ہندوستان کے محکمہائے تعلیم میں منظور شدہ

رسالہ

ادبی دنیا



The Adabi Dunya, Lahore.

ایڈیٹر: منصور احمد

PRICE 6 ANNAS. قیمت چھ آنے

جلد ۱۰ — نمبر ۱

فہرستِ مضامین

بابت ماہ اپریل ۱۹۳۴ء

تصویر:- بہار

سالانہ چندہ ...

حال وقال

ادبی دنیا اس ماہ بڑی تقطیع پر چھپ رہا ہے اور آئندہ کے لئے بھی ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ اسی تقطیع پر چھپے۔ ظاہر ہے کہ یہ تقطیع اقتصادی اور کاروباری نقطۂ نظر سے ہمیں بہت گراں پڑتی ہے اور اگرچہ ذاتی طور پر ہم چھوٹی تقطیع ہی کو پسند [illegible] میں لیکن [illegible] بعض معاونین کے اصرار پر ہم نے اسے تبدیل کر دیا ہے۔ تقطیع بڑھانے سے صرف کتابت طباعت اور کاغذ پر تقریباً ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ زائد خرچ ہوگا۔ ان مصارف کے علاوہ ادبی دنیا نے بعض غیر معمولی مصارف اپنے ذمے لگا رکھے ہیں۔ سالنامہ اور انعامی مقابلہ ان میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ گذشتہ سالنامے پر معمولی پرچے کی بہ نسبت دگنے سے زیادہ خرچ آگیا۔ پانچ انعامی مقابلوں کا نتیجہ نکل چکا ہے۔ انعام پچاس روپے ماہوار مقرر ہے۔ لیکن وصولی کی اوسط بمشکل بیس پچیس روپے ہوتی ہے۔ اب تک ہم ایک سو چالیس روپے اپنی گرہ سے انعام کی مد میں صرف کر چکے ہیں۔

ہم یہ بھی اپنے معاونین سے گوش گذار کر دینا چاہتے ہیں کہ گذشتہ سال کے دوران میں ادبی دنیا نے اپنی خصوصیت کو برقرار رکھتے ہوئے سب رسائل سے زیادہ صفحات اپنے قارئین کو پیش کئے اور اس کے باوجود قیمت پہلے سے بھی کم کر دی۔ [illegible] دور کے پہلے تین ماہ تک رسالہ بڑی تقطیع پر نکلتا رہا۔ اس کے بعد نو پرچے چھوٹی کبھی ۲ [illegible] اور کبھی ۸۰ صفحات پر شائع ہوئے۔ مختصر یہ کہ چھوٹے بڑے [illegible] نو سو صفحات ہم نے چار روپے سات آنے میں اپنے خریداروں کو دئے اور بائے ملک مو قرا خبارات اور محکمۂ تعلیم کے افسروں نے تسلیم کیا ہے کہ ادبی دنیا کا معیارِ ادب اس سال گزشتہ کی بہ نسبت بلند رہا ہے۔ ہماری محنت اور جانفشانی کی داد تو ہمیں مل گئی۔ لیکن اُس صرفِ کثیر کی طرف شاید ہی کسی کا خیال گیا ہو جو ہمیں اس کے قائم رکھنے کے لئے برداشت کرنا پڑا۔ نئے دور میں اگرچہ قدیم مستقل عنوانات ہم نے حذف کر دئے لیکن ادب کے ہر شعبے میں ہم نے بہتر اور بہتر حاصل مضامین فراہم کئے۔ زبان، تنقید، سائنس کی جدید [illegible] معاشرت، تاریخ، حکما و مشاہیرِ عالم کے حالاتِ زندگی، افسانے [illegible] گراں پایہ مضامین شائع ہوئے۔

گذشتہ پرچے کے ساتھ ادبی دنیا کے دورِ جدید کا پہلا سال ختم ہوگیا۔ اپریل کا پرچہ نئے سال کا پہلا پرچہ ہے۔ جب نئے کارپردازوں نے ادبی دنیا کو اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ ایک نیم جاں پیکر بن چکا تھا لوگوں کو اس کی زندگی کا یقین نہ رہا تھا۔ وہ اس کی بدنظمیوں اور بے قاعدگیوں سے اتنے بدظن ہو چکے تھے کہ پہلے مہینے جب تقریباً چھ سو وی پی بھیجے گئے۔ تو ان میں سے پانچ سو واپس آگئے۔ لیکن رفتہ رفتہ قارئین کی شکایات دور ہو گئیں اور اس وقت خدا کے فضل وکرم سے اس کی اشاعت پہلے سے ڈیوڑھی ہو چکی ہے۔

مگر یہ اشاعت اس کے مصارف کے مقابلے میں اب بھی کم ہے ہم اپنا فرض پہلے سے بھی زیادہ محنت اور تندہی سے ادا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن ہم اپنے معاونین کو ان کا فرض یاد دلائے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔ ہم ان کے ذوقِ ادب سے یہ سفارش کریں گے کہ وہ اس کی ترقی کے لئے کوشاں ہوں، اور اپنے حلقۂ اثر میں اسے متعارف کرائیں اور اپنے دوستوں کو اس کی خریداری کی ترغیب دیں۔ جس عظیم الشان مقصد کے لئے ادبی دنیا جاری ہے۔ اس میں ان کی امداد و اعانت کا شامل ہونا اشد ضروری ہے۔

اگر آپ اردو زبان کو اپنی ملکی زبان بنانا چاہتے ہیں تو اس کے لئے اس وقت بڑی جد وجہد اور ایثار کی ضرورت ہے۔ آپ اپنے رسائل کو اس قابل بنا دیجئے کہ وہ لکھنے والوں کو معقول معاوضے دے کر ان کی ہمت افزائی کر سکیں۔ آپ کی زبان میں بہترین ادب اسی طرح پیدا ہوگا اور اس زبان کو پڑھنے اور لکھنے کی تحریص ہندوستانیوں کو صرف اسی صورت میں ہوگی۔ ہم اپنے معاونین سے اس استدعا کے جواب کے منتظر ہیں۔

منصور احمد

آئینۂ عالم

ہندوستان کی قدیم یونیورسٹیاں

فلاطوں نے اپنی تصوری جمہوریت کی ترکیب میں سب سے زیادہ اہمیت اُس نظامِ تعلیم کو دی ہے جو اس جمہوریت میں رائج ہوتا۔ روس، ترکی، اٹلی، جرمنی اور دوسرے مقامات پر جو انقلابات موجودہ زمانے میں ہوئے ہیں انہوں نے وہاں کے تعلیمی نظام بھی بدل دئے ہیں اور اب وہاں تعلیم کے وہ طریقے رائج ہیں جو ان ممالک کے قائدین کا مطمحِ نظر تھے۔

تمام دنیا کے واقعات کی صورت اس وقت ایک سیلاب کی سی ہے۔ کوئی چیز مستقل معلوم نہیں ہوتی۔ اور اقوام کے محبوب ترین اعیان تک نہایت سرعت سے بدل رہے ہیں۔ دنیا کسی ایسے چین کے لئے اندھیرے میں ٹامک ٹوئے مار رہی ہے جو امن اور استحکام کا ضامن ہو۔ آیئے ذرا دیکھیں تو سہی کہ آیا موجودہ مسائل کے حل میں ہمیں قدیم ہندوستان سے کچھ مدد مل سکتی ہے یا نہیں۔ اس مقصد کے لئے ہم گوروکلوں یعنی قدیم قومی یونیورسٹیوں اور ان کے مطمحِ نظر کا جائزہ لیتے ہیں۔

گوروکل ایک سنسکرت لفظ ہے جس کے معنی ہیں "اُستاد کا گھرانا"۔ قدیم ہندوستان میں لڑکے لڑکیاں دونوں جب پانچ برس سے زیادہ عمر کے ہو جاتے تھے تو وہ اپنے والدین کا گھر چھوڑ دیتے تھے اور اپنی طالب علمانہ زندگی کا سارا عرصہ اپنے گورو کے ہاں گزارنے کے لئے چلے جاتے تھے۔ اس عرصہ کے دوران میں کسی اشد ضرورت کے سوا انہیں اپنے ماں باپ سے ملنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ وید مقدس نے اس کو نہایت خوبصورت الفاظ میں یوں بیان کیا ہے کہ "استاد انہیں اپنے رحم میں لے جاتا تھا"۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ چونکہ طالب علمانہ زندگی حیاتِ انسانی کا اہم ترین اور سب سے بڑھ کر صورت پذیر حصہ ہے اس لئے یہ ایک ماہر استاد کی مسلسل نگرانی اور تربیت میں گزرنا چاہئے۔ والدین سے اُس ہنرمندی اور فرصت کی توقع نہیں کی جاتی تھی جس کی بچے کو ضرورت ہوتی ہے۔ اور قوم کی فلاح و بہبود کا انحصار کلیتہً بچوں کی تعلیم اور اخلاق پر ہے اس لئے قوم کے بہترین افراد کو یہ کام تفویض کیا جاتا تھا۔

گورو عموماً ایسا معمر شخص ہوتا تھا جس نے دنیا کو چھوڑ دیا ہو اور تمام زندگی حق و صداقت اور علم و حکمت کے لئے وقف کر دی ہو۔ وہ اپنی ان خدمات کا کوئی معاوضہ نہ لیتا تھا جو اپنے ان متبنیٰ بچوں کے لئے وہ فرض سمجھ کر انجام دیتا تھا۔ وہ اور اس کے شاگرد ایک بڑے خاندان کی طرح رہتے تھے اور ان کی گزران کلیتہً لوگوں کے عطیات پر ہوتی تھی۔ عموماً ہر گرہستی ان گوروکلوں کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا اور اس لئے مانگے اور منت پذیر ہوئے بغیر انہیں عطیات پہنچ جاتے تھے۔ مطلب یہ ہوتا تھا کہ طالب علم کے دل پر یہ بات نقش کر دی جائے کہ سماج کے خرچ پر اس کی تربیت ہوئی ہے اور اس لئے اسے عمر بھر سماج کی خدمت کرنی چاہئے۔ بڑے بڑے گوروکلوں میں اس قسم کے متعدد استاد ہوتے تھے جو ایک بڑے استاد کے ماتحت ہوتے تھے۔

گوروکل میں تمام بچوں سے خواہ امیر ہوں یا غریب ایک جیسا برتاؤ ہوتا تھا۔ گورو اور لڑکے باپ بیٹوں کی طرح رہتے تھے۔ بادشاہ کے بیٹے اور فقیر کے بیٹے کا ایک درجہ ہوتا تھا۔ جس آرام سے سب متمتع نہ ہو سکیں اس کی کسی کو اجازت نہ دی جاتی تھی۔ تمام اختلافات کو برابر کر دیا جاتا تھا اور ذہانت، فراست، صنعت، خدمت، جسمانی طاقت اور اخلاق کے سوا کسی بات میں ایک دوسرے کا حریف ہونے کی اجازت نہ دی جاتی تھی۔ اخوت اور موالات کا احساس جو یہاں بچوں کو حاصل ہوتا تھا تمام عمر باقی رہتا تھا۔ بعد میں نہ امیر اپنی دولت پر مغرور ہوتے تھے نہ غریبوں کو اپنی غریبی سے عار آتی تھی۔ گوروکل کی جائے وقوع کو خاص اہمیت دی جاتی تھی عموماً تنہائی میں کسی دریا کے کنارے پر شہر کے شور و شغب سے دور اور فطرت کے کسی خوبصورت منظر کے درمیان اس کی بنیاد رکھی جاتی تھی۔ سب سے پہلے بچے مادرِ فطرت سے آرٹ سیکھتے تھے۔ جس سے ان کی چھپی ہوئی شاعرانہ اور مصورانہ قابلیتیں ابھر آتی تھیں۔ اس کے علاوہ یہ نقصان کو فاسد اثرات سے محفوظ رکھتی تھی اور ان کی جسمانی اور روحانی نشو و نما

میں ان کی مدد کرتی تھی۔

گورو کل کے بچے برہمچاری کہلاتے تھے۔ جس کے لفظی معنی "جویائے حق" ہیں۔ ہندوستانی فلاسفہ کے خیال کے مطابق حق کو انسان صرف اس صورت میں پا سکتا ہے کہ اپنے احساس پر اسے کلیتہً قابو حاصل ہو اور دنیا کی چیزوں سے اسے قطعاً وابستگی نہ ہو۔ اسی لئے ضبطِ نفس اور تجرد پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ مشترکہ تعلیم بالکل ممنوع تھی۔ لڑکیوں اور لڑکوں کے لئے الگ الگ گورو کل قائم تھے اور ان میں صنفِ مخالف کے افراد کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ ان کا یہ خیال تھا کہ زندگی کے اس سب سے زیادہ اثر پذیر حصے میں دونوں اصناف کا آپس میں ملنا بعض ایسی نفسیاتی پیچیدگیاں پیدا کر دیتا ہے جو ان کی ضروری نشوونما کے لئے مضر ہیں۔ لڑکوں کے نصابِ تعلیم کی تکمیل چوبیس سال میں ہوتی تھی اور لڑکیوں کے نصاب کی سولہ سال میں۔ اس کے بعد وہ گھر جا سکتے تھے، شادی کر سکتے تھے اور زندگی کی دوسری منزل یعنی متاہل اور شہری زندگی میں قدم رکھ سکتے تھے۔

یہاں ہر قسم کی تعلیم دی جاتی تھی لیکن سب سے زیادہ توجہ تہذیبِ اخلاق کی طرف ہوتی تھی۔ تعلیم کے ہر شعبے تک پہنچنے کا طریقہ مذہبی تھا۔ لیکن مذہب سے مراد یہاں عقیدہ نہیں۔ مذہب کے معنی ہیں تکمیلِ نفس، اور ہندو کتب میں تکمیلِ نفس کے چار طریقے لکھے ہیں۔ تصوف، علم، عبادت، عمل۔ ان میں سے کسی ایک کی مدد سے تکمیلِ نفس حاصل ہو سکتی ہے۔ تخلیق کی گوناگونی اور رنگا رنگی میں توحید و تفرید کا احساس چونکہ مذہب ہے۔ اس لئے تمام علوم اس بنیادی توحید کے نقطۂ نظر سے پڑھے جاتے تھے۔ نصابِ تعلیم اس پر مشتمل ہوتا تھا کہ سنسکرت ادب اور گرامر، فلسفہ، ریاضی اور ہیئت، علم الادویہ، اقتصادیات، سیاسیات اور فوجی تعلیم کی تکمیل کی جائے۔ یہ ہے مختصر سا خاکہ اس نظامِ تعلیم کا جو قدیم ہندوستان میں رائج تھا

اس سے ہمارے ذہن میں ان قومی تربیت گاہوں کا خیال آتا ہے جن کا ذکر فلاطوں نے اپنی جمہوریہ میں کیا ہے۔ ان قومی تربیت گاہوں کا مقصد یہ تھا کہ بچوں کے دلوں سے ان تنگ خیالیوں کو دور کیا جائے جو گھروں میں رہنے سے پیدا ہو جاتی ہیں اور ان کی پرورش ایسے طریقے سے ہو جیسے وہ مملکت کے بچے ہیں۔ لیکن جیسا کہ بعد میں ارسطو نے کہا اس نظام میں بعض نفسیاتی حقائق کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ الفت اور ہمدردی کی جبلت صرف مشق سے پیدا ہوتی ہے۔ سب سے پہلے اس کا تعلق ماں سے ہوتا ہے۔ جب ماں بچے کو اپنی چھاتیوں سے دودھ پلاتی ہے تو اس جبلت کو رونمائی کا موقع ملتا ہے اور تقویت پہنچتی ہے۔ رفتہ رفتہ بچے کی محبت وسیع ہوتی ہے اور اس میں باپ اور گھر کے دوسرے افراد بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ مسٹر میک ڈوگل نے کہا ہے کہ "وہ قوم جو بوتلوں کا دودھ پی کر پلے گی ایک ایسی قوم ہوگی جس کے افراد سرد مہر اور غیر ہمدرد ہوں گے۔ ماں کے دودھ [illegible] نے سے الفت اور ہمدردی کی جبلت پر نہایت تقویت بخش اثر ہوتا ہے۔

گورو کل کا نظام ایسا ہے کہ فلاطوں کے مقصد کو بھی پورا کرتا ہے اور ارسطو اور موجودہ ماہرینِ نفسیات نے جن نفسیاتی نقصانات کی طرف اشارہ کیا ہے ان سے بھی بچاتا ہے۔ ماں کی تربیت کے پہلے چند سال بچے میں ہمدردی کی جبلت اچھی طرح پیدا کر دیتے ہیں اور اس کے بعد بچہ ایک اس سے بڑے گھر (گورو کل) میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح نہ تو وہ یکایک محبت و ہمدردی کی جبلت کی تربیت سے محروم رہ جاتا ہے اور نہ ہمیشہ گھر میں رہ کر تنگ خیالی کے جذبات کا شکار ہوتا ہے۔ استاد کی شفقت آمیز نگرانی میں بچے نہایت اچھے شہری اور نہایت اچھے گرہستی بن کر نکلتے ہیں۔

گورو کل کی ایک اور خصوصیت یہ ہوتی تھی کہ اس میں اخلاقی قوت اور ضبطِ نفس پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ عیش و عشرت کی اجازت نہ دی جاتی تھی اور بالکل باقاعدہ اور جفاکشی کی زندگی گزارنے کی ہدایت ہوتی تھی۔ گورو کل کا ماحول قدرتی اور مصنوعی دونوں حیثیتوں سے ایسا ہوتا تھا کہ اخلاقی اور روحانی نشوونما نہایت اچھے طور پر ہو سکتی تھی۔ بچوں میں اخوت اور مساوات کی روح پیدا کی جاتی تھی۔ ہر قسم کی تعلیم نوجوانوں میں وسعتِ نظر پیدا کرتی تھی اور آئندہ پیش آنے والے دولت کے نشیب و فراز کے لئے انہیں تیار کرتی تھی۔ پبلک کے روپے پر معاش کا انحصار ان کے دلوں پر ایک گہرا نقش کر دیتا تھا کہ جس سماج نے انہیں تعلیم دی ہے اس کا ان پر بڑا حق ہے۔ سارا نظام ایسا تھا کہ وہ فرد کو ایک عجیب طریقے سے سماج میں جذب کر لیتا تھا لیکن اس کے باوجود اس کی انفرادیت کو محفوظ رکھتا تھا۔

اس نظام کا ایک تیسرا نتیجہ یہ تھا کہ قدیم ہندو معاشرت میں گویا استاد کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہو جاتی تھی اس کا پیشہ معزز ترین خیال جاتا تھا اور بڑے سے بڑا بادشاہ بھی گورو کے سامنے سر جھکاتا تھا۔

تہذیب کے گہوارے

مسٹر ارنسٹ بن ٹیوز کرانیکل میں لکھتے ہیں :- "تمام مشرق وسطیٰ میں آثارِ قدیمہ کے اکتشافات کا یہی موسم ہے۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین اسی خوشگوار موسم میں قدیم مقابر کو کھودتے اور پرانی عمارات اور قدیم تہذیب و تمدن کے آثار کا انکشاف کرتے ہیں۔

اکثر مہمات ان مقامات پر کام کر رہی ہیں جن کا ذکر کتبِ مقدسہ میں آیا ہے۔ جو اشیاء حال سے برآمد ہوئی ہیں وہ فی الجملہ ان کتب کے بیانات کی تصدیق کرتی ہیں۔

لیکن اب کئی مہمات کتبِ قدیمہ کے زمانے سے بہت پہلے کے آثار کا انکشاف کر رہی ہیں۔ نسلِ انسانی کی ابتدائی تاریخ کی نسبت گذشتہ چند سال کے اکتشافات ہمارے تصور کو بدل رہے ہیں۔ اس موسم کے اکتشافات کے نتائج بھی جلد ہی منظرِ عام پر لائے جائیں گے اور توقع کی جاتی ہے کہ بعض حیرت انگیز انکشافات کا اعلان کیا جائے گا۔

تیس یا چالیس سال گزرے جب سر آرتھر ایونز نے کریٹ میں ہیلنک زمانے سے قبل کی تہذیب کے آثار دریافت کئے تھے تو اسے ایک بہت بڑا انکشاف خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن آج یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ دجلہ و فرات کے سنگم کی تہذیب مصر، فلسطین اور یونان کی تہذیبوں سے بھی قدیم ہے۔

آج کل برطانوی اور امریکی مکتشفین تہذیب کے اولیں مراکز کی تلاش میں مشرق کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ گزشتہ دو تین سال کے دوران میں مسٹر ڈولے نے کالدیوں کے شہر اُر میں اور ڈاکٹر فرینک فورٹ نے تل اسمر میں جو بغداد کے قریب ہے ایسے انکشافات کئے ہیں جن سے ہندوستانی تہذیب اور سومیری تہذیب کے درمیان ایک یقینی رشتے کا ثبوت ملتا ہے۔ میسوپوٹیمیا کے ان قدیم شہروں سے ایسی چیزیں برآمد ہوئی ہیں جو بلاشبہ ان لوگوں کے ذریعے سے یہاں پہنچیں جو وادیٔ سندھ کے رہنے والے تھے۔

جرمنوں نے جنوبی ایران میں تختِ جمشید کے مقام پر جو انکشافات کئے ہیں ان سے اس مسئلہ پر اور بھی روشنی پڑتی ہے۔ اور ماہرین کی رائے ہے کہ اگر افغانستان اور بلوچستان میں کھدائی کا کام جاری رکھنے کے لئے روپیہ ہوتا تو اس زمانہ قبل تاریخ کے حقیقی سلسلہ آمد و رفت کا پتہ چل سکتا ہے۔

بائیبل کے بیانات جو ہر یورپین کے دل پر نہایت نمایاں طور پر نقش ہیں، گزشتہ زمانے میں آثارِ قدیمہ کی تلاش میں آخری حد سمجھے جاتے تھے۔ لیکن میسوپوٹیمیا کے اکتشافات تاریخ کو پرانے عہدنامے سے بھی قدیم زمانے تک لے گئے ہیں، اور اب ان سے معلوم ہو رہا ہے کہ کیونکر یورپ وادیٔ سندھ کی قدیم تر تہذیبوں کا مرہونِ منت رہا ہے۔

اُر میں تو مسٹر ڈولے نے شہر کے چہرے سے اس طرح نقاب اٹھایا ہے کہ جس زمانے میں حضرت ابراہیم اسے چھوڑ کر وادیٔ غیر ذی زرع کو چل دیئے تھے اس زمانے کی ہر چیز نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ میں ان گلیوں میں گیا ہوں جن کو آپ کے زمانے کے لوگوں نے پامال کیا ہے۔ میں نے اس عہد کی دکانوں اور بازاروں کو دیکھا ہے جو بالکل عہدِ حاضر کے کسی مشرقی بازار کی طرح ہیں۔ ان دکانوں سے اُن لوگوں نے اپنی روزمرہ کی ضروریات خریدی ہیں۔ میں ان کے گھروں کے کھنڈروں میں داخل ہوا ہوں اور آنکھوں سے مانوس اندرونی صحن کو، ٹوٹے ہوئے ستونوں کو اور اوپر کی منزل پر جانے کے لئے جو پیچدار زینے استعمال ہوتے تھے ان کی ابتدائی سیڑھیوں کو میں نے دیکھا ہے۔

بابل عظمےٰ میں میں نے معلق باغات دیکھے ہیں جو کبھی دنیا کے سات عجائبات میں شمار کئے جاتے تھے اور اب سنسان و ویران ہیں۔ اور میں اُن مقدس راستوں پر چلا ہوں جہاں سے قربانی اور ماتم کے جلوس گزرے ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے وادیٔ شاہان میں فراعنہ کی پرشکوہ موت کے مناظر دیکھے ہیں۔

لیکن ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی توجہ اب زیادہ سے زیادہ مشرق کی جانب ہو رہی ہے۔ امریکی ماہر اپنی مہمات کو نہایت مستحکم بنیادوں پر منظم کر رہے ہیں۔ شکاگو یونیورسٹی کے اورینٹل انسٹیٹیوٹ نے مصر میں ایک صدر مقام بنایا ہے جس کا مقصد "ہلال شاداب" میں امریکہ کی مختلف مہمات کے کام کی نگرانی ہے۔

ہلال شاداب کیا ہے؟ یہ اُس قطعۂ زمین کا نام ہے جو اناطولیہ کی پہاڑیوں اور شمالی صحرائے عرب کے درمیان واقع ہے۔ مصر سے یہ فلسطین اور شام تک شمال کی طرف بڑھتا ہے۔ پھر بالائی فرات اور دجلہ تک مشرق کی طرف، پھر نیچے خلیج فارس تک اور پھر ہندوستان تک۔ اس علاقے میں شکاگو کے ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے مہمات کا ایک سلسلہ جاری کر رکھا ہے جو کافی ساز و سامان اور رہنے اور کام کرنے کے لئے اعلیٰ درجے کی عمارتیں تعمیر کر کے کام کر رہی ہیں۔ ان کے مقابلے میں برطانوی مہمات کو یہ آسانیاں حاصل نہیں۔

ماہرینِ آثارِ قدیمہ جس بات کی تلاش میں ہیں وہ اشیا نہیں بلکہ وہ شہادت ہے جو ان اشیا کے موقع و محل سے حاصل ہوتی ہے۔

مشرقی لوگ جو ہمیشہ اپنے خزانے زمین کے نیچے دفن کرنے کے عادی رہے

میں سمجھتے ہیں کہ ہر سال یورپ اور امریکہ سے جو مہمات وارد ہوتی ہیں وہ یہاں سے بیش قیمت خزانے کھود کرلے جاتی ہیں حالانکہ اکثر یوں ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ بیش قیمت وہی اشیا ثابت ہوتی ہیں جو سب سے زیادہ بے قیمت ہیں۔ اس سال کے انکشافات چند ہفتوں تک ظاہر کئے جائیں گے۔

عجیب و غریب وصیتیں

حال ہی میں دو عجیب و غریب وصیتیں ظہور میں آئی ہیں جن میں سے پہلی سیڑھیوں کے ایک تختے پر اور دوسری پنیر کے ایک ٹکڑے پر لکھی ہوئی پائی گئی۔ وصیت ایک خاص تاریخی حیثیت رکھتی ہے جس کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جن کی وصیتیں کسی دماغی خبط کی وجہ سے یا تو مافوق العادۃ ہوتی ہیں یا وہ اپنے مال و دولت کی تقسیم کے متعلق غیر معمولی ہدایات چھوڑ جاتے ہیں۔

وصیت کی تاریخ میں مندرجہ ذیل تازہ اور نادر واقعات رونما ہوئے ہیں

گذشتہ جنوری میں لاز اینجلز (کیلی فورنیا) کے مقام پر ایک متمول سوداگر ہربرٹ شیکمین کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۵۲ برس کی تھی۔ لیکن ابھی تک اس نے شادی نہیں کی تھی۔ اس نے تین ہزار پونڈ کی جائداد پیچھے چھوڑی۔ لیکن کوئی وصیت نہ کی یا کم از کم یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اس نے ایسا نہیں کیا لیکن اس کی موت کے دو ہفتے بعد اس کا ایک ہمسایہ جو اس کی سیڑھی لے گیا تھا اور واپس کرنا بھول گیا تھا۔ سیڑھی کے زینے پر یہ لفظ پڑھ کر جو مرحوم کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے تھے، حیران رہ گیا۔

"مورخہ ۲ دسمبر ۱۹۳۲ء۔ میری سب جائداد ایلن گالٹس کو دے دو۔ مجھے اس سے محبت ہے۔ وہ میری روح رواں ہے۔"

ایلن گالٹس ایک معمولی حیثیت کی بیوہ عورت تھی اور ہربرٹ شیکمین جو کسی قدر شرمیلا واقع ہوا تھا، اس کا بہت [illegible] دوست تھا۔ وہ جانتی تھی کہ مرحوم اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے لیکن اسے اس بات کا کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا کہ وہ اس کے لئے تمام جائداد تو کیا اس کا کوئی حصہ بھی چھوڑ جائیگا۔

سیڑھی اس کے وصیت نامے کے طور پر لاز اینجلز کی عدالت میں پیش کی جا چکی ہے اور یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ مسز گالٹس کو یہ نعمت غیر مترقبہ مل جائے گی۔

دوسری وصیت اگرچہ اتنی بعید از قیاس نہیں لیکن کافی حیرت انگیز ہے۔

حال ہی میں لیوی ایس۔ اولٹزمین جو ٹینسی کے ایک گاؤں کا کسان تھا۔ اچانک مر گیا۔ اس کے رشتہ داروں نے وصیت نامہ کی تلاش کرنی شروع کی وہ ناکام رہے آخر کار ایک نوکر کو ایک پنیر کا ٹکڑا ملا جس پر کسان کی آخری وصیت نمایاں طور پر لکھی ہوئی تھی۔

یہ وصیت نامہ بالکل اصلی حالت میں ہے۔ اولٹزمین کی ایک خواہش یہ تھی کہ ارسلا کو ایک سو پچاس ڈالر دئے جائیں تاکہ وہ اپنی زندگی آرام و اطمینان سے بسر کر سکے۔ ارسلا مرحوم کی ایک رفیقہ تھی جو اس کے کھیتوں میں بیج بویا کرتی تھی۔

امریکہ کے ایک اخبار نے اس خبر کو "عجیب ترین وصیت" کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ لیکن حقیقت میں اس قسم کی بہت سی عجیب و غریب وصیتوں کا انکشاف ہوتا رہا ہے۔

ابھی چند ہی ماہ گزرے کہ اٹھارہ ہزار پونڈ کی جاگیر کی ایک وصیت صرف تیس الفاظ میں ایک ہوٹل کے مینو کارڈ پر لکھی ہوئی ملی۔ یہ وصیت لنڈن کی ایک خاتون مسز ایڈتھ میرین راس کی تھی اور مسٹر جے منڈی گریگوری کے نام لکھی گئی تھی۔

ایک اور عجیب و غریب وصیت انڈے کے چھلکے پر لکھی ہوئی ملی۔ یہ وصیت مسز جیمز بارنز کے مرحوم شوہر کی تھی جو مانچسٹر کا ایک جہاز ران تھا، اور جو عدالت العالیہ میں نومبر ۱۹۲۶ء کو پیش ہوئی۔ اس میں یہ الفاظ لکھے تھے "میری تمام جائداد میری بیوی کو ملے۔ ج ب۔"

مسز بارنز کو یہ اتفاقاً ایک الماری پر پڑی ہوئی مل گئی۔ لیکن ایک رات دفتر کی تجوری میں پڑے رہنے کے بعد لارڈ میریویل نے جو عدالت کے شعبۂ وصایا کے صدر تھے اسے ناجائز قرار دیا کیونکہ اس پر شہادت درج نہ تھی۔

انگلستان میں وصیت اُسی وقت جائز سمجھی جاتی ہے جب کہ اسے وصیت کرنے والے نے دو گواہوں کے سامنے لکھا ہو، دستخط کئے ہوں اور جس کے نیچے ان گواہوں کے دستخط بھی ہوں۔ ٹائپ رائٹر اور پریس کا چھپا ہوا بھی "لکھنے" کے تحت میں آجاتا ہے، اور وصیت خواہ کسی چیز پر لکھی جائے قانون کو اس پر اعتراض نہیں ہوتا۔

ایک خبطی نے جسے اس قانون کا علم تھا اپنی وصیت نہایت تیز روشنائی کے ساتھ اپنی خوابگاہ کے دروازے پر لکھی۔ اس کے نیچے دستخط اور شہادت بالکل صحیح طور پر لیکن بے ڈھنگے پن سے درج تھی۔ صورتِ حالات نے وکلا کو بہت پریشان کیا اور انہوں نے عدالت سے درخواست کی کہ اصل وصیت کا منتقل کرنا چونکہ

طول ملی۔ ہم اس لئے اس کی ایک صلفی نقل یعنی منظور کر لی جائے۔ لیکن جج نے انکار کر دیا اور حکم دیا کہ دروازے کو اکھاڑ کر عدالت کے سامنے پیش کیا جائے۔

سمرسٹ ہوس کے محافظ دفتر میں ایک اور وصیت ردی میں لپٹی ہوئی محفوظ ہے۔ یہ ایسے بوسیدہ کاغذ پر لکھی گئی ہے کہ ہلکے سے ہلکا مس بھی اسے نقصان پہنچانے کے لئے کافی ہے۔ یہ ایک نانبائی کی وصیت ہے جو کسی طرح اس کے تنور میں پہنچ گئی اور اس کی موت کے بعد ملی۔

دو وصیتیں تقطیع کے لحاظ سے عجیب وغریب ہیں۔ ان میں سے پہلی ایک سنگتراش کی تھی جو ایک دیوار پر نہایت جلی حروف میں لکھی گئی تھی۔ دوسری ایک سپاہی کی تھی جو چند سال ہوئے انگریزی عدالتوں کے سامنے پیش ہوئی۔ یہ نہایت باریک حروف میں تانبے کے ایک قرص پر لکھی گئی تھی۔ بعض الفاظ اس میں ایسے تھے جو خوردبین کے بغیر پڑھے ہی نہ جا سکتے تھے۔

ایک اور غیر معمولی وصیت سے ایک نہایت المناک واقعہ متعلق ہے۔ اسے ایک مرتے ہوئے آدمی نے پتھر پر کھرچ کر لکھا ہے۔ وصیت کرنے والا کانیں دریافت کیا کرتا تھا۔ ایک دن وہ ایک چٹان پر کھڑا تھا کہ چٹان یکایک گر پڑی۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں لوگوں کی آمد ورفت نہ تھی اور کوئی اس کی مدد کے لئے وہاں موجود نہ تھا چونکہ وصیت لکھنے کے لئے اس کے پاس کوئی سامان نہ تھا اس لئے اس نے اپنی آخری خواہشات کو ایک پتھر پر نقش کر دیا تھا۔

لیکن شاید زیادہ قابلِ ذکر وہ وصیتیں نہیں جو شکل کے لحاظ سے عجیب وغریب ہیں بلکہ وہ ہیں جن میں بعض نرالی خواہشات کا اظہار کیا گیا ہے اور ورثا پر انوکھی پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔

لنڈن کے ایک بیرسٹر نے جس کا نام پرابٹ ڈیو تھا اور جس نے ۱۹۳۱ء میں انتقال کیا اپنی بیوی اور دوسرے رشتہ داروں کے نام ترکہ چھوڑا، لیکن ساتھ یہ شرط لگا دی کہ ان میں سے کوئی شخص سرطان، جھینگا مچھلی، جھنگری، بام مچھلی یا کوئی اور سیپ دار جانور یا کوئی ایسا جانور نہ کھائے گا جس کے متعلق اسے شک ہو کہ اس کی موت بیرحمانہ طریقے سے ہوئی ہے اور پکانے سے پہلے اس کی جان نکل نہیں چکی تھی۔

یہ شخص پاگل خانے میں مرا، لیکن یہ وصیت اس نے مرنے سے اٹھارہ برس سال قبل لکھی تھی جب اس کے ہوش وحواس بالکل درست تھے اور وہ بیرسٹری کر رہا تھا۔

ایک مشہور امریکن ماہرِ چشم ڈاکٹر چارلس کیلگ جس نے اپریل ۱۹۴۲ء میں ۶۹ برس کی عمر میں انتقال کیا دو ہزار پونڈ اس شخص کے نام چھوڑے جس سے اس کی ایک مطبوعہ کتاب کا آدھا پھٹا ہوا صفحہ برآمد ہو۔ یہ ایک بالکل معمولی سی کتاب تھی۔ ساتھ ہی اس نے یہ شرط بھی لگا دی تھی کہ مالک کے لئے لازم ہے کہ اس آدھے صفحے کو مقامی عدالت کے سامنے ۱۹۵۵ء سے پہلے پیش کرے۔

۱۹۲۰ء میں لنڈن کے ایک باشندے نے وصیت کی کہ اس کی تمام غیر منقولہ جائداد رودبارِ انگلستان کے وسط میں لے جا کر سمندر میں ڈبو دی جائے اور تین سال گزرے لنڈن کے ایک اور شخص نے جو گالف کا کھلاڑی تھا کہا کہ اس کی نعش جلا دی جائے اور اس کی خاک بیدِ مجنوں کے اُس درخت کے نیچے بکھیر دی جائے جو گالف کھیلنے کے دوران میں اس کے راستے میں [illegible] تھا۔

ایک امیر آدمی بڑے اہتمام سے اپنی ڈائری لکھا کرتا تھا اور [illegible] سال اپنے چار دوستوں میں سے کسی ایک کو دے دیا کرتا تھا۔ کچھ عرصے [illegible] وہ اس سلسلے سے تنگ آ گئے اور انہوں نے ڈائری کو پڑھنا چھوڑ دیا۔ لیکن [illegible] لکھنے والے کی موت کے بعد ایک دن اچانک ایک دوست کی نظر [illegible] کے صفحہ ۴۴ پر پڑ گئی جس پر اس امیر کی وصیت درج تھی۔ اس نے اپنی تمام دولت اپنے چار دوستوں کے نام چھوڑی تھی۔ اس دوران میں اس کی جائداد اس کے ایک دور کے رشتہ دار کو مل چکی تھی، اور بڑی لمبی قانونی چارہ جوئی کے بعد اصل حقداروں کو ملی۔

منصور احمد

معاونین سے

براہِ مہربانی خط وکتابت کرتے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجیے۔ یہ آپ کے پتے کی چٹ کے اوپر درج ہوتا ہے اس کے بغیر اکثر اوقات آپ کے ارشاد کی تعمیل نہیں ہو سکتی۔

(مینیجر ادبی دنیا)

بہار

ایک سیاح کسی غیر آباد سرزمین میں سفر کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کسی کو اس سفر پر جانے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ عام طور پر یہ یقین کیا جاتا تھا کہ دنیا کے اس حصے میں کسی انسان کا گذر ممکن نہیں۔ اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے ریت میں ایک نشان دیکھا جو صرف انسانی قدموں سے بن سکتا تھا۔ سیاح کا دل خوف اور استعجاب کی آماجگاہ بن گیا۔ اور اس نے ارادہ کیا کہ جب تک اس شخص کے حالات کا پورا علم حاصل نہ کر لوں گا اس وقت تک میرے لئے کھانا پینا اور آرام کرنا حرام ہے

ہماری حیثیت ایک سیاح کی ہے۔ اور ہر عظیم کارنامہ ایک دلچسپ [illegible] میں ایک گذرے زمانے کی یاد دلاتا ہے۔ ایک [illegible] ہوئی [illegible] اور جلے ہوئے شہر اور تباہ [illegible] پیغمبر کا نقشِ قدم کیا ہے؛ ایک معبد جسے دیکھ کر بھولے بھٹکے [illegible] آقا کو یاد کرتے ہیں۔ اور ایک مصور کا نقشِ قدم؛ ایک شاہکار، تخیل [illegible] پردازی کا مظہر، حسن کا ایک رنگیں خواب، جنت کا ایک دلکش ٹکڑا، جسے [illegible] والے کے منہ سے بے اختیار یہ شعر نکلے ؎

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

بہار کی جو تصویر ہمارے پیشِ نظر ہے، کسی بے فکرے نے وقت کا خون کرنے کے لئے نہیں بنائی، بلکہ مصور کے موقلم کی ہر جنبش معنی خیز ہے بائیں طرف سے نظر ڈالی جائے تو پہلے دیوتاؤں کا نامہ بر عطارد نظر آتا ہے، پھر بہار کی دیوی کی تین سہیلیاں رقص کرتی ہوئی نظر آتی ہیں، ان سے ہٹ کر جو شکل درمیان میں نظر آتی ہے وہ ملکۂ حسن وینس کی ہے۔ اس سے دائیں طرف دوشیزۂ بہار اپنی گلکار پوشاک میں جلوہ گر ہے، اس کے قریب پھولوں کی ملکہ ہے جسے نسیم کا ایک جھونکا اپنی آغوش میں لینا چاہتا ہے۔

بہار کی یہ تمثیل جن جذبات و معانی کی حامل ہے وہ ظاہر ہیں، لیکن اس بات کی تصریح کی ضرورت ہے کہ مصور کو اس تمثیل کے اجزا یونانی صنمیات کے سرمایہ سے بہم پہنچے۔ پندرھویں صدی میں اٹلی کے مصوروں کا رجحان انسانی حسن کی تشکیل کی طرف تھا۔ پاپائے روم اور دوسرے مذہبی اکابر کا اثر ایک حد تک زائل ہو رہا تھا۔ اور جو مصور اپنی زندگیاں گرجاؤں کی آرائش کے لئے وقف کر چکے تھے وہ بھی جب موقع ملتا تھا زہد و اتقا کو سلام کہہ کر اپنی حسن پرستی کی حس کی تسکین کا سامان ڈھونڈھتے تھے۔ مشہور مصور لیپولپی کا شمار بھی اس زمرہ میں تھا۔ پیشِ نظر تصویر اس کے شاگردِ رشید سینڈرو بوٹیچلی کے کمالِ فن کا نمونہ ہے۔

بوٹیچلی کی تصویروں میں رہبانیت اور نفس کشی کی تعلیم کے اثرات تقریباً مفقود ہیں۔ وہ انسانی حسن کو اس کی تمام رعنائیوں، شوخیوں اور زلف فریبیوں کے ساتھ پیش کرتا ہے، اور اس معاملہ میں مذہب اور رسوم کی قیود کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ جیسا اس تصویر سے ظاہر ہے۔ یونانی صنم پرستی نے مسیحی رہبانیت کو آرٹ کے میدان میں شکستِ فاش دے دی تھی۔ یہ تصویر جو ترکوں کی فتحِ قسطنطنیہ (۱۴۵۳) کے پچیس سال بعد کھینچی گئی تھی اس حیرت انگیز انقلاب کا پتہ دیتی ہے جو مسیحی دنیا کے خیالات میں واقع ہوا تھا۔ یونانی ادب کا مرکز قسطنطنیہ سے ہٹ کر اٹلی میں منتقل ہو گیا۔ یونانی حسن پرستی اٹلی میں سرایت کر گئی، اور ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا!

عطاءاللہ کلیم

خواب و خیال

یہ افسانہ ڈنمارک کے ایک مشہور مصنف گستاف وائیڈ کے بہترین افسانوں میں سے ہے۔ اگرچہ بظاہر اس کی ظرافت غم آمیز معلوم نہیں ہوتی لیکن اس کی تہ میں وہ زندگی کے متعلق ایک تلخ اور قنوطی نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔ اس کی یہ شاعرانہ کہانی ایک لطیف طنز ہے۔

وہ ایک کواڑے کے نیچے بیٹھ گئے۔ شام نہایت خوشگوار تھی اور ان کے سروں کے اوپر پھل اور پھولوں سے لدی ہوئی بیلوں نے سایہ کر رکھا تھا۔ اُن کی پشت پر ایک صاف اور ہموار پتھر زرد زرد مٹی سے نکل کر ایک قد آدم تک بلند ہو گیا تھا، اور لکڑی کا ایک موسم زدہ تختہ، غالباً کسی پرانی گاڑی کی نشست جس کا رنگ دھوپ سے اُڑ چکا تھا انہیں بینچ کا کام دے رہا تھا۔ بیلوں کی جھلملیوں میں سے نیچے سمندر تک پھیلتا ہوا سبزہ اور سمندر، وسیع نیلا سمندر، لہریں مارتا ہوا، اور لہریں ساحل کے سنگریزوں میں سرسراتی ہوئی سب کچھ انہیں دکھائی دے رہا تھا۔

دن کے شور اور ہنگامے سے دور خاموشی اور تنہائی میں وہ بیٹھے تھے۔ ساحل پر سیر کرتے ہوئے وہ یہاں آ پہنچے تھے اور کچھ دیر کے لئے بیٹھ گئے تھے۔ مرد بولا

"ہاں، یہ جگہ ہے جہاں ہمارا مکان بننا چاہیئے! مکان کی دیواریں آسمانی برف کی طرح سفید ہونی چاہئیں، اور چھت چھپر کی بنی ہوئی ہو، اور گلاب اور عشق پیچاں کی بیلیں دروازوں اور کھڑکیوں سے لپٹی ہوئی ہوں"

عورت نے کہا "ہاں، اور کھڑکیوں میں پرانی وضع کے سبز شیشے لگے ہوئے ہوں، اور دروازے کے اوپر دیوار کے ساتھ ہم جنگل کے سب سے بڑے ہرن کے سینگ لگا دیں گے، اور ابابیلیں ہماری چھتوں میں اپنے گھونسلے بنائیں گی اور سارس بھی گرمیوں میں چھت کے اوپر کی پیال میں رہا کریں گے"

مرد نے کہا "لیکن سارس یہاں کیسے رہیں گے۔ ان کی غذا کا تو یہاں کچھ سامان ہی نہیں۔ نہ یہاں میدان ہیں اور نہ دلدلیں"

عورت فیصلہ کن انداز میں بولی "کچھ بھی ہو سارس یہاں ضرور ہونے چاہئیں۔ میں انہیں ہر روز شام کے وقت اڑتے ہوئے اپنے گھونسلے میں آتے دیکھنا چاہتی ہوں، اور ان کے بچوں کی طرف دیکھ دیکھ کر جب وہ اپنی لمبی لمبی پتلی پتلی ٹانگوں پر ناچیں گے، اور اپنے پر پھڑپھڑائیں گے اور جب یوں معلوم ہوگا کہ وہ صحن میں منہ کے بل اب گرے کہ گرے، خوب ہنسنا چاہتی ہوں"

مرد نے عورت کے ننھے سے سفید ہاتھ کو چومتے ہوئے کہا "اچھا تو ہم ایک سارس رکھ ہی لیں گے۔ لیکن بچے نہیں؛ ان پر بہت زیادہ خرچ آ جائیگا ہم ایک بڑا سا سبز طوطا بھی پال لیں گے، اور اس کا پنجرہ کھانے کے کمرے میں رکھ دیں گے اور جب ہم چائے پینے کے لئے کمرے میں جایا کریں گے تو وہ ہمیں کہا کرے گا "اماں جان آداب!"

عورت نے اپنے سر کو ہلاتے ہوئے کہا "ہاں طوطا ضرور۔ لیکن ایک ننھا سا بچہ بھی ہونا چاہیئے!"

مرد نے مسکراتے ہوئے اور اس کے بالوں کو چھیڑتے ہوئے کہا "لیکن ہو نا ضرور چھوٹا سا چاہیئے"

عورت نے کہا "ہا۔ا۔ں! بالکل ننھا سا۔ بس اتنا سا" اور اُس نے اپنی انگلی سے اس کا قد بتایا۔

مرد نے عورت کا منہ چوم کر کہا "کھانے کے کمرے میں دیواروں کا رنگ سبز ہونا چاہیئے اور الماری میں عجیب عجیب قسم کے برتن اور طشتریاں، اور کرسیاں بھی سبز رنگ کی لکڑی کی پشتوں والی، جن پر پھول پتے بنے ہوں اور ایک کونے میں ایک سبز رنگ کی میز پر قدیم وضع کی چاندی کی چاےدانی اور پیالیاں رکھی ہوئی ہوں"

عورت بولی "اور ایک سبز رنگ کا بڑا سا کلاک جس پر نقش و نگار بنے ہوں"

مرد نے کہا "ہاں کلاک، اور آدم اور حوا کے ہبوط کی ایک تصویر اور فرعون کی دریائے نیل میں غرق ہونے کی"

عورت نے پوچھا "مگر نشست کا کمرہ کیسا ہوگا؟"

"نشست کا کمرہ؟ اس کی تین کھڑکیاں ہونی چاہئیں، جہاں سے نظر

درختوں کی چوٹیوں کو عبور کرتی ہوئی سمندر تک جا پہنچے۔"

"لیکن اس طرح تو صبح سے دوپہر تک کمرہ دھوپ سے بھرا رہے گا۔"

"نہیں، کھڑکیوں کے آگے چھجے لگے ہوں گے اور اُن پر خوشبودار پھولوں سے لدی ہوئی بیلیں چڑھی ہوئی ہوں گی، اس لئے دھوپ اندر نہیں آ سکے گی بلکہ چند سنہری کرنیں فرش اور کمرے کے ساز و سامان پر آ کر پڑا کریں گی۔ کمرے کے درمیان ایک بیضوی شکل کی آبنوسی میز ہوگی جس کے پائے شیر کے پنجوں کی طرح بھاری بھاری ہوں گے اور نیچی نیچی نرم نرم کرسیاں، اور کونے میں گول کمرے کے قریب ایک شاندار پیانو رکھا ہوگا۔ درمیانی میز پر ایک بہت بڑے تھال میں چوڑے چوڑے پتوں والی پام کا گملا بہار دے رہا ہوگا۔"

"مگر میرے سینے کی میز کہاں رکھی جائے گی؟"

"تمہارے سینے کی میز؟ درمیانی کھڑکی میں، جس کے شیشوں پر خوبصورت نقوش اور زریں اقوال گہرے نیلے، ہلکے سرخ اور پیلے انگوری رنگ میں لکھے ہوئے ہوں گے۔ کھڑکی میں سنبل اور عشق پیچاں کی بیلیں ہوں گی اور کانچ کے لمبے لمبے نازک گلدانوں میں سے نرگس کے سفید سفید پھول تمہیں دیکھ دیکھ کر مسکرائیں گے اور شیشے کے ایک بڑے سے برتن میں سنہری مچھلیاں تمہارے ہاتھ سے روٹی کے ریزے لے لے کر کھائیں گی۔۔۔ اور ہاں، کبوتر بھی ہونے چاہئیں! ـــ برف کی طرح سفید اور سمندر کی طرح نیلے اور زنگار کی طرح بھورے کبوتر۔ جب تم برآمدے کی سیڑھیوں پر گلاب اور عشق پیچاں کی بیلوں کے نیچے کھڑی ہوگی تو وہ تمہارے سر کے گرد چکر کھائیں گے ۔۔ وہ تمہارے سر پر اور کبھی کندھوں پر اور کبھی ہاتھوں پر آ کر بیٹھ جائیں گے ۔۔ اور تمہارے ہاتھ میں سے یا تمہارے لبوں میں سے دانے لے لے کر کھائیں گے۔ اور تم سفید رات کے لباس میں ملبوس، آدھی بانہوں والی قمیص اور زردی مائل ہرے جرابیں اور بالوں میں موتیوں کا ایک نازک سا ہار پہنے ان کا تماشا دیکھ رہی ہوگی۔"

عورت نے اپنی بانہیں مرد کے گلے میں ڈال دیں اور خوشی سے مسکراتے ہوئے اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔ پھر کہنے لگی "اور خلوت کا کمرہ کیسا ہو؟ اور تمہارے مطالعے کا کمرہ کیسا؟"

مرد نے جواب دیا "خلوت کے کمرے کا رُخ مشرق کی طرف ہونا چاہیے اور اس کی کھڑکی کے باہر اخروٹ کا ایک بہت بڑا درخت ہونا چاہیے۔ اتنا بڑا جتنے لبنان کے ہزار ہزار سال کے بلوط ہیں، اور اس درخت کے نیچے نرم نرم سبز سبز گھاس ہو، اور اس پر بید مجنوں کی شاخوں کو خم دے کر بنائی ہوئی کرسیاں اور میزیں، اور پاس ہی ہمارے مہمانوں کے لئے ٹینس کا انتظام ہو ـــ اور ایک تپائی پر ایک دو فٹ لمبی دُوربین ہو تاکہ ہم سمندر میں سے جہازوں کو آتے جاتے دیکھ سکیں۔"

"لیکن خلوت کے کمرے کا فرنیچر کیسا ہوگا؟"

مرد نے کہا "یہ تم خود ہی فیصلہ کر لو، کیونکہ یہ تمہارا کمرہ ہوگا۔"

عورت نے کہا "نہیں، یہ تمہیں تجویز کرو۔"

وہ سر کی جنبش سے اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے بولا "سفید، ہاں سفید میز کرسیاں، جن کی نازک ٹانگوں پر نفیس سنہری کام بنا ہوا ہو، اور ان کے بازو اور نشستیں ریشم کی ہوں، ایسا ریشم جس کی زردی مائل نیلی زمین پر بڑے بڑے پھول کڑھے ہوئے ہوں، اور چھوٹے سونے کی گول سروں والی کیلوں سے اس کو جڑا گیا ہو۔ دیواریں سب منقش چرمی کاغذ سے ڈھنپی ہوئی ہونگی۔ سنہری کاغذ سے، اور پردے وغیرہ بھی ریشمی اور اسی رنگ کے ہونگے جس رنگ کا فرنیچر ہوگا۔ درمیانی میز بیضوی شکل کی ہوگی اور اس کی سطح پر بیل بوٹے کندہ کئے ہوں گے۔ کناروں پر ملمع ہوگا اور میز کے اوپر ایک عظیم الشان جھاڑ لٹک رہا ہوگا جس میں بلور اور موتی لگے ہوں گے اور وہ ستاروں کی طرح چمکیں گے۔"

"اور آتشدان؟"

"نہیں آتشدان کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہم صرف بہار اور گرمیوں کا موسم یہاں گزارا کریں گے اور خزاں اور جاڑے میں ہم کسی اور صحت افزا مقام پر چلے جایا کریں گے۔"

عورت بولی "تو بس اب صرف تمہارے مطالعے کا کمرہ رہ گیا اور سونے کا کمرہ۔"

"میرا کمرہ مکان کے مغربی کونے میں ہوگا۔ جہاں سے میلوں تک پہاڑیوں، وادیوں، جنگلوں اور جھیلوں کو شفقِ شام کی سرخی میں نہائے ہوئے میں دیکھا کروں گا۔ اس میں ایک ہی بہت بڑی سی گوتھک طرز کی کھڑکی ہوگی جس کے سامنے ایک بھاری پردہ لٹک رہا ہوگا۔ کمرے میں بھیڑیوں اور ریچھوں کی کھالیں بچھی ہوئی ہونگی اور یہ بلوط کی لکڑی کے متین اور باوقار ساز و سامان سے آراستہ ہوگا۔ پردوں پر چمکتے ہوئے زرہ بکتر میں ملبوس بہادرانِ قوم کی تصویریں ہوں گی اور دیواروں کے ساتھ تلواریں بندوقیں اور ڈھالیں لٹک رہی ہوں گی۔ اِن چیزوں کے علاوہ اس کمرے میں ایک چور دروازہ بھی ہونا چاہیے کہ جب چاہو ایک بٹن دباؤ اور کتابوں کی الماری آگے سے

ہٹ جائے "

عورت نے کانپتے ہوئے کہا " اوہ ——— مگر یہ دروازہ کس طرف کھلے گا ؟"

" نیچے ایک سرنگ کی طرف ۔ جو تمہارے کمرے کو جائے ، جہاں تم لیٹی ہوئی ہوگی ۔ تم لیٹی ہوئی انتظار کر رہی ہوگی ، اور صرف ایک چھوٹا سا لیمپ تمہارے سرہانے کی طرف سنگِ مرمر کی میز پر جل رہا ہوگا اور تم باہر اندھیرے میں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہوگی ۔ تم دیر تک کوئی کتاب پڑھتی رہی ہوگی لیکن اب وہ کتاب تمہارے سامنے بستر کی سفید چادر پر پڑی ہوگی ، اور تم نے اپنی دونوں باہوں سے اپنا سر تکیے سے ذرا بلند کر رکھا ہوگا ، اور تمہارے سیاہ بالوں نے تمہارے چہرے کے گرداگرد ایک حالہ سا بنا رکھا ہوگا ۔ تم میرے پاؤں کی آہٹ پر کان دھرے اپنی بڑی بڑی خوابگیں آنکھوں سے باہر کی طرف دیکھ رہی ہوگی ۔ پھر تم چور دروازے کے کھلنے کی آواز سنو گی ، اور مسکراتی ہوئی اپنی کہنی کا سہارا لیے ذرا اٹھ کر پھر اُس کھٹکے پر کان لگاؤ گی ۔ تمہیں میرے دبے پاؤں چلنے کی آواز قریب سے قریب تر آتی ہوئی سنائی دیگی ۔ جلدی سے تم کتاب میز پر رکھ دو گی اور سرہانے پر سر رکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لو گی ۔ آہستہ سے ایک دروازہ کھلے گا ، تمہارے چہرے پر کوئی اپنا چہرہ جُھکا دے گا ، اور ایک چیخ سنائی دے گی ، مسرت آمیز چیخ ، اور تم اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال دو گی اور مجھے اپنی طرف کھینچکر پیار کرو گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

سو کچھ اس طرح بیٹھے وہ خیال آرائیاں کر رہے تھے ، بہار کی ایک خوشگوار شام تھی اور بیل اور پھولوں سے لدی ہوئی بیلوں نے ان پر سایہ کر رکھا تھا ، اور ان کی نگاہیں جھومتے ہوئے سرسبز درختوں اور سمندر کی ان موجوں کے ساتھ کھیل رہی تھیں جو ایک سرسراہٹ کے ساتھ آ آ کر ساحل سے ٹکراتی تھیں +

جب سورج مغربی پہاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا اور اوس پڑنی شروع ہوئی تو مرد اپنی جگہ سے اٹھا اور کہنے لگا " میرا خیال ہے کہ اب گھر چلنا چاہیئے تمہاری اماں چائے کے لئے ہمارا انتظار کر رہی ہونگی "

وہ خاموش تھے اور ایک عجیب سی تکان ان کے دلوں پر طاری تھی ۔ آہستہ آہستہ وہ جنگل میں چلنے لگے ۔ ریلوے سٹیشن کی طرف ۔

یکایک عورت بولی " میرا تو جی چاہتا ہے کہ ہم یہیں کھانا کھائیں !"

مرد نے ذرا مضطربانہ اس کی طرف اپنا سر گھما کر کہا " لیکن پیاری تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

عورت نے جلدی سے جواب دیا " ہاں ہاں ، میں نے تو یونہی بے سوچے سمجھے کہہ دیا تھا ۔ ہم پہلے ہی آج بہت خرچ کر چکے ہیں "

اب پھر وہ پہلے کی طرح خاموش ہو گئے ۔

جب وہ سٹیشن کی اُس کھڑکی کے سامنے کھڑا ہوا جہاں ٹکٹیں ملتی ہیں تو وہ ذرا گھبرا سا گیا ۔ پھر عورت کی طرف منہ پھیر کر اس نے کہا " میرا خیال ہے کہ ہم تیسرے درجے میں بیٹھ جائیں +

عورت نے پُرجوش لہجے میں کہا " ہاں ہاں ، ٹھیک ہے اس وقت تو گاڑی میں کچھ زیادہ بھیڑ نہیں ہوتی ، اور اس طرح ایک روپیہ بھی بچ رہیگا "

منصور احمد

غریبی میں امیری کی کہانی ——— شکستہ تارِ سازِ مُطرباں ہے
تہیدستی میں مفلس کی جوانی ——— شبِ سرما میں ماہِ ضوفشاں ہے
ضعیفی میں جوانی کی امنگیں ——— چراغِ صبحِ صادق کا دھواں ہے

" شمعِ رُخ "
از ہوشیارپور

غزل

جب سے آنکھیں فائزِ انوارِ جاناں ہوگئیں
سرمدی جلووں کی شمعیں دِل میں تاباں ہوگئیں

اب کسی کی جستجوئیں فرض ہیں، تازیست فرض
اب کسی کی آرزوئیں دینِ وایماں ہوگئیں

کیا کہوں، کیوں وحشتیں اکدم ترقی کر گئیں
کیا کہوں، کیوں حسرتیں یک لخت عریاں ہوگئیں

کیا خبر، کیونکر وہ آنکھیں دِل کو گھائل کر سکیں
کیا خبر، کیونکر وہ نظریں تیر و پیکاں ہوگئیں

ظلمتیں سی ظلمتیں حدِ نظر تک چھٹ پڑیں
طلعتیں سی طلعتیں آنکھوں سے پنہاں ہوگئیں

حیف تدبیراتِ رفعِ دردیوں بیکار جائیں
حیف تاثیراتِ گرم و سرد یکساں ہوگئیں

لو وہ اُس مہ رُو نے قصدِ جلوہ آرائی کیا
لو وہ غیبی طلعتیں انوار افشاں ہوگئیں

لو وہ اُس گلرُو نے عزمِ رنگ پیرائی کیا
لو وہ فطری زینتیں الوانِ در الواں ہوگئیں

پھر کوئی خورشید رُو بالائے مہتابی چلا
پھر مہ و اختر کی قندیلیں فروزاں ہوگئیں

پھر کوئی رشکِ چمن سیرِ گلستاں کو اُٹھا
پھر گلستاں کی بہاریں گل بداماں ہوگئیں

اے خدا کی شان، آخر تیری کافر کیشیاں
اصلِ ہر دیں بن گئیں، عینِ ہر ایماں ہوگئیں

اے ترے قربان، آخر تیری کفر اندیشیاں
جانِ ہر دل بن گئیں، جانانِ ہر جاں ہوگئیں

تھیں، کبھی صبر و سکوں پر قدرتیں ہمکو بھی تھیں
لیکن اب نذرِ نگاہِ نازِ جاناں ہوگئیں

تھیں، کبھی عیش و طرب کی فرصتیں ہمکو بھی تھیں
لیکن اب اسبابِ رنج و یاس و حرماں ہوگئیں

ایک میں کیا، ساری دُنیا اُن اداؤں کے نثار
جو مجھے دنیا سے کھو کر اور نازاں ہوگئیں

چارہ سازِ زخمِ دِل، درمانِ زخم اچھا کیا
زخم کی سب لذتیں مجروحِ درماں ہوگئیں

آہ کیا کیا جستجوئیں رائگاں ثابت ہوئیں
آہ! کیا کیا آرزوئیں صرفِ حرماں ہوگئیں

حضرتِ آزادؔ صرف اُس کے کرم کی دیر تھی
عمر بھر کی مشکلیں دم بھر میں آساں ہوگئیں

حکیم آزادؔ انصاری

موسیقی اور اُس کے اثرات

حُسن اور نغمے کا تجزیہ

"انسان فطرتاً حُسن پرست واقع ہوا ہے" ! یہ ایک ایسی ناقابلِ انکار حقیقت ہے جس کا کسی طرح بھی ابطال نہیں کیا جا سکتا۔ تمدن و تہذیب کے تمام فلک بوس محلوں کی تشکیل و تعمیر کی علتِ غائی انسان کا یہی جذبہ حُسن پرستی ہے۔ اگر قدرت انسان کے دل کو حسن پرستی کی سرمدی دولت سے مالا مال نہ کرتی تو پھر مدنیت و عمرانیت کے یہ "نیم ربانی آثار" جو ان دنوں دنیا کے چپے چپے پر پائے جاتے ہیں، ان کا سرے سے وجود ہی نہ ہوتا۔ اور اگر خدانخواستہ انسان کے دل و دماغ سے "حسن پرستی" کا جذبہ فنا ہو جائے تو یقین جانیئے کہ دنیا کی ہر ہنگامہ آرائی پر عالمِ سکرات طاری ہو جائے۔ تمدن و تہذیب کا ہر فانوس گل ہو جائے اور نشو و ارتقا کی بجائے "رجعتِ قہقری" کا ایک ایسا سیلاب رونما ہو جو ترقیوں کی تمام کائنات کو بہا کر لے جائے۔ یہ شاعرانہ مبالغہ نہیں ہے، کسی افسانہ کا ٹکڑا نہیں ہے بلکہ حقایق و بصائر ہیں، اسرار و معارف ہیں اور وہ چیزیں ہیں جو اپنے اندر صداقت ہی صداقت رکھتی ہیں +

انسان کی ابتدائی زندگی پر ایک اُچٹتی ہوئی نظر ڈال جائیے۔ خدا کی پیدا کی ہوئی فراخ و وسیع زمین پر ایک مقام بھی آپ کو ایسا نہیں مل سکتا جہاں دو چار ہزار انسان اجتماعی طور پر آباد ہوں۔ لق و دق صحراؤں میں وحشیوں کی طرح انسان بھر رہے ہیں۔ نباتات اُن کی غذا ہے۔ درختوں کی چھال ان کا لباس ہے، بدصورت اور تکلیف دہ جھونپڑے ان کے مکان ہیں۔ آج اس جھونپڑے میں آباد تھے، کل دوسری جگہ کا کوچ کر دیا، اور وہاں بھی پہلے کی طرح دو چار ترچھے اور اونچے بانس وغیرہ نصب کر کے ان پر درختوں کے پتے اور چھال بچھالی۔ "قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا" کے نظریہ کے ماتحت اُن کی معاشرت کا بھی آپ آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہیں، کہ اِس "نیم شعوری" حالت میں معاشرت کے طریق و آداب کس درجہ قابلِ مضحکہ ہوں گے۔ موجودہ زمانہ میں تو ان کے تصوّر سے بھی جبینِ انسانیت عرق عرق ہو جاتی ہے +

قدرت کو منظور نہیں تھا کہ اشرف المخلوقات حضیضِ مذلت اور قعرِ نکبت میں پڑا رہے۔ وہ پہلے ہی حُسن پرستی کو انسان کے خمیر کا جزوِ اعظم بنا چکی تھی لہذا اسی قانونِ قدرت اور ضابطۂ فطرت کے ماتحت انسان نے ترقی کی منزلوں کو قطع کرنا شروع کیا۔ اور حُسن کا آفتاب جب اس کے شعور و ادراک کی دنیا پر چمکا تو اس کی روح چونک اٹھی اس کا ضمیر بیدار ہو گیا۔ اس نے جھونپڑوں کی بجائے اچھے مکان بنائے۔ درختوں کی چھال کی بجائے جانوروں کی کھالوں سے اپنا لباس تیار کیا۔ اور اسی طرح تمدن و معاشرت کے دوسرے شعبوں میں "نشو و ارتقا" کی کارفرمائی ہونے لگی +

یہ ترقی کیوں ہوئی؟ انسان کی اس ذہنیت کی تبدیلی کا باعث کیا ہے؟ ایک ہی نوعیت کے یہ دو سوال ہیں جو اس ضمن میں کئے جا سکتے ہیں۔ ان سوالات کا جواب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ جذبہ حسن پرستی کی بدولت انسان کو اپنی ترقی کا خیال ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ درختوں کی چھال بدن پر بدنما معلوم ہوتی ہے۔ لہذا اس نے جانوروں کی کھال کا لباس بنا ڈالا۔ اس کی آنکھ کو اینڈے بینڈے جھونپڑے بھلے معلوم نہیں ہوتے لہذا اس نے ایسے مکانات تعمیر کئے جو نگاہوں کو بھلے آئیں اسی طرح آگے بڑھتے بڑھتے انسان نے بہترین لباس ایجاد کئے، نظر نواز عمارتیں بنائیں، خوشنما شہر تیار کئے، غرض ہر وہ سامان مہیا کیا جو "ذوقِ حُسن پرستی" کو تسکین بخش سکے۔ ترقی کا یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ کس منزل پر جا کر یہ کارواں ٹھہرے گا اور اُس وقت دنیا کی تزئین و آرائش کی کیا حالت ہو گی؟

حُسن کی عمومیت

مندرجہ بالا جواب کے ضمن میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے اور ایک

معترض آسانی سے یہ اعتراض پیش کر سکتا ہے کہ انسان نے اپنی آسائش و راحت کے لئے یہ سامان مہیا کئے اور ایجادیں کیں۔ یہ اعتراض بنی حقیقت کے اعتبار سے بڑا وزنی ہے۔ بیشک انسان نے اپنے آرام و راحت کی خاطر طرح طرح کی ایجادیں کیں اور اپنے جسمانی اور روحانی حظ و کیف کے لئے بہت سے گھروندے بنا بنا کر بگاڑ دیئے اور ہر تجربہ کے بعد ایک ایسی تعمیر کی جو آسائشِ حیات کے لئے خاطر خواہ گنجائش اپنے اندر رکھتی ہو۔ لیکن ان تمام دعاوی اور اعتراضات کو تسلیم کرنے کے بعد مجھے پھر یہی کہنا پڑتا ہے کہ انسان نے اس سلسلے میں جو اقدام بھی کیا وہ "جذبۂ حُسن پرستی" کے ماتحت کیا، اور اس قسم کے تمام اعتراضات فی نفسہٖ میرے دعویٰ کی تائید کرتے ہیں +

سطحی نظر رکھنے والے جو حُسن کو ایک محدود چیز سمجھتے ہیں، میرے اس دعویٰ پر متحیر ہوں گے، لیکن اگر قلب و ضمیر کی صلاحیتیں مفقود نہیں ہو گئی ہیں اور حقائق کی گہرائیوں میں نگاہ اترتی ہے تو پھر حیرت و استعجاب کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ سمجھیے اور ذرا غور سے سمجھیے، تدبر و تفکر سے کام لیجئے اور حقیقتِ حُسن پر ایک گہری نظر ڈال جائیے +

حُسن صرف ظاہری زیبائش و زینت کا نام نہیں ہے۔ دمکتے ہوئے تاروں اور کھلے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر اگر آپ نے یہ سمجھ لیا کہ آپ عالمِ حُسن کی سیر کر چکے تو آپ نے فی الحقیقت غلطی کی، اور آپ کے ضمیر نے آپ کو دھوکا دیا۔ آپ نے واقعی حُسن کی تابشوں کا مشاہدہ کیا اور دنیا کی ہر شے میں ان ہی تابشوں کو آپ مختلف صورتوں میں جلوہ گر پاتے ہیں، لیکن آپ کے یہ تمام مشاہدات ناقص ہیں اگر آپ کی نظر صرف ظاہری اور خارجی مناظر سے ٹکرا کر اپنی قوت ختم کر چکی ہے اور آپ نے حُسن کے "فلسفۂ لامحدودیت" اور اس کی جہانگیر کیفیت کو نہیں سمجھا۔ اگر بدقسمتی سے ایسا ہے تو پھر نظر کو بلند بنانے کے لئے اگر پہلے یہ بات آپ نے نہیں سمجھی تو اب سمجھیے:۔

دنیا کی ہر آسائش اپنے اندر ایک حُسن رکھتی ہے۔ دنیا کا ہر حظ حُسن سے عبارت ہے۔ دنیا کا ہر آرام حسن کا پرتو ہے۔ حیاتِ انسانی کی ہر نشاط انگیزی حسن کی جھلک ہے۔ فلسفے کی زبان میں جن کیفیات کا نام "حظ و کرب" ہے، وہ دراصل "حُسن و تاریکی (عدمِ حسن)" کے مترادف الفاظ ہیں۔ گلاب کے پھول کو دیکھ کر آپ خوش ہو جاتے ہیں اور جی میں آتا ہے کہ گھنٹوں اس کی تر و تازگی کو دیکھا کریں۔ بات یہ ہے کہ گلاب کا حسن آپ کے دل کی رگوں میں ایک قسم کی گدگدی پیدا کرتا ہے جس کا نام "حظ" ہے اور آپ محظوظ ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کسی گلی میں غلاظت کے انبار پر آپ کی نظر پڑ جاتی ہے تو آپ کی پیشانی کی تمام لکیریں سمٹ کر رہ جاتی ہیں۔ آپ کے دل کی رگیں سکڑنے لگتی ہیں اور بجائے حظ کے آپ "کرب" محسوس کرتے ہیں۔ کس لئے؟ اس لئے کہ آپ نے اس انبار میں حسن کی بجائے وہ چیز دیکھی جو حُسن کی ضد ہے، اور یہ قاعدۂ کلیہ ہے کہ دنیا کی جس شے میں بھی "عدمِ حُسن" کی کارفرمائی نظر آتی ہے اس کا مشاہدہ انسان کے لئے باعثِ تکلیف ہوتا ہے۔ لہٰذا غلیظ و کثیف جھونپڑوں کی بجائے انسانوں کو خوبصورت اور خوشنما مکانات بنانے کی فکر ہوئی تو اس کا باعث واقعی آسائشِ حیات اور حظِ نفس ہے، لیکن اوپر اس بات کو ثابت کیا جا چکا ہے کہ "حظ و آسائش" کیفیاتِ حُسن ہی کے نام ہیں +

ابتدائی زندگی کا پہلا دور گذرنے کے بعد انسان نے محسوس کیا کہ اس کے ہر کام میں ابتری اور انتشار ہے اور اس کی زندگی کا ہر رخ "حُسن" سے خالی ہے۔ لہٰذا اس کی روح نے ایک قسم کا کرب محسوس کیا اور اکتسابِ حظ کی خاطر اس نے اپنے کو منظم کیا۔ ہر چیز میں سلیقہ اور ترتیب پیدا کی۔ معاشرتی برہمی اور سماجی انتشار کو دور کرنے کے لئے انسان نے تقسیمِ کار کے اصول مدون کئے، دفاتر بنائے، انجمنیں قائم کیں، سوسائٹیوں کی داغ بیل ڈالی۔ رزم و بزم، سفر و حضر، سونے جاگنے، بیٹھنے اٹھنے غرض حیات کے ہر شعبے میں حُسنِ تنظیم پیدا کرنے کے لئے اس نے مختلف النوع ایجادات کیں تاکہ دل، نگاہ، روح اور ضمیر سب کے ذوقِ حسن پرستی کی تکمیل ہو چکے +

ہر غبی سے غبی اور کودن سے کودن اس بات کو سمجھتا ہے کہ روح بہت ہی لطیف و نظیف شے ہے، لہٰذا اس کو متکیف بنانے کے لئے لطیف و نفیس موثرات کی زیادہ ضرورت ہے۔ ناممکن ہے کہ انسان نے جس کا خمیر "جذبۂ حُسن پرستی" سے عبارت ہے، احتظاظِ روح کے لئے مؤثرات تلاش نہ کئے ہوں۔ جو ہستی صرف نگاہوں کو محظوظ کرنے کے لئے ایجادات کے طومار لگا سکتی ہے، روح کو مسرور و محظوظ بنانے کے لئے وہ جو کچھ بھی کرے تھوڑا ہے۔ پس اس سلسلے میں انسان نے "موسیقی" ایجاد کی +

موسیقی کی تاریخ

موسیقی کی ایجاد کب ظہور پذیر ہوئی؟ مجھ سے موسیقی کے ایک باکمال اُستاد نے کہا تھا کہ حضرتِ نوح علیہ السلام کی کشتی جب طوفان میں سوار ہوئی تھی تو ہواؤں اور موجوں کے تصادم سے جو نغمہ پیدا ہوتا تھا اسی کا نام مالکوس راگ ہے۔ اسی طرح شخصِ مذکور نے دوسرے راگوں کی تاریخ بھی بیان کی تھی غالباً نہیں بلکہ یقیناً تاریخ ان دعاوی کی تصدیق سے عاجز ہے اور اگر کوئی شخص

اس قسم کی چیزیں پیش کرے تو ان کا نہ تو بطلان کیا جا سکتا ہے اور نہ تصدیق !
مجھے ذاتی طور پر صاحبِ مذکور کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے کہ اُس وقت جبکہ قہرِ الٰہی کا طوفان انسانی آبادی کو تباہ و برباد کر رہا تھا، روحیں بے تاب تھیں، دل مضطر تھے، خشیتِ الٰہی سے ضمیر کانپ رہے تھے، خوفِ خداوندی سے جسم کا رواں رواں لرز رہا تھا تو حضرتِ انسان کو "نغمے" کی سوجھ رہی تھی - میں نے یہ رائے صرف مذہبی عقائد کی بنا پر [illegible] نہیں کی بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بات فطرتِ انسانی کے خلاف ہے - انسان کے قلب پر ایک ہی وقت میں دو کیفیات طاری نہیں ہو سکتیں - محال ہے کہ انسان کا دل خوف سے کانپ بھی رہا ہو، اس کی روح کسی کیف و حظ سے بھی متکیف ہو رہی ہو - جہاں تک کیفیات کا تعلق ہے ایک ہی وقت میں متضاد کیفیات کا طاری ہونا محالات سے ہے - لیکن ان تمام باتوں کے باوجود میں تو یہاں تک مانتا ہوں کہ انسان کے شعور و ادراک کو جب حُسن کے آفتاب نے منجلی اور منور بنایا اُسی وقت سے انسان کو روح کے لئے سامانِ کیف و انبساط پیدا کرنے کی دھن لگ گئی - جس طرح آنکھ حُسن کے لئے بے تاب اور بے چین رہتی ہے اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر روح بھی حُسن کے لئے مضطرب رہتی ہے اور وہ بھی حُسن کے چشمے سے اپنی پیاس بجھانا چاہتی ہے - پس انسان نے یقیناً "موسیقی" کے ذریعے روح کو محظوظ کیا - لہٰذا ہم جب انسان کے ابتدائی دورِ معاشرت کو تاریخ کے دھندلکے میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ غاروں اور جھاڑیوں اور سنسان جنگلوں میں جانوروں کی کھال انسان جسم پر چپیٹے ہوئے پھر رہا ہے - لیکن اس وحشیانہ حالت میں بھی اس کے لب مترنم ہیں اور اس کے نغموں سے جنگل کی فضا گونج رہی ہے - پس موسیقی کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ انسان کے ابتدائی عہد کی تاریخ ہے +

انسان کو "موسیقی" کس نے سکھائی ؟ اس کے جواب کے لئے میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں کہ انسان کو جب پہلی مرتبہ پیاس لگی تو اسے کس نے بتایا کہ "پانی" اس درد کی دوا ہے - جس چیز نے پانی کی طرف انسان کی رہنمائی کی اسی نے موسیقی کی ترغیب دی - اس چیز کا نام "وجدان" ہے جو انسان کی ہر وقت رہنمائی کرتا ہے اور انسان کے دل پر اسی کی بدولت قدرت ایسی ایسی غیر مرئی اور غیر محسوس باتوں کا القا کرتی ہے جو انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتیں - میں کوئی تصوف کی بات نہیں کہہ رہا، الٰہیات کا درس آپ کو نہیں دے رہا - بلکہ اس حقیقت سے آپ کی نگاہوں کو روشناس کرا رہا ہوں جس کا اعتراف روحانیین ہی نہیں بلکہ شدید سے شدید مادیین نے بھی کیا ہے +

موسیقی کا نشو و ارتقا

انسان کے ابتدائی دور کے رنگ اگر آج محفوظ ہوتے تو ان کو سن کر ممکن ہے کہ آپ بے اختیار قہقہہ لگا دیتے - لیکن "موسیقی" پر ہی کیا موقوف ہے اس زمانے کی جو چیز بھی آپ کے سامنے پیش کی جائے گی وہ آپ کے لئے ہنسی اور مضحکہ کا باعث ہوگی - دورِ حاضرہ کا کمسن بچہ جو آنِ واحد میں دیا سلائی کی اڑنے رگڑ سے آگ پیدا کر لیتا ہے یہ دیکھ کر یقیناً ہنسیگا کہ بڑے بڑے آدمی آگ کے شراروں کیلئے پتھروں کو رگڑ رہے ہیں اور ایک چنگاری کی خاطر خون پسینہ ایک کئے ڈالتے ہیں لیکن دنیا میں ترقی اسی طرح ہوتی چلی آئی ہے کسے خبر ہے کہ دورِ موجودہ کی وہ ایجادیں جن پر آج انسانیت کو ناز ہے، سو دو سو سال گذرنے کے بعد دنیا کی ترقی اس قدر منزلیں طے کرے کہ ان ایجادات کا اس زمانے کے لوگ مضحکہ اڑائیں اور ہمارے تمام مدنی اسباب اور عمرانی سامان ان کو مذاق معلوم ہوں - سائنس کی حیرت انگیز رفتارِ ترقی کو دیکھتے ہوئے یہ انقلاب کچھ مستبعد نہیں ہے ممکن ہے کہ آیندہ دور میں ہمارے موجودہ طیارے عجائب خانوں میں رکھے ہوئے ہوں اور ان کو دیکھ کر لوگ ہنس ہنس کر کہہ رہے ہوں کہ "گذشتہ تمدن کس قدر ناقص تھا" خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا - مقصد یہ ہے کہ دورِ گذشتہ میں موسیقی کی ترکیب اس زمانہ سے یقیناً مختلف ہوگی - لیکن "جذبۂ حسن پرستی" کی بدولت جہاں انسان نے دیگر شعبہ ہائے حیات میں ترقیاں کیں، وہاں "موسیقی" کو بھی ضرور ترقی دی اور اس میں بھی ایک خاص سلیقہ اور حسن پیدا کیا - پہلے دو پتھروں کو بجا کر ان کی آواز پر گایا جاتا تھا تو اب جانوروں کے سینگوں سے نغمہ پیدا کر کے مزے مزے کی تانیں اڑائی جانے لگیں - اسی طرح آگے چل کر اصوات کے زیر و بم کے امتزاج و تالیف سے راگ بنائے گئے اور ہوتے ہوتے "موسیقی" ایک مستقل فن بن گیا - "راگ" کو زیادہ منضبط اور دلکش بنانے کے لئے آلات و مزامیر کی ایجاد عمل میں آئی - دف، بربط، نفیری، چنگ، مردنگ، بانسری، الغوزہ وغیرہ کی ایجادات "فنِ موسیقی" ہی کی رہینِ منت ہیں +

حُسن اور نغمہ

اوپر کہا جا چکا ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان کے دل و دماغ اور روح و ضمیر کو متکیف بناتی ہے اپنے اندر "حُسن" رکھتی ہے - اور حسن ہی کی لطافت اور دلکشی احساسات میں گدگدی پیدا کرتی ہے - باصرہ، شامہ، لامسہ، سامعہ اور ذائقہ کی قوتوں کو جو چیز بھی منضبط اور مبتہج بناتی ہے وہ حُسن کا ہی ایک پرتو ہوتا ہے - "نغمہ" قوتِ سامعہ کو نوازتا ہے - "حسنِ موسیقی" کیلئے قوتِ سامعہ بے چین اور

مضطرب رہتی ہے اور جب کبھی یہ قوت "حسنِ موسیقی" کو محسوس ہوتی ہے تو دل نہیں روح محظوظ ہوتی ہے اور حظِ روح کے بعد انسان کے اعضا و جوارح کا سراپا کیف بن جانا ناگزیر ہے۔ لیکن "حسنِ موسیقی" کے ساتھ "حسنِ صورت" بھی اگر موجود ہو تو پھر "موسیقی" مکمل ہو جاتی ہے اور "موسیقی" کے مکمل ہو جانے کے بعد انسان پر جو کیفیات طاری ہوتی ہیں اس کی تشریح الفاظ کے ذریعے نہیں ہو سکتی۔ مختصر یہ ہے کہ سننے والا وجد کرنے لگتا ہے۔ ہر بُنِ مُو مجسمۂ سرور و انبساط بن جاتا ہے اور سامع کو محسوس ہوتا ہے کہ ذرہ ذرہ جھوم رہا ہے۔ پتہ پتہ محوِ رقص ہے۔ ہر طرف سے نغمہ کا طوفان اٹھ رہا ہے۔ آسمان سے نغمہ کی بارش ہو رہی ہے۔ پہاڑوں کی چٹانوں سے نغمہ کی نہریں جاری ہیں۔ زمین کی تہوں سے نغمے کے چشمے اُبل رہے ہیں۔ غرض اس کو ساری کائنات "مکمل نغمہ" نظر آتی ہے۔ لیکن یہ کب ہوتا ہے؟ عموماً ایسی صورت میں جبکہ حسنِ موسیقی اور حسنِ صورت دونوں موجود ہوں "حسنِ نغمہ" اور "حسنِ صورت" کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس فلسفے کی اجمالی تشریح بھی لگے ہاتھوں ملاحظہ فرما لیجیے۔ آپ ایک شخص کا گانا سُن رہے ہیں، جو شومیِ قسمت سے حسین نہیں ہے، لیکن موسیقی کا باکمال اُستاد ہے۔ یہ امر یقینی ہے کہ قوتِ سامعہ کو جب "حسنِ موسیقی" متاثر کرے گا تو آپ پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جائے گی۔ لہٰذا آپ اس کے گانے سے ضرور متاثر ہوں گے۔ لیکن اگر نغمہ ساز حُسن کا ایک پیکر، اور خوبصورتی کا مجسمہ ہے جب وہ کوئی راگ چھیڑتا ہے تو اس کے مترنم لبوں پر تبسم کی بجلیاں رقص کرنے لگتی ہیں، جب وہ زیادہ قوت کے ساتھ گاتا ہے تو اس کی شربتی آنکھوں کے ڈورے سرخ ہو جاتے ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ شرابِ ارغوان کے یہ روح نواز پیالے کوئی دم میں چھلکنے والے ہیں۔ ایسی صورت میں کیا آپ کے قلب پر وہی کیفیت طاری ہوگی جو ایک بدصورت مُغنی کا گانا سُن کر طاری ہوئی تھی۔ اگر آپ کے احساسات مفلوج نہیں ہو گئے ہیں تو پھر یقیناً ہر دو کیفیات میں آپ ضرور فرق محسوس کریں گے اس وقت اگر ایک نشتر آپ کے دل میں چبھا تھا تو اس وقت دو نشتر آپ کے دل و جگر میں ڈوب جانے چاہئیں۔ اسی نظریہ کے ماتحت، ماہرینِ موسیقی نے "حسنِ نغمہ" اور "حسنِ صورت" کو جزوِ مشترک کی حیثیت دی ہے۔ تاکہ حظِ روح اور انبساطِ قلب کے لئے مکمل سامان مہیا ہو سکیں اور "ذوقِ حُسن پرستی" کسی نہج اور کسی صورت سے بھی تشنہ نہ رہ جائے +

موسیقی اور ہندوستان

اگرچہ ستار وغیرہ مزامیر کی ایجاد مشاہیرِ یونان نے کی ہے لیکن "موسیقی" کو بحیثیت فن کے بھارت ورش میں ہی مدون کیا گیا۔ اس سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ دوسرے ممالک "موسیقی" سے بے بہرہ رہے، بلکہ غرض کہنے کی یہ ہے کہ ہندوستان میں "موسیقی" نے ایک مکمل "سائنس" کی حیثیت اختیار کی۔ دنیا کے دوسرے خطوں کے رہنے والوں کو اس فن کے اصولوں کی تدوین کی مہلت ہی نہ مل سکی اور نہ اُن کے یہاں وہ اسباب و مؤثرات موجود تھے۔ "موسیقی" اطمینان اور راحت چاہتی ہے و "حسنِ صورت" سے حظ اٹھانے کے لئے بھی اطمینانِ حیات ضروری ہے۔ "موسیقی" پر ہی کیا موقوف ہے، انسان اسی وقت ایجادات کر سکتا ہے جب اس کا [illegible] فارغ سکون پذیر ہو اور کائنات کے ہنگاموں سے ایک حد تک وہ بے نیاز ہو جائے۔ اُس وقت جبکہ یورپ میں کُشت و خون ہو رہا تھا، ایران کی زمین خون سے لالہ زار بنی ہوئی تھی، عرب میں خون کی ندیاں بہ رہی تھیں، یونان میں فتنہ و فساد برپا تھا، ہندوستان امن اور آسائش کا مرکز تھا، ہر طرف اطمینان کی کار فرمائی اور آسائش کی فراوانی تھی۔ لہٰذا اہلِ ہند کو "حسنِ موسیقی" اور "حسنِ صورت" سے مستفید ہونے کے بیش از بیش مواقع موجود تھے۔ اسی سبب سے اہلِ ہند کو "فنِ موسیقی" کی تدوین کیلئے کافی وقت ملا اور جن "راگوں" کی تشریح آگے جا کر کی جائے گی۔ ان کی ایجاد کا فخر اہلِ ہند ہی کو حاصل ہے۔ اس حقیقت سے ایک اور نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ "موسیقی" کے لئے اطمینانِ حیات کی بہت زیادہ ضرورت ہے ورنہ زندگی کی غیر اطمینان بخش حالت میں ہر نغمہ پریشان ہوگا، ہر ترنم منتشر ہوگا۔ ظاہر ہے کہ نغموں کی پریشانی اور ترنم کا انتشار "موسیقی" کی غیر منظم کیفیت کا نام ہے۔ جس کے سبب بجائے "بسط" کے "قبض" پیدا ہوگا جس کا نتیجہ معلوم!

لطافتِ حُسن

"نغمہ" دنیا کی لطیف ترین شے ہے۔ لطافت کا کمال یہ ہے کہ وہ کثافت کے بڑے سے بڑے حجاب سے گزر جائے۔ آپ کی نظر شیشہ کے ٹکڑے سے بلا تکلف گزر جاتی ہے ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لئے کہ آپ کی نظر لطیف ہے۔ اور لطافت کیلئے حجاب مانعِ گذر نہیں ہو سکتا۔ یہ امر مسلّمہ ہے کہ انسان اور حیوان (مطلق) جس طرح خواص کے اعتبار سے مختلف ہیں اسی طرح احساسات کے لحاظ سے وہ بھی متباعد اور مختلف ہیں۔ انسان کا شعور، ادراک، جذبہ اور احساس حیوان کے مقابلہ میں زیادہ لطیف ہیں۔ لطافتِ احساس کے باعث ہی تو انسان کو "اشرف المخلوقات" کے خطاب سے نوازا گیا ہے۔ حیوان، نباتات سے زیادہ اور نباتات، جمادات سے زیادہ حساس ہیں۔ اسی نوعیت سے اُن کے مراتب میں بھی فرق ہے۔ نسیمِ صبح جب چلتی ہے تو پتھر کی جامد رگوں کو محسوس تک نہیں ہوتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ لیکن سبزہ کھلنے لگتا ہے، حیواناتِ مطلق بھی ایک ناقص کیف محسوس کرنے لگتے ہیں، مگر انسان غیر معمولی طور پر متکیف ہو جاتا ہے، بہر حال مخلوقاتِ عالم، احساسات و مدرکات کے لحاظ سے

درجات رکھتی ہیں، کسی چیز کی قوتِ حاسہ زیادہ نازک اور لطیف ہے اور کسی چیز کی کم۔ بعض میں اس جوہرِ لطیف کا سرے سے فقدان ہے لیکن "لطافتِ حسن" کثافت کے تمام پردوں کو چاک کرنے کی قوت اپنے اندر رکھتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جوہرِ لطیف پر "لطافتِ حسن" زیادہ زوردار اثر مرتب کرے گی۔ لیکن جوہرِ کثیف اس کی زد سے بچ نہیں سکتا، لہٰذا "نغمۂ انسان" کو حیوان کے مقابلے میں زیادہ [illegible] اثر کرے گا۔ مگر حیوانات مطلق چونکہ احساسات رکھتے ہیں پس ان کا متاثر ہونا کچھ استبعاد انگیز نہیں ہے۔

ذیل میں جن راگوں کی تفصیل درج کی جاتی ہے ان میں آپ یہ چیز ملاحظہ کریں گے کہ کسی راگ کو سن کر ہرن رقص کر رہے ہیں۔ کسی راگ کے اثر سے مور ناچ رہے ہیں۔ کسی نغمہ پر سانپ لوٹ رہے ہیں۔ پس آپ کو ان مناظر کے مشاہدے سے متحیر نہیں ہونا چاہیئے، کیونکہ "حسنِ نغمہ" کی لطافت حیواناتِ مطلق کے احساسات کو متاثر کرنے کی بے پناہ قوت اپنے اندر رکھتی ہے اور بعض آوازوں کے امتزاج و تالیف کے بعد جو نغمہ پیدا ہوتا ہے وہ بعض جانوروں کے فرقِ احساسات کے اعتبار سے متاثر اور کیف اندوز کرتا ہے۔

ہندوستانی راگوں کی تفصیل

تودی راگنی:۔ یہ راگنی "مالکوس راگ" کی ایک قسم ہے۔ سورج نکلنے کے ایک گھنٹہ بعد اس کو گایا جاتا ہے۔ اس کے گانے کے لئے جنگل کا مقام بہترین ہے۔ جنگل کے سکوت کو جب یہ راگنی توڑتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریکی میں یکایک آفتاب چمک گیا۔ اس کے اثر سے گانے والے کے گرد جنگل کے ہرن جمع ہو جاتے ہیں اور مغنی کی صورت کو دیکھ کر محو ہو جاتے ہیں، اور جب تک وہ گاتا رہتا ہے ہرن وہاں سے ہلنے کا نام نہیں لیتے۔ راگنی کے ختم ہو جانے کے بعد ہرن وہاں سے روانہ ہوتے ہیں، لیکن دور تک گانے والوں کو دیکھتے جاتے ہیں۔

جوگیا اساوری راگنی:۔ یہ راگنی بھی دن نکلنے کے کچھ دیر بعد گائی جاتی ہے۔ اس کے گانے کی صورت یہ ہے کہ گانے والا درخت کے نیچے ایک بڑے کتّے پر سوار ہو کر نغمہ سرائی کرتا ہے۔ نغمہ جب فضا میں منتشر ہوتا ہے تو "سانپ" سب سے پہلے متاثر ہوتے ہیں۔ اور وجد کرتے ہوئے مغنی کے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ جب تک گانا ہوتا رہتا ہے "سانپ" جھومتے رہتے ہیں۔

بھیرویں راگنی:۔ اس راگنی کا وقت "طلوعِ صبح" ہے۔ مہادیو بت پر بیٹھ کر نغمہ سرائی کی جاتی ہے۔ مغنی کے ساتھ ایک حسین عورت کا طنبورہ بجانا بھی ضروری ہے۔ اس راگنی کے اثر سے تمام چرند پرند مدہوش اور محو ہو جاتے ہیں۔ چہکتے ہوئے پرند ساکت ہو کر گانا سننے لگتے ہیں اور دوڑتے ہوئے چرند فوراً رک جاتے ہیں۔ اور ان پر کیف انگیز سکوت طاری ہو جاتا ہے۔

بہاگ راگنی:۔ اس راگنی کو طلوعِ صبح سے ایک گھنٹہ قبل گایا جاتا ہے۔ نغمہ سرائی کی صورت یہ ہے کہ بت کے سامنے بیٹھ کر نغمہ سرائی کی جاتی ہے۔ اس راگنی کے اثر سے شیر محو ہو جاتا ہے، اور گانے والے کے پس پشت آکر نغمہ سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

سورٹھ راگنی:۔ تقریباً دو گھنٹے رات گذرنے کے بعد اس راگنی کے الاپنے کا وقت ہے۔ کسی بستی سے طنبورہ ہاتھ میں لے کر راگنی کو گاتے ہوئے جنگل میں چلا جانا چاہیئے۔ جنگل کے موروں پر اس راگنی کا بیحد اثر ہوتا ہے۔ اس راگنی کے زیر و بم پر مور والہانہ انداز میں رقص کرتے ہیں اور بعض اوقات رقص چھوڑ کر گانے والے کی صرف صورت دیکھتے رہتے ہیں اور مغنی کے نقشِ قدم پر ناچتے ہوئے چلتے ہیں۔

پٹ منجری راگنی:۔ موسمِ باراں میں دن نکلنے کے چھ گھڑی بعد اس راگنی کا وقت ہے۔ اس راگ کو سننے سے پہلے تو ایک خاص قسم کا کیف محسوس ہوتا ہے اور پھر سننے والا بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج سے بیحد خوف کھانے لگتا ہے، یہاں تک کہ بادل کی گرج سے اس کا جسم کانپ جاتا ہے۔

کدارا راگنی:۔ یہ راگنی دیپک راگ کی ایک قسم ہے۔ جب رات ختم ہونے میں ڈیڑھ گھنٹہ باقی رہ جائے تو اس راگنی کو الاپنا چاہیئے۔ نغمہ سرائی کی صورت یہ ہے کہ ایک تیرنے والے کے سامنے بیٹھ کر بین بجا کر نغمہ گانا چاہیئے۔ تیرنے والے کا حوض میں ہونا ضروری ہے۔ اس منظر اور نغمہ کے اثر سے ہر سننے والا محوِ حیرت ہو جائے گا اور بعض اوقات رقص کی کیفیت طاری ہو جائے گی۔

گونڈ ملہار راگنی:۔ بارش کا آغاز اس راگنی کے لئے مناسب وقت ہے۔ جنگل میں فرشِ گل پر بیٹھ کر نغمہ سرائی کرنی چاہیئے۔ اس کے اثر سے تالابوں کی مچھلیاں محوِ سرود ہو جاتی ہیں۔

بھیاس راگنی:۔ طلوعِ صبح کے وقت اس راگنی کو گایا جاتا ہے جب یہ راگنی گائی جاتی ہے تو سننے والے کے ہاتھ میں تیر یا بندوق ہو اور مغنی اور سامع کے درمیان اگر کوئی چیز حائل ہو جائے تو پھر راگ سننے والا بحیثیت حائل شدہ چیز کو نشانہ بنا دے گا۔ کیونکہ یہ راگ سامع کو مغنی کی صورت کا اس قدر فریفتہ بنا دیتا ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی مغنی کی صورت کا اپنی نگاہوں سے اوجھل ہونا پسند نہیں کرتا۔

بھیرویں راگ (اول):۔ صبح کاذب سے طلوعِ آفتاب تک اس راگ

کا وقت ہے۔ اس راگ سے جذبات میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے اور عورت کے جذبات کو تو یہ راگ بیحد برانگیختہ بناتا ہے۔ اور نسوانی محسوسات میں طوفان بپا کرتا ہے ÷

گوری راگنی:- اس راگنی کا وقت "قریب شام" ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ چمن زار میں کھڑے ہو کر خوبصورت پودوں کی دو تازک شاخوں کو ہاتھ میں تھام کر اس راگنی کو چھیڑا جاتا ہے ÷

رام کلی راگنی:- جب دو گھڑی رات باقی رہ جاتی ہے تو اس راگنی کو گایا جاتا ہے۔ اس راگنی کی تاثیر یہ ہے کہ اگر عورت اس راگنی کو گائے تو اس کا محبوب خواہ وہ کتنا ہی مغرور و متکبر کیوں نہ ہو مغنیہ کے قدموں پر سر رکھدے ÷

منظور حسین ماہر القادری

غزل

مآلِ گل کی خبر کوششِ صبا معلوم — کلی کلی کو ہے گلشن کی انتہا معلوم

ہر اک قدم رہِ الفت میں ڈگمگاتا ہے — یہ ابتدا ہے تو پھر اس کی انتہا معلوم!

تجلیات کی اک رو میں بہ چلا ہے دل — نہ آرزو کی خبر ہے نہ مدعا معلوم

چلے ہیں اُسکے طلبگار سوئے دیر و حرم — جو کوششیں ہیں یہی ہو چکا پتا معلوم

ہر ایک پھول میں دوڑی ہے انبساط کی روح — چمن میں آکے وہ کیا کہہ گئے خدا معلوم

مری حیات بھی فطرت کا اک مُعمّا ہے — مرے وجود کو میرا نہیں پتا معلوم

نگاہ ملتے ہی ماہر میں ہو گیا غافل

پھر اس کے بعد کو کیا کچھ ہوا خدا معلوم

منظور حسین ماہر القادری

وادیٔ شادمان (کشمیر) کا ایک منظر

ذوق و سرور

گھنگھور گھٹا جہاں ہے چھائی — پیغامِ نشاط و عیش لائی
طوفاں ہے سیاہ مستیوں کا — میخانہ طرب پرستیوں کا
دریا کی روانیوں میں مستی — مے کی سی ہے پانیوں میں مستی
ہیں وادی و کوہسار سرمست — اشجار ہیں میگسار، سرمست
ہر چیز ہے غرقِ شادمانی — ہر شے پہ ہے رنگِ نوجوانی

اک کیف فضا لئے ہوئی ہے
گویا ہر شے پئے ہوئی ہے

ہوں دامنِ کوہ میں خراماں — دل عالمِ وجد میں ہے رقصاں
کیا پاک فضائے پُرسکوں ہے — بیگانۂ وحشتِ جنوں ہے
بیکار کی زندگی سے آزاد — انساں کی درندگی سے آزاد
عصیاں کا شرر یہاں نہیں ہے — شیطاں کا گذر یہاں نہیں ہے
فطرت کے یہ جلوہ ہائے بے غم — انساں کے ہیں غمگسار محرم

پیغامِ سکوں صبا کے جھونکے — ہیں روح فزا ہوا کے جھونکے
چشموں کا سرور کیف آگیں — سرمایۂ بے خودی و تسکیں
نظارۂ کوہسار گلپوش — وادی کے ہیں شاخسار گلپوش
یہ پھول ہیں رازدار میرے — ہیں مونس و غمگسار میرے

پی کر مئے حسن جھومتا ہوں
معصوم گلوں کو چومتا ہوں

دل فرطِ طرب سے نغمہ زن ہے — سرشار تمام انجمن ہے
ہے نغمۂ روح کیف بردوش — پُرنور، سرور خیز، خاموش
چھایا ہے فضا پہ نور بن کر — دل میں ہے رواں سرور بن کر
ہے جلوہ فشاں جمالِ یزداں — ہر شیشہ بادۂ ہائے عرفاں

یہ نغمہ و نور کی ہے دنیا
یہ ذوق و سرور کی ہے دنیا

اثر صہبائی

سیاہ مکڑی

ذیل میں ایک مغربی مصنف کے شاہکار کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔ یہ ان افسانوں میں سے ایک ہے، جنہیں ہیبتناک افسانوں کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دنیائے عقل وفراست میں اُن واقعات کی کوئی توجیہ بیان نہیں ہو سکتی، جو اس افسانہ میں معرض ظہور میں آئے ہیں۔ لیکن مصنف کا کمال یہ ہے، کہ یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ ایسا ہونا ممکن نہیں آپ یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ لیکن ایسا ہونا نہ چاہیئے اور غالباً یہی وہ کیفیت ہے جسے تاثر ہیبت کہہ سکتے ہیں۔ ن۔ د +

جب میڈیکل کالج کے طالب علم رچرڈ نے سٹیونز ہوٹل کے کمرہ نمبر ۷ میں منتقل ہونے کا فیصلہ کیا تو اس سے قبل اس کے کمرے کے تین مکین گذشتہ تین متواتر جمعوں کو روشندان کی رسی کا پھندا بنا کر اپنے آپ کو ہلاک کر چکے تھے۔ پہلا آدمی ایک تجارتی کارندہ تھا۔ اس کی نعش ہفتہ کی شام کو دستیاب ہوئی۔ لیکن اطبا کا یہ خیال تھا کہ موت جمعہ کی شام کو واقع ہوئی تھی۔ نعش رسی کے ذریعے ایک ایسی کھونٹی پر لٹک رہی تھی جو بالعموم کپڑے لٹکانے کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔ کمرے کی کھڑکی بند تھی، اور چونکہ کھونٹی زیادہ بلند نہ تھی اس لئے نعش کے گھٹنے تقریباً زمین پر آ لگے تھے۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ خودکشی کرنے کے لئے غیر معمولی قوت ارادی سے کام لیا گیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ خودکشی کرنے والا آدمی اپنی عام زندگی سے نہایت مطمئن تھا۔ اس کی شادی ہو چکی تھی اور اس کے تین بچے تھے۔ آمدنی اتنی کافی تھی کہ مالی پریشانی کا اسے کبھی سامنا ہی نہ کرنا پڑا تھا۔ لیکن نہ تو خودکشی سے قبل اس نے اپنے عندیہ سے کسی دوست آشنا کو اطلاع دی تھی اور نہ بعد ہی میں کسی تحریر سے اُسکی خودکشی کی وجہ معلوم ہو سکی +

دوسرا واقعہ اس سے چنداں مختلف نہ تھا خودکشی کی واردات کے دو دن بعد ایک کارل نے یہ کمرہ کرایہ پر لیا۔ لیکن جب جمعہ کے روز کارل وقت پر سرکس میں نہ پہنچ سکا۔ تو سرکس کے مہتمم نے ایک ملازم اسے بلانے کے لئے بھیجا۔ ملازم نے دیکھا کہ کارل غیر مقفل کمرے میں بالکل انہی حالات میں رسی سے لٹک رہا تھا جن میں مسافر کارندہ پایا گیا تھا۔ یہ واقعہ بھی کم حیرت انگیز نہ تھا۔ ایکٹر بالکل نوجوان آدمی تھا اور ہر لحاظ سے کامیاب انسان تھا۔ کسی طرح کے تحریری یا دیگر ثبوت کی عدم موجودگی میں یہ معما بھی لاینحل رہا +

خودکشی کے یہ واقعات ہوٹل کی مالکہ مادام ڈبوئے کے لئے بہت تشویشناک تھے۔ ایکٹر کی خودکشی کے بعد بہت سے آدمی ہوٹل چھوڑ کر چلے گئے تھے، اور بہت سے روزمرہ کے آنے والے گاہکوں نے وہاں آنا ترک کر دیا تھا۔ مالکہ نے پولیس کمشنر سے تفتیش کے لئے درخواست کی اور اس نے صرف تفتیش کا ذمہ ہی نہ لیا۔ بلکہ مستقل طور پر ایک سپاہی ہوٹل میں بھیجدیا، جو ہر وقت اس پُر اسرار کمرے میں رہتا تھا +

اس سپاہی کا نام شامی تھا۔ یہ مختلف مقامات پر ڈاکوؤں سے مقابلہ کر چکا تھا، اور جنگلوں میں لٹیروں کو گرفتار کر چکا تھا۔ اپنے پرانے تجربے اور دلی شجاعت کی بنا پر اس نے خود ہی اس پُراسرار کمرے میں رہنے کی درخواست کمشنر سے کی تھی جو قبول کر لی گئی، وہ اتوار کی شام کو اس کمرے میں قیام کرنے کی غرض سے گیا، اور وہاں خوب کھاتا پیتا رہا۔ وہ ہر روز اپنے افسر کے پاس جا کر اپنی خیریت کی اطلاع دے آتا۔ پہلے پانچ دنوں تک وہ یہی بیان کرتا رہا کہ اسے اس کمرہ میں کوئی چیز غیر معمولی نظر نہیں آتی۔ البتہ بدھ کی شام کو اس نے یہ بیان کیا کہ اسے اس معمے کا حل مل گیا ہے۔ جب اس سے تفصیل بیان کرنے کے لئے کہا گیا تو اُس نے اس عندیہ کا انکار کر دیا، کہ چونکہ وہ اپنے مرتب کردہ نتائج کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا اس لئے اس کا خاموش رہنا بہتر ہو گا۔ جمعرات کی شام کو وہ کچھ مشوش اور غمگین سا تھا، لیکن اس نے کوئی غیر معمولی اطلاع نہ دی جمعہ کی صبح کو اس کے چہرے پر ہیجان کے آثار تھے۔ اور اس نے نیم مزاحیہ انداز میں یہ اقبال کیا کہ اس کمرے کی کھڑکی میں کوئی غیر معمولی کشش ہے۔ لیکن وہ اس نظریہ پر مُصر رہا کہ اس کا خودکشی کی وارداتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس شام کو وہ پولیس کمشنر کے پاس نہ گیا۔ اور جب کمشنر خود اس سے ملنے کے لئے گیا تو وہ کھونٹی پر رسی کے ساتھ لٹک رہا تھا +

اس واردات کے واقعات جزئیات کے لحاظ سے ہو بہو پہلی وارداتوں کی طرح تھے۔ ٹانگیں فرش پر دوہری ہو رہی تھیں اور روشندان کی رسی خودکشی کے لئے استعمال کی گئی تھی۔ کھڑکی بند تھی اور دروازہ غیر مقفل تھا۔ متوفی کا

منہ کھلا ہوا تھا اور اس کی زبان باہر نکل رہی تھی ٭

اس واردات کے بعد ہوٹل کے تمام آدمی ہوٹل چھوڑ کر چلے گئے۔ ماسوا ایک استاد کے جس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے کمرے کا کرایہ گھٹا لیا، اگر کوئی اور موقع ہوتا تو ممکن ہے اخبارات والے اس واقعہ کو کتنی حاشیہ آرائی سے شائع کرتے لیکن انتخابات کے جھگڑوں اور اقتصادی مسائل کے اندراجات کے بعد اخبار کے پاس خودکشی کی واردات کی خبر درج کرنے کیلئے مزید گنجائش نہ تھی۔

میڈیکل کالج کے طالب علم رچرڈ کو بھی اِن خبروں کی وجہ سے اس معاملے میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن اسے عام واقعات کے علاوہ اور کسی تفصیل کا علم نہ تھا۔ یہاں تک کہ اسے اس تفصیل کا علم بھی نہ تھا جو بعد میں اس کی وساطت سے دوسروں کو یاد آگئی اور وہ یہ تھی کہ جب مزدوروں نے پہلے دو خودکشی کرنیوالوں کی نعشوں کو سنبھالا تھا تو ہر بار ان کے منہ سے ایک سیاہ مکڑی نکلتی تھی۔ لیکن رچرڈ کو اس کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا۔ وہ آخری واردات کے تین ہفتے بعد اس کمرے میں مقیم ہوا اور اس نے اپنے تجربات نہایت دیانتداری سے اپنی ڈائری میں درج کر دیئے ٭

رچرڈ کی ڈائری

اتوار۔ ۲۸ ر فروری۔ میں کل رات یہاں چلا آیا تھا۔ میں نے اپنا سامان کھولا، اور کچھ چیزیں ترتیب سے رکھ کر سو رہا۔ میں کافی گہری نیند سویا رہا۔ صبح نو بجے کے قریب مالکہ نے دروازہ کھٹکھٹایا، اور مجھے جگا کر ناشتہ دے گئی۔ ناشتہ بہت پرلطف تھا، اور مالکہ نے نہایت ایمانداری سے تیار کیا تھا۔ ناشتے کے بعد میں نے منہ دھو کر کپڑے پہنے اور نوکر سے کمرہ صاف کرنے کے لئے کہکر خود سگرٹ پینے لگا ٭

اب کہ میں اس کمرے میں رہنے کے لئے آگیا ہوں، مجھے یقین ہے کہ اگر میں نے اس معمے کو حل کر لیا تو میری قسمت جاگ اٹھے گی۔ مجھے موقع مل گیا ہے، اور میں اس موقع سے جان کو بھی خطرہ میں ڈال کر فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ اور بھی بہت سے آدمیوں نے پولیس اور مالکہ کی معرفت اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا ہے، لیکن وہ میری طرح نادار ہونے کے باوجود میرے جتنے زیرک نہ تھے۔ صرف میں اکیلا آدمی ہوں جو پولیس کو غلط حل بتا کر چکمہ دے چکا ہوں۔ یہ بیان میں نے پولیس کے لئے درج کیا ہے۔ تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ انہیں صرف دھوکا دیا گیا ہے۔ پولیس کمشنر نے مجھ سے استفسار کیا تھا کہ میں اپنی تجاویز کی تفصیل سے اسے آگاہ کروں۔ لیکن میں نے اسے ارتجالاً ایسے الم غلم نظریئے بنائے کہ وہ میرا منہ تکتا رہ گیا، اور اپنی حفت اور جہالت کو چھپانے کے لئے اس نے مجھے اس کمرے میں آنے کی اجازت دے دی ٭

پولیس کمشنر میری ہر طرح سے مدد کر رہا ہے۔ اُس نے مالکہ سے یہ کہہ دیا ہے کہ وہ ہر قسم کی آسایش مجھے مہیا کرے، اور قیام و طعام کے اخراجات سے بھی میں بے فکر ہوں۔ مجھے ایک نہایت عمدہ پستول بھی دیا گیا ہے۔ اور ایک سپاہی کو کمرے کے باہر میری خدمت کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ میرے کمرے میں ٹیلیفون بھی لگا دیا گیا ہے جس کی وساطت سے میں ہر وقت پولیس کمشنر سے گفتگو کر سکتا ہوں۔..........

پیر۔ یکم مارچ۔ آج اعدکل کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ مادام دبو نے دوسرے کمرے سے ایک نئی رسی لاکر میرے روشندان سے باندھ گئی تھی، وہ بہت متواضع عورت ہے، اور میری ہر طرح سے خاطرداری کرتی ہے۔ اس نے خودکشی کی تفصیلات دوبارہ مجھ سے بیان کیں۔ لیکن ان کے وجوہ کے متعلق کسی طرح کا قیاس اس کے فہم میں نہ آسکتا تھا۔ وہ بہت عرصہ تک بے معنی باتیں کرتی رہی، لیکن چونکہ اس سے میری تنہائی کی تلخی کم ہو جاتی ہے اس لئے میں اسکی باتیں سُنتا رہتا ہوں ٭

جمعرات۔ ۳۰ مارچ کچھ بھی نہیں ہوا۔ کمشنر نے مجھے کئی دفعہ ٹیلیفون کیا ہے اور میں نے اسے بتایا ہے کہ ہر طرح سے خیریت ہے۔ وہ ان اطلاعات سے مطمئن نہیں۔ میں نے اپنی طبی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا ہے۔ اس طرح سے میں اختیاری قید کے عذاب سے محفوظ ہوں ٭

جمعہ۔ ۴ مارچ۔ دو بجے بعد دوپہر۔ میں نے دوپہر کا کھانا خوب سیر ہو کر کھایا ہے۔ مادام دبو نے کھانے کے ساتھ شاہین کی آدھی بوتل بھی لائی تھی۔ یہ کھانا بالکل ایسا ہی تھا جیسے پھانسی پانے والے کو پھانسی سے قبل دیا جاتا ہے۔ وہ مجھے اس وقت بھی تین چوتھائی مردہ سمجھتی ہے۔ جانے سے قبل اس نے مجھے بہت مجبور کیا کہ میں اسکے ساتھ چلا جاؤں۔ وہ میری آئندہ موت سے بہت خائف ہے ٭

میں نے روشندان کی نئی رسّی کا بغور جائزہ لیا ہے۔ شاید مجھے بھی اس سے لٹکنا پڑے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں ایسا کروں گا یا نہیں۔ البتہ دیگر پھانسی پانے والوں کی پیروی کرنے کے لئے مضبوط ارادے کی ضرور ضرورت ہے، لیکن اب جبکہ ٹیلیفون میرے سامنے پڑا ہوا ہے اور پستول میری میز پر رکھا ہے مجھے کسی طرح کا خوف محسوس نہیں ہوتا ——— تاہم میں متفکر ضرور ہوں ٭

چھ بجے شام۔ مجھے افسوس سے قلمبند کرنا پڑتا ہے کہ کچھ بھی رونما نہیں ہوا۔ امتحان کا وقت آیا اور گذر گیا۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ میرے

دل میں بار بار کھڑکی کے قریب جانے کی خواہش پیدا ہوئی ہے —— مگر اس کی وجہ اور تھی۔ کمشنر نے پانچ اور چھ بجے کے درمیان مجھے چھ دفعہ بلایا ہے۔ وہ بھی میری طرح مضطرب تھا۔ لیکن مادام دبوئے مطمئن تھی، کمرہ نمبر ۷ میں ایک انسان ایک ہفتہ سے زیادہ زندہ ہے۔ کیا یہ معجزہ نہیں!

پیر - ۷ مارچ - مجھے یقین ہو گیا ہے کہ مجھے کچھ معلوم نہ ہوگا، اور میں خیال کرنے لگا ہوں کہ مجھ سے پہلے مکینوں کی خودکشی کی وارداتیں محض اتفاقی تھیں۔ میں نے کمشنر سے کہا ہے کہ وہ شواہد کی تفاصیل پر از سر نو غور کرے۔ ممکن ہے ان کا کوئی حل نظر آ جائے۔ تاہم میں یہیں قیام کروں گا۔ یہ صحیح ہے کہ مجھے کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا۔ لیکن یہاں رہ کر میری صحت بہت اچھی ہو گئی ہے میرا وزن بڑھ گیا ہے۔ مزید برآں میرے اخراجات حکومت برداشت کر رہی ہے اور مجھے مطالعہ کے لئے کافی وقت مل گیا ہے۔ لیکن یہاں رہنے کی ایک اور وجہ بھی تو ہے +

بدھ - ۹ - مارچ - میں نے ایک قدم لوراٹھایا ہے۔ کلارا —— لیکن ابھی تک تو میں نے کلارا کے متعلق کہا ہی کچھ نہیں۔ ہاں میرے یہاں رہنے کی تیسری وجہ وہ ہے اور اسی کے لئے اس منحوس وقت میں کھڑکی کے قریب جانا چاہتا تھا۔ لیکن میں اپنے آپ کو رسی سے لٹکانا نہیں چاہتا تھا۔ کلارا —— بھلا میں اسے اس نام سے کیوں پکارتا ہوں۔ مجھے تو اس کا نام معلوم ہی نہیں لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ اسے اسی نام سے پکاروں، اور میں یہ شرط لگانے کے لئے تیار ہوں کہ اس کا نام یہی ہوگا!+

میں نے یہاں آنے کے چند دنوں بعد کلارا کو دیکھ لیا تھا۔ وہ اس تنگ گلی کی دوسری جانب رہتی ہے، اور اس کی کھڑکی میری کھڑکی کے بالکل سامنے ہے۔ وہ وہاں پردوں کے پیچھے بیٹھی رہتی ہے، اور اس نے مجھے مجھ سے پہلے دیکھ لیا تھا، اور مجھ میں کافی دلچسپی کا اظہار کر رہی تھی۔ یہ کچھ عجب نہیں کیونکہ یہاں میری آمد کی ہر ایک کو خبر ہو چکی ہے۔ مادام دبوئے میرے لئے اشتہار کا کام کرتی ہے+

میں ایسا آدمی نہیں جو کسی سے محبت کر سکے۔ عورتوں سے میرے تعلقات میں جذباتِ لطیف کو کوئی دخل نہ تھا۔ جو آدمی باہر سے طبی تعلیم حاصل کرنے نکلے لئے آئے، اور تین دن میں ایک دفعہ بھی اچھا کھانا کھانے کی استطاعت نہ رکھتا ہو اس کے لئے محبت کے مشغلے کے علاوہ اور بہت سے امور سرگرمیانے کے لئے موجود ہوتے ہیں۔ مجھے اس کا کچھ زیادہ تجربہ بھی نہیں اور غالباً میں نے یہ سلسلہ کسی حماقت آمیز خواہش کے زیر اثر شروع کیا تھا۔ تاہم اس وقت حالات نہایت خوشگوار ہیں+

پہلے تو مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ میں اپنے اجنبی ہمسایوں سے کسی طرح کے تعلقات استوار کر سکتا ہوں۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ میں یہاں صرف ایک معاملہ کرنے آیا ہوں۔ اس لئے مجھے اپنی توجہ اسی پر مرکوز کرنی چاہیئے۔ لیکن اس بیکاری اور فراغت میں آدمی تمام کتابوں کی طرف بھی کب تک متوجہ رہ سکتا ہے۔ اس لئے متواتر مشاہدہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کلارا اپنے مکان میں تنہا رہتی ہے۔ اس کے کمرہ کی تین کھڑکیاں ہیں۔ لیکن وہ میرے مقابل کی کھڑکی میں بیٹھی رہتی ہے اور کشیدہ کاڑھتی رہتی ہے۔ لیکن اس کے آلات نہایت قدیم وضع کے ہیں۔ میری دادی اماں کے پاس ایسے آلات ہوا کرتے تھے۔ وہ پردوں کے پیچھے بیٹھی رہتی ہے اور ان تھک محنت کے ساتھ تمام دن کام کرتی رہتی ہے۔ جتنے کہ شام ہو جاتی ہے۔ ان دنوں دھند کی وجہ سے شام کو اندھیرا بہت جلد ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسے کام چھوڑنا پڑتا ہے۔ میں نے اس کے کمرہ میں روشنی کبھی نہیں دیکھی +

اس کی شکل وشباہت کیسی ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہ معلوم ہی نہیں۔ اس کی زلفیں لمبی اور گھنگھریالی ہیں۔ اس کا رنگ کچھ زرد سا ہے۔ اُس کی ناک تیلی اور چھوٹی ہے، اس کے ہونٹ زرد ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شکاری درندوں کی طرح اس کے دانت نوکیلے اور تیز ہیں اسکی پلکیں لانبی لانبی اور گھنیری ہیں۔ لیکن جب وہ آنکھیں کھولتی ہے تو ان میں سے برق آسا روشنی نکلتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ مجھے معلوم نہیں بلکہ میں ایسا محسوس کرتا ہوں۔ پردوں کے پیچھے سے کسی چیز کو واضح طور پر شناخت نہیں کیا جا سکتا +

ایک اور بات - وہ ہر وقت تنگ اور چست لباس پہنے رہتی ہے اور ہاتھوں پر ہر وقت سیاہ دستانے چڑھائے رکھتی ہے۔ غالباً کام کرنے کے لئے جب وہ باریک تاروں کو کھینچتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مکڑی جالا بُن رہی ہے +

ہمارے ایک دوسرے سے تعلقات؟ یہ بالکل ظاہری ہیں لیکن اس کے باوجود وہ بہت گہرے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا آغاز ہمارے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے ہوا تھا، اس نے مجھے دیکھا اور میں نے اُسے۔ یہ یقینی امر ہے کہ وہ مجھے دیکھ کر مسرور ہوئی تھی۔ کیونکہ صبح کو جب میں نے اسکی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہی تھی میں بھی مسکرایا۔ یہ سلسلہ کچھ دنوں تک جاری رہا، اور ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے رہے۔ پھر میں ہر لمحہ یہ ارادہ کرتا رہا

کہ اسے بلاؤں گا - لیکن یہ ارادہ آج تک عملی جامہ نہیں پہن سکا - نہ جانے کیوں!

لیکن آج میں نے ایک اور کوشش ضرور کی ہے - میں نے کلارا کو سلام کیا تھا اور اس نے بھی جواب دیا تھا - یہ صحیح ہے کہ اس کی حرکت بالکل مبہم سی تھی، لیکن میں نے اس کے سر کی جنبش ضرور دیکھی تھی +

جمعرات -- ۱۰ / مارچ - کل رات میں بہت دیر تک کتاب لئے بیٹھا رہا لیکن سچ پوچھو تو میں نے ایک حرف بھی نہیں پڑھا - میں ہوائی قلعے بناتا رہا اور کلارا کے متعلق خوشنما خواب دیکھتا رہا - میں کافی گہری نیند بھی نہیں سویا - لیکن بہت دن گئے تک سوتا رہا ہوں +

جب میں کھڑکی کے قریب پہنچا، کلارا بھی اپنی کھڑکی میں بیٹھی ہوئی تھی، میں نے اُسے سلام کیا اور اس نے جواب میں سر ہلایا - وہ مُسکرا کر کافی عرصہ تک میری طرف دیکھتی رہی +

میں کام کرنا چاہتا تھا، لیکن میرا دماغ پریشان تھا - میں کھڑکی میں بیٹھ کر اس کی طرف دیکھتا رہا - دفعتہً میں نے دیکھا کہ اس نے ہاتھ اپنی گود میں رکھ لئے ہیں - میں نے روشندان کی رسی کھینچی اور اس نے بھی تقریباً اسی وقت یہ کام کیا - ہم دونوں ایکدوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے رہے - شاید ایک گھنٹے تک دونوں ایسے ہی بیٹھے رہے ہوں گے - اس کے بعد اس نے پھر کشیدہ کا کام شروع کر دیا -

ہفتہ - ۱۲ - مارچ - دن سرعت سے گذرتے جا رہے ہیں - میں کھا پی کر کام کرنے لگتا ہوں - سگرٹ سلگا لیتا ہوں اور کتاب کھول لیتا ہوں - لیکن پڑھتا ایک حرف بھی نہیں - در اصل میں پڑھنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں لیکن پہلے ہی سے مجھے علم ہوتا ہے کہ میں اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتا - پھر میں کھڑکی کے قریب چلا جاتا ہوں - میں کلارا کو سلام کرتا ہوں، اور وہ اشارے سے جواب دیتی ہے - پھر ہم گھنٹوں ایک دوسرے کی طرف دیکھکر مسکراتے رہتے ہیں +

کل دوپہر کے بعد میں کچھ پریشان سا تھا - بہت جلد اندھیرا ہو گیا تھا اور میں نامعلوم خوف محسوس کر رہا تھا - میں میز کے سامنے بیٹھا ہوا منتظر تھا، لیکن اس وقت میرے دل میں کھڑکی کے پاس جانے کی بہت خواہش پیدا ہوئی میں اپنے آپ کو پھانسی نہیں دینا چاہتا تھا بلکہ کلارا کو دیکھنے کے لئے کھڑکی کے پاس جانا چاہتا تھا - میں پردے کے پیچھے کھڑا ہو گیا - اندھیرا ہو چکا تھا - لیکن وہ واضح طور پر نظر آ رہی تھی - وہ کشیدہ کاڑھ رہی تھی اور ترچھی نظروں سے میری طرف دیکھتی جاتی تھی - میں کچھ عجیب سی راحت اور خوف محسوس کرتا تھا +

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی - مجھے کمشنر پر غصہ آ رہا تھا - وہ بیہودہ سوالو سے میرا وقت ضائع کر رہا تھا - آج صبح وہ مادام دیوئے کی معیت میں مجھ سے ملنے کے لئے آیا تھا - مادام دیوئے مطمئن ہے کہ میں دو ہفتوں تک کمرہ نمبر ۷ میں زندہ رہ سکا ہوں، لیکن کمشنر نتائج کے لئے بیتاب ہے - میں نے اس سے کہدیا ہے کہ میں مشاہدہ کر رہا ہوں اور نفیس طور پر معمے کا حل سوچ رہا ہوں - اُلّو میرے جھانسے میں آ گیا، اور میری باتوں پر اعتبار کر کے چلا گیا - میں ابھی یہاں کچھ دن اور قیام کر سکوں گا، لیکن میں یہاں پر مادام دیوئے کی عمدہ خوراک اور دیگر آسائشوں کو حاصل کرنے کے لئے نہیں ٹھہرنا چاہتا، بلکہ اس کھڑکی کے لئے جہاں سے میں اپنے مرکزِ تصوّر کے تماشے سے اپنے لئے "جنتِ نگاہ" کا سامان بہم پہنچا سکتا ہوں -

جب میں کمرہ روشن کرتا ہوں تو اس کی شکل نظر نہیں آتی - میں نے بہت کوشش کی ہے کہ اسے گلی میں چلتے پھرتے دیکھوں - لیکن اس نے آج تک کبھی گلی میں قدم نہیں رکھا - میں ایک [illegible] کھبوری رنگ کے برقی قمقمے کے سامنے بیٹھا رہتا ہوں - کمشنر نے مجھے [illegible] عمدہ سگرٹ ارسال کئے ہیں - میں نے اتنا اچھا تمباکو آج تک استعمال نہیں کیا - لیکن اس کے باوجود میں کوئی کام نہیں کر سکتا - میں نے دو تین صفحے پڑھے تھے - جب میں مطالعہ ختم کر چکا تو میں نے محسوس کیا تھا کہ ایک حرف بھی میری سمجھ میں نہیں آیا - میری آنکھیں حروف کو پہچانتی ہیں، لیکن میرا ذہن ان کے معانی متعین نہیں کر سکتا - کیا یہ عجیب بات نہیں! میرے دماغ میں کلارا کے سوا اور کوئی خیال داخل ہی نہیں ہو سکتا +

اب میں نے کتابیں پرے ہٹا دی ہیں - اور کلارا کے خواب دیکھنے لگا ہوں

اتوار - ۱۳ - مارچ - آج میں نے ایک المیہ ڈراما دیکھا ہے - جب ملازم کمرہ صاف کر رہا تھا میں برآمدہ میں گھوم رہا تھا - کھڑکی کے سامنے کی دیوار پر مکڑی کا جالا تنا ہوا ہے، اور اس میں ایک موٹی سی سیاہ مکڑی بیٹھی ہوئی ہے مادام دیوئے اسے وہاں سے صاف کرنے نہیں دیتی، اس کا خیال ہے کہ مکڑی مبارک چیز ہے، اسے گھر سے باہر نہیں نکالنا چاہیئے - خدا جانتا ہے کہ اس کے گھر میں اس مکڑی سے کس قدر [illegible] برس رہا ہے - جب میں اسے دیکھ رہا تھا تو اس وقت ایک مکڑا جالے کے قریب آیا - وہ وسط میں پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا - لیکن جب مکڑی اپنی جگہ سے ہلتی تو وہ واپس لوٹ آتا - پھر وہ دوسرے کنارے سے جا کر جالے کو ہلاتا - حتیٰ کہ طاقتور مکڑی نے اپنی حرکت بند کر دی اور مکڑا آگے بڑھنے پر آمادہ ہو گیا - پھر وہ ایک تار کو پکڑ کر آہستہ آہستہ وسط میں پہنچ گیا - مکڑی نے خاموشی سے اس کا استقبال کیا - اور مکڑا جا کر اس سے مل گیا - وہ بہت عرصے تک جالے کے وسط میں لٹکتے رہے +

پھر میں نے دیکھا کہ مکڑے نے اپنے آپ کو مکڑی سے آہستہ آہستہ علیحدہ

کر لیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مکڑی کو اسی عالم میں چھوڑ کر واپس چلا جانا چاہتا ہے۔ وہ دفعتہً اُٹھ کر پرے ہٹ کر بھاگ نکلا۔ لیکن مکڑی نے اس کا تعاقب کیا۔ کمزور مکڑا ایک تار کی وساطت سے نیچے اُتر رہا تھا اور مکڑی اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ تار ٹوٹ گیا، اور دونوں دہلیز پر آ رہے۔ مکڑا ہوش سنبھالکر دوڑا، لیکن مکڑی نے اسے آلیا، اور اسے اپنے پنجوں میں پکڑ کر جالے کے وسط میں لے گئی۔ مکڑا اپنے آپ کو چھڑانے کی بے سود کوشش کر رہا تھا، لیکن مکڑی اسے مضبوط پکڑے ہوئے تھی۔ کچھ دیر تک زور آزمائی کرنے کے بعد مکڑا بیہوش سا ہو گیا۔ اس وقت مکڑی نے اپنی سوئیاں اس کے بدن میں چبھو کر اس کا خون پی لیا۔ اور پھر مکڑے کی نعش کو حقارت آمیز انداز میں جالے سے نیچے پھینک دیا +

آہ ان جانوروں کی محبت کا انجام کتنا خطرناک ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نوجوان مکڑا نہیں +

پیر - ۱۴ - مارچ - میں اب اپنی کتابوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ تمام دن کھڑکی کے پاس بیٹھ کر صرف کر دیتا ہوں۔ یہاں تک کہ شام ہو جاتی ہے۔ پھر وہ نظر نہیں آتی۔ لیکن میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور کسی نہ کسی طرح اسے دیکھ لیتا ہوں ....

میری ڈائری بالکل میری توقع کے خلاف لکھی جا رہی ہے۔ اس میں ماوام دبوئے، کمشنر، کلارا اور مکڑی کا ذکر ہوتا ہے۔ لیکن مطلوبہ امر کے متعلق کوئی اطلاع نہیں، لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے؟

منگل - ۱۵ - مارچ - کلارا نے اور میں نے ایک نیا کھیل معلوم کیا ہے۔ اور ہم اسے تمام دن کھیلتے رہتے ہیں۔ میں اسے سلام کرتا ہوں اور وہ فوراً سلام کا جواب دیتی ہے۔ پھر میں اپنی کھڑکی کھٹکھٹاتا ہوں اور وہ بھی فوراً اپنی کھڑکی کھٹکھٹانے لگتی ہے۔ میں اس کی طرف دیکھ کر پُر معنی انداز میں مسکراتا ہوں اور وہ بھی مسکراتی ہے۔ میں اپنے ہونٹ ایسے ہلاتا ہوں جیسے باتیں کر رہا ہوں اور وہ بھی اپنے ہونٹ اسی طرح ہلاتی ہے۔ پھر میں اپنے بال پیشانی سے ہٹاتا ہوں اور اس کا ہاتھ بھی فوراً پیشانی پر پہنچ جاتا ہے۔ یہ بچوں کا کھیل سہی، لیکن کتنا پُر لطف ہے۔ ہم دونوں ہنس پڑتے ہیں۔ وہ ہنستی تو نہیں البتہ مسکراتی ہے، اس کی ہنسی میں آواز نہیں ہوتی۔ شاید میں بھی اسیطرح ہنستا ہوں +

یہ تمام کام اتنے بیہودہ نہیں جتنے بظاہر نظر آتے ہیں۔ ہم ایکدوسرے کی نقل نہیں اُتارتے۔ کیونکہ اس طرح ہم اس سے بہت جلد بیزار ہو جاتے، یہ دلی لگاؤ ہے۔ کیونکہ کلارا میری ہر ایک حرکت کی فوراً نقل اتارتی ہے۔ وہ میری حرکت کو دیکھنے سے قبل ہی میری حرکت کی نقل اتار لیتی ہے۔ بعض دفعہ تو میں یوں محسوس کرتا ہوں۔ کہ ہم دونوں بیک وقت ایک ہی فعل کر رہے ہیں بعض دفعہ میں جلدی جلدی بہت سی حرکات کرتا ہوں۔ پھر ان کی ترتیب بدل دیتا ہوں لیکن کلارا ان کی نقل اتارنے میں ایک غلطی بھی نہیں کرتی، میں حیران ہوتا ہوں کہ وہ اتنی جلدی سب کچھ یاد کیسے کر لیتی ہے +

بس اس طرح میرے دن گذر رہے ہیں۔ لیکن میرے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ احساس پیدا نہیں ہوتا کہ میں اپنا وقت ضائع کر رہا ہوں، بلکہ یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں نے اس سے اہم کام کبھی کیا ہی نہیں +

بدھ - ۱۶ - مارچ - کیا یہ عجیب بات نہیں کہ میں نے کلارا سے اپنے تعلقات کی بنیاد کو زیادہ مضبوط بنانے کا کبھی خیال نہیں کیا۔ کل میں اسکے متعلق سوچ رہا تھا۔ میں ٹوپی اور کوٹ پہن کر زینے سے چند قدم نیچے اُتر کر گلی میں جا سکتا ہوں۔ دروازے پر کلارا .... ہاں کلارا .... خدا جانے کیا لکھا ہوا ہے۔ بہرحال میں دروازے پر دستک دے سکتا ہوں +

یہاں تک تو میں سب کچھ صحیح طور پر سوچ سکتا ہوں۔ اور ہر ایک حرکت صحیح طور پر کر سکتا ہوں۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوگا۔ میں دروازے پر دستک دُوں گا۔ دروازہ کھل جائے گا۔ لیکن وہ نہیں آئے گی ——— کوئی بھی نہیں آئے گا۔ اور میں تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہوں گا +

بعض دفعہ مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کلارا، اور کسی طرح کی نہیں ہو سکتی۔ بس یہی سیاہ لباس اور سیاہ دستانے ہر وقت اس کے ساتھ موجود ہونگے

بعض دفعہ میں اپنے آپ سے یہ استفسار کرتا ہوں کہ کیا میں اس سے محبت کرتا ہوں، لیکن اس کا جواب میں کیسے دے سکتا ہوں میں نے تو آج تک کسی سے محبت کی ہی نہیں۔ لیکن اگر میں کلارا سے واقعی محبت کرتا ہوں تو میرے جذبات کی نوعیت اُن جذباتِ محبت سے ضرور مختلف ہے جن کے متعلق میں نے ناولوں میں پڑھا ہے۔ میں اپنے جذبات کو کچھ واضح طور پر بیان نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ کلارا، کے سوا مجھے اور کچھ سوجھتا ہی نہیں +

کلارا ——— ہاں میں کلارا کی طرف کچھ کشش سی محسوس کرتا ہوں لیکن اس کشش کے ساتھ ایک اور جذبے کی آمیزش بھی ہے۔ اس کے ساتھ کچھ خوف بھی ملا ہوا ہے۔ خوف؟ نہیں یہ خوف نہیں، بلکہ یہ کچھ گھبراہٹ سی ہے۔ میں اس کی توضیح نہیں کر سکتا۔ کچھ بدگمانی سی ہے اور بدگمانی مجھے اس سے دور رکھتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں نے ایک دائرے میں اس کے گرد گھوم کر اس کے قریب جانے کی کوشش ہے، لیکن پھر پیچھے

ہٹ گیا ہوں، پھر آگے بڑھا ہوں، اور پیچھے آگیا ہوں۔ لیکن یہ مجھے یقین ہے کہ کسی دن اس کے قریب ضرور پہنچ جاؤں گا +

کلارا کھڑکی میں بیٹھی ہوئی کشیدہ کاڑھ رہی ہے۔ وہ نہایت عمدہ جالی بن رہی ہے۔ اور اس پر نہایت خوشنما نقوش بن رہے ہیں۔ لیکن یہ سب نقوش دیووں اور حکایتی خوفناک جانوروں کے ہیں +

لیکن میں یہ کیا لکھ رہا ہوں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے اچھی طرح سے نظر ہی نہیں آتا کہ وہ کیا بنا رہی ہے۔ لیکن پھر بھی میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مجھے جو کچھ دکھائی دے رہا ہے۔ وہ بالکل وہی کام کر رہی ہے ایک بہت بڑی جالی اور راسخ خوفناک جانوروں کے نقوش............

جمعرات۔ ۱۷۔ مارچ۔ میں بہت مضطرب ہوں۔ میں کسی سے بات تک نہیں کرتا۔ مادام دیوسنے اور ملازم کے آنے کی پروا بھی نہیں کرتا۔ میں صرف کھڑکی میں بیٹھ کر اس سے کھیلنا چاہتا ہوں +

مجھے یہ خوف محسوس ہو رہا ہے کہ کل کچھ ضرور رونما ہوگا +

جمعہ۔ ۱۸۔ مارچ۔ ہاں آج ضرور کچھ نہ کچھ ہوگا............

میں اونچی آواز میں باتیں کر رہا ہوں تاکہ یہ محسوس کر سکوں کہ میں یہاں موجود ہوں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے۔ میں یہ خوف بھی محسوس کر رہا ہوں کہ میرے پیشرؤوں کا کیا حشر ہوا اور پھر مجھ پر کلارا کا خوف بھی طاری ہے۔ لیکن میں ان دونوں خوفوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتا۔ ان کی نوعیت ایک ہی طرح کی معلوم ہوتی ہے +

مجھے اب خوف آرہا ہے۔ میں چیخنا چاہتا ہوں +

۶ بجے شام۔ کچھ الفاظ جلدی جلدی لکھ لوں اور پھر میں ٹوپی اور کوٹ پہن لوں گا +

پانچ بجے میری طاقت مجھے جواب دے چکی تھی۔ مجھے یہ یقین ہے کہ ہفتہ کے اس دن مجھے ضرور کوئی حادثہ پیش آئے گا....... اب میں اپنے کئے پر پچھتا رہا ہوں۔ میں کرسی پر بیٹھ کر اپنی قوتِ ارادی کا امتحان کر رہا ہوں۔ لیکن میں مجبور ہو کر کھڑکی کے قریب چلا گیا تھا۔ مجھے کلارا سے کھیلنا تھا۔ لیکن وہاں پھر مجھے کھڑکی سے خوف آنے لگا۔ وہاں مجھے اپنے پیشرو یاد آئے تینوں کھڑکی کے قریب لٹک رہے تھے پھر مجھے اپنی نعش بھی ان میں نظر آئی۔

آہ یہ کتنا خوفناک خیال ہے۔ روشندان کی رسی سے تمام آدمی لٹک رہے تھے اور کلارا ان کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ آہ۔ یہ بھی کتنا بیہودہ خیال ہے کیا کلارا میرے ان لغو جذبات کو معاف کر دے گی +

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ میں خودکشی کروں۔ میں خودکشی سے بھی نہیں ڈرتا۔ مجھے صرف کھڑکی، رسی اور کلارا سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ کسی خوفناک مبہم اور نامعلوم حادثے کے خیال سے میرے بدن میں کپکپی پیدا ہو رہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں کھڑکی کی طرف جانا چاہتا تھا، اور میں واقعی وہاں گیا..........

اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چونگا اٹھایا، اور کوئی آواز سننے سے پیشتر ٹیلیفون میں چلایا "آؤ۔ فوراً یہاں آؤ!"

ایسا معلوم ہوتا تھا میری چیخ سے تمام خوف مجھ سے ڈر کر پرے ہٹ گیا ہے اور میں مطمئن ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے پیشانی سے پسینہ پونچھا اور پانی کا ایک گلاس پیا۔ پھر میں نے سوچا کہ مشنر سے کیا کہنا چاہیئے آخرکار میں اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا۔ میں نے کلارا کو سلام کیا۔ کلارا نے ایک تبسم سے جواب دیا +

پانچ منٹ کے بعد مشنر یہاں پہنچ گیا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں نے معمے کا حل معلوم کر لیا ہے۔ اور اگر وہ آج مجھ سے کوئی استفسار نہ کرے تو میں مستقبلِ قریب میں اسے محیر العقول نتائج سے آگاہ کروں گا۔ عجیب بات یہ ہے کہ جب میں اس سے جھوٹ کہہ رہا تھا تو میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ بلکہ اب تک یہی محسوس کرتا ہوں ——————

میرا خیال ہے کہ وہ میرے اطوار سے میری صحیح کیفیت کو بھانپ گیا تھا۔ لیکن جب میں چیخ کے لئے کوئی معقول وجہ پیش نہ کر سکا تو اس نے نہایت شریفانہ طور پر مجھ سے کہا کہ وہ ہر وقت میری خدمت کے لئے تیار ہے، اور اطلاع ملنے پر فوراً حاضر ہو جائے گا۔ پھر اس نے مجھے شام کو اپنے ہمراہ چلنے کی دعوت دی ہے۔ میں نے اس کی دعوت قبول تو کر لی ہے لیکن اس کمرے کو چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا +

ہفتہ ۱۹ مارچ۔ میں کل کمشنر کے ہمراہ باہر چلا گیا تھا۔ پہلے پہل تو میری طبیعت کچھ اداس سی تھی۔ لیکن بعد میں ہم دونوں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ اور مختلف موضوعات پر دلچسپ گفتگو کرتے رہے ۔

آج صبح جب میں کھڑکی کے قریب گیا۔ تو میں نے یوں محسوس کیا جیسے کلارا مجھے فہمائش کر رہی ہے۔ لیکن اسے میری حرکات کا کیسے علم ہو سکتا ہے۔ غالباً یہ میرا واہمہ ہے۔ کیونکہ کچھ دیر کے بعد وہ بدستور مسکرانے لگی۔ اور ہم تمام دن کھیلتے رہے ۔

اتوار۔ ۲۰ مارچ۔ آج مجھے پھر یہی کہنا ہے کہ ہم تمام دن کھیلتے رہے۔

پیر ۔ ۲۱ ۔ مارچ ۔ ہم تمام دن کھیلتے رہے ۔

منگل ۔ ۲۲ ۔ مارچ ۔ ہم آج بھی ویسے ہی [illegible] رہے ۔ بعض دفعہ میں اپنے آپ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں ؟ آخر اس کا مدعا کیا ہے ؟ اس سے کیا حاصل ہو سکتا ہے ؟ اس کا نتیجہ کیا ہوگا ؟ لیکن میں اپنے سوالوں کا جواب نہیں [illegible] ۔ کیونکہ مجھے جو کچھ چاہئے وہ سب کچھ میسر آ رہا ہے ۔

آج ہم ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے ۔ لیکن بلند آواز سے نہیں صرف ہم دونوں کے ہونٹ ہلتے رہے ۔ کلارا مجھ سے ناراض تھی کہ میں جمعہ کی شام کو باہر کیوں چلا گیا تھا ۔ میں نے معافی طلب کی ۔ اس نے میرا گناہ بخش دیا ۔ اور ہم دونوں نے کھڑکی کے شیشوں سے ہونٹ لگا کر ایک دوسرے کو بوسہ دیا ۔

بدھ ۔ ۲۳ ۔ مارچ ۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اس محبت کی نوعیت مختلف سہی لیکن اس میں ہرج کیا ہے ۔ اس دنیا میں کون دو آدمی ایک دوسرے سے ملتے ہیں ؟ مجھے معلوم ہے کہ یہ نئی طرح کی محبت ہے لیکن میں [illegible] پر خوش ہوں ۔

لیکن یہ خواب میرا پیچھا نہیں چھوڑتا ۔ کبھی کبھی میں اسے بھول جاتا ہوں [illegible] گم ہو جاتا ہے ۔ لیکن [illegible] آ کر میرے دماغ پر سوار ہو جاتا ہے ۔ اچھا دیکھو [illegible] ہم دونوں اپنے ارادوں میں کامیاب ہو جائیں گے ۔ اس وقت ہماری محبت [illegible] ہو جائیگی ۔

جمعرات ۔ ۲۴ ۔ مارچ ۔ میں نے ایک راز معلوم کیا ہے ۔ کلارا سے میں نہیں کہونگا [illegible] مجھے [illegible] دن معلوم ہوا ہے ۔

[illegible] شام کو [illegible] پیچیدہ سی شکلیں بنائی تھیں ۔ اور بار بار ان کو [illegible] کلارا کا امتحان لینا چاہتا تھا ۔ اور میں نے یہ فیصلہ کیا تھا [illegible] ہوا میں بناؤنگا ۔ اور دیکھونگا کہ وہ میری [illegible] ایسا ہی کیا ۔ کلارا بلا پس و پیش میری نقل اتارتی رہی ۔ [illegible] دروازے پر دستک دی ۔ اور میں نے دروازہ کھول کر اس سے اپنے بوٹ لے لئے ۔ بوٹ رکھتے ہوئے میری نظر کاغذ پر پڑی اور میں یہ دیکھ کر بھونچکا سا رہ گیا کہ میں نے ان شکلوں میں سے ایک شکل بھی کلارا کے سامنے نہیں بنائی ۔ بلکہ میں کلارا کی حرکات کی نقل کرتا رہا ہوں ۔

تو حقیقت یہ ہے کہ میں غلط طور پر اپنے آپ پر نازاں تھا ۔ میں کلارا کو متاثر نہیں کر سکا بلکہ خود اس سے متاثر ہو رہا ہوں ۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اس کا اثر نہایت لطیف ہے ۔ اتنا لطیف اور اتنا خوشگوار کہ میں محسوس ہی نہیں کرتا ۔

پھر میں نے اور تجربات بھی کئے ہیں ۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈال لئے ۔ اور کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا ۔ کلارا نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھائے اور وہ مسکرائی ۔ میری انگلیاں جیب میں سے باہر نکلنے کے لئے بیتاب ہو گئیں ۔ لیکن میں انہیں زور سے دباتا رہا ۔ پھر کچھ منٹوں کے بعد میری طاقت ختم ہو گئی ۔ اور میرے بازو آہستہ آہستہ ہوا میں بلند ہونے شروع ہوئے ۔ حتیٰ کہ میں نے بالکل کلارا کے مطابق اپنے ہاتھ ہوا میں بلند کر دیئے ۔ بالآخر وہ مجھ پر [illegible]

لیکن میں نے اس راز کو معلوم کر کے کیا لیا ہے ۔ اس سے مجھے کیا فائدہ ہو سکتا ہے ۔ میں تو یہاں ٹھہرا ہی اس لئے ہوں کہ کلارا آہ پیاری کلارا کے ارشاد کی تعمیل کروں ۔

جمعہ ۔ ۲۵ ۔ مارچ ۔ میں نے ٹیلیفون کا تار کاٹ دیا ہے ۔ میں بار بار کمشنر کی باتیں نہیں سننا چاہتا ۔ خصوصاً اس وقت جب کہ منحوس لمحہ قریب آ رہا ہے ....

توبہ خدایا ! میں یہ سب کچھ کیوں لکھ رہا ہوں ۔ اس تحریر کا تو ایک حرف بھی صحیح نہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی غیبی طاقت میرا قلم چلا رہی ہے ۔ لیکن جو کچھ مجھے پیش آ رہا ہے وہ سب میں یہاں درج ضرور کرنا چاہتا ہوں ۔ مجھے اس کے لئے بہت کوشش کرنی پڑتی ہے ۔ لیکن میں یہ کرنا ضرور چاہتا ہوں ۔

میں نے ٹیلیفون کا تار کاٹ دیا ہے .... آہ اس کے سوا چارہ نہیں .... میں اس پر مجبور تھا ۔

آج صبح ہم کھڑکی کے پاس کھڑے ہوئے کھیل رہے تھے ۔ ہمارا کھیل کل سے کچھ تبدیل ہو گیا ہے ۔ وہ کچھ حرکات کرتی ہے اور میں اپنے آپ کو وہ حرکات کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہوں ۔ لیکن آخر کار مجھے شکست تسلیم کرنی پڑتی ہے ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کی نقل کرنے میں مجھے ناقابل بیان راحت محسوس ہوتی ہے ۔

ہم کھیلتے رہے ۔ پھر وہ دفعتاً اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی ۔ وہاں تاریکی اس قدر تھی کہ میں اسے دیکھ نہ سکتا تھا ۔ وہ تاریکی میں گم ہو گئی ۔ لیکن جلد ہی واپس آ گئی ۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹیلیفون تھا جیسا میرے پاس بھی ہے ۔ اس نے اسے کھڑکی میں رکھ دیا ۔ پھر ایک چاقو سے اس کا تار کاٹ دیا اور اسے اٹھا کر اندر رکھ آئی ۔

پندرہ منٹ تک میرے دل میں ایک کشمکش سی جاری رہی ۔ مجھ پر خوف طاری ہو گیا ۔ لیکن یہی خوف مجھے شکست پر مائل کر رہا تھا ۔ آخر کار میں اپنا

ٹیلیفون اٹھالایا - اور میں نے اس کا تار کاٹ کر اسے میز پر رکھ دیا - یہ ہے تفصیل اس واقعہ کی +

میز پر بیٹھا ہوا ہوں - چائے پی چکا ہوں اور ملازم ابھی ابھی برتن اٹھا کر لے گیا ہے - میں نے اس سے وقت پوچھا تھا - شاید میری گھڑی کا وقت ٹھیک نہیں - اس وقت پندرہ .... پندرہ ....

مجھے معلوم ہے کہ اگر میں اس طرف دیکھوں تو کلارا کوئی کام کر رہی ہوگی پھر مجھے بھی وہی کام کرنا ہوگا +

خیر میں اوپر دیکھتا ہوں - وہ وہاں کھڑی ہوئی مسکرا رہی ہے ....

اچھا ..... کاش میں اپنی آنکھیں اس کے چہرے سے ہٹا سکتا! ....

اب وہ روشندان کی طرف جا رہی ہے .... وہ دیکھو اس نے روشندان کی رسی کاٹ لی ہے - وہ رسی بالکل میری رسی کی طرح ہے - وہ اب ایک پھندا بنا رہی ہے - اب اس نے رسی کا دوسرا سرا کھونٹی سے لٹکا دیا ہے +

اب [illegible] کر مسکرا رہی ہے -

.... نہیں یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے خوف کہا جا سکے - یہ جنون انگیز جذبہ ہے - لیکن میں یہ جذبہ اپنے دل میں کسی قیمت پر پیدا نہیں کرنا چاہتا - یہ کسی نامعلوم قوت کا اثر ہے - لیکن کتنا خوفناک اثر ہے +

میں روشندان کی طرف جا سکتا ہوں اور وہ کام کر سکتا ہوں جو وہ مجھ کرنے کو کہتی ہے - لیکن میں انتظار کر رہا ہوں - اپنے آپ سے برسر پیکار ہوں اور اپنے جذبات کو دبا رہا ہوں - لیکن اس کے باوجود یہ خوفناک خیال ہر لحظہ مضبوط ہوتا جا رہا ہے ....

....

اب میں یہاں بیٹھا ہوا ہوں - میں دوڑ کر کھڑکی کی طرف گیا تھا اور اس کے حکم کی تعمیل کر چکا ہوں - میں نے رسی کاٹ کر اس کا پھندا بنا لیا ہے اور اسے کھونٹی سے لٹکا دیا ہے ....

اب میں اس کی طرف نہیں دیکھوں گا - اب میں یہاں بیٹھ کر اس کا غذ کو دیکھتا رہوں گا - کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ اگر میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ کیا کرے گی آج جمعہ کی شام ہے اگر میں نے اس کی طرف دیکھا تو مجھے اس کے حکم کی تعمیل کرنی پڑے گی ....

میں اس کی طرف نہیں دیکھوں گا +

لیکن میں اب قہقہے لگا رہا ہوں .... بلند قہقہے - نہیں میں تو نہیں ہنستا - کوئی چیز میرے اندر ہنس رہی ہے +

میں اس کی طرف دیکھنا نہیں چاہتا - لیکن دیکھوں گا ضرور ......

اور پھر ....

میں اپنے عذاب کی ساعتیں طویل کر رہا ہوں - بس یہی بات ہے ....

میں سرعت سے لکھ رہا ہوں تاکہ یہاں بیٹھا رہ سکوں .... تاکہ اپنے عذاب کو زیادہ کر سکوں ....

اب پھر مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے - میں اس کی طرف دیکھوں گا اور پھندا اپنے گلے میں ڈال لوں گا - لیکن یہ خوف مجھے محسوس نہیں ہوتا، نہیں —— بلکہ یہ تو نہایت ہی دلخوش کن خیال ہے +

وہ لیکن ایک اور بات ہے ...... ایک اور خوف ہے - مجھے یہ معلوم نہیں کہ وہ کیا ہے - لیکن کوئی واقعہ پیش آنے والا ہے - یہ واقعہ ضرور رونما ہوگا ....

میں اب کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا -

میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں، کچھ لکھنا، کوئی خاص چیز نہیں - صرف جلدی جلدی اور سوچنے کے بغیر ....

میرا نام رچرڈ - رچرڈ - رچرڈ - آہ اب میں آگے نہیں لکھ سکتا -

رچرڈ —— رچرڈ —— اب —— اب ——

میں ضرور اس کی طرف دیکھوں گا ...... رچرڈ —— میں ضرور ——

نہیں —— نہیں —— بالکل —— بالکل —— رچرڈ ......

رچرڈ ....

کمشنر نے ہوٹل میں بار بار ٹیلیفون کیا - لیکن جب اُسے کوئی جواب نہ ملا تو وہ کمرہ نمبر ۷ میں ۷ بجکر ۵ منٹ پر پہنچ گیا - وہاں رچرڈ کی نعش پہلی نعشوں کی طرح کھونٹی پر رسی سے لٹک رہی تھی - صرف اس کے چہرے کی مختلف کیفیت تھی - وہ خوف سے بالکل بگڑ گیا تھا - اس کی آنکھیں باہر کو نکلی پڑی تھیں - اس کے ہونٹ کھلے ہوئے تھے - لیکن اس کے مضبوط دانت ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے، اور ان کے درمیان ایک سیاہ مکڑی پھنسی ہوئی تھی - جس کا دانتوں نے پیس کر کچومر نکال دیا تھا +

میز پر طالب علم کی ڈائری پڑی ہوئی تھی - کمشنر نے اسے پڑھا اور فوراً سامنے کے مکان پر پہنچا - دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ مکان ایک عرصے سے خالی پڑا ہے +

نسیم رضوانی

محبّت

سانیٹ

محبّت لفظ تو سادہ سا ہے لیکن ضیاؔ اس میں
سمٹ آئی ہیں سب رنگینیاں گلزارِ ہستی کی
بیاں الفاظ میں اسکو کرے یہ تاب ہے کس میں
کہ یہ اک آخری منزل ہے راہِ کیف و مستی کی

محبت سے ہے وابستہ ترقی روحِ انساں کی
یہ رازِ عالمِ ایجاد سے آگاہ کرتی ہے
یہی تنظیم کرتی ہے خیالاتِ پریشاں کی
دلوں کو بے نیازِ حسنِ مہر و ماہ کرتی ہے

رواں ہیں میری رگ رگ میں محبت کی حسیں لہریں
میں ہر تارِ نفس سے راگنی الفت کی سنتا ہوں
تماشا حسن کا کرتا ہوں جب آئینۂ دل میں
محبت کی شباب آگینیوں پر سر میں دھنتا ہوں

محبّت کیلئے حاضر مرا دل ہے، مری جاں ہے
محبّت میرا مذہب ہے، محبّت میرا ایماں ہے

ضیاؔ فتح آبادی

پریت کی ریت

بُری بلا ہے پریت
اے پیتم!
بُری بلا ہے پریت

(۱)

برہ کے دکھ ہنس ہنس کر سہنا
منہ سے کوئی بات نہ کہنا
کم کم مِلنا، چُپ چُپ رہنا

یہ ہے پریت کی ریت
اے پیتم!
بُری بلا ہے پریت

(۲)

نا کہیں آنا نا کہیں جانا
سب سے جی کا بھید چھپانا
تنہائی میں بیٹھ کے گانا

جوگ کی دُھن میں گیت
اے پیتم!
بُری بلا ہے پریت

(۳)

آنکھ میں آنسو، بند زبانیں
بیکل جی میں، دُکھیا جانیں
کس کی سنیں اور کس کی مانیں

کون کسی کا میت
اے پیتم!
بُری بلا ہے پریت

(۴)

ڈوب چلے آکاش پہ تارے
درشن پیاسے پیتم پیارے!
دیکھ کھڑے ہیں جی کو ہارے

پریت کی ہار ہے جیت
اے پیتم!
بُری بلا ہے پریت

(۵)

پریت کے دکھ کو جی سے چاہیں
جیسے ہو یہ ریت نباہیں
پریت ہے ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں

پریت کی آگ ہے شیت
اے پیتم!
بُری بلا ہے پریت

حفیظ ہوشیارپوری

راگ

"راگ" میرے دوست چیتن دیو آنند کی ایک انگریزی نظم کا ترجمہ ہے۔ ان کے خیالات اور الفاظ کے حسن اور جذبات کی لطافت نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اسے اردو زبان میں منتقل کروں +

(۱)

راگ کی دیوی —
آسودگی کی جان!
میری روح
ایک طوفان زدہ
اور تھکی ماندی مرغابی کی طرح
جو دن بھر کی محنت کے بعد
اپنے مامن کی طرف لوٹتی ہے،
تیرے پاس آتی ہے
میٹھے اور سکون پرور خوابوں کی جستجو میں —

(۲)

نیم شب کی تاریکی
اور ہیبتناک خاموشی!
تاروں بھرے آسمان کے نیچے
مدھم روشنی میں
مندروں کے کھنڈر!
جیسے خیالی تصویروں کے موہوم عکس!
عالمگیر سکوت!
ایسے میں —
فضا کے ہر گوشے سے تیری آواز بلند ہوتی!

(۳)

کھنڈروں پر تیری عظمت چھا گئی!
تارے ٹمٹمائے!
تو نے اٹھ کر
مجھے اپنے دامن میں چھپا لیا؛
میں نے تیری آنکھیں دیکھیں،
اداس اور غمگین!
تیرے لمس میں ایک سرور تھا،
اور تیرے پہلو میں تسکین
جہاں میں چین کی نیند سو گیا،

(۴)

تو میرے دل کے
کسی عمیق گوشے میں نہاں ہے
کبھی کبھی تنہائی کے لمحوں میں
تو اس طرح بیقرار ہوتی ہے جیسے نیند میں بچے!
اور میرے خوابیدہ جذبات کو بیدار کر دیتی ہے
لیکن —
دنیا کس قدر بے رحم ہے
مجھے تیرے گیت سننے اور تجھ سے ہمکنار ہونے نہیں دیتی!
آہ! یہ قید خانے کی دیواریں،
بے جا نمود اور رسم و رواج کی حائل کی ہوئی
سنگین چٹانیں!
بے معنی آوازوں کی ہنگامہ آرائی،
اور مالستی ہنسی،
کیا تیرے نغمے بھی
انہیں چپ نہیں کر سکتے؟
تیری تانوں کی امید افزا گونج اٹھتی ہے
اور مجھے دیوانہ بنا کر فضا میں کھو جاتی ہے،

(۵)

صبح کے وقت
کھیتوں میں سورج کی کرنوں کو
کمزور اور ژالہ زدہ پودوں کو چھوتے ہوئے دیکھا
سمندر کی لہریں بھی ان چٹانوں کو چومتی ہیں
جن پر بجلی گر چکی ہو۔
اسی طرح
جب غیر معمولی ملاقاتوں کے ہاتھوں زندگی تلخ ہو جاتی
تو میں بھی اُس تسکین اور راحت کو محسوس کرتا ہوں
جو تو میرے زخم رسیدہ دل کو پہنچاتی ہے،

(۶)

راگ کی
غیر فانی دیوی!
تیرا غم بھی سرور انگیز ہے۔
تو مجھے اپنے بازوؤں میں
لوریاں دیتی ہے،
اور تیرے مدھ بھرے گیت
جو شیر مادر سے زیادہ شیریں ہیں
میرے دل کو زندگی کی جاوداں خوشیوں
اور راحت آمیز تکلیفوں سے آشنا کرتے ہیں"

حفیظ ہوشیارپوری

ایک پنجابی گیت

"پنجابی ڈراما لکھنے میں ایک دقت یہ بھی ہے کہ اس زبان میں مناسب حال گانے نہیں ملتے اور ابھی تک ہندوستانی تھیئٹر گانے کے بندھنوں سے آزاد نہیں ہوا اور بظاہر یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایسا ناٹک جس میں عمدہ گانے شامل نہ ہوں پبلک سٹیج پر کامیاب ہو سکے گا" یہ تھی رائے ایک ماہرِ فن کی جو اس نے ایک ملاقات کے دوران میں ظاہر کی +

قمری مہینے کی درمیانی تاریخیں تھیں، شام ہو رہی تھی، چاند نکل آیا۔ ہم ابھی تک پبلک باغ کی روشوں پر گھوم رہے تھے۔ ذرا سستانے کے لئے ایک بھدی سی بنچ پر بیٹھ گئے۔ چاندنی سارے باغ میں پھیل گئی +

ڈراما نویس نے کہا "مثلاً یہی چاندنی کا سماں دو۔ ڈرامے میں اکثر ایسا منظر پیش کیا جاتا ہے۔ ایک یورپین مصنف کو ایسے موقع پر یونان اور روما کے افسانوں کا خزینہ مل جاتا ہے۔ جس میں سے وہ حسبِ خواہش اپنے خیالات کی تزئین کر سکتا ہے۔ اُردو میں بھی بیسیوں روائتیں چاندنی رات سے منسوب ہیں اور سینکڑوں تو اشعار ہیں جن میں کئی اس وقت بھی میری زبان پر آ رہے ہیں۔ لیکن پنجابی؟ میں تو نہیں جانتا کہ کوئی بھی روایت پنجابی میں چاندنی رات سے منسوب ہو۔ مجھے تو کوئی شعر بھی یاد نہیں جو اس موقع کے حسبِ حال ہو"

شام کی چہل قدمی یا ریل کے سفر میں بیسیوں ہی ایسے موضوع ہوتے ہیں۔ جن پر اظہارِ خیال ہوتا رہتا ہے۔ لیکن یہ ضروری خیال نہیں کیا جاتا کہ سیر سے واپسی پر یا پلیٹ فارم پر اترنے کے بعد ان مباحث پر مزید "میاں گرائی" کی جائے۔ لیکن آج خلافِ معمول، شام کا موضوع ذہن سے نہ اُترا۔ بار بار وہی خیالات دماغ میں گھومتے اور رہ رہ کر پنجابی کی بے مائگی پر افسوس ہوتا +

چاند اب بلند ہو چکا تھا اور چاندنی ہر طرف پھیل رہی تھی +

چاند قدرت کی حسین ترین چیزوں میں شمار ہوتا ہے۔ اسے پکڑنے کو بچہ اپنی ماں کی گود میں اچھلتا ہے۔ مگر فقط اس وقت تک جب کہ ماں کی گود اس کا گہوارہ ہے، جب تک دنیا اور اس کی چیزیں اسے کھلونے نظر آتے ہیں، جب اسے حقائق سے دوچار ہونا پڑے، جب اسے یہ معلوم ہو جائے کہ دنیا اس کے لئے ایک خوش کن کھلونا نہیں بلکہ وہ خود دیوتاؤں کے تفننِ طبع کے لئے محض ایک کھلونے کی حیثیت رکھتی ہے، جب قدرت اس کے جذبات اور اس کی امنگیں نہایت سنگدلی سے پامال کر کے رکھ دے تو اس محرومِ تمنا کے لئے چاند مسرتوں کا پیغامبر نہیں افسانۂ یاس و حسرت کا قاصد بن کر نکلتا ہے۔ بڑھتی ہوئی چاندنی سے طبیعت میں بکلی پیدا ہوتی ہے، گویا کوئی دل کو مسوس رہا ہو +

میں بھی آج یہی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ کیا یہ سچ ہے "پنجابی میں گانے نہیں ملتے" اور پنجابی میں کوئی روایت بھی چاندنی رات سے منسوب نہیں"؟

میں اس ادھیڑ بن میں یکدم چونک سا پڑا، کوئی میری حرماں نصیبی کی داستان کہہ رہا تھا۔ روح کی افسردگی ایک نغمۂ دلگداز بن کر فضا میں گونج رہی تھی۔ یہ ایک نوعمر لڑکا تھا جو گا رہا تھا ۔۔

"وے بیبا! راتاں چاننیاں لگ رہیاں"

لڑکے کا پُرکیف نغمہ، اس کی آواز کا سوز و گداز، روح کی گہرائیوں میں سازِ غم چھیڑ رہا تھا ۔۔

"وے بیبا! راتاں چاننیاں لگ رہیاں"

سادہ الفاظ تھے ۔۔ لیکن غم میں ڈوبے ہوئے۔ لڑکے کی آواز پھر گونج اٹھی ۔۔

"باہر گیوں پھر آیوں ناہیں ۔۔ باہر گیوں
ہاں! ہاں!! ہاں رے!!! باہر گیوں پھر آیوں ناہیں نا۔ نا۔ ناہیں!
نت اُوڈیکاں لگ رہیاں!
وے بیبا! راتاں چاننیاں لگ رہیاں!"

پرانی داستانِ فراق کیسے سادہ اور مؤثر الفاظ میں! اس پر چاندنی کی افسردگی اور دنیائے عشق میں اس کی فریب کاریوں کا احساس، لڑکے کی سحر انگیز آواز اور اس کا پُرجوش نغمہ۔ کیا اُس کا بھی کوئی بے وفا محبوب تھا؟ ہمیں پوچھنے کی ضرورت ہی کو تھا کہ فضا پھر گونج اُٹھی

"بیبا وے ۔ قاتل!

سلہ میں نے لڑکے کی سریلی تانوں کو بجنسہٖ قلمبند کر دیا ہے جو لوگ پنجابی جانتے ہیں اُن کو ان اشعار کی موسیقی کے تصور سے زیادہ لطف حاصل ہوگا +

ہاں بیبا راتاں!

چانَنیاں لگ رہیاں

مینہ وی آیا ــ اندھی وی آئی

ہاں رے! ہاں!! ہاں!!! مینہ وی آیا!

ہاں! مینہ وی آیا، اندھی وی آئی

باہر کھلوتی بھِج گیاں ــ وے بیبا

وے بیبا، راتاں، چانَنیاں لگ رہیاں!

محویت کی انتہا ہے۔ لڑکے کا گیت ایک طویل افسانۂ غم لئے ہوئے ہے۔ عاشق مہجور چاندنی رات میں جائے متعینہ پر پہنچتا ہے۔ دل میں امیدوں کی ایک دنیا بس رہی ہے، نگاہیں کسی کے انتظار و جستجو میں آوارہ ہیں، مقررہ وقت آہستہ آہستہ گزرتا جا رہا ہے اور معشوق کا کہیں پتہ نہیں۔ شکوک، شبہات، رقابت امڈ امڈ کر روح پر یلغار کرتے ہیں۔ مگر امید ہے کہ سب کا مقابلہ کر رہی ہے۔ معلوم نہیں کس وقت بادل چھانے شروع ہوئے اور کب چاند چھپا۔ عاشق ان سے بے خبر، اپنے جذبات کو دبائے قیاس آرائیاں کر رہا ہے۔ وقتِ مقررہ کب کا گذر چکا ہے مگر دل واپس جانے کو نہیں مانتا۔ یکا یک ایک ہولناک طوفان اٹھتا ہے: تند ہوا، آندھی اور ساتھ ہی موسلا دھار بارش، مگر جو طوفان عاشق کے دل میں بپا ہے وہ بادوباراں کے طوفان سے کہیں زیادہ ہولناک ہے۔ غم و غصہ اور جوشِ رقابت ایک طرف، محبت، وفا اور خود فراموشی دوسری طرف مقابلہ میں صف آرا ہیں۔ پہروں وہیں کھڑا رہتا ہے۔ بالآخر اس باہمی آویزش سے جذبات تھک جاتے ہیں اور ایک ہجومِ یاس دل کو گھیر لیتا ہے۔ اب عاشق گرد و پیش کے حقائق سے آگاہ ہوتا ہے۔ بارش کا ایک سیلاب ہے، کپڑے بھیگ رہے ہیں اور چاند کہیں تاریکیوں میں روپوش ہے۔ معشوق کی بے وفائی کا خیال دل میں چٹکیاں لے رہا ہے اور زبان پر حرفِ شکایت آتا ہے۔

حسن گویا اب دور پہنچ چکا تھا۔ مگر آواز نہایت پُرسوز تھی۔

"مینہ وی آیا ــ اندھی وی آئی ــ"

ہاں! مینہ وی آیا، اندھی وی آئی

باہر کھلوتی! ہاں!!

باہر کھلوتی بھِج گئیاں ــ

وے بیبا! راتاں ــ

اب الفاظ سنائی نہ دیتے تھے۔ صرف ایک مانوس نغمہ تھا جو روح کو تڑپائے جا رہا تھا۔ میں پہروں اسی طرح دم بخود بیٹھا رہا۔ اُف یہ پُرسوز نغمہ روح کی گہرائیوں میں اتر رہا تھا۔

دوسرے دن شام کے وقت جب ڈراما نویس سے پھر ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے معمول سے زیادہ خاموش دیکھ کر اس کی وجہ پوچھی۔ میں پہلے تو چپ ہو رہا لیکن پھر آہستہ سے بولا:۔

"کل جو آپ نے فرمایا تھا وہ سراسر غلط ہے!"

اس نے حیران ہو کر پوچھا "کیا؟"

میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا "پنجابی گانوں کے متعلق! ہاں، بالکل غلط!!"

نہ معلوم اس نے میرے چہرے سے کیا اندازہ لگایا اور میرے کلام سے کیا سمجھا کہ پھر اس ذکر کو نہ چھیڑا۔

محمد حسین غازی

رباعی

نغمہ ہوں میں اس سرحدِ اقلیمِ مجاز

اب دوسری منزل میں ہیں یہ راز و نیاز

وہ کعبۂ مقصود و منظرِ راز ہے

اے راہروِ عشق تیری عمر دراز

نجم ندوی

غزل

کچھ مسرت ہے وفا پر ان کو مائل دیکھ کر
کچھ ہے مایوسی ہجومِ حسرتِ دل دیکھ کر

تھا جگر کو بھی جگرداری کا دعویٰ عشق میں
خون ہو کر بہہ گیا بربادیٔ دل دیکھ کر

حال میرا میرے مستقبل کی دیتا ہے خبر
اپنی کشتی کو بھی دیکھا سوئے ساحل دیکھ کر

کون سمجھے مدعا کیا ہے نگاہِ ناز کا
کچھ کیا ارشاد اس نے جانبِ دل دیکھ کر

سعی و محنت کی حقیقت آج دہقاں کو کھلی
برقِ خاطف کو بلا گردانِ حاصل دیکھ کر

آرزو کا خون ہونا ہے یہ ظاہر ہو گیا
آج مجھ کو رنگِ استغنائے قاتل دیکھ کر

خود بخود آ ہی گیا کچھ شیوۂ عرضِ نیاز
اس سراپا ناز کو اپنے مقابل دیکھ کر

دیدۂ مشتاق کی حرماں نصیبی کیا کہوں
پھر نہ کچھ دیکھا گیا ان کو مقابل دیکھ کر

میاں سے نکلی ہے شمشیرِ جفا کھنچی ہوئی
اب اگر دم لوں تو لوٹوں میں خونِ بسمل دیکھ کر

کام اپنے منحصر ان کی مروّت پر رکھے
میں نے عرضِ مدعائے دل کو مشکل دیکھ کر

بے خبر منزل سے ہیں وہ سالکانِ راہِ عشق
جو قدم رکھتے ہیں راہ و رسمِ منزل دیکھ کر

رفتہ رفتہ دل نے اپنا شیوہ بے تابی کیا
عشق میں آئینِ خودداری کو مشکل دیکھ کر

وقتِ آخر چشمِ عبرت نے بہائے اشکِ یاس
عمر بھر کی کاوش و کوشش کا حاصل دیکھ کر

امتحانِ عشق و ہوس کا ہو نہ کھا جانا فریب
دیکھ کر اے حسن فرقِ حق و باطل دیکھ کر

آئے تھے افسردہ دل ہم اب ہیں اک برقِ تپاں
محفل افروزی تری او شمعِ محفل دیکھ کر

دل بھی نازک دل کا افسانہ بھی نازک کیا کریں
ہم غزل پڑھتے ہیں وحشت رنگِ محفل دیکھ کر

رضا علی وحشت کلکتوی

اقرارِ گناہ

مارگیرٹ مر رہی تھی۔ اگرچہ اس کی عمر چھپن برس کی تھی مگر وہ پچہتر سال کی معلوم ہوتی تھی۔ وہ جلد جلد سانس لے رہی تھی۔ اس کا رنگ بستر کی چادر سے زیادہ سفید ہو رہا تھا۔ اس کا جسم مارے خوف کے تھرا رہا تھا۔ اس کا منہ سکڑ رہا تھا۔ اور آنکھیں بے نور ہو رہی تھیں، جیسے اس نے کسی خوفناک چیز کو دیکھ لیا ہو۔

اس کی بہن سوزن، جو اس سے عمر میں چھ سال بڑی تھی، اس کے بستر کے قریب گھٹنوں کے بل جھکی سرد آہیں بھر رہی تھی۔ نیم جان مارگیرٹ کی چارپائی کے قریب ایک چھوٹی سی میز رکھی تھی۔ میز کے اوپر دو شمعیں جل رہی تھیں۔ وہ سب کے سب پادری کے انتظار میں بیٹھے تھے، تاکہ وہ اپنی آخری دعا سے مارگیرٹ کو تسکین دے۔

کمرہ موت کا بھیانک منظر پیش کر رہا تھا۔ دواؤں کی شیشیاں میزوں پر بکھری پڑی تھیں۔ پردے پریشان حالت میں کونوں میں پڑے تھے تاکہ آمد و رفت میں مزاحم نہ ہوں، بے ترتیب کرسیوں سے بیم و یاس کے آثار نمایاں تھے۔ الغرض موت وہاں اپنا تسلط جمانے کے لئے تیار تھی!

ان دونوں بہنوں کی کہانی بڑی درد انگیز تھی، اور دور دور تک مشہور تھی۔ جو کوئی بھی اسے سنتا تھا اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے تھے۔

سوزن، بڑی بہن، ایک ایسے نوجوان شریف زادے کی الفت کا دم بھرتی تھی جو اس سے بیحد محبت کیا کرتا تھا۔ ان دونوں کی نسبت ٹھہر چکی تھی، اور سوزن شادی کے دن کا نہایت بے صبری کے ساتھ انتظار کر رہی تھی کہ ہنری، اس کا منگیتر، اچانک مر گیا۔

یہ روح فرسا خبر سن کر سوزن مایوسی کے بے پناہ سمندر میں ڈوب گئی۔ اور اس نے اعلان کر دیا کہ وہ کبھی شادی نہیں کرے گی۔ اس نے اپنے عہد کو نہایت صبر کے ساتھ قائم رکھا اور ہمیشہ ایک بیوہ کا سا ماتمی لباس زیبِ تن کئے رہی۔

ایک دن اس کی چھوٹی بہن، مارگیرٹ جو اس وقت بارہ سال کی تھی اس کے پاس آئی اور بڑی بہن کے آغوش میں اپنے آپ کو پھینک کر بولی۔

"بہن! میں تمہیں اس غمزدہ حالت میں نہیں دیکھ سکتی۔ میں نہیں چاہتی کہ تم تمام عمر آہ و زاری میں گزار دو۔ میں تمہیں کبھی تنہا نہیں چھوڑ سکتی میں تا دمِ زیست تمہارے ساتھ رہوں گی۔"

سوزن نے اس کی معصومانہ باتوں سے متاثر ہو کر اور ان کو محض طفلانہ خیال کرتے ہوئے اس کو چوما اور بہت پیار کیا۔

مگر چھوٹی بہن اپنے عہد پر استقلال سے قائم رہی اور باوجود والدین کے کہنے سننے اور بڑی بہن کی درخواستوں کے اس نے شادی نہ کی۔ وہ نہایت خوبصورت تھی، اور کئی ایسے نوجوانوں کی درخواستوں کو مسترد کر چکی تھی جو اس سے سچی محبت کے دعویدار تھے، مگر اس نے اپنی بہن کی جدائی گوارا نہ کی۔

دونوں بہنیں زندگی بھر اکٹھی رہیں اور کبھی ایک دوسری سے جدا نہ ہوئیں مگر مارگیرٹ سوزن سے ہمیشہ زیادہ اداس اور غمگین رہا کرتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے ایثار نے اس کے جذبات کو ہمیشہ کے لئے نابود کر دیا ہے۔ وہ قبل از وقت بوڑھی ہو گئی اور تیس سال کی قلیل عمر میں اس کے سر کے بال سفید پڑ گئے۔ وہ اکثر اوقات بیمار رہا کرتی تھی، اور کوئی اندرونی مہلک عارضہ اُسے اندر ہی اندر بڑی سرعت سے کھائے جا رہا تھا۔ اب وہ قریب المرگ تھی۔

اس نے چوبیس گھنٹوں سے کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالا تھا۔ صرف صبح کے وقت یہ کہا تھا:۔

"جاؤ، پادری کو جلد بلا لاؤ ——— میرا آخری وقت آ پہنچا ہے۔"

وہ خاموشی سے اپنی پیٹھ کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی اس کا جسم مارے خوف کے تھرا جاتا تھا۔ اس کے ہونٹ کبھی کبھی جنبش کرتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس کے دل سے بیتابی کی الفاظ اُٹھتے ہیں مگر قوتِ گویائی سلب ہو چکنے کے باعث اندر ہی رہ جاتے ہیں۔ اس کی آنکھیں خوف کی وجہ سے وحشت برسا رہی تھیں اور اس کی نگاہیں اضطراب آمیز معلوم ہوتی تھیں۔

"مارگیرٹ، معصوم، عاجز، آہ میری ننھی مارگیرٹ!"

سوزن اسے ہمیشہ "ننھی" کہکر پکارا کرتی تھی۔ اور مارگیرٹ اپنی بڑی بہن سوزن کو ہمیشہ "آپا" کہکر مخاطب کرتی تھی +

اسی اثنا میں سیڑھیوں پر پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ دروازہ کھلا [illegible] لڑکا نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے ایک بوڑھا پادری، جبے میں ملبوس د[illegible]ا۔ جونہی کہ نیم مردہ عورت نے اسے دیکھا وہ بے قرار ہوگئی اور ہوش میں آکر اٹھ بیٹھی۔ اس نے اپنے ہونٹ ہلائے، دو تین الفاظ منہ سے نکالے اور پھر خاموش ہوگئی +

پادری سائمن اس کے پاس گیا۔ اور اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ پھر کہنے لگا "میری بچی! خدا تمہیں معاف کر دے ہوشیار ہو جاؤ۔ آخری وقت آ پہنچا ہے۔ کہو، جو کچھ کہنا چاہتی ہو!"

مارگیرٹ جو سر سے پاؤں تک لرز رہی تھی اور جس کی تھرتھراہٹ سے تمام پلنگ جنبش کر رہا تھا، لکنت آمیز لہجے میں بولی "بیٹھ جاؤ، میری بہن! اور سنو"

پادری سائمن نے سوزن کو جو بستر کے پاس ہی لیٹی تھی، قریب آنے کو کہا۔ پھر اس نے مارگیرٹ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دعا کی:۔

"اے خدا اس کو قوت عطا فرما۔ اور اس پر رحم کھا"

ان جادو اثر الفاظ کے سنتے ہی مارگیرٹ نے بولنا شروع کر دیا۔ الفاظ [illegible] اس کے گلے سے تیز اور صاف آواز میں نکل رہے تھے +

"تم! تم! بہن مجھے معاف کر دو! اے کاش تم کو معلوم ہو جائے کہ میں ساری عمر اس لمحے سے کس درجہ خائف رہی!"

سوزن نے رکتی ہوئی زبان سے کہا "ننھی! کس گناہ کی پاداش میں میں تمہیں معاف کروں" "تم نے ہر طرح سے مجھے مدد دی۔ اور ہر ایک چیز مجھ پر قربان کی۔ تم فرشتوں کی طرح معصوم ہو!"

مگر مارگیرٹ نے اس سلسلۂ کلام کو قطع کرتے ہوئے کہا:۔

"خاموش، خاموش رہو........ مجھے بولنے دو........ مجھے مت روکو........ میری داستان بڑی دہشتناک ہے........ آہ مجھے تمام کی تمام بیان کرنے دو........ سنو! تمہیں یاد ہے ہنری کا نام تمہیں یاد ہے!"

یہ سن کر سوزن کانپ گئی، اور اس کی طرف دیکھنے لگی۔ چھوٹی بہن نے کہا:۔

"اگر تم اس کہانی کو سمجھنا چاہتی ہو تو تمام کی تمام سنو........ میں اُس وقت بارہ برس کی تھی —— صرف بارہ برس کی —— تمہیں یاد ہے! میں بہت خودسر ہوگئی تھی۔ جو چاہتی تھی کیا کرتی تھی۔ تمہیں یاد ہے نا میری خودسری؟ اچھا تو اب سنو!........ پہلی دفعہ جب وہ آیا، وہ اونچی ایڑی والے چمکدار بوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے سیڑھیوں کے بالمقابل بوٹ اوتار دیئے........ تمہیں یاد ہے نا........ بولو مت! غور سے سنو!........ جب میں نے اسے ایک نظر دیکھا تو یہ خیال میرے دل میں چٹکیاں لینے لگا کہ وہ نہایت، حسین و جمیل ہے، اور جب تک وہ گفتگو کرتا رہا میں بیٹھک کے کونے میں چھپ کر اس کی طرف دیکھتی رہی........

آہ بچپن کتنا سادہ، اور غیر مآل اندیش ہوتا ہے!

"وہ کئی دفعہ ہمارے ہاں آیا........ میں بصد شوق ظاہری اور دل کی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی........ میں اپنی عمر کے لحاظ سے زیادہ ہوشمند واقع ہوئی تھی۔ اور عام لوگوں سے کئی گنا زیادہ فہم و ادراک رکھتی تھی........ وہ اب اکثر آیا کرتا تھا........ میں بس اُسی کی شیریں یاد میں ہر وقت سرشار رہا کرتی تھی اور وفور شوق میں آہستہ آہستہ اس کے نام —— ہنری —— کا ورد کیا کرتی تھی!

"پھر یہ بات میرے کانوں تک پہنچی، کہ اس کی شادی تم سے ہونیوالی ہے........ میرے لئے یہ خون آشام غم ناقابل برداشت تھا —— آہ کیا بتاؤں، کس قدر جانفرسا غم تھا —— میں نے پوری تین راتیں آہ وزاری میں جاگتے گذار دیں، اور ایک لمحہ بھی نہ سوئی —— وہ ہر روز پچھلے پہر دوپہر کے کھانے کے بعد آیا کرتا تھا........ تمہیں یاد ہے نا؟... بس خاموش رہو اور سنو! تم اس کے لئے کیک طیار کیا کرتی تھیں، جن کا وہ بہت مشتاق تھا —— آٹے، مکھن، اور دودھ کے کیک! ——

آہ اب بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تم کس طرح انہیں بنایا کرتی تھیں اور اگر اب مجھے تیار کرنے پڑیں تو اسی وقت بنا کر دکھا سکتی ہوں........ وہ ایک نوالے میں ان کو نگل جایا کرتا تھا، اور اوپر سے شراب کا گلاس غٹ غٹ پی لیا کرتا تھا........ پھر کہا کرتا تھا "کتنے لذیذ ہیں؟ کتنے خوش ذائقہ ہیں!" تمہیں یاد ہے نا؟ وہ یہ الفاظ کہا کرتا تھا +

"میں حسد کی آگ سے جل رہی تھی........ تمہاری شادی کا دن قریب آرہا تھا۔ صرف دو ہفتے باقی رہ گئے تھے........ میں پاگل ہو رہی تھی۔ اور اپنے آپ سے کہا کرتی تھی "میں اس کی شادی سوزن سے

ہرگز نہ ہونے دوں گی —— نہیں ہرگز نہیں —— ہاں میں میں ہی اس سے شادی کروں گی میں اب سیانی ہوچکی ہوں...... مجھے کسی دوسرے شخص سے ہنری کی سی والہانہ محبت نہیں ہوسکتی!

"پھر ایک شام، شادی سے دس دن پہلے، میں نے تمہیں گھر کے سامنے، چاندنی رات میں پھرتے دیکھا...... اس نے صنوبر کے درخت کے نیچے تمہارے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ پیوست کردیئے تھے،......

...... اور فرطِ محبت سے اپنی آغوش میں تمہیں لے لیا تھا...... تم یہ سب کچھ بھول تو نہیں گئیں ......؟ شاید وہ پہلا دن تھا کہ اُس نے اظہارِ محبت کیا تھا...... ہاں تو، جب تم کمرے میں واپس آرہی تھیں، تمہارے چہرے کا رنگ اُڑا ہوا تھا +

میں نے تمہیں اس حالت میں دیکھ لیا تھا...... میں اس وقت ڈیوڑھی میں تھی، اور فرطِ غیض و غضب میں آپے سے باہر ہو رہی تھی...... اگر میرے بس میں ہوتا تو تم دونوں کو وہیں مار ڈالتی!

"میں نے اپنے دل میں کہا 'میں سوزن سے اس کی شادی نہ ہونے دوں گی —— نہیں، ہرگز نہیں ہونے دوں گی...... وہ میرے سوا کسی اور سے شادی نہیں کرسکتا...... اگر ایسا ہوا تو میری زندگی تلخ ہوجائے گی'، اور ان ہی خیالات میں محو میں حقارت سے اس کی طرف دیکھنے لگی!

"تمہیں معلوم ہے پھر میں نے کیا کیا......؟ لو سنو! میں نے باغبان کو آوارہ کتے مارنے کے لئے مہلک گولیاں بناتے دیکھا تھا...... وہ شیشے کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے اس کا سفوف بنالیا کرتا تھا، اور گوشت کا گولا بنا کر اس میں اس کو رکھ دیا کرتا تھا!

"میں نے اماں کے کمرے سے ایک چھوٹی سی شیشی لے کر اس کو ہاون دستے سے کوٹا۔ اور سفوف کو اپنی جیب میں چھپائے رکھا۔ وہ بہت چمکدار سفوف تھا...... دوسرے دن جب تم نے کیک طیار کئے تو میں نے چاقو سے شگاف کرکے ان میں وہ سفوف بھر دیا...... اُس نے تین کیک کھا لئے اور ایک میں نے کھایا...... اور باقی چھ کیکوں کو میں نے جوہڑ میں پھینک دیا...... جوہڑ کی دونوں بطخیں ان کو کھا کر دوسرے دن مرگئیں......

"خاموش رہو...... اور سنو! صرف میں ہی تھی جو بچ رہی مگر اُس وقت سے لے کر آج تک بیمار رہتی ہوں...... ہاں تو، وہ مرگیا

...... تمہیں معلوم ہوگا...... اُس وقت تو نہیں مگر بعد میں یہ خیال میری آنکھوں کے سامنے بھیانک صورت میں پھرنے لگا +

"میری زندگی، آہ میری ناتمام زندگی، نہ ختم ہونے والے مصائب کی آماجگاہ بنی رہی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا، میں اپنی بہن کو تنہا نہیں چھوڑوں گی، اور یہ غم بھری داستان موت کے وقت اسے سناؤں گی ...... اور اس وقت سے لے کر آج تک اسی وقت کا انتظار کر[illegible]......

.... اب وہ گھڑی آپہنچی ہے...... کتنی ہیبتناک، آہ بہن! کتنی جان گسل ہے یہ گھڑی!

"ہر وقت، صبح، شام، دن، رات یہ خیال میرے دل میں سمایا رہتا تھا کہ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب میں اپنی بہن کو حقیقت سے آشنا کروں گی...... میں اس گھڑی کا انتظار کرتی رہی......

اب میں ڈر رہی ہوں...... ہائے اب کس قدر خائف ہوں!

.... میں اب مر رہی ہوں اور تم سے التجا کرتی ہوں کہ تم مجھے معاف کردو...... اگر تم معاف نہ کروگی تو مر کر بھی میں اس سے ہمکنار نہیں ہوسکوں گی...... 'اے میرے رہنما پادری! میری بہن سے کہو کہ مجھے معاف کردے...... میں تم سے منت کرتی ہوں...... اس سے کہو...... میں اس کی معافی کے بغیر کبھی نجات نہیں حاصل کرسکتی!"

اس طویل گفتگو کے بعد وہ خاموش ہوگئی، اور ہانپتی ہوئی لیٹ گئی اور اپنی پریشان انگلیوں سے بستر کو نوچنے لگی......

سوزن نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور بالکل بے حس ہوگئی، وہ اُس آدمی کی یاد کو تازہ کر رہی تھی جس کے ساتھ اس نے بہت عرصہ پہلے محبت کی تھی۔ آہ اُسوقت ان دونوں کی زندگی کس درجہ خوشگوار اور روح افزا تھی۔ سوزن کے تصور نے ہزاروں سال کے حجابوں کو چاک کرکے پھر اس کا محبوب سامنے لا کھڑا کیا —— "آہ اے محبوب! تم نے میرے دل کو چھلنی کردیا ہے!" سوزن نے کہا۔

پادری اُٹھا اور لرزہ خیز بلند آواز میں کہنے لگا:۔

"سوزن تمہاری بہن مر رہی ہے"!

سوزن نے اپنے اشک آلود چہرے پر سے ہاتھ ہٹا لئے اور اپنی بہن پر گرتے ہوئے گرمجوشی سے اس کو چوما اور کہا۔

"میں تمہیں معاف کرتی ہوں...... میں تمہیں معاف کرتی ہوں...... ننھی!"

(موپساں) طاہر قریشی

غزل

صبح [illegible] روئی جو دیکھا اپنے دیوانے کا حال
شمع پر روشن نہ ہوتا کاش پروانے کا حال

خُم اِدھر ٹوٹا پڑا ہے اور ساغر اُس طرف
بس سمجھ لے اب اسی سے کوئی میخانے کا حال

کچھ تو کہہ اے آئینہ تو بھی تو اُس محفل میں تھا
کم سے کم کچھ زلف کی رُوداد کچھ شانے کا حال

ہر کتابِ زندگی دو باب پر ہے منقسم
ایک تو اپنی کہانی ایک بیگانے کا حال

رات یوں گردش میں تھی محفل میں اُس کی چشمِ مست
جس طرح ہوتا ہے وقتِ دورِ پیمانے کا حال

ایک میں حق کی پرستش ایک میں باطل کا زور
ایک ہے کعبے کا عالم اور بت خانے کا حال

جھاڑتے رہتے ہیں دامن ان کو کیا کیا وہم ہے
کہہ دیا کس نے مرے مٹی میں ملجانے کا حال

اپنے حصّے کی سیاہی دے بھی دے اے شامِ غم
لکھ ہی ڈالوں آج میں اپنے سیہ خانے کا حال

قیس دشتِ آرزو میں ٹھوکریں کھاتا پھرا
دیکھ لو حد سے زیادہ پاؤں پھیلانے کا حال

نجمؔ اک عرصہ ہُوا تائب ہوئے لیکن ہنوز
پُوچھتا رہتا ہوں ہر مےکش سے میخانے کا حال

نجم ندوی بی اے

دلّی کے لال قلعے کی ایک جھلک

مغل شاہنشاہوں نے جس قلعے سے دنیا کے دِل پر اپنی شان و شوکت کا سکہ جمایا، جہاں عیش و طرب، رنگ رلیوں کے سامان مہیا کئے اس قلعے کو وہ اپنی عظمت کا مدفن بنا کر چھوڑ گئے - سیاح ان مرمریں محلوں میں بیٹھ کر بادِ لطیف کی مست موجوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں، اور ان کی صنعت کو دیکھ کر محوِ حیرت ہو جاتے ہیں - لیکن کیا وہ کبھی یہ بھی سوچتے ہیں کہ کبھی یہاں فردوس کے عیش و سرود ہیچ سمجھے جاتے تھے - یہ سنسان محل کبھی نازآفریں شہزادیوں کی شیریں آوازوں سے گونجتے رہتے تھے +

قلعے کے اندر کیا ہے؟ شاعر اپنی ساری قوتِ متخیلہ صرف کر کے بھی اس کا جواب نہ دے سکتا تھا - انسان تو کیا وہاں فرشتوں کا بھی گذر نہ تھا - اور آج؟ اس مرمریں تخت پر جس کے اوپر تختِ طاؤس رکھا جاتا تھا دیوانِ خاص میں جو کہ شہنشاہِ عالم کی جگہ تھی - ہر بیخوف و خطر بیٹھنے میں کوئی مانع نہیں ہوتا -

آج سے سو برس پہلے بڑے بڑے راجہ نواب ان تختوں کے پائے چھونا فخر و مباہات کا باعث سمجھتے تھے - آئیے آج آپ کو اسی لال قلعے کی ایک جھلک دکھائیں +

۹ - محرم الحرام ۱۰۴۸ھ میں استاد حامد اور احمد نے لال قلعہ کی بنیاد ڈالی - اُس روز دہلی میں خوب جشن منایا گیا - تمام امراء و حکام اور ارکانِ سلطنت جمع ہوئے - عام تماشائیوں کا بھی انبوہِ کثیر تھا - ٹھیک بارہ بج کر پانچ منٹ پر قلعے کی بنیاد رکھی گئی +

جہاں پناہ قلعے کو جلد از جلد تیار کرانا چاہتے تھے، اس لئے حکومت کے گوشے گوشے سے بہترین صناع بلائے گئے +

سب سے پہلے عزت خان کو انتظام سپرد کیا گیا - انھوں نے کامل پانچ مہینے میں بنیاد کھدوا کر پتھر جنوائے، اور ضروری سامان مہیا کئے +

ان کے بعد دو برس ایک مہینہ گیارہ روز صوبیدار علی کی زیرِ نگرانی قلعہ بنا رہا - ان کے بعد مکرمت خاں کو انتظام تفویض ہوا +

جب قلعہ بن کر تیار ہوا تو شہنشاہِ شاہ جہاں کابل میں تھے آپ نے

۲۴ - ربیع الاول ۱۰۵۸ھ کو قلعے میں قدم رنجہ فرمایا - رعایا نے [illegible] نہایت تزک و احتشام سے اپنے بادشاہ کا استقبال کیا - جب جہاں [illegible] میں داخل ہوئے تو مبارک سلامت کے نعروں اور توپوں کی سلامی سے دلی گونج اٹھی

اُس روز جہاں پناہ نے غرباء اور مساکین کو کپڑے اور انواع و اقسام کے بہترین کھانے تقسیم کرائے - بچوں کو انعام اور مٹھائیاں تقسیم کرائیں

امتیاز محل

یہ محل دیوانِ خاص کے عقب میں بنا ہے - اور یہی سب سے بڑا محل ہے - اس کے وسیع صحن میں کبھی حسین نہریں تھیں اور فوارے چھوٹتے تھے - اس کے اندر ایک خوبصورت باغ بھی تھا +

اس صحن میں اب متعدد منحوس مکانات بن گئے ہیں - پہلے اس میں ایک حوض تھا - جس میں پانچ فوارے تیز گرد و پیش نہریں تھیں - اس حوض کے چاروں طرف دو ہزار سنہرے کلس تھے +

اس صحن کے تین طرف حسین مکان بنے ہوئے تھے - امتیاز محل کے آگے کرسی پر ایک خوبصورت چبوترہ ہے اور اس کے نیچے دو تہ خانے ہیں - اس کے اوپر وسیع نشستگاہ ہے جو ستاون گز لمبی اور چھبیس گز چوڑی ہے +

درمیان کے حصے سے آگے صحن کی طرف سنگِ مرمر کا ایک حوض ہے - جس میں سے پانی نکل کر باغ کی تمام روشوں پر بہتا تھا - اس محل کی صنعتی خوبیوں کا بیان حیطۂ امکان سے باہر ہے - اس محل میں ایک حوض ہے جو کھلے ہوئے کنول کی طرح حسین و دلکش ہے +

محل میں سے ایک نہر دیوانِ خاص کی طرف جاتی ہے اور دو نہریں پورب اور پچھم کیطرف بھی ہیں - محل کے چاروں طرف خس کی ٹٹیاں رہنے کا سامان تھا، لیکن اب وہ خس کی ٹٹیوں میں رہنے والے ہی نہ رہے تو ٹٹیاں کون لگائے - محل سنسان پڑا ہے - نہریں خشک ہیں - حوض میں خشک پتے اڑ اڑ کر جمع ہو جاتے ہیں +

اس محل کی چھت سونے کی تھی - جو فرخ سیر کے زمانے میں توڑدی گئی اور اس کی جگہ تانبے کی چھت چڑھا دی گئی - لیکن اخیر میں لیٹروں نے اسے بھی نہ چھوڑا، اور اسے نکال کر لکڑی کی چھت لگادی - لیکن امتدادِ زمانہ نے اسے بھی نہ رہنے دیا +

چھوٹی نشستگاہ امتیاز محل کے شمال میں ہے - اس کے عقب میں [illegible] وکا ہے - جس کے پاس بیٹھ کر جہاں پناہ تماشا وغیرہ دیکھتے تھے [illegible]س کھڑکی سے جہاں پناہ کی زیارت بھی کیا کرتی تھی - اس کے پاس ہی بڑا برج ہے - اسے برج اسد کہتے ہیں +

امتیاز محل کی جنوبی سمت میں خوابگاہ ہے - اس میں قسم قسم کے طلائی اور پچی کاری کے کام بنے ہوئے ہیں +

اس کے آگے سنگِ مرمر کا ایک حسین دالان ہے - یہ چوبیس گز لمبا اور چھ گز چوڑا ہے - اس دالان کے دونوں طرف حسین محرابیں ہیں - اس کے درمیان سے دیوانِ خاص کو راستہ جاتا ہے - اسے "خاص ڈیوڑھی" بھی کہتے ہیں +

دالان کے وسط میں سنگِ مرمر کا ایک حوض ہے جس میں کبھی کنول کے پھول کھلتے تھے - دالان کی مشرقی سمت میں "برج طلا" ہے جو سرتاپا سنگِ مرمر کا بنا ہے - اس میں بہترین طلائی کام کیا گیا ہے - اس برج کے پانچ حصے دریائے جمنا کی طرف ہیں، جن میں سنگِ مرمر کی جالیاں لگی ہوئی ہیں - بیگمیں ان میں سے دریا کا منظر دیکھتی تھیں +

دیوانِ خاص

یہ محل خواب گاہ کے جنوب میں سنگِ مرمر کے چبوترے پر بنا ہوا ہے - اس کے جنوب میں حیات باغ کا راستہ ہے - اور شمال میں شاہی ڈیوڑھی ہے - دیوانِ خاص میں ہندوستانی صناعی کے حیرت انگیز نمونے ہیں - یہ محل بے حد حسین اور دلآویز ہے - کبھی اس کے وسط میں سنگِ مرمر کی نہر بہتی تھی - اس کے دروازے پر جہاں پناہ نے یہ شعر لکھوا دیا تھا :-

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

اس سے محل کے حُسن اور دلکشی کا اندازہ ہو سکتا ہے - لیکن آج؟ نہریں خشک پڑی ہیں، چھت کی حسین پچی کاری مٹ چکی ہے - سنگِ مرمر کا تخت سنسان ہے جس پر کبھی شہنشاہِ عالم رونق افروز ہوتے تھے اب اس پر سیاح بیٹھ کر دم لیتے ہیں +

اس کے علاوہ موتی محل، ساون بھادوں، برج شمالی اور موتی مسجد وغیرہ لال قلعے کی قابلِ ذکر عمارتیں ہیں - لیکن سب سے زیادہ قابلِ ذکر "حیات بخش باغ" ہے - یہ حسین باغ شہزادیوں اور بیگموں کی تفریح گاہ تھا یہ باغ اپنی تر و تازگی اور دلکشی سے جنت کو بھی شرماتا تھا +

اس کے وسط میں ایک بڑا حوض ہے، اور چاروں طرف سنگِ سرخ کی نہریں ہیں - کسی وقت ہر نہر میں چاندی کے تیس تیس فوارے چھوٹتے تھے - حوض میں چاندی کے چھیالیس فوارے لگے ہوئے تھے - اب فواروں کا تو نام و نشان نہیں، لیکن سوراخ اب بھی باقی ہیں +

کسی وقت یہ باغ قدرتی مناظر کا دلفریب نمونہ تھا - لیکن اب صرف کچھ درخت باقی ہیں جو سیاحوں کو اپنی خشک پتیوں کی کھڑکھڑاہٹ سے گزشتہ رونق اور تر و تازگی کی داستان سناتے ہیں!

آسی رام نگری

رباعی

سربستہ ہر ماں کا ہوں زمین راز شب ہوں
سرنامہ مرا نیا ہے وطن راز شب ہوں
سجدہ گلو ہوں کبھی راز بہ ہستی
جب حال میں پیاسا ہوں سمجھ پیاسا ہوں

نجمہ ندوی

اے چاند!

اے چاند حسن تیرا عالم پہ چھا رہا ہے
دریائے دل میں میرے طوفان آ رہا ہے

کیا درد کی کسک ہے موجود روشنی میں
ہے جذبۂ محبت پوشیدہ خامشی میں

تکتا ہے کیوں زمیں کو تو بامِ آسماں سے؟
ہے بے قرار شاید سوزِ غمِ نہاں سے

بزمِ فلک میں الفت کا جام کیا نہیں ہے
تاروں کی گود میں بھی آرام کیا نہیں ہے؟

حیران ہو گیا ہے تو کلفتِ سفر سے
یا خوف کھا رہا ہے رنگِ رُخِ سحر سے؟

کیا تیری بزم میں بھی ہمدم ترا نہیں ہے
واقف ترا نہیں ہے محرم ترا نہیں ہے؟

تیری طرح ہوں میں بھی فرقت کے غم کا مارا
تیرِ الم کا گھائل تیغِ ستم کا مارا

پھرتا ہے مارا مارا تو جس کی جستجو میں
میں بھی تو ہوں پریشاں اسکی ہی آرزو میں

بیچارہ تو اگر ہے تو ہوں غریب میں بھی
قسمت کا تو ہے ہیٹا ہوں بدنصیب میں بھی

یکساں اثر ہے دونوں پر گردشِ زماں کا
جو حال ہے زمیں کا وہ حال آسماں کا

ہمراز ہوں ترا میں تو میرے پاس آجا
اس دل میں گھر بنا لے کیوں ہی اوداس آجا

اور یہ نہیں جو ممکن تو تُو مجھے بلا لے
یہ دل نثار تجھ پر یہ جاں ترے حوالے

اندر جیت شرما

پروفیسر راہبر

عضب کی سردی تھی، سڑکوں پر شام سے سناٹا تھا - جاڑے کے مارے [illegible] سے اپنے اپنے مکانات میں بند ہو گئے تھے - اِکّا دُکّا راہرو کہیں [illegible] آجاتا تھا اور راستے کے اس سکوت میں تھوڑی دیر کے لئے اُسکے قدموں کی آواز ایک خفیف شور پیدا کر دیتی تھی - چلنے والے بلا ایکدوسرے کو دیکھے ہوئے جلد جلد پاس سے گذر جاتے +

شناسی آفندی، پروفیسر ادبیات کو شاید کوئی ضروری کام ہی ہوگا جو وہ ایسی سردی میں گھر سے نکلا تھا - کیونکہ آٹھ بج چکے تھے ——— وہ ایک لمبا کوٹ پہنے گلا گلوبند سے چھپائے کسی خیال میں محو جلد جلد قدم اُٹھاتا چلا رہا تھا +

ایک آہستہ رو شخص کے سلام کی آواز سے چونک کر رُک گیا - سلام کرنے والا کوئی نوعمر اجنبی معلوم ہوتا تھا جس کو اس سے پہلے اس نے کبھی نہ دیکھا تھا - اس کا لب و لہجہ نہایت نرم و شائستہ تھا +

اجنبی - یا اخی! شناسی آفندی پروفیسر ادبیات کا مکان آپ کو معلوم ہے کہاں ہے؟

شناسی آفندی - شناسی آفندی (اُس نے کچھ عجیب انداز سے اس نام کو دُھرایا) آپ اُن کا مکان دریافت کرتے ہیں - شاید پہلی مرتبہ آپ ان سے ملیں گے؟

اجنبی - جی ہاں - بالکل پہلی مرتبہ!

شناسی - مگر سنیئے تو ایسی سرد رات میں، اس قدر ناوقت، کیا کوئی شدید ضرورت ہے؟ ورنہ آج کل تو صبح کا وقت ملاقاتوں کے لئے عام طور سے اچھا ہوتا ہے +

اجنبی - مجھے چونکہ کل علی الصباح آدرنہ واپس جانا ہے، وقت کم تھا - اس واسطے ———

شناسی - بہت خوب - اچھا دیکھیئے - چند قدم اسی سڑک پر جاکر دائیں جانب مڑ جایئے پھر بائیں طرف - ایک تنگ راستہ پر آپ پہنچ جائیں گے اس کے آخری سرے پر عین روشنی کے ستون کے سامنے ایک پھاٹک ہے جس پر پروفیسر کا نام لکھا ہوا ہے - بس وہی اس کا مکان ہے ——— اور دیکھیئے اگر پروفیسر آپ کو اس وقت مکان پر نہ ملے تو چند منٹ اس کا انتظار کر لیجئے گا +

اجنبی - بہت اچھا جناب ——— شکریہ -

اظہارِ تشکر کے لئے وہ کسی قدر جھکا اور چل دیا +

اجنبی اس بتائے ہوئے سیدھے اور راستے پر ٹھیک چلا جا رہا تھا - سامنے سے ایک ایسا راہرو گذرا جس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی وہ کچھ ٹھٹک سا گیا - اُس کے قدم شاید خود بخود رُک گئے - گیا وہ اس کا کوئی ملاقاتی تھا - شناسا تھا!! نہیں کیونکہ راہرو اس کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا - صرف چند قدم، کیونکہ اجنبی نے کسی قدر رُکتی ہوئی آواز سے اسکی طرف مڑ کر پوچھا +

اجنبی - جناب ——— کیا ——— آپ کو ——— ان کا مکان معلوم ہے؟

راہ رو - پلٹ کر اور اجنبی کی طرف آتے ہوئے - کس کا مکان؟ (اس کا لب و لہجہ دلکش و شیریں تھا) آپ کس کا مکان دریافت کرتے ہیں؟"

اجنبی - میں بھول گیا ——— ابھی میرے ذہن سے وہ نام اتر گیا ——— میں بتاتا ہوں ——— وہ ——— شناسی آفندی پروفیسر

راہ رو (جلدی سے) شناسی آفندی ——— اتفاق سے آپ ان کے مکان کے بالکل قریب ہیں - دیکھیئے (ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے) اس موڑ کے بعد ایک تنگ سی گلی ملے گی - اُس کے آخری کونے پر پروفیسر کا مکان ہے - پھاٹک پر نام کی تختی لگی ہوئی ہے +

بات تو ختم ہوگئی مگر راہرو کو کچھ ایسا معلوم ہوا کہ پتہ پوچھنے والا سننے کے بجائے دیکھنے میں زیادہ معروف ہے ——— ہوگا - وہ یہ مختصر پتہ بتا کر پھر اپنے راستہ پر ہو لیا - اور یکایک اس کو محسوس ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے آرہا ہے - اس نے مڑ کر دیکھا ——— وہی مستفسر اجنبی

راہ رو - (کسی قدر استعجاب سے) آپ ادھر کہاں آرہے ہیں - پروفیسر

کا مکان اس طرف تو نہیں ہے +

اجنبی - میں معافی چاہتا ہوں (منفعلانہ) —— مجھے خیال نہیں رہا - میں سمجھا کہ آپ بھی شاید اس طرف جا رہے ہیں - میں آج ہی یہاں وارد ہوا ہوں اور رستوں سے ناواقف ہوں —— معاف کیجیئے گا —— (ایک جانب غلط اشارہ کرتے ہوئے) اس جانب بتایا تھا آپ نے ؟

راہ رو مسکرایا - اجنبی نے معذرت کے طور پر اٹکتے اٹکتے کہا "دیر سے آپ کے اشارہ کو غور سے نہ دیکھا تھا اس واسطے ——"

راہ رو - (پھر مسکرا کر) کیا مضائقہ ہے - آپ میرے ساتھ آیئے - میں آپ کو وہاں تک پہنچا ہی جاتا ہوں +

کیا اجنبی یہی چاہتا تھا ؟ اس کے چہرہ پر ایک مسرت نمودار ہوئی —— ایسی مسرت جو کسی مایوسی، کسی اُداسی کے بعد بے توقع انسان کو میسر آ جاتی ہے - دونوں چل دیئے - دس قدم بھی راہ نہ طے کی ہوگی کہ اجنبی نے ٹھوکر کھائی - راہ رو نے سنبھال لیا - پندرہ قدم اور —— پھر ٹھوکر - راہ رو مسکرا دیا ——

راہ رو - سڑک کس قدر ناہموار ہے - ہمارے بلدیہ کو تو بس ٹیکس وصول کرنے سے کام ہے - سڑکوں کی درستی سے کیا واسطہ "

اجنبی اس چبھتے ہوئے فقرہ کا مطلب سمجھ گیا - سڑک صاف کشادہ یکساں اور روشن تھی - اس نے شرمندہ ہو کر راہ رو کے چہرے سے نظر ہٹائی اور باحتیاط چلنے لگا - بیس قدم —— پھر ٹھوکر +

راہ رو - بسم اللہ -

اجنبی - (کچھ خفیف ہو کر) اس قدر تھک گیا ہوں کہ پاؤں چلنے سے جواب دے رہے ہیں +

توبہ ——

راہ رو - شاید —— (ایک پرمعنی انداز سے) بیشک ——

اجنبی پھر راہ رو کے چہرے سے نظر ہٹا لیتا ہے - کچھ دور ٹھیک چلتا ہے —— پندرہ قدم —— پھر ٹھوکر —— دس قدم —— پھر ٹھوکر —— پانچ قدم —— پھر ٹھوکر -

راہ رو - (خود بخود) آپ اس قدر تھک گئے ہیں کہ پاؤں چلنے سے جواب دے رہے ہیں +

—— توبہ -

اجنبی - جی نہیں —— جی ہاں —— میں عذر خواہ ہوں +

راہ رو - کیا حرج ہے - آپ کی ٹھوکریں راہ کے پتھروں کو رنگین بناتی چلی جا رہی ہیں - آپ نے غور نہیں کیا شاید "

ساتھ ہی وہ ہنس بھی دیا - اجنبی، ساکت، مبہوت، مغلوب، مسحور، اور نظری ذوق میں مبتلا - اس کے اوضاع و اطوار اسکی ذہنی کیفیت کے آئینہ دار تھے -

---

راہ رو - (رک کر) لیجیئے یہ ہے پروفیسر کا مکان (انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) امید ہے کہ اب آپ نہ بھولیں گے ——

اجنبی - جی نہیں —— بہت بہتر —— مشکور ہوں —— اب نہیں - بھولوں گا —— آپ نے یہی بتایا کہ بائیں طرف مڑ کر ایک تپلی سی گلی ملے گی - اس کے آخری کونے پر پروفیسر کا مکان ہے - پھاٹک پر نام کی تختی لگی ——

راہ رو - (زور سے ہنس پڑا - شاید بے ارادہ) اب سڑک اور گلی کا کیا ذکر ہے، آپ تو پروفیسر کے دروازے پر کھڑے ہیں —— یہ پھاٹک (راہ رو انگلی سے اشارہ کرتا ہے) +

اجنبی - (راہ رو کے چہرے سے نظر ہٹائے بغیر خود بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ٹھیک ہے یہ پھاٹک - شکریہ آپ کا - بہت زحمت دی میں نے آپ کو - میں یہاں آج ہی وارد ہوا ہوں - رستوں سے ناواقف ہوں - آپ کا اسم گرامی ؟

راہ رو - (جس کے ہونٹوں پر ایک نرم و نامعلوم سی معنی خیز مسکراہٹ تھی) میرا نام —— میرا نام راہبر ہے -

"راہبر" اجنبی نے زیر لب محویت آمیز تعجب کے ساتھ اس نام کو دہرایا - پھاٹک میں ایک شخص لمبا کوٹ پہنے - گلا گلوبند سے چھپائے اس آخری گفتگو کو سن رہا تھا +

راہبر چلا جاتا ہے اور اجنبی ڈوبی ہوئی نگاہوں سے اس طرف نگران ہے - ایک مسکراتا ہوا چہرہ اور بھاری آواز -

"آپ کس کا مکان دریافت کرتے ہیں "

اجنبی - (چونک کر) —— جی ہیں —— میں —— پروفیسر —— پروفیسر راہبر کا مکان

ایک بلند بانگ قہقہے سے اس کا جواب ملتا ہے -

اجنبی منفعل و خاموش ——

محمد عبدالحی خاں

غزل



وہ پوچھتے ہیں تو نے تو پیکاں نہیں دیکھا
گر زخم نہ کہہ دیں تو کہوں ہاں نہیں دیکھا

اللہ رے سیاہی تری اے روزِ جدائی
وہ دیکھتے ہیں جو شبِ ہجراں نہیں دیکھا

وحشت کدۂ دل کا مرے حال نہ پوچھو
کیا تم نے کوئی خانۂ ویراں نہیں دیکھا

ویرانیٔ دل یاس کے ہاتھوں ہوئی ورنہ
اس گھر میں کبھی کیا کیا سروساماں نہیں دیکھا

تو نے ابھی او زخمِ جگر دیکھنے والے
پیوست ہے جو دل میں وہ پیکاں نہیں دیکھا

کوچے میں ترے صدق کو مثلِ گل و شبنم
خنداں نہیں دیکھا ہے کہ گریاں نہیں دیکھا

صدق جائسی

مُلکہ کُشی

"ادبی دنیا" کے اکتوبر ۳۳ء کے نمبر میں "بادشاہ کشی" کے عنوان سے لوئی شانزدہم، شہنشاہِ فرانس کے قتل کا واقعہ پیش کیا جا چکا ہے کہ کس طرح حامیانِ جمہوریت نے، انقلابِ فرانس کے آغاز میں، فوری منتقمانہ جوش سے مغلوب ہو کر تاجدار و سریر آرائے فرانس کو، جمہوریت کی قربانگاہ پر چڑھا دیا۔ اس مضمون میں لوئی کی بیوہ، ملکہ میری اینٹوئنٹ کے مقدمے اور قتل کا بیان ہے ملکہ مقتولہ، شہنشاہِ آسٹریا کی ناز پروردہ دختر تھی اور ۱۷۷۰ء میں لوئی کے ساتھ اس کی شادی ہوئی تھی۔ علمبردارانِ جمہوریت کی آنکھوں میں، شخصی حکومت کی ایک پژمردہ یادگار بھی، جو بیوہ ملکہ کی ذات کے ساتھ وابستہ و قائم تھی، نوکِ خار کی طرح کھٹکتی تھی۔ چنانچہ تشنۂ خون انقلابیوں نے شاہ بیگم کو بھی بقیدِ حیات دیکھنا پسند نہیں کیا، اور لوئی کے قتل کے چند ماہ بعد، ملکہ پر مختلف اہم اور غیر اہم الزامات عائد کر کے اس کی موت کا فیصلہ دیا اور مظلوم و بدنصیب ملکہ کو گلوٹین پر چڑھا دیا۔ لوئی کے قتل کی طرح ملکہ کے قتل کی کیفیت بھی پُرحسرت و عبرت خیز ہے، لیکن اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہایت دلکش و دلچسپ و ہو نہا ہے۔

دوشنبہ کے دن، اکتوبر ۱۷۹۳ء کی چودھویں تاریخ کو جدید منظم کی ہوئی انقلابی دارالعدالت میں ایک ایسا اہم مقدمہ پیش ہے۔ کہ اس عمارت کی کہنہ اور سنگین دیواریں اتنے عبرت آموز اور اہم معاملہ سے ابھی تک ناآشنا رہی تھیں یعنی میریِ انیٹوئنیٹ، ملکۂ فرانس کا مقدمہ۔ شہنشاہِ آسٹریا کی عزیز بیٹی، شہنشاہِ فرانس کی محبوب بیوی، جو اپنے عہد کی حسین ترین ملکہ اور شاہ بیگموں کی سرتاج تھی، آج تحقیر و مذلت کا نشانہ ہے اور بے یار و مددگار، تصویرِ یاس و حرماں بنی ہوئی کمرۂ عدالت میں، اپنی پیاری زندگی کی خاطر جوابدہی کرنے کے لئے کھڑی ہوئی ہے۔ فردِ الزامات گذشتہ شب کو اس کے حوالے کی گئی تھی۔ انسان کی تقدیر کی ایسی کایا پلٹ، ایسی ہولناک تغیر پسندی کے اظہار کے لئے کونسے الفاظ کافی ہو سکتے ہیں؟ خاموشی اور سکوت ہی شاید اس اظہار پر قادر ہو سکے، الفاظ اس کے حامل نہیں ہو سکتے۔

دنیا کے اندر شاید چند ہی ایسی تحریریں ہوں گی جو اپنی [illegible] اور ہولناک اہمیت کے لحاظ سے "انقلابی سرگذشت" کے ان [illegible] سے ہم پلّہ ہوں جن کا عنوان "ہیوہ کیپٹ[1] کا مقدمہ" ہے۔ ناروا ستم و جور کے تذکرہ سے یہ صفحات روئے زنگی کی طرح سیاہ ہیں، اور ان بدطینت اور سیاہ قلب آدمیوں کے ذکر نے جو معصوم ملکہ کے خلاف شہادت دینے کو طلب کئے گئے تھے اس تاریکی میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ ان گواہوں کی سیاہ باطنی اتنی نمایاں ہے کہ چشمِ تخیل سے یہ انسان غولِ بیابانی سے کم نظر نہیں آتے۔ یہ گروہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو پرلے سرے کے افترا پرداز، اوّل درجے کے تہمت تراش، اور فنِ دروغگوئی میں ماہرِ زمانہ تھے۔ لیکن اُن کی کم بینی سے انہیں کیا خبر تھی کہ وہ خود موت اور بدنصیبی کا شکار ہونے والے ہیں اور گلوٹین ان کے سروں کو تن سے جدا کرنے کی منتظر ہے۔ انہیں کیا علم تھا کہ وہ بے خبری میں دہانِ مرگ کے اس قدر قریب آ چکے ہیں کہ ذرا سی لغزش انہیں واصلِ جہنم کر دے گی۔ وہ یقیناً چاہ کن را چاہ درپیش کے مقولے سے ناآشنا تھے یا اگر اس سے واقف تھے تو اس پر عمل پیرا ہونا نہ جانتے تھے۔ ان ظالم جاہلوں میں طویل القامت ڈی اسینگ بھی ہے جو اپنے آپ کو ایک مخلص محبِّ وطن کی صورت میں جلوہ گر کرنا چاہتا ہے وہ گلوٹین سے نہیں بچ سکتا۔ اور نہ بیلی جو بہت جلد موت کی تمام تلخیوں سے آشنا ہونے کو ہے۔ لیکن اسے کیا معلوم؟ اس نے تو یہ سوال کئے جانے پر کہ "آیا تم مجرم سے واقف ہو؟" ملکہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "جی ہاں، میں میڈم کو جانتا ہوں"۔ یہاں ایسے بزرگ بھی ہیں جو کبھی محبانِ وطن کہلاتے تھے اور ایسے حضرات بھی ہیں جو کبھی عہدۂ وزارت پر مامور رہ چکے ہیں۔ غریب بھی ہیں، پیشہ ور بھی ہیں اور امیر بھی ہیں ـــ لیکن ہر کہ و مہ بلا استثنا، ملکہ کے درپئے آزار ہے۔ شکستہ نصیب و خستہ دل ملکہ کا ہر فعل جو اس کی زندگی میں اس سے صادر ہوا تھا، اب جرم اور گناہ ہے اور عقوبت و سزا کے لائق ہے۔ انسانی تقدیر کے تغیر کے ساتھ ساتھ لوگوں کا برتاؤ بھی بدلتا رہتا ہے۔

[1] فرانس کے بادشاہوں کی ایک نسل کا خاندانی نام (CAPET) جس کی بنیاد (HUGH CAPET) ہیو کیپٹ نے ۹۸۷ء میں ڈالی تھی۔ خاندان ویلوی (۱۳۲۸ء) اور خاندان بوربن (۱۵۸۹ء) دونوں اسی سے تعلق رکھتے تھے۔ لوئی شانزدہم کا مقدمہ لوئی کیپٹ کے نام سے ہوا تھا۔ اس کی بیوہ بیوہ کیپٹ کے نام سے پکاری گئی۔ چشتی

ایسی بے یاری و مددگاری میں بھی، جبکہ دنیا اس کی دشمن اور زمانہ اس کے خلاف تھا، جبکہ ہمدرد و بہی خواہ کا وجود عنقا تھا بیگم نے اپنی شانِ امارت کو قائم رکھا۔ زمانہ اُس کے خلاف ہو تو ہو، دنیا اس کی دشمن ہو تو ہو لیکن وہ پھر بھی شہنشاہِ فرانس کی بیوہ اور ملکۂ فرانس ہے۔ الزامات کی فہرست پڑھے جانے کے دوران میں ملکہ کی ظاہری حالت نہایت سنجیدہ اور پُرسکون تھی لیکن کبھی کبھی اس کی انگلیاں اس طرح حرکت کرتی معلوم ہوتی تھیں جیسے کہ پیانو بجاتے وقت حرکت کرتی ہیں۔ وہ جوابات نہایت صاف آواز میں دلیرانہ دیتی ہے۔ جس میں پس و پیش کا شائبہ تک نہیں، لیکن اکثر حد درجہ مختصر۔ اس کے جوابات میں ایک فیصلہ کن جذبہ نمایاں ہے۔ حقارت کا جذبہ جو اَب پیدا ہو چلا ہے سنجیدہ الفاظ کے پردے میں ابھی محفوظ ہے اور نمایاں نہیں ہونے پاتا +

"تو کیا تم انکار پر اصرار کرتی ہو؟"

"میرا پیرایۂ عمل انکار نہیں ہے۔ میں حق کا اظہار کرتی ہوں اور حق پر مصر ہوں!"

بدنام کنندۂ ننگ و ناموس ہیبرت نے مختلف الزامات کی تائید کی ہے ان میں سے ایک تہمت ملکہ اور اس کے بچے کے متعلق ہے۔ جس کے اعادے سے زبانِ قلم نا آشنا رہے تو بہتر ہے۔ ملکہ نے جملہ الزامات سے اپنی بریّت ظاہر کی ہے اور صفائی پیش کی ہے، لیکن ایک بدنفس جوری اس ناگفتہ بہ الزام کی طرف اشارہ کرتا ہے" اس پر ملزمہ نے کچھ روشنی نہیں ڈالی"

"میں نے اس کا جواب نہیں دیا" ملکہ ایک شریفانہ جذبہ سے مغلوب ہو کر چلائی "۔ میں نے اس کا جواب نہیں دیا۔ کیونکہ فطرت ایسی کمینہ تہمت کا جواب دینے سے اِبا کرتی ہے جو ایک ماں پر تراشی جائے۔ میں اُن تمام ماؤں سے جو یہاں موجود ہیں اپیل کرتی ہوں......"

یہ سن کر روبس پئیری کو ہیبرت کی بدنفسی اور خباثت پر نہایت طیش آیا۔ اور اس نے اس ملعون پر نہایت غصّہ ظاہر کیا۔ ہیبرت کا کمینہ پن خود اس کے لئے باعثِ تذلیل و عقوبت بن گیا +

مقدمہ کو ہوتے دو دن اور دو راتیں گزر گئیں۔ شب و روز متواتر جرح کی گئی۔ سوالات کئے گئے، الزامات تراشے گئے، تہمتیں لگائی گئیں، مشورے ہوئے، اتفاقِ رائے ہوا اور کبھی اختلافِ رائے — دو دن اور دو رات متواتر! تا آخر چہارشنبہ کو صبح چار بجے کے قریب فیصلہ صادر ہوا موت کا حکم!

"کیا تمہیں کچھ اور کہنا ہے؟"

ملکہ نے سر نفی میں ہلا دیا۔

اب صبح ہونے والی ہے۔ شمعیں یکے بعد دیگرے ٹھنڈی ہوتی جاتی ہیں، اور کمرے کی روشنی مدہم پڑتی جاتی ہے، وقت تیزی سے گزرتا جاتا ہے۔ جہاں ملکہ کھڑی ہے وہاں نسبتاً زیادہ روشنی ہے۔ وہ خاموش آہستہ آہستہ کمرۂ عدالت سے واپس ہونے لگتی ہے، سپیدۂ سحر نمودار ہوا۔ موت اسکی منتظر ہے۔ تھوڑی دیر میں آفتابِ عالمتاب ملکہ کے لئے پیغامبرِ فنا ہو کر نکلے گا۔ اور ملکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ہو جائے گی +

وہ جلوس، وہ شاہانہ جلوس، جن کے درمیان تیئیس[۲۳] سال کا زمانہ حائل ہے، اپنی متضاد کیفیتوں کی بنا پر چشمِ بینا کے لئے درسِ عبرت ہیں +

پہلا جلوس ایک حسین شاہزادی کا ہے جو اپنے وطن سے پندرہ سال کی عمر میں رخصت ہو رہی ہے۔ اس کا دِل ایسی آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز ہے جو حوا کی کسی بیٹی کے خواب و خیال میں بھی نہ آئی ہوں گی۔ اس کا دِل جن مختلف جذباتی کیفیات سے آشنا ہے وہ اس کو ملول و افسردہ بھی بناتی ہیں اور مسرور بھی۔ وتیر ایک عینی گواہ یوں تحریر کرتا ہے:۔ "کل شاہزادی وائنا سے رخصت ہوئی۔ تمام شہر گویا ایک جگہ جمع ہو گیا تھا۔ ہر مرد عورت کے چہرے پر غمِ مفارقت کے آثار نمایاں تھے۔ شاہزادی کی گاڑی نمودار ہوئی لوگوں نے دیکھا کہ وہ گاڑی میں افسردہ سی پڑی ہوئی ہے۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے دُھلا ہُوا تھا۔ وہ اپنی آنکھیں کبھی ہاتھوں سے اور کبھی رومال سے چھپاتی تھی کئی مرتبہ اس نے اپنا سر گاڑی سے باہر نکالا۔ شاید اس لئے کہ ایک مرتبہ اور اپنے باپ دادا کے محلات و قصور کو دیکھ لے جہاں سے وہ عمر بھر کے لئے رخصت ہو رہی تھی۔ اس نے قوم سے جدائی پر اپنے جذبات کے اظہار کے لئے ہاتھ ہلائے اور قوم کی ہمدردی اور محبت کا شکریہ ادا کیا۔ یہ نہایت ہیجان انگیز موقع تھا۔ ابھی تک لوگ اپنے جذبات کو روکے ہوئے تھے۔ شاہزادی کی شکرگذاری پر معاً گریہ و زاری کی صدائیں وائنا کی فضا میں گونجنے لگیں اور ایک کہرام مچ گیا کوئی فرد نہ تھا کہ شاہزادی کے غم میں مصروفِ نالہ و بکا نہ تھا۔ شاہزادی کا جلوس آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ جلوس کا آخری آدمی رہنے تک مجمع قائم رہا۔ زاں بعد رفتہ رفتہ منتشر ہو گیا......"

پندرہ سال کی کمسن دوشیزہ اب ایک اڑتیس[۳۸] برس کی بیوہ ہے اور عمر کے لحاظ سے نسبتاً زیادہ ضعیف معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بال وقت سے پہلے بھورے ہونے شروع ہو گئے ہیں دوسرا جلوس اپنے اندر یہ جاذبیت رکھتا ہے۔ ملکہ کی موت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ صبح چار بجے کا وقت ہے۔ فوجی بگل

میں ہر جگہ نقارے پیٹے جا رہے ہیں۔ جن کی کرخت صدا سے دل پر چوٹ سی لگتی ہے۔ صبح ہوتے ہوتے تمام فوج آراستہ اور تیار ہو جاتی ہے۔ پلوں کے دونوں سروں پر چوراہوں اور چوکوں پر، غرض دار العدالت سے قصرِ انقلاب تک ہر اہم مقام پر توپیں نصب کر دی جاتی ہیں۔ دس بجتے بجتے متعدد فوجی دستے شاہراہوں پر چکر لگانا شروع کر دیتے ہیں۔ تیس ہزار پیادہ و سوار فوج علیحدہ تیار رہتی ہے

۱۱ بجتے ہیں۔ ملکہ معتوبہ باہر لائی جاتی ہے۔ وہ معمولی لباس بے پروائی سے پہنے ہوئے ہے۔ عام مجرم کی طرح اسے قتل گاہ تک لے جاتے ہیں وہ ایک گاڑی سے بندھی ہوئی ہے۔ سادہ لباس پہنے ہوئے ایک پادری اس کے ساتھ ہے۔ سوار و پیادہ فوج کے کئی ہزار [illegible] اس کی ہمراہی میں ہیں۔ سڑکوں پر دونوں طرف فوجی سپاہی متعین ہیں۔ ملکہ ان سب کو بے تعلقی اور بے پروائی سے دیکھتی جاتی ہے۔ اس کا چہرہ کسی قسم کے جذبہ کا آئینہ دار نہیں ہے۔ نہ غرور کے علامات ہیں نہ شرم و ندامت کے۔ "زندہ باد جمہوریہ" اور "استیصالِ استبداد" کے نعروں پر وہ [illegible] توجہ نہیں کرتی۔ پادری سے وہ بہت مختصر گفتگو کرتی ہے سہ رنگی جھنڈیوں کو جو مکانات کی چھتوں پر لہرا رہی ہیں وہ دیکھتی جاتی ہے سڑکوں پر مکانات کے پیشیں حصوں پر جو الفاظ اور عبارتیں کندہ ہیں وہ ملکہ کی نظروں کو متوجہ کرتے ہیں۔ قصرِ انقلاب کے پہنچنے پر وہ "جارڈن نیشنل" کو دیکھنے لگتی ہے جو اب قصر تیولریز کے نام سے مشہور ہے۔ مگر اس کے چہرے پر نہایت قوی و ہیجان انگیز جذبات کے آثار ہویدا ہوتے ہیں اور اس کے چہرے کی رنگت تغیر پذیر ہو جاتی ہے۔ اب وہ گلوٹین کے قریب پہنچ چکی ہے۔ ہمت کر کے وہ اس کے تختے پر چڑھ جاتی ہے۔ ظالم لیکن مجبور جلاد اسے تختۂ دار سے باندھ دیتا ہے۔ [illegible] پندرہ منٹ گزر جاتے ہیں۔ تبر آواز کے ساتھ گرتا ہے اور ملکہ کا سر تن سے جدا ہو جاتا ہے۔ جلاد سر کو بلند کرتا ہے۔ حاضرین دیکھتے ہیں۔ "زندہ باد جمہوریہ" "[illegible] زندہ باد!" کے فلک شگاف نعرے بہت دیر تک فضا میں گونجتے رہتے ہیں +

سید [illegible] الحسن چشتی

قطعات

[illegible] دریا سے پلٹی، روح کو گرما گئی — موج جب تک تیرے دھارے پر رہی لہرا گئی
جانبِ ساحل گئی جب ناز فرماتی ہوئی — اس کی ہستی کو کنارے کی خموشی کھا گئی

حشر کیا ہوگا تمنا کا یہ معلوم نہیں — اس قدر ہوتا ہے محسوس کہ سودا ہی مجھے
آج تک کوئی تمنا نہ بر آئی میری — ہائے کس دل سے کہوں تیری تمنا ہی مجھے

عدم

تاثرات

نورِ زر انے جھانکا سمندروں میں
موتی ہزار ہوں گے پیدا سمندروں میں

سمجھا تھا جس کو طوفاں جانا تھا موج جس کو
سیلابِ عشق تھا وہ تیرا سمندروں میں

تمثال میرے غم کی تمثیل میرے دل کی
آسودہ ہیں بلائیں صد ہا سمندروں میں

سودا دو غم کا جیسے اک دل میں ہو ٹھکانا
سو سو سمائے ہیں دریا سمندروں میں

چشمِ کرم سے دیکھا جب ماہِ آسماں نے
سیلابِ نور اٹھا ہر جا سمندروں میں

یہ کون ہے خدایا دو ہاتھ سے جو اپنے
موتی لٹا رہا ہے بیجا سمندروں میں

کیوں ان روانیوں سے مدہوش ہو گیا دل
شاید کہ بہہ رہی ہے صہبا سمندروں میں

غوطہ زناں طبیعت ایسی ہوئی نہ ابھری
جلوہ ترا تھا پنہاں گویا سمندروں میں

(ح - ب)

میرے آنسو

مندروں میں گونجتے ہوئے ناقوس کی آواز خدا کی توحید اور تقدیس کو زندہ رکھتی ہے،

خوشی انسان کی روح کی زندگی کو برقرار رکھتی ہے،

لیکن آہ، میری زندگی اس لفظ سے آشنا بھی نہ ہوئی۔

وسیع قدرت کی رنگین فضاؤں میں اسے تاریکیوں کے سوا کچھ نصیب نہ ہوا۔

میری روح انسانوں کی تشنہ ہے،

وہ ان سے محبت کی بھیک مانگتی ہے،

لیکن انسان

دولت کے نشے میں چور

میری محبت اور اس کی گہرائی سے ناآشنا

میری محبت کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ غم کا سیاہ نقاب میری زندگی پر چھا جاتا ہے اور میری آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں۔

ریشم کے کپڑے کو انگلیوں میں دبانے کے بعد چھوڑ دو، اس میں کوئی شکن نہ ہوگا۔

دریا کی بلوریں لہریں خاک کے خشک ذرّوں کو شاداب کر دینے کے لئے ان کی طرف بڑھتی ہیں لیکن ساحل سے ٹکرانے کے بعد مایوس نہیں ہو جاتیں بلکہ اُسی بے تابی سے دریا کے سینے پر بل کھاتی رہتی ہیں۔

ہوا کے لطیف جھونکے دہکتے ہوئے شعلوں کی حرارت سے زخمی ہونے کے بعد انھی کا طواف کرتے ہیں۔

اندھی بھکارن تانبے کے ایک پیسے کے لئے اپنا ہاتھ پھیلاتی ہے اس کی آواز فضاؤں میں گونج کر خاموش ہو جاتی ہے اور ہزاروں انسان اس کے قریب سے گذرتے رہتے ہیں لیکن امید کے بھروسے پر اس کی آواز ہر دفعہ اس کی ہڈیوں اور گوشت کو چیرتی ہوئی نکلتی ہے۔

میری روح بھی مایوس نہیں ہوتی اور ایک غریب مالن کی طرح اپنی محبت کے پھول لے کر پھر انہی انسانوں کے پاس جاتی ہے۔

انسان اپنے اُجلے جسموں کو لئے اِدھر اُدھر پھرتے ہیں
میں اپنی محبت ان کے سامنے پیش کرتا ہوں
لیکن ———

ان کی نگاہوں میں اجنبیت پیدا ہو جاتی ہے،

ان کی پیشانیوں پر شکنیں پیدا ہو جاتی ہیں،

اور وہ حقارت آمیز قہقہوں سے میری محبت کو پھر ٹھکرا دیتے ہیں

میری روح پاش پاش ہو جاتی ہے،

دنیا میرے سامنے تاریک ہو جاتی ہے،

اور میری آنکھوں سے میری زندگی کا سرمایہ، میرے آنسو بہتے ہیں

اس بیدردی سے ٹھکرا دیئے جانے کے بعد بھی

میری روح تڑپتی ہے۔

اپنے پامال شدہ آنسوؤں کو لے کر وہ قدرت کے پاس جاتی ہے جو ایک طرف انسان کو الفت کا جھولا جھلا رہی ہے اور دوسری طرف انسان کے خون کے ارغوانی قطروں سے کھیل رہی ہے۔

وہ مجھے دیکھتی ہے

لہلہاتی ہوئی ٹہنیوں اور شگفتہ پھولوں کی رنگین نقاب میں سے مُسکراتی ہے۔

وہ مسکرائے جا رہی ہے۔

میں نے کہا

"قدرت! انسان تیرا بیٹا ہے - میں بھی ایک حقیر انسان ہوں - تو میری ماں ہے - ماں کا دِل بیٹوں کی محبت کا وہ عمیق سمندر ہے جس کی گہرائی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا - تو نے تمام انسانوں کی روحوں کو محبت کے نور سے روشن کیا ہے"

محبت ....

تیری دی ہوئی محبت اور تیرے ہی انسانوں کی محبت مجھے دنیا میں لئے پھرتی ہے - میں ان سے محبت کرتا ہوں - ان سے محبت کی بھیک مانگتا ہوں لیکن وہ میری محبت کو ٹھکرا دیتے ہیں - میرے آنسوؤں کو پامال کر دیتے ہیں اور میری روح زخمی ہو جاتی ہے۔

قدرت ....

تیری آغوشِ شفقت ان کے لئے کھلی رہتی ہے - تیرے دامن میں قہقہے ان کی زندگی کا عنوان بنتے ہیں - تیرے لعل و گوہر ان کے قدموں کے نیچے بچھے ہوئے ہیں - تیرے بل کھائے ہوئے دریا ان کے لئے محبت کا گیت گاتے [illegible]ے لب چاندنی راتوں میں ان کی پیشانیاں چومتے ہیں - تیری کائنات ان[illegible] جھک جاتی ہے - محبت کی نور افشاں شعاعوں سے ان کی زندگیاں [illegible]ن ہو جاتی ہیں اور تیرے دامن میں وہ معصوم بچوں کی طرح سو جاتے ہیں +

میری ماں ——————

میرے ٹوٹے ہوئے دل اور بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ اور بتا کہ تیرے دامن میں میرے لئے کیوں کچھ نہیں ؟

شاہی دربار کی طرح سجی ہوئی کائنات کے تخت پر اپنی تمام قوتوں کے ساتھ کامیابی کا سنہرا تاج پہنے ہوئے قدرت بیٹھی تھی اور اُس کے چہرے پر مسکراہٹ پیدا ہوئی - اس نے کہا ؛ -

"نادان بچے ! تیرے شکوے نے میرا دل ہلا دیا - میں خود محبت ہوں - اور ہر انسان کی روح کو محبت کے نور سے روشن کرتی ہوں اور سورج کی حکومت کے بعد جب شام اپنے سیاہ گیسو پھیلائے دنیا پر چھا جاتی ہے میں چاند کی شمع لے کر اُن روحوں کی تلاش میں نکلتی ہوں جو محبت کے نور سے روشن اور شفاف ہو چکی ہوں ، اور جب وہ روحیں میرے پاس آ جاتی ہیں تو میں اُن میں اور وہ مجھ میں جذب ہو جاتی ہیں - اس وقت کائنات سمٹ کر صرف محبت بن جاتی ہے - محبت دنیا پر حکومت کرتی ہے اور ایک شہزادی بن کر دنیا کے تخت پر جلوہ افروز ہوتی ہے - فرشتے ، ستارے اور اس دنیا کا ذرہ ذرہ اس کے [illegible]نے جھک جاتا ہے اور اس کے پاؤں کی مقدس خاک کے ذروں سے اپنی پیشانی روشن کرتا ہے +

میرے بیٹے ....

جا - میرے پاس اپنے دل کے ٹکڑوں اور آنسوؤں کو نہ لا - ان منتشر قطروں اور ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ - ان میں محبت کے طوفان موجود ہیں - جا محبت کے طوفانوں میں سے زندگی کے موتی کی تلاش کر - محبت کے معنی سمجھ - محبت کرنے کی صلاحیت پیدا کر - تجھے جب محبت کرنی آ جائے گی تو یہ انسان جن کے سامنے تو سجدے کرتا ہے تیرے قدموں میں گر جائیں گے - میں نے تجھے محبت کرنے کے لئے دل دیا ہے ، روح دی ہے آنسو دیئے ہیں - محبت کرنے کے لئے دنیا کو آہ و نالے نہ سنا - محبت کی آگ میں جل اس کے شعلوں سے اپنے آپ کو خاک بنا اور اس خاک کے ذروں کو اپنے آنسوؤں سے سیراب کر - پھر جب تو تو نہیں رہے گا اور خاک کے ذرے اور آنسو تجھے مجسم محبت بنا دیں گے اس دنیا کے ذرے ذرے کو اور مجھے تیری اور صرف تیری تلاش ہو گی - میں تجھے اپنی آغوش میں لینے کے لئے بیقرار ہو جاؤں گی اور میرے لب تیری پیشانی چومنے کے لئے ترسیں گے -

میرے بچے ....

جا محبت کے نور سے منور ہو جا - پھر دنیا تیری پرستش کرے گی "

میں نے کہا " ہاں ، میری ماں تو سچ کہتی ہے - تو ماں ہے اور ماں کا دل صرف جذبات کی دنیا ہوتا ہے - تیرا دل ایک سمندر ہے جس کی سطح پر محبت کی کشتیاں چلتی ہیں اور تو اپنے ہر بیٹے کو ان کے لطیف اور خواب آور جھکولوں میں سُلا دینا چاہتی ہے - لیکن جن فضاؤں میں تیری یہ بے لوث آرزوئیں رہتی ہیں ان پر تیرے اُن ہی بیٹوں کی حکومت ہے جن کے لئے تیری نعمتیں وقف ہو چکی ہیں - ان کے سامنے تیری دی ہوئی محبت اور اس کے خلوص کے معنی کچھ نہیں - ان کی زندگی کی رہنمائی صرف عقل کرتی ہے - جذبات کی پرستش کرنے والوں کو وہ صرف اپنے اصولوں پر پرکھتے ہیں اور انہیں اپنی ٹھوکروں سے پامال کر دیتے ہیں +

اس دنیا میں کتنے انسان ہیں جن میں محبت کی صلاحیت موجود ہے لیکن ان کی زندگیاں تیری اُن فضاؤں میں جہاں سُورج اور چاند اپنی سنہری شعاعوں سے روشنی کی بارش کرتے ہیں تاریکیوں کا گہرا سمندر بنی ہوئی ہیں - کتنے ٹوٹے ہوئے دل ہیں جو سینوں کی ہڈیوں کے پنجروں میں دھڑک رہے ہیں - کتنی روحیں ہیں جو خوشی کی ایک رمق کے لئے ترستی ہیں - کتنی آنکھیں ہیں جو مسرت کی بجائے آنسوؤں کا ابلتا ہوا چشمہ بنی ہوئی ہیں - کتنی حسرتیں ہیں جو تڑپ تڑپ کر فنا ہو رہی ہیں - کتنی چیخیں اور آہیں ہیں جو ان فضاؤں میں بلند ہوتی ہیں [illegible] صدا بصحرا ثابت ہوتی ہیں کتنے مظلوم انسانوں کی پیشانیاں ہیں جو ہر روز جب آفتاب کی سنہری کرنیں صبح کا پیغام لے کر تیری بارگاہ میں حاضر ہوتی ہیں اور تجھے گہرے خواب سے بیدار کرتی ہیں تیری پرستش کرتی ہیں اور تیرے سامنے خاک کے ذروں کو تھکتی ہیں - کتنے ہاتھ ہیں جو تیرے سامنے دعاؤں کیلئے اُٹھتے ہیں - کتنے لب ہیں جو بھکاری بن کر تجھ سے سوال کرتے ہیں -

لیکن بتا ....

جب شام ہوتی ہے اور تیری محفل سے عشرت کے نغمے بلند ہوتے ہیں
جب تو چاند کی شمع لیکر محبت سے روشن روحوں کی تلاش کرتی ہے
نہیں —————— !

جب تو گناہ کا شعلہ اپنی پوری قوت سے روشن کرتی ہے
وہ انسان تجھ سے کیا لے کر جاتے ہیں؟
پُرنم آنکھیں، جلے ہوئے دل، تڑپتی روحیں، غم، ڈوبتی ہوئی زندگیاں،

بتا۔ کیا تو ان کی ماں ہے؟
ماں کے قدموں کے نیچے اس کے بیٹوں کیلئے جنت ہوتی ہے
تو اگر ماں ہے اور اس دنیا کے اندھوں کی طرح بھٹکتے ہوئے
انسان اگر تیرے ہی بیٹے ہیں
تو ان روشنی سے جگمگاتے ہوئے محلوں سے نکل، اپنے شفاف
چشموں کی چاندی جیسی آبشاروں سے نکل، اپنے مخملی سبزہ زاروں سے نکل،
اور ان مغموم انسانوں کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی دنیا کو بھی دیکھ
اور اگر ان کے لئے تیرے سینے میں کوئی درد ہے۔

تو اپنی فولادی قوتوں سے اپنے درندے بیٹوں کی عقل کی ان
عظیم الشان چٹانوں کو توڑ دے جو میرے آنسوؤں اور میرے خون کے
قطروں پر کھڑی ہیں +

لیکن اگر تیری محفل میں عقل ہی کی حکومت رہے گی، انسان تیز
دنیا کی چکی میں پسنے ہی کے لئے بنائے جائیں گے، جذبات کی دنیا میں
کوئی قدر نہ ہوگی اور آنسوؤں کی کوئی قیمت نہ ہوگی
تو لے اپنی دی ہوئی آرزوؤں کو بھی لے جا
آرزوؤں کے مرکز دل کو بھی لے جا
دل میں پیدا ہونے والے محبت کے طوفانوں کو بھی لے جا
طوفانوں سے جوش کھانے والے خون کے سرخ قطروں کو بھی لے جا!"
قدرت پر سکوت چھا چکا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔
شام فلک بوس عمارتوں کو اپنی آغوش میں لئے کھڑی تھی ان
میں سے ارغنوں کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں اور میں اپنے آنسو لئے
ان انسانی آبادیوں سے دُور بھاگا جا رہا تھا +

ساقی

جستجوئے لامکان

نہ ہمارے دوست ہیں نہ رشتہ دار، دولت نہ جائے سکونت،
اگر ہے تو صرف اس شاہراہ کے دوسرے سرے پر پہنچنے کی خواہش۔
اور اس خدائی شہر کی جستجو۔
قناعت، آسائش، دلجمعی اور تسکین ہمارے لئے نہیں ہے۔
ہم ایک ایسے شہر کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو ہمیں کبھی نہیں ملے گا۔
ہم یہ راستہ طے کرتے چلے جاتے ہیں۔
صبح، سورج، آندھی، بارش، ستارے، نیند اور پھر وہی راستہ،
ہم خدا کے شہر کی تلاش میں ہیں اور حقیقت کا مسکن ڈھونڈھتے ہیں،
لیکن پھر وہی شور و ہنگامۂ دنیاوی سامنے آجاتا ہے۔
ہائے! وہ خاموش شہر اور اس کے فرشتہ سیرت باشندے نہیں ملتے +
اس گرد و غبار سے اٹی سڑک پر ہم چلتے رہتے ہیں اور دن ختم ہو جاتا ہے۔
اور اس راستے کا انجام! —————— حقیقی مدعا نظر نہیں آتا۔

(انگریزی) (محمد صادق قریشی)

لطفِ سخن

شمیم گیسوئے مشکیں سنگھائے جاتے ہیں
وہ اک جہان کو بیخود بنائے جاتے ہیں

[illegible] وہ آنکھیں چرائے جاتے ہیں
جو دشمنوں کے یہاں بے بلائے جاتے ہیں

[illegible] دل میں جگر میں سینے میں
وہ کس لئے مری ہستی مٹائے جاتے ہیں

رہے سہے بھی ہیں ہوش و حواس کھو بیٹھا
جو آج وہ مجھے جلوے دکھائے جاتے ہیں

رہی تمیز نہ دیر و حرم کی اب مجھ میں
وہ آج کچھ مجھے ایسی پلائے جاتے ہیں

مجھے مٹا کے بھی اُنکو نہ آہ چین آیا
وہ مجھ کو گور سے لحد بھی مٹائے جاتے ہیں

جنھیں تھا عالمِ تصوّر میں بھی مرے آنا
وہ آج کیوں مجھے جلوے دکھلائے جاتے ہیں

وہ بھری ہر رگ و پے میں ہیں جلوہ گر شاہد
طرح طرح سے وہ دل میں سمائے جاتے ہیں

(شاہد رام نگری)

——— ۲ ———

تسلی کیا ہو ایسے تشنہ کامانِ محبت کو
بڑھا دیتا ہے آبِ تیغ بھی جن کی حرارت کو

اٹھا لیتا ہوں کوہِ غم بھی ہر اِس ناتوانی میں
حسد کرتے ہیں دشمن دیکھکر میری شجاعت کو

روانی رات دن ہے اشکِ خوں کی چشمِ گریاں سے
لگا یا روگ تو اچھا دعا دیتا ہوں الفت کو

اگر اک جنبشِ ابرو سے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہوں
تو اے قاتل غنیمت کیوں نہ سمجھوں اس شہادت کو

کہاں کی نیند لیکن بس یونہی رکھتا ہوں بند آنکھیں
کہ شاید دیکھ لوں میں خواب میں اس ماہ طلعت کو

مرے مرنے پہ بھی قاتل کی ہیں بیرحمیاں باقی
جلانا جاتا ہے دامن سے بجھا کر شمعِ تربت کو

ڈراتا ہے لحد کی تیرگی سے کیوں مجھے زاہد
سمجھتا ہوں چراغِ قبر اپنے داغِ الفت کو

نہ ہو افسردہ خاطر اے صفی گردوں کی گردش سے
کبھی تو پھیر دے گا حق تیری برگشتہ قسمت کو

(صفی بہلدی)

——— ۳ ———

اٹھائی گردی عشق کی، روگ جیسے
یہ پاپڑ بہت روز تک ہم نے بیلے

محبت گرو، ہم محبت کے چیلے
کوئی عاشقی کا سبق ہم سے لے لے

جوانی کا زلِ جوش کھائے ہوئے ہے
کہیں کیا کہ ہم کونسا کھیل کھیلے

محبت نے کیا کچھ دیا ہے نہ پوچھو
عجب کیا محبت اگر جان لے لے

زمانے کے ساتھی بہت بیوفا ہیں
چلے جا رہے ہیں اکیلے اکیلے

یہ کشتی کنارے سے کیونکر لگے گی
چلے آ رہے ہیں مصائب کے ریلے

محبت کی تربت پہ پھولوں کی چادر
محبت کے سر میں زمانے کے ڈھیلے

کہاں لے اڑی، اے زمانے کی گردش
وہ دن کی سبھائیں وہ راتوں کے میلے

وقار آہ وہ عشق کی سادہ کاری
وہ گاؤں کے معشوق الھڑ اَنیلے

(وقار انبالوی)

——— ۴ ———

بے مہریٔ اربابِ جفا یاد رہے گی
گزری ہے جو ہم پر بخدا یاد رہے گی

وہ لغزشِ مستانہ کی تمہید کا عالم
اٹھتی ہوئی گھنگھور گھٹا یاد رہے گی

اللہ! وہ ساعت طلبِ عشق کی ساعت
برباد یئے قسمت کی دعا یاد رہے گی

اے بوالہوسو! زندگیٔ خضر نہ مانگو
یہ ایسی دعا ہے جو سدا یاد رہے گی

گو اور سزائیں بھی ہیں اے داورِ محشر
لیکن تیری دنیا کی سزا یاد رہیگی

(ناظر دہلوی)

——— ۵ ———

سوز ِ سی معمور میری زندگی کا ساز ہے
اس پہ بھی تیرا کرم کچھ اے نگاہِ ناز ہے

قوتِ بازو کا دعویٰ ہے تو آ میدان میں
ورنہ اپنے آشیاں میں ہر کوئی شہباز ہے

چار تنکے بار ہا آتش بداماں ہی رہے
پھر بھی اہلِ آشیاں کو ان پہ کتنا ناز ہے

آنکھوں آنکھوں میں پلا دیتا ہے اہلِ غم کو
[illegible]ے ساقی میں خدا جانے یہ کیا انداز ہے

ان کو یہ خطرہ مرا انجام کیا ہو دیکھئے
[illegible] کو یہ غرّہ ابھی تو عشق کا آغاز ہے

رک نہیں سکتی کبھی روشن میری طبعِ رواں
میرا ہر تارِ رگِ جاں زمزمہ پرداز ہے

(روشن نکودری)

ایڈیٹر

جب تک میری بیوی زندہ رہی، میں نے پرو بھا کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ مجھے لڑکی سے زیادہ ماں کا خیال تھا، اور میری تمام توجہ کا تنہا مرکز وہی تھی۔

اس وقت پرو بھا کے ساتھ میرا سلوک بالکل رسمی اور سطحی تھا۔ اور وہ صرف اس حد تک محدود تھا کہ میں کبھی اس کی تتلی باتیں سن لیتا تھا یا تھپتھپا دیتا تھا یا کبھی کبھی اس کے معصوم تبسم اور کھیل کو دیکھ لیتا تھا۔ جب تک مجھے اچھا معلوم ہوتا میں اسے کھلاتا، اور جب میری طبیعت بیزار ہونے لگتی تو میں اسکو اس کی ماں کے حوالے کر دیتا۔

میری بیوی کی قبل از وقت موت نے آخر کار پرو بھا کو میری آغوش میں ڈال دیا اور میں نے اس کو اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آیا میں نے، اس یتیم بچی کی پرورش کو اپنا فرض تصور کر لیا یا اُس نے اپنی ماں کے بعد، اپنے باپ کی خدمت کرنے میں اپنی تمام توجہ صرف کر دی۔ بہرکیف یہ واقعہ ہے کہ چھ برس کی عمر سے وہ خانہ داری کا انتظام کرنے لگی۔ یہ بات صاف ظاہر ہو رہی تھی کہ یہ لڑکی خود کو اپنے باپ کا تنہا سرپرست سمجھنے لگی تھی۔

میں دل ہی دل میں اس کی اس حرکت پر مسکراتا تھا۔ لیکن میں نے اپنے آپکو پوری طرح اس کے ہاتھوں میں دے دیا تھا۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ اگر میں کبھی اپنے کپڑے کھونٹی سے اتارتا ہوں یا خود ہی چھاتا اٹھاتا ہوں تو یہ بات اسکو ناگوار گزرتی ہے اور وہ سمجھنے لگتی ہے کہ میں نے اس کے حقوق غصب کر لئے ہیں۔ اس کو پہلے کبھی ایسا اچھا کھلونا نہ ملا تھا جیسا کہ اُس کا باپ تھا اور اسے وہ اس کو کھلانے، پلانے، اور سلانے میں بے حد مسرت محسوس کرتی تھی البتہ جب میں اس کو ریاضی یا انگریزی ریڈر پڑھاتا تھا تو اس وقت مجھے بیدانہ حقوق حاصل ہوتے تھے۔

میں اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ میرے پاس کہاں سے اتنا روپیہ آئے گا کہ میں اس کو موزون جہیز دے سکوں گا۔ میں اس کو عمدہ تعلیم دے رہا تھا، لیکن اگر وہ کسی جاہل کے پلے پڑ گئی تو اُس کا کیا حشر ہوگا؟



میں نے روپیہ کمانے کا ارادہ کر لیا، میری عمر اتنی ڈھل چکی تھی کہ سرکاری ملازمت نہ مل سکتی تھی۔ اور میرے پاس ایسے ذرائع بھی نہ تھے کہ نوکری مجھے مل سکتی۔ اس لئے بہت غور و خوض کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ مجھے تصنیف و تالیف کا کام شروع کرنا چاہیے۔

اگر تم کسی بانس میں سوراخ کر دو تو پھر نہ تو اس میں پانی ٹھہر سکتا ہے نہ تیل۔ دراصل اس طرح اس کی پذیرائی کی قوت سلب ہو جاتی ہے لیکن اگر اس کو منہ سے پھونکا جائے تو بلا کچھ خرچ کئے ہوئے اس میں سے راگ پیدا ہو جاتا ہے۔ مجھے اس پر کامل یقین تھا کہ جو شخص کسی دوسرے میدان میں پیداوار حاصل نہیں کر سکتا وہ کم سے کم "ادب" میں ضرور کچھ پیدا کر سکتا ہے۔ اس خیال سے میری ہمت افزائی ہوئی اور میں نے ایک مختصر تمثیل لکھی لوگوں نے اس کو پسند کیا اور وہ اسٹیج پر بھی پیش کی گئی۔

جب مجھے ایک بار شہرت کا چسکا پڑ گیا تو میں نے اس سلسلے کو جاری رکھنے کا ارادہ کر لیا۔ اس کے بعد میں بہت دنوں تک مختصر تمثیلات لکھتا رہا۔ پرو بھا آتی اور مجھ سے مخاطب ہو کر محبت آمیز انداز سے کہتی "ابا جان، آپکے غسل کا وقت ہو گیا ہے" اور میں اس کو ڈانٹ کر جواب دیتا "چلی جاؤ یہاں سے دیکھتی نہیں ہو کہ میں لکھنے میں مشغول ہوں۔ مجھے پریشان مت کرو"۔

لڑکی افسردہ خاطر ہو جاتی اور مجھے چھوڑ کر چلی جاتی۔ میں نے گھر کی خادمہ کو نکال باہر کیا، اور نوکروں کو بھی بہت مارتا۔ اور جب گداگر دروازے پر آکر بھیک مانگتے تو میں ان کے پیچھے لکڑی لے کر دوڑتا تھا۔ چونکہ میرا کمرہ بالکل سرراہ تھا اس لئے اکثر اوقات راہرو مجھ سے رستہ دریافت کرنے لگتے لیکن میں جھنجلا کر اُن سے کہتا "جہنم کو یہ راستہ جاتا ہے" کم بختوں کو اس کا احساس ہی نہ ہوتا تھا کہ میں ایک تمثیل لکھنے میں منہمک ہوں۔

پھر بھی مجھے معاوضہ شہرت کے برابر نہ ملتا تھا۔ لیکن یہ امر میرے لئے باعث اضطراب نہ تھا۔ چند ہی روز میں ایک بہت اچھا موقع میرے ہاتھ آ گیا ایک قصبہ کے ایک زمیندار جاہی رام نے ایک اخبار جاری کیا اور مجھ سے استدعا کی کہ میں اس کی ایڈیٹری قبول کر لوں۔ میں نے اس خدمت کو منظور کر لیا۔

ابتدا میں چند روز تک میں نے اس قدر جوش و خروش کے ساتھ مضامین لکھے کہ جب سڑک پر سے گزرتا تو لوگ میری طرف انگشت نمائی کرتے مجھے اپنی اس دماغی قابلیت اور عظمت کا بہت زیادہ احساس ہونے لگا ۔

جاآہی رام کے پاس ہی آہی رام کا گاؤں تھا۔ ان دونوں زمینداروں [illegible] سخت رنجش اور عداوت تھی۔ اکثر اوقات ان دونوں میں ہاتھ پاؤں اور مار پیٹ [illegible] آجاتی تھی۔ لیکن اب مجسٹریٹ نے ان سے امن وامان قائم رکھنے کا [illegible] لے لیا تھا۔ میں ان میں سے ایک کی حمایت میں لکھا کرتا تھا۔ گویا میں نے ایک پیشہ ور بدمعاش کا بھیس اختیار کرلیا تھا۔ ہر شخص یہی کہنے لگا کہ میں اپنی حیثیت سے بڑھ کر بات کرتا ہوں ۔

میری تحریروں میں اس قدر اثر اور شرافشانی ہوتی تھی کہ آہی رام اپنا سر نہ اٹھا سکتا تھا۔ میں نے اپنے زورِ قلم سے اس کے قدیم خاندان اور ساری قوم کو سیاہ کر ڈالا ۔

اس قلیل مدت میں مجھے یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ میں اب بہت مسرت کی زندگی بسر کر رہا ہوں، میں کچھ موٹا بھی ہو گیا، اور میرا چہرہ ایک قابل شخصیت ہونے کے خیال سے چمکنے لگا۔ میں اپنی ذہانت اور ذکاوت کی خود ہی داد دیا کرتا تھا۔ جب میں آہی رام کے خاندان کے متعلق کوئی طنزیہ فقرہ لکھتا تو سارا جاآہی رام کا قصبہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگتا تھا۔ بہرکیف میرا وقت بہت اطمینان، مسرت اور چین سے گذر رہا تھا ۔

لیکن آخرکار آہی رام نے بھی ایک اخبار جاری کیا۔ جو کچھ اس اخبار میں لکھا جاتا تھا وہ بالکل مہمل، لغو، لچر اور فضول ہوتا تھا، اور اس میں علمی ادب کی جھلک تک نہ نظر آتی تھی۔ اس کی زبان بالکل بازاری ہوتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر لفظ پڑھنے والے کا منہ چڑا رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں گاؤں کے باشندے اس کا مطلب صاف صاف سمجھ گئے ۔

لیکن چونکہ میری طنز نگاری بہت اعلےٰ پایہ کی اور خوش اسلوب ہوتی تھی اس لئے اس کا اثر دونوں حریفوں پر بہت کم پڑتا تھا ۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب میں اس ذلیل قسم کی جنگ میں کامل طور پر فتح پاتا تھا تو میرے دوستوں کو میری فتحمندی کا علم ہوتا تھا۔ آخرکار بہت بیزار ہو کر میں نے "ادب میں ذوقِ سلیم کی ضرورت" کے عنوان سے ایک ناصحانہ مضمون لکھا۔ کیونکہ جو باتیں زیادہ سنجیدہ ہوتی ہیں ان سے مزاحیہ امور کے مقابلہ میں زیادہ ہنسنے کا موقع ملتا ہے، اور اس لئے میری اس اصلاحی کوشش کا اثر، میرے ہموطنوں پر میری توقع کے خلاف الٹا پڑا ۔

میرے سرپرست نے اپنی اگلی توجہ میری طرف سے ہٹا لی۔ میری موجودہ عزت و توقیر میں کمی ہونے لگی۔ اور اس میں سرعت کے ساتھ انحطاط ہونے لگا۔ جب میں سڑک پر نکلتا تو لوگ مجھ سے کوئی بات نہ دریافت کرتے حتےٰ کہ بعض احباب تو اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے میرے شانوں پر ہاتھ رکھتے اور مجھے طرح طرح کے مکروہ اور ذلیل ناموں سے پکارتے۔

اس اثنا میں میرے مداح، میری اُن تمثیلوں کو بھی بھول گئے جنہوں نے مجھے بامِ شہرت پر پہنچایا تھا، اب میں اپنے آپ کو اس دیا سلائی کی مانند سمجھنے لگا جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک جل کر سیاہ ہو چکی ہو۔

میرا دماغ ان باتوں سے اس قدر متاثر ہوا کہ باوجود انتہائی غور و فکر کے میں ایک سطر بھی نہ لکھ سکتا تھا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرے دل میں زندگی کا تمام ولولہ اور جوش خاموش ہو چکا ہے ۔

پروبھا اب مجھ سے ڈرنے لگی۔ اب اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ بغیر بلائے ہوئے میرے پاس آتی۔ اب یہ بات بخوبی اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ ایک معمولی گڑیا، ایک باپ کی ایسی قابلیت سے بدرجہا بہتر ہے جو مزاحیہ تمثیل لکھتا ہے ۔

ایک روز میں نے دیکھا کہ آہی رام کے اخبار نے میرے سرپرست کو چھوڑ کر میری ذات پر نکتہ چینی کی تھی، اور مجھ پر زہر اگلا تھا۔ میری شخصیت پر چند بہت بدنما الزامات لگائے تھے۔ ایک ایک کر کے میرے احباب میرے پاس آتے اور مجھے یہ مضمون سنا کر خوب قہقہے مار مار کر ہنستے۔ ان میں سے بعض نے تو یہ بھی کہا کہ خواہ اس مضمون میں حقیقت کچھ نہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ مضمون بہت خوبی سے لکھا گیا ہے۔ اس طرح دن بھر میں تقریباً بیس آدمی آئے اور سب نے ذرا ذرا سی تبدیلی کے بعد اس مضمون کو دہرایا ۔

میرے گھر کے سامنے ایک باغ ہے۔ میں شام کے وقت اس میں ٹہل رہا تھا۔ اس وقت میرا دماغ پراگندہ تھا اور میرا دل بہت بے چین تھا۔ جب پرندے اپنے اپنے آشیانوں میں واپس آگئے اور بالکل خاموش ہو کر بسیرا لینے لگے تو میں سوچنے لگا کہ ان پرندوں میں کوئی مضمون نگار نہیں ہے اور نہ وہ ذوقِ سلیم پر مباحثے کرتے ہیں ۔

اُس وقت صرف ایک ہی بات میرے ذہن میں موجود تھی، وہ یہ کہ اپنی اس توہین کا جواب کیا دے سکتا ہوں۔ نرم اندازِ بیان اختیار کرنے کا نقصان ہے کہ ہر درجے کے لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے میں نے پہلے کیا کہ میرا جواب بھی اسی سخت لہجے میں ہونا چاہیے' جس میں مجھ پر حملہ کیا گیا۔ میں ہار ماننے

پر تیار نہ تھا +

جیسے ہی میں اس نتیجے پر پہنچا۔ مجھے تاریکی میں سے ایک آشنا آواز سنائی دی، اور اس کے بعد ہی میں نے اپنی ہتھیلی سے کسی کے گرم گرم ہاتھ کو مس کرتے ہوئے محسوس کیا۔ میں اس قدر متفکر اور پریشان تھا کہ اس آواز سے واقف ہونے کے باوجود میں نے اس کا احساس نہ کیا کہ میں اس سے واقف ہوں +

لیکن ایک لمحہ کے بعد جب وہ ہستی وہاں سے غائب ہوگئی تو آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی اور میں ہونے کی یاد کو تازہ کر دیا۔ میری بیٹی ایک بار پھر میرے پاس آئی اور میرے کان میں چپکے سے بولی "ابّا جان"! لیکن جواب نہ پاکر اس نے میرا دایاں ہاتھ اٹھایا۔ اس کو اپنی پیشانی پر رکھا اور پھر خاموشی سے اندر چلی گئی +

ایک طویل عرصے تک مجھے پروبھا نے اس طرح نہیں پکارا تھا، اور نہ میرے ساتھ اس محبت کا اظہار کیا تھا۔ اس لئے آج اس کے اس طرح مجھے مس کرنے سے یکایک میرے دل میں اس کی محبت کے جذبات پیدا ہو گئے +

تھوڑی دیر کے بعد اندر جانے پر میں نے دیکھا کہ پروبھا اپنے بستر پر لیٹی ہوئی ہے۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ اور بظاہر اس کو کوئی جسمانی تکلیف تھی۔ وہ اس وقت اس شگفتہ پھول کی مانند نظر آ رہی تھی جو دن بھر کے بعد شام کو زمین پر گر پڑتا ہے +

اس کا ماتھا چھونے سے مجھے معلوم ہوا کہ اس کا جسم بخار سے تپ رہا ہے، اس کا تنفس تیز ہے اور نبض بھی زور زور سے چل رہی ہے +

میں نے محسوس کیا کہ یہ غریب لڑکی بیمار کے آثار دیکھ کر شفقت و محبت کی آس لے کر اپنے باپ کے پاس آئی تھی۔ لیکن وہ ایک نشتر کی مانند جواب لکھ کر بھیجنے کی سعی کر رہا تھا +

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ لڑکی نے اپنے دونوں گرم ہاتھوں سے میرا ہاتھ پکڑ لیا، اور بہت خاموشی سے ان کو اپنی پیشانی پر رکھ لیا +

آہتی رام اور رجاہتی رام کے جتنے اخبارات تھے۔ سب کو میں نے جلا کر راکھ کر دیا۔ اور مجھ پر جو حملہ کیا گیا تھا اس کا جواب بھی میں نے نہیں لکھا۔ میں نے کبھی اس قسم کی مسرت محسوس نہیں کی جیسی کہ اس وقت مجھے اپنے اعتراف شکست سے حاصل ہو رہی تھی +

میں نے اپنی بیوی کی اس یادگار کو اتنے دنوں تک اپنے سے دور رکھنے کے بعد آج پھر سینے سے چمٹا لیا تھا +

(ٹیگور کا آزاد ترجمہ)

محشر عابدی

غزل

قصۂ وفورِ غم کا لکھا اور رو لئے — اک بے وفا کو یاد کیا اور رو لئے

خلوت میں دل کا کام نہ پوچھو کہ کیا رہا — گذرا زمانہ یاد کیا اور رو لئے

ہم کو بس اتنی دردِ محبت کی ہے خبر — شعلہ سا ایک دل میں اٹھا اور رو لئے

پوچھو نہ کس ہیرسیٔ غربت کی حسرتیں — درد اپنا اپنے دل سے کہا اور رو لئے

مایوسیوں نے کام یہ بخشا ہمیں شہید
رونے سے جب جنوں بڑھا اور رو لئے

حیات اللہ شہید

دُنیائے اَدَب

غزل

ازان[illegible] ر چھپایا نہیں جاتا
لاتا ہوں اگر لب پہ تو لایا نہیں جاتا

[illegible] یہ خلش روح فزا کیا
گر وہ مری ہستی میں سمایا نہیں جاتا

ناصح ہے اور رائمِ جانِ تمنا کی برائی
جاتا نہیں یہ ذکر خدایا، نہیں جاتا

کیوں شورشِ محشر ہے بپا میری لحد پر
اس طرح تو سوتوں کو جگایا نہیں جاتا!

جلتا ہے شب و روز دلِ سوختہ میرا
جوں شمع سر شام جلایا نہیں جاتا

زنہار محبت میں نہ کیجو ہوسِ دوست
اس شہد میں یہ زہر ملایا نہیں جاتا

اپنے دلِ مجروح پہ ہنستے ہیں ہیں آپ
اوروں کو بھی رو رو کے رلایا نہیں جاتا

کس منہ سے تری سامنے آتے مگر آئے
ہر چند یہ حالت ہے کہ آیا نہیں جاتا

صورت تری کیا دل میں سمائی نہیں جاتی؟
نقشہ ترا کیا آنکھ کو بھایا نہیں جاتا ہے؟

یہ ناز بہت ہے کہ خطاکار ہیں تیرے
سر غیر کی چوکھٹ پہ جھکایا نہیں جاتا

آنکھیں تری آنکھوں سے ملائی نہیں جاتیں
سر اب ترے قدموں سے اٹھایا نہیں جاتا

تدبیرِ ملاقات ہو کیا حضرتِ حامدؔ
آتے نہیں وہ آپ سے جایا نہیں جاتا

"ہمایوں"

بنگالی

دعوتِ عمل

(۱)

بس رہنے دے!
یہ تسبیح گردانی، یہ عبادت، اور یہ وظیفہ خوانی رہنے دے!!
بھلے آدمی عبادت گاہ کے دروازے بند کئے، تاریک گوشے میں، تو
کیوں بیٹھا ہے؟
کس کی عبادت کر رہا ہے؟
ارے، آنکھ تو کھول.......... دیکھ تو سہی ....
"وہ" اس گھر میں نہیں ...

(۲)

جہاں دہقان مٹی کے ڈھیلے پھوڑ پھوڑ کر زمین کی کاشت کرتا ہے
جہاں پتھر توڑ توڑ کر سڑک کو کوٹنے والا مزدور بارہ مہینے اپنا خون پسینے کی راہ
بہاتا ہے......... وہاں "وہ" ہے +
"وہ" دھوپ اور پانی میں ان کا ساتھی ہے۔
"اس کے" دونوں ہاتھ مٹی سے میلے ہو رہے ہیں۔
تو بھی "اُس" کی طرح اپنا جُبۂ تقدیس اتار پھینک...... زمین پر آ بیٹھ....

(۳)

نجات؟ نجات کہاں پاؤ گے؟ نجات کہاں؟
اے پروردگار تو خود آفرینش کی زنجیروں میں ہم سب کے ساتھ بندھا
پڑا ہے +
چھوڑ ان مراقبوں کو...... پھینک دے یہ نذر و نیاز۔
تیرے لباس کے چیتھڑے اڑتے ہیں تو اڑنے دے..... عمل میں
اس کا شریک ہو +
پیشانی سے پسینہ بہنے دے +

میری رُوح کا بَربط

سنہری خوابوں ہی میں نے تجھے دیکھا تھا تو نے اس دن سے مجھے
کیا بنا دیا، اے میرے محبوب!
زریں خوابوں کی صبح کو میرے نغماتِ اُلفت فضا میں لہرانے لگے۔ اور
دُور تک چلے گئے +
تجھے دیکھ کر تیرے قدموں پر نثار ہو گئے +
یہ میری روح کے بربط کی پہلی تھرتھراہٹ تھی، اے میرے محبوب!

اِن گیتوں سے میرا دل شوق و آرزو کا سمندر بن گیا ہے۔ آسمان اور
زمین پر انہی گیتوں کی گونج ہے +
میرے بربط کے تار اب تک میرے نغموں سے لبریز ہیں +

آج صبح میں نے تیری یاد میں کئی گیت لکھے، اے میرے محبوب!
آج رات میں ان گیتوں کو روح کے بربط پر چھیڑوں گا۔ کیا تو سننے
آئے گا؟

آج تو نے مجھے کہاں پہنچا دیا، اے میرے محبوب، میں ربابِ صدا
کی طرح ہوں...... تو نے میرے دل کا تار چھیڑ کر روح کو بیدار کر دیا +
پھر میری روح کے نغموں نے ساری کائنات کو بیدار کر دیا +
قربان اے محبوب، تو نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا +

میں جب تجھے دیکھتا ہوں اے محبوب، تو بربط کے تار کپکپانے
لگتے ہیں۔ اور تیرے جمال کی تعریف میں ایک غیر فانی گونج پیدا کر کے مجھے
"لانہایت" میں گم کر دیتے ہیں +
اے میرے محبوب تو نے مجھے قلزمِ عشق کی تاریکی میں گم ہونے
کے لئے چھوڑ دیا ہے +
اور میں خوش ہوں کہ مجھے "نورانی خط" مل گیا ہے +
ہاں یہ خط منزل کی طرف میری رہنمائی کرے گا، اے میرے محبوب!
"جمالستان"

مدراسی

بہار کی آمد

اے بہارِ رنگیں! ایک وقت تھا جب میں نقابِ زریں ڈال کر، چمپا
کے گجرے پہن کر سیمیں پازیبوں کی جھنکار کے ساتھ تیری پیشقدمی کے لئے بڑھا
کرتی تھی۔ مگر وہ زمانہ اب گزر گیا۔ آہ! آہ!
راہ میں اگر میں دیوار کے زیرِ سایہ کھڑی رہ جاؤں اور تیرے استقبال کو
آگے نہ بڑھوں تو یہ نہ سمجھ اے نوبہار! کہ میری محبت سرد پڑ گئی ہے، یا اس میں
خلوص نہیں ہے، یا میں تیرے پُرفسوں جشنِ شادمانی سے کوئی مسرت حاصل
نہیں کرتی۔ نہیں اے بہارِ رنگیں! میرا دل تیرے لئے روتا ہے +
روتا ہے میرا دل۔ اے بہارِ شیریں! اور اداس رہتا ہے۔ اس
میں اب "واہ" نہیں ہے بلکہ درد کی ایک خلش، ایک چسک، ایک سوزش رسیدہ خو-
میں ملول ہوں اور اے بہار! تو اب مجھ میں تحریک پیدا نہیں کر سکتی
میرا شباب ختم ہو گیا!
جب تو آئی تھی میں نے تیرے لئے ایک حسین نغمہ گایا تھا۔ آہ! وہ
گیت، جسے میں اب بھول گئی ہوں!
وہ نغمہ گیا اب تو میں ایک دنیا کو بھلا چکی ہوں اور اب کچھ بھی یاد نہیں
وہ نغمۂ رنگیں جو کبھی میرے لبوں پر کھیلتا تھا...... آہ اسے
میں بھول گئی! میری رفیقہ! اے نوبہار! مجھے معاف کر اور [illegible]
آستی [illegible]

انگریزی

آزاد محبت

محبت کی راہ میں سب کچھ دیدو
دل جو کچھ کہتا ہے وہ مانو
دوست، احباب، ایام
دنیا کی قیمتی چیزیں، اپنا نیک نام، ارادے اور دنیوی اعتبار
سب کو محبت کی راہ میں لٹا دو
کچھ باقی نہ رکھو +
محبت بڑی جوان ہمت اور دلیر ہے
سب اختیار اسی کے ہاتھ میں دے دو
پورا پورا اسی کے کہنے پر چلو
ناامید ہو کر بھی امید کو ہاتھ سے نہ جانے دو
محبت پرواز کرتے کرتے آخر
اپنے نصف النہار کو پہنچ ہی جاتی ہے
عزمِ راسخ کے ساتھ اور ان تھک پروں کے ساتھ
کیونکہ یہ دیوی ہے جو اپنے راستے سے واقف ہے
اور پہنائے عالم کو خوب جانتی ہے

محبت بزدلوں کے لئے نہیں
اس کے لئے وہ ہمت چاہیئے جو شکست نہ ماننے
وہ روح جو شک و شبہ کو قبول نہ کرے

اور وہ ارادہ جس کو کوئی بدل نہ سکے

اور جو ان اوصاف کے مالک ہوں محبت بھی ان کو مالا مال کر دیتی ہے

اور انہیں وہ کچھ بنا دیتی ہے جو وہ کبھی نہ تھے

اور ہر وقت ان کا مرتبہ بلند کرتی رہتی ہے۔

[illegible] کے لئے سب کچھ چھوڑ دو

لیکن ہاں، میری ایک اور بات بھی سن لو

ایک اور بات جو تمہیں ضرور سننی چاہیئے

ارادے کی ایک اور نبض بھی تم کو معلوم ہونی چاہیئے جو چھوٹنے نہ پائے

محبت کی سانس استغنا کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دو

اور ہر زمانے میں اپنے آپ کو اپنے محبوب سے اسی طرح آزاد رکھو جیسے کہ عرب آزاد ہوتے ہیں۔

محبوب سے تمہارا تعلق تو جسم و جان کا سا تعلق ہو

لیکن جب اس کے نوجوان سینے میں

تم سے علیحدہ خوشی کی آرزو تمہیں جھلکتی دکھائی دے

تو اُس کو آزاد کر دو

اس کا دامن پکڑ کر اسے مت روکو

اور اُس گلاب کے پھول کی ایک پتی بھی اپنے پاس نہ رکھو

جسے اس نے اپنے گلہائے بہار کے ہار سے نکال کر پھینکا تھا

(رالف والڈو ایمرسن) (ملک محمد اسلم خاں ایم اے بیرسٹر ایٹ لا)

بچہ

ایک دن جب مئی کے آفتاب کی شعاعیں اپریل کی بارشوں کو خشک کر رہی تھیں میں نے ایک خوبصورت بچے کو کیاریوں کے شگفتہ پھولوں میں کھیلتے ہوئے دیکھا۔

وہ خوش رُو اور متبسم تھا لیکن اسے اپنی خوشی کی وجہ خود بھی معلوم نہ تھی۔ اس کو دیکھ کر کس کا دل اسے بے اختیار پیار کرنے کو نہ چاہتا ہوگا۔ اس کی پیشانی آسمان کے ستاروں سے بھی زیادہ روشن تھی۔

زمانے کی گردشوں نے اس جلد فریب وادی کی پُر امن زندگی کو انتہائی غصے میں آ کر تہ و بالا کر دیا۔ چشمے سوکھ گئے۔ طائروں کے دلکش ترانے خاموش ہو گئے، کنول کے پھول مرجھا گئے۔ لیکن وہ معصوم بچہ ابھی تک پتنگ اڑانے میں محو تھا۔ وقت نہایت سرعت کے ساتھ دنیائی ستارہ کو پیام بربادی دیتا ہوا گذر گیا، لیکن اُسے اپنی دلکش وادی کی بربادی کا علم بھی نہ ہوا۔

گناہوں کے دیوتا نے اس کو اپنی خونخوار آنکھوں سے دیکھا لیکن بچے کی معصوم آنکھوں میں کچھ ایسا جادو تھا کہ وہ سیاہ فام دیوتا اپنے ارادے میں شکست کھا کر شرمندگی اور ناامیدی کو اپنے ساتھ لئے ایک خوفناک اور تاریک غار میں چھپ گیا۔

ستم کا سیاہ فام آسیب [illegible] کے پاس گیا۔ خوف کے مارے اور صبر کی تمثال کے ٹیوں کا تاج پہنے ہوئے اور [illegible] کو تمہاری شراب کا پیالہ پیش کیا [illegible] نہایت معصومیت سے کہا ابھی [illegible]

[illegible] سے اُسے مسحور کرنا چاہا۔ [illegible] رہ گئے اس نے خفگی آمیز [illegible]

[illegible] کی ہے تبایا کہ حباب کیوں بنتے ہیں، درختوں سے پھل کیوں گر پڑتے ہیں اور گھونسلے کیوں ٹوٹ جاتے ہیں، اور اسے فطرت کے حیرت انگیز قوانین سے آشنا کرنا چاہا، لیکن ابھی وہ اس کو سنانے میں معروف ہی تھی کہ بچہ پھولوں میں جا کر سو گیا۔

وہ گہری نیند سو رہا ہے۔ سب انسانی امیدیں، رنج و مسرت، محبت تمنا، مال و دولت اور بہادری کے کارناموں سے لبریز ہیں لیکن بچہ ایک ایسی شیریں نیند میں ہے جو ملکوتی نور کی کرنوں سے منور ہے اور فردوسی زندگی کا منظر دیکھ رہا ہے۔

تاج بخش صدیقی

گیت

مسافر سمندر میں جہاں کہیں جائے ستارے اس کا ساتھ دیتے ہیں +
ماہتاب اپنے وقت کا پابند ہے - آفتاب فلک پر چمکنے میں کبھی خطا نہیں کرتا +
تمام دنیا میں سرسبز زمین اور سمندر پر یہ انسان کے ساتھ ساتھ رہتی ہیں +
اسی طرح عاشق کہیں بھی چلا جائے محبت اس کے دل میں ضرور رہے گی +
وہ کہیں بھی ہو ہر صبح ستارے ماند پڑ جائیں گے چاند چھپ جائے گا +
سورج رات کو غروب ہو جائے گا مگر بے غرضانہ اور سچی محبت اس کی غیر حاضری میں بھی روشن رہے گی +
اس کے فیض سے شب تاریک نہ ہوگی اور دن زیادہ روشن ہوگا +

(دیوان امرت لعل سہگل عندلیب)

جرمن

طوفانی رات

رات امنڈتے ہوئے طوفان سے متزلزل
کیسی یکایک سارے عالم پر چھا گئی ہے۔
(جیسے یوں زمانے کی ہلکی ہلکی تہوں میں لپٹی ہوئی ایک سیاہ پوٹلی تھی)
اس کی انتہا اوجِ ثریا سے بھی بلند تر،
اور ابتدا اس کی،
یہ ہیچ جنگل میں ہے،
نہ میرے چہرے کے اندر،
اور اس کا اندازِ قامت،
تیرے اندازِ قامت سے الگ،
چراغ اس رات کے آگے،
کج مج زبان ہیں،
اور حیران کہ ان کی روشنی ہیچ ہے،
یا سرتا پا جھوٹ ....
کیا مظہرِ نور سراسر دھوکا ہے
اور جلوۂ طور سراسر باطل ہے؟
کیا ہزار ہا برس سے
رات ہی ایک تنہا حقیقت ہے ....

ایسی راتوں کو اندھیری گلیوں میں
آدمی آنے والے جنم دیکھ لے ۔ دُبلے دُبلے،
زرد زرد چہرے،
جو نہ خود کسی کو پہچانیں نہ آپ پہچانے جائیں،
اور ایک عالمِ سکوت میں راہ گذرتے چلے جائیں،
لیکن کہیں بولنے پر آ جائیں تو قیامت ڈھا دیں،
اور سننے والا یوں دم بخود کھڑا رہ جائے،
جیسے کوئی مدت کا تہِ خاک رفتہ ہو،
یا ایک افسانۂ گم گشتہ۔
مگر وہ چپ رہتے ہیں،
جیسے مُردے،
گو ہیں وہ آنے والوں میں سے،
مستقبل ابھی شروع نہیں ہوا،
ابھی وہ اپنے چہرے
زمانے کی تہوں میں چھپائے ہوئے ہیں،
اور دیکھ نہیں سکتے،
جیسے آدمی پانی کے اندر نہ دیکھ سکے،
اور اگر
آنکھیں تھوڑی دیر کے لئے
لہروں کے نیچے کھول بھی دے
تو صرف مچھلیوں کا
جلدی جلدی چلنا دیکھے،
اور جہاز کے لنگروں کا گرنا،

ایسی راتوں میں قید خانے ٹوٹ جاتے ہیں،
اور پہرہ داروں کو ڈراؤنے خوابوں میں سہمتا چھوڑ کر
ان کے تمتے کی تحقیر کرنے والے
چپکے چپکے ٹھٹھے لگاتے نکل جاتے ہیں،

جنگل! وہ تیرے پاس آتے ہیں،
تیری گود میں سونے کے لئے،
اپنی لمبی لمبی قیدوں کا پشتارہ لادے ہوئے،
جنگل!

ایسی راتوں میں یکبارگی کہیں تھیئٹر میں آگ لگتی ہے،
اور اس کا چوڑا چکلا ہال، ایک عفریت کی طرح
ہزاروں کو کھاتا چباتا چلا جاتا ہے،
جو بھی پاس کے منہ میں دہشت کے مارے گھستا چلا جائے۔
مرد اور عورتیں راہوں میں دھنسے آتے ہیں،
ایک دوسرے سے خوف کے مارے چمٹے جاتے ہیں،
اور یکبارگی پورا ٹھاٹ ٹوٹ کر گرتا ہے،
اور سب کے سب اس کے نیچے۔
پھر کسی کو خبر نہیں ہوتی
کہ سب سے نیچے کس نے دم توڑے،
اور ایک کے کانوں میں
ابھی آوازیں گونج ہی رہی تھیں،
(آوازیں ہی تو وہاں سننے گئے تھے)
کہ دوسرے کے پیر نے اس کا دل کچل ڈالا۔

ایسی راتوں میں جیسے کچھ دنوں پہلے،
بڑے بڑے گذرے ہوئے بادشاہوں کے دل
تابوتوں کے اندر چونک کر پھر سے چلنے لگتے ہیں،
ایسے زور زور سے چلتے ہیں
کہ ان کی ضربوں سے یہ صندوق
جو چاہتے ہیں کہ ان طلس اور تاریکی
میں لپٹے ہوئے سنہرے خوابوں کو
اپنے ہاتھوں پر سنبھالے رہیں
یکایک پھٹ جاتے ہیں،
اور فلک نما گرجے ڈگمگانے لگتے ہیں،
ویران گنبدوں میں لٹکے ہوئے گھنٹے ایسے پھڑ پھڑاتے ہیں،

جیسے دہشت زدہ، بدحواس پرندے،
ان کے دروازے لرزاں ہیں
اور ان کی محرابوں کے جوڑ جوڑ میں رعشہ ہے،
جیسے اُن کی بنیاد کے سیاہ پتھر
اندھے کچھوؤں کی پیٹھوں پر رکھے ہوں،
جو ہلنے ڈلنے لگیں۔

ایسی راتوں میں مایوس العلاج سمجھنے لگتے ہیں
کہ ہم بچتے۔
اور کسی گزرے ہوئے تا تمام خیال کی دوڑ
پھر سے پکڑ لیتے ہیں،
اور سوچنے لگ جاتے ہیں،
لیکن ان سے چھٹنے والے چھوٹے چھوٹے بچوں میں سے سب سے
چھوٹا بچہ،
شاید اسی وقت میں،
اکیلی اندھیری گلیوں میں،
کہیں اکیلا بھٹک رہا ہو،
اور یہ خیال انہیں ایسا معلوم ہوتا ہے
جیسے ان کی طولانی زندگی کا پہلا اور آخری خیال ہو،
اور وہ دیر تک اُن کے سینوں پر
سیسے کی لاٹ کی طرح مسلط رہتا ہے۔
لیکن اب عنقریب سارے پردے اُٹھ جائیں گے،
اور یہ خیال
کہ بڑی دھوم مچائیں گے اس کی،
ان کے دلوں میں رچ رہا ہے۔

ایسی راتوں میں سارے شہر ایک سے معلوم ہوتے ہیں
پہلے پٹلے۔
جیسے طوفان نے ان کے لمبے لمبے جھنڈے
بالوں کی طرح پکڑ کر
ان کو کسی دور دراز فلک میں پھینک دیا ہو۔

جس میں ان کی حدیں دُھندلی دُھندلی نظر آتی ہوں
اور کہیں کہیں ندیاں ......

پھر تو یوں معلوم ہوتا ہے
کہ ہر باغ میں وہی ایک تالاب ہے،
ہر تالاب پہ وہی ایک مکان
اور ہر مکان میں وہی ایک دالان
اور سارے آدمیوں کی ایک ہی صورتیں ہیں،
اور سب کے سب اپنے چہرے
اپنے ہاتھوں سے ڈھانپے ہوئے ہیں۔

اور اُن کی نزع کا انداز
کچھ ایسا سارے گھر پر چھا جاتا ہے،
جیسے مکان آئینہ خانہ بن گیا ہو
اور وہ اپنی انگلیوں سے
بالوں میں یوں دبا دبا کر کنگھی کرتے ہیں
کہ وہ ساری قوتیں صرف ہو جاتی ہیں،
جو ان کے ہاتھوں نے عمروں میں جمع کی تھیں،
عمریں!
جو گذر گئیں۔

ایسی راتوں میں مرنے والوں پر ایک مستقل فراش ہونے لگتا ہے
وہ آہستہ سے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہیں
جن کے تنتے ان کے سروں کی نقاہت سے
بیماری کے ان لمبے لمبے دنوں میں
جڑوں سے ایسے نکلے آتے ہیں،
جیسے اب موت کی سنجھارتے اوپر ہی اوپر تیر رہے گئے؛

ایسی راتوں میں میری چھوٹی بہن بڑھتی ہے
جو مجھ سے پہلے پیدا ہوئی اور مجھ سے پہلے ہی
ننھی سی جان، مر گئی۔
تب سے کتنی ہی ایسی راتیں آئیں اور گئیں؛
اب تک جیسے اس کی کیسی موہنی صورت ہو گئی ہو گئی۔

جامعہ

بھوک لگی ہے بھوک

آج کل شاعروں کو گیت لکھنے کا ادبی ہیضہ ہو گیا ہے۔ اور چونکہ ہیضہ متعدی مرض ہے اس لئے اس کے جراثیم سے مظفر غریب بھی بچ نہ سکا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اور لوگ گیتوں میں بھی حسب معمول مبالغہ سے کام لیتے ہیں اور یہاں مبالغہ کا نام تک نہیں صرف تھوڑے سے جھوٹ سے کام چل گیا ہے۔

گیت

بھوک لگی ہے بھوک
مظفر
بھوک لگی ہے بھوک

موقع دیکھیں بینک میں جائیں — جائیں نوٹ چرا کر لائیں
حلوا مانڈا خوب اڑائیں — شرم حیا کو تھوک
مظفر
بھوک لگی ہے بھوک

بی اے کر کے بیکاری ہے — جینے تک سے بیزاری ہے
ناداری سے ناداری ہے — ہوک اٹھتی ہے ہوک
مظفر
بھوک لگی ہے بھوک

ناداری میں پریت لگائی — پریت لگا کر منہ کی کھائی
بن پیسے کا باپ نہ مائی — چوک گیا میں چوک
مظفر
بھوک لگی ہے بھوک

مظفر احسانی

فہرستِ مضامینِ "ادبی دنیا"

جلد ۱۰ — بابت ماہِ مئی ۱۹۳۴ء — **نمبر ۲**

تصویر:۔ سروجنی نائیڈو

سالانہ چندہ چار روپے سات آنے۔ محصول ڈاک اور وی پی نو آنے کل پانچ روپے۔ ممالکِ غیر سے دس شلنگ

حال و قال

انعامی مقابلہ

انعامی معمے حل کرنے کی طرف صرف روپے کا خیال ہماری توجہ کو نہیں کھینچتا بلکہ یہ ایک ذہنی ورزش ہے جو قریب قریب تفریح کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی لئے بعض انگریزی اخبارات و رسائل میں ایسے معمے بھی دیکھنے میں آتے ہیں جن کے حل کرنے کے لئے کوئی انعام مقرر نہیں ہوتا۔

اسی ہمارے ہندوستان میں جہاں ایسی تفریحی تحریکات کو اکثر ناکامی ہوتی ہے "ٹائمز آف انڈیا" کے مصور ہفتہ وار پرچے نے انعامی مقابلوں کو نہایت کامیاب طریق پر چلایا ہے اور اس میں اتنی ترقی کر چکا ہے کہ اس کا ایک انعام کسی غریب کو امیر بنا سکتا ہے یا کسی کی مستقل آمدنی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

"ٹائمز" کی کامیابی سے متاثر ہو کر ہمارے ایڈیٹر مقابلہ کو بھی شوق ہوا کہ وہ "ادبی دنیا" میں ہر مہینے ایک معمہ شائع کیا کریں۔ بدقسمتی سے ہم اُنہیں مردہ دلوں میں سے ہیں جو معموں وغیرہ سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ ہم نہ چاہتے تھے کہ وہ ادبی دنیا میں معمے درج کیا کریں۔ لیکن ہماری پاس انگیز دلیلوں سے وہ قائل ہونے والے نہ تھے۔ انہوں نے ایک نہ مانی اور یہ سلسلہ جاری کر کے رہے۔

وہ نہایت جوش کے ساتھ دلچسپ سے دلچسپ اور تعلیمی لوگ کہتے ہیں کہ مفید سے مفید معمے بناتے رہے اور اپنی ایڈیٹری کے متعلق خیالی قصر تعمیر کرتے رہے۔ ایک دفعہ مجھ سے کہنے لگے۔

"تمہیں معلوم ہے ہم کون ہیں؟ ہمارا حکم پچاس ہزار انسانوں پر چلتا ہے۔ اور ہمارے فیصلے کی کوئی اپیل نہیں۔"

ہم سمجھے کہ شاید یہ کہیں کے آنریری مجسٹریٹ ہو گئے ہیں۔ ہم نے پوچھا۔ "فرمائیے صاحب آپ کون ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "ہم ایڈیٹر مقابلہ ہیں۔"

کہاں اردو کی بے رونق بستی اور کہاں اُس شہر غدار کا تصور جس میں پچاس ہزار نفوس بستے ہوں۔ ایڈیٹر صاحب کی "رعایا" کی اوسط گزشتہ چھ مہینوں میں کبھی [illegible] نہیں بڑھی۔ تنگ آ کر آخر آج انہوں نے اپنے [illegible] ہے اور ہم افسوس کے ساتھ اس کا اعلان کر رہے ہیں۔

انعامی مقابلے کے سلسلے کو ہم اس مہینے سے ملتوی کر رہے ہیں۔ "ادبی دنیا" کے ناظرین اگر اسے پسند کرتے ہیں تو وہ اس کو مؤثر اور دلچسپ بنانے کے لئے اپنی تجاویز بتائیں تاکہ ہم ضروری اصلاحات کے بعد اسے دوبارہ جاری کر سکیں۔

گزشتہ ماہ کے مقابلۂ اشعار میں تقریباً سب کے حل درست موصول ہوئے ہیں۔ پچاس روپے کی قلیل رقم کے اس قدر زیادہ حصے کرنا چونکہ موزوں معلوم نہیں ہوتا اس لئے ہم اس رقم کو قرعہ اندازی کے ذریعے سے مندرجہ ذیل دس اصحاب میں تقسیم کر رہے ہیں۔

۱۔ بیگم صاحبہ سید اکبر علی صاحب بی اے ایل ایل بی، بھاٹی دروازہ، موتی ٹبہ لاہور
۲۔ چوہدری محمد شفیع صاحب بی اے بی ٹی ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول کوٹ ادو، ضلع مظفر گڑھ۔
۳۔ قاضی سید محمود نواز صاحب مدرس اردو ٹریننگ سکول۔ کیمپ پونہ
۴۔ حامد علی خاں صاحب، جائنٹ ایڈیٹر "ہمایوں"، لاہور
۵۔ سید ابرار احمد صاحب شائق، معرفت منشی مقبول احمد صاحب جنرل مرچنٹ پہاڑی دھیرج، صدر بازار، دہلی۔
۶۔ عبدالرشید صاحب دوم، دفتر ڈسٹرکٹ چیف انجینئر (ریجز) مغل پورہ
۷۔ غلام محمد صاحب سیکنڈ ماسٹر مڈل سکول کھوڑ، تحصیل پنڈی گھیب، اٹک
۸۔ عبدالوہاب خاں صاحب، معرفت محمد بشیر خاں صاحب، ریلوے بنگلہ نمبر ال ۵ علی گڑھ
۹۔ غلام حسین صاحب زراعت ماسٹر مڈل سکول سہال، براہ راولپنڈی۔ اٹک
۱۰۔ عبداللطیف خاں صاحب مترجم عدالت جناب جوڈیشل کمشنر بہادر۔ کوئٹہ

معمہ نمبر ۶ کا حل

۱۔ کسان ۲۔ عالمگیر ۳۔ اصلاح ۴۔ ریاست ۵۔ انقلاب ۶۔ آزاد ۷۔ لیڈر ۸۔ سہیلی ۹۔ انصاف ۱۰۔ باپ ۱۱۔ آفتاب ۱۲۔ منادی

مطالبات ۱۰ جون تک دفتر میں پہنچ جانے چاہئیں۔

منصور احمد

آئینۂ عالم

اخبار نویسی کی طاقت

اخباری اطلاعات جائز یا ناجائز ذرائع سے جمہوریت کو مستحکم یا متزلزل کر سکتی ہیں۔

کولمبیا یونیورسٹی کے مدرسۂ اخبار نویسی کے ڈین مسٹر سی۔ ڈبلیو۔ ایکرمین کے ایک لکچر کے اقتباسات جو انہوں نے ییل یونیورسٹی (امریکہ) میں دیا ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

حکومت کے نئے خیالات کی بہم رسانی اور ان کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں اخبارات کی صلاحیت و استعداد، اور جمہور کی مزاحمت اور مباحثے ایک قومی سرمایہ ہیں۔ کیونکہ موجودہ دورِ انقلاب میں عوام کو داخلی اور خارجی مسائل سے آگاہ کرنا جمہوریت کا اہم ترین فرض ہے۔

اس نکتہ چینی کے باوجود جو چند روزانہ اخباروں پر ان کی سطحیت عمومیت غلط بیانی اور کمینگی کی بنا پر کی جاتی ہے، امریکی اخبار نویسی کے متعلق ایک سب سے ضروری بات یہ ہے کہ رائے عامہ کی قوت مہیا کرنے اور عوام الناس کے جذبات کو برانگیختہ ہونے سے بچانے کی صورت میں یہ جمہور کی بہت بھاری خدمت سرانجام دے رہی ہے۔

جمہوریت کے زمانے میں قومی اور بین الاقوامی معاملات میں اس قسم کی تعلیم عامہ نہایت ہی ضروری ہے۔ کیونکہ جب لوگوں کے جذبات حد سے زیادہ برانگیختہ ہو چکے ہوں تو عمال بھی عوام کی مرضی کے خلاف کوئی حکم جاری نہیں کر سکتے۔ جمہور کی رائے ان کی تعلیم کا آئینہ ہے۔

جذبات انگیزی

اگرچہ بعض اخبار جذبات انگیز اور زر پرست ہیں اور ان میں سے چند بڑے بڑے شہروں میں بہت زیادہ تعداد میں شائع ہوتے ہیں لیکن یہ صرف ان ناتراشیدہ لوگوں کے لئے ہیں جن کی تعداد امریکہ میں بہت کم ہے۔

عالمگیر شہرت رکھنے والے مرکزوں میں امریکی اخباروں کا یہ چھوٹا سا گروہ عوام کے جذبات کو بیدار کرنے کے لئے بہت ضروری ہے لیکن سیاسی نقطۂ نگاہ سے اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ امریکہ میں کل روزانہ اخبارات کی اشاعت چار کروڑ ہے۔ لیکن مذکورہ بالا اخباروں کی اشاعت کل اشاعت کا دس فی صدی بھی نہیں۔ اخباروں کی اشاعت یا حکومت کے سلسلے میں بعض اوقات تو لوگوں کو دھوکا دیا جا سکتا ہے لیکن ہمیشہ نہیں۔

دنیا پر معتبر اطلاعات کی اہمیت اچھی طرح سے روشن ہے، عوام کی زندگی کے لئے یہ اتنی ہی ضروری ہیں جتنی روشنی، گرمی، ہوا اور پانی ان کے بغیر کسی قسم کی ترقی نہیں ہو سکتی۔

جس طرح ہر فردِ بشر کا فرض ہے کہ وہ خود غرضی اور خودی کی حدود سے باہر نکل کر اپنے آپ کو سوسائٹی کی ہیئتِ ترکیبی کا ایک جزو تصور کرے اسی طرح اخبار کو روزانہ خبروں کی طرف اتنی توجہ نہیں دینی چاہئے جتنی جدید خیالات کے تسلسل اور دنیا کے معاملات میں اپنی ذمہ داری کے احساس کو۔

عوام الناس، منظم اقلیتیں، فوجی رہنما، سیاسی لیڈر اور معاملاتِ عامہ میں حصہ لینے والے مرد اور عورتیں قوتِ کنایہ کی اہمیت کو جانتے ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ یہ نئی معلومات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ خواہ آزاد ہو یا غیر آزاد۔

خبروں کے جائز اور ناجائز استعمال نے قوتِ کنایہ کو دنیا کے معاملات میں ایک فیصلہ کن طاقت بنا دیا ہے۔ یہ جنگ کو چھیڑ سکتی ہے، اور اسے روک بھی سکتی ہے، یہ جمہوریت کو مستحکم یا تباہ کر سکتی ہے، یہ ایک قوم کو برباد یا آباد کر سکتی ہے۔

تاہم ہماری تعلیم گاہوں یا ان بڑے بڑے اداروں میں جو اپنے آپ کو بنی نوع انسان کا خیر خواہ کہتے ہیں، موجودہ زندگی کی اس اہم ترین قوت کو سمجھنے کے لئے عملی طور پر کچھ نہیں کیا جا رہا۔

اخبار نویسی کے لئے پروفیسر آئن سٹائن یا اڈمرل برڈ جیسے لوگ موزوں ہیں۔ بلکہ اگر ممکن ہو سکے تو دونوں کی ضرورت ہے، اور خصوصاً ان محققین کی جو فلسفۂ اخبار نویسی کا مطالعہ شروع کریں تاکہ انہیں معلوم ہو کہ بین الاقوامی امن، خود مختاری، حکومت اور جمہوریت کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے؟ معلومات عامہ کا رائے عامہ پر کیا اثر ہے؟ اور تعلیم، مذہب، وطن پرستی اور حکومت اخبار نویسی سے کہاں تک وابستہ ہے؟

مستقبل کی ضروریات میں سے سب سے اہم اس بات کی تحقیق ہے کہ روزانہ اخبار مجلسی نظام پر کن کن طریقوں سے اثر انداز ہوتا ہے۔

اس تحقیق کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ خبریں جو رائے عامہ کی بنا ہیں ان کی بہم رسانی اور بدامنی کے زمانے میں رائے عامہ کو موثر ثابت کرنے میں اخبار کو سماجی زندگی کے لئے زیادہ کار آمد بنایا جائے۔

نازی جرمنی کی خصوصیات

صنفِ نازک کو مطبخ کی خدمات کے لئے وقف کردو" کے نعرے

"نازی جرمنی" سپاہیوں کی سرزمین ہے، سپاہیانہ روح سے سرشار! اس کے موجودہ رہنما گذشتہ سپاہی تھے۔ اس کے حاکم سپاہیوں کی وردی میں ملبوس ہیں۔ اس کے ذکور یک آہنگی کے دلدادہ ہیں۔ ان کا نیم سیاسی اور نیم معاشرتی فلسفہ کچھ نیا نہیں بلکہ اس کے نشانات نپولین کے زمانے میں ملتے ہیں۔" یہ ہیں ایک ادیب کے خیالات جن کا اظہار اس نے حال ہی میں کیا ہے۔

نازیوں کے زمانے میں جرمن عورتوں کی حیثیت کا اندازہ کرتے وقت ہمیں یہ دو باتیں ضرور یاد رکھنی چاہئیں۔ جنگِ عظیم کے زمانے سے جرمن عورت نے کسی قدر معاشرتی اور اقتصادی آزادی حاصل کر لی تھی۔ لیکن جب نازیوں نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لی تو ان کا خیال یہ تھا کہ عورت کو گھر کے کام کاج اور مطبخ کی آبادی کے لئے وقف کر دیا جائے۔

سپاہیانہ طرزِ حکومت۔

نازیوں کے سپاہیانہ طرزِ حکومت کا مقصد خواہ وہ سیاسی سپاہی ہی کیوں نہ ہوں۔ عورت کو غلام بنانے میں مضمر ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ عورت مرد اور حکومت دونوں کی خدمت کرے۔ جرمنی کی لاکھوں عورتوں پر اس انقلاب کا بہت گہرا اثر ہوا ہے۔ بڑے بڑے جلسوں اور نمائشوں میں وہ اب بہت کم حصہ لیتی ہیں۔ موجودہ جرمن عورت اپنے شوہر لڑکے یا بھائی کو پریڈ کے لئے بھیج دیتی ہے اور خود اس کا کھانا وغیرہ تیار کر کے منتظر رہتی ہے۔ یہ ہے اس کا کام۔ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ یہ نیم سیاسی اور نیم معاشرتی تحریک مردوں کی جاری کی ہوئی ہے۔

بعض دفعہ نازی حکام عورتوں کی خوشامد بھی کرتے ہیں۔ حال ہی میں کاسل کے مقام پر ایک بہت بڑی نمائش ہوئی۔ ڈاکٹر لی نے تیس ہزار عورتوں کے ایک مجمع کے سامنے بڑے پُرزور الفاظ میں جرمن عورت کو تحفظِ نسل کے الٰہی تخیل کی اہمیت پر توجہ دلائی اس نے کہا۔ تحریکِ نسوانیت کا سب سے بڑا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ عورتوں کو امورِ خانہ داری کی طرف دوبارہ متوجہ کرے اور ایک ماں کی حیثیت سے انہیں انسانیت کا مقدس فرض ادا کرنے کی ترغیب دے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ڈاکٹر لی نے ایک عام مجمع میں جرمن عورتوں پر اس بات کا الزام لگایا تھا کہ گذشتہ جنگ کے دوران میں انہوں نے میدانِ جنگ میں شکایت آمیز خطوط بھیج کر جرمن سپاہیوں کے عزم و ہمت میں خلل ڈال دیا تھا۔

پس نازیوں کے عہد میں عورت کی حیثیت ہم پر واضح ہو گئی ہے ایک نازی مصنف لکھتا ہے۔ "مرد کے لئے ہتھیار پہننا اس کا پیدائشی حق ہے۔ لیکن اس کے برعکس عورت کی عزت اسی بات میں ہے کہ وہ ماں کے فطری فرائض انجام دے۔ مستقبل میں عورت حکومت کی حکمتِ عملی کا جزو ہو گی۔ اس کے لئے لازم ہے کہ بہادر مرد پیدا کرے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ بقائے نسل کے لئے اپنی صنف میں بھی اضافہ کرے

قدرتی طور پر نازی اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ مستقبل میں جرمن عورت کو اپنی اصلی حیثیت کا علم ہو جائے۔ انہوں نے لفظوں کی ایک مخصوص شعبدہ بازی سے نیم کاتھک انداز میں مریم کی تصویر کھینچ دی ہے۔ ان کے ہاں عورت کا صحیح تصور یہی ہے۔ نازیوں نے حکومت کا ایک ایسا ذہنی خاکہ ایجاد کیا ہے جس میں عورتیں جو رہنما بننے کے ناقابل ہیں داخل نہیں کی گئیں۔ نازیوں کا دعویٰ ہے کہ مارکس کے دورِ حکومت میں عورت کو اس کی روح اور صحیح نسوانی خصوصیات سے محروم کر دیا گیا تھا اور وہ اپنی فطرت سے بالکل بیگانہ ہو گئی تھی۔ اب عورتوں کی رائیں حاصل کر کے نازی اپنے آپ کو ان کے خیرخواہ ظاہر کر رہے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے صنفِ نازک کو آزادی کے خوفناک انجام سے بچا لیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہزاروں جرمن عورتیں ایسی ہیں جو اس نئے نظام کو پسند

نہیں کرتیں۔ جرمنی میں عورتوں اور مردوں کی آبادی علی الترتیب ۱۲۶۰۰ اور ۱۰۰ کی نسبت سے ہے جس کی وجہ سے دونوں کے درمیان اقتصادی اور معاشرتی توازن بہت مشکل ہے۔

اگرچہ عورتوں کی شکایات اخباروں کے ذریعے عوام تک پہنچنے نہیں پاتیں لیکن اُن کی اپنی کتابوں اور جلسوں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ موجودہ صورت حالات سے مطمئن نہیں۔ ہزاروں ایسی ضدی عورتیں بھی ہیں جن کے دلوں میں موجودہ آزاد خیالات نہایت سختی سے جاگزیں ہو چکے ہیں۔ عورتیں کثیر تعداد میں دکانوں دفتروں اور کارخانوں سے آہستہ آہستہ نکالی جا رہی ہیں۔ اور انہیں اپنے لئے جائے پناہ ڈھونڈنے کے لئے مجبور کیا جا رہا ہے۔

چونکہ وہاں فوری شادی کا امکان نہیں اس لئے عورتیں اُس مثالی خانہ داری کو بھی اختیار نہیں کر سکتیں جس کا ذکر آغازِ مضمون میں کیا گیا ہے۔

دنیا کی عظیم ترین دوربین کا عکاس

دنیا کی عظیم ترین دوربین کے لئے عکاس شیشہ ڈھالنے کی تیاریاں آج رات مکمل ہو گئی ہیں۔ یہ دوربین کائنات کے متعلق انسان کے علم کو اب سے چار گنا بڑھا دے گی۔

کل اُس محنت شاقہ کا نتیجہ نکلنے والا ہے جو اس عکاس شیشے کے لئے سالہا سال تک کی گئیں۔ کیونکہ اس کی کامیابی کے لئے ہر ممکن احتیاط کام میں لائی گئی ہے ڈاکٹر جی میک کالے ایک فاضل طبیعی ہیں جن کے اہتمام میں کام سرانجام ہوگا۔ اس کی ڈھلائی میں اڑتالیس گھنٹے صرف ہوں گے۔ اور ڈاکٹر موصوف نے اس عرصے تک جاگتے رہنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔

عکاس کی تیاری میں دس ماہ صرف ہو جائیں گے اس وقت تک یہ محض ایک تجرباتی منزل میں ہوگا۔ سیال شیشہ ایک بھٹی میں سے انڈیلا جائے گا جس کی تپش ۲۸۰۰ درجے فارن ہائیٹ ہوگی۔

۔۔۔ میں سے آئینہ ایک پہلے سے گرم کئے ہوئے سانچے میں ڈالا جائے گا اور اُس وقت تک اس میں پڑا رہے گا جب تک کہ رفتہ رفتہ ٹھنڈا ہو جائے۔ تبریدیا انجماد کا عمل روزانہ چند درجوں کی شرح سے ہوگا، اور کامیابی کا علم آج سے دس ماہ کے بعد ہو سکے گا۔

اس کام کو جس پر ساری علمی دنیا کی توجہ مرکوز ہو رہی ہے کارنگ گلاس ورکس کے پینتیس منتخب ماہرین علی الصباح شروع کریں گے، اور ڈھالنے کا اصلی کام آٹھ بجے شروع ہوگا۔

خیال کیا جاتا ہے کہ سیال مادہ سانچے میں ڈالنے پر آٹھ گھنٹے صرف ہو جائیں گے۔ کیونکہ اسے یکدم نہیں بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے ڈالا جائے گا اس ملک کے اور دوسری اقوام کے چار ہزار حکما جن کے پاس اجازت نامے ہوں گے اس تقریب کو دیکھنے آئیں گے۔

اس تجربے میں اتنی دلچسپی لی جا رہی ہے کہ کارخانے والے منتظمین کے آس پاس ناظرین کے لئے خاص طور پر ایک بالاخانہ بنانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

دیکھنے والے پچاس پچاس کی ٹولیاں بن کر اندر داخل ہوں گے، کھڑکیوں میں سے ڈالنے کا عمل دیکھیں گے اور پھر دوسری ٹولی کے لئے جگہ خالی کر کے چلے جائیں گے۔

ایک خاص بالاخانہ اخبارات کے نمائندوں کے لئے بنایا گیا ہے اس پر سے پگھلے ہوئے شیشے کو چمچوں کے ساتھ سانچے میں ڈالنے کا نظارہ نہایت اچھی طرح نظر آئے گا۔

اندر بیٹھ میں ہر حصہ لینے والے ہر آدمی نے شدید تپش سے بچنے کے لئے خاص قسم کے کپڑے پہن رکھے ہوں گے اس کے علاوہ انہیں پنکھیاں مسلسل ہوا دیتی رہیں گی۔ تاکہ تپش کو کم کیا جائے۔

ان تیاریوں کو کام کرنے والوں نے پسند نہیں کیا۔ وہ انہیں زائد از ضرورت سمجھتے ہیں۔ وہ بھٹی جس میں پگھلا ہوا شیشہ ہوگا ایک مہینے سے بتدریج گرم کی جا رہی ہے۔

عکاس کو ایک دو سو انچ قطر کی مقعر شکل میں ڈھالنے کی بجائے سانچے کو محراب دار بنایا گیا ہے جس سے تقریباً آدھے وزن میں اتنا ہی مضبوط آئینہ تیار ہو جائے گا۔

تقریباً ۔۔۔ پونڈ شیشہ بھٹی میں ڈالا گیا ہے۔ اور تقریباً چالیس ہزار پونڈ سانچے میں ڈالا جائے گا۔

یہ عکاس دنیا کی عظیم ترین دوربین میں لگایا جائے گا جو جنوبی کیلی فورنیا کی ایک پہاڑی کی چوٹی پر نصب کی جائے گی۔ اس رصدگاہ پر کل ۔۔۔۔۔۔ ڈالر صرف ہوں گے۔

اس وقت دنیا میں سب سے بڑا عکاس ماؤنٹ ولسن کی رصدگاہ میں ہے۔ اس کا قطر ایک سو انچ ہے۔ نئے عکاس کی جسامت اس سے دگنی ہوگی

مصنفین کے حقوق کا تحفظ

جینوا میں ایک نئے ادارے کا افتتاح

ادب اور آرٹ کی بقا کے سلسلے میں برن کی ترمیم شدہ کنونشن مورخہ ۱۳ نومبر ۱۹۱۱ء کے مطابق ہر ایک مصنف کو بین الاقوامی تحفظ حاصل ہے جو مختلف ممالک کے قوانین میں زیادہ وضاحت سے بیان کی گئی ہے۔

تاہم اکثر اوقات سرقہ کرنے والوں کے مقابلے میں مصنفین کو اپنی تصنیفات کی قدامت ثابت کرنے میں بڑی مشکل پیش آئی ہے جس کی وجہ سے انہیں بہت سے نقصانات برداشت کرنے پڑے حقیقی مصنف کے شاہد مثلاً خاندان کے افراد، سکرٹری یا تو بہت دور ہوتے یا انتقال کر چکے تھے یا متنازعہ فیہ تصنیف کی اشاعت کی صحیح تاریخ انہیں یاد نہ تھی۔ ہمیں اس کام میں دلچسپی لینے والے ان بے شمار لوگوں کی مساعی کا شکر گذار ہونا چاہیئے جنہوں نے جینوا میں ایک بین الاقوامی ادارہ قائم کیا ہے جو ادب، موسیقی، سنگتراشی کے کارناموں کو جن میں فسانے، ناول، ڈرامے، علمی موضوع پر کتابیں، فلمی مسودے، علمی کتابیں وغیرہ شامل ہیں مصنفین کی تحریری درخواست پر ایک رجسٹر میں درج کرے گا، جس میں داخلہ کی تاریخ کی تصدیق بھی لکھی جائیگی۔

مصنفین کی بین الاقوامی فہرست میں داخل کرنے کے لئے ہر ایک تصنیف کی دوہری نقل ایک درخواست کے ساتھ جینوا کے ادارے میں بھیجی پڑتی ہے۔ چھ دن کے اندر اندر درخواست کنندہ کو ارسال شدہ کتاب داخلہ کی دستاویزی تصدیق کے ساتھ واپس مل جائے گی۔ تصدیق نامے میں بالکل صحیح تاریخ درج ہو گی۔ کتاب کی دوہری نقل کی رسید جینوا میں رجسٹر پر درج ہو جائیگی یہ تصدیق نامہ مصنف کے حقیقی ہونے کا سرکاری ثبوت ہوگا اور خصوصاً قانونی تنازعوں میں بہت کام دے گا۔

حیاتِ انسانی کا تخمینہ

"کنٹمپرری ریویو" میں زندگی کے مستقبل پر ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں حیاتِ انسانی کا مشرح تخمینہ دیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کرۂ زمین پر آثار حیات کو ظاہر ہوئے تقریباً ۱۱۲۰۰۰۰۰۰۰۰ سال گزر چکے ہیں اور انسان کو اس دنیا میں آئے دس لاکھ سال ہوئے ہیں۔ اگر دس لاکھ کے اس عرصے کو ایک مہینہ فرض کر لیا جائے تو تہذیب و تمدن کی تمام گذشتہ تاریخ کا زمانہ سات یا آٹھ گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوگا۔ لیکن اس کے برعکس اگر اسی حساب سے کرۂ زمین کی آئندہ عمر کا اندازہ کیا جائے تو ۱۰۰۰۰۰ سال بنتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ زندگی کو اپنا عمل جاری رکھنے کے لئے ۱۲۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ سال کا عرصہ درکار ہے۔ اس وسیع عرصۂ حیات کو مدِنظر رکھتے ہوئے کیا ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ انسان محض سب سے آخر میں نمودار ہونے کی بنا پر تخلیق کا آخری تجربہ ہوگا؟ کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان ہی ہر زمانے میں ارتقا کو جاری رکھنے کا بہترین ذریعہ ہوگا؟ اور کیا حیات اپنے آپ کو مادی جسم کی حقارت انگیز قید سے آزاد کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے گی۔

دنیا کی سب سے چھوٹی کتاب

امریکہ کے شاعر ہنری۔ ایچ چیمبرلین نے آکسفورڈ کی بوڈلین لائبریری کو دنیا کی سب سے چھوٹی کتاب پیش کی ہے۔ وارسسٹر کے کامن ویلتھ پریس نے عمر خیام کی مشہور رباعیوں کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے۔ کتاب کی تقطیع ۱/۲ انچ × ۳/۴ انچ سے زیادہ نہیں۔ یہ ۴۳ صفحوں پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ پر متن کی تقطیع ۵/۱۶ انچ × ۹/۱۶ انچ ہے اس کا وزن ڈیڑھ گرین کے برابر ہے اور اس کی جلد "قرمزی مراکو" کی بنی ہوئی ہے۔ ٹائپ کے حروف کو ترتیب دینا اس قدر نازک معاملہ تھا کہ یہ کام رات کو کرنا پڑا جب سڑک پر کی آمد و رفت اور دفتر کی مشینیں بند ہو چکی تھیں۔

صنّاع پیدا کرو

ہز ہائنس گائکواڑ، مہاراجہ بڑودہ نے حال ہی میں اپنی ایک تقریر کے دوران میں کہا "اپنے تمام سفروں میں دوسری قوموں کی صنعتی ترقی کو دیکھ کر میں نے یہ سمجھا ہے کہ ہندوستانیوں کے لئے صنعتی تعلیم حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔ سب سے پہلے صناع پیدا کرو۔ ہماری ترقی کی بنیاد یہی ہے۔ کامیابی کا عزم اور خواہش سب سے زیادہ اہم ہیں۔ اور ان کا خلاصہ دو لفظوں میں کیا جا سکتا ہے۔ یعنی "بڑھے چلو" اس مستحسن مقصد کو دل میں لے کر ایک عزم صمیم کے ساتھ مستقبل کا انتظار کرو۔

نوا ہائے راز

یوں درد و کرب سے نہ رہوں بیقرار میں
پروانہ وار اگر ہوں وطن پر نثار میں

کس سے کہوں کہ چھوڑ گیا کارواں مجھے
ہوں پیچ و تاب گردِ سرِ رہگذار میں

کاٹے سے کٹ سکیں گے نہ روز و شبِ فراق
کب تک کروں گا آہ ترا انتظار میں

آساں ہو لاکھ وعدۂ فردا کا اعتبار
کیا اعتبارِ عمر، ہوں بے اعتبار میں

اب داغ ہائے تازہ کا کس کو حساب دوں
بیٹھا ہوں لے کے اک دلِ گوہر شمار میں

ڈرتا ہوں اِس تپش سے، خدا جانے کیا کرے
تُو بے قرار اُدھر تو اِدھر بے قرار میں

پھر میرے دل میں کوند گئی آ کے برقِ طور
رختِ خودی جلا کے ہوا خاکسار میں

چھٹنے کو ہے جو ظلمتِ باطل محیط ہے
نور آفریں ہوں، گرچہ ہوں شمعِ مزار میں

کیا غم ہو مجھ کو موت کا ہاں اے عروسِ فتح
زندہ ہوں میں جو تجھ سے ہوا ہمکنار میں

حامد علی خاں

ایک راز

(ڈراما)

مقام:- ملاقات کا کمرہ (جس کے دروازے اور دریچے کھلے ہوئے ہیں اور دروازوں پر گرد جمی ہوئی ہے کرسیاں ادھر اُدھر بے ترتیبی سے پڑی ہیں۔)

وقت:- دن کے ½۱۱ بجے

افراد:- ماں اور باپ

باپ:- آہ ظالم موت!

ماں:- آہ میری نازوں کی پالی فیروزہ! اب ہم اسے کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔

باپ:- کیا تم نے اس کی ہر چیز نگاہوں سے اوجھل کر دی ہے، اس کے ملبوسات، اس کے کھلونے اور اس کی کتابیں، ان میں سے کسی ایک کا نظارہ یقیناً مجھے مار ڈالے گا۔ خدا کے لئے انہیں چھپا ڈالو۔

ماں:- ہاں میں نے اس کی ہر چیز چھپا دی ہے۔ اس کے کپڑے کھلونے، کتابیں، سب کچھ...... سب کچھ.... آہ!

باپ:- خدایا! ہم اس کے بغیر کیونکر زندہ رہ سکیں گے! مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا کسی نے نہایت بیرحمی سے میرا ایک بازو قطع کر لیا ہے اور مجھے اس وسیع دنیا میں ایک بے بس کی صورت زندگی بسر کرنے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔

آج صبح جب میں بیدار ہوا تو مجھے اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر زندگی کی تازگی و شادابی نظر آئی تھی، مگر افسوس وہ صرف ایک وہم تھا۔ غم و اندوہ کی ہولناک گھٹائیں برس کر رہیں اور حسرت و ارمان کے پہاڑ ٹوٹ کر رہے۔

ماں:- نزع کے وقت بچی کا تڑپنا ---- آہ مجھ سے دیکھا نہ جاتا تھا۔ بخت دردناک منظر تھا مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی میرا کلیجہ مسل رہا ہے۔ میرا خیال تھا کہ فیروزہ کے اس جانکاہ عذاب سے نجات پا جانے سے میرے مضطرب دل کو کچھ سکون حاصل ہو جائے گا۔ لیکن افسوس ایسا نہ ہوا۔ میں پہلے سے بھی زیادہ بےچین ہوں۔

اب ہم کبھی آشنائے مسرت نہ ہونگے۔ حیاتِ چند روزہ کے آخری لمحے تک غم و اندوہ ہمارا پیچھا نہ چھوڑیں گے۔ گو مرورِ زمانہ ہمارے تاثراتِ غم پر اثر انداز ہو کر انہیں ہلکا کریگا۔ اور ہماری آنکھیں بھی نیند سے ہم آغوش ہونگی جس طرح کہ اس حادثے سے پہلے ہوا کرتی تھیں لیکن آہ! اس نیند میں وہ سکون وہ اطمینان کہاں جو کبھی ہمیں میسر تھا۔

باپ:- مجھے یقین ہے کہ ہم فیروزہ کو کبھی نہ کبھی اور کسی نہ کسی جگہ ضرور دیکھیں گے۔

ماں:- ہم اسے کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ ہم اس کی یاد میں تڑپتے مر جائیں گے لیکن اس کی پیاری پیاری صورت کے دیدار سے محروم رہیں گے۔

باپ: تم تو کہا کرتی تھیں کہ ہم رفتگانِ عدم کو دیکھ سکتے ہیں۔

ماں:- ہاں میں کہا کرتی تھی لیکن اب معلوم ہوا کہ وہ سب جھوٹ تھا۔ ایسا جھوٹ جس کی فریب کاریوں سے ہم اپنی مسرتوں کا تسخر اڑایا کرتے تھے۔ اور اس وقت تو ہمیں اس جھوٹ کی ضرورت نہ تھی لیکن اب ----

باپ:- بے شک، بے شک: وہ ایک جھوٹ تھا، سخت ظالم اور ہمارے جذباتِ راحت سے کھیلنے والا جھوٹ۔

ماں:- ہم بھی تو کہا کرتے تھے کہ محبت ہمیں دوبارہ یکجا کرنے کی طاقت رکھتی ہے اور اب جبکہ ہمیں اس کی ضرورت ہے ہم جانتی کہ اس سے پیشتر کبھی نہیں ہوئی تھی وہ طاقت پہلے کبھی ہم

نہیں آرہی۔

کیا فیروزہ بھی ہماری طرح درد و کرب سے بیچین ہے اور ہماری ملاقات کے لئے تڑپ رہی ہے؟

جب کبھی وہ گھر سے دو ایک روز کے لئے بھی کہیں جایا کرتی تھی تو کس قدر ملول و غمگین واپس آتی تھی۔ گویا برسوں سے بچھڑی ہوئی ہے۔

آہ ہمارے خوابوں کی دنیا، اور وہ محبت جس نے ہمیں ایک فریب مسلسل میں مبتلا رکھا۔ آج ان دونوں کی حقیقت ظاہر ہو گئی۔

باپ:۔ خدا کے لئے خاموش رہو، مجھ میں تمہارے زہرہ گداز الفاظ سننے کی طاقت نہیں۔

ماں:۔ جب پیری ہمیں اپنی سفید چادر میں ڈھانپ کر ہمارے حافظے کی لوح سے دنیا کی دلبستگیوں کے نقوش محو کرنے کی کوشش کرے گی جب فیروزہ کی دلفریب باتیں، اس کی بھولی بھالی ادائیں ایک خوشگوار خواب کی طرح ہونگی اور جب وہ کسی اور دنیا کی فضا میں جوان ہو کر ایک سر بمہر فرشتے کی صورت اختیار کر چکی ہوگی مجھے اس کی مطلق پروا نہ ہوگی۔ میں اسے اب دیکھنا چاہتی ہوں جبکہ اس کی ہر معصوم ادا میرے حافظے میں تازہ ہے

باپ:۔ لیکن اس وقت نہ وہ "وہ" ہوگی نہ ہم "ہم" ہونگے۔

ماں:۔ میں اپنی بچی سے اپنے ان تلخ الفاظ پر اظہارِ افسوس کرنا چاہتی ہوں جو کبھی بطورِ فہمایش میری زبان سے اسے سننے پڑے تھے کیا وہ میرے اس اظہارِ افسوس کی پروا نہ کریگی؟

باپ:۔ اگر وہ کچھ جانتی ہے تو اسے تمہارے اظہارِ افسوس کا بھی علم ہے۔

ماں:۔ کاش وہ جانتی۔

باپ:۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندہ ہے اور ہمارا اسی طرح انتظار کر رہی ہے جس طرح کبھی ہمارے سیر سے واپس آنے کے وقت کیا کرتی تھی۔

ماں:۔ وہ اس کی صرف عادت تھی اور کچھ نہیں۔

باپ:۔ ہاں وہ اس کی صرف عادت تھی۔

(خاموشی)

وہ متفکرانہ انداز سے اپنا سر جھکا لیتا ہے، چند لمحوں کے بعد اٹھاتا ہے، اور سامنے کھلی ہوئی کھڑکی سے باغ کے منظر پر نگاہ ڈالتا ہے۔

باپ:۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو جو کبھی دل و دماغ کی فرحت کا باعث ہوتی تھی، آج پریشانی و اضطراب کا سامان بہم پہنچا رہی ہے۔

(کھڑکی بند کرنے کے لئے اٹھتا ہے، لیکن بند کرنے کی بجائے اس کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے اور باغ کو دیکھنے لگتا ہے)

باپ:۔ آج باغ اور اس کی دلکشی و دلفریبی پر بھی موت کا سا سکوت چھا رہا ہے۔ ہر چیز اداس ہے گویا ہماری طرح سب فیروزہ کے لئے سوگوار ہیں، آسمان کا منظر کس قدر ویران اور سنسان ہے بادل کا ایک ٹکڑا تک نظر نہیں آتا،

(دریچہ بند کر دیتا ہے)

ماں:۔ بارش کی سخت ضرورت ہے، سڑک کے گرد و غبار نے ناک میں دم کر رکھا ہے، ہر چیز خراب ہو رہی ہے، فرش پر گرد کی تہیں جمی ہوئی ہیں اور اس پر آج تعزیت کرنے والوں کے جوتوں نے اس میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ تمام گھر کو جھاڑنے پونچھنے میں کافی عرصہ لگے گا۔

باپ:۔ آفتاب آگ برسا رہا ہے، لیکن مرحومہ سردی سے کانپ رہی تھی، اس کے بغیر گھر ایک ویرانہ نظر آ رہا ہے، کبھی اس کے معصوم قہقہوں سے رشکِ فردوس تھا،

ماں:۔ آہ فیروزہ! وہ ایک موم کی گڑیا تھی جسے موت کی حرارت نے پگھلا کر نیست و نابود کر دیا۔ اسی کے دم سے یہ چار دیواری گھر کہلانے کی مستحق تھی۔

(چند لمحوں کے لئے دونوں خاموش ہو جاتے ہیں۔ باپ یکلخت کانپ اٹھتا ہے اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہتا ہے)

باپ:۔ سنو!

ماں: ۔ تم نے تو مجھے ڈرا دیا ہے۔

باپ:۔ سنو! یہ آواز کیسی آ رہی ہے۔

ماں:۔ ہوا سے دریچوں کی چلمنیں ہل رہی ہیں۔

باپ :- ہوا کا تو نام و نشان تک نہیں۔

ماں - ایک لمحہ کے بعد) جاؤ اوپر جا کر دیکھو۔

باپ - آواز کسی پرندے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے مشابہ ہے تو اب بند ہو گئی۔

ماں - خدا کے لئے اوپر جا کر دیکھو، کیا بات ہے، مجھ پر سخت گھبراہٹ طاری ہو گئی ہے۔ اگر تم نہ جاؤ گے تو میں خود جاؤں گی۔

باپ - نہیں تم نہ جاؤ، میں خود جاتا ہوں۔

(وہ کمرے سے نکل کر سیڑھیوں پر چڑھتا ہے اس کے بوٹوں کی کھٹ کھٹ سنائی دیتی ہے اور دریچے کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز آتی ہے ماں نیچے سے پکارتی ہے۔)

ماں - کیا بات ہے فیروزہ کے ابا!

باپ - ایک پرندہ کھڑکی کے نیم وا کواڑ اور چلمن میں پھنس گیا تھا، سمجھ میں نہیں آتا یہاں کس طرح آ گیا۔

(نیچے واپس آ جاتا ہے اور اپنی جگہ پر بیٹھ جاتا ہے۔)

ماں - کیسا پرندہ تھا!

باپ - عجیب قسم کا، میں نے آج تک کبھی نہیں دیکھا، کاش وہ مرحومہ کے کمرے میں رہتا۔

ماں - تمہارا اس سے کیا مطلب ہے، تم جانتے ہو کہ ہر ذی روح اس مکان کو چھوڑنے کی کوشش کر رہا ہے، ہم اگر یہاں سے نہیں جا سکتے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم زندہ ہیں، نہیں بلکہ ہم تو مردوں سے بھی بدتر ہیں۔

باپ - وہ کمرے کے اندر داخل ہونا چاہتا تھا۔ اس نے دو تین بار کوشش کی لیکن ناکام رہا کیونکہ میں نے کواڑ بند کر دیئے تھے، اب مجھے سخت افسوس ہے کاش میں اسے اندر آنے دیتا

ماں - تم تو بڑے وہم پرست ہو، کیا تمہارا خیال ہے کہ ---

(وہ دفعتاً رک جاتی ہے اور کچھ عرصے کے لئے خاموشی طاری رہتی ہے۔)

باپ - یہ ہماری مایوسی ہی ہے جو فیروزہ کو ہم سے جدا رکھتی ہے۔

ماں - تو کیا تمہارا خیال ہے کہ ہماری امید اس کو ہمارے پاس واپس لا سکتی ہے؟

باپ - نہیں۔

ماں - یا ہماری انتہائی خواہش اس کو دوبارہ زندہ کر سکتی ہے!

باپ - ہماری خواہش نہیں بلکہ ہماری محبت اس کو دوبارہ زندہ کر سکتی ہے کیونکہ خواہش صرف ہمارے فانی جسموں سے متعلق ہے، اس لئے فانی ہے اور محبت ایک آسمانی اور ابدی شے ہے، جس کو فنا سے کوئی تعلق نہیں وہ زندہ رہے گی۔

ماں - بہتر کوشش کر دیکھو۔

باپ - تمہارا تذبذب مجھے مار ڈالے گا۔

ماں - یہ میرے بس کی بات نہیں، نہ میرا تذبذب اور نہ میرا یقین ہی اسے واپس لا سکتا ہے۔

اور یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔

باپ - شاید پیانو کی تاروں سے ہوا ٹکرا رہی ہے۔

ماں - ہوا تو بالکل بند ہے اور تم نے بھی ابھی ابھی کہا تھا کہ ہوا کا نام و نشان تک نہیں۔

باپ - تو پھر ہماری آوازیں ہی اس کے تاروں سے متصادم ہوتی ہونگی

ماں - کیا آج تک کبھی ایسا ہوا ہے! لیکن یہ آواز پیانو کی آواز سے بالکل مشابہت نہیں رکھتی، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنے دماغ کے نہاں خانے میں کوئی آواز سن رہی ہوں اور کوئی چیز دیکھ رہی ہوں (گھبرا کر) سنو! دیکھو! کیا تم کچھ نہیں سنتے اور کچھ نہیں دیکھتے یا میں ہی پاگل ہوئی جا رہی ہوں۔

باپ - ہاں ہاں میں بھی سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں، کیا تم اس سے خوفزدہ ہو؟

ماں - مطلق نہیں، لیکن یہ کس قدر عجیب ہے، تمہیں کچھ اس کے متعلق علم ہے!

باپ - نہیں۔

ماں - کہیں ہم خواب تو نہیں دیکھ رہے!

باپ - خدا اتنا ظالم نہیں ہو سکتا۔

ماں - خدا نے موت کو پیدا کیا ہے۔

باپ - دیکھو تم نے فیروزہ کو سخت صدمہ پہنچایا ہے وہ ایسی باتوں کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اس سے معذرت کرو!

ماں — کیا فیروزہ یہاں ہے ؟

باپ — یقیناً۔

ماں — میری پیاری بچی! مجھے معاف کرو۔ میرا مقصد تمہیں رنج پہنچانا نہ تھا۔

اوہ! وہ کس قدر خوبصورت نظر آ رہی ہے۔ اس کا چہرہ گلاب کے تازہ پھول سے زیادہ شاداب ہے، وہ پژمردگی جو بیماری کے باعث اس پر چھائی ہوئی تھی، اب غائب ہے بے شک یہ وہی ہے، میری پیاری فیروزہ ...... لیکن آہ جب وہ چلی جائے گی تو فیروزہ کے ابا پھر تم اسے کہاں دیکھو گے ؟

باپ — اپنے دماغ، اپنے دل، اپنی زندگی اور اپنی محبت میں۔

ماں — ہاں میں بھی اسے اپنے دماغ، اپنے دل، اپنی زندگی اور اپنی محبت ہی میں دیکھتی ہوں۔ میں اس کا نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں محسوس کر رہی ہوں، ہم نے اپنی گم شدہ فیروزہ کو پا لیا ہے، لیکن یہ کس قدر تعجب خیز امر ہے کہ ہم اسے اپنے دل کی دنیا ہی میں دیکھ رہے ہیں، اس سے باہر اس کا کوئی وجود نہیں کیا تم اپنے دل کے علاوہ اسے اور کہیں بھی دیکھتے ہو ؟

باپ — ہاں تمہارے دل میں۔

ماں — مجھے بھی وہ تمہارے دل میں نظر آ رہی ہے اور میں اس کی آواز بھی سن رہی ہوں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم کس طرح یک جان دو قالب کے مصداق ہیں، اب ہم آپس میں کبھی نہیں لڑیں جھگڑیں گے، اور میں تسلیم کرتی ہوں کہ یہ سب کچھ تمہارے یقین و محبت کا کرشمہ ہے ...... لیکن کہیں ہم خواب تو نہیں دیکھ رہے ؟

باپ — ہم دونوں ایک ہی خواب بیک وقت کیونکر دیکھ سکتے ہیں ؟

ماں — دیکھ سکتے ہیں جبکہ ہم دونوں ایک ہوں۔

باپ — تم پھر شک کا شکار ہو رہی ہو، وہ دیکھو، مرجھا رہی ہے۔

ماں — میری بچی! میں مانتی ہوں یہ واقعہ خواب نہیں۔ اصل ہے

خدا کیلئے ہمیں چھوڑ کر نہ جاؤ۔ فیروزہ کے ابا! تم فیروزہ کو مرجھانہ کہو۔ دیکھو وہ مسکرا رہی ہے اور اس کے ہونٹ ہل رہے ہیں گویا وہ کچھ کہہ رہی ہے۔ کیا تم اس کا مطلب سمجھتے ہو ؟

باپ — اس کی گفتگو الفاظ سے بے نیاز ہے۔ تاہم میں اس کو سمجھتا ہوں۔

ماں — میں بھی سمجھتی ہوں لیکن میری خواہش ہے کہ تم اس گفتگو کو الفاظ کی صورت میں لے آؤ تاکہ یادگار رہے۔

باپ — لیکن جو کچھ وہ کہتی ہے لکھا نہیں جا سکتا، ہمارے لئے یہی کافی ہے کہ ہم اسے سمجھتے ہیں۔

ماں — نہیں مجھے یقین نہیں آنے کا تاوقتیکہ وہ تمہیں ابا اور مجھے اماں کہہ کر نہ پکارے۔

سنو! اس نے کچھ کہا ہے۔

باپ — ہاں میں نے بھی سنا ہے۔

ماں — اس نے ہمیں ابا اور اماں کہہ کر پکارا ہے۔ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں یقیناً خواب نہیں ہو سکتا۔ میری فیروزہ، مجھے اُس جگہ کے متعلق کچھ بتاؤ۔ جہاں اب تم ہو کیا وہ اسی طرح ہے جس طرح مقدس کتابوں میں لکھا ہے ؟

باپ — وہ جواب دینے میں پس و پیش کرتی ہے، اپنے بچپن میں جب کبھی وہ ہم سے کوئی سوال کیا کرتی تھی اور ہم جانتے تھے کہ اس کا جواب اس کے لئے کچھ سود مند نہیں، تو ہم بھی پس و پیش کیا کرتے تھے، آج ہماری حیثیت بھی اس کے نزدیک بچوں سے زیادہ نہیں۔

ماں — میں تو کروں گی اور ضرور کروں گی۔

باپ — لو وہ گئی! اے لو پھر آ گئی۔

ماں — نہیں ہم ہی کسی اور جگہ ہیں، آخر یہ کونسا مقام ہے ؟ کیا یہ وہ مقام ہے جہاں فیروزہ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں آنے سے پیشتر جس طرح ہم اس کے خیال میں ڈوبے ہوئے تھے، وہ بھی ہماری ذات میں مستغرق تھی —— ہم سب کی خواہشیں کس قدر یکساں ہیں —— میرے اللہ! یہ کیا راز ہے میں اس ہم آہنگی میں اس قدر محو

گئی ہوں کہ مجھے کچھ خبر نہیں کہ کہاں ہوں، خدارا مجھے بچاؤ:
فیروزہ کے ابا! کیا تم یہاں نہیں ہو؟

باپ۔ ہاں میں یہیں ہوں لیکن اس طرح نہیں جس طرح وہاں
تھا۔ میں اب اُس "کل" کا (جو تھا اور ہے اور رہے گا) ایک
جزو نظر آتا ہوں، یہی ہے اصل زندگی اور وہ —— اس
کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ میں تمہیں بھی دیکھ سکتا ہوں، فیروزہ
کو بھی، لیکن اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتا —— پانی کے اُس
حقیر قطرے کی مانند جو بحرِ ناپیدا کنار میں مل کر اپنی ہستی قائم نہیں
رکھ سکتا۔

ماں۔ اوہ! میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے بچالو خدا کے لئے
مجھے بچالو، میں ابھی اس کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میری فیروزہ
مجھ سے اُسی زبان میں گفتگو کرو، جس کو میں سمجھ سکوں، مجھ پر یہ
ناقابلِ برداشت سناٹا میں نہ ڈالو جو خیالات کے لئے کہیں
پناہ نہیں چھوڑتیں، مجھ میں اس بے پایاں مسرت کی برداشت کی
طاقت نہیں، مجھے ابھی اپنی حیاتِ مستعار میں واپس جانے
دو۔ میری پیاری فیروزہ! اور فیروزہ کے ابا آؤ میرے ساتھ
واپس چلو! اوہ! یہ تو وہی ہمارا مکان ہے جس کے در و دیوار
اور ہر چیز پر موت چھائی ہوئی ہے —— ہمارا پیارا مکان،
لیکن فیروزہ کہاں ہے؟ خدارا اس کو بلاؤ۔

باپ۔ اب ہم اسے نہیں بلا سکتے۔ میرے تو ہوش و حواس گم ہیں
مجھے تو اس کا بھی یقین نہیں کہ کیا میں واقعی اپنے مکان
میں ہوں۔

ماں۔ شاید وہ یہاں کبھی نہیں آئی۔ اور ہم نے صرف ایک خواب
دیکھا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں ابھی ابھی نیند
سے بیدار ہوئی ہوں۔ آخر ہم وہاں کتنا عرصہ رہے ہیں؟

باپ۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا، شاید زندگی بھر یا ایک لمحہ۔

ماں۔ بہرحال ہم بہت قلیل عرصے کے لئے وہاں رہے ہیں،
کیونکہ چڑیاں ابھی تک گلاب کے پودوں پر چہچہا رہی ہیں
جس طرح ہمارے جانے سے پیشتر چہچہا رہی تھیں گویا
حقیقت میں کچھ بھی واقع نہیں ہوا۔ لیکن پھر بھی ہمیں
فیروزہ کی گفتگو سے قدرے اطمینان ہو گیا ہے۔ کیا تمہیں
یاد ہے اس نے کیا کہا تھا؟

باپ۔ میں اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔

ماں۔ کچھ بھی نہیں ہوا، صرف ہمارے غم و اندوہ نے
ہمیں دھوکا دیا ہے۔ اور حسرت و الم نے ہمارا تمسخر
اڑایا ہے۔

باپ۔ لیکن ہم مطمئن کیوں ہو گئے ہیں؟

ماں۔ یہ ہماری غلط فہمی ہے، ورنہ حقیقت میں یہ سب
ایک فریب ہے۔

باپ۔ ہم کو اپنی زندگی کا پرتو پسِ پردہ نظر آیا ہے۔ جس سے
معلوم ہوتا ہے کہ یہ حیاتِ مستعار اس قدر حقیر اور ارزاں
نہیں جتنا ہم سمجھتے تھے، ہم فیروزہ سے ملیں گے اور ضرور ملیں
گے۔ لیکن کب؟ جب ہماری میعادِ حیات پوری ہو جائے گی۔
ابھی ہمیں زندگی کی کشمکش میں حصہ لینا ہے۔

(ماں ایک ٹھنڈی سانس لے کر گھر کے کام کاج میں
مصروف ہو جاتی ہے اور باپ باہر چلا جاتا ہے۔)

حمدی

غزل

اب وہ نوید ہی نہیں، صوتِ ہزار کیا کرے
نخلِ امید ہی نہیں، ابرِ بہار کیا کرے

دن ہو تو مہر جلوہ گر، شب ہو تو انجم و قمر
پردے ہی جب ہوں پردہ در، روئے نگار کیا کرے

عشق نہ ہو تو دل لگی، موت نہ ہو تو خودکشی،
یہ نہ کرے تو آدمی، آخرِ کار کیا کرے

اہلِ ہوس بھی ہیں بہت، خیر نظر نہ آیئے
یہ تو مگر بتایئے، عاشقِ زار کیا کرے

موت نے کس امید پر سونپ دئیے ہیں بحر و بر
مشتِ غبار ہے بشر، مشتِ غبار کیا کرے

شمع بھی ہے رہینِ یاس، پھول بھی ہیں اداس اداس
کوئی نہیں ہے آس پاس، شمعِ مزار کیا کرے

گریۂ شرم واہ واہ، فردِ عمل ہوئی تباہ
دیکھئے اک یہی گناہ، روزِ شمار کیا کرے

اپنے کئے پہ بار بار، کون ہو روز شرمسار،
مل گیا عذرِ پائدار، قول و قرار کیا کرے

ابو الاثر حفیظ جالندھری

نظیری کا رنگِ تغزل

اگر شاعری نام ہے جذبات کی صحیح ترجمانی کا، اور اگر شعر عبارت ہے وجدانی کیفیات کی دلفریب صورتگری سے، تو میرا یہ دعویٰ غالباً ناقابلِ قبول نہ سمجھا جائیگا کہ دنیائے شاعری میں نظیری کا منصب اتنا بلند ہے کہ بعض مواقع پر تو وہ حافظِ شیراز سے بھی بیش بیش نظر آتا ہے۔ اگرچہ اس نے حافظ کے تتبع کا اپنے اس شعر میں علانیہ خود بھی اظہار کیا ہے۔

تا اقتدا بہ حافظِ شیراز کردہ ایم   گردیدہ مقتدائے دو عالم کلامِ ما

مگر درحقیقت نظیری کی شاعری اُس کیفِ خاص سے معمور ہے، جس سے کما حقہٗ متکیف ہونے کے لئے ایک وجدانِ صحیح درکار ہے اور جس کے ادراک کے واسطے مذاقِ لطیف کی ضرورت ہے۔ اس کے اشعار میں جذبات کے ایسے تڑپتے ہوئے جلوے ہیں جن کی شعاعیں قلب کی تاریک ترین گہرائیوں کو بھی تھوڑی دیر کے لئے "بقعۂ نور" بنا کے رکھ دیتی ہیں، اس کے ایک ایک لفظ میں احساسات کی وہ جیتی جاگتی تصویریں ہیں جو دل کے ہر ہر گوشے میں ایک نئی کیفیت اور ایک نرالا تجسس پیدا کر دیتی ہیں، اس کی غزل کا ہر ہر مصرعہ گوناگوں رنگینیوں کا آئینہ دار ہے، اس کے الفاظ کی ایک ایک بندش میں جذبات کے سینکڑوں تابناک آبگینے جلوہ ریز نظر آتے ہیں۔ وہ ایسا شاعر ہے جو آپ کے سامنے وہ سب کچھ رکھ دیتا ہے، جو اس کے اعماقِ قلب میں مستور ہوتا ہے۔ اس کی آواز کبھی درد انگیز ہوتی ہے، اور کبھی طرب خیز، مگر ہمیشہ اتنی صاف اور غیر مبہم کہ ہر وہ شخص جس کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل ہے، اس کی صدا سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

عرفی ایک حساس شاعر ہے جو درد سے کراہتا ہے، خوشی سے خندہ پاش ہوتا ہے، حسرت و غم کا مجسمہ بن کر لوگوں کے سامنے فریادی ہوتا ہے، لیکن سننے والے اس کی آواز کو اس وقت سمجھتے ہیں جب بقولِ مومن یہ حالت ہوتی ہے کہ

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب   تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

وہ ایک ہوشیار غواص ہے، جو گرانبہا موتیوں کو سمندر کی تہ سے نکال کر لاتا ہے، لیکن اُس وقت جب دیکھنے والے اس کی واپسی سے مایوس ہو چکے ہوتے ہیں۔ حافظ ایک نخلِ بندِ معنی ہے جس کا دامن خوشبودار پھولوں سے بھرا ہوا ہے مگر جس پر اس کے ہوا خواہوں نے اپنی خوش اعتقادی سے خانقاہ کی موٹی موٹی سیاہ ردائیں اس طرح ڈال دی ہیں کہ جس سے پھولوں کی شگفتگی اور عطر بیزی بیک وقت ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ غالب ایک فلسفی ہے، جو ہنستا بھی ہے، مسکراتا بھی ہے اور درد و حسرت سے کراہنے بھی لگتا ہے، مگر سننے والے بعض اوقات اس کے شریکِ جذبات ہونے کے بجائے اس کا منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ لیکن نظیری ایک ایسی مضطرب روح ہے جو اہلِ ذوق کے دل و دماغ میں نغمہائے لاہوتی بن کر گونجتی رہتی ہے۔ وہ جب کراہتا ہے تو کل عالمِ احساس اس کے درد کی شرکت کے لئے تڑپ جاتا ہے۔ جب اس کے لبوں پر تبسم کھیلنے لگتا ہے تو کائنات کا ذرہ ذرہ خندۂ مجسم نظر آتا ہے۔ اس کی غزل کے ہر ہر شعر میں شعریت کی ایک وسیع دنیا پنہاں ہوتی ہے جو اپنی سادگیٔ زبان اور سلاستِ بیان سے ایک عامی کے دل میں بھی جوشِ جذبات سے ایک طوفان برپا کر دیتی ہے ...... ملٹن کے نزدیک "بہترین شعر وہ ہوتا ہے جس میں سادگی اصلیت اور جوش ہو"۔ ابنِ رشیق کہتا ہے "اچھا شعر وہ ہے کہ جب کوئی اسے سنے تو اس کی سلاست اور روانی کو دیکھ کر خیال کرے کہ میں بھی اس جیسا لکھ سکتا ہوں لیکن جب لکھنے بیٹھے تو نہ لکھ سکے۔" اچھے شعر کی ایک تعریف یہ کی گئی ہے "کہ اس کی زبان اتنی سادہ اور اس کے خیالات اتنے سلجھے ہوئے ہوں کہ اگر اس کو نثر میں منتقل کرنا چاہیں تو وہ بجائے خود نثر نظر آئے"۔

اگرچہ یہ تمام تعریفات ایک شعر کی تحدید نہیں کرتیں لیکن پھر بھی ذہن کو اس کے قریب قریب ضرور پہنچا دیتی ہیں۔ ان امور کو پیشِ نظر رکھ کر اگر نظیری کی غزلوں کا مطالعہ کیا جائے، تو یہ سب چیزیں اس میں بداہتہً نظر آتی ہیں، چند مثالیں ملاحظہ ہوں ...... نوجوان محبوب اپنی سادگی، ناتجربہ کاری اور الھڑپنے کے باوجود جس چالاکی سے دلوں پر قبضہ کر لیتا ہے

ہے، اس کو قریب قریب ہر شاعر نے مختلف پیرایوں میں ادا کیا ہے، لیکن نظیری ایک نئے اسلوب کے ساتھ جب اس کو بیان کرتا ہے تو دل میں ایک نیا زخم پیدا کر دیتا ہے۔

از کف نمی دہد دلِ آساں ربودہ را ۔ دیدیم زور بازوئے ناآزمودہ را

محب و محبوب میں شکوہ و شکایت، یہ خیال اتنا عام اور فرسودہ ہو گیا ہے کہ اس میں کوئی ندرت پیدا کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب نظیری اس کو بیان کرتا ہے تو نظروں کے سامنے ایک عجیب و غریب نقشہ کھنچ جاتا ہے

چہ خوش است از دو یکدل سرِ حرف باز کردن
سخنِ گذشتہ گفتن گلہ را دراز کردن
اثرِ عتاب بردن ز دلے ہم اندک اندک
بہ بدیہہ آفریدن بہ بہانہ ساز کردن

ایک جگہ محبوب کی رعنائیوں سے تصویرِ حیرت بن کر کہتا ہے۔

ز فرق تا قدمش ہر کجا کہ می نگرم ۔ کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

وصالِ محبوب کی ایک جاں نواز رات کا تذکرہ کس درجہ لطافت سے کرتا ہے

ہمہ شب برلب و رخسار و گیسوی زدم بوسہ ۔ گل و نسرین و سنبل را صبا در خرمن ست امشب

یہاں تشبیہات کی لطافت سے ایک عریاں ترین خیال کو جس دلربایانہ انداز سے پیش کر دیا ہے وہ مدح و توصیف سے بالاتر ہے۔

شاعری کی اصطلاح میں جس چیز کو "معاملہ بندی" کہتے ہیں، وہ حقیقتاً ایک ایسا مکمل ڈراما ہوتا ہے، جس کو شاعر اپنے کمالات سے انتہائی ایجاز کے ساتھ دو مصرعوں میں بند کر کے رکھ دیتا ہے۔ پھر اگر اس کا طرزِ بیان اس درجہ شگفتہ، سلیس اور سنجھا ہوا ہو کہ پڑھنے کے بعد متروک حصے خود بخود ذہن میں آتے جائیں تو اس کو شاعری کا کمال سمجھا جاتا ہے۔ نظیری کے یہاں ہمیں ایسی سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں، ایک شعر ملاحظہ ہو۔

مُردم از شرمندگی تا چند باہر ناکسے ۔ ہر دست از دور بنمایند و گویم یار نیست

اسی خیال کے قریب عرفی کا ایک شعر ہے۔

میروی با غیر و می گوئی بیا عرفی تو ہم ۔ لطف فرمودی برو ایں پائے را رفتار نیست

لیکن نظیری کے اندازِ بیان میں حسرت و افسوس کے جذبات کا جو طوفان پنہاں ہے وہ عرفی کو کہاں نصیب!

ایک جگہ کہتا ہے۔

تو مپندار کہ ایں نقصہ بخود می گویم ۔ گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

اس شعر میں جس لطیف انداز سے ایک طول طویل خیال کو ادا کر دیا گیا ہے، وہ ہر حیثیت سے قابلِ تعریف ہے۔ اگر ہم نظیری کے اس خیال کو زیادہ واضح الفاظ میں ظاہر کرنا چاہیں تو یوں کہیں گے کہ عاشق صدماتِ عشق کو سہتے سہتے سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے اور اس کی ضعف و نقاہت بڑھتے بڑھتے اس درجے کو پہنچ گئی ہے کہ اب اس کے منہ سے آواز بھی نہیں نکلتی۔ اتفاق سے محبوب ایک دن اس کی طرف آ نکلتا ہے۔ عاشق یہ دیکھ کر جامہ سے باہر ہو جاتا ہے اور اپنے گذشتہ شکوہ و شکایات کے دفتر کھول دینا چاہتا ہے لیکن نقاہت کا یہ عالم ہے کہ منہ سے جو آواز نکلتی ہے وہ اتنی کمزور اور نحیف ہے کہ اس کی وقعت سرگوشی سے زیادہ نہیں ہے۔ محبوب یہ حالت دیکھ کر سمجھتا ہے کہ شاید عاشق اس کی طرف ملتفت نہیں ہے بلکہ جنون میں آپ ہی آپ کچھ باتیں کر رہا ہے۔ عاشق کو محبوب کی اس بدگمانی کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ایک مرتبہ باآوازِ بلند کہتا ہے کہ "خدا کے لئے آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں یہ باتیں اپنے آپ سے کر رہا ہوں۔ بلکہ اس کے برخلاف میں تو یہ ساری رامِ کہانی آپ ہی کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں، لیکن یہ نقاہت کی وجہ ہے کہ میرے منہ سے آواز نحیف نکل رہی ہے۔ خدا را آپ اپنے کانوں کو میرے لبوں تک لائیے اور سنئے کہ میرے ہونٹوں کی جنبش آپ سے کیا کہہ رہی ہے۔"

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہم نے جس خیال کو پندرہ سولہ سطروں میں ظاہر کیا ہے۔ نظیری اس کو کس حسن و خوبی کے ساتھ دو مصرعوں میں کہہ گیا ہے۔ اور پھر شعر کی سلاست کا یہ عالم کہ یہ تمام غیر مذکور حصے ہمارے دماغ میں خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں اور یہی ہے ایک پختہ کار شاعر کا کمالِ فن۔

اس موقع پر غالب کا ایک شعر بھی قابلِ ذکر ہے۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم ۔ میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

اس میں بھی معاملہ بندی ہے۔ لیکن اس درجہ بعید از فہم کہ جب تک شرح کو نہ ٹٹولا جائے پوری طرح مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔ نظیری کا ایک اور شعر ہے۔

گویا تو بر دل می روی از سینہ دگر نہ ۔ جاں دادنِ کس ایں ہمہ دشوار نباشد

یہاں بھی ایک مکمل افسانہ ہے جس کو انتہائی خوش اسلوبی سے بحد اختصار کے ساتھ [illegible] کر دیا گیا ہے۔ عاشق اپنے محبوب کے پاس [illegible] آلامِ فراق کی شکایت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کا یہ درد و اضطراب موت کی سختیوں سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہے۔ اس پر محبوب

مسخر اور استہزا سے کہتا ہے کہ "ایسا ہی ہے تو پھر مر کیوں نہیں جاتا" عاشق اس پر بلبلا اٹھتا ہے اور کہتا ہے "تو میرے دل میں اتنا رچ گیا ہے کہ اب میری رگ و پے میں روح کی بجائے تیری یاد اور تیرا جلوہ گردش کرتا ہے، اور اس لئے اگر میری جان نکلنے لگی تو گویا اس کا یہ مطلب ہوگا کہ تیرا پرتو میری رگوں سے نکالا جا رہا ہے۔ ورنہ خود جان دے دینا تو کوئی بڑی بات نہیں ہے"

شاعری کا اہم ترین عنصر جذبات سے اپیل کرنا ہوتا ہے۔ یعنی جب شعر پڑھا جائے تو وہ ہر دل کے احساسات کی کائنات کو الٹ کر رکھ دے اور پھر پڑھنے والا بالکل یہ سمجھے کہ گویا شاعر اس کے دل میں بیٹھا ہوا اس کے حسیات کی ترجمانی کر رہا ہے۔ نظیری اس چیز کا اولوالعزم شہنشاہ ہے۔ ذیل کے اشعار پڑھئے اور پڑھنے کے بعد اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھئے کہ آپ کے دل کی قدرتی دھڑکن میں کتنا اضافہ ہو گیا ہے۔

ز گرہ براہم زنی سودائے دل نازے زیاں داری

مرا سرمایۂ دنیا و دیں نابود مے گردد

اس شعر میں جس درد و اضطراب کے ساتھ محبوب سے رحم کی اپیل کی گئی ہے، وہ جذبات کی ایک بلا خیز تصویر ہے، جس میں شاعر اپنے محبوب کا دامن پکڑ کر کہتا ہے میرے دل کی کائنات کو الٹ دینے میں آپ کے ترکشِ ناز کے تو صرف ایک تیرِ ادا کا نقصان ہوتا ہے، لیکن خدا کے لئے کبھی اس پر بھی تو غور کیا ہوتا کہ میرا تو دین و دنیا کا سارا سرمایہ اس ادا کے صدقہ ہو جاتا ہے،

محبوب اس کو بھی بمشکل گوارا کرتا ہے کہ وہ عاشق کو اپنے ہاتھ سے قتل کر کے اس کے مصائب کو خوشگوار طور پر ہمیشہ کے لئے ختم کر دے۔ اسی خیال کو پیشِ نظر رکھ کر نظیری ذیل کے شعر میں کس درجہ مؤثر انداز بیان کے ساتھ کہتا ہے۔

درخونِ دیدہ کشتہ تنم بسمل تو نیست زیں مرحمت ملال کہ کارِ دلِ تو نیست

یعنی دلورِ غم میں میری آنکھوں سے آنسوؤں کی بجائے خون نکلنے لگا ہے لیکن محبوب میرے خون آلود جسم کو دیکھ کر لوگوں کے سامنے فخریہ طور پر یہ کہتا ہے کہ میرا یہ خون اس کی تیغ نیم کش کا رہین منت ہے۔ حالانکہ میں آج تک اس لذت سے محروم رہا ہوں۔ . . . .

. . . .

. . . .

. . . .

ایک جگہ عاشق کے قلب کی مختلف حالتوں کو ان دو شعروں میں پیش کیا ہے۔ ان کو پڑھ کر غور کیجئے کہ نظیری کس طرح معمولی معمولی باتوں میں بھی ندرت پیدا کر دیتا ہے

از آبگینہ حوصلۂ ما تنک تر ست صبر از دلے طلب کہ در منزلِ تو نیست

زیں پیش شیشۂ دلِ ما ہم زسنگ بود بے نسبت آشنا دلِ ما با دلِ تو نیست

اگر نالم ز حرماں رخ مگرداں حسبتہ ملتہ، قیاسِ وصل و محرومی گلستان ست و نابینا

یعنی محبوب سامنے بیٹھا ہے، عاشق یاس و حرماں سے رو رہا ہے محبوب اس پر غصہ سے منہ پھیر لیتا ہے، عاشق گھٹنے ٹیک کر کہتا ہے، پیارے دوست اگر میں تیرے سامنے یاس اور ناکامی سے رو رہا ہوں تو خفا مت ہو۔ اس لئے کہ ایک اندھا باغ کے بیچ میں بیٹھ کر بھی پھولوں کی لطافت سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ وفورِ حسرت و یاس کا اظہار اس سے زیادہ اور کس طرح ممکن ہے۔

بوئے یارِ من ازیں سست وفا می آید گلم از دست بگیر ید کہ از کار شدم

ایک پھول کو ہاتھ میں لے کر نظیری نے جس انداز سے یہاں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ہمارے جذبات میں ایک تلاطم پیدا کر دیتا ہے۔ محبوب ہمیشہ بیوفا ہوتا ہے اس اعتبار سے پھول کو "سست وفا" کہہ کر مخاطب کرنا کتنا لطیف ہو گیا ہے۔ شاعر کس تڑپ سے چلاتا ہے کہ اس سست وفا پھول سے مجھے میرے دوست کی بو آ رہی ہے۔ خدارا یہ پھول میرے ہاتھ سے لو ورنہ میں ہوش و حواس کھو بیٹھونگا۔ سودا کے یہاں ہمیں ایک شعر اسی مضمون کا ملتا ہے۔ جس میں اس نے "از کار شدم" کے مفہوم کو انتہائی خوبی سے ادا کیا ہے۔

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

جذبۂ رشک کو شعرا نے مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ مرزا غالب تو ایک جگہ اسی رشک کے ہاتھوں خدا سے بھی بدگمان ہو کر کہتے ہیں

قیامت ہے کہ ہوئے مدعی کا ہمسفر غالب وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

لیکن اسی قبیل میں نظیری کا یہ شعر پڑھئے۔

خود از محبتِ جاناں بخود حسد دارم ، ز رشکِ غیر کنوں بر گذشتہ کار مرا

مرزا غالب کو خدا پر بد اعتمادی ہے، لیکن نظیری یہاں خود اپنی ذات سے بدظن ہے، اب اس بات کا تصفیہ آپ خود کر لیجئے کہ دونوں میں سے کس کا تخیل بلند ہے؟

محبوب غیروں پر ہمیشہ مہربان ہوتا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں غریب عاشق ہمیشہ مرکزِ تغافل بنا رہتا ہے، اس خیال کو نظیری اس طرح ادا کرتا ہے

بغل از نامۂ احباب پُر کرد و نے خواند کہ می ترسد شود مکتوبِ من ہم درمیاں پیدا

ایک جگہ اپنے محبوب کی کمسنی اور ناسمجھی کو اس طرح ادا کرتا ہے۔

شرم می آید ز قاصد طفلِ محبوب مرا بر سرِ راہش بیندازید مکتوبِ مرا

معشوق سے رحم و کرم کی امید تو کبھی ہوتی ہی نہیں البتہ جور و ستم کی چاشنی کبھی کبھی ضرور میسر ہو جاتی ہے۔ اس خیال کو غالب نے ایک جگہ بہت اچھی طرح ادا کیا ہے۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

لیکن اب نظیری کا شعر سنئے۔

نتواں چشید تندیِ کرمہ ازاں لباں بتواں شنود تلخ مکرر شنودہ را

اسی خیال کے ماتحت ایک اور جگہ اپنی ناکامیوں کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے۔

پیش ازیں در جان سپاریہا ازاں لب قسمتم

حرفِ تلخے بود اکنوں گاہ ہست و گاہ نیست

یعنی اس سے قبل تو میری جاں نثاری کے معاوضے میں معشوق گالیاں دے دیا کرتا تھا لیکن افسوس کہ اب یہ نعمت بھی کبھی کبھی میسر آتی ہے۔

عاشق کو عشق کرنے میں اپنی نظرِ انتخاب پر ناز ہوا کرتا ہے۔ نظیری اس کو یوں ادا کرتا ہے،

عشق بازیم بمعشوق مزاجے لذت ، زاں نیازے کہ بادہست مرا نازے ہست

ایک جگہ اپنی ناکامیوں پر کس لطیف انداز سے ناز کرتا ہے۔

باشد بہ ناامیدیٔ خویشم محبتے کو آشنائے گوشۂ چشمِ ترحم است

اس شعر کی تمام کائنات اس لطیف تصور پر ہے "کہ ناامیدی اسی وقت ہوتی ہے جب اس سے پہلے امید کے حصول کی توقع ہو۔ اور اس لئے گویا "ناامیدی" کم از کم محبوب کی چشمِ التفات سے آشنا ضرور رہی۔ اگرچہ وہ اس سے فیض یاب نہ ہو سکی۔

ایک دن معشوق کو مہربان دیکھ کر عاشق نے بے اختیار ہو کر اس کی گردن میں باہیں ڈال دیں۔ اب محبوب لطف و کرم سے پوچھتا ہے جو کچھ مانگنا ہو مانگ لے۔ لیکن عاشق اس کیفیت سے اتنا مست ہے کہ اس کو ہاتھ سے دینا نہیں چاہتا۔ چنانچہ کہتا ہے۔

دست در گردنِ معشوق حمائل کردم نتواں کف پئے عرضِ تمنا برداشت

معشوق کے ظلم و ستم کے ہاتھوں عاشق بسترِ مرگ پر پڑا کراہ رہا ہے لیکن اب بھی اس کے خیالات کا واحد مرکز محبوب کے سوا کچھ نہیں۔ اسی حالت میں وہ درد سے تڑپ کر کہتا ہے۔

نظیری از تو بجاں کندن است لب بکشا بایں قدر کہ بگوئی بمیر خرسند ست

یعنی آپ کے ظلم و ستم کے ہاتھوں نظیری کا آخری وقت آپہنچا۔ خدا کے لئے اب تو کچھ منہ سے بولئے، اگر اور کچھ کہنا نہیں چاہتے، تو صرف یہی کہدیجئے کہ 'مرجا' میں اسی سے خوش ہو جاؤنگا۔ کرب و الم کی دردناکیاں اس سے بڑھ کر اور کس طرح ظاہر کی جا سکتی ہیں۔

ایک جگہ فطرت کی صناعیوں اور مستور جلوہ پاشیوں سے متحیر ہو کر کہتا ہے۔

می گریم و از گریہ چو طفلم خبرے نیست

محبوب عاشق کو قتل کرنے کے لئے کھڑا ہے اس موقع پر عاشق سمجھتا ہے کہ چونکہ اس وقت عاشق کی استدعا پر معشوق قتل کرنے کے لئے آمادہ ہوگیا ہے اس لئے شاید یہی وقت قبولیت کا ہوگا۔ اس لئے ہاتھ پھیلا کر خدا سے وصل کی دعا مانگتا ہے۔

دعا کنید بوقتِ شہادتم او را کہ آں دمیست کہ در ہائے آسماں باز ست

مومن نے اسی خیال کو ایک جگہ نہایت دلکش انداز سے باندھا ہے۔

بوقتِ ذبح یہ دیکھو دنورِ ناکامی دعائے وصل نہ کی تھی اثر کا سا

دوسرے مصرعہ میں "سا" کے لفظ نے شعر کو آسمان پر پہنچا دیا ہے۔

عاشق کے نالوں میں کوئی اثر نہیں ہوتا، اور محبوب کبھی اس کو یاد نہیں کرتا یہ ایک نہایت فرسودہ اور پیش پا افتادہ خیال ہے۔ لیکن نظیری نے طرزِ ادا کی قدرت سے اس خیال کو کتنا عجیب بنا دیا ہے

آنچہ رحم از دل برد تاثیر فریادِ من ست وانچہ نسیاں آورد خاصیتِ یادِ من ست

پایم بہ پیش از سرایں کو نمی رود یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست!

عاشق محبوب کی گلی میں نادانستہ طور پر پہنچ گیا ہے اب اس کا قدم آگے نہیں اٹھتا۔ بالآخر مبہوت ہو کر چلاتا ہے۔ "میرا قدم اس گلی سے باہر نہیں اٹھتا دوستو! خدا کے لئے بتاؤ کہ یہ مقام کس دل رُبا کی جلوہ گاہ ہے"؟

نظیری نے ایک اور جگہ قریب قریب اس خیال کو ایک اور انداز سے اس طرح ظاہر کیا ہے۔

نظیری بیخود از بزمِ وصالِ یار می آیم   عجب کیفیتے دارم ندانم تا کجا رفتم

انتہائی مسرت میں انسان کے قلب و دماغ کی جو کچھ حالت ہو جاتی ہے اس کا صحیح نقشہ اگر الفاظ میں کھینچا جا سکتا ہے تو اس سے زیادہ بہتر نہیں ہو سکتا۔

غالب اسی مضمون کو یوں ادا کرتا ہے۔

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر   جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

شرم ما باد کہ مشہورِ جہانیم بعشق   نشدیم آتش و برقے بدیارے نزدیم

اس شعر میں جذباتِ انسانی کا کتنا صحیح نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ کہتا ہے کہ ہم نے سارے جہان میں تو اپنے عشق کی ڈھنڈ پیٹ رکھی ہے۔ لیکن ہماری بے غیرتی کا یہ عالم ہے کہ ہم ان مصائب و آلام کے جھیلنے کے بعد بھی اب تک ویسے ہی ہیں جیسے پہلے تھے۔ بات تو جب تھی کہ ہم آگ یا بجلی بن کر کسی ملک کو پھونک ڈالتے۔

ایک جگہ اپنے غمِ عشق کی المناکیوں کا منظر یوں پیش کرتا ہے۔

میگساراں ہمہ خفتند و نظیری در شور   داروئے بہشتی نیست کہ در کار کنم؟

محبوب ایک مرتبہ لطف و اکرام کے ساتھ عاشق سے ذرا نرمی سے بات کر لیتا ہے اور کچھ دو چار جھوٹی سچی باتیں کہہ کر اس کا دل رکھ لیتا ہے۔ ایسے موقع پر عاشق کے جذبات کو کس قدر صحت کے ساتھ اس شعر میں ادا کیا ہے۔

از یک حدیثِ لطف کہ آں ہم دروغ بود
امشب ز دفترِ گلہ صد باب شستہ ایم

ایک جگہ محبوب کی بے مہریوں اور رقیب نوازیوں سے جل کر کہتا ہے۔

ز رقیب اگر تنزل نکنم چہ چارہ دارم   کہ اگر کجوں بگردم نرسد حمایت از تو

ایک جگہ کس درجہ دردناک طریقے سے کہتا ہے۔

تا بکے از کثرتِ غم روئے بر زانو نہم   تنگ گردد خانہ بر من سر بشہرِ کو نہم

یعنی میں کب تک اپنے زانو پر سر رکھ کر ایک کونے میں بیٹھا ہوا اپنی قسمت کا رونا روتا رہوں۔ اب تو دنیا میری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی، اور اس لئے شہر کے گلی کوچوں میں مارے مارے پھرنے کے سوا میرے لئے کیا چارۂ کار ہے!

کسی شاعر کا رنگِ تغزل جانچنے کے لئے ایک معیارِ مقابلہ بھی ہوتا ہے۔ یعنی دوسرے بلند پایہ شعرا سے اس کے ہم مضمون اشعار کا مقابلہ کر کے اس کے تخیل کی بلند پروازی اور جدتِ ادا کے متعلق رائے قائم کی جاتی ہے چنانچہ اسی سلسلہ میں ہم نظیری کے بعض اشعار کے مقابلہ میں حافظِ شیراز اور غالب کے ہم مضمون اشعار نقل کرتے ہیں۔ نظیری

گردِ سرِ تو گشتن و مُردن گناہِ من   دیدن ہلاک و رحم نکردن گناہِ کیست

دوسرے مصرعہ کی وجد آفریں بندش کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے غالب کا یہ شعر سنئے۔

بخود بوقتِ ذبح طپیدن گناہِ من   دانستہ دشنہ تیز نکردن گناہِ کیست

جگر مراد آبادی کا بھی ایک شعر اس مضمون کا ہے۔

دیوانہ وار جاں بفشاندن گناہِ من   بیگانہ وار رخ نہ نمودن گناہِ کیست

حافظ کا ایک شعر ہے۔

حدیث از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو   کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

نظیری بھی ذیل کے شعر میں اس مضمون کو ادا کرتا ہے۔ لیکن کتنی بلند پروازی کے ساتھ۔

جہاں را نیست آں معنی کہ باید فکرِ آں کردن   الف با خوانِ ہر مکتب شگافد ایں معما را

(۱) وصالِ محبوب کا حصول ناممکن ہے لیکن پھر بھی عاشق اسی توقع پر جیتا ہے۔ نظیری

با وجودِ ناامیدی بسکہ مشتاقِ توام   مدعی گر مژدۂ وصلت دہد باور کنم

غالب:۔ تیرے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا   کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

(۲) محبوب کے دل میں عاشق کی آہ و زاری کا اثر نہیں ہوتا۔

نظیری۔ بگریہ در دلِ تو گر اثر تواں کردن   ترا ز ذوقِ محبت خبر تواں کردن

عرفی۔ عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال   صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

(۳) محبوب کے حسن کا یہ عالم ہے کہ تمام جہان اس کا حلقہ بگوش بنا ہوا ہے۔

نظیری۔ ہر کرا جان و دلے ہست کند در کارش   نہ دو بینی دو جہاں بر سرِ ایں کار شود

خسرو۔ کسے نماند کہ دیگر بہ تیغِ ناز کشی   مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

(۴) دنیا میں سربلندی و افتخار حاصل کرنے کے مواقع اب بھی اسی طرح باقی ہیں جس طرح آج سے دو ہزار برس پہلے تھے۔

نظیری   جنسِ کنعاں مصریاں گفتند در بازار نیست
پیشتر راندیم رخش از کارواں سودا زدیم

حافظ۔ فیضِ روح القدس ار باز مدد فرماید   دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

(۵) چونکہ ظلم کرنے میں محبوب کو لطف آتا ہے اس لئے عاشق اس کے پاس شکایت لے جانا بھی اچھا نہیں سمجھتا۔

نظیری - دریں مدت غمِ ہجراں عبث برخود پسندیدم ، ندانستم کہ از مرگم دلت خوشنود میگردد

حافظ - دلا منال ز بیداد و جورِ یار کہ یار   ترا نصیب ہمیں کردہ است و ایں عدلست

مومن - ہم نہیں جلتے کبھی اپنی شبِ دراز میں لو تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خوابِ ناز میں

جہاں ملک خاتون - گرچہ بیدادِ جفائے تو بغایت باشد

حاشا للہ کہ مرا از تو شکایت باشد

(۶) کسی کے دل پر جو کچھ گزرتی ہے - دوسرا اس کو نہیں جانتا۔

"جس کی نہ پھٹی ہو کبھی بوائی - وہ کیا جانے پیر پرائی"

نظیری - بزیرِ شاخِ گل افعی گزیدہ بلبل را ، نواگرانِ نخوردہ گزند را چہ خبر

حافظ - شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل

کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا

غالب - ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز   گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفت ست

(۷) عاشق نے محبوب کے سامنے نیاز مندیوں کی حد کر دی

لیکن اس کا دل نہ پسیجا۔

نظیری - کمر در خدمتِ عمریست می بندم چہ شد قدرم

برہمن می شدم گر ایں قدر زنار می بستم

غالب - کیا وہ نمرود کی خدائی تھی ، بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

(۸) محبوب کے حسن کی فریب کاریاں اور زاہد فریبیاں ۔

نظیری - اگر فریبِ ملائک بہ عجب نشود کہ با صد ہوس پسند جانے یا صنش

اکبر الہ آبادی - آنکھیں وہ فتنہ دوراں کہ گنہگار کریں

گال وہ صبحِ درخشاں کہ ملک پیار کریں

(۹) دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری - نظیری

تقاضا بر تقاضا میرسد زانسوئے دل ہر دم ، ز طلبے نیستم خالی نخل زیں شوق کار افزا

حافظ - مرا در منزلِ جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم

جرس فریاد میدارد کہ بربندید محمل ہا

۱۰ - انسان کے معاصی حد حساب سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔

نظیری - طاعتِ ما نیست غیر از ورزشِ پندارہا ، ہست استغفار ما محتاجِ استغفار ما

عرفی - سالب آلودہ بہر توبہ بکشائیم لیک   بانگِ عصیاں میزند ناقوسِ استغفارِ ما

(۱۱) زندگی میں سکون و اطمینان ناممکن ہے ۔ نظیری ۔

بہجر و وصل و ملال و نشاط گریہ کنم   دراں دمے کہ طلب ہست آرمیدن نیست

غالب - قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

(۱۲) محبوب کی جدائی بھی لطف سے خالی نہیں ۔

نظیری - باشد بنا امیدیِ خویشم محبتے ، کو آشنائے گوشۂ چشمِ ترحم است

حافظ - از دستِ غیبتِ تو شکایت نمی کنم ، تا نیست غیبتی نبود لذتِ حضور

امیر مینائی - غصہ سے دیکھتے ہیں مگر دیکھتے تو ہیں

خوش ہوں کہ ہوں تو میں بھی کسی کی نگاہ میں

(۱۳) محبوب کے حسن کو دیکھ کر عاشق مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے ۔

نظیری - پا ہم بہ پیش از سرایں کوئی نمی رود   یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہِ کیست

حافظ - یارب ایں شمعِ دل افروز ز کاشانۂ کیست

جانِ ما سوخت بپرسید کہ جانانہ کیست

(۱۴) عاشق کے دل و دماغ میں صرف محبوب ہی محبوب بسا ہوا ہے

نظیری - بدل تنگی کنم دل خوش ہمیشہ   کہ تنہا جائے غمہائے تو باشد

سعدی - دو عالم را بیکبار از دلِ تنگ   بروں کردیم تا جائے تو باشد

الغرض نظیری کے کلام سے اس قسم کے جواہر ریزے منتخب کئے جائیں تو ایک مستقل رسالہ مرتب ہو سکتا ہے۔ نہایت اجمال کے ساتھ اس کے بعض خاص اشعار نقل کر دیئے گئے ہیں۔ نظیری کے متعلق اس وقت تک جو کچھ گذارش کیا ہے اس کی تائید فنِ سخن کے دیگر اساتذہ سے بھی ہوتی ہے چنانچہ علامہ شبلی فرماتے ہیں کہ غزل گوئی میں نظیری کا مرتبہ رفیع ہے نیز استادِ محترم حضرتِ علامہ شاداں بلگرامی نے اورنٹیل کالج میگزین کی نومبر ۳۲ء کی اشاعت میں جو بصیرت افروز مقالہ تحریر فرمایا ہے اس میں بھی موصوف نے نظیری کا مرتبہ بہت سے غزل گو اساتذہ پر فائق ظاہر کیا ہے ۔

جلیل احمد فخری بھوپالی

جامِ صہبائی

(۱)

غم سے سرِ آرزو مٹے جاتا ہوں
زینے سے مگر آرزو کے گرتا جاتا ہوں
پھر بھی ہے اسی بس امیرِ امید
دیکھا ہے ہزار بار انجامِ امید
امید پہ پھر بھی جان دئے جاتا ہوں

(۲)

راز عدم و وجود پایا نہ گیا
یہ پردۂ مرگ و زیست اٹھایا نہ گیا
انکار بھی ہو سکا نہ مجھ سے ہمدم
ایماں بھی مگر موت پہ لایا نہ گیا

(۳)

ہیں آنکھیں نگراں ہیں اور نگاہیں بے نور
ہے دل نگراں اگرچہ بے ذوق و سرور
پیتا ہوں اگر زندگی کی ہی نہیں
زندہ تو ہوں سوزِ زندگانی سے دور
میں طور تو ہوں مگر ہوں بے شعلۂ طور

(۴)

خورشید ہے تیرہ فرقِ گرداں میں وثن
دل جیسے ہے جسمِ ناتواں میں وثن
دل ایک ہے جسم و نور و جلوے
ہیں ایک ہی نور کے یہ دو نور و جلوے
سورج جیسے ہی ہے جسم جہاں میں وثن

اثر صہبائی

رباعیات

۱

صہبا فصلِ شباب میں لُٹے ساقی
لا ساغرِ آفتاب میں دے ساقی
پیمانے سے تابناک ہے خورشید
خورشید کو تابناک میں لُٹے ساقی

۲

ساقی مئے بیخودی کا دے پیمانے میں
[illegible] ہوش کھو جانے میں
ہے لذتِ [illegible] ہستیٔ دل ہو
کس تک نہیں ہم حکایت افسانے میں

۳

جب اس پہ درد و اندوہ سے اپنا ہے
پینے سے کہیں نصیب سے مزہ جینا ہے
ایسا نہ ہو زیست رائیگاں ہو جائے
پیمانہ کہاں ہے کس طرف مینا ہے

۴

اک جرعہ ہے ساغرِ [illegible] دے ساقی
اک جام ہے زمین و آسماں کر دے ساقی
تا آتشِ عشق کی نہیں ہے بجھو
تا بادہ کشی ہے آتشِ تر دے ساقی

احمد اعجاز

چوکیدار

غضب کی سردی تھی اور ہوا نے طوفان مچا رکھا تھا۔ کئی دنوں سے ایسا اندھیرا چھا رہا تھا کہ لوگ بھول گئے تھے کہ انہوں نے دن کی روشنی دھوپ اور صاف شفاف آسمان آخری بار کب دیکھا تھا۔

ہوا بے طرح چل رہی تھی؛ اس کی ہائے وہو میں ایسی دہشت وہیبت ملی ہوئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا وہ موت کے شہر سے آ رہی ہے، وہ برف کے ساتھ کھیل رہی تھی اور اپنے ہلاکت آفریں سانس کے ساتھ ہر چیز کو چاٹ رہی تھی۔

سرد ہوا نے انسانوں ہی پر لرزہ طاری نہ کر رکھا تھا بلکہ گاؤں کے تمام جھونپڑے گھاس کے تودے اور لکڑی کے ڈھیر بھی کانپ رہے تھے اور تاریک سایوں میں دبکے جا رہے تھے کون کہہ سکتا ہے کہ وہ سردی سے ٹھٹھر رہے تھے یا خوف سے لرز رہے تھے؟ گاؤں کا گاؤں خوف کے پنجے میں اسیر تھا۔

یہ بادل، یہ بجلی، یہ آندھی اور یہ طوفان گاؤں والوں کے نزدیک عناصر کا کوئی بے معنی اور بے ہودہ کھیل نہ تھا۔ بلکہ ایک آسمانی تازیانہ تھا جو کسی خاص مقصد کو لے کر نازل ہوا تھا اور انہیں اس کا یقین تھا۔ پھر کیوں وہ اس سے نہ کانپتے؟ خدا کا خیال بجلی کے خوف کو دور کر سکتا ہے لیکن جب باہر برفانی ہوا چل رہی ہو تو قہوہ خانے کی گرم فضا ہی میں گھستے بنتی ہے۔

بار بار ہواؤں سے "ہُو، ہُو، ہُو" کی آوازیں نکلتیں، اور اس مہیب آواز کے ہر اعادے پر ملک شاہاں کے قہوہ خانے میں دیواروں کے ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے لوگ اپنی گفتگو بند کر دیتے اور حقے چھوڑ کر ایک دوسرے کے چہروں کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگتے پھر ایک دوسرے سے اور قریب ہو جاتے۔

کوئی پکار اٹھتا "یا الٰہی! برف تو ہوئی اور سردی بھی اپنی جگہ پر درست ہے لیکن یہ تند ہوا ہمیں کیا پیغام دینا چاہتی ہے!" مگر عناصر کے اس المناک گیت کے معنی بیان کرنے کی کسی کو جرات نہ ہوئی گو ہر شخص جانتا تھا کہ یہ ایک ماتمی راگ ہے جسے ہوا نے دنیا کے غموم وہموم، کمزوروں کی آہ و بکا، مصیبت زدوں کی ہائے وہو، غریبوں کے آنسوؤں اور حاجت مندوں کی التجاؤں سے ترتیب دیا ہے۔

درد سے بھرا ہوا ایک سانس بھی فضا میں ضائع نہیں ہوتا ایک دبی ہوئی بے آواز آہ سے لے کر دل کو چیر کے گزر جانے والی چیخ تک فریاد کی ہر لے کو ہوا اکٹھا کر کے اپنے سینے میں رکھ لیتی ہے کہ اس سے دنیا کے رنج و محن کی ایک لازوال شہادت تیار کرے۔ وہ ان آہوں اور زاریوں کو پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر لے جاتی ہے، اور تاریک غاروں کی عمیق گہرائیوں میں ٹھونس دیتی ہے تاکہ کسی وقت یک لخت کھول کر انہیں پھر زمین پہ نازل کرے اور لوگ خوف ومصیبت کی چیخوں کو اور ٹلنے والی تقدیر کی سرگوشیوں اور دھمکیوں کو سنیں۔

یہ تھا ان دیہاتیوں کا خیال جو اس وقت قہوہ خانے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اس ماتمی راگ کو سن رہے تھے جس کے الفاظ مرے ہوؤں کی آہیں، شیطانوں کی چیخیں اور گیدڑوں کے نعرے تھے۔ کیا طوفان اور جھکڑ میں یہ سب آوازیں اپنے اپنے مسکنوں سے نکل نہیں آتیں، اور اپنے غیر زمینی شور وغل سے فطرت کو اور زیادہ ہیبت ناک نہیں بنا دیتیں ان کو سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، زبان خشک ہو جاتی ہے، گلا گھٹنے لگتا ہے۔

"ہُو، ہُو، ہُو!" طوفان اور تندی سے چلنے لگا۔ قہوہ خانے کی چھت کڑکڑانے لگی۔ جیسے اس پر کوئی بھاری قدموں سے چل رہا ہو۔

ایک شخص نے یونہی بات کرنے کے لئے کہا۔ "باہر تو جہنم ہے میرا دشمن کہیں پہاڑوں پر ٹھٹھر نہ رہا ہو۔"

دوسرے نے کہا: "پہاڑوں کو چھوڑو، ذرا جرأت ہے تو تاکستان تک جا کر دکھاؤ۔"

کسی نے کہا: "آسمان اور زمین کشتی لڑ رہے ہیں۔"

پھر خاموشی چھا گئی۔ یہ غور و فکر کا موقع تھا۔

باہر کا دروازہ کھلا۔ تمام نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں۔ دھندلی سی روشنی میں ایک آدمی کی شکل دکھائی دی۔ جس کا لمبا کوٹ برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ گھنٹوں باہر طوفان میں رہا تھا۔

نووارد نے برف کو جھاڑتے ہوئے سلام کیا۔

ایک شخص نے سلام کا جواب دے کر کہا۔ "بھئی! آؤ، آؤ، اندر آجاؤ اوہو تم تو سردی کی وجہ سے جم گئے ہوگے۔" اور دوسرے نے نہایت ہمدردی سے کہا "اسے بیٹھنے کے لئے جگہ دو۔"

نووارد نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "ہاں، واللہ، میں تو جم گیا! مجھ سے تو اب باہر ٹھیرا نہیں گیا۔ آسمان ٹوٹ ٹوٹ پڑتا ہے۔ انسان اس کے نیچے دبا چلا جا رہا ہے۔ کتنا طوفان ہے! کیسا جھکڑ ہے! مجھے گرم ہونے کے لئے قہوہ خانے میں آنا ہی پڑا۔ میں ابھی پھر باہر چلا جاؤں گا۔"

انگیٹھی کے اوپر ایک چھوٹے سے مٹی کے دیئے میں جو زیتون کے تیل سے بھرا ہوا تھا ایک باریک سی بتی جل رہی تھی اور اس کا بے نور سا شعلہ ہوا میں لہرا رہا تھا اور ٹمٹما رہا تھا۔ یہ بھی طوفان کے خوف سے دبکا جاتا تھا۔ لیکن پھر بھی اس سے ایک دھیمی دھیمی روشنی نکل کر ان چہروں کو نمایاں کر رہی تھی جو بوجھل استراخاں ٹوپیوں کے نیچے سے جھانک رہے تھے اور چند باریک اور زرد کرنیں نووارد کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ یہ چہرہ ایک کسان کا چہرہ تھا جس پر محنت اور مشقت نے اپنے گہرے نقوش ثبت کر رکھے تھے۔ عمر کے لحاظ سے وہ جوان تھا لیکن تجربے کے لحاظ سے وہ بوڑھا نظر آتا تھا۔ اس کی گھنی مونچھوں کے نیچے اس کے مضبوطی سے ملے ہوئے ہونٹ ظاہر کرتے تھے کہ وہ ایک زبردست ارادے کا مالک ہے۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی لیکن بیزار اور شرر ریز تھیں۔ وہ گاؤں میں پہرہ دیا کرتا تھا۔

اس کا نام کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ سب اسے ہی کہتے تھے جو ارمنی کے لئے ایک دوسرا لفظ ہے۔ گو گنے والے بھی ارمنی تھے لیکن وہ چونکہ ایک دوسرے گاؤں سے آیا تھا اس لئے اسے ہی کہہ لینا آسان تھا یہی ہی تھا جو اب ایک کونے میں دیوار کے ساتھ ٹک کر بیٹھا ہوا تھا۔ گاؤں میں اس کے بہت سے ساتھی آئے تھے۔ لیکن اب وہ تمام اس سے جدا ہو چکے تھے اور وہ ایک بچھڑی ہوئی کونج کی طرح باقی رہ گیا تھا۔ اسے بھیک مانگنے سے نفرت تھی۔ اسی لئے وہ گاؤں کا چوکیدار بن گیا تھا

قہوہ خانے میں کیسا امن تھا! باہر طوفان تھمنے میں نہ آتا تھا۔ ہوا ایک زخمی درندے کی طرح شور مچا رہی تھی۔

رئیس کیوان نے کہا۔ "بس ایسی ہی رات تھی جب وہ بیچارا موت کے منہ میں جا پڑا۔" اس کا اشارہ اسی گاؤں کے ایک شخص کی طرف تھا جو تھوڑے ہی دن ہوئے طوفان کے جنگل میں پھنس کر اپنی جان کھو بیٹھا تھا۔

ایک اور شخص بولا "کتنی دفعہ ہم نے اس سے کہا باہر نہ جاؤ، اس برف و باد میں آوارہ نہ پھرو، اپنے بیوی بچوں کا خیال کرو۔"

ملک نے کہا۔ "کیسی جاہلوں کی سی باتیں کرتے ہو! یہ تو اس کی پیشانی پر لکھا تھا کہ وہ باہر نکلے اور مر جائے۔ تقدیر سے اسے کون بچا سکتا تھا!"

ایک نے کہا "ملک تم نے سچ کہا۔" دوسرا بولا۔ "تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے!"

تقدیر، قادر مطلق تقدیر! ایسی مہیب رات میں اور اس [illegible] دوز قہوہ خانے کے اندر جب کہ باہر طوفان کے تھپیڑے دل میں غم انگیز کہانیوں کی یاد تازہ کر رہے ہوں گفتگو کے لئے اس اندھی طاقت کے سوا کون سا موضوع زیادہ موزوں ہو سکتا ہے!

ہر شخص نے تقدیر کے متعلق کچھ نہ کچھ کہا اور سب اس بات پر متفق ہو گئے کہ تمام انسانی اسباب اور کوششیں تقدیر کے سامنے عاجز ہیں۔

کمرے کے ایک کونے سے آواز آئی۔ "میں تقدیر کا ذرا بھی قائل نہیں ہوں۔"

تمام نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں۔

ملک نے ہجو یہ انداز میں کہا۔ "یہ اژدہا کہاں سے بولا!"

اسی آواز نے ذرا اور مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "یہ میں ہوں، ملک، تمہارا خادم۔ میں تقدیر کا قائل نہیں ہوں۔"

لوگ نہ جانتے تھے کہ اس پر ہنسیں یا ناراض ہوں۔ یہ جو تقدیر کی زبردست طاقت کا قائل نہ تھا رات کو گاؤں میں پہرہ دینے والا مفلوک الحال چوکیدار تھا۔

چوکیدار کے اس زعم نے سب کے دلوں کو سخت تکلیف پہنچائی

امیر اور طاقتور ملک تقدیر کا قائل تھا اور اس سے ڈرتا تھا۔ رئیس گیوان جس کے ڈنڈے کے سامنے سب لوگ بید کی طرح کانپتے تھے، وہ بھی تقدیر سے سخت خائف تھا۔ امام اپنے ہر وعظ میں تقدیر کی طاقت کا ذکر کیا کرتا تھا۔ غرض سب پر تقدیر نے اپنی ہیبت بٹھا رکھی تھی۔ لیکن یہ بے برگ و نوا انسان نہ اس کا قائل تھا اور نہ اس سے ڈرتا تھا۔

اس نے دیکھا کہ وہ سب اس کی طرف حقارت آمیز نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس نے پھر ایک دفعہ ذرا اور قوی آواز سے کہا۔ "میں تقدیر کا قائل نہیں ہوں۔ اور میں ثابت کر سکتا ہوں کہ میں درست کہہ رہا ہوں۔ لیکن اس وقت مجھے اب گاؤں کے گرد ایک چکر لگانا ہے"۔ وہ اٹھ کر جانے لگا۔

کئی پرشوق آوازیں یک دم بلند ہوئیں "ٹھیرو، ٹھیرو، ٹھیرو جی ٹھیرو"۔ رئیس اس سے بولا کہ بیٹھ جائیے، گاؤں کو آج رات کوئی خطرہ نہیں"۔

رئیس کے کہنے پر وہ پھر بیٹھ گیا۔ سب لوگ منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے کہ یہ شخص جو تقدیر کا اس سختی سے انکار کرتا ہے اپنی کہانی کب شروع کریگا۔

اس نے اپنی سرگذشت شروع کی "اس سال ہماری ٹولی میں دس آدمی تھے —— دس دلیر اور جری آدمی۔ ہم کئی کئی مہینے ایک ریگستان سے دوسرے ریگستان، ایک وادی سے دوسری وادی اور ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ میں پھرا کرتے تھے۔ جہاں سانپ پانی پیتے تھے وہیں ہم بھی پیتے تھے۔ جن پتھروں کے نیچے سانپ چھپے ہوتے تھے ان کے اوپر ہم سوتے تھے۔ اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا! ہم نے اپنے وقار کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ ہم نے اپنے صبر کی کوئی انتہا نہ رکھی تھی لیکن ہمارے دشمنوں کے ظلم کی بھی کوئی انتہا نہ تھی —— ان کے سنگ دلانہ ظلم کی۔ ہمارے پاس کھانے کو روٹی تک نہ تھی اور جو تھی تو کھانے کے قابل نہ تھی۔ وہ زہر کی طرح ترش ہو گئی تھی۔ اس لئے ہم نے اپنے گھر بار، بیوی بچوں کو چھوڑ دیا تھا، اور اپنی بندوقیں کندھوں پر رکھ کر ہم اپنی عزت کے دامن سے دھبے چھڑانے کے لئے نکل پڑے تھے۔

ہم نے اچھا کیا تھا۔ اب ہم آزاد تھے۔ آہ! جب کسی کو ہماری طرح مصیبتیں پیش آئیں، جب اس کی بہن، اس کی بیوی، اس کی ماں کی توہین کی جائے، جب اس کے بیٹے کو مار دیا جائے، اور اس کے باپ کو گالیاں دی جائیں تو اس کے پاس کچھ باقی نہیں رہتا —— بندوق کے سوا کچھ نہیں۔

"ترک اور کرد ہمیں فدائی (واجب القتل) کہتے تھے، لیکن ارمنی ہمیں منتقم شیاطین کے نام سے پکارتے تھے۔ ہمارا خوف ہمارے آگے آگے چلتا تھا اور اپنے پیچھے ہم موت کو چھوڑتے جاتے تھے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر عقابوں کے گھونسلوں کے پاس ہمارا مسکن ہوتا تھا۔ آہ، ہم نے کہاں کہاں کا سفر کیا! کتنے ترک اور کرد ہم نے مار ڈالے! اور ان کے ناپاک منصوبوں کو خاک میں ملا دیا! انہوں نے ہر جگہ ہمیں تلاش کیا مگر ہماری ہستیاں غیر مرئی ہستیاں تھیں۔ ہم ہر کہیں موجود تھے اور پھر کہیں بھی نہ تھے۔ کسی فدائی کا سراغ نکالنا آسان کام نہیں اور اس سے دوچار ہونا تو خطرۂ عظیم کے مرادف ہے یہ ہمارا حال تھا اور ہم اپنی تقدیر کا فیصلہ سننے کے منتظر تھے۔ تقدیر پر ہمارا پورا ایمان تھا۔

ہم کوہ سیم پہ رہا کرتے تھے جب ایک دن ہمارے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ رہا تو خوراک مہیا کرنے کے لئے قرعہ میرے نام پر نکلا۔ میں اس علاقے کے دیہات سے واقف تھا۔ دن دہاڑے بغیر کسی ہتھیار کے میں نے اپنی کمین گاہ سے نکل کر پہاڑ سے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ میں نے خیال کیا اول تو میں دشمن کی نظر بچا کر نکل جاؤں گا اور کسی کا سامنا ہو بھی گیا تو میرا خالی ہاتھ ہونا ہی میری نجات کے لئے کافی ہوگا۔ لیکن اگر میں مارا گیا تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ میری قسمت میں ایسا ہی لکھا تھا۔ چنانچہ میں گیا۔

کچھ عرصے تک مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ مجھے وادی تک پہنچنے کے لئے ایک پہاڑ کو عبور کرنا تھا جب میں اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا تو وہاں میں نے ایک کرد سپاہی کو دیکھا جو پورے طور پر مسلح تھا۔

میں نے بے پروائی سے کہا "سلام کرو آدا (آقا)"۔

کرد نے جواب میں کہا "سلام فلا (پرستار زادے)"، لیکن وہ گزر نہ گیا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔

مگر میں نہ ٹھیرا۔ میں اسی طرح چلتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ وہ وہیں کھڑا میری طرف دیکھ رہا ہے۔ میں نے اپنی رفتار ذرا بھی تیز نہ کی۔ تاکہ اس کے دل میں میری طرف سے کسی قسم کا شک پیدا نہ ہو۔

اتنے میں اس نے آواز دی "او فلا ٹھیر جاؤ"۔ میں ٹھیر گیا اور پیچھے دیکھنے لگا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا "میری تقدیر آ پہنچی"۔ مجھے

پہلے ہی امید تھی کہ مجھے میری تقدیر ایک ایسے ہی کُرد کی صورت میں آملے گی۔ اس کی بندوق اس کے کندھے پر تھی۔ اس کی تلوار اس کے پہلو میں لٹک رہی تھی اور اس کا ہاتھی دانت کے دستے والا خنجر اس کے کمربند میں آویزاں تھا۔ اس کے چہرے سے شیطنت برس رہی تھی اور اس کی آنکھیں ایک بھیڑیے کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ وہ میرے پاس آگیا۔

"کُرد نے کہا۔ آج کل ان علاقوں میں کسی غلط کو آنے کی جرات نہیں۔ تم مجھے شریف آدمی معلوم نہیں ہوتے۔ تم کون ہو اور کہاں جا رہے ہو؟"

میں نے کہا، اے کرد! ہم پر بڑا برا وقت آپڑا ہے۔ مگر ہم تمہارے ہمسائے ہیں۔ میں خوط سے آیا ہوں۔ ہمارے علاقے میں قحط پڑ گیا ہے جیسا کہ تمہیں معلوم ہے۔ میں طرستان میں اپنے بچوں کے لئے روٹی کی تلاش میں جارہا ہوں۔ مجھے اپنے راستے پر جانے دو۔"

"نہیں فلاح مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ تم مجھے شریف آدمی معلوم نہیں ہوتے۔"

"کُرد! خدا کو مانو۔ تم دیکھتے ہو میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں۔ میرے پاس چاقو تک نہیں۔ دو خالی ہاتھوں کے ساتھ میں کیا کر سکتا ہوں؟ مجھے گھر جانے دو۔"

"میرے آگے آگے چلو۔ میں تمہیں گورنر کے پاس لے جاؤں گا۔"

گورنر کے پاس! گورنر کے پاس جانا مجھے بھلا معلوم نہ ہوا۔

"کُرد، مجھے گورنر کے پاس نہ لے جاؤ۔ وہ مجھے کچھ کہے گا تو نہیں لیکن مجھے دیر ہو جائے گی۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچوں پر رحم کرو۔ وہ بھوک سے مرجائیں گے۔ کُرد، خدا کے لئے مجھے جانے دو۔"

مگر کُرد کو ذرا رحم نہ آیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ یہ میری تقدیر ہے، اور سر جھکا کر اس کے آگے آگے چل پڑا۔ میں کیا کر سکتا تھا، میں اس کے قبضے میں تھا۔ بندوق اس کے کندھے پر تھی۔ تلوار اس کے پہلو میں اور خنجر اس کے کمربند میں۔ ہم چلتے رہے۔

ہمارے آس پاس ہر چیز پر حسن چھایا ہوا تھا۔ آفتاب روشن تھا۔ آسمان صاف تھا۔ پہاڑیاں سرسبز تھیں۔ پھول مہک رہے تھے۔ پرندے چہچہا رہے تھے۔ ہر طرف زندگی اور مسرت کا دور دورہ تھا۔ دور آسمان پر ایک کلنگ آزاد اور بے کھٹکے اڑ رہا تھا۔ میں اس کے دیکھنے میں ایسا محو ہوا کہ کچھ دیر کے لئے اپنے متعلق کسی قسم کا خوف نہ رہا۔ کیا اس کی آزادی پر مجھے رشک آ رہا تھا یا کوئی اور بات تھی جس نے میری توجہ کو یوں اپنی طرف منعطف کر رکھا تھا!

مجھے معلوم نہیں کیوں میں اس میں کھو گیا تھا۔ جب کلنگ عین ہمارے سر کے اوپر پہنچ گیا تو یکایک اس نے نیچے کی طرف رخ کیا اور ایک قریب کے ٹیلے پر اتر گیا۔ میں نے قیافے سے معلوم کر لیا کہ وہاں سانپ ہے جسے کلنگ نے اوپر سے دیکھا ہے۔ اس کے پروں کی آواز سن کر سانپ نے اپنا منہ اپنے کچھوں میں چھپا لیا۔ اس کے بعد خوب لڑائی شروع ہوئی۔ ہم دونوں دیکھنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔

"کُرد نے کہا، دیکھتے ہو؟ سانپ ایک بلا ہے اور اسی لئے اس کا غارت کر دینا لازم ہے۔"

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ میں دیکھ رہا تھا۔ کلنگ ایک طرف ہٹ گیا۔ اس نے اپنی چونچ سانپ کے جسم میں گھونپ دی اور پھر ایک طرف ہٹ گیا۔ سانپ نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنے پیچوں کو کھولتا، اس کے عجیب دشمن نے اس پر حملہ کر دیا۔ سانپ پھر اکٹھا ہو گیا اور اس نے اپنا سر چھپا لیا۔ میرا خیال غلط تھا کہ اب اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی۔ میری کچھ ڈھارس بندھی۔ رفتہ رفتہ کلنگ زیادہ دلیر ہوتا گیا۔ وہ اب زیادہ سرعت اور زیادہ شدت سے حملے کرنے لگا۔ آخر جب اس نے سمجھا کہ سانپ کی سب طاقت زائل ہو چکی ہے تو وہ اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا تاکہ ایک آخری حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دے۔ سانپ نے اب تک اپنا سر باہر نہ نکالا تھا اور نہ مدافعت کی کوشش کی تھی۔ اب کلنگ اس کے بالکل قریب تھا۔ یکایک ایک حیرت انگیز بات ظہور پذیر ہوئی۔ قریب المرگ سانپ نے آخری بار اپنی قوت کو مجتمع کیا۔ سر اٹھایا، جسم کو کھول دیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ پھر ایک ہی دفعہ اس نے کلنگ کی لمبی گردن کو اپنے پیچوں میں جکڑ لیا۔ کلنگ نے بہت کوشش کی، مگر وہ اپنے آپ کو اس موت انگیز آغوش سے جدا نہ کر سکا۔ اس کے پر لٹک کر زمین پر آ گئے۔ اس کی چونچ مٹی سے آلودہ ہو گئی۔ وہ بہت پھڑپھڑایا۔ اس نے اڑنے کی کوشش کی، لیکن اس کی تمام کوششیں بے کار گئیں۔ سانپ کا بے اندیشانہ غصہ خطرناک تھا اس کے پیچ اور سخت ہوتے گئے، اور آخر کار کلنگ بے جان ہو کر

زمین پر آرہا۔ سانپ نے اپنی گرفت چھوڑ دی اور چلا گیا۔

کُرد نے کچھ نہ کہا۔ اس نے صرف میری طرف دیکھا اور ایک طویل لمحے کے لئے ہماری نگاہیں ایک دوسرے پر جمی رہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے خیالات معلوم کرنا چاہتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے لئے خطرناک خیالات گزر رہے تھے اور ہماری آنکھوں سے صاف ان خیالات کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ کلنگ پر سانپ کی غیر متوقع فتح نے کُرد کو ہوشیار کر دیا ہے اور وہ میرے قتل کا فیصلہ کر چکا ہے، لیکن میں بھی کچھ سوچ رہا تھا۔ سانپ اور کلنگ کی اس لڑائی نے مجھ میں بھی ایک تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ میں نے یہ کبھی نہ سنا تھا کہ سانپ نے کلنگ کو زیر کیا ہو۔ کلنگ سانپ کا جانی دشمن ہے۔ اس کی تقدیر کا مالک۔ مگر آج یہ کیسے ممکن ہو گیا کہ اس کی تقدیر اس پر غلبہ نہ پا سکی۔ کیا وہ خدا جس نے اس بے بس سانپ کو کلنگ کا ناحق شکار نہ ہونے دیا میری تقدیر کا فیصلہ اس کرد کے ہاتھوں دیکھنا گوارا کرے گا؟ نہیں، میں نے کہا، میں غلطی پر تھا۔ انسان کو نجات کی راہ ڈھونڈنی چاہئے۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ کوئی راہ نکل آئے۔ مگر وہ راہ کونسی ہو سکتی ہے؟ میرے پاس تو ایک چاقو بھی نہیں تھا۔ اسی وقت میری نظر اس خنجر پر پڑی جو کُرد کے کمر بند میں لٹکا ہوا تھا۔ آہ! کاش میرے پاس یہ خنجر ہوتا...... صرف یہ خنجر!

کُرد نے گرج کر کہا "چلے چلو! تم کھڑے کیوں ہو گئے؟"

میں چلتا رہا۔ ہم ایک تنہا اور تاریک وادی میں داخل ہو رہے تھے کہ کرد نے پریشان ہو کر ادھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ اس نے بندوق اپنے کندھے سے نیچے اتاری لیکن پھر وہیں رکھ دی۔ میں نے خیال کیا کہ اب انجام نزدیک ہے۔ لیکن میں ابھی مرنا نہ چاہتا تھا۔ اگر ایک سانپ زندہ رہنے کا حق رکھتا ہے تو انسان کو یہ حق اس سے بہت زیادہ ملنا چاہئے! میری رفتار سست ہو گئی۔ مجھے خیال آیا کہ کرد کے آگے آگے چلنا یقیناً میرے لئے خطرے کا باعث ہے۔

کرد نے کہا "تیز چلو، تیز!" وہ مجھے اپنے سامنے رکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میں اس کے پہلو بہ پہلو چلنا چاہتا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو سمجھ لیا اور ہمارے درمیان ایک خاموش جنگ جاری ہو گئی — ایک ہلاکت آفریں جنگ، جس کے پوشیدہ منصوبے دہشت انگیز طور پر خطرناک تھے۔

یکایک میں کھڑا ہو گیا۔ میری کھڑاؤں کے تسمے ڈھیلے ہو گئے تھے۔ کُرد میرے پاس آ پہنچا اور وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ میری داہنی طرف کھڑا تھا، اور اس کے خنجر کا سفید دستہ اس کے کمر بند میں آگے کو نکلا ہوا تھا۔

مجھے سست دیکھ کر وہ غصے سے پکارا "جلدی کرو فلاں، جلدی کرو"

میں بجلی کی طرح اٹھا اور قبل اس کے کہ وہ اپنے آپ کو بچانے کے لئے کوئی حرکت کرے میں نے اس کا خنجر نکال کر اس کے سینے میں گھونپ دیا۔ اس نے ایک دفعہ ہائے کی اور زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں بچ گیا تھا۔ دیکھو! جس خنجر نے مجھے بچایا تھا۔ وہ یہ ہے!

چوکیدار نے ہاتھی دانت کے دستے والا ایک خنجر اپنے کمر بند سے نکالا اور سامعین کو دکھایا۔ سب نے جھک جھک کر اس بھیانک ہتھیار کو دیکھنا شروع کیا جس نے ایک شخص کو تقدیر کے پیچ در پیچ دام سے آزاد کرایا تھا۔ حی، وہ معمولی سا آدمی اب حقیقت میں سب کی نظروں میں ایک اژدہا بن گیا تھا۔ اس نے تقدیر پر غلبہ پا لیا تھا۔ تقدیر اس کے آگے ہیچ تھی۔ وہ حق بجانب تھا۔

حی نے پھر کہا "میں تقدیر کا قائل نہیں ہوں" مگر اس دفعہ کسی نے اس کی ہنسی نہیں اڑائی۔ بلکہ سب نے اس کی بات احترام آمیز خاموشی کے ساتھ سن لی۔

اس نے خنجر اٹھا کر اپنے کمر بند میں رکھا اور باہر کی طرف چل دیا۔ کوئی اُسے روک نہ سکا۔

باہر اُسی طرح ہوا چل رہی تھی، مگر اب اس میں تقدیر کی دل ہلا دینے والی دہشت موجود نہ تھی۔ ہوا کی کثیر التعداد آوازوں میں اب ایک آواز یہ بھی آرہی تھی۔ "آزادی کے لئے لڑو"

(ار مئی)

منصور احمد

اِلتجا

کسی ناشادِ غم کو شاد فرما
کسی بھولے ہوئے کو یاد فرما
کبھی حرفِ کرم ارشاد فرما

تمنا کی منازل جاں گسل ہیں
محبت کی سلاسل جاں گسل ہیں
مجھے اس قید سے آزاد فرما

عطا کر رخصتِ فریاد مجھ کو
تغافل سے نہ کر برباد مجھ کو
قتیلِ خنجرِ بیداد فرما

شہیدِ شوق مقہورِ تمنا
سمجھ کر مجھ کو مجبورِ تمنا
ستم آرائیاں ایجاد فرما

بہارِ حسن کی رنگینیوں سے
تبسم کی حسیں شیرینیوں سے
دیارِ شوق کو آباد فرما

عابد لاہوری

اناطول فرانس اور آسکر وائلڈ

بیسویں صدی کے آغاز سے انگریزی ادب میں آزادیٔ فکر اور بیباکیٔ تحریر کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے جس عہد کو انگریزی میں وکٹورین ایج Victorian Age کہتے ہیں۔ اس کی ایک نمایاں خصوصیت یا کورانہ تقلید تھی۔ یہاں تک کہ ادب میں بھی بعض واضح حقیقتیں ناقابلِ اظہار سمجھی جاتی تھیں۔ اس عہد کے برخلاف جو ردِ عمل ہوا ہے اس کے ساتھ اگر ہم موجودہ تمدنی نظام کے انقلاب کو بھی شامل کر لیں تو بیسویں صدی کے انگریزی مصنفوں کی بیباک نگاری کے اسباب ظاہر ہو جاتے ہیں۔

آج کل جیمز جوائس جس کی کتاب "یولیسیز" شائع ہو کر مغربی نقادوں کے لئے ایک متنازعہ فیہ مسئلہ بن گئی ہے آلڈس ہکسلی جس کی تازہ ترین تصنیف "نئی دنیا" میں مستقبل کے معاشری نظام کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ ماریس ڈی کوبرا جس کی کتابیں صرف عریاں نگاری کے لئے مشخص ہیں۔ لارنس جس کی کتاب "لیڈی چیٹرلی کا عاشق" خاص خاص انگریزی حلقوں میں ضبط ہو چکی ہے عصرِ حاضر کے ممتاز ادیب ہیں۔ ان کی تصانیف میں جنسی نفسیات بلکہ جنسیات کے متعلق جس طرح کھلے بندوں اظہارِ خیال کیا جاتا ہے وہ حیرت انگیز بھی ہے اور عبرت آموز بھی۔ ابھی کل کی بات ہے کہ آسکر وائلڈ "ڈورین گرے" کو اس طرح ہدفِ طعن بنایا گیا تھا کہ اسے ایک خاص دیباچہ لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ جو کچھ آسکر وائلڈ نے اپنے دیباچے میں آرٹ کے متعلق لکھا تھا وہ آج کل حرف بحرف صحیح ثابت ہوتا نظر آرہا ہے۔ اس اشاعت میں آسکر وائلڈ کے دیباچے کے بعض حصے اور اناطول فرانس کی کتاب "اپی کیورس کا باغ" کے کچھ حصے پہلو بہ پہلو پیش کئے جاتے ہیں۔

اناطول فرانس حسنِ اتفاق سے ایسے دور میں پیدا ہوا کہ اسے بیباکانہ اپنے خیالات کے اظہار کا موقع مل گیا۔ موجودہ زمانے کے بیباک نگاروں میں وہ یوں ممتاز ہے کہ تمدن تو تمدن مذہب کے معاملے میں بھی بہت زباں دراز واقع ہوا ہے۔ زندگی کے متعلق اس کا نقطۂ نظر جو کچھ ہے اس کی تفصیل کی اس جگہ نہ گنجائش ہے نہ ضرورت لیکن بشرطِ فرصت کسی مضمون میں ان دونوں مصنفوں کی مشابہتِ فکر سے بحث کی جائیگی۔

اناطول فرانس

۱۔ صداقت صنعت کا مقصد نہیں۔

۲۔ سچ کی تلاش ہے تو سائنس کی بارگاہ میں جا۔ ادب کا مقصد تخلیق حسن اور صرف تخلیق حسن ہے۔ افسانے کو دلکش بنانا چاہتے ہو تو اسے زندگی کے معمولی تجربات سے بلند کرو اور امکانات کی بحث سے تھوڑے عرصے کے لئے بے نیاز ہو جاؤ۔

۳۔ ہم محبت کو غیر فانی سمجھتے ہیں اور یہ عورت کا تصور نہیں ہے۔

۴۔ ایک وقت انسانی زندگی میں ایسا آتا ہے جب جستجو گناہ ہو جاتی ہے۔

۵۔ شیطان کو تم ہمیشہ محققوں کے ہمراہ پاؤ گے۔

۶۔ کسی بیوقوف نے کہا تھا اپنے آپ کو پہچانو۔ ہم نہ اپنے آپ کو پہچان سکتے ہیں نہ کسی اور کو۔

۷۔ پرانی دنیا کو سمجھنا ناممکن ہے ایک نئی دنیا پیدا کر دینا ممکن ہے۔

۸۔ ذہانت کی اس سے بڑھ کر توہین نہیں ہو سکتی کہ اسے صداقت کی جستجو میں صرف کیا جائے۔

۹۔ ہم سب تاریکی میں ہیں۔ فرق یہ ہے کہ دانا دروازہ کھٹکھٹاتا رہتا ہے اور بیوقوف اطمینان سے بیٹھا رہتا ہے۔

۱۰۔ عیسائیت نے محبت کو گناہ قرار دے کر عورتوں کی بڑی خدمت کی ہے۔

۱۱۔ کلیسا کا فرمان ہے کہ عورتوں کو مذہبی پیشواؤں کا حق حاصل نہیں۔

۱۲۔ کلیسا عورت سے خائف ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت بہت خطرناک ہے۔

۱۳۔ کلیسا کا فرمان ہے کہ ان تنکوں پر بھروسہ نہ کرو جو ہوا کے جھونکوں سے جنبش میں آجائیں۔ کوئی دھوکا عورت کے دھوکے سے زیادہ خطرناک نہیں۔

۱۴۔ حق اے صنفِ نازک! تہذیب نے تجھ پر راز کا نقاب ڈال دیا۔ جس دن سے تو ایک راز ہوئی اس دن سے تجھ میں گناہ کی سی دلکشی پیدا ہو گئی۔ تیری وجہ سے محبت کا بزیان عالمِ وجود میں آیا وہ مسرتیں جو تو عالمِ خیال میں بخشتی ہے ان مسرتوں سے زیادہ شیریں ہیں جو تو حقیقت میں دیتی ہے۔

۱۵- سن اے صنفِ نازک مرد کی ہمسر نہ ہو۔ مرد کی ہمسر ہونے سے تیری شخصیت کا راز راز نہ رہے گا اور جب تو یہ کھو بیٹھے گی۔ تو سب کچھ کھو بیٹھے گی۔

آسکر وائلڈ

۱- صناع خوبصورت چیزوں کا خالق ہے۔ صنعت کا اظہار اور صناع کا اخفا صنعت کا مقصد ہے۔

۲- جو شخص خوبصورت چیزوں کے تاثرات کو ایک نئے طریقے سے بیان کر سکے یا ایک نئی صورت میں منتقل کر سکے وہ نقاد ہے۔

۳- کوئی کتاب مخربِ اخلاق یا مصلحِ اخلاق نہیں ہو سکتی۔ کتاب کے متعلق صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اچھی ہے یا بری ہے۔

۴- جو لوگ خوبصورت چیزوں میں برے معنی دیکھتے ہیں وہ مفسد ہیں اور اس کے ساتھ دلکش بھی نہیں۔ یہ ایک نقص ہے۔

۵- جو لوگ خوبصورت چیزوں میں خوبصورت معنی دیکھتے ہیں وہ مہذب ہیں ان کے لئے ابھی امید ہے۔

۶- برگزیدہ وہ ہیں جن کے لئے خوبصورت چیزوں کے معنی حسن کے ہیں۔

عابد علی

سر سیّد احمد مرحوم کی یاد میں

جوشید خوش شرابِ محبت بجامِ ما
شد تازہ یادِ سیّدِ عالی مقامِ ما

ما سرخوشِ شرابِ وفائیم مستِ خواب
شرمندہ سحر نبود کیفِ شامِ ما

سر سیّد از کرامتِ خود جلوہ نمود
طالع شد آفتابِ مسرت زبامِ ما

وحشت مگو کہ سیدِ ما از جہاں برفت
دانی چہ گفت حافظِ شیریں کلامِ ما

"ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما"

رضا علی وحشت

فریبِ کامرانی

وہ ایک روز مرے غمکدے میں آ نکلا
خدا کا شکر، مرے منہ سے "یا خدا" نکلا
وگرنہ یاد میں اس کی خدا کا نام کہاں
جنونِ عشقِ بتاں میں خدا سے کام کہاں
نظر نواز اگر ہو نگاہِ بادہ فروش
تو وہ نگاہ نہ کیوں ہو وداعِ عالمِ ہوش
کہا یہ میں نے کہ تجھ سے مجھے محبت ہے
مگر ہے پاک محبت یہ اک حقیقت ہے
ترے خیال میں سب کو بھلا چکا ہوں میں،
خیالِ غیر کو دل سے مٹا چکا ہوں میں
جہاں سے رازِ محبت چھپا رہا ہوں میں،
ہزار رنج و مصیبت اٹھا رہا ہوں میں
دفورِ غم سے کلیجا تو پک ہی جاتا ہے
ایاغِ دیدۂ پُرنم چھلک ہی جاتا ہے
نہ پوچھ غم سے جو ناکام دل کی حالت ہے
یہ ایک سانس جو ہونٹوں پہ ہے غنیمت ہے
یہ دل نہیں ہے مرا ایک شمعِ الفت ہے
خرابِ شوق ہے، وارفتۂ محبت ہے
کبھی نہ تو نے سنی دل سے گفتگو میری
ترے خلوص کی تشنہ ہے آرزو میری
دلِ حزیں کو مرے بھی کبھی قرار آئے
تجھے بھی کاش! یونہی مجھ سے پیار ہو جائے
نہیں ہے پہلو میں کچھ بھی سوائے حسرت کے
دل و جگر بھی ہیں دو داغ سوزِ الفت کے

یقیں نہ ہو تو یقیں بھی دلا دیا جائے
کہو تو چیر کے سینہ دکھا دیا جائے

غرض جو دل کی تھی حالت وہ سب بیاں کر دی
تمام عشق و محبت کی داستاں کر دی
خیال تھا کہ وہ دے گا تسلیاں مجھ کو
ملے گا کچھ صلۂ عرضِ داستاں مجھ کو
وہ سن کے حالِ دلِ دردمند رو دے گا
جگر کے داغ حسیں آنسوؤں سے دھو دیگا
مجھے وہ دردِ محبت کی کچھ دوا دے گا
مجھے وہ میری محبت کا کچھ صلہ دے گا
بنے گا یاس کی تصویر دیکھ کر مجھ کو
کڑھے گا رنج سے دلگیر دیکھ کر مجھ کو
نکل ہی آئے گی تسکینِ دل کی کوئی سبیل
جلا بجھا ہوا سینہ بنے گا باغِ خلیل
دلِ حزیں تھا نظر بازِ جلوۂ دلبر
نثارِ صورتِ پروانہ روئے انور پر
یقین تھا کہ وہ مجھ کو گلے لگا دے گا
گلے لگا کے مری حسرتیں نکالے گا

نگاہِ حسن میں پر رنگِ التفات کہاں؛
ہے جس کی دل کو مرے آرزو وہ بات کہاں؛

خنداںؔ

روشن شمعیں

سیر و تفریح کا شوق تو بہت ہے لیکن گاڑی کا سفر مجھے ہمیشہ ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے میں جب روما جانے کے لئے پیرس ایکسپریس میں سوار ہوا تو مجھے ایک لمبے اور تھکا دینے والے سفر کے تصور سے کوفت ہو رہی تھی میں نے سونے کے کمرے میں ایک سیٹ ریزرو کرا لی تھی۔ اور چونکہ اس میں دو ہی سیٹیں تھیں اس لئے میرا خیال تھا کہ راستہ بھر شاید کوئی دوسرا مسافر اس کمرے میں نہ آئے، اور میں اکیلا ہی تمام سفر گذار دوں۔ لیکن میری تمام امیدیں خاک میں مل گئیں جب میں نے دیکھا کہ مجھ سے پہلے ہی ایک اور شخص پلش والی سیٹ پر بیٹھا نہایت اطمینان سے سگار پی رہا ہے۔

میں جب گاڑی میں سوار ہوا تو اس نے مجھ پر ایک مستفسرانہ نگاہ ڈالی میں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور اپنی چیزیں درست کرتے ہوئے اس کے پاس بیٹھ گیا۔ چند ہی منٹوں میں گاڑی گارڈی لائن سے روانہ ہو گئی۔ نوکر نے آ کر پوچھا کہ اگر ہم سونا چاہیں تو وہ بستر لگا دے۔ ہماری نظریں پھر ایک دفعہ ملیں لیکن یہ دیکھ کر کہ میرا ساتھی ابھی سونا نہیں چاہتا میں نے نوکر کو رخصت کر دیا اور اسے ایک گھنٹے تک آنے کے لئے کہدیا۔ نوکر چلا گیا اور ہم پھر اکیلے رہ گئے۔ سگار سلگاتے ہوئے میں نے بیگ میں سے کچھ اخبار اور ایک کتاب "بھوتوں کی سچی کہانیاں" نکالی۔ کتاب کو اپنے اور اپنے ساتھی کے درمیان رکھتے ہوئے میں نے اخباروں کا مطالعہ شروع کیا۔ اخباروں میں روسی بغاوت کی اندوہناک اور بھیانک خبریں درج تھیں۔ جب میں تھک گیا تو میں نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ روسی بغاوت کتنا تکلیف دہ واقعہ ہے"۔

"اُف۔ بے حد۔ خدا جانے اس کا نتیجہ کیا ہو گا"۔

اس کے بعد ہم اِدھر اُدھر کی باتوں میں مشغول ہو گئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ میرا ساتھی ایک انگریز مگر آزاد خیال انگریز ہے۔ اس کے خیالات بلند اور مطالعہ وسیع تھا۔ روس کے متعلق کچھ باتیں کرنے کے بعد اس نے کہا:۔

"میں دیکھتا ہوں کہ آپ کے پاس بھوتوں کے متعلق بھی ایک کتاب ہے"۔

"ہاں۔ لیکن میں نے ابھی سب کہانیاں نہیں پڑھیں۔ میرا نوکر سٹیڈ اسے خرید لایا تھا۔ اس میں لکھا ہے ناممکن ہے کہ کسی مجلس میں کوئی ایسا آدمی نہ ہو جس نے بھوت نہ دیکھا ہو، یا جس کے ساتھ ایسا ہی کوئی غیر معمولی واقعہ نہ گذرا ہو۔ نہ معلوم یہ کہاں تک درست ہے"۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ شاید ایسا ہی ہو۔ اور اگر آپ مجھے بھی کسی مجلس کا رکن خیال کر سکتے ہیں تو میں اس سے اتفاق کروں گا"۔

"تو پھر کوئی ایسا واقعہ آپ کو پیش آیا ہے"۔

"میرا خیال ہے۔ اور ہاں کیسی عجیب بات ہے ــــ میں تو یہی سمجھتا ہوں ــــ کہ اس کا تعلق بھی روس سے ہے"۔

"کیا ہی اچھا ہو اگر آپ مجھے بھی مختصراً اس سے آگاہ کریں"۔

"ہاں بخوشی۔ لیکن کہانی کو دلچسپ بنانے کے لئے ضروری ہے کہ تفصیل کے ساتھ اور سلجھا کر بیان کیا جائے"۔

"واقعی۔ شاید میں نے آپ کو نہیں بتایا کہ میں ایک مصنف ہوں اس لئے اغلب ہے کہ آپ کی کہانی میں زیادہ اچھی طرح سمجھ سکوں اور اس کی داد دے سکوں"۔

"اگر آپ اُسے اس قابل سمجھیں تو بیشک شائع کرا دیجیے۔ لیکن کیا آپ روما تک جا رہے ہیں؟"

"ہاں"۔

"میں بھی وہیں جا رہا ہوں اور یہ تمام واقعات بھی روما ہی میں پیش آئے"

"بہت خوب!"

وہ مسکرایا اور جب گاڑی رات کی تاریکی میں تیزی سے سرحد کی طرف جا رہی تھی اس نے مجھے مندرجہ ذیل حکایت سنائی:۔

"اگرچہ میں بہادر ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ پھر بھی مجھے ایک خاص نوع کے آدمی سے جسے بزدل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے سخت نفرت ہے۔ گویا مجھے ڈر لگنے سے ڈر لگتا ہے۔ میرے لئے کوئی شے اتنی ناگوار نہیں اور اتنی تکلیف دہ ثابت نہیں ہوتی جتنا کہ بزدلی کا مظاہرہ۔ میں

ایک ڈرپوک اور بزدل آدمی کی معیت میں بے آرامی محسوس کرتا ہوں - مجھے اس کی حرکات وحشیانہ معلوم ہوتی ہیں -

"عرصہ تین سال کا ہوا کہ میں موسمِ خزاں میں سردیاں گزارنے کی غرض سے روما گیا - چونکہ ہوٹل میں زیادہ آزادی نہیں ہوتی اس لئے میرا خیال تھا کہ ایک علیحدہ فلیٹ لے لوں - صبح کا وقت تھا اور ابھی گاڑی سے اُترا ہی تھا کہ ایک قلی نے آکر پوچھا :- "کیا آپ ہوٹل جانا چاہتے ہیں یا ایک علیحدہ فلیٹ پسند کریں گے ؟" شاید آپ کو معلوم ہو کہ بہت سے قلی مکان والوں کے لئے ایجنٹوں کا کام کرتے ہیں - میرے جواب پر قلی نے مجھے اپنے ہمراہ چلنے کے لئے کہا - اس نے مکان کی بڑی تعریف کی اور کہا کہ فلیٹ میرے لئے ہر طرح موزوں ہوگا - یہاں تک کہ میں ایک ٹانگے میں بیٹھ کر اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہوگیا - مکان واقعی ہر لحاظ سے میرے لئے موزوں تھا، لہٰذا اُسے فوراً ہی اسے کرایہ پر لے لیا - فلیٹ میں میری حسبِ منشا کمرے تھے - اس کے سامنے جنوب کی طرف ایک کھلا میدان تھا جو ایک شخص نے لوگوں کو بائیسکل کی سواری سکھانے کی غرض سے لے رکھا تھا - اور چونکہ کمروں کی کھڑکیاں بھی اسی طرف کھلتی تھیں اس لئے ہوا اور دھوپ کافی آسکتی تھی - فلیٹ کی مالکہ ایک اطالوی عورت تھی جو تمباکو بیچا کرتی تھی - میں نے مکان کو تین ماہ کے لئے کرایہ پر لے کر اپنا کل سامان رات کو اسمیں منتقل کرلیا -

فلیٹ میں داخل ہوتے ہی ایک ہال کمرہ آتا تھا جس میں کرسیاں اور صوفہ پڑا ہوا تھا - ہال کے دائیں جانب تین کمرے تھے، بیڈروم، ڈرائنگ روم، اور ڈائننگ روم - یہ کل کمرے جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے اس کھلے میدان کی طرف واقع تھے - ہال کے دوسری جانب ڈائننگ روم کے سامنے ایک بیٹھک تھی جس کے دروازے اور کھڑکیاں ایک چھوٹے سے باغ کی طرف تھیں جو مکانوں کی پشتوں سے گھرا ہوا تھا - اس بیٹھک کے بالمقابل ایک تنگ رستہ تھا جو بائیں ہاتھ سے باورچی خانے اور نوکروں کے سونے کے کمرے کی طرف جاتا تھا - یہ دونوں بھی باغ کی طرف کھلتے تھے - ان کی کھڑکیوں سے فلیٹ کے باقی حصے اور میرے سٹوڈیو کی کھڑکیاں نظر آتی تھیں - دراصل میرے فلیٹ کا یہ حصہ مکان کے عمودی واقع ہوا تھا - ہال کی پرلی طرف بیٹھک اور کھانے کے کمرے کے درمیان ایک غسل خانہ بھی تھا -

"میں کام کاج کے لئے ایک عورت ملازم رکھنا چاہتا تھا لیکن پہلی رات میں بالکل اکیلا تھا - اس لئے فلیٹ کی مالکہ نے ہی آکر میرا بستر بچھا دیا - جب وہ موم بتی، دیا سلائی اور دیگر ضروری اشیاء رکھ کر شب بخیر کہتے ہوئے واپس جانے لگی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ نیپلز کی اس ڈیل ڈول اور پھیکے چہرے والی عورت کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں مجھ پر رکیں اور ایک لمحے کے لئے جم کر رہ گئیں - اس پوشیدہ اور مستفسرانہ نگاہ میں ایک خاص قسم کی حیرت پائی جاتی تھی - جب وہ چلی گئی تو میں نے موم بتی جلا کر کمروں کا جائزہ لینا شروع کیا - نوکروں کے کمرے میں کھڑکی کے نیچے میز پر ایک نئی موم بتی اور دیا سلائی کی ڈبیا پڑی ہوئی تھی - میں نے موم بتی بغیر کسی غرض کے جلائی اور کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھ کر آتی دفعہ جیسا کہ میرا خیال ہے اسے بجھا دیا -

"چونکہ رات ہوچکی تھی اس لئے میں باہر نکلا اور ہوٹل میں کھانا کھا کر وہیں سے تھیئٹر چلا گیا - جب واپس آیا تو سیڑھیوں میں تاریکی کی وجہ سے مجھے موم بتی کی ضرورت پڑی - لیکن میری جیب میں صرف دیا سلائی کی ڈبیا تھی - میں نے ایک تیلی جلائی اور چند سیڑھیاں طے کیں جہاں آکر تیلی بجھ گئی میں نے دوسری نکالی لیکن وہ بھی جلدی بجھ گئی - ڈبیا میں تیسری تیلی نہ تھی - کیونکہ شام کے وقت میں معمول سے زیادہ سگرٹ پیتا رہا تھا - یکایک مجھے خیال آیا کہ ہال میں میز پر ایک نئی ڈبیا پڑی ہوئی ہے - میں نے آہستہ آہستہ ٹٹول کر چڑھنا شروع کیا حتےٰ کہ زینے تک پہنچ گیا - یہاں پہنچ کر کھڑکی میں سے اچانک مجھے نوکروں کے کمرے سے روشنی آتی ہوئی دکھائی دی -

"میں وہیں خاموش بے حس و حرکت کھڑا ہوگیا - میری حیرانی کی کوئی انتہا نہ تھی - میں سوچنے لگا - کیا مالکہ کسی کام کے لئے واپس آئی تھی یا چور — میں نے ریوالور نکال لیا اور چابی سے دروازہ کھول کر اندر آیا - لیکن اس تمام دوران میں میرے کان ہر معمولی حرکت اور آواز کو بھی سننے کے لئے ہوشیار تھے - ڈبیا مل جانے پر میں نے موم بتی جلائی اور سامنے والا دروازہ کھلا چھوڑ کر دبے پاؤں "غلام گردش" کی طرف چلا - کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور سامنے کی دیوار پر اندر جلتی ہوئی بتی کی روشنی پڑ رہی تھی - میں ٹھہر گیا - پستول کے گھوڑے پر انگلی رکھ لی اور کان لگا کر سننے لگا - لیکن کوئی آواز نہ آئی - میں جلدی سے داخل ہوا - لیکن کمرے میں کوئی بھی نہ تھا - میز پر موم بتی تقریباً تمام جل چکی تھی - اُسے اٹھا کر میں نے تمام کمروں کو دیکھنا شروع کیا - مگر ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر بدستور پڑی ہوئی تھی -

"میں سوچنے لگا کہ یہ کیا معاملہ ہے - شاید موم بتی جلتی ہی چھوڑ

گیا تھا ———— لیکن میں قسم کھا کر کہہ سکتا تھا کہ میں نے جاتی دفعہ اُسے گل کر دیا تھا۔ مگر کئی دفعہ ہمیں خود دھوکا ہو جایا کرتا ہے اِس لئے اپنے آپ کو دلاسا دیتے ہوئے اور اپنی ہی یاد کو جھٹلاتے ہوئے بستر پر لیٹ گیا اور جلد ہی سو گیا"۔

"صبح سویرے میں نے ایک ایجنسی کے پاس جا کر ایک قبول صورت باورچن لوسی کو نوکر رکھ لیا، جس نے کہا کہ وہ اسی روز سے میرا کام شروع کر دے گی۔ اس کے بعد میں اپنے فلیٹ کی مالکہ کے پاس گیا تاکہ اگر اس کے پاس فلیٹ کی ایک اور چابی ہو تو دوسری چابی میں ملازمہ کو دے دُوں لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ اور میرا خیال کہ شاید اسی طرح سے اس جلتی ہوئی موم بتی کا سراغ مل جائے غلط ثابت ہوا۔ ظاہر تھا کہ میری یادداشت ہی نے مجھے دھوکا دیا"۔

"میں نے ایک اور چابی باورچن کے لئے بنوالی۔ اور اس واقعہ کو ذہن سے فراموش کر دیا"۔

لوسی کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اپنے خاوند کے ساتھ مجھ سے تھوڑے ہی فاصلہ پر رہا کرتی تھی۔ اس لئے جب تک میں نے ایک اور ملازم نہ رکھا میں فلیٹ میں رات کو اکیلا ہوتا تھا"۔

"اس شام میں نے گھر پر ہی کھانا کھایا۔ اور جب تک لوسی چلی نہ گئی میں وہیں رہا۔ جونہی کہ اس نے جاتی دفعہ دروازہ بند کیا میں اُٹھ کر غلام گردش میں گیا۔ لوسی نے شمعدان ہٹا کر چارپائی کے پاس رکھ دیا تھا اور اس میں ایک نئی بتی بھی لگا دی تھی۔ اس کے پاس ایک دیاسلائی کی ڈبیا بھی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے کمرے کا معائنہ کیا اور پھر باہر چلا گیا"۔

"میں نے شام شہر کی بڑی لائبریری میں اخبار کے مطالعہ میں اور دیگر تفریحی مقامات میں صرف کی۔ جب میں گھر پہنچا تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اس دفعہ میرے پاس ایک موم بتی کا ٹکڑا تھا جس سے سیڑھیوں میں روشنی کرتے ہوئے میں اوپر پہنچا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے دروازہ بند کر دیا اور لیمپ جلا دیا۔ پھر خوابگاہ میں جا کر میں نے لباس تبدیل کرنا شروع کیا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں بزدل یا ڈرپوک نہیں۔ میں کئی ایسی جگہوں پر نہایت اطمینان کی نیند سو چکا ہوں جہاں دوسرے لوگ قدم رکھتے بھی ڈرتے ہیں۔ لیکن نہ معلوم اس رات کیا بات تھی کہ جب میں سونے کے لئے تیار ہوا تو مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے کوئی کام ادھورا رہ گیا ہو اور مجھے سونے سے پہلے اسے ختم کر لینا چاہیئے۔ ایسی کیا چیز تھی جو میں کرنا بھول گیا تھا؟ میں ڈریسنگ ٹیبل کے پاس کھڑا سوچ رہا تھا کہ میں نے خوابگاہ کا دروازہ کھول کر ہال اور اس راستہ کی جانب جو غلام گردش کی جانب جاتا تھا دیکھا۔ ایک ہلکی روشنی اس طرف سے آ رہی تھی۔ میں ننگے پاؤں ہی اس طرف گیا۔ بستر کے پاس وہی موم بتی جو میں آج رات بھی ہوئی چھوڑ گیا تھا جل رہی تھی۔ میں نے کمرے میں جا کر آج بھی دیکھا لیکن آج بھی وہاں کوئی نہ تھا اور نہ کوئی نشانی تھی جس سے معلوم ہو کہ کوئی وہاں آیا تھا"۔

"اس دفعہ مجھے واقعی بے چینی محسوس ہوئی۔ ظاہر تھا کہ کوئی اجنبی کہیں نہ کہیں روما میں ایسا موجود تھا جس کے پاس میرے کمرے کی چابی تھی اور جو چند وجوہ کے ماتحت جن کا مجھے علم نہ تھا میرے کمرے میں غیر حاضری میں آتا تھا۔ اس شخص کا مقصد کیا تھا۔ میں کچھ سمجھ نہ سکا۔ اور اس پر حیرانی کی بات یہ تھی کہ یہ شخص اتنا بے پروا کیوں ہے کہ جاتی دفعہ موم بتی جلتی چھوڑ جاتا ہے تاکہ اس کی آمد کا پتہ چلتا رہے۔ میرا شبہ اب یقین کو پہنچ گیا کہ پچھلی رات بھی میری یادداشت نے مجھے دھوکا نہ دیا تھا، اور میں نے بتی کو جاتی دفعہ بجھا دیا تھا۔ موم بتی گل کر دینے کے بعد میں خوابگاہ میں سونے کے لئے گیا تو سہی لیکن بے چینی کی وجہ سے سو نہ سکا"۔

"دوسرے دن مجھے پھر مکان کی مالکہ کا خیال آیا لیکن وہ صاف انکار کر چکی تھی کہ اس کے پاس دوسری چابی نہ تھی اور اس کے علاوہ اسے رات کے وقت میری غیر حاضری میں میرے مکان سے کیا غرض تھی؟ .... لیکن اس مکان میں پہلے کون رہتا تھا؟ میں نے باتوں باتوں میں مالکہ سے آج پھر جا کر پوچھا:-

"یہاں مجھ سے پہلے کون رہتا تھا"؟

"ایک روسی۔

"مرد؟"

"نہیں، شہزادی انڈرا کوف۔"

"کیا وہ روما چھوڑ کر چلی گئی ہے"؟

"وہ مر چکی ہے"۔

"اس کے بعد دوکان پر کسی کے آنے جانے کے باعث میں مالکہ سے کچھ اور معلوم نہ کر سکا"۔

"جب میں گھر واپس گیا تو میں شہزادی انڈرا کوف کا نام دہرا رہا تھا۔ اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ شہزادی کس شکل و صورت اور کن خط و خال کی مالک ہوگی اور اس کا مزاج کیسا ہوگا"۔

"آج کا دن معمول سے زیادہ دلکش تھا۔ میں سیکرڈ ہارٹ کے گرجے کی طرف جو ایک پہاڑی پر واقع تھا گیا۔ وہاں چوراہے میں میری نظر ایک شخص پر پڑی جس کی عمر پچیس کے لگ بھگ ہو گی۔ اس کا چہرہ چپٹا، ناک دبی ہوئی اور گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ اس کے بال لمبے اور گھونگھریالے تھے۔ اجنبی نے پرانے کپڑے پہن رکھے تھے اور قرائن سے روسی طالبعلم معلوم ہوتا تھا۔ ایک لمحہ ٹھہرنے کے بعد اس نے چلنا شروع کیا میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا ——— نہ معلوم کیوں ——— لیکن جب وہ اوپر پہنچکر ٹھہر گیا تو میں بھی اُس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ ہمارے سامنے دلکش نیلگوں آسمان کے نیچے اس دلکش شہر کا دلکش نظارہ تھا۔

"میں نہیں بتا سکتا کہ کس طرح، لیکن ایک منٹ کے بعد ہم دونوں فرانسیسی زبان میں گفتگو کر رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مدتوں کے بچھڑے ہوئے دو دوست آپس میں ملے ہوں۔ وہ ایک روسی طالب علم تھا اور مصوری سیکھ رہا تھا۔ روما کی شہرت سُن کر یہاں آیا تھا۔ جب ہم جانے لگے تو میں نے دستور کے مطابق مجھے اپنا کارڈ دیا اور میں نے اسے اپنا، جس پر کہ میرا روما کا پتہ چھپا ہوا تھا۔ اس نے کارڈ پر نگاہ ڈالی اور کچھ ٹھٹک سا گیا۔

"میں نے پوچھا، کیوں؟ ...... کیا میں نے تمہیں غلط کارڈ تو نہیں دے دیا؟"

"نہیں، نہیں۔ فقط تم ایک ایسے گھر میں رہتے ہو جس میں آج سے پہلے میرا ایک دوست رہا کرتا تھا"،

"کیا شہزادی انڈرا کوف"؟

"ہاں۔ کیا تم اسے جانتے ہو؟"

"نہیں۔ لیکن میں نے وہی فلیٹ لے رکھا ہے جس میں مجھ سے پہلے وہ رہا کرتی تھی"۔

"نوجوان نے مجھے نہایت غور سے دیکھا"۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ مر چکی ہے"۔

"ہاں"۔

"کیا وہ روما ہی میں مری تھی"؟

"ہاں یہیں پر۔

"اور کیا اسی فلیٹ میں"؟

"ہاں"۔

"میں حیران ہوں"۔ میں ہوقت جلتی ہوئی موم بتیوں کے متعلق سوچ رہا تھا"۔ میں نے پوچھا کیا وہ کسی قدر بے پروا تو نہ تھی"؟

"کیا کہا بے پروا"۔

"ہاں"۔

"کیا تم کسی خاص وجہ سے ایسا کہہ رہے ہو"؟

"میں رکا۔ اجنبی اور میں بالکل نا واقف تھے، اور میرا قاعدہ ہے کہ میں اجنبیوں کو ہمراز بنانے میں دلیری نہیں کرتا۔ لیکن اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں معلوم نہیں کیا کشش تھی کہ میں اس کو تمام حالات بتائے بغیر نہ رہ سکا۔ کوئی چیز تھی جو مجھے اس بات پر مجبور کر رہی تھی۔۔ لہٰذا میں نے اسے بے کم و کاست سب کچھ کہہ سُنایا"۔

"جب میں ختم کر چکا تو میں نے کہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آیا اس کے پاس فلیٹ کی کوئی دوسری چابی تو نہ تھی جو اس نے گم کر دی ہو یا جو اس نے کسی ملازم کو دے دی ہو؟"

اس نے کہا:۔ "شہزادی کا کوئی خادم نہ تھا"۔

"کوئی خادم نہ تھا"؟

"نہیں شہزادی نے ایک عجیب طبعیت پائی تھی"۔

"واقعی"؟

"ہاں وہ بہت شکی مزاج کی واقع ہوئی تھی۔ اسے ملازم رکھنے سے بھی ڈر لگتا تھا۔ کہ وہ کسی سے مل کر اس کے خلاف سازش نہ کر دیں"۔

"کیا وہ چوروں سے ڈرتی تھی؟"

"نہیں ——— لیکن یہ ایک دردناک واقعہ ہے ——— خیر شہزادی مر چکی ہے اور ———"

وہ رک گیا۔ لیکن آخرکار اس نے کہنا شروع کیا:۔ "روس میں میں اس کا واقف تھا اس کا خاوند باحیثیت آدمی تھا ——— ایک جرنیل اور کسی وقت جنوبی روس کے ایک صوبہ کا گورنر بھی رہ چکا تھا۔ وہاں ایک بغاوت ہوئی اور وہ اسے فرو کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ مگر جن طریقوں سے اس نے بغاوت کو فرو کرنا چاہا ان کو نہ تو عوام الناس ہی نے پسند کیا اور نہ باغیوں ہی نے۔ سبھی اس سے سخت نفرت کرتے تھے۔ لیکن شہزادی کو اس سے بھی زیادہ بُرا سمجھتے تھے۔ لوگ اسے کوستے تھے"۔

"لیکن کیوں"؟

"وہ اس طبقہ سے تھی جو اپنی امارت کے گھمنڈ میں سخت سے سخت ظلم اپنے محکوموں پر روا رکھتے ہیں۔ اور اسے بالکل بُرا نہیں سمجھتے۔ وہی تھی کہ جس نے

اپنے خاوند کو ہر ممکن تشدد پر اُکسایا۔ ورنہ کیا ضرورت تھی کہ اس کا بیان فخریہ طور پر ہر ایک کے سامنے کرتی۔ اگر شہزادی نے اسے ترغیب نہ دی ہوتی تو وہ ہرگز ایسا نہ کرتا۔ اور اس کا نتیجہ بس جو ہو سکتا تھا وہی ہُوا۔ کہ ایک نوجوان لڑکی نے اسے قتل کر دیا" پھر اس نے ایک لمحے کے بعد کہا۔

"لڑکی چلی گئی، غالباً سائبریا کو، اور شہزادی؟ وہ بھی روما کو بھاگ آئی، میں نے پوچھا، کیا وہ ڈرپوک تھی،

بیحد، اُس جیسا بُزدل شاید کوئی نہ ہوگا۔ وہ ایک کمزور نازک اندام نخریلی عورت تھی اور اپنے خاوند سے عمر میں کئی سال بڑی، اور جیسا کہ بڑی عمر کے آدمیوں کے ساتھ ہُوا کرتا ہے۔ اس کی طبیعت نے ایکدم پلٹا کھایا اور اس کی تمام جرأت اور دلیری مفقود ہو گئی۔ ایک ہی دن میں وہ جابر اور سنگدل حاکم سے منہ چڑانے والی کمزور عورت بن گئی یہ دن اس کے خاوند کے قتل کا دن تھا۔ اسی دن باغیوں نے اس کو بھی تہ تیغ کرنے کا تہیہ کر لیا تھا اور وہ اس بات کو جانتی تھی۔

"کیا یہی وجہ تھی کہ اس نے روس کو چھوڑا؟"

"ہاں وہ یہاں چلی آئی۔ اُس نے تمہارے والا فلیٹ لے لیا، اور اپنا نام تبدیل کر لیا۔ لیکن یہاں آ کر اس کا ڈر بڑھتا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے اور اس کی ہر ایک حرکت کی نگہداشت کی جا رہی ہے۔ اسی وجہ سے اس نے کسی کو ملازم نہ رکھا تھا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں وہ بھی اس کے قاتلوں میں سے کوئی نہ نکل آئے۔ وہ پچھلے کمرے میں رہا کرتی تھی تاکہ اسے کوئی سڑک پر سے دیکھ کر پہچان نہ لے۔ آخر کار وہ اسی خیال میں خوف وہراس کی وجہ سے مر گئی۔ کیونکہ اسے ایکدن لیٹر بکس میں ایک چٹھی ملی جس میں لکھا تھا کہ اس کی جائے پناہ معلوم ہو چکی ہے۔

میں نے پوچھا "تو پھر اس کی موت اسی کمرے میں ہوئی جس میں بتیاں جلتی رہی ہیں"

"وہی پیچھے کا کمرہ۔ صرف ایک ہی تو ہے"

"معاف کرنا۔ لیکن یہ سب کچھ تمہیں کس طرح معلوم ہے"

"عجیب سی بات ہے۔ لیکن شہزادی میری اور میری والدہ کی بڑی ہمدرد تھی۔ میری والدہ اُسے مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھ کر سنانے پر مامور تھی۔ اور اگرچہ میں شہزادی کا شرمندۂ احسان ہوں لیکن مجھے اس کی طرف کبھی رغبت نہ ہوئی۔ اس جگہ میں اس سے ایک آدھ دفعہ ملنے کے لئے گیا لیکن بعد میں وہ مجھ سے بھی خوف کھانے لگی۔ حتےٰ کہ ایکدن لوگوں کو اس کا دروازہ توڑنا پڑا کیونکہ متواتر آوازوں کا شہزادی کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تھا۔ اندر جا کر معلوم ہوا کہ شہزادی مر چکی ہے اور اس کا چہرہ خوف وہراس کی وجہ سے پچک گیا ہے .... اس کے نزدیک ایک جلتی ہوئی موم بتی پڑی تھی"

"یہ تھی اس نوجوان روسی کی حکایت۔ میں ضرور کہوں گا کہ کہانی سُن کر میں اپنے فلیٹ سے کچھ دِل برداشتہ سا ہو گیا۔ بلکہ میں اس میں رہنے سے کترانے لگا۔ میں کبھی اس نازک اندام کمزور نخریلی عورت کا خیال کرتا اور کبھی سوچتا کہ میرے دوست نے بھی جلتی ہوئی موم بتیوں کے معمے کو حل کرنے میں میری کوئی مدد نہ کی ― میں ابھی تک اسی وہم میں تھا کہ کوئی دوسرا شخص ہے جو کسی اور چابی سے میرے فلیٹ میں آ جا سکتا ہے"

"اُس رات میں نے کھانا گھر پر ہی کھایا اور جب لوسی جانے لگی تو میں ایک کتاب لے کر بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا تاکہ جونہی تالے میں چابی لگانے کی آواز آئے میں چور کو پکڑ لوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی تھا کہ سب کو معلوم ہے میں آج باہر نہیں گیا اور اس وجہ سے کوئی میری موجودگی میں نہ آئے گا۔ تاہم میں نے ہال کا دروازہ کھول کر کتاب کی ورق گردانی شروع کر دی اگرچہ پڑھنے کو طبیعت نہیں چاہتی تھی۔

"وقت گزرتا گیا۔ میں نے چند صفحے کتاب کے پڑھے۔ لیکن کیا پڑھا یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ حتےٰ کہ باہر سے لوگوں کے چلنے پھرنے کی آوازیں کم ہوتے ہوتے آخر بند ہو گئیں اور ہر چیز پر خاموشی طاری ہو گئی۔ میں نے گھڑی نکالی۔ وقت دیکھا تو ایک بجنے والا تھا .... مجھے ہرگز یہ خیال نہ تھا کہ اتنی دیر ہو جائے گی۔

میں اٹھا اور گیس کی روشنی گل کر دی۔ ہال کے کمرے کا دروازہ اور اس کے ساتھ سے گزرتا ہُوا راستہ کچھ اس طرح واقع ہُوا تھا کہ میں غلام گردش تک اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ غلام گردش کا دروازہ بند تھا ―― کیا اُسے میں نے بند کیا تھا؟ میں سوچنے لگا۔ دروازہ بند تھا۔ ہر طرف تاریکی تھی لیکن دروازے کی درازمیں سے ہلکی ہلکی روشنی آرہی تھی ―― کمرے کے اندر موم بتی جل رہی تھی۔

"لیکن کس نے جلائی؟" میرے دِل میں یہ سوال پیدا ہُوا۔

"میں ہکا بکا رہ گیا۔ مجھے بے چینی سی محسوس ہونے لگی اور مجھے کمرے کے اندر جاتے ہوئے سخت ڈر لگنے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اگر میں کمرے کے اندر گیا تو مجھے وہی کمزور نازک اندام نخریلی عورت

وہاں بیٹھی ٹہلنے لگی، اور مجھے دیکھتے ہی زور سے چیخ اُٹھے گی۔ یہ عمر میں پہلا موقع تھا کہ مجھے ڈر محسوس ہُوا۔ اس وقت میری اولیں خواہش یہی تھی کہ مکان سے نیچے اُتر کر باہر میدان میں تاروں کی چھاؤں کے نیچے چلا جاؤں اور اپنے آپ کو لوگوں کی آمدورفت میں گم کردوں۔ تاہم میں نے ہمت کی اور موم بتی کو مضبوطی سے پکڑ کر کمرے کی طرف چلا اور جاتے ہی کمرے کے دروازے کو زور سے دھکا دیا۔

"کمرے کی خاموشی اور تنہائی میں موم بتی جل رہی تھی"۔

"چھوٹا سا کمرہ خالی تھا۔ اس میں چارپائی کے پرلی طرف ایک کرسی پڑی ہوئی تھی۔ دیوار پر ایک تصویر تھی۔ کھڑکی بند تھی اور اس کی چٹخنی لگی ہوئی تھی۔ یہ وہی چارپائی تھی جس پر شہزادی نے اپنے آخری لمحے گذارے تھے اور یہ وہی شمعدان تھا جس میں اس نے ایک موم بتی رات کے خوفناک گھنٹوں کے کاٹنے کے لئے تسلی کے طور پر جلائی تھی"۔

"لیکن اس کمرے میں یہ موم بتی آج کس نے جلائی؟"

"میں اُس اکیلی کرسی پر بیٹھ گیا اور کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح اس عجیب وغریب واقعہ کی تہ تک پہنچوں۔ لیکن کیسے؟ دروازہ اور کھڑکی بند تھی۔ مکان میں میرے سوا کوئی نہ آیا تھا۔ اور کسی کے آنے کا کوئی امکان بھی نہ تھا۔ اگرچہ میں بھوت پریت کی باتوں کو مانتا نہیں لیکن ان سے انکار بھی نہیں کرتا۔ لہٰذا مجھے اس کمرے میں ایک خاص عجوبہ پن دکھائی دینے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ دُور دراز سے چیخوں کی آواز آرہی ہے اور اس کمرے میں کوئی ہستی ہے جو قتل کے ڈر سے ہر روز موم بتی جلائے رکھتی ہے"۔

"تم کہوگے کہ یہ محض وہم تھا اور میرا تخیل ہی میرے سامنے ان تمام صورتوں کو پیش کررہا تھا۔ شاید۔ کیونکہ میں بھی اس وقت کچھ ایسی ہی خیال مثال کرکے بمشکل تمام جاکر سو رہا۔ صبح اٹھ کر میں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ ان اوہام کے ازالے کے لئے میں اس کمرے کو آج آباد کردوں گا اور اسی وقت جاکر ایک نوکر کو لے بھی آیا اور یہ کمرہ اس کے لئے وقف کردیا۔ یہ شخص سسلی کا رہنے والا تھا"۔

"شام کے وقت میں کھیت کے پاس ٹہل رہا تھا۔ مجھے اس دن پھر وہی روسی طالب علم ملا۔ میں نے اس کو ساری کیفیت کہہ سنائی اور جب نوکر کو ملازم رکھ لینے کے متعلق کہا تو اس نے اپنے کندھوں کو اس طرح ہلایا۔ جیسے کوئی ڈر کی وجہ سے کانپتا ہو۔

اس نے کہا "میں تو ایسی صورتوں میں کبھی تمہارا نوکر بننا پسند نہ کروں اور کبھی اس کمرے میں نہ سوؤں"۔

"لیکن اسے تو کچھ خبر نہیں اور وہ کچھ محسوس نہ کرے گا"۔

"اور اگر رات کے وقت موم بتی خود بخود جل اٹھی تو؟"

"تو کیا واقعی تم ———"

اس نے کہا "جناب! روس کے لوگ وہمی ہوتے ہیں۔ میں خوش ہوں کہ آپ نے ایسے شخص کو ملازم رکھا ہے جو سسلی کا باشندہ ہے۔ سسلی کے لوگ دلیر ہوتے ہیں۔ مگر حساس بھی اتنے کہ ذرا ذرا سی باتوں سے متاثر ہوجاتے ہیں۔ تاہم یہ شخص اس کمرے کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ اور اغلب ہے کہ وہ ایک کسوٹی ثابت ہو جس پر ہم اس واقعے کی حقیقت کو جانچ سکیں۔ اگر اسے ڈر نہ لگا اور اسے کچھ محسوس نہ ہوا تو کمرے میں نہ بھوت ہے نہ آسیب۔ اور اگر وہ ڈرے اور اسے کسی چیز سے خوف محسوس ہو تو ظاہر ہے کہ کمرے پر کسی قسم کا سایہ ہے"۔

وہ رُکا اور ایک لمحے کے بعد اس نے پھر کہنا شروع کیا:۔

"جو لوگ وہمی واقع ہوئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ تین جلتی ہوئی موم بتیاں دکھائی دینا موت کی نشانی ہے"۔

"انگلستان میں بھی لوگ یہی کہتے ہیں"۔

اُس نے پوچھا "کیا تم اس بات کو مانتے ہو؟"

"میں نے کبھی ایسی باتوں کے سوچنے میں وقت ضائع نہیں کیا۔ میری زندگی میں کوئی عجیب یا غیر معمولی واقعہ نہیں ہوا"۔

اس کے بعد وہ چلا گیا۔

"گوانی (یہ ملازم کا نام تھا) خوش مزاج تھا۔ اس نے اس کمرے کو بہت پسند کیا اور جب شام کو میں نے اسے لوسی کے ساتھ ہنسی مذاق کی باتیں کرتے سُنا تو میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا اور میں سمجھنے لگا کہ موم بتیوں والا قصہ اب مجھے تنگ نہ کرے گا۔ لیکن ———"

"میرا ہمسفر یکدم ٹھہر گیا۔ اس کے چہرے سے بے چینی کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے پوچھا۔

"لیکن یہ کیا؟ تم ٹھہر کیوں گئے۔ کہو آگے کیا ہوا"

"میں بیان نہیں کرسکتا کہ میرے لئے یہ کیسی اندوہگین یاد ہے۔ میں جب اس واقعے کو بیان کرتا ہوں تو مجھ پر ایک ہیبت سی چھا جاتی ہے کیونکہ جب میں دوسری صبح گوانی کے کمرے میں گیا تو وہ ——— وہ مر چکا تھا۔ اور اس کا چہرہ خوف و ہراس کی ایک بھیانک تصویر بن گیا تھا"۔

وہ ایک منٹ کے لئے ٹھہرا اور پھر دوبارہ کہنا شروع کیا:۔

میں جب ڈاکٹر کو بلا کر لایا تو اس نے معائنے کے بعد کہا کہ گوانی کی موت حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ہوئی۔ اگرچہ وہ کافی مضبوط اور توانا تھا لیکن اس کا دِل بہت کمزور تھا۔ اسی دن لوسی نے مجھے تنبیہ کی کہ میرے مکان پر کسی بُری چیز کا سایہ ہے۔

"میں نے اسی روز اپنا سامان ایک ہوٹل میں تبدیل کر لیا۔ ان حالات میں آپ میری اس حرکت سے متعجب تو نہیں ہوتے" اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"بالکل نہیں"

اس نے اپنا سلسلۂ کلام شروع کیا "بدقسمتی سے میں نے مکان تین ماہ کے لئے لیا تھا اس لئے مجھے ان تین مہینوں کا کرایہ دینا پڑا۔ گوانی کو دفن کر دیا گیا۔ اور میرے نقلِ مکان کے بعد فلیٹ خالی رہا۔ اس کی چابی میرے پاس تھی اور میں جب چاہتا اس میں جا سکتا تھا"

میں نے پوچھا "کیا تم دوبارہ کبھی گئے بھی؟"

"ہاں اسی روسی طالب علم کے ساتھ۔ یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ میرے اور اس کے تعلقات روز بروز بڑھتے گئے۔ شاید شہزادی کے متعلق اس کی واقفیت مجھے روز بروز اس کی طرف کھینچ رہی تھی۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد میں اس کو ذاتی طور پر پسند کرنے لگ گیا۔ اس کا بے تکلف طرزِ کلام مجھ بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔ پھر باوجود اس کی خندہ پیشانی اور صاف گوئی کے مجھے محسوس ہوتا تھا کہ چند راز تھے جو وہ دِل میں چھپائے رکھتا تھا۔ اس کی ہستی مجھے پیچیدہ معلوم ہوتی تھی جسے میں ابھی تک سمجھ نہ سکا تھا۔

"جب میں نے اُسے اپنے نوکر کی موت اور تبدیلی مکان کے متعلق بتایا تو اُس نے کہا۔

"تم نے اچھا کیا۔ وہاں پر موت ہے"

"ایک دن جب ہم بے سارڈی ہوٹل میں چائے پی رہے تھے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ کیوں میں نے اس سے کہا کہ جب سے میں نے فلیٹ چھوڑا ہے میرے دِل میں رہ رہ کر اس میں خواہ ایک ہی گھنٹے کے لئے ہو جانے کا خیال آتا تھا۔ لیکن جب میں وہاں پہنچوں تو میری ہمت نہیں پڑتی کہ اندر جاؤں۔

اس نے پوچھا "کیا تم کبھی گئے بھی ہو؟"

"نہیں۔ جب سے میں نے فلیٹ چھوڑا ہے کبھی نہیں گیا۔ لیکن کیا تم اس کشش کو سمجھ سکتے ہو؟"

"ہاں، جہاں خوف اور پیچیدگی کا گند ہو وہاں ہمیشہ ایک نامعلوم کشش ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود قاتل بھی کئی دفعہ جائے قتل پر جائے بغیر نہیں رہ سکتے"

"شاید ——— میں نے ہچکچا کر کہا۔

"ہاں، ہاں کہو"

"شاید تم میرے فلیٹ پر میرے ساتھ چل کر ایک گھنٹہ سگار پینے میں صرف کرنا پسند نہ کرو"

اُس نے میری طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

"میں؟ ——— میں؟ کیوں مجھے وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

اس کا پُرزور لہجہ پریشان کرنے والا تھا۔

میں نے آہستہ سے جواب دیا "محض میرا ساتھ دینے کے لئے"

"اچھا۔ یہ بات ہے ——— ہاں تو کیوں نہیں"

"شاید تم اسے پسند نہیں کرتے؟"

اس نے نہایت خندہ پیشانی سے کہا "میں اسے ناپسند بھی کرتا ہوں لیکن اس میں خاص کشش بھی پاتا ہوں۔ صاحب میں سچ کیوں نہ کہوں میرے لئے وہ کمرہ اور ہیبت ایک چیز ہے۔ میں اسے خوفناک سمجھتا ہوں۔ لیکن میری محبوبہ شہزادی انڈراکوف کی موت میں ایک کشش ہے جو مجھے اس طرف کھینچتی ہے۔ میں نے کئی دفعہ وہاں جانا چاہا۔ لیکن دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں جس سے میں زیادہ ڈرتا ہوں۔ یہ امر واقع ہے، آگے جو نتیجہ آپ اخذ کرنا چاہیں کریں وہ آپ کی مرضی ہے"

میں نے کھڑے ہو کر فیصلہ کُن لہجہ میں کہا "تو آؤ پھر چلیں"

میری جلدی سے وہ کچھ ڈر سا گیا۔ لیکن چند لمحوں کے بعد وہ بھی کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا "اچھا"

جب ہم مکان پر پہنچے تو نوکر نے پوچھا کیا آپ واپس آ گئے ہیں؟ میں نے نفی میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ میں اور میرا ساتھی روسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، صرف ایک گھنٹے کے لئے آئے ہیں۔

ہم نے سیڑھیوں سے چڑھنا شروع کیا۔ مگر زینے کے قریب ڈراونسکی رکیا میں اسے اس نام سے پکار سکتا ہوں؟ کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔

"آخر ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"شاید تم ڈرتے ہو اور اس لئے چیخنا اور شور مچانا چاہتے ہو"

"پھر بھی معلوم تو ہو کہ ہم دو نوجوان اس طرح کیوں بیوقوف بن رہے ہیں"

"اچھا تو یہ تمہیں اندر چل کر بتاؤں گا"

میں نے دروازے کو چابی لگا کر کھولا اور اندر پہنچ کر گیس جلائی۔ اس کے بعد موم بتیاں ڈھونڈھ کر کمروں کو دیکھنا شروع کیا۔ ہر چیز بدستور پڑی ہوئی تھی۔ واپس آکر میں نے سگار سلگایا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تو کیا تمہیں معلوم نہیں کہ جہاں خوف اور پیچیدگی کا گزر ہو ——"

ڈرادلسکی کا جواب محض ایک قہقہہ تھا۔ اس نے بھی میری طرح سگار جلا کر کش لگانے شروع کئے۔

کیا ایسی جگہوں پر بھوت کا گذر ہو سکتا ہے؟ اس پر وہ ہنسا اور اس کی ہنسی ہی فوراً اس کے سوال کا جواب اثبات میں دے رہی تھی۔

"میرا خیال ہے جہاں کوئی خوفناک واقعہ ہو چکا ہو وہاں بھوت رہ سکتے ہیں اور اس جگہ ایسا واقعہ ہو چکا ہے۔"

"کیا تمہارا مطلب بیچارے گوانی کی موت سے ہے؟"

"ہاں اور شہزادی اندرا کوف کی موت سے بھی۔"

"اوہ شہزادی!"

"کیا محض ڈر کی وجہ سے مر جانے سے بھی کوئی ہستی زیادہ خوفناک ہو سکتی ہے۔"

"لیکن وہ تو اوروں کے لئے بھی خوفناک ہو سکتی ہے۔"

"اس کی گفتگو میں تلخی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھا سگار کے کش لگا رہا تھا اور میں ضرور کہوں گا کہ اس کا لہجہ مجھے کئی دفعہ پہلے بھی تلخ معلوم ہوا تھا شہزادی اس کی محسن تھی۔ اس لئے اس کا لہجہ مجھے عجیب معلوم ہوا۔ میں نے کہا لیکن تم تو شہزادی کے دوست تھے؟"

"بمشکل۔ اگرچہ اس نے مجھ پر اور میری والدہ پر چند ایک احسانات کئے تھے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اس کی باقی تمام کیوں کو نظر انداز کر دوں۔"

"یعنی؟"

"میں حیران ہوں ———— کہ اگر راز کا انکشاف کر دوں تو تمہاری میرے متعلق کیا رائے ہوگی۔ کیسی عجیب بات ہے کہ اس جگہ جہاں شہزادی کی موت ہوئی مجھ کو کوئی غیبی طاقت مجبور کر رہی ہے کہ میں سب کچھ کہہ دوں۔"

میں نے کہا۔ "تو کہہ دو۔"

"کیا تمہیں یاد ہے کہ میں نے بے مارڈی میں تم سے کہا تھا کہ کئی دفعہ خود قاتل بھی جائے قتل پر جائے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

"ہاں۔"

"تو میں نے بھی یہی کیا ہے۔"

تم! تم نے بھی یہی کیا ہے؟ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔

"ہاں، میں نے ہی شہزادی اندرا کوف کو قتل کیا تھا۔"

"میں نہایت اضطراب کی حالت میں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"لیکن ذرا ٹھہریئے، روسی نے فوراً ہی کہا۔ میرا ہتھیار صرف ایک چٹھی تھی۔"

"تمہارا مطلب؟"

میں نے اسے ایک چٹھی بھیجی جس میں لکھا تھا کہ شہزادی کی جائے پناہ معلوم ہو گئی ہے۔ یہی چٹھی شہزادی کی موت کا باعث ہوئی اور اسے میں نے ہی اس کے لیٹر بکس میں ڈالا تھا۔"

مجھے قدرے اطمینان ہوا اور میں کرسی پر دوبارہ آکر بیٹھ گیا۔

"کیا تم چاہتے تھے کہ شہزادی چٹھی کو دیکھ کر کسی اور جگہ بھاگ جائے۔"

"برعکس میں چاہتا تھا کہ وہ مر جائے۔"

"اس کی وجہ؟"

"اگر وہ مر نہ جاتی تو میں خود اپنے ہاتھوں سے اُسے قتل کر دیتا۔"

"اپنی محسن کو؟ —— اُس عورت کو جس نے تمہارے ساتھ ہمدردی کی تھی؟"

لیکن اس کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔ میں ایک [illegible] سوسائٹی کا ممبر تھا جس کے احکام کی تعمیل مجھ پر فرض تھی۔ شہزادی کا قتل میرے سپرد کیا جا چکا تھا۔"

"کیا تم اسی غرض سے روما آئے تھے۔"

"نہیں حالات کچھ ایسے تھے کہ روس چھوڑنا ہی میرے لئے بہتر تھا۔ اور چونکہ میں روما میں تھا اس لئے یہ معلوم ہونے پر کہ شہزادی یہاں ہے یہ کام میرے سپرد کیا گیا۔"

"کیا تمہیں نے شہزادی کے یہاں ہونے کی اطلاع ان کو دی تھی"۔

"نہیں —— تم میرے متعلق کیا رائے رکھتے ہو؟"

"میں تمہیں ایک دلیر آدمی سمجھتا ہوں"۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ تم واقعات سے آگاہ ہونے کے باوجود تم اس کمرے میں آئے ہوئے ہو۔"

"لیکن میں اکیلا نہیں ہوں۔"

"اس وقت کسی شیطانی ارادے نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس سے پوچھوں کہ

"کیا تم ایک رات یہاں اکیلے گذار سکتے ہو"؟

"مگر کس لئے؟"

"ایک انعامی شرط پر"۔ مجھے معلوم تھا کہ روسی غریب ہے اور وہ اس شرط کو مان لے گا۔ ضرور کوئی شیطانی ارادہ میرے اندر کام کر رہا تھا۔

"میں ایک ہزار روپیہ شرط لگاتا ہوں کہ تم ایسا نہ کرو گے"۔

"تم مذاق کر رہے ہو"۔

"نہیں میں صحیح کہتا ہوں کہ میں تمہیں ایک ہزار روپیہ دوں گا اگر تم یہاں ایک رات اکیلے گزار دو"۔

روسی دل میں سوچ رہا تھا۔

میں نے کہا "کل میں یہاں آؤں گا اور ہم دونوں یہیں ناشتہ کریں گے۔ بعد میں تمہاری شرط کا ایک ہزار روپیہ میں تمہیں دے دوں گا"۔

اس نے کہا "ایک شرط میری بھی ہے"۔

"وہ کیا ہے"؟

"کہ میں پیچھے کے کمرے میں نہ جاؤں گا"۔

"نہ جانا۔ یہ تمہاری اپنی مرضی ہے"۔

"تو پھر میں تمہاری شرط منظور کرتا ہوں"۔

"دیکھو خوب اچھی طرح سوچ لو۔ شاید اب بھی کوئی رکاوٹ ہو"۔

"حضرت مجھے تمہاری شرط قبول ہے۔ آخر زبان بھی کوئی چیز ہوتی ہے"۔

"اچھا۔ تو کل صبح میں کس وقت آؤں"؟

"جس وقت تم چاہو"۔

"کیا آٹھ بجے"؟ اور یہ کہہ کر میں جانے لگا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک دفعہ تمام کمرے دیکھنے گیا۔ جب ہم کھانے کے کمرے میں گئے تو کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے بند کرتے ہوئے دیکھا کہ سامنے کے میدان میں جہاں لوگ بائیسکل چلانا سیکھا کرتے تھے ایک شخص اندھیرے میں اکیلا کھڑا ہے اور شاید مکان کی طرف دیکھ رہا ہے ——— کون؟ اور کیوں؟ ——— خیر میں نے کھڑکی بند کر دی اور رخصت ہونے لگا۔

"کیا واقعی آج رات یہاں اکیلے ٹھہر رہے ہو"؟

"ہاں"۔

"شاید تم مذاق کر رہے ہو"؟

"نہیں۔ میں آج رات حقیقت میں یہاں ٹھہروں گا"۔

"اس کی آواز اس کے لفظوں کی طرح عجیب تھی۔ میں نے اسے شب بخیر کہا اور رخصت ہوا۔ راستے میں خود کو کوستا اور لعنت ملامت کرتا رہا کہ مجھے یہ شرط لگانے کی کیوں سوجھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس مردہ شہزادی کی روح ضرور وہاں رہتی ہے اور وہاں ضرور خطرہ ہے۔ میں اس امر کی تہ تک پہنچنا چاہتا تھا اور اسی وجہ سے شاید میں نے روسی طالب علم سے شرط لگائی تھی"۔

اس موقع پر ملازم پھر ہماری گاڑی میں آیا۔ اس نے کہا "جناب بارہ بج چکے ہیں۔ کیا میں بستر لگا دوں"؟ میرے ساتھی نے کہا کہ وہ کہانی تقریباً ختم کر چکا ہے۔ اس لئے میں نے نوکر کو کوئی پانچ منٹ بعد آنے کے لئے کہا۔ میرے ساتھی نے پھر کہنا شروع کیا۔

"صبح جب میں نمبیٹ پر گیا تو وہاں غیر معمولی خاموشی تھی۔ دروازے کے اندر قدم رکھتے ہی میں نے اونچی آواز میں پکارا:

"ڈراونسکی!" لیکن کوئی جواب نہ تھا۔

"میں نے ایک دفعہ اور آواز دی۔ لیکن جواب اب بھی ندارد تھا۔

"میں ہال کمرے میں گیا۔ وہ خالی تھا۔ بیٹھک اور خوابگاہ دیکھی وہ بھی خالی تھیں۔ غسل خانے اور باورچی خانے میں بھی کوئی نہ تھا۔

"ڈراونسکی!" میں پھر چلایا۔ لیکن اس دفعہ بھی کوئی جواب نہ ملنے پر مجھے کچھ شبہ سا ہوا۔ میں نوکروں کے کمرے کی طرف گیا اور دیکھا کہ وہ بند ہے۔ میں نے زور سے دھکا دے کر دروازہ کھولا۔ آہ! روسی چارپائی پر دروازہ کی طرف منہ کئے ہوئے لیٹا ہوا تھا۔ اس کے الجھے ہوئے بال اس کی گالوں پر آ پڑے تھے۔ میز پر موم بتی تقریباً جل چکی تھی۔ اس کا شعلہ ڈراونسکی کی آنکھوں میں چمک رہا تھا لیکن وہ ایک مردہ آنکھوں کی چمک تھی"۔

میرا ساتھی یہاں پر ٹھہر گیا۔

میں نے کہا۔ "کیا کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی"؟

اُس نے جواب دیا۔ "یاد رکھو یہ ایک سچی کہانی ہے۔ زندگی ایک ہوشیار ناول نویس نہیں جو اپنے تخیل سے باتیں گھڑ گھڑ کے لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے"۔

"مگر روسی اس کمرے میں کیوں گیا"؟

میں نے بھی اکثر اس کی نسبت سوچا ہے۔ شاید خوف کی کشش

اُسے وہاں لے گئی"۔

"پھر شاید تمہارا خیال ہے کہ وہاں کوئی بھوت ہے جو اُسے دکھائی دیا"۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں جو گوانی کے ساتھ ہوا وہی غالباً اُس کے ساتھ ہوا"۔

"میں نے کہا" مجھے تو اس کہانی میں عجیب ترین بات جلتی ہوئی موم بتیوں کی معلوم ہوتی ہے"۔

"ہاں موت کا پیغام لانے والی موم بتیاں! میری بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ پہلی موم بتی شاید میں نے ہی جلائی ہو، دوسری شاید کسی اور سے جلتی رہ گئی ہو۔ لیکن تیسری؟ تیسری موم بتی کا جلنا میری سمجھ سے بالکل باہر ہے۔ ایک شخص جسے میں نے یہ واقعہ سنایا کہتا تھا کہ یہ محض میری نظر کا دھوکا تھا۔ میں نے کہا میں نے اپنی آنکھوں سے کمرہ دیکھا تھا کمرے میں کوئی موم بتی نہ تھی وہ تاریک تھا جس پر اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نے موم بتی کو ہاتھ میں لے کر دیکھا تھا۔ میرے انکار پر اس نے کہا کہ بس پھر تو بالکل ہی ممکن ہے کہ تم نے غروبِ آفتاب کی ہلکی ہلکی روشنی میں جلتی ہوئی موم بتی کو جس کی ایسے وقت پر بہت ہی کم روشنی ہوا کرتی ہے نظر انداز کر دیا ہو۔ مجھے اس پر غصہ بھی آیا۔ کہ کیا میری آنکھیں اس بوڑھ بھی دھوکا کھا سکتی تھیں؟ لیکن اُس نے کہا کہ ہر ایک کی آنکھیں دھوکا کھا سکتی ہیں۔ اس کے ساتھ بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آ چکا تھا ایک دفعہ جب کہ وہ ایک دیہاتی مکان میں ٹھہرا ہوا تھا، شام کے وقت اس نے اپنے مطالعے کے کمرے میں خوب غور سے دیکھا کہ وہاں کوئی ہے تو نہیں کیونکہ وہ چند خطوط لکھنا چاہتا تھا اور اس کے لئے خلوت کی ضرورت تھی۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ مگر جب وہ بتی لے کر اس کمرے میں آیا تو اس کی ٹکر ایک مہمان سے ہوئی جو سرِ شام ہی سے گھر میں آیا تھا۔ اس شخص کو دیکھتے ہی اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اس کے تمام بدن میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ شام کے جھٹپٹے میں اُس نے آدمی کو نہ دیکھا تھا میرا مطلب یہ ہے کہ آنکھیں دھوکا کھا سکتی ہیں۔ میں اس کے خلاف کیا کہتا سوائے اس کے کہ شاید یہی بات ہو"۔

"میں نے کہا" تو پھر روسی کی موت کس وجہ سے ہوئی"؟

"گوانی کی طرح حرکتِ قلب بند ہو جانے سے! اس وقت سے اب تک میں کبھی اس فلیٹ میں نہیں گیا اور نہ اسے کسی نے کرائے پر لیا، کیونکہ لوگ اس کے متعلق طرح طرح کی روایات بیان کرتے ہیں۔ اور کسی کو جرأت نہیں ہوتی کہ وہاں رہے۔ میں بھی جب وہاں گیا تھا تو مالک نے مجھے نہایت غور سے دیکھا تھا کہ آیا میں ان تمام روایات سے ناواقف تھا یا اپنے کو غیر معمولی طور پر دلیر تصور کرتا تھا"۔

"درست۔ لیکن اس شخص کے متعلق جو اندھیرے میں مخالط خیال سے مکان کو تاک رہا تھا تمہاری کیا رائے ہے"؟

"ہاں میں نے اس کو کئی دفعہ سوچا ہے۔ شاید ڈرانسکی کی خفیہ سوسائٹی کا کوئی دوسرا ممبر جو اس سے ناراض تھا اور وہاں کھڑا تھا دیکھ رہا تھا کہ آج ڈرانسکی اکیلا ہوگا اور اس سے بدلا لینا آسان ہے۔ ہس نے آکر اُسے ڈرایا دھمکایا ہوگا اور جذبات کے جوش میں شاید ڈرانسکی کی موت واقع ہو گئی ہوگی۔ کچھ بھی ہو یہ میری سمجھ سے بعید ہے اور میں کسی طرح بھی اس کا حل نہیں کر سکتا"۔

"لیکن کیا تم اس کے خلاف یہ بھی مانتے ہو۔ شاید کمرے میں بھوت ہوں؟"

"ہاں ممکن ہے کہ میں غلطی پر ہوں"۔

اس نے سگار کا ٹکڑا کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

اس کے بعد نوکر پھر آیا تاکہ بسنر بچھا دے اور اس دفعہ ہم نے اسے ایسا کرنے دیا۔

(ترجمہ از رابرٹ ہچنز)

مقبول الٰہی

بہارستان

نسیمِ جاں فزا چلی، عذارِ گل دمک اُٹھے
گلوں کی عطر بیزیوں سے بوستاں مہک اُٹھے

طرب کے جوش میں ہر ایک نخل جھومنے لگا
ہر ایک پھول بڑھ کے منہ کلی کا چومنے لگا

نہال جھومتے ہیں یا روش روش پہ مست ہیں
کھلے ہیں پھول، میگسار با قدح بدست ہیں

بجا رہا ہے برگ برگ شاد ہو کے تالیاں
وفور ہے نشاط کا کہ رقص میں ہیں ڈالیاں

جدھر نظر اُٹھائیے اِدھر، اُدھر، یہاں، وہاں
سرور میں طیور شاخ شاخ پر ہیں نغمہ خواں

طیور شاخ شاخ پر ہیں نغمہ ریز پے بہ پے
ہر ایک نخل جنتِ نظر بہشتِ گوش ہے

چکور، مور، قمریاں، ہزار، سار، فاختہ
ہر ایک مستیِ مئے طرب سے ہوش باختہ

یہ مور ہیں کہ رقص میں ہیں شاہدانِ ذوفنوں
صدائے آبشار ہے کہ بج رہا ہے ارغنوں

نوائے فاختہ ہے اک طرف فرازِ سروِ جو
ہے ایک سمت کویلوں کی آم پر کہو کہو

پپیہے کا لہک لہک کے "پی کہاں" پکارنا
سیہ گھٹا سے مست ہو کے مور کا جھنگارنا

پھوار پڑ رہی ہے اور وہ کھڑے ہیں صحن میں
ملار گنگنا رہے ہیں نرم نرم لحن میں

ڈھلک گئی ہے اوڑھنی کھلا ہوا ہی نصف سر
ہیں قطرہ ہائے آب کچھ جبیں پہ کچھ عذار پر

وہ ابر کی بہار دیکھتے ہیں اور میں انہیں
یہ کیف ہے کہ بوجھ آ چلا ہے میری سانس میں

(وامق شادانی)

غزل

مجاز ہی کو حقیقت بنائے جاتے ہیں
وہ ہیں کہ سارے زمانے پہ چھائے جاتے ہیں

عجیب شان سے جلوے دکھائے جاتے ہیں
مجھی سے چھپ کے، مجھی میں سمائے جاتے ہیں

مشاہدات کی دُنیا بسائے جاتے ہیں
تحیّرات کے سکّے بٹھائے جاتے ہیں

تجلیوں کے فسانے سنائے جاتے ہیں
خموش ہیں وہ، مگر مُسکرائے جاتے ہیں

وہ دُور رہ کے مرے پاس آئے جاتے ہیں
نہ جانے کونسا عالم دکھائے جاتے ہیں

طرح طرح سے مجھے آزمائے جاتے ہیں
وہ روز ایک نیا گل کھلائے جاتے ہیں

نہیں ہیں دامنِ گل پر یہ اوس کے قطرے
سحر کا وقت ہے موتی لٹائے جاتے ہیں

رکھا گیا ہے انھی کا لقب مہ و خورشید
تری نگاہ کے کچھ نقش پائے جاتے ہیں

خدا کرے کہ نہ کم ہو بہارِ میخانہ
یہ بزم وہ ہے جہاں بن بلائے جاتے ہیں

فسانہ اُن کی نگاہوں کا کیا کہوں ماہر
ابھی وہ تیر کلیجے میں پائے جاتے ہیں

ماہر القادری

زندہ چراغ

بہت سے جانور روشنی پیدا کرتے ہیں۔ لیکن اس کا مشاہدہ شاذ و نادر ہی کیا جاتا ہے۔ بہت سی چیزیں جب خاص حالات میں رکھی جاتی ہیں تو جگمگانے لگتی ہیں اور ان سے روشنی نکلنے لگتی ہے لیکن بہت سے جانور اور بوٹیاں ہر وقت روشنی دیتے ہیں۔

گرم ممالک میں رات کو اکثر سمندر کی سطح پر کبودی روشنی پھیل جاتی ہے اور لہروں کے کنارے اس طرح چمکنے لگتے ہیں گویا ان پر چھوٹے چھوٹے ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔ یہ خوبصورت اور دلکش روشنی جو سمندر پر ہر چہار اطراف میں ایک نورانی پردے کی طرح پھیل جاتی ہے جگمگاہٹ کی عام قسم ہے اور ان چھوٹے چھوٹے بیشمار جانداروں سے پیدا ہوتی ہے۔ جنہیں حکمانے "ناکٹی لوکا" یا "شب تاب" کا نام دے رکھا ہے۔ اس عجیب الخلقت مخلوق کا قطر ایک انچ کا بیسواں حصہ ہوتا ہے۔ اور یہ بہ کثرت سواحل کے پانی میں پائی جاتی ہے۔

یہ کیڑے اتنے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ کہ ہر کیڑا ایک داغ کی طرح نظر آتا ہے۔ ان کی شکل بالکل مدور ہوتی ہے۔ اور ان کے جسم میں ایک باریک دُم لگی ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ تیرتے رہتے ہیں۔ اگر ہم ان کے بدن میں سوئی چبھوئیں تو فوراً روشنی نظر آنے لگتی ہے، اور اگر ان کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو روشنی وقفوں کے بعد نظر آتی ہے۔ مرنے سے کچھ عرصہ قبل "ناکٹی لوکا" متواتر روشنی دینے لگتا ہے اور اس کی جگمگاہٹ اس کی زندگی ختم ہونے کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔

"ناکٹی لوکا" کی جگمگاہٹ کا امتحان لینے کے لئے کئی ایک دلچسپ تجربات کئے گئے ہیں۔ ایک دفعہ بہت سے کیڑے ایک شفاف پیالے میں بند کر دیئے گئے اور پیالے کو چراغ کی طرح استعمال کیا گیا۔ روشنی اتنی کافی تھی کہ اس کی مدد سے کتابوں کا مطالعہ کیا جا سکتا تھا اگر سمندر کے ایسے پانی کو ایک پیالے میں ڈال دیا جائے جس میں یہ کیڑے کافی تعداد میں موجود ہوں اور دوربین کی مدد سے دیکھا جائے تو بہت سے مدور اجسام ایک دُم کی مدد سے اِدھر اُدھر تیرتے نظر آئیں گے ان کے تمام جسم سے روشنی نکلتی ہے۔ لیکن خاص مقامات سے نسبتاً زیادہ روشنی نکلتی ہے، اگر ان مقامات کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ بہت سے ایسے چھوٹے چھوٹے نقاط سے مرکب ہوتے ہیں جن سے کم روشنی نکلتی ہے۔

دیگر روشن اجسام کے علی الرغم یہ جگمگاہٹ حرارت پیدا نہیں کرتی۔ چنانچہ تجربہ کر کے دیکھا گیا ہے کہ حساس ترین مقیاس الحرارت بھی اس سے متاثر نہیں ہوتا۔ یہ روشنی کسی چیز کے جلنے سے بھی پیدا نہیں ہوتی۔ کیونکہ جب ان کیڑوں کے مردہ اجسام میں آکسیجن گیس کو داخل کر کے دیکھا گیا تو پھر روشنی پیدا نہیں ہوئی۔

'میڈوسے' ایک قسم کی مچھلی ہے۔ اس قسم کی اکثر مچھلیاں رات کو جگمگانے لگتی ہیں اور ان کی پر اسرار جگمگاہٹ سے سمندر روشن ہو جاتا ہے۔

"ناکٹی لوکا" کے روشنی دینے کے اسباب معلوم نہیں ہو سکے۔ البتہ یہ ضرور دیکھا گیا ہے کہ کسی وقت روشنی زیادہ ہوتی ہے اور کسی وقت کم۔ سخت گرمی کے موسم میں "ناکٹی لوکا" بہت چمکتا ہے اور پھر سخت سردیوں اور کہر کے موسم میں بھی اس کی روشنی بہت بڑھ جاتی ہے۔ ناکٹی لوکا کی روشنی کا بالوضاحت مطالعہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ رات کافی تاریک ہو اور چاند نہ نکلا ہوا ہو۔

ایک اور قابل غور روشنی، سمندر میں "شعلۂ آتشین" یا 'پائرو سما' سے پیدا ہوتی ہے۔ ہر ایک 'پائرو سما' بے شمار چھوٹے چھوٹے کیڑوں سے مرکب ہوتا ہے۔ جو پہلو بہ پہلو ایک دوسرے سے پیوست ہو کر دو سے لے کر چودہ انچ تک طویل اور آدھ سے تین انچ تک محیط کا بیلن بنا لیتے ہیں۔

رات کو یہ کیڑے بہت جگمگاتے ہیں - اور ان سے سبزی مائل نیگوں روشنی نکلتی ہے - ہر ایک کیڑا چھوٹا سا لو ہے کا روشن بیلن معلوم ہوتا ہے ان کا علمی نام بھی ان کی روشنی کی وجہ سے رکھا گیا ہے - کیونکہ یونانی میں 'پائرو' کے معنی آگ کے ہیں، اور 'سما' کے معنی بیلن ہیں +

ان کیڑوں کی روشنی وقفوں کے بعد ظاہر ہوتی ہے، اور روشنی کے لئے لہروں کی ضرب کی ضرورت ہوتی ہے - اگر 'شعلہ پاشیں' کو مصنوعی جوہڑ میں رکھا جائے تو روشنی کچھ عرصے کے بعد معدوم ہو جاتی ہے - مشاہدہ کرنے پر معلوم ہوا ہے - کہ کیڑوں کا ہر ایک اجتماع ایک نلکی کی صورت میں ہوتا ہے، اور ہر ایک کیڑے کے بدن پر دو نقاط ایسے ہوتے ہیں جو ہیرے کی طرح چمکتے ہیں - ان نقطوں میں چھپڑی اور نعل کی شکل کے چھوٹے چھوٹے ذرّے ہوتے ہیں +

سمندر پر چمکنے والی ان روشنیوں کے علاوہ، قدرت نے اور بھی کئی روشنیاں پیدا کی ہیں جو سمندر کی تہ کو روشن کرتی ہیں اور ان تاریک گہرائیوں کو منور کر دیتی ہیں جن کو ازل سے سورج کی شعاعوں نے جھانکا تک نہیں +

حال ہی میں پروفیسر ای - نیوٹن ہروے نے دو روشن مچھلیوں کا مشاہدہ کیا ہے، جن کو 'اینامیب' اور 'فوٹو بلی فیران' کہا جاتا ہے - یہ مچھلیاں جزائر باندا کے سواحل کے قریب ملتی ہیں - ان کے دو لمبے لمبے عضو ہوتے ہیں - جن سے شب و روز مسلسل روشنی نکلتی رہتی ہے، اور بغیر کسی بیرونی لمس یا ضرب کے یہ روشنی قائم رہتی ہے دوسری روشن مچھلیاں اس کے برخلاف لہروں کی ضرب سے یہ روشنی دیتی ہیں کیونکہ اس ضرب سے ان کے جسم کی مخصوص گلٹیاں ایک خاص قسم کا لعاب پیدا کرتی ہیں جو روشن عملی روشنی کا مواد بہم پہنچاتے ہیں ان کے ساتھ محدب شیشے کی طرح جھلی لگی ہوتی ہے جو روشنی کو وضاحت سے ظاہر کرتی ہے اس روشن عضو کی شکل آنکھ کی طرح ہوتی ہے اگرچہ روشنی پیدا کرنے اور روشنی دیکھنے کے عمل میں بہت فرق ہے +

بکٹیریا کی بھی ایک ایسی قسم ہے جو مردہ مچھلیوں کو اندھیرے میں روشن کر دیتے ہیں - پروفیسر نیوٹن ہروے نے معلوم کیا تھا کہ اگر روشن مچھلی کے اعضا کو سکھا کر بھگویا جائے تو ان میں سے ایک مدھم سی روشنی نکلتی ہے - یہی حال اس بکٹیریا کا بھی ہے - اس بکٹیریا کی روشنی ان مسموم اشیا سے بھی متاثر ہوتی ہے جو روشن مچھلیوں کی روشنی کو کم کر دیتے ہیں یا بالکل بجھا دیتے ہیں - یہ بکٹیریا باندا کی مچھلیوں کے جسم پر پرورش پاتا ہے اور انہیں سے اپنی خوراک حاصل کرتا ہے -

بہت سے ماہرین سائنس کا خیال ہے کہ یہ بکٹیریا اپنی روشنی مچھلی کی روشنی سے مستعار لیتا ہے لیکن حال ہی میں پروفیسر کمبز نے تحقیق کر کے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچا دیا کہ اس بکٹیریا کی روشنی کا ماخذ علیحدہ ہے - کیونکہ روشن بکٹیریا متواتر روشنی منتشر کرتا رہتا ہے لیکن اس کے برخلاف مچھلی کی روشنی وقفوں کے بعد نظر آتی ہے - مگر یہ بھی ممکن ہے کہ مچھلی کی روشنی کا وفور و فقدان روشنی میں وقفے پیدا کرتا رہتا ہو +

بگلوں کی ایک ایسی قسم بھی ہوتی ہے جن کی چھاتی سے روشنی نکلتی رہتی ہے - کئی ایک شکاریوں نے ان بگلوں کو دیکھا ہے اور ان کی چھاتی سے تیز روشنی نکلتی دیکھی ہے - خیال کیا جاتا ہے کہ یہ روشنی مچھلی کے لئے جاذبیت رکھتی ہے اور بگلے کو اپنا کھانا حاصل کرنے میں مدد دیتی ہے +

جن علاقوں میں مینڈک کافی تعداد میں ہوتے ہیں اکثر ان کے انڈوں سے روشنی نکلتی دیکھی گئی ہے - یہ روشنی انڈے کے خول سے نکل کر آتی ہے +

سمندر کی روشنیوں کے علاوہ فطرت نے خشکی پر بھی ایسے چراغ پیدا کئے ہیں جو اندھیرے میں اجالا کرتے رہتے ہیں ان میں سب سے زیادہ معروف جگنو ہے - دن کو یہ کیڑے بالکل بے نور ہوتے ہیں لیکن رات کو چمکتے ہیں ان کی روشنی چند چھوٹے چھوٹے ایسے ذرات سے مرکب ہوتی ہے جو ان کے پیٹ کے حصوں میں جمع ہو جاتے ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ بے پر مادہ کی روشنی پر دار نر کی بہ نسبت بہت زیادہ ہوتی ہے +

ہزار پا کی بھی ایک ایسی قسم ہوتی ہے جو روشنی پیدا کرتی ہے - جب یہ رینگتی ہے تو اپنے پیچھے روشنی کی ایک لکیر چھوڑتی جاتی ہے - یہ لکیر ایک روشن لعاب کی وجہ سے ہوتی ہے - جو اس کے پیٹ سے نکلتا رہتا ہے +

رات کو اڑنے والے کئی ایک پروانوں کی آنکھیں بہت روشن ہوتی ہیں اور ان کی روشنی بالخصوص اس وقت زیادہ ہوتی ہے جب وہ غصے میں آجاتے ہیں یا کسی اور طرح تنگ ہوتے ہیں +

نباتات کی دنیا میں بھی اس روشنی کا وجود پایا جاتا ہے کئی ایک پودوں سے روشنی نکلتی ہے، سورج مکھی، سرخ پوست اور میری گولڈ کے پھولوں کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ان سے روشنی نکلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے - بعض دفعہ تاریک مطلع میں آلو چمکنے لگتا ہے اور اکثر اس سے ڈر کر خائف ہو جاتے ہیں +

زمانہ قدیم میں جنوں اور پریوں کے عام قصے مشہور تھے اور رات کو چمکنے والی روشنیوں کو اکثر ان کے وجود پر محمول کیا جاتا تھا - لیکن حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں ہزارہا قسم کے ایسے کیڑوں کا وجود ہے - جو جنگلوں، قبرستانوں اور غاروں میں چمکا کرتے ہیں - اور توہم پرست لوگوں کے لئے خوف کا باعث بن جاتے ہیں، کاش ہم اسرار فطرت کو زیادہ عمیق نظر سے دیکھنے کے عادی ہوتے +

نسیم رضوانی

تجلیات

سمجھے وہی کہ کیوں نہیں اکبر کو گھر عزیز
جس سے جدا ہوا ہو کوئی فتنہ گر عزیز

اُن کے بغیر چارۂ دردِ جگر غلط
لائیں اُنہیں اگر ہیں مرے چارہ گر عزیز

ناصح رہِ وفا میں ہے کیا جان و دل کا ذکر
ناداں ہے جان و دل سے کوئی بیشتر عزیز

جب اس کو ان کی شوخ نگاہی سے ربط ہے
درماں سے ہے سوا مجھے دردِ جگر عزیز

ناکامیابیاں ہیں مجھے کامیابیاں
ناکامیابیوں کا مری غم نہ کر عزیز

کیا جانیئے کہ کیوں ہوا دل ان کا مبتلا
کیا جانیئے کہ کیوں وہ ہوئے اس قدر عزیز

حالانکہ ان کی خوئے وفا ناشناس سے
ہیں شکوہ سنج دوست اِدھر اور اُدھر عزیز

اس رنگ سے گزار دی اکبرؔ نے زندگی
روتے اِدھر ہیں لاش پہ دشمن اُدھر عزیز

جلال الدین اکبر

دریا پر

پچھلی گرمیوں میں میں نے ، پیرس سے کئی میل دور ، دریائے سین کے کنارے ایک شہری وضع کا مکان کرائے پر لیا ، میں ہر روز وہاں رات بسر کرنے کی خاطر جایا کرتا تھا - کچھ عرصے کے بعد میں نے اپنے ایک ہمسائے سے دوستی پیدا کر لی - میرا ہمسایہ عمر میں تیس چالیس سال کے درمیان ہوگا - اور جتنے آدمیوں سے میں نے اب تک رابطہ پیدا کر رکھا تھا ان سب میں سے وہ عجیب ترین فطرت کا مالک تھا - وہ ایک بوڑھا کشتی بان تھا اور کشتیوں کے موضوع پر گفتگو کرنے کا دلدادہ تھا - وہ ہمیشہ دریا کے اندر یا باہر یا آس پاس رہا کرتا تھا ......

...... وہ کشتی ہی میں پیدا ہوا ہوگا - اور کشتی ہی میں سفر کرتے وہ ایک دن چل بسے گا ! ◆

ایک شام ، جب کہ ہم دونوں دریا کے کنارے کنارے چل رہے تھے میں نے اس سے کہا " کیا آپ اپنا کوئی بحری تجربہ مجھ سے بیان کر سکتے ہیں ؟ " اچانک اس کا چہرہ سرخ ہوگیا اور اس پر فصیح شاعروں کی سی کیفیت طاری ہوگئی - اس وقت یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے دل سے دریا کی گہری والہانہ اور بے پایاں محبت چھلک پڑی ہے - اس نے کہا -

" آہ اس دریا کے متعلق جو ہمارے پاؤں میں بہ رہا ہے مجھے بہت سی باتیں یاد ہیں - تم گلیوں کے رہنے والوں کو کیا معلوم کہ دریا حقیقت میں کیا چیز ہے ؟ مگر ماہی گیر اسے ایک سربستہ راز ، ایک سرابستان ، اور ایک دنیائے خیال سمجھتا ہے ، جہاں عجیب و غریب مناظر ، جن کا حقیقتہً کوئی وجود نہیں ، رات کے عمل میں نمودار ہوتے ہیں اور دلربا آوازیں سنائی دیتی ہیں ―――― جہاں آدمی بے سبب کانپنے لگ جاتا ہے ، جیسے قبرستان میں سے گذر رہا ہو ! اور دریا فی الحقیقت ایک دہشت انگیز قبرستان ہے جس کا کوئی دروازہ نہ ہو ◆

" ماہی گیر کی نظر ...... محدود معلوم ہوتی ہے ، مگر دریا رات کی تاریکیوں میں اسے لامحدود دکھائی دیتا ہے - ایک ملاح سمندر کے متعلق ایسا خیال نہیں کر سکتا - سمندر اکثر بے رحم ہوتا ہے - وہ شور مچاتا ہے اور جھاگ پیدا کرتا ہے - مگر دریا خاموش اور مکار ہے - یہ چپکے چپکے بہتا رہتا ہے ―――― بغیر شور مچائے ―――― اور میرے لئے اس کی دائمی پرسکوت روانی بڑی بڑی موجوں سے زیادہ خوفناک ہے ◆

اوہام پرستوں کا خیال ہے کہ سمندر کی اتھاہ گہرائیاں سرسبز و شاداب زمینوں کو چھپائے ہوئے ہیں - جہاں ڈوبے ہوئے انسان بڑی بڑی مچھلیوں کے ساتھ عجیب و غریب جنگلوں اور غاروں میں غائب ہو جاتے ہیں - مگر دریا کی گہرائیاں بہت پست ہیں ، جہاں مردہ اجسام جا کر گل سڑ جاتے ہیں - لیکن بخلاف سمندر کی خیالی دلفریب بہشتوں کے جب دریا کی سطح پر سورج کی سنہری کرنیں کھیلتی ہیں تو دلکش منظر پیدا کرتی ہیں ، اور جب پانی خراماں خراماں کناروں سے ٹکراتا ہے ، جہاں سرکنڈے سرسراہٹ پیدا کر رہے ہوں تو ایک سامعہ نواز نغمہ پیدا کرتا ہے ◆

" ہاں مجھے یقین ہے کہ وہ دھیمی دھیمی پاکیزہ آوازیں جو نازک اندام سرکنڈے ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر پیدا کرتے ہیں ان ہوشربا مناظر سے زیادہ خوفناک ہیں جو محشر خیز موجیں پیش کرتی ہیں ◆

" مگر تم نے مجھے کوئی آپ بیتی بیان کرنے کے لئے کہا ہے - میں تمہیں ایک ایسی مہم کا حال سناؤں گا ، جو دس سال قبل مجھے پیش آئی ◆

" میں اب کی طرح اس وقت بھی بوڑھی لافن کے گھر میں رہا کرتا تھا - دوستوں میں سے میرا بہترین دوست ، لوئی برنٹ ، جو ایک خوش مذاق کونسلر تھا ، میرے قریب ہی ایک گاؤں میں اقامت گزیں تھا ―――― دو میل کے فاصلے پر ، ہم روز اکٹھے کھانا کھایا کرتے تھے - کبھی اُس کے گھر کبھی اپنے ہاں -

"ایک شام جب میں تکان سے چُور ہو کر اکیلا گھر کی طرف آ رہا تھا، اور اُس دس فٹ لمبی کشتی کو جس پر میں ہمیشہ رات کے وقت آیا جایا کرتا تھا، کشاں کشاں لئے جا رہا تھا تو آرام کی خاطر میں سرکنڈوں سے گھرے ہوئے ایک مقام پر، جو ریلوے اسٹیشن سے دو سو گز کے فاصلے پر ہو گا ٹھہر گیا۔ موسم نہایت روح افزا اور خوشگوار تھا؛ چاند پوری تابانی کے ساتھ چمک رہا تھا اور ہوا ساکت تھی۔ گرد و پیش کی پُر سکوت فضا کو محسوس کرتے ہوئے میں نے چاہا کہ یہاں ٹھہر کر سگرٹ سے لطف اندوز ہونا چاہیئے۔ یہ خیال آیا ہی تھا کہ میں نے لنگر پکڑ کر کشتی سے نیچے گرا دیا۔ کشتی جو دریا کی روانی کے ساتھ ساتھ چل پڑی تھی فوراً ٹھہر گئی اور میں آرام سے ایک غالیچے پر دراز ہو گیا۔ اس وقت نہ کوئی آواز سنائی دیتی تھی۔ نہ کسی قسم کی کوئی حرکت محسوس ہوتی تھی۔ ہاں کبھی کبھی پانی کی بے معلوم کشاکش سن سکتا تھا اور سرکنڈوں کی چوٹیوں کو جو ہلتے وقت مختلف شکلیں اختیار کر لیتے تھے، ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔"

"دریا بالکل خاموش تھا، مگر میں فضا کے غیر معمولی سکوت سے متاثر ہو رہا تھا۔ مینڈک اور رات کو ٹر ٹر کرنے والے دوسرے جانور نیند کے مزے لے رہے۔ اچانک میرے بائیں طرف ایک مینڈک چلانے لگا۔ میں نے اسے ڈرایا اور فضا پر پھر سکوت چھا گیا۔ اس کے بعد میں نے دل کی بے چینی دُور کرنے کے لئے سگریٹ سلگانے کا ارادہ کیا۔ اگرچہ میں سگریٹ پینے کا بڑا عادی تھا، مگر اُس وقت کوئی لطف نہ اُٹھا سکا اور چند کش لگانے کے بعد بیزار ہو گیا۔ اس کے بعد میں کچھ گنگنانے لگا۔ مگر میری آواز بھرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔"

"آخر کار میں کشتی میں لیٹ گیا اور میں نے آسمان کی طرف نگاہ جما دی۔ کچھ عرصہ میں مطمئن پڑا رہا، مگر کشتی اچانک کسی چیز سے ٹکرائی اور میں چونک پڑا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں آگے، پیچھے اور دریا کے اس جانب سے اُس جانب جُھلایا جا رہا ہوں اور کوئی مخفی طاقت یا جاندار چیز کشتی کو آہستہ آہستہ کبھی نیچے کھینچ لیتی ہے اور کبھی اوپر لے جاتی ہے۔ میں ایک طوفان زدہ آدمی کی طرح کبھی اس طرف کبھی اُس طرف ہچکولے کھا رہا تھا۔ مجھے اس وقت عجیب و غریب آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں کھڑا ہو گیا۔ پانی چمک رہا تھا اور بالکل ساکن تھا۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ میرے تن بدن میں خفیف سی جنبش پیدا ہو رہی ہے۔ میں نے وہاں سے چل دینے کا قصد کیا اور زنجیر کو کھینچا۔ لنگر اوپر آنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تہ میں کسی بوجھل چیز سے اٹک کر وہیں جم گیا ہے۔ میں نے پُوری قوت کے ساتھ کھینچا مگر بے سُود! اب میں نے چپوؤں کے ذریعے سے کشتی کو اِدھر اُدھر کرنا شروع کیا تاکہ وہ دریا کی رَو کی سمت چل سکے۔ مگر یہ کوشش بھی بیکار گئی۔ لنگر اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ غصے میں آ کر میں زنجیر کو زور زور سے ہلانے لگا۔ مگر وہ ذرہ برابر بھی نہ سرکی۔"

میں اس مصیبت پر بیٹھا دیر تک غور کرتا رہا۔ یہ ناممکن تھا کہ زنجیر توڑ کر کشتی سے علیحدہ کر دی جائے، کیونکہ وہ ایک بھاری لٹھے سی بندھی ہوئی تھی، موسم خوشگوار تھا۔ میں کسی ماہی گیر کا انتظار کرتا رہا۔ اپنی ناکامی سے میں اس قدر مرعوب ہو چکا تھا کہ خاموشی سے اپنی جگہ پر جما رہا اور سگریٹ پیتا رہا۔ میرے پاس شراب کی ایک بوتل تھی میں نے اس میں سے تین گلاس پیئے اور اپنی بے بسی پر ہنسنے لگا۔ میں شراب سے اسقدر گرم ہو چکا تھا کہ اگر ساری رات مجھے باہر رہنا پڑتا تو میں سردی بالکل محسوس نہ کرتا۔"

اچانک کوئی چیز کشتی کے پاس سے کھڑکھڑاتی ہوئی گذری۔ میں چونک پڑا۔ میرا جسم سر سے پاؤں تک پسینے میں شرابور ہو گیا۔ یہ آواز ایک گٹھے سے آ رہی تھی جو پانی کی رو کے ساتھ بہا چلا جا رہا تھا۔ اس آواز نے میرے دماغ میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی۔ ایک دفعہ پھر میں نے زنجیر کو پکڑا اور پُوری قوت کے ساتھ اوپر کھینچنے لگا۔ میں نے اپنے جسم میں عجیب سی کمزوری محسوس کی...... لنگر اسی طرح جما پڑا تھا میں تھک کر بیٹھ گیا۔

"اسی اثنا میں دریا کے آس پاس کی سفید دھند آہستہ آہستہ اس کی سطح پر چھانے لگی، اور جب میں اُٹھا تو نہ پانی، نہ میرے پاؤں، اور نہ کشتی مجھے دکھائی دیتی تھی۔ میں صرف سرکنڈوں کی مبہم سی چوٹیاں وادی، جو چاند کی سیمیں روشنی میں سفید ہو رہی تھی اور جس میں فلک بوس چنار کے درخت بڑے بڑے سیاہ دھبوں کے مانند معلوم ہو رہے تھے دیکھ سکتا تھا۔ میں دھند میں اس طرح ملفوف تھا جس طرح کوئی ایک عجیب سے سفید روؤاں دار کمبل میں لپٹا ہوا ہو۔ میرے سامنے ہر قسم کے خیالی مناظر نمودار ہو رہے تھے۔ مجھے یُوں محسوس ہوا۔ جیسے کوئی کشتی

میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے اور گہری دھند سے ملفوف پانی میں ہر قسم کی دہشتناک مخلوق میرا گھیرا کئے ہوئے ہے۔ میرا حوصلہ پست ہوگیا۔ میرا دل وحشتناک انداز سے دھڑکنے لگا —— جیسے بے قابو ہو چلا ہو! اب میں نے ارادہ کیا کہ تیر کر صحیح سلامت کنارے پر پہنچ جاؤں۔ مگر اس خیال سے میں اچانک خوفزدہ ہوگیا.......... میں نے اپنے آپکو گہری دھند میں گھرا ہوا۔ سرکنڈوں اور آبی جانوروں میں بے مقصد پھرتے پایا۔ اس وقت نہ مجھے دریا کا کنارہ اور نہ کشتی دکھائی دیتی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میرے پاؤں اکھڑ گئے ہیں اور میں سیاہ پانیوں کی تہ میں غائب ہوا جا رہا ہوں ✦

میں نے اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کی اور ارادہ کیا کہ اب کبھی نہیں ڈروں گا۔ مگر میری قوتِ ارادی کے علاوہ مجھ میں کوئی حوصلہ شکن مخفی طاقت تھی جو اس وقت مجھے بے حوصلہ کر رہی تھی۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ وہ کونسی چیز ہے جس سے میں ڈر رہا ہوں؟ مگر میرا حوصلہ ٹھنڈا پڑ گیا اور اس کی جگہ بزدلی، جبن، اور بے حوصلگی نے لے لی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی حوصلے اور بزدلی کی ایک دوسرے پر فتح پانے کیلئے ایسی کشمکش نہ دیکھی تھی۔ مگر آج میں نے اس کشمکش کا اچھی طرح تجربہ کر لیا۔ میرا خوف ہر لحظہ بڑھتا گیا۔ اور اب میں اس سے قطعی طور پر مغلوب ہو چکا تھا۔ میں بے حس و حرکت، آنکھیں کھولے، کان کھڑے کئے بیٹھا رہا —— کس لئے؟ میں صحیح طور پر بتانے سے قاصر ہوں۔ مگر غالباً کسی دہشتناک واقعے کیلئے......!

آخرکار میں نے اپنے حواس کو حوصلے کی مضبوط گرفت میں جکڑ لیا اور شراب کی بوتل کو لبوں تک لانے کے لئے اٹھایا ✦

'اچانک میں اپنی انتہائی آواز کے ساتھ، باری باری چاروں جانب منہ کر کرکے چلانے لگا۔ جب میرا حلق پورے طور پر خشک ہوگیا میں نے اپنی وحشت زدہ آواز بند کرکے سننا شروع کیا۔ دُور فاصلے پر ایک کتا بھونک رہا تھا ✦

میں نے اور شراب پی، اور کشتی کے پیندے پر دراز ہوگیا۔ میں بے خوابی کی حالت میں ایک یا شاید دو گھنٹے، آنکھیں کھولے پڑا رہا۔ اس وقت میں بیداری کی حالت میں بھی متوحش خواب دیکھ رہا تھا۔ میں اٹھ بیٹھنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ گو میں دل سے ایسا کرنا چاہتا تھا۔ مگر اپنے ارادے کو ایک سے دوسرے منٹ پر رکتے ہوئے ملتوی کرتا رہا کہ اب ضرور اٹھ بیٹھوں گا۔ بالآخر میں نے اپنے آپ کو بڑی احتیاط کے ساتھ سنبھالا۔ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میری زندگی کسی خفیف ترین آواز پر منحصر ہے جو میں نکالوں۔ میں کشتی کی ایک طرف کو جھکا۔ اور عجیب و غریب، دلفریب اور محیر العقول مناظر نے میرا استقبال کیا..........

میرے سامنے اس وقت پریوں کی ایک سرزمین تھی جو دور دراز ممالک میں سفر کرنے والے مسافر بیان کرتے ہیں اور جسے ہم ناقابلِ تسلیم سمجھتے ہیں ✦

" دھند جو دو گھنٹے قبل پانی پر چھائی ہوئی تھی اب چھٹ کر دریا کے کناروں پر پہنچ چکی تھی اور اس چھ سات گز اونچی مسلسل پہاڑی کی طرح معلوم ہوتی تھی جس کی برف چاندنی میں خیرہ کن روشنی کے ساتھ چمک رہی ہو۔ اس وقت صرف دو سفید پہاڑیوں کے درمیان ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا اور چودھویں رات کا چاند جو نیلگوں آسمان کو منور کر رہا تھا، نظر آ رہے تھے "

" آبی جانور تمام کے تمام بیدار ہو چکے تھے۔ مینڈک بھیانک آواز سے ٹرا رہے تھے۔ اب میرے دل سے خوف و ہراس اڑ چکا تھا۔

میں یہ اندازہ لگانے سے قاصر ہوں کہ یہ کیفیت کتنا عرصہ رہی کیونکہ بالآخر مجھ پر نیم خوابی سے گہری نیند طاری ہوگئی تھی۔ جب میں جاگا چاند غائب ہو چکا تھا اور آسمان بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ پانی خوفناک طریق سے چمک رہا تھا۔ ہوا چل رہی تھی، ٹھنڈک اتر آئی تھی اور فضا پر اندھیرا ہی اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں نے شراب کی بوتل ختم کر ڈالی اور سرکنڈوں کی سرسراہٹ اور دریا کا نغمہ سنتے سنتے پھر لیٹ گیا "

" اتنے میں اندھیرا لحظہ بلحظہ کم ہونے لگا۔ اچانک ایک سایہ میرے سامنے سے تیزی کے ساتھ گزرا۔ میں نے شور مچایا۔ اُدھر سے آواز آئی.......... یہ کوئی ماہی گیر تھا۔ میں نے اسے اپنی نازک حالت سے آگاہ کیا۔ وہ اپنی کشتی مجھ تک لے آیا اور ہم دونوں زنجیر کو تازہ دم ہو کر کھینچنے لگے۔ مگر لنگر اب بھی جوں کا توں جما رہا۔ حسنِ اتفاق سے ایک اور ملاح ادھر آ نکلا۔ اس نے ہمارے حوصلے بڑھائے اور ہم تینوں نے زور لگانا شروع کیا۔ بدقت تمام لنگر اپنی جگہ سے ذرا سرکا۔ وہ آہستہ آہستہ کسی بے اندازہ بوجھ کے ساتھ اوپر کو آ رہا تھا۔ آخرکار ایک سیاہ تودا ہماری نظر پڑا، اور ہم نے اسے کھینچ کر کشتی پر لا دیا۔ یہ کسی بوڑھی عورت کی نعش تھی۔ اس کے گلے کے ساتھ ایک بھاری پتھر بندھا ہوا تھا!

(ماپساں)

طاہر قریشی

ہندی گیت

ہردے بیچ مسکائے
سکھی کوئی ہردے بیچ مسکائے

(۱)

من مندر میں آکر بیٹھا
نگری ایک بسا کر بیٹھا
روپ انوپ سجا کر بیٹھا
سندر چھبی دکھلائے
سکھی کوئی ہردے بیچ مسکائے

(۲)

رس بھری بات سناتا ہے وہ
گیت پیت کا گاتا ہے وہ
جیا مرا للچاتا ہے وہ
نین سے نین لڑائے
سکھی کوئی ہردے بیچ مسکائے

(۳)

جادو سا من بسنے آیا
پیت کے پھندے کسنے آیا
ناگن بن کر ڈسنے آیا
سوتی آگ جگائے
سکھی کوئی ہردے بیچ مسکائے

(۴)

کیسے سمجھاؤں میں من کو
روگ لگا میرے بالے پن کو
کھائے جاتا ہے پاپن کو
کچھ نہ مجھے سہائے
سکھی کوئی ہردے بیچ مسکائے

گیت

چپکے چپکے تاک لگائے
سانس کی آہٹ تک نہ آئے
ناگ سمان کئی بل کھائے

رین اندھیری ہُو کا عالم
کیسے نڈر ہو سندر بالم
ایسے میں جب آتے ہو
جی کو دھڑکا جاتے ہو

اوپر والا راہ بتائے
رہ میں وہ ٹھوکر نہ کھائے
بگڑی بات کہیں بن جائے
آئے سوئے بھاگ جگائے

ویری ہے سنسار تمہارا
میں ہاری جب من کو مارا
سپنے میں کیوں آتے ہو
نیند بھی چھینے جاتے ہو

لطیفہ انور گورداسپوری

شامِ رنگیں

وہ شاعر تھا۔

وہ شعر سنتا تھا لیکن ان میں کچھ معنی نہ ہوتے تھے۔ وہ روتا تھا ہنستا تھا لیکن نہ رونے میں کوئی اذیت ہوتی تھی اور نہ ہنسنے میں مسرت۔

اس نے اپنے عزیزوں سے افسانہ ہائے محبت کو سنا تھا۔ وہ ان کی سرد آہوں سے متاثر ہوا تھا۔ اس نے ان کے اشکہائے خونیں کو دیکھا تھا لیکن اسے ان کی محبت کا یقین نہ آیا تھا۔ وہ خود تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ ذاتی تجربہ سنی ہوئی یا لکھی ہوئی باتوں سے زیادہ قابلِ یقین ہوتا ہے۔

ایک دن اس نے اپنے چند دوستوں کو گفتگو کرتے دیکھا۔ اس نے ان کے چہروں سے پہچان لیا کہ وہ اس کی بابت کچھ کہہ رہے ہیں وہ ان کی باتیں سننے کے لئے ان کے قریب گیا تو ان میں سے ایک نے کہا "مبارک"۔ لیکن وہ اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔

دوسرے دن اس کے ایک اور دوست نے مبارکباد دی لیکن وہ اس راز کو سمجھنے سے قاصر رہا۔

تیسرے دن اس نے ان ہی لوگوں کو یہ کہتے سنا "یہ محبت کی ابتدا ہوگئی ہے"۔ وہ کانپ اٹھا اور تنہائی میں جا کر بہت دیر تک روتا رہا اسی دوران میں اس نے ضمیر کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہا تھا "ان لوگوں نے تمہاری محبت کا فرضی افسانہ بنایا ہے اور اس طرح تمہیں بدنام و رسوا کرنا چاہتے ہیں تم اس فرضی افسانہ کو صحیح کر دکھاؤ۔ زندۂ جاوید ہو جاؤ گے یا برباد"۔

اس نے کہا "اچھا۔ میں اس نصیحت پر عمل کرونگا۔ میں محبت کرونگا اور ضرور"۔

اب وہ ایک دوشیزہ سے محبت کر رہا تھا۔ اس کا پیمانۂ دل اس کی صہبائے محبت سے لبریز تھا۔ اس کی روح مہرِ حسن کی کیف آور کرنوں سے منور۔ اس کی رگ رگ شعریت سے معمور اور اس کا کاشانۂ دل تجلیٔ محبوب سے آباد و روشن تھا۔ اس نے اپنی خاکسترِ دل سے ایک ایسا مندر بنایا جہاں ہر وقت ایک شمعِ محبت کی پرستش ہونے لگی —— غرض وہ اب محبت کر رہا تھا۔

محبت نے اس کے جذبات کو ایک ترنم دیا تھا۔ وہ اب وقفِ محبت تھا۔ محبت کے گیت گاتا تھا۔ محبت کے شعر بناتا تھا۔ اس کی پروازِ تخیل اب بہت بلند تھی۔

وہ اپنی محبوبہ سے ملتا تھا۔

اور اسی طرح بہت زمانہ تک حبیب و محبوب ایک دوسرے سے ملتے رہے۔

(۲)

ایک دن رشتۂ جسم و جان ٹوٹ جاتا ہے۔ ایک دن حبیب و محبوب جدا ہو جاتے ہیں۔ یہ زمانے کی نیرنگیاں ہیں۔ غرض شاعر زندگی کی کسی بدنصیب گھڑی میں اپنی جان سے جدا ہو گیا۔ اس نے "خدا حافظ" کہا۔ اس کے دستِ نازک کو پیار کیا اور رخصت ہو گیا۔ اب ان کی حسین و رنگین ملاقاتیں ختم ہو گئیں۔ شاعر اپنی محبت میں مدہوش تھا مگر دوشیزہ نے خیالِ پرستار کو دل سے نکال کر تیرہ بختی میں عیش و عشرت کی گھڑیاں آمیز رنگوں پر گذارنی شروع کر دی —— شاید عورت کا دل ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے حبیب، اپنے پرستار کو بھلا دیتی ہے۔ بہرحال شاعر اس سے محبت کرتا رہا اس نے شعر کہنا اور سننا چھوڑ دیا۔ زمانہ نے اسے چھیڑا لیکن وہ خاموش رہا۔ اس کے سازِ تخیل سے کوئی آہ نہ نکلی۔ نہ کوئی گیت بلند ہوا۔ اظہارِ محبت اس کے نزدیک جرم تھا ناقابلِ تلافی۔ شاید یہ ایسا ہی گناہ ہے —— اس لئے وہ کبھی اپنی محبت کا راز اپنے لبوں تک نہ لایا۔

لوگ سمجھے کہ محبت مردہ ہوگئی —— یہ انہیں ان کے تجربہ نے بتایا تھا —— شمعِ محبت بجھ گئی اور صرف خاک باقی ہے جس سے دھواں نہیں اٹھتا۔ لیکن آہ! —— ایسا نہیں تھا۔ وہ محبت کر رہا تھا اور منازلِ محبت کو نہایت تیزی سے طے کر رہا تھا۔

"اسے محبوب کا کچھ خیال ہی نہیں"۔ دنیا کہتی تھی لیکن وہ یہ کہہ کر کہ "خود نگاہوں کی التجا کو نہ سمجھے اس کے سامنے اپنی زبان کو شرمندۂ تکلم نہ کرنا چاہئے" خاموش ہو جاتا تھا۔

کبھی ایک چیز کی ایک سی حالت نہیں رہتی۔ بچہ جوان ہوتا ہے پھر بوڑھا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح زمانہ گزرتا ہے۔ واقعات میں بھی رد و بدل ہو جاتا ہے۔ کبھی کاشانۂ امید بھی قسمت کی روشنی سے جگمگا اٹھتا ہے۔

وہ کسی ایسے "لمحۂ رنگیں" کا منتظر تھا۔

(۳)

کئی عیدیں گذریں۔ بہار کا بہار آفریں اور خزاں کا غم انگیز موسم کئی مرتبہ آیا اور چلا گیا چمن میں پھول کھلے عنادل نے نماز پڑھی لیکن آہ! شاعر کی آرزوؤں کی کھیتی یوں ہی ویران رہی بلبل و گل کئی مرتبہ ملے اور جدا ہو گئے لیکن شاعر اس دوشیزہ سے نہ مل سکا جس نے اسے اپنی محبت کی نہ ٹوٹنے والی زنجیروں میں گرفتار کر لیا تھا۔

پرستارِ محبت کے جذبۂ غم سے متاثر ہو جانا ہی حسن کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ برسات کا موسم تھا۔ ہر طرف تازگی تھی۔ ہر طرف شگفتگی تھی لیکن شاعر کے چہرے پر اداسی برس رہی تھی ایک "لمحۂ رنگین" نے اسے چند لمحوں کے لئے کھلا دیا۔ اس کی تاریک دنیائے محبت حسن کی ضیاپاشیوں سے پرنور ہو گئی۔

ایک روز ایک خوبصورت شام کو جبکہ ہر جگہ مسرت چھائی ہوئی تھی حسنِ اتفاق سے اس دوشیزہ نے شاعر کو سڑک کے کنارے آہستہ آہستہ جاتا دیکھ لیا۔ وہ اس سے ملنا چاہتی تھی۔ تین سال بعد وہ اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے اسے بلایا۔ مسکرائی اور کچھ دیر رک کر اس نے کچھ کہا۔ نہ معلوم کیا! شاعر اس وقت خوشی و غم کے مخلوط جوئباروں میں بہہ رہا تھا خوشی اس لئے تھی کہ اس کی کتابِ زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو رہا تھا اور غم اس لئے کہ اسے خوف تھا کہ یہ ملاقات اسکے جذباتِ محبت کو نیست و نابود کر دیگی۔ وہ برباد ہو جائیگا وہ اس محبت کو جو اس نے اس عرصہ میں حاصل کی تھی کھو بیٹھیگا محبوب کی خوشی پر اپنی ہر آرزو کو قربان کر دینا اس کیلئے معمولی بات تھی اس لئے وہ اس سے ملا۔ اس کی باتوں کو گوشِ دل سے سنا اور پھر چلا آیا۔

ر۔ سی

اَے دوست

کچھ میرے دردِ دل میں تخفیف ہو چکی ہے
آرام ہو رہا ہے تکلیف ہو چکی ہے

آرام یعنی غم کا خوگر سا ہو گیا ہے
جھولے میں درد کے دل گویا کہ سو گیا ہے

غم تلخ کامیوں کی لذت بدل چکا ہے
فرقت کا درد اپنی فطرت بدل چکا ہے

وہ شورشیں نہیں اس دنیائے آب و گل میں
ہاں گھن سا لگ رہا ہے اب کائناتِ دل میں

بے تابیوں سے اب تو کچھ ربط ہو گیا ہے
رہنے کا بے کسی میں اک خبط ہو گیا ہے

ناکامیوں سے کتنا مانوس ہو گیا ہوں
دل کی شگفتگی سے مایوس ہو گیا ہوں

گریہ بھی اب تو وجہِ تسکینِ دل نہیں ہے
کیا عشق کا جہنم اب مشتعل نہیں ہے

کیوں قدرتی مناظر وہ لطف کھو چکے ہیں
روحانیت کے شعلے کیا سرد ہو چکے ہیں

پہلے تو غم فزا تھے پچھلے کے سرد جھونکے
کیا ساتھ اپنے اب بھی لاتے ہیں درد جھونکے

پہلے تو شام ہوتے دل میرا ڈوبتا تھا
کیا کچھ نظامِ عالم اُس وقت دوسرا تھا

پہلے یہی ستارے کہتے تھے راز اپنے
اب کیوں لئے ہوئے ہیں خاموش ساز اپنے

پہلے تو چاندنی سے اٹھتی تھی لہر دل میں
دل اب بھی کھینچتی ہیں کیا چاند کی شعاعیں

بے کیفیوں نے آخر کیوں گھیر لیں نگاہیں
شاید کہ تم نے مجھ سے اب پھیر لیں نگاہیں

ناکامِ لطف تھا ہی محرومِ جور بھی ہوں
گر حکم ہو تو میں بھی الفت کو ترک کر دوں!

زیبا (عثمانیہ)

کمرہ نمبر ۱۳

ایک مسافر نے جو اپنی پشت پر ایک بھاری تھیلا اٹھائے ہوئے تھا سرائے کے بوسیدہ دروازے کو کھولا اور اندر داخل ہوا۔

سرائے کا مالک ایک عجیب قسم کا انسان تھا وہ اپنے سوا اور کسی کی رائے پر اعتماد نہ رکھتا تھا۔ اس دن سخت سردی کے باوجود اس نے ہلکا پھلکا لباس پہن رکھا تھا

"کیا آپ آج شب کے لئے ایک کمرہ کرایہ پر دے سکتے ہیں" مسافر نے اپنا بھاری تھیلا ایک کندھے سے دوسرے کندھے پر رکھتے ہوئے یہ کہا۔

سرائے کے مالک نے ایک تجسس نگاہ ڈالی۔ پھر اپنی ٹوپی کو گھماتے ہوئے بولا "میرے پاس صرف ایک کمرہ خالی ہے آپ وہ لے سکتے ہیں بشرطیکہ آپ کسی قسم کے وہم میں مبتلا نہ ہوں"

مسافر مسکرایا اور کہنے لگا "مجھے کسی قسم کا وہم نہیں۔ لیکن یہ تو بتائیے آپ کا ایسا پوچھنے سے کیا مطلب تھا۔ کیا وہاں کوئی بالائی طاقت قیام رکھتی ہے؟"

"جو واقعات آج شام اس کمرے میں ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ ان سے اس بات کا امکان ہو سکتا ہے۔ یہ کمرہ نمبر ۱۳ ہے"۔

مسافر نے حیرانی سے پوچھا "وہاں کیا ہوا"

پھر سرائے کے مالک کی ٹوپی کو گردش ہوئی۔ اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "آپ جانتے ہیں کہ آج کل مسافر کس کثرت سے آتے ہیں اس وقت صرف کمرہ نمبر ۱۳ خالی ہے باقی تمام کرائے پر دے جاچکے ہیں۔ آج شام میں نے وہ کمرہ بھی دو اشخاص کو دے دیا تھا —— مگر اب وہ لاپتہ ہیں"

مسافر نے متعجب ہو کر پوچھا "لیکن اگر انہوں نے کمرہ کرایہ پر لے رکھا ہے تو کیا وہ واپس نہ آئیں گے؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔ کسی شخص نے انہیں باہر جاتے نہیں دیکھا —— وہ دو نو یکے بعد دیگرے گم ہو گئے۔ انہوں نے کھانا تیار کرنے کے لئے کہا تھا وہ بھی خراب ہو گیا ہے۔ میں آپ کو تمام حالات سے مطلع کئے دیتا ہوں۔ ان سے آپ اندازہ کر لیں۔

تقریباً ایک گھنٹہ پیشتر ایک اجنبی شخص میرے پاس آیا اور اس نے ایک کمرہ کرایہ پر لینا چاہا۔ اس نے کہا سڑک پر ہماری موٹر خراب ہو گئی ہے اور میرا دوست اس کی درستی میں مشغول ہے۔ چند منٹ کے بعد وہ بھی آجائے گا میں نے کمرہ نمبر ۱۳ کرایہ پر دے دیا۔ اس نے اپنا نام سوشیل بتایا۔

بیس منٹ کے بعد اس کا دوست بھی آگیا۔ وہ موٹر درست کرنے میں ناکامیاب رہا تھا۔ اس لئے اسے سڑک ہی پر چھوڑ آیا۔

مسافر نے کہا۔ "میں بھی ابھی وہاں سے گزرا تھا اور موٹر کو تنہا اور خالی دیکھ کر حیران ہوا تھا"

سرائے کے مالک نے کہا۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ حیران ہوئے ہونگے۔ میں نے اس شخص کو بتایا کہ اس کا دوست سوشیل مکان کی چھت پر ہے اور ملازم کو راستہ دکھانے کے لیے ساتھ بھیج دیا۔ دو منٹ بعد وہ دونوں واپس آگئے اور کہا کہ سوشیل وہاں نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ میں یہیں بیٹھا رہا ہوں اور سیڑھیوں کی طرف میرا رخ تھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ نیچے نہیں اترا ہے۔ ملازم سوشیل کی تلاش میں ادھر ادھر چکر کاٹنے لگا اور دوسرا شخص اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ملازم نے بہتیری کوشش کی مگر سوشیل کا کچھ پتہ نہ چلا۔ ملازم ان کے کمرے میں گیا تاکہ اس کے دوست کو اس سے مطلع کرے —— مگر اس کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ کمرہ خالی ہے اور وہاں دونوں میں سے کوئی بھی نہیں"۔

مسافر نے کہا۔ "کیا وہ اپنی موٹر کی دیکھ بھال کے لئے باہر تو نہیں چلے گئے"۔

سرائے کے مالک نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "میں یہیں بیٹھا رہا ہوں میں نے ان میں سے کسی کو بھی سیڑھیاں اترتے نہیں دیکھا"۔

"وہ جو کمرے میں کھڑکی ہے اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے"۔

"کھڑکی سے زمین کا فاصلہ بیس فٹ سے کم نہیں۔ وہاں سے نیچے اترنا ناممکن ہے"۔

"شاید وہ سیر کے لئے چلے گئے ہوں اور آپ نے انہیں باہر جاتے نہ دیکھا ہو"۔

"پھر وہی ڈھاک کے تین پات۔ میں نے پہلے ہی آپ کو بتا دیا ہے کہ

میں نہیں بیٹھا رہا ہوں" سرائے کے مالک نے جھنجلاتے ہوئے جواب دیا۔

مسافر نے کہا "بہت اچھا پہلے مجھے کھانے کو کچھ دیجئے اگر وہ اشخاص نہ آئے تو میں کمرہ نمبر ۱۳ لے لونگا۔ مجھے کسی قسم کا وہم نہیں"۔

مسافر نے اپنا تھیلا اور ٹوپی اپنے کمرے میں رکھ دی اور خود کھانا کھانے کے لئے باورچی خانے میں چلا گیا۔ باورچی خانے میں چند بڑی اور چند چھوٹی میزیں بڑے قرینے سے رکھی تھیں۔ کھانا کھلانے کا باقاعدہ انتظام تھا۔ مسافر ایک چھوٹی میز کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ پانچ منٹ کے بعد ڈبل روٹی اور اُبلے ہوئے آلو اس کے سامنے رکھے گئے۔ مسافر کو بھوک زیادہ لگ رہی تھی کھانے کی چیزیں لذیذ تھیں اس لئے ضرورت سے زیادہ ہضم کر گیا۔ جب وہ کھانا ختم کر چکا اور باہر نکلا تو سرائے کے مالک نے جو صحن میں چہل قدمی کر رہا تھا اسے دیکھتے ہی آواز دی۔ "آپ اب رجسٹر پر دستخط کر دیں اور کمرہ نمبر ۱۳ پر بلا شک و شبہ قبضہ کر لیں، وہ اشخاص اب نہیں آنے کے"۔

مسافر نے رجسٹر پر اپنا نام گریو لکھتے ہوئے کہا "کیا آپ نے ان کے متعلق کچھ سنا ہے"۔

"کیوں نہیں۔ انسپکٹر پولیس ابھی مجھ سے ٹیلیفون پر گفتگو کر رہا تھا کہ مقام گر گنج میں چوری ہو گئی ہے اور وہ تحقیقات کے لئے یہاں پہنچ رہا ہے میرے خیال میں یہ انہیں دونوں کی کارستانی ہے جو شام سے غائب ہیں"

مسافر نے پوچھا "انسپکٹر صاحب نے آپ کو اور کچھ بتایا"

"اس نے صرف اتنا کہا ہے کہ گر گنج میں شام کے وقت ایک اجنبی شخص نے کسی جوہری کی ہٹی سے زیورات اور جواہرات چرائے ہیں۔ ایک شخص نے پکڑنے کی کوشش بھی کی مگر وہ بچ نکلا۔ چور کے پاس موٹر تھی اُس شخص نے پولیس میں اطلاع کر دی۔ چور کے حلیے اور چوری کے تمام حالات سے مطلع کر دیا۔ پولیس نے تمام موٹریں روکنے کا حکم دے رکھا ہے۔ وہ موٹر جس کی تلاش میں وہ تھے اس طرف آ رہی تھی۔ چونکہ انہیں معلوم تھا کہ شہر میں پہنچتے ہی موٹر روک لی جائے گی اور وہ گرفتار کر لئے جائیں گے اس لئے انہوں نے موٹر باہر ہی رہنے دی اور خود پا پیادہ میری سرائے میں وارد ہوئے۔ اب وہ کہاں ہیں اور ان کا یہاں آنے سے کیا مطلب تھا اس کے متعلق مجھے کچھ پتہ نہیں"۔

گریو نے کہا "شاید وہ چوری کا مال یہاں چھپا گئے ہوں"۔

سرائے کا مالک اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا "میرے خیال میں آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آیئے تو ذرا کمرہ نمبر ۱۳ کی دیکھ بھال کریں"۔

گریو اور سرائے کا مالک دونوں سیڑھیاں چڑھ کر کمرہ نمبر ۱۳ میں پہنچ گئے۔ وہ کمرہ بہت سادہ مگر صاف ستھرا تھا۔ وہاں دو بستر رکھے تھے اور دو تولئے ایک کھونٹی پر لٹک رہے تھے۔ کمرے کی کھڑکی بند تھی۔

گریو کی مدد سے سرائے کے مالک نے باقاعدہ تلاشی لینی شروع کی۔ بستر الٹ پلٹ دئے اور گوشہ گوشہ دیکھ مارا۔ آخر پندرہ منٹ کے بعد مایوس ہو کر انہوں نے اس کام سے ہاتھ اٹھا لیا۔ گریو نے کھڑکی کھولی۔ دوسرے کمروں کے لیمپوں کی روشنی صحن کو منور کر رہی تھی اور کھڑکی سے زمین کا فاصلہ بیس فٹ کے قریب تھا جیسا کہ سرائے کے مالک نے بتایا تھا۔

"کسی اور کمرے سے تو وہ باہر نہیں چلے گئے" گریو نے سرائے کے مالک سے پوچھا جو ایک گہری سوچ میں اپنا سر کھجا رہا تھا۔

"ممکن ہے۔ اس طرف شیڈ کو ایک راستہ جاتا ہے اور اس طرف ایک کھڑکی بھی ہے۔ پس وہ اسی راستے سے باہر گئے ہوں گے"۔

گریو نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہمیں اس سے کیا مطلب۔ انسپکٹر صاحب خود تحقیقات کر لیں گے۔ آپ ان اشخاص کا حسب نسب تو بیان کریں"

سرائے کے مالک نے کچھ دیر کے بعد جواب دیا۔ "پہلا شخص جس نے اپنا نام سوشیل بتایا تھا۔ نیلے رنگ کا برساتی کوٹ پہنے ہوئے تھا اس نے بڑے بڑے چشمے لگا رکھے تھے۔ لیکن جب وہ رجسٹر پر دستخط کرنے لگا تو اس نے عینک اتار دی تھی۔ اس کا رنگ سیاہی مائل، مونچھیں لمبی اور ڈاڑھی قدرے مختصر تھی۔ دوسرے شخص کی مونچھیں صفا چٹ تھیں۔ وہ زردی مائل برساتی کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کی زبان میں لڑکھڑاہٹ تھی اور کچھ لنگڑا بھی تھا۔ اس کی نیلگوں آنکھوں پر چشمہ لگا ہوا تھا"۔

"آپ نے ابھی فرمایا تھا کہ پولیس کے پاس اس شخص کا حلیہ بھی موجود ہے جو اصلی چور ہے"۔

"جی ہاں! جوہری کو صرف اتنا معلوم ہے کہ چور کی ڈاڑھی موجود تھی"

"پس وہ سوشیل ہی ہو گا"۔

مالک نے کہا "میرا بھی یہی خیال ہے"۔

"کچھ بھی ہو چوری کا مال یہاں نہیں ہے۔ میرے خیال میں سوشیل نے اپنے دوست کو دھوکا دینے کی کوشش کی ہے اور کھڑکی میں سے جو شیڈ کو جانے والے راستے کے قریب ہے باہر چلا گیا۔ جب اس کا دوست آیا اور اس نے دیکھا کہ وہ چلا گیا ہے تو اس کے دل میں شبہ پیدا ہوا کہ کہیں وہ پکڑا نہ جائے۔ اس لئے وہ بھی غائب ہو گیا"۔

"یہ ممکن تو معلوم ہوتا ہے مگر وہ پیدل بہت دور تک نہیں جا سکتے کیونکہ ان میں سے ایک لنگڑا ہے۔ آج ہمارے گاؤں کا چوکیدار ان کی موٹر پر پہرہ دے رہا ہے اور ــــــ"

اسی اثنا میں سرائے کا دروازہ بڑے دھماکے سے کھلا اور انسپکٹر پولیس سپاہیوں کے ایک دستے کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ سرائے کے مالک نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "انسپکٹر صاحب۔ لیجئے آپ کا ملزم حاضر ہے۔"

انسپکٹر پولیس نے گرتو کا بازو پکڑتے ہوئے کہا "میں تم کو اس چوری کا ذمہ دار ٹھہرا کر جو آج شام کو گرینج میں ہوئی ہے گرفتار کرتا ہوں"

گرتو نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "انسپکٹر صاحب، آپ غلطی پر ہیں مجھے اس معاملے کے متعلق کچھ علم نہیں مجھے تو سرائے کے مالک نے تمام حالات سے آگاہ کیا ہے ــــ"

انسپکٹر نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "میں غلطی پر نہیں ہوں۔ آپ صرف ایک منٹ انتظار کیجئے تمام راز افشا ہو جائے گا۔"

انسپکٹر پولیس کمرہ نمبر ۱۲ میں گیا اور جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں گرتو کا تھیلا تھا۔ اس نے ایک مسرت آمیز لہجے سے تھیلے کو کھولا اور اس کی تمام چیزیں بستر پر رکھ دیں۔ جب ان اشیا کا بغور معائنہ کیا گیا تو ان میں ایک نیلے رنگ کا برساتی کوٹ۔ دوسرا زردی مائل برساتی کوٹ اور ایک تولیہ نظر پڑا۔ جب تولیے کو بھی کھولا گیا تو اس میں سے قینچی اور حجامت کا سامان، ایک بناوٹی بالوں کا گچھا اور ایک مخملی ڈبہ جس میں تمام جواہرات تھے برآمد ہوا۔

سرائے کے مالک نے طعنے کے طور پر کہا۔ "کیوں جناب! اب بتائیے کون غلطی پر ہے؟"

انسپکٹر نے ملزم کو ہتھکڑی پہنائی اور یوں گویا ہوا "خوب ہوشیار آدمی معلوم ہوتے ہو۔ پہلے داڑھی مونچھوں والا بن کر آنا اور پھر میدان صفاچٹ کر کے دوسرے شخص کا بھیس بدل کر آنا تاکہ لوگ خیال کریں کہ ملزم دو تھے، اور اب بے گناہ کے طور پر تیسری دفعہ آئے ہو۔"

گرتو نے شرماتے ہوئے کہا "بالکل ٹھیک۔ مگر یہ بتائیے کہ آپ نے میری شناخت کیونکر کی؟"

انسپکٹر نے جواب دیا۔ "سرائے کے مالک سے پوچھئے وہ تمام حالات سے واقف ہے۔"

سرائے کے مالک نے گرتو کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔ "جب تم دوسری دفعہ آئے تو میں تم کو بالکل پہچان نہیں سکا۔ تمہاری ٹانگوں میں لنگڑا پن تھا جس نے میری توجہ تمہارے پاؤں کی طرف مبذول کر دی تھی میں نے تم کو سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے دیکھا۔ مجھے ایک پرندے کا پر تمہارے بوٹ کی ایڑی سے چپٹا ہوا نظر پڑا۔ میں نے اس بات کو بھی صرف سرسری نظر سے دیکھا۔ جب تم تیسری دفعہ آئے تب بھی مجھے کسی قسم کا شک نہ تھا۔ تم پہلے سے بالکل مختلف معلوم ہوتے تھے۔ لیکن جب میں نے تمہارے سامنے کھانا لا کر رکھا تو مجھے پھر وہی پر تمہارے بوٹ کی ایڑی سے چپٹا ہوا نظر آیا۔ اس سے میری حیرانی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ میں نے تمہاری غیر حاضری میں کمرہ نمبر ۱۲ میں جا کر تمہارے تھیلے کی اشیا کا بغور ملاحظہ کیا۔ اس سے مجھ پر تمام حالات روز روشن کی طرح عیاں ہو گئے۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا ان باتوں پر غور کر رہا تھا کہ انسپکٹر صاحب کا ٹیلیفون آیا کہ کوئی موٹر والا تو یہاں نہیں آیا۔ چونکہ گرینج میں چوری ہو گئی تھی میں نے تمام حالات سے جو مجھے معلوم تھے انسپکٹر صاحب کو آگاہ کر دیا۔ انہوں نے مجھے تاکید کی کہ تم کو بغیر کسی احتمال میں ڈالنے کے کچھ عرصے کے لئے ٹھہرایا جائے چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔"

روشن نکودری

رباعی

ہر نقش میں تدبیر سراپا بیتابی ہے
انسان کی نقش سراپا بیتابی ہے
نقاش کے دل پہ کیا گزری ہوگی
بن بن کے یہ تصویر سراپا بیتابی ہے

وقار (انبالوی)

غزلیات

جہانِ عشق میں رسوا دلِ خراب نہ کر
شکایتِ ستم و جورِ بے حساب نہ کر

کہیں مجاز و حقیقت میں امتیاز تو ہو
اٹھا حجاب اٹھا ہاں بس اب حجاب نہ کر

مآل بینی و میخواری ہائے زبوں ہمت
یہ میکدہ ہے یہاں خوفِ احتساب نہ کر

جو تیرے عفو و کرم کا کوئی حساب نہیں
مرے گناہوں کو شرمندۂ حساب نہ کر

میں اپنے شیوۂ صبر و رضا پہ قائم ہوں
ستا ستا تو ستانے سے اجتناب نہ کر

نہ چھیڑ افسانۂ عہدِ نشاط پھر ہمدم
دلِ غریب کو پھر غرقِ اضطراب نہ کر

خیالِ خاطرِ اہلِ نیاز لازم ہے
نگاہِ ناز کو آلودۂ عتاب نہ کر

سنا سنا کے تو کیفیؔ یہ شعر درد انگیز
جہاں میں رازِ محبت کو بے نقاب نہ کر

(کیفیؔ جام پوری)

—— ۲ ——

جفائے حسن کے قابل سمجھ کر
مٹا جاتا ہوں خود کو دل سمجھ کر

مجھے جتنا بھی چاہو درد دے دو
مگر اس درد کا حاصل سمجھ کر

پکارا اے رہِ الفت کے رہرو
دیارِ درد کو منزل سمجھ کر

بہت رک رک کے میں لیتا ہوں سانس
نفس میں آپ کو شامل سمجھ کر

تبسم ریزیاں طوفاں زدہ دل پر
سمجھ کر اے لبِ ساحل سمجھ کر

نگاہِ یار اللہ بجلی گرا دے
ترس مت کھا مجھے بسمل سمجھ کر

دلِ زخمی کو ہے فریاد کی دھن
کسی کو حال سے غافل سمجھ کر

محبت نے ستم توڑا، ستم ہے
خلشؔ کو حسن کے قابل سمجھ کر

(عزیز احمد خلشؔ صدیقی)

—— ۳ ——

اس طرح تڑپا کوئی مارا ہوا آرام کا
ڈبڈبائی آنکھ، دل اٹھا چراغِ شام کا

آسماں دشمن، زمانہ بیوفا، تم بے نیاز
رو دیئے جا کر کہاں دکھڑا دلِ ناکام کا

پھر کہاں صبحِ اسیری پھر کہاں شامِ قفس
دل دھڑکتا ہے رہا ہوتے اسیرِ دام کا

سننے والے نے ہمارے نالۂ بیتاب کے
مرثیہ ہے یہ ہماری الفتِ ناکام کا

ہو گیا سازِ زباں ساکت نظر تھرا گئی
کون حامل ہو ہمارے آخری پیغام کا

وائے محرومی کہ شیشے مے کے خالی ہو گئے
رخ ابھی بدلا نہ تھا محفل میں دورِ جام کا

اک شکستہ سی لحد کچھ پھول مرجھائے ہوئے
آہ یہ منظر ہمارے دردناک انجام کا

صبح ہو یا شام میں ہوں اور کسی کی آرزو
رات دن رونا ہے اپنی حسرتِ ناکام کا

میرے مرنے کی خبر سن کر وہ کہتے ہیں ظفرؔ
نامرادِ آرزو تھا تو کوئی اس نام کا

سراج الدین ظفرؔ

—— ۴ ——

ہمیشہ خاکساری خوئے اربابِ ہنر ہوگی
جھکے گی باغِ عالم میں جو شاخ بارور ہوگی

سرِ شام ابتدا ہو تو کم از کم رات بھر ہوگی
کہانی طولِ گیسو کی کہاں تک مختصر ہوگی

بہت تیری خوشامد اب نہ مجھ سے نامہ بر ہوگی
جو دل سے راہ ہے دل کو اسے میری خبر ہوگی

یہ ساری جانفشانی رائیگاں اے چارہ گر ہوگی
دوائے دردِ دل ہرگز نہ ممنونِ اثر ہوگی

دمِ رحلت بھرے ہیں اقربا رونے رلانے کو
بھلا ایسے میں کیا آرائشِ رختِ سفر ہوگی

کب آئیں گے وہ دن جب سر کہ تقدیم سے چھوٹوں گا
نہ آنا قفس ہوگا، نہ فکرِ بال و پر ہوگی

قیامت رونما ہوگی ہٹے گا رخ سے جب پردہ
نہ وہ بالا فلک ہوگا، نہ زمیں زیر و زبر ہوگی

قیامت تک نہ چھوٹے گی یہ عادت کوچہ گردی کی
اگر میں خاک ہوں گا، خاک میری دربدر ہوگی

چراغِ داغِ حسرت ٹمٹمائیں گے سدا اے انجمؔ
سرِ مدفن ہماری بیکسی ہی نوحہ گر ہوگی

(انجمؔ ندوی)

—— ۵ ——

پروا نہیں کچھ اہلِ چمن کو نہ صبا کو
میں کیا کروں صیاد زمانہ کی ہوا کو

ہشیار ہو ہاتھ اٹھاتا ہوں دعا کو
کچھ دن کے لئے بھول گیا تھا میں خدا کو

گلزار میں یہ جا کے لگا دیگی گلوں سے
اڑتی ہوئی مل جائے کوئی بات صبا کو

جاں دینا تو اک فرض ہے کچھ جرم نہیں ہے
بدنام کریں آپ نہ اربابِ وفا کو

لاشہ پہ شمیمؔ جو گنہگار کے برسے
ہم بھول گئے آج ترے جرم و خطا کو

(ربی الحسن شمیمؔ)

دنیائے ادب

فرانسیسی

فرعون کی محبوبہ

ایچ جی سمتھ نے ۱۹۲۵ء میں فرعون کے متعلق یہ دلچسپ مضمون شائع کیا تھا۔

کیا طوتنخ آمن ہی وہ مشہور فرعون ہے جس سے حضرت موسیٰ کو سابقہ پڑا؟ بعض ماہرین اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں۔ اگر طوتنخ آمن کی لاش مل گئی تو شاید اس مسئلے کا قطعی فیصلہ ہو سکے۔ فی الحال ہم یہ سوال چھوڑ کر اس خاص واقعے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ آج سے تقریباً ستر سال پہلے اسی "وادیٔ ملوک" میں مصر کی اس ملکہ کی ممی ملی تھی جو فرعون کے بعد تخت نشین ہوئی۔

اس حقیقت کا انکشاف تعجب انگیز ہوگا کہ یہ ملکہ شاہی نسل سے نہ تھی بلکہ افرادِ رعایا ہی میں سے ایک نوجوان لڑکی تھی جسے فرعون دیوانہ وار چاہتا تھا اور جسے بالآخر اس نے اپنا وارث قرار دے دیا۔ یہ پوری داستان قدیم مصری کاغذ پر لکھی ہوئی اس ملکہ کے کفن سے برآمد ہوئی تھی کم از کم گوتیئے کی کتاب "ممی کی کہانی" میں یہی مذکور ہے۔ گوتیے کا یہ افسانہ جس میں قدیم مصر کے مناظر حیرت انگیز تفصیل کے ساتھ دکھائے گئے ہیں ادبی مصوری کا ایک شاہکار ہونے کے اعتبار سے بھی قابلِ توجہ ہے۔

گرمی کا ایک دن تھا۔ مصر کے اسقفِ اعظم کی یتیم لڑکی طہوسر غم و حرماں کا مجسمہ بنی محل کے ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی بے اعتنائی سے اپنی باندیوں کے گیت سن رہی تھی۔ اس کی کرسی کی مطلا چوب کاری کے نقوش میں دلفریب سرخ رنگ جھلملا رہا تھا اور بانسوں کی کندہ کاری دو شیروں کی مورتیں دکھا رہی تھی۔ کرسی کے قرمزی گدیلوں پر زریں ستارے ٹنکے تھے۔ سامنے چھوٹی سی میز پر کنول کے پھولوں کے ایک گلدستے اور ہاتھی دانت کے پائے پر کانسے کے خوبصورت آئینے کے علاوہ ایک تابہ کمر برہنہ لڑکی کا مجسمہ عطردانوں کا ڈبا اس طرح سنبھالے ہوئے تھا گویا کوئی تیرتی ہوئی جل پری اپنے صندوق کو پانی سے اوپر اٹھائے ہوئے ہے۔

طہوسر کا چہرہ خالص مصری وضع کا تھا، ہلکے سنہرے اور گلابی رنگ کی آمیزش نے اس کی سانولی زردی کو جلا دے کر ایک جگمگاہٹ سی پیدا کر رکھی تھی۔ اس کی بڑی بڑی اداس آنکھیں جن کے ابروؤں پر کاجل کے سیاہ خط کھنچے تھے اور ہونٹوں پر غازے کا رنگ چڑھا تھا روشن ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں انار کی کلیوں کے سے سرخ کھلے ہوئے ہونٹوں کے درمیان ایک نیلگوں موتی کی نمناک چمک نظر آتی تھی۔ ناک جس کا نچلا حصہ خفیف سا جھکاؤ دکھا رہا تھا کسی دیوی کے مجسمے کی ترشی ہوئی ناک کی طرح ستواں اور خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ ٹھوڑی کی گولائی میں عاج کی سی چمک تھی۔ اور بالوں کی سیاہ تاب تجلی پر ایک پوشش تھی ـــ ایک ٹوپی جو چینیا بطخ سے بنائی گئی تھی۔ بطخ کے بازو اس کی کنپٹیوں کے وسط تک پھیلے ہوئے تھے۔ جانور کا خوبصورت سر اس کی پیشانی پر، اور اس کی ستارہ کار دُم اس کی گردن کو مس کرتی ہوئی نیچے چلی گئی تھی۔ کانوں میں بڑے بڑے طلائی بالے تھے۔ اور سینے پر عقیق اور سونے کا ایک جڑاؤ لٹکن جس کی سرخی اور سفیدی اس کے مہین لباس میں سے جھلک رہی تھی بطلا، وجود کی تین تین مرصع

چوڑیاں اس کی نازک کلائیوں کے گرد حلقہ زن تھیں۔ اور وہ بادامی کی طرح نرم اور سفید چمڑے کا جوتا پہنے اپنے نازک پاؤں دیوار کی ایک سرخ و سبز مینا کار چوکی پر رکھے ہوئے تھی۔

یوں وہ اداس بیٹھی تھی۔ ایک اسرائیلی نوجوان پوری کی محبت نے جسے محض اس نے دیکھا تھا اس کے دل میں دنیا کی طرف سے بیزاری پیدا کر رکھی تھی۔ اسی صبح شہر میں فاتح جنگ کی حیثیت سے فرعون کا جلوس نکلنے والا تھا۔ طلوسر نے بھی کچھ دیر کے لئے اپنی خیالی دنیا کو چھوڑا اور سہیلیوں کو ساتھ لے کر یہ نظارہ دیکھنے کے لئے باہر نکل آئی۔ جلوس لامتناہی شان و شکوہ کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہا تھا سازندوں کے پاس گو رخر کے چمڑے کے تنبورے اور کانسے کے عجیب و غریب ساز تھے۔ پیچھے پیچھے کاٹھ کی ہنسلیاں پہنے ہوئے قیدیوں کی لمبی لمبی قطاریں تھیں، جن کے ساتھ ہی سانولے چہروں والی لونڈیاں اشک آلود آنکھوں کے باوجود ناز و ادا سے چلتی نظر آتی تھیں۔ ہر طرف باز کی مقدس تصویر والے علم بلند تھے۔ اور چاؤش پکار پکار کر مال غنیمت کی تفصیل بیان کر رہے تھے۔ اس کے بعد ہاتھیوں، زرافوں، اور چیتوں کے غول اور پھر فرعون کی ہیبت کے سامنے جڑا اڑا کر دان اور شتر مرغ کے پروں کے مجلے اور بیاق پنکھے ایک پر شکوہ انداز میں حرکت کرتے نظر آئے۔ وہ ایک جواہر نگار پالکی میں بیٹھا تھا اور اس کے قدموں میں ایک شیر لیٹا تھا ہاتھوں میں شاہی نشانات تھے۔ اس کے ترشے ہوئے سانولے اور پیلے خد و خال دیکھ کر اس پر کسی دیوتا کے سنگین بت کا گمان ہوتا۔ اس کی لمبی بڑی آنکھیں گرد و پیش سے بالکل بیخبر ایک ابوالہول کی آنکھوں کی طرح زمانے کی انتہا پر جمی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

لیکن یہ پر اسرار آنکھیں طلوسر کو دیکھ چکی تھیں۔ یہ ایک نظر تقدیر کا فیصلہ کر دینے والی تھی۔ فرعون کے دل میں محبت کا تیر ترازو ہو چکا تھا۔ دوسرے دن اس نے طلوسر کے گھر میں محبت کے تحائف ...... لعل و جواہر زربفت و کمخواب اور طلائی زیور بھیجے لیکن اس کے غلام مایوس لوٹے۔ طلوسر غائب ہو چکی تھی۔

ان ممالک میں خون خون نہیں ہوتا آگ ہوتا ہے۔ وہ اپنی جنون انگیز محبت سے مجبور ہو کر اپنے غلاموں تک کو اطلاع دئے بغیر پوری کے دیہاتی مقبر کی طرف نکل گئی تھی، اور وہاں جا کر ربط نوازی کی خدمت پر مامور ہو گئی تھی۔ اس کا فقط اتنا کام تھا کہ اپنی خنیاگری سے رات کو سوتے وقت پوری کی آنکھوں کو نیند کا نشہ پلا دیا کرے۔ لیکن اس دلنواز خدمت میں بھی ایک مصیبت آ پڑی۔ پوری خود ایک عبرانی پری پیکر کو دل دے چکا تھا اور وہ ہر شام اس سے ملنے چلا جاتا۔ ایک شب طلوسر نے اپنی رقیب کو دیکھنے کے لئے پوری کے پیچھے پیچھے جانے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت نیل کو عبور کرنے کے لئے صرف ایک ہی کشتی مل سکی جسے پوری لے کر روانہ ہو گیا۔ طلوسر نے ہمت نہ ہاری اور اس کے پیچھے پیچھے تیرنے لگی۔ اور یہاں میں بہت کم منظر اتنے سحر انگیز ہونگے کہ ایک بے خبر عاشق چپو مارتا اپنی محبوب لڑکی کی طرف جا رہا ہے اور وہ لڑکی جو خود اس پر جان دیتی ہے چاندنی رات میں اس کے پیچھے آہستہ آہستہ تیرتی چلی آتی ہے اور ڈرتی ہے کہ کہیں پانی کی آواز اس کے محبوب کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔

وہ نیم مدہوش اور نیم جاں ہو کر کنارے پر پہنچی لیکن اس پر بھی جوش جنوں نے اسے پوری کے پیچھے پیچھے راحیل کے مکان تک پہنچا دیا اور وہ خوش و خرم عاشق و معشوق کو جھانک کر دیکھنے میں کامیاب ہو گئی۔ پوری کے جانے کے بعد وہ راحیل کی دہلیز پر گر پڑی ہوئی ملی۔ راحیل اسے اٹھا کر اندر لے گئی اور اس کی خبرگیری کرتی رہی جس سے اس کی جان بچ گئی۔ دوسری شام کو پوری جب وہاں آیا تو وہ اپنی ربط نواز کو راحیل کی تحویل میں دیکھ کر سخت حیران ہوا۔ لیکن جلد ہی وہ حقیقت کی تہ تک پہنچ گیا۔ شاہی دربار کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے وہ جانتا تھا کہ فرعون کے جاسوس بھوکے شیروں کی طرح طلوسر کی تلاش میں لگے ہیں راحیل کی بوڑھی ملازمہ نامر بھی معاملے کو بھانپ گئی اور فرعون کو اطلاع دینے کے لئے چپکے سے اٹھ دوڑی۔

یہاں ایک عجیب منظر تھا۔ فرعون اپنے محل کی چھت پر بیٹھا ساعت بہ ساعت قاصدوں کا انتظار کر رہا تھا کہ کہیں سے طلوسر کے ملنے کی خبر آئے۔ وہ خاموش اور بے حس و حرکت بیٹھا سیاہ پتھر کا ایک مجسمہ معلوم ہوتا، اس کی آنکھوں کے سامنے ایک شہر غدار اپنی تمام عظمت و شوکت کے ساتھ پھیلا ہوا تھا۔ دریائے نیل کی آئینہ پوش سطح پر کھجور کے درختوں

کے پنکھے جنبش کر رہے تھے۔ چاروں طرف ہزارہا ابوالہول اور جا بجا قدیم معبدوں کے بلند گنبد نظر آتے، جن کو مس کرتے ہوئے خود زمانہ بھی اپنا نقش چھوڑے بغیر یوں گزر جاتا جیسے پانی کا قطرہ سنگِ مرمر کی سطح پر سے پھسل جائے۔ مقدس پرندوں کے مجسمے آسمان کے گہرے نیل کے بالمقابل کہیں اپنے جاودانی پر پھیلائے دکھلائی دیتے تو کہیں ایک ٹانگ پر بے حس و حرکت کھڑے نظر آتے۔ لیکن ان تمام چیزوں کا مالک ایک لڑکی کے لئے جو اسے نہ ملتی تھی درد و کرب کی حالت میں تنہا بیٹھا تھا۔ وقتاً فوقتاً جب کوئی پیادہ ناکامی کی بار بار دہرائی ہوئی خبر لے کر پہنچتا تو اس سنگیں مجسمے کا ایک سنگیں ہاتھ اٹھتا اور عصائے شاہی شعلۂ برق کی طرح سوختہ بخت قاصد کے سر پر گر کر طرفۃ العین میں اس کی لاش کو سنگین فرش پر پٹ گرا دیتا۔

آخر بوڑھی جریل نامراپنی اطلاع لے کر وہاں پہنچی۔ دفعتہً پتھر کا بادشاہ زندہ ہو کر اچھل پڑا اور لپک کر اپنی رتھ میں سوار ہو گیا۔ وہ سرپٹ گھوڑے دوڑاتا ہوا راحیل کے گھر پہنچا۔ جہاں اس نے طلوسر کو چیختے چلاتے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا اور پلوٹو کی طرح جو پرازرپینا کو اپنی زیر زمیں مملکت کی طرف لے بھاگا وہ طلوسر کو رتھ میں رکھے گرجتا، کوسنتا، کڑکتا، گڑگڑاتا دارالسلطنت کے بازاروں میں سے گزر گیا۔

محل میں پہنچ کر اس کے جذبات میں نرمی پیدا ہوئی اور اس نے طلوسر سے کہہ دیا کہ میں تم پر اس وقت تک اپنا کسی قسم کا دعویٰ نہ جماؤں گا جب تک تم مجھے محبت کی نشانی کے طور پر کنول کا یہ پھول لوٹا نہ دو۔

اسی وقت فرعون ایک عجیب و غریب بڈھے آدمی کو باریاب کرنے کے لئے رخصت ہوا۔ یہ بڈھا آدمی موسیٰ تھا۔

اس کے بعد انجیل کی کہانی شروع ہوتی ہے۔ مصر پر مصائب ٹوٹتے ہیں۔ اور بنی اسرائیل وہاں سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ فرعون جو بچوں کے قتلِ عام کے دوران میں اپنے اکلوتے بیٹے کو بھی کھو چکا تھا یاس و قنوط اور قہر و غضب کی حالت میں طلوسر کو اپنا جانشین مقرر کر کے سپاہیوں کی چھ سو رتھیں لئے سمندر کے پانیوں کی درمیانی شاہراہ پر ان کا تعاقب کرتا ہوا پہنچتا ہے۔

بنی اسرائیل میں سے کچھ آخری افراد جن میں پوٹری، راحیل اور تامر شامل تھے۔ اپنے آپ کو تقریباً کھو چکے تھے۔ لیکن دفعتہً موسیٰ نے ایک اشارہ کیا جس پر رتھوں کے پہیے نکل کر گر پڑے اور پانی کی دو عظیم الشان دیواریں دونوں طرف سے امڈ کر باہم ٹکرائیں۔ اس کے بعد سمندر پھر اپنی جگہ چلا گیا اور گاڑیاں گھوڑے اور آدمی طوفانی موجوں میں تنکوں کی طرح اچھلتے نظر آئے۔ صرف فرعون اپنی تیرتی ہوئی رتھ میں تن کر بیٹھا تھا۔ بپھرا اور طیش میں آپے سے باہر ہو کر وہ ساحل پر اترتے ہوئے دشمن کو اپنے تیروں کا نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب وہ آدھا ڈوب چکا تو اس نے اپنے داہنے ہاتھ سے کہ اب وہی پانی کے اوپر رہ گیا تھا۔ اپنا نیزہ سنبھالا اور اپنی بے چارگی کے باوجود نہایت دلیری سے اٹھا کر اسے نامعلوم خدا کے خلاف دے مارا۔

اس طرح طلوسر مصر کی ملکہ بن گئی۔

(حامد علی خاں)

"ہمایوں"

روسی
زندگی کا ایک گر

ایک بڈھے عیار نے مجھ سے کہا۔ اگر تم اپنے کسی مخالف کو پورے طور پر تنگ کرنا چاہتے ہو، بلکہ اسے دکھ پہنچانا چاہتے ہو تو اس کو اسی نقص یا عیب کا الزام دو جو تم سمجھتے ہو کہ خود تم میں موجود ہے۔ اس پر غضب ناک ہو جاؤ . . . . . . اور اسے خوب ملامت کرو۔

اس کا پہلا فائدہ تو یہ ہوگا کہ دوسروں کو تمہاری یہ حرکت سوچ میں ڈال دیگی کہ شاید تم میں یہ عیب نہیں ہے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ تمہارے غضب میں خلوص بھی ہو سکتا ہے . . . . . تم اپنے ضمیر کی ملامت کی طرف بھی متوجہ ہو سکتے ہو۔

مثلاً اگر تم ایک بے اصول آدمی ہو تو اپنے مخالف سے کہو کہ اس کا کوئی اصول نہیں۔

اگر تم خود غلامانہ ذہنیت رکھتے ہو تو اسے ملامت آمیز انداز میں کہو کہ اس کی ذہنیت غلامانہ ہے . . . . وہ تہذیب کا غلام ہے، یورپ کا غلام، اشتراکیت کا غلام!

میں نے کہا: "غلام دشمنی کا غلام بھی تو کہا جا سکتا ہے۔"
عیار بڈھے نے کہا: "ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔"

کھوپریاں

روشنی سے جگمگ جگمگ کرتا ہوا ایک شاندار ایوان، جس میں کچھ [illegible] جمع ہیں۔

تمام چہروں پر مسرت جھلک رہی ہے اور سب کی گفتگو میں زندہ دلی پائی جاتی ہے . . . . ایک مشہور رقاصہ کی تعریف نہایت زور شور سے کی جا رہی ہے۔ وہ کہتے ہیں وہ ایک غیر فانی دیوی ہے . . . . آہ کل اس کا آخری نغمہ کتنا دلکش تھا۔

یکایک، جیسے کسی جادوگر نے جادو کر دیا ہو۔ ہر سر اور ہر چہرے پر سے چمڑے کا نازک غلاف اتر گیا، اور ایک پل میں مُردوں کی سی سفید سفید کھوپریاں نمایاں ہو گئیں جن کے ننگے جبڑے اور سوڑے چمک رہے تھے۔

ان جبڑوں اور مسوڑوں کی حرکت، لیمپوں اور موم بتیوں کی روشنی میں ان گُھٹل ڈھیلوں کا گھماؤ اور چمک، اور ان کے اندر چھوٹی چھوٹی گولیوں یعنی بے معنی آنکھوں کی گردش میں دیکھ رہا تھا اور خوف کھا رہا تھا مجھے اپنے چہرے کو ہاتھ لگانے کی جرات نہ ہوئی تھی، آئینہ دیکھنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔

اور کھوپریاں بدستور اپنا رخ ادھر اُدھر پھیر رہی تھیں، اور بدستور ان کے کھکھاتے ہوئے دانتوں میں سے سرخ سرخ دھجیوں کی طرح ان کی تیز تیز زبانیں شور مچاتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ "کتنا حیرت انگیز طور پر کتنا بے مثال طور پر غیر فانی . . . . . . ہاں غیر فانی . . . . . رقاصہ نے اپنا آخری نغمہ گایا تھا۔"

منصور احمد

انگریزی

بات

میں نے کہا۔
"پیاری!
اب وقت آ گیا ہے
کہ میں تمہاری ماں کے ساتھ بات کروں؟"
لیکن وہ رو کر کہنے لگی
"نہیں، میری ماں تو کہتی ہے
مرد دھوکا دیتے ہیں،
میں جانتی ہوں وہ کبھی نہیں مانے گی۔
وہ کہتی ہے
جو لڑکیاں بیاہ میں جلد بازی کرتی ہیں
وہ پھر کفِ افسوس ملتی رہتی ہیں!"

میں نے کہا
"پیاری!
تو پھر میں تمہارے باپ سے بات کروں؟"
لیکن وہ رو کر کہنے لگی
"نہیں، میرا باپ تو مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے
کہ میرے جانے پر
کبھی رضامند نہ ہو گا۔
اگر میرے باپ کے ساتھ بات کرو گے
تو وہ ضرور انکار کر دے گا۔"
میں نے کہا
"تو پیاری!

میں پھر کس طرح اپنے لعل کو پا سکتا ہوں ؛
اگر تمہاری ماں
اور تمہارا باپ
اتنے ظالم ہیں
تو میں تو ضرور مر جاؤں گا "
لیکن وہ کہنے لگی
تپیارے !
مرنے کا ذکر نہ کرو ۔
مجھے تمہارے بچانے کا
ایک طریقہ نظر آگیا ہے ؛
میرے ماں باپ مخالف ہیں تو کیا ہوا
تم بات میرے ہی ساتھ کر لو "

ملک محمد اسلم خاں ایم اے

جب مجھے موت آئے !

جب مجھے موت آئے ،
اور یہ شرارِ حیات جو میرے سینے میں چھپا ہے ،
جو ابدیتوں سے بے پروا ہو کر دہکتا ہے ،
دوڑ کر نکل جائے ، زندگی کے عظیم الشان مرکز سے ملجانے کیلئے
تو خدارا مجھے دفن مت کرو ،
خاکِ سیاہ کے نیچے ، جہاں شعلوں کا گزر نہیں ،
نور کا ، حرارت کا ، ہر اس شے کا جس سے زندگی دلکش تھی ،
لیکن میری پژمردہ ہڈیوں کو یہاں سے دور لے جاؤ ، دور !
شہر کے شور و شغب سے دور ،
میرے جسم کے لئے ایک باد و باراں زدہ سل ڈھونڈھ لو ،
اور اس کے اوپر مجھے لٹا دو ،
جس کے بہت نیچے پتھریلی چٹانیں جھکی ہوئی ہیں ،
تیرہ و تار وادی کی طرف !
سفید رنگ کف آلود ندیاں
سیاہ ، آویزاں پتھروں کے بالمقابل گرتی ہیں ،
جہاں سورج کی مہر آگیں تابشیں کبھی نہیں چمکیں ،
جہاں ایک بلند ، تنہا ، مستحکم چوٹی ، جھولا جھلاتی ہے
پاس سے گذرتے ہوئے دیوتاؤں کو ،
اور جہاں انسانوں کے اطوار نہیں جانے جاتے ،
تاکہ میں اس موت میں بھی ، جو ہر چیز کے ساتھ لگی ہے ،
تیزی سے پگھلتی ہوئی برف کی خاموش تند آواز سن سکوں ،
اور بارش کی جھاجھم ؛
بارہ سنگوں کی وحشیانہ ڈکار ،
اور تیز اڑتی ہوئی ہوا کی درشت نشتریں ہم آغوشی مل جائے ؛
اور اس حالت میں بھی تھرتھراتی ہوئی صبح ،
میری آنکھوں کے خالی ، بے نور خانوں کو چھوئے ،
میں ڈوبتے سورج کو دیکھوں ،
پھر دفعتاً رات کی مخملی لطافت مجھے آلے ،
اور میں چمکتے ہوئے ستاروں کا نظارہ کروں !

(ن م راشد) "نخلستان"

دمے با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد — بمے بفروش دلقِ ما کزیں بہتر نمی ارزد
بکوئے مے فروشانش بجامے در نمی گیرند — زہے سجادۂ تقویٰ کہ یک ساغر نمی ارزد

حافظ

نقد و نظر

کلیاتِ طغرائی

ملک الشعرا حکیم فیروز الدین احمد فیروز طغرائی مرحوم امرتسری کے اردو فارسی کلام کا مجموعہ ہے جو ان کے قابلِ فخر تلمیذ صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم ایم اے لکچرار گورنمنٹ کالج لاہور نے مرتب کیا ہے۔

ابتدا میں پروفیسر تبسم نے ان کے سوانح حیات لکھے ہیں جو چھبیس صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد مرحوم کے اردو فارسی کلام پر جداگانہ تبصرے ہیں جو علی الترتیب مولانا محمد حسین صاحب عرشی امرتسری اور ممتاز حسن صاحب احسن ایم اے اسسٹنٹ اکونٹنٹ جنرل لاہور نے لکھے ہیں۔

مرحوم اردو اور فارسی کے کہنہ مشق اور خوش گو شاعر تھے۔ قدیم رنگِ تغزل کو خوب نبھایا ہے۔ اس کے علاوہ چند سیاسی۔ اخلاقی اور اسلامی نظمیں اور قصائد ہیں اگرچہ مرحوم کے کلام میں جذبات کی فراوانی اور لطافت نہیں، لیکن زبان اور فن کے لحاظ سے یہ مجموعہ قابلِ قدر ہے اور شاعری کے دلدادہ حضرات کو اسے خرید کر مرحوم کے عقیدت مندوں اور تلامذہ کی مساعی کی داد دینی چاہیئے نمونہ کے طور پر چند اشعار درج کئے جاتے ہیں:

اردو :- شبنم گل کی پرساں تھی نرگس شبنم کا پرساں تھا ، جو گریاں تھا سو گریاں تھا جو خنداں تھا سو خنداں تھا
سوائے نغمۂ اندوہ پیدا اور کیا ہوتا ، ادھر مضطرب حسرت تھی ادھر تارِ رگِ جاں تھا

حال اُس بزم میں ہم شام و سحر کہتے ہیں   کوئی سنتا نہیں ہرچند، مگر کہتے ہیں
اور کچھ اس کے سوا فلسفۂ عشق نہیں   کر لیا دل میں کسی چیز نے گھر کہتے ہیں
منظورِ نگاہِ بتِ پُرفن نہ ہوئے ہم   صد شکر کہ رنجِ دلِ دشمن نہ ہوئے ہم
محفلِ انس میں پابندیٔ آداب نہیں   ہم کو بھی تاب نہیں آپ کو بھی تاب نہیں
مجھ سے آگے ہے راہِ الفت میں ،   پوچھے کیا ہو میری ہمت کی

فارسی :- صفتِ نگہ تست بساز اے محبت   دل ورنہ متاعیست کہ ارزاں شدنی نیست
گیسوئے تو بگرفت سیاہی و درازی   از تیرہ شبِ من کہ بپایاں شدنی نیست
ممتازِ نگاہِ تو فرود آمدہ در دل   پیمانۂ مرا بے مئے احمر نتواں گفت
ہر گز بزی تیغ تو برنگ دگرے ہست   ہر جلوہ باکرے تو بجز نتواں گفت
کیفیت لے برشگال مپرس   بادہ! از سحاب می ریزد
اک جبیں را عرق فشاں بینم   اختر از ماہتاب می ریزد

نظموں میں "ایثار و طلب" "ہلال" "جگنو اور دل" خوب ہیں۔ کتاب "بانگ درا" کے سائز کے ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ کاغذ۔ کتابت اور طباعت عمدہ مصنف کی تصویر بھی شامل ہے۔ قیمت عہ حکیم محمد حسین صاحب عرشی چوک لاہوری دروازہ امرتسر سے مل سکتی ہے۔

نغمۂ زندگی

مولانا عبد الحکیم خاں صاحب نشتر جالندھری نے اس نام سے اپنی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ شائع کیا ہے دو سو سے کچھ ہی زائد صفحات ہیں لیکن کتاب کھلے رنگا رنگ کا ایک گلدستہ ہے۔ مذہبی۔ قومی۔ اخلاقی۔ ادبی سب قسم کی نظمیں اور قدیم و جدید دونوں رنگ میں غزلیں موجود ہیں۔ نشتر صاحب کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ فن اور زبان کے لحاظ سے بے عیب ہوتی ہے۔

مندرجۂ ذیل حیات پرور اور پُر جوش اشعار ملاحظہ فرمائیے جو ان کی نظم سالِ نو سے منتخب ہیں۔

چھیڑ ترانہ وقت کا
دیکھ بدل گئی ہوا
سازِ عمل بجائے جا
تال نئی ہو سُر نیا
نغمہ سرائے زندگی مژدۂ سالِ نو ہوا
مژدۂ سالِ نو ہوا نغمہ سرائے زندگی

ایک وطن پرست کو اس سے بڑھ کر وطن پر کیا ناز ہوگا :-

آنکھ کھولی آرزوؤں نے تری آغوش میں
ایک مشتِ گِل میں پیدا ہوگئے سو بانکپن !
اے وطن ! اے مرے پیارے وطن !

غزلوں میں معارف اور تغزل دونوں موجود ہیں۔

ہمہ یک تو ہو جلوہ ہے بیتابِ نمود   چشمِ محرم سے کبھی یار نے پردہ نہ کیا
دیدنی ہے مرا نیرنگِ جنوں اے نشتر   کبھی فرزانہ بنایا کبھی دیوانہ کیا
چھیڑ ہاں چھیڑ وہی نغمۂ افکارِ جمیل   عشقِ مایوس کو بیتابِ تمنا کر دے
کیف انگیز ہے نظارۂ چشمِ ساقی   موج زن [illegible] نظر آتا ہے مجھے
خود نمائی کے لئے کون لبِ بام آیا   اک جہاں محوِ تماشا نظر آتا ہے مجھے

کتاب کے آغاز میں مولانا غلام رسول صاحب مہر کے قلم سے ایک دلکش اور مبسوط مقدمہ ہے جس میں انہوں نے نشتر صاحب کے خاندانی حالات، نشتر سے اپنے تعلقات اور نشتر کی شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ نونہالِ زندگی مجلد ہے اور مصنف کی تصویر سے مزین ہے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ فیروز پرنٹنگ ورکس ۱۱۹ سرکلر روڈ لاہور سے طلب فرمائیں۔

بیاضِ سحر:- ایک دلچسپ اخلاقی اور اصلاحی ناول ہے جسے ایک قابل خاتون وہاب صاحبہ سدید (اہلیہ شیخ تراب علی صاحب) نے آسان اور بامحاورہ اردو زبان میں لکھا ہے۔ ہندوستانی تہذیب و تمدن میں بیرونی اثرات سے جو تغیر واقع ہوا ہے اس پر انہوں نے ایک مفکرانہ پیرائے میں بحث کی ہے اس کے ساتھ ہی تعلیمِ نسواں اور شادی بیاہ کے طریقوں کی اصلاح کے سلسلے میں مفید مشورے بھی دیئے ہیں اور مذہب اور قوم میں اتحاد و یکجہتی کی طرف لطیف انداز میں توجہ دلائی ہے۔ سا‌ڑھے پانچ سو صفحے کی یہ ضخیم کتاب بیگم تراب علی صاحبہ کے علم و فضل کا ایک زندہ ثبوت ہے ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کہانی آزادی اور روشن خیالی کے ساتھ ساتھ ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں اخلاق اور سوچ بچار پیدا کرنے کے لئے ایک بہترین ذریعہ ہو سکتی ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت مجلد مع سطلا تین روپے آٹھ آنے۔ پتہ:- قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور۔

فلسفۂ تاریخ۔ مصنفہ شیخ غلام محمد صاحب احمد ایم اے، ایم او ایل۔ اس کتاب میں قوموں کے تہذیب و تمدن کے پیشِ نظر اُن کے عروج و زوال کے اسباب پر تاریخی حوالجات سے روشنی ڈالی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح کوئی قوم ایک زمانے میں پستی و نکبت کے قعر میں گرتی ہے اور کس طرح پھر رفتہ رفتہ ترقی کی منازل طے کرتی ہوئی تہذیب و کامرانی کی بلندیوں پر نظر آتی ہے۔ قوموں کے عروج کے پانچ بڑے اسباب بتائے ہیں۔ مساوات و وحدت نوعی، اعلیٰ نظامِ سیاست، اعلیٰ اخلاقی حالت، علوم و فنون کی دلدادگی اور اعلیٰ فوجی تنظیم۔ اور ان کے زوال و ہبوط کا ذمہ دار اُن کے جبر و استبداد، ان کے بگڑے ہوئے نظامِ حکومت، ان کی اخلاقی پستی، ان کی فنونِ لطیفہ پر فریفتگی اور ان کے کمزور فوجی نظام کو قرار دیا ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب بڑی محنت اور کاوش سے لکھی گئی ہے اور مصنف کا اندازِ بیان اس قدر دلکش ہے کہ فلسفہ کی بجائے یہ ایک کہانی معلوم ہوتی ہے۔ حجم ۱۴۲ صفحات قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ پتہ:- دارالتصوف معرفت اخبار "ترجمانِ کشمیر"۔ جموں۔

تین جیمز آف غالب۔ اس نام سے مسٹر شہاب الدین رحمت اللہ بی اے نے غالب کے دس اشعار کا ترجمہ انگریزی زبان میں شائع کیا ہے، اور اس کے ساتھ ہی ان اشعار کو تصاویر میں بھی منتقل کیا ہے۔ نظم کو ایک زبان سے دوسری میں منتقل کرنا ایک نہایت مشکل کام ہے لیکن جس خوش اسلوبی کے ساتھ ہمارے دوست نے غالب کے اشعار کو انگریزی زبان میں پیش کیا ہے اس کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنی کوشش میں بہت کامیاب رہے ہیں۔ بعض تصاویر بھی فنکارانہ حیثیت سے بلند درجہ رکھتی ہیں۔ کتاب اعلیٰ درجہ کے آرٹ کاغذ پر بلاکوں کے ذریعے چھپی ہے قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ مسٹر ایس رحمت اللہ، یوسف بلڈنگ، فیروز روڈ۔ پٹنہ۔

۱۔ **تجدیدِ شباب کے چند مغربی طریقے**۔ اس میں اطبائے مغرب کے وہ مختلف طریقِ علاج لکھے ہیں جن سے وہ کمزور انسانوں کے جسم میں از سرِ نو قوت پہنچاتے ہیں اور بڑھاپے کو جوانی سے بدل دیتے ہیں۔

۲۔ **اعادۂ شباب کا ایک سہل طریقہ**۔ اسمیں ڈاکٹر معاورسکی کے ایجاد کردہ طریقہ انتقالِ خون کا بیان ہے یہ طریقہ مصنف کی دانست میں نہایت آسان ہے اور ایک ہوشیار ڈاکٹر اسے انجام دے سکتا ہے

۳۔ **اعادۂ شباب اور درازئ عمر**۔ اسمیں فاضل مصنف کے سفرِ یورپ اور وہاں سے واپس آنے کے بعد تین سال سے زاید کے تجربات درج ہیں۔

۴۔ **عمر کے گھٹنے کے اسباب**۔ اس میں فرداً فرداً ان عادات کا ذکر ہے جن سے عمر کوتاہ ہوتی ہے اور انسان قبل از وقت بوڑھا ہو جاتا ہے اس رسالے میں یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ مذہب اسلام نے جن چیزوں کو حرام اور ناجائز قرار دیا ہے انمیں ہر ایک بالواسطہ یا بلاواسطہ صحت کیلئے مضرت رساں ہے

۵۔ **بڑھاپے سے مقابلہ**۔ اس میں پروفیسر شتاینا خ کے اصول اعادۂ شباب کا بیان ہے۔

۶۔ **درونِ افرازیات**۔ اس رسالے میں اُن غدودی رطوبات کا بیان ہے جو انسان کے جسم میں جذب ہو کر شباب وغیرہ پیدا کرتی ہیں۔

۷۔ **وٹامانس**۔ اسمیں یہ لکھا ہے کہ جواہرِ غذا کیا ہیں اور انکے افعال کیا ہیں اشیا میں ان جواہر کا وجود ہمیں بتاتا ہے کہ ہم کو غذا کی تیاری میں حد سے زیادہ نفاست کی جانب مائل نہ ہونا چاہئے۔

۸۔ **قوائے جسمانی پر غذا کا اثر**۔ اس رسالے میں حالات کے لحاظ سے غذا تجویز کی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ مرض کی حالت میں دوا کے ساتھ غذا کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔

۹۔ **نفسیاتی علاج**۔ اس میں نفسی یا روحانی قوتوں کے ذریعہ سے مریضوں کا علاج کرنے کے تین بڑے بڑے طریقوں کا بیان ہے۔

مندرجہ بالا نو رسالے جو دو دو تین تین جز پر شائع ہوئے ہیں لفٹننٹ کرنل ڈاکٹر محمد اشرف صاحب ایم بی ایچ ڈی (آنرز) ایم ڈبلیو ایل ایس آر (برلن) قلعہ گولکنڈہ حیدرآباد دکن کی تصنیف ہیں۔ انہوں نے ان مضامین کو اصل ماخذوں سے نہایت تحقیق کے بعد اخذ کر کے اردو میں لکھا ہے اور انکی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ عام اردو طبی کتابوں کی طرح غلط سلط نہیں چھپیں بلکہ ان میں نہایت صحیح معلومات درج ہیں لکھائی چھپائی اور کاغذ بہترین قیمت علی الترتیب ۶ر ۲ر ۴ر ۸ر ۴ر ۲ر ۳ر ۲ر ہے مصنف موصوف سے طلب فرمایئے

فرانسیسی افسانے۔ مرتبہ و مترجمہ جناب عزیز احمد صاحب۔ اس مجموعے میں فرانس کے نو بڑے بڑے افسانہ نویسوں کے نو بہترین افسانوں کا اردو ترجمہ دیا گیا ہے مرتب خود ایک اچھے افسانہ نویس ہیں اور انکی تمہیدِ کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ادب کا انہوں نے وسیع اور غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے انہوں نے اس میں ایسے افسانے انتخاب کئے ہیں جو اپنی لطافتِ بیان، حسن کاری اور فرانسیسی طرزِ معاشرت کے اظہار کیلئے نمائندگی کا درجہ رکھتے ہیں کتاب کی تمہید کو فرانسیسی ادب کی ایک مختصر تاریخ کہنا چاہئے قیمت ۱۲ر مکتبہ ابراہیمیہ سٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

فہرست مضامینِ "ادبی دنیا"

جلد ۱۰ — بابت ماہ جون ۱۹۳۴ء — نمبر ۳

تصویر

باغ کے دروازے پر

سالانہ چندہ چار روپے سات آنے۔ محصولڈاک و وی پی نو آنے کل پانچ روپے۔ ممالک غیر سے دس شلنگ

آئینۂ عالم

تعلیم کا مقصد تہذیب و تمدن ہے

تعلیم کا یہ مجوزہ مقصد ان دو عنصروں پر مشتمل ہونا چاہیے:-
مقاصد زندگی کے تخیل پر اور نفسیاتی مدوجزر کے علم یعنی ذہنی تغیر کے قانون پر۔ ایسے دو شخص جن کے درمیان مقاصد زندگی میں اختلاف ہو تعلیم کے متعلق متفق نہیں ہو سکتے۔ تمام مغرب میں تعلیم کی کل دو اخلاقی نظریوں پر چلتی ہے۔ ان میں سے پہلا مسیحیت اور دوسرا قومیت ہے۔ جب ان دونوں کو اہمیت دی جاتی ہے تو یہ ایک دوسرے کے نقیض ثابت ہوتے ہیں، جیسا کہ جرمنی کے حالات سے ظاہر ہو رہا ہے۔ یہ ہے رائے مغرب کے ایک بڑے حکیم برٹرینڈ رسل کی۔ وہ کہتے ہیں اگر مجھ سے پوچھیے تو میں کہوں گا کہ جہاں ان دونوں میں اختلاف ہو وہاں مسیحیت قابل ترجیح ہے، لیکن جہاں ان کا اتحاد ہو جائے سمجھ لو کہ وہاں دونوں کو غلط فہمی ہوئی ہے +

وہ تخیل جو میں اس کے بجائے تعلیم کے مقصد کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں تہذیب ہے۔ جس کے معنی میرے نزدیک ایک حد تک انفرادی ہیں اور ایک حد تک معاشرتی۔ فرد میں یہ ذہنی اور اخلاقی دونوں صفات پر مشتمل ہوتی ہے۔ ذہنی حیثیت سے ایک خاص حد تک عام معلومات کا علم، اپنے فن میں مہارت اور کسی شہادت پر اپنی رائے قائم کرنے کی عادت۔ اخلاقی طور پر غیر جانبداری، حسن سلوک اور ضبط نفس +

میں ایک اور وصف کا بھی اضافہ کروں گا جو نہ تو اخلاقی ہے نہ ذہنی بلکہ طبعی ہے، اور وہ ہے زندگی کا لطف اور مسرت۔ قوموں میں تہذیب کا مطالبہ قانون کا احترام، ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان عدل، نوع انسان کے ہر فرقے کے حقوق کا تحفظ، اور مقاصد کے لئے موثر ذرائع اختیار کرنے کا شعور ہے +

اگر تعلیم کے مقاصد یہی ہیں تو نفسیات کے علم کے لئے قابل توجہ سوال یہ ہے کہ ان کے حصول کے لئے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے اور خصوصاً یہ کہ کس قدر آزادی موثر ثابت ہو سکتی ہے +

تعلیم میں آزادی کے مسئلے پر اس وقت اختلاف خیال کے لحاظ سے تین بڑے سکول ہیں جن کا انحصار کچھ تو مقاصد کے اختلافات پر ہے اور کچھ نفسیاتی نظریے کے اختلافات پر۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ بچے خواہ کتنے ہی برے کیوں نہ ہوں وہ بالکل آزاد ہونے چاہئیں۔ ایسے بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ بچے خواہ کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں ان کو کامل طور پر استاد کے حکم کے ماتحت رہنا چاہیے۔ اور پھر ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ انہیں آزاد ہونا چاہیے۔ لیکن آزادی کے باوجود انہیں ہمیشہ نیک رہنا چاہیے۔ یہ آخری جماعت جتنی غیر منطقی ہے اتنی ہی زیادہ ہے۔ سب بچے بڑوں کی طرح شرارت سے باز نہیں رہ سکتے اگر ان کو پوری آزادی حاصل ہو۔ یہ عقیدہ کہ آزادی اخلاقی تکمیل کی ضمانت ہے، روسو کے مسلک کا ایک فرسودہ خیال ہے؛ اور حیوانوں اور بچوں کے معاملے میں کسی کام نہیں آ سکتا۔ اس عقیدے کے لوگوں کا خیال ہے کہ تعلیم کو بجائے خود کوئی حیثیت حاصل نہیں ہونی چاہیے بلکہ اسے محض ایک ایسا ماحول پیش کرنا چاہیے جو بچوں کی ذاتی ترقی کے لئے موزوں و مفید ہو۔ میں اُن لوگوں کا ہم خیال نہیں ہو سکتا، جو مجھے حد سے زیادہ انفرادیت پرست اور علم کی اہمیت سے نہایت غافل معلوم ہوتے ہیں۔ ہم جماعتوں کے اندر رہتے ہیں جنہیں موالات باہمی کی ضرورت ہے، اور یہ توقع رکھنا کہ جس موالات کی ضرورت ہے وہ ذاتی جذبات ہی سے پیدا ہو جائے گی ایک وہم ہے۔ ایک بڑی آبادی کا ایک محدود رقبے میں سمانا صرف علم اور علمیت پر منحصر ہے۔ اس لئے بقدر ضرورت انہیں تعلیم میں شامل ہونا چاہیے۔ تعلیم، معاشرتی نقطہ نظر سے ایک محض اتفاقی تربیت کی بجائے زیادہ حقیقی ہونی چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ تربیت بھی اس کے دائرہ عمل میں داخل ہے، لیکن ایک ذہنی اور اخلاقی ساز و سامان بھی اُسے مہیا کرنا چاہیے جسے بچے اپنے آپ حاصل نہیں کر سکتے +

حقیقت یہ ہے کہ تعلیم میں آزادی کی حمایت میں جو دلایل پیش کئے جاتے ہیں وہ انسان کی فطرتی نیکی سے اخذ نہیں کئے جاتے بلکہ پابندی کے اُن اثرات سے لئے جاتے ہیں جو بچوں پر پابندی عائد کرنے والوں پر نمایاں ہوتے ہیں جن بچوں پر پابندیاں عاید کی جاتی ہیں ان میں یا تو مسکنت پیدا ہو جاتی ہے یا وہ بغاوت اختیار کرتے ہیں، اور یہ دونوں عیب ہیں +

میں نہیں سمجھتا کہ معلمین ابھی تک آزادی کی حسب دلخواہ صورت اور ضروری اخلاقی تربیت کے امتزاج کے مسئلے کو حل کر سکے ہوں - یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اس مسئلے کا صحیح حل والدین اپنے بچوں کو روشن خیال مدارس میں بھیجنے سے پہلے ہی ناممکن کر دیتے ہیں - جس طرح تحلیلِ نفسی کے ماہرین نے اپنے تجربوں سے ثابت کر دیا ہے کہ ہم سب دیوانے ہیں بالکل اسی طرح جدید مدارس کے معلمین جن کو اُن بچوں سے سابقہ پڑا ہے جنہیں ان کے والدین نے بدلگام بنا دیا ہے یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ تمام بچے منہ زور ہوتے ہیں اور تمام والدین قطعاً احمق - استادوں کو ان بچوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے جو والدین کے ظلم (جو اکثر مترشح محبت کی صورت اختیار کر لیتا ہے) کی وجہ سے سرکش ہو جاتے ہیں آزادی کا نسبتاً زیادہ عرصہ درکار ہوتا ہے - لیکن اُن بچوں کو جن کی تربیت گھر پر اچھی طرح ہوئی ہے اگر ایسے معاملات میں ٹوکا جائے جن کی اہمیت کو وہ خود سمجھتے ہوں تو وہ بلا چون و چرا اس بات کو مان لیتے ہیں - وہ استاد جنہیں بچوں سے دلچسپی ہوتی ہے اور جن کے اعصاب ان کی معیت میں درہم و برہم نہیں ہو جاتے تعلیم کے نتائج حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوتے ہیں اور شاگردوں کے دلوں میں دوستی کے جذبات بھی پیدا کر لیتے ہیں +

میرا خیال ہے عہد حاضر کے تعلیمی نظریئے بنانے والے حضرات بچوں کے معاملات میں دوستانہ دلچسپی کی خوبی کو بہت زیادہ اور ان کی معیت سے لطف اندوز ہونے کے وصف کو بہت کم اہمیت دیتے ہیں - اگر بچوں کے لئے آپ کو اسی قسم کا انس ہے جس قسم کا بہت سے لوگوں کو اپنے گھوڑوں اور کتوں کے لئے ہوتا ہے تو بچے بڑا ماننے کے بغیر شاید ذرا سے تامل کے بعد آپ کی تجاویز کو ماننے اور آپ کی ممانعت کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے - ان سے اس طرح کی بے جان دلچسپی لینے کا کچھ فائدہ نہیں جس سے یہ ظاہر ہو کہ آپ انہیں معاشرتی جد و جہد کا ایک میدان سمجھتے ہیں - ایک بچہ ایسی دلچسپی لینے سے ہرگز آپ کا شکر گذار نہیں ہو سکتا جو اس خیال سے پیدا ہوا ہو کہ اسے آپ کی جماعت میں شامل رہنے کے لئے ایک رائے حاصل ہو گی یا اسے بادشاہ اور ملک پر قربان ہونے کا حق ہو گا - ضرورت اس قسم کی دلچسپی کی ہے جس میں کسی بعید تر مقصد کو مدنظر رکھے بغیر اس کی معیت سے آپ کو خوشی حاصل ہو - جن معلمین میں یہ وصف ہوتا ہے انہیں شاذ و نادر ہی بچوں کی آزادی میں دخل دینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، لیکن جب ضرورت ہو تو کسی نفسیاتی نقصان کے بغیر وہ ایسا کرنے پر قادر ہوتے ہیں +

بچوں کی صحبت تکان پیدا کرنے والی ہے - خصوصاً اُس وقت جب ان پر سے پابندیاں اٹھا لی جائیں اور تکان آخر میں تلخی پیدا کر دیتی ہے جس کا اظہار گھبرائے ہوئے استاد سے بہرصورت ہو جاتا ہے خواہ وہ کتنے ہی نظریوں کا قایل ہو - جس دوستانہ پن کی ضرورت ہے اس کی حفاظت صرف ضبطِ نفس سے نہیں ہو سکتی - لیکن جہاں یہ موجود ہے وہاں پہلے ہی سے ایسے قوانین بنانے غیر ضروری ہیں کہ جن کا مطلب یہ ہو کہ شریر بچوں سے کیا سلوک کیا جائے - کیونکہ محبت یقیناً آدمی کو صحیح نتیجے تک پہنچاتی ہے، اور اگر بچے کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپ اس کو پسند کرتے ہیں تو وہ ہمیشہ صحیح نتیجے پر پہنچے گا - کوئی قانون خواہ وہ کتنا ہی دانشمندانہ کیوں نہ ہو محبت اور حکمت عملی کا مقابلہ نہیں کر سکتا -

کرنل لارنس اور ہوا باز شا

نیوز کرانیکل کا ایک نامہ نگار سو تھمٹن سے لکھتا ہے :-

آج رات میں کرنل لارنس کے بھوت یعنی ہوا باز شا سے ملا، جو یہاں قریب ہی ایک معمولی سے مکان میں رہتا ہے - تقریباً ایک گھنٹے تک وہ اس غلط فہمی کی تردید کرتا رہا کہ وہ مشہور کرنل لارنس ہی ہے اور کرنل لارنس ہمیشہ کے لئے مر چکا ہے +

یہ خاموش اور مہذب انسان اپنے بستر پر بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرتا رہا - اس نے کہا "پورے پندرہ سال سے لارنس کی روح مجھ پر سوار ہے ہر جگہ میرا تعاقب کرتی ہے اور اس نے مجھے اقوام عالم کی نظر میں ایک ذلیل کتے

کا نذر بھی دے دیا ہے +

"کوئی قوم مجھے قبول کرنے کو تیار نہیں۔ فرانس، جرمنی، ٹرکی ان میں سے کسی ملک میں داخل ہونے کے لئے مجھے پروانۂ راہداری نہیں ملتا۔ اپنی شہرت، نہیں بدنامی کے باعث میں ہندوستان سے نکلا اور وہاں کے ہوائی بیڑے سے علیحدہ کیا گیا +

"مجھے ہر ایک ملک میں داخل ہونے کی ممانعت ہے کیونکہ مجھے ایک خفیہ ایجنٹ سمجھا جاتا ہے۔ میں خفیہ ایجنٹ نہیں ہوں اور نہ کبھی رہا ہوں آئندہ سال میں ہوائی بیڑے کو چھوڑ رہا ہوں۔ میرا جی چھوڑنے کو نہیں چاہتا لیکن اب میں مزید بیس سال کے اقرار نامے پر دستخط نہیں کرسکتا۔ میں اب بہت بوڑھا ہو گیا ہوں اور یہ ایک جوان آدمی کا کام ہے +

"میں نہیں جانتا کہ میں اس کے بعد کیا کروں گا۔ میں اپنے دورانِ جنگ کے فرضی کارناموں کی سنسنی پیدا کرنے والی کہانیاں بیان کرکے اپنے ہاتھ آلودہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے صرف ایک مرتبہ ایسا کیا ہے اور وہ بھی محض اس لئے کہ ذاتی ضرورت کے لئے اس کے قلمبند کرنے کی مجبوری تھی۔ لیکن اس ایک غلطی کے علاوہ میرے ہاتھ پھر کبھی آلودہ نہیں ہوئے"۔

ہوا باز شا نے مسکرا کر اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا وہ مشینوں کے تیل اور سیاہی سے کالے ہو رہے تھے +

اس نے کہا "کوئی باوقار کارخانہ میری بدنامی کی وجہ سے مجھے ملازم نہ رکھے گا وہ جو کارخانہ میری شہرت سے روپیہ کمانے کیلئے مجھے ملازم رکھنا چاہے گا میں اسمیں ہرگز نہیں جاؤنگا"۔

میں ہوا باز شا سے اس لئے ملا تھا کہ عرب کی موجودہ صورتِ حالات پر اس کے خیالات معلوم کروں جہاں دو عرب بادشاہ ابنِ سعود اور امام یمن مصروفِ جنگ ہیں +

اس نے صاف طور پر کہہ دیا کہ "مجھے عرب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے مجھے عرب کی موجودہ صورتِ حالات کا کچھ علم نہیں۔ میں زمانے سے پندرہ سال پیچھے ہوں اگرچہ اطلاعات اسکے خلاف شائع ہوتی رہی ہیں لیکن میں پندرہ سال سے وہاں نہیں گیا۔

"حقیقت یہ ہے کہ میں ہوائی فوج میں ملازم ہوں، اور خواہ امکان ہوتا یا نہ ہوتا میں عرب کے متعلق کچھ نہ لکھ سکتا تھا بادشاہ کا قانون قطعی طور پر اس سے منع کرتا ہے۔ میں عرب میں صرف نو ماہ تک رہا ہوں، اور اب آج کے عرب کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں اگرچہ شاید اس آدمی کی بہ نسبت جو وہاں صرف نو دن رہا ہو میں اس ملک کے متعلق زیادہ علم رکھتا ہوں۔ بہرحال آپ یہ بتائیے کہ آپ کو فکر کس بات کی ہے؟"

میں نے کہا "عدن کا کیا حشر ہوگا!"

شا نے فوراً جواب دیا "عدن محفوظ ہے۔ جب میں دفتر نوآبادی میں تھا تو میں نے عدن کو کاسل اور ہوائی جہازوں کی حفاظت میں دے دیا تھا۔ خوبصورتی کیا فائدہ تھا؟ کچھ فایدہ نہیں۔ ہمیشہ وہی پرانا جھنجھٹ کرنا پڑتا ہے، وہی خندقیں کھودنی پڑتی ہیں۔

"مجھے امام یمن کے متعلق اس کے سوا کچھ معلوم نہیں کہ وہ اور اس کا خاندان وہاں ایک ہزار سال سے حکمران ہے۔ میں ابن سعود کو نہیں جانتا۔ میں کبھی اس سے واقف نہ تھا، کبھی اس سے نہیں ملا۔ مجھے عرب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے صرف ہوائی جہازوں اور کشتیوں سے دلچسپی ہے +

"میں ہوائی بیڑے میں اس لئے ملازم ہوں کہ میں ایک اپنا ہوائی جہاز بنانے کی مقدرت نہیں رکھتا۔ میرا خیال ہے کہ مجھ میں کبھی یہ مقدرت نہ ہو گی۔ ہوائی بیڑے میں مجھے ان مشینوں پر کام کرنے کا موقع ملتا ہے جن پر دولت کے خزانے صرف ہو جاتے ہیں"۔

میں نے اس عجیب و غریب جوان ہمت بڈھے سے پوچھا کہ اس نے فوج میں کیوں ترقی نہیں کی۔ اس نے آہستہ سے جواب دیا "کیونکہ صرف افسر مشینوں کو اڑاتے ہیں۔ ہم صرف ان کو بناتے ہیں اور چلاتے ہیں۔ مجھے صرف مشینوں سے دلچسپی ہے، روپے یا عہدے سے نہیں"۔

ہوا باز شا ایک نہایت تلخ کام آدمی ہے۔ وہ ایک عظیم الشان ناقابلِ فہم عقدہ ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب غم ہے جو اس زہر آلود مسکراہٹ کے پیچھے جھلکتا رہتا ہے جو اکثر اس کے ہونٹوں پر کھیلتی ہے۔ اس کے باوجود اسے ناخوش ہونے سے انکار ہے، کیونکہ جب میں نے اس سے کہا کہ آپ خوش معلوم نہیں ہوتے تو اس نے کہا کہ "مجھے کوئی غم نہیں"۔

اس نے کہا "مجھے ایک بہت اچھا کام ملا ہوا ہے۔ مجھے ہوائی جہازوں کلدار کشتیوں اور مشینوں پر کام کرنا پسند ہے۔ یہ ایک عام آدمی کا کام ہے مجھے اس کے کرنے میں خوشی حاصل ہوتی ہے۔ مجھ میں کوئی اسرار نہیں ہے۔ میں ایک بالکل معمولی آدمی ہوں جو اپنے طریقے پر اپنی روزی کماتا ہو۔ جو اسرار مجھ سے منسوب کیا جاتا ہے وہ محض ایک افسانہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے تنہا چھوڑ دیا جائے۔ ہر جگہ میرا تعاقب نہ کیا جائے اور مجھے میری جائے سکونت سے صرف اس لئے محروم نہ کیا جائے کہ مجھ پر لوگوں کو ایک شر انگیز شخصیت کا دھوکا ہے"۔

لارنس مر چکا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد شا کا بھی کوئی نام نہ لے گا اس کی طرف انگلیاں نہ اٹھیں گی۔ وہ ایک خلوت نشین عالم کی طرح اپنی چھوٹی سی کٹیا میں ایک گمنام آدمی کی مانند زندگی گزار دے گا۔ اگر وہ اپنے ضمیر کو قربان کردے تو اپنے قلم کی قوت سے ہزاروں پونڈ کما سکتا ہے +

مادی کائنات کی توسیع

مادی کائنات کا قطر اتنا ہے کہ اگر روشنی اسے عبور کرے تو اس سفر میں اسے ۶۰۰۰۰۰۰۰ سال لگ جائیں۔ یہ ایک محدود کرہ ہے جو غالباً خوفناک رفتار سے وسعت اختیار کر رہا ہے اور دم بدم بڑھ رہا ہے اس کی بیرونی حدود روشنی کی رفتار کے ساتھ یا تقریباً ۱۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ کے حساب سے اپنے مرکز سے پرے ہٹ رہی ہیں۔

ان حیرت میں ڈال دینے والے قیاسات کا اظہار ڈاکٹر ایڈون پی ہبل نے واشنگٹن (امریکا) میں نیشنل اکیڈیمی آف سائنسز کے سامنے کیا۔ کائنات کے حجم اور شکل کی نسبت یہ تازہ ترین قیاسات ہیں جو دنیا کی سب سے بڑی دُوربین کے ذریعہ سے قائم کئے گئے ہیں۔ یہ دُوربین مسٹر ولسن کی مشہور رسدگاہ میں نصب ہے۔ نئے قیاسات ماقبل کے تمام اندازوں سے اسقدر بڑھے ہوئے ہیں اور ان کی وسعت اسقدر زیادہ ہے کہ محدود دماغوں کے لئے ان کا احاطہ کلیۃً ناممکن ہے۔

مثلاً روشنی تقریباً ۱۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ کے حساب سے سفر کرتی ہے۔ چاند سے زمین تک وہ دو سیکنڈ میں پہنچ جاتی ہے۔ آفتاب سے ہم تک پہنچنے میں آٹھ منٹ لیتی ہے۔ چند گھنٹوں میں نظامِ شمسی کو عبور کر کے پلوٹو کے مدارِ بعید تک جا پہنچتی ہے۔ اور قریب ترین ستارے سے ہم تک پہنچنے میں اندازاً چار سال صرف کرتی ہے۔

یہ کہکشاں کا قطر تقریباً ۱۰۰۰۰۰ سال میں طے کرتی ہے۔ اور قریب ترین "جزیراتی دنیا" یعنی سحابِ ماجلانِ اصغر سے ہم تک پہنچنے میں بھی تقریباً اسی قدر وقت لیتی ہے۔ مرأۃ مسلسلہ میں سحابِ نجمی اعظم کے اُس بعید ترین ستارے سے جو برہنہ آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے ہماری زمین تک یہ ۹۰۰۰۰۰ سال میں آئی ہے۔

سحابِ ماجلانِ اصغر اور سحابِ نجمی اعظم ہماری کہکشاں کے نسبتاً قریب کے ہمسائے ہیں۔ اس سے پرے مسٹر ولسن کی دُوربین فوٹوگرافی کے ذریعے سے اُن ستاروں کو ہمارے لئے مرئی بنا دیتی ہے جن کی روشنی درمیانی فضا کی دوری کو ۳۰۰۰۰۰۰۰ سال میں طے کرتی ہے یا بالفاظِ دیگر اُن ستاروں سے تین سو گنا بعید ہیں جن کو ہماری آنکھ بغیر کسی مدد کے دیکھ سکتی ہے۔ ڈاکٹر ہبل کہتے ہیں کہ اس بعد دراز مقام پر کم از کم ۱۰۰۰۰۰۰ سحابیات نجمی دیکھے جا سکتے ہیں جن میں سے ہر ایک ہماری کہکشاں جتنا بڑا ہے۔ یہ بظاہر تمام اطراف میں فلک کے اندر کافی ہموار طریقے پر منقسم ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بہت سے اسقدر دور ہیں کہ موجودہ زمانے کی دوربینوں سے ان کے الگ الگ ستارے پہچانے نہیں جا سکتے۔ تاہم ان میں سے ہر سحابِ نجمی میں ہمارے آفتاب جو ایک اوسط درجے کا ستارہ ہے ۸۰۰۰۰۰۰ گنا زیادہ مواد موجود ہے۔

تمام سحابیات حرکت میں ہیں، اور ایک بے مثال یکسانی کے ساتھ ہماری کہکشاں کے عام رخ سے ان کی حرکت بعید تر ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ جتنی دور کوئی سحاب ہے اتنی ہی تیزی سے وہ حرکت کر رہا ہے۔ اپنے مشاہدے کی روشنی میں ہم اپنے مفروضات کو تاہی ثابت کر سکتے ہیں کہ ہم اس کو تسلیم کریں کہ ایک زمانے میں جس کو اب ۲۰۰۰۰۰۰ سال گذر چکے ہیں کائنات کا تمام مادہ جمع تھا اور پھر وہ ایک گولے کی طرح پھٹا اور سحابیات فضا میں پھیل گئے۔

لیکن یہ کیا شاندار گولا پھٹا! ڈاکٹر ہبل جن سے بڑھ کر کائنات کا مشاہدہ اور مطالعہ غالباً دنیا میں کسی نے نہیں کیا کہتے ہیں کہ جو سحابیات قریب تر ہیں وہ نسبتاً کم رفتار کے ساتھ حرکت کر رہے ہیں مگر جو بعید تر ہیں ان کی رفتار بھی اسی نسبت سے زیادہ ہے جن سحابیات کی دُوری ۳۰۰۰۰۰۰ نوری سال ہے وہ تیس سے چالیس ہزار میل فی سیکنڈ یا تخمیناً روشنی کی رفتار سے ⅙ رفتار کے ساتھ حرکت کرتے ہیں۔ اسی بنا پر ڈاکٹر ہبل نے کُل کائنات کے قطر کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ آئن شٹائن کا نظریہ یہ ہے کہ مادہ روشنی سے زیادہ رفتار کے ساتھ سفر نہیں کر سکتا، اس لئے ہماری کائنات کی حد اُس نقطہ پر مقرر ہونی چاہیئے جہاں سحابیات کی اسراعِ حرکت اس رفتار کے ساتھ جا کر مل جائے۔

اگر کائنات کے مرئی حصے میں فاصلے کی اس شرح ایزادی سے باقی پر بھی قیاس کیا جائے تو اسکی حد ۶۰۰۰۰۰۰۰ سال پر جا کر ختم ہوتی ہے یا شاید ۳۰۰۰۰۰۰ سال گزرے جب نظر آنیوالے اس بعید ترین سحاب کی روشنی نے زمین کی جانب اپنا سفر شروع کیا تھا۔ ڈاکٹر ہبل کی رائے میں کائنات اس زمانے سے اب بدرجہا بڑی ہے اور اسکے علاوہ خالی بھی، کیونکہ اگر توسیع کا نظریہ درست ہے تو یہ سلسلہ جاری رہا ہے اور آئندہ بھی غیر محدود زمانے تک روشنی کی رفتار سے جاری رہے گا۔

ستاروں کی اس بیشمار تعداد کے باوجود جس کا اندازہ ۵۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ سحابیات کا ۰۰۰۰۰۰۰۰ گنا لگایا گیا ہے کائنات اتنی خالی ہے کہ دنیا کا کوئی معمل آج تک اس سے بہتر خلا تیار کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ ستاروں اور سحابیات کے درمیان اتنی جگہ ہے کہ اگر ایک کے عدد کے ساتھ تیس صفر لگا دیئے جائیں تو فضا کی ہر کا ئی کو کل مادے کا صرف ایک گرام حصے میں آئے گا۔ ڈاکٹر ہبل نے کہا کہ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ہماری زمین جتنی جگہ میں ریت کا ایک ذرہ ڈال دیا جائے۔

منصور احمد

ترقی کرتی ہوئی نسل کو ایک نئے نصب العین کی حاجت

پیٹر فارسٹ کا ایک مضمون جسے پڑھ کر آپ سوچنے لگیں گے

جو کوئی ان کارخانوں میں کام کرتا ہے وہ ضرور کہتا ہے کہ میں کروڑپتی ہونے والا ہوں۔ جوتا سازی کے ایک کارخانے میں جہاں چند بچوں کی تعلیم شروع ہونے والی تھی انہیں نصیحت کے یہ انمول موتی نثار کئے گئے تھے۔

بڑی عجیب بات ہے کہ ماضی کے تلخ تجربوں کے بعد بھی ایک ایسا انسانی طبقہ اب تک موجود ہے جو ذاتی دولت کو شاہراہ کامیابی کا تاج سمجھتا ہے۔ ایک وقت جب مورخین ہمارے زمانے پر تنقیدی نظر ڈالیں گے تو خود ہم سے ہمارے وقتوں کی جو باتیں چھپی ہوئی ہیں اُن کے سامنے آئینہ ہو جائیں گی۔

ناقدین کہیں گے کہ ”اُن لوگوں نے سائنس اور ایجادات سے گہرے رشتے ناطے قائم کر لئے تھے اور پھر بھی اپنی سیاست کو حیات نہ بنا سکے۔ ذہین تھے تعلیم کے مدارج بلند تھے۔ پھر بھی ان کا معیار کامیابی مجموعی حیثیت سے پست تھا۔ اور بے شک جب اس پست معیار اور حیرت انگیز بلند مادی تہذیب میں تصادم ہوتا تھا تو قومی جنگ اور خانہ جنگیوں کی بنیادیں اور مضبوط ہو جاتی تھیں۔ اس زمانے کی خصوصیت، بے چینی، مصائب، الجھن، مسرت کی کمی اور استقلال کا عدم تھا۔“

جھوٹے معیار ہماری ترقی کرتی ہوئی تہذیب ایک بڑی نازک منزل تک پہنچ گئی ہے۔ ہماری رفتار اوپر چڑھنا یا واپسی اور نیچے اُترنا اس بات پر موقوف ہے کہ آج کا بچہ کیا رنگ دکھلائے۔ جوان ہو کر اس کی کامیابیاں قابل قدر ہوں گی مگر زیادہ قابل قدر اس کا زاویہ نگاہ ہوگا۔

اگر ہم میں ذرا بھی عقل ہے تو ہمیں خیال رکھنا چاہئے کہ آج کے بچے اور کل کے انسان کی تعلیم و تربیت جھوٹے معیار سے نہ ہونی چاہئے۔ والدین ہوں یا معلم جو آنے والی نسل کے متعلق ذرا بھی ذمہ دار ہوں ان کو نوجوانوں میں پوری سنجیدگی کے ساتھ سچے جذبات اور قدر اشیاء کا صحیح سلیقہ پیدا کرنا چاہئے۔ ویسی تعلیم نہ ہو جس کا نتیجہ جنگ عظیم تھی، اور نہ بعد جنگ والی نسل کا معیار مدنظر ہونا چاہئے جس کا اعتقاد یہ ہے کہ دولت ہی قوت ہے اور دونوں کے ہو جانے سے حیات کا بہترین تحفہ حاصل ہو جاتا ہے۔

اعلٰے تعلیم اور تمام سماجی مصلحین جن کے لئے ہم رشتے جا رہے ہیں اندر ہی اندر گھل گھل کر ختم ہو جائیں گی اگر آج کے بچے کو سب سے بڑی تعلیم نہ دی جائے گی اور وہ ایسی فضا میں نہ بڑھیں گے جس میں قدیم اور روایتی عقائد کے برعکس صفائی اور سچائی کی نسیم روح پرور کے جھونکے چلتے تھے۔

بعد جنگ کے دور میں عظمت اور تعیش کی ہوس اپنی انتہائی حد سے بھی آگے نکل گئی ہے۔ ایسا تو نہ دیکھا تھا نہ سنا تھا۔ ہر طبقے نے بے پناہ تعیش کو اپنا مشرب بنا لیا ہے۔ ہر سال سامانِ تعیش کے خرچ بڑھتے جاتے ہیں۔ قومی شراب کی مد قومی روٹی اور قومی گوشت کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ آپ کو مردوں اور عورتوں میں بے شمار تعداد ایسوں کی ملے گی جن کی حیات کا مقصد صرف یہی ہے کہ ”زندگی مزے سے گزر جائے“ اور یہ کہ منت کی تو قاضی کو بھی حلال ہے۔

ایسوں کی کوئی قیمت نہیں ہے کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مگر وہ بچے اور بچیاں جو ایک کوڑی برس کے بعد مرد اور عورت ہوں گے بہت اہم ہیں۔ قوم اور افراد قوم دونوں کا فرض منصبی ہے کہ بچے آج کل کے فیشن کے مزخرفات سے اثر نہ لینے پائیں۔ مکان اور مدرسہ وہ کارخانے ہیں جہاں وہ بن سکتے ہیں اور جہاں بگڑ سکتے ہیں۔

بہت سے گھروں اور بہت سے مدرسوں میں بچوں کو یہی سکھایا جاتا ہے کہ کامیابی کے ان معیاروں کو مدنظر رکھیں جن کی بنا خود غرضی، ذاتی قوت، دل آزاری اور تنگ نظری پر ہے۔ اُن کی ہمتیں بڑھائی جاتی ہیں کہ دولت اور ملک یہی دو چیزیں کامیابیوں کے جوہر ہیں اور ایک مفتی گر سر و تاجِ انسان مضحکہ انگیز ہستی ہے۔

عالم افسانہ میں بھی نئے سورما کی ضرورت ہے۔ اب فوجی سپاہی یا بحری افسر ہیرو نہیں رہ گئے۔ آج کل کے سورما ایسے تکم پرست بوڑھے کرتے ہیں جو غباری تالوں کا چشمہ لگائے میدانِ جنگ سے بہت دور بیٹھے ہوئے موشگافیاں اور نقشہ پرستیاں کرتے ہیں اور آج حصولِ زر کی ان گنت راہیں ایسی پیدا ہو گئی ہیں کہ اب تحصیل زر کی کوئی وقعت نہیں رہ گئی۔

سچے سورما سچے سورماؤں کی کوئی پوچھ گچھ نہیں ہے۔ انہیں دیکھنا ہو تو صنعت کی بھٹیوں اور تجارت کی منڈیوں میں دیکھئے یا عمل میں آگے سیرت جیسے جہاں سکھ کے ساتھ وہ فطرت سے نئی معلومات کیلئے مغز ریزی میں مصروف ہیں جہاں وہ آٹھ پہر ایک کی بجائے گیہوں کی دو بالیں پیدا کرنے کی، زندگی بڑھانے کی، بیماریاں گھٹانے کی اور سچی تندرستی رکھنے کی تدبیریں سوچتے ہیں۔ بھلا کہاں وہ اور کہاں شہرت کے طلبگار، بھلا یہ کے وہ فتنہ جن کے نزدیک کامیابی یہی ہے جس کی ڈگی پٹ جائے سر فرو ہی سب سے بڑا عیب ہے جن کی نظر میں حیات مشرب کی سادگی بے مزہ اور بے معنی ہے۔ سچے سورماؤں کے یہاں وہ گہری قناعت وہ سچی مسرت اور وہ اچھا تبسم ہے جس کا دامن نمائش اور تکلف سے پاک ہے۔

ایسے نفوس غنیمت ہیں خاصکر اس زمانے میں جب کہ دولت کے شکاری مدتعیش کے بے شمار سے زیادہ ہو گئے ہیں۔

(عابد ایم اے)

سرِ راہے

اِک نازنیں نگاہ میں جادُو لئے ہوئے
ہر اک نفس میں نکہت و خوشبُو لئے ہوئے

تھی محوِ سیرِ باغ میں اور جا رہا تھا میں
دِل میں کسی خیال کو سُلجھا رہا تھا میں

گو زور ڈالتا تھا طبیعت پہ بار بار
ہوتے نہ تھے معانیٔ جاں بخش آشکار

گزری جو دیکھتی ہوئی مجھ کو وہ پاس سے
موسیقیاں سی ہونے لگیں مس حواس سے

بے اختیار ذہن میں کلیاں چٹک اُٹھیں
دِل باغ باغ ہو گیا آنکھیں چمک اُٹھیں

ادراک کے نقوش اُبھرنے لگے تمام
فکرِ رسا کے رنگ نکھرنے لگے تمام

اُمڈا جو دل سے شعر کا طوفان کیا کہوں
اُس نوبہارِ ناز کا احسان کیا کہوں

میری ہر اک نگاہ میں موتی پرو گئی
اُس کے طفیل ایک حسیں نظم ہو گئی

عدم

باغ کے دروازے پر

یہ تصویر تناسب کی جان ہے۔ روشنی اور سائے کا حسین توازن قابلِ دید ہے۔ پس منظر سائے میں ہے۔ لڑکی جو اس کی پشت پر دیوار اور باغ کی روش جو دروازے سے گزرتی ہوئی باہر کی طرف جاتی ہے دونوں روشنی میں ہیں۔ پردۂ تصویر پر روشنی اور سائے دونوں کے درمیان خطِ فاصل ایک تر کی صورت میں ہے اور سائے کا حصہ مکمل طور پر روشنی میں ہے۔ جیسا کہ معلوم ہوتا ہے کہ مصور کا مقصد صرف روشنی کا اظہار نہیں بلکہ اس کی کامیابی کا اصلی راز اس سے تاثر پیدا کرنے اور اسے پردۂ تصویر پر لانے میں مضمر ہے۔ کلازن کی نظرِ انتخاب ہمیشہ کسی عام دیہاتی منظر پر پڑتی ہے اور وہ اسے کسی پوشیدہ مقصد کا آئینہ دار بنا دیتا ہے۔ یہ مقصد اس کی تصاویر کا جزوِ لاینفک بن جاتا ہے جس طرح مادی تفصیلات منظر سے جدا نہیں کی جاسکتیں اسی طرح یہ بھی تصویر سے علیحدہ نہیں ہو سکتا۔ اس تصویر میں ہم ایک غمگین اور پژمردہ خاطر دیہاتی لڑکی کو دیکھتے ہیں۔ مصور نے اسے خوبصورت بنانے کی مطلق کوشش نہیں کی۔ اگرچہ اکثر لوگ ہر کاغذی پیکر میں کسی حسن کی تلاش کرتے ہیں۔ مصور نے جو کچھ باغ کے دروازے پر دیکھا اس کے سوا اور کسی بات سے اس کا تعلق نہیں۔

لڑکی کے چہرے پر قبل از وقت عمر رسیدگی اور مضبوط اور سخت ہاتھوں کو نہایت دیانتداری سے ظاہر کیا ہے۔ لیکن اس کے عام انداز اور آزردہ اور دکھ بھری آنکھوں میں کوئی ایسی چیز ہے جو ہمیں اسے دیکھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اور یہی بات مصور کی بڑائی کی دلیل ہے۔ جہاں تک جسمانی حسن کا تعلق ہے اس کا چہرہ بالکل معمولی اور غیر دلچسپ ہے لیکن اس کے باوجود یہ جاذبِ توجہ ہے اور دیکھنے والے کے جذبات میں تحریک پیدا کرتا ہے۔ اس نے اپنے بال قدیم انداز میں پیشانی سے پیچھے کی طرف موڑ رکھے ہیں لیکن کسے معلوم ان کے نیچے کیا کیا خیالات پیدا ہو رہے ہیں۔ اس کی نگاہیں کسی ایسی چیز پر جمی ہوئی ہیں جسے وہ خود ہی دیکھ سکتی ہے — کوئی مستقبل کا خواب یا شاید اپنے مقدر کا نامکمل احساس۔ کون جانے؟ ہم حیرت زدہ ہو کر اس معمے کو سوچتے ہیں!

اس تصویر میں کلازن کا انداز بالکل بدل چکا ہے۔ وہ رومان و لطیف تصور کو حقیقت پرستی پر ترجیح دیتا ہے۔ بعد کی تصویروں میں وہ انسان کی ظاہری شکل و صورت میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا بلکہ تخیل اور فطرت کا دلدادہ ہے۔ "باغ کے دروازے پر" اس وقت کی تصویر ہے جب وہ پہلے دور سے دوسرے دور کی طرف جا رہا تھا۔ جارج کلازن ۱۸۵۲ء میں لندن میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین ڈینش تھے۔ ۱۸۶۷ء سے ۱۸۷۳ء تک اس نے ساؤتھ کنسنگٹن میں گزارا۔ اس کے بعد پیرس میں، نیز ہالینڈ اور بلجیم کے سٹوڈیو میں کام کرتا رہا۔ یہ تصویر ۱۸۹۰ء میں [illegible] گئی اور [illegible] ہو گئی۔

حفیظ ہوشیارپوری

مصوّر شاعری

موسیقی، شاعری، مصوّری، فرداً فرداً فنونِ لطیفہ میں شمار کئے جاتے ہیں شعر اور موسیقی میں عام خاص مطلق کی نسبت ہے۔ جہاں شعر ہوگا بالفعل یا بالقوۃ موسیقیت اس میں ضرور ہوگی۔ جہاں موسیقیت ہو، وہاں شعر ہونا ضروری نہیں —

لیکن مصوری اور شاعری بالکل دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ مصوری میں شاعری نہیں سما سکتی، شاعری میں مصوری نہیں آ سکتی —

مگر ہم اس وقت ایک ایسا دوہا آپ کو سناتے ہیں، یا دکھاتے ہیں جس میں شاعری (مضمون) موسیقی، اور مصوری دونوں بلکہ تینوں چیزیں صحیح اور حقیقی معنی میں موجود ہیں غضب تو یہ ہے کہ باوجود ان خوبیوں کے دوہے کا مضمون بھی اصلیت اور حقیقت کو لئے ہوئے عین واقعہ کے مطابق ہے۔

شعریت علیحدہ اپنے واقعہ کا اظہار کر رہی ہے اور مصوری بطورِ تشریح اسی واقعہ کی عین بین تصویر دکھا رہی ہے۔

لیجیے دوہا، شعر سمجھ کر آپ بھی سن لیجئے یا تصویر سمجھ کر دیکھ لیجیے۔ ذرا مگر آپ بھی تصویر نہ بن جائیں۔

راتن کے رس بین میں، با تن پڑ گئی کھیس
تر سیٹھ کے چھیا تسٹھ بھے، چھیا سٹھ کے چھتیس

اُردو زبان میں بھی اس کے ہم مضمون ایک شعر ہے:۔

وصل میں جب گفتگو ہونے لگی — آپ سے تم، تم سے تُو ہونے لگی

دوہے کا مضمون یہ ہے:۔

(۱) وصل کی رات کی بات چیت میں آخر ہوتے ہوتے جھگڑا فساد ہو گیا۔ ابتداءً عاشق و معشوق دونوں کے رخ ۶۳ کی طرح ملے ہوئے تھے۔

(۲) پھر ان دونوں کی صورتیں ۶۶ کی تصویر بن گئیں یعنی معشوق روٹھ گیا اور عاشق منانے اور سمجھانے لگا۔

(۳) پھر جب عاشق مناتے مناتے اور سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا تو اس نے بھی اپنی کروٹ بدل لی، اور معشوق سے منہ پھیر لیا جن کی تصویریں آخر میں ۳۶ کی صورت میں تبدیل ہو گئیں۔

اللہ اکبر، اللہ اکبر —

تسخیر ہے، سحر ہے کہ اعجاز ہے شعر — ہے نغمۂ کُن جس میں یہ وہ ساز ہے، شعر

رباعی

ہر مرتبہ آئینۂ دل دھلتا ہے
میں شاعری کو مراقبہ کیوں نہ کہوں
کانٹا، کانٹا، نگاہ میں تُلتا ہے
ہر فکر میں بابِ معرفت کھلتا ہے

سید احمد حسین امجد

نفع بالاکن کہ از زوال نیند

سر زمین سے اپنا دل تنہا پایا
دل ہمیں تارے سے گھر نے کا رشتہ پایا
تجھ سے اپنی دین و دنیا و سے کر
پایا پھر بھی خوش ہوں کہ کیا ہی رستہ پایا

الاشیاء تعرف باضدادھا

ہیں وہ دونوں جہاں کسی کی رونق کیلئے
راز فنا ہے یہاں بیانِ لطف کیلئے
ہے وجود بھی نہیں باطل کا
کیوں کہ بھی تو ہے بعد فنا بقا کیلئے

ناہید حسین امجد

اقبال کی شاعری میں آرٹ کا تصور

خویش را از خود برون آوردہ اند
این چنین خود را تماشا کردہ اند

آرٹ کا معیار

اقبال نے ہمیں اچھے برے کی یہ پہچان بتائی ہے جو چیز انسان میں قوت پیدا کرے وہ اچھی ہے اور جو اس سے عزیز ہیں کمزوری پیدا کرے وہ بری ہے۔ اگر اسی معیار سے آرٹ کو بھی پرکھا جائے تو اس کا کام بھی انسان کی ذات کی تعمیر ہونا چاہئے۔ اقبال کہتا ہے

آگہی از علم و فن مقصود نیست
غنچہ و گل از چمن مقصود نیست
علم از سامان حفظ زندگی است
علم از اسباب تقویم خودی است
علم و فن از پیش خیزان حیات
علم و فن از خانہ زادان حیات

آرٹ کا جدید مفہوم

اقبال کے نزدیک جدید آرٹ کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھیڑوں کا وہ حسن ہے جس کے سحر نے کسی شیر پر نیند طاری کر دی ہو، اور یہ کہ آرٹ میں اس قدر جذبات پرستی داخل ہو گئی ہے کہ اس کو صرف اسی کی خاطر سراہا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ وہ پستی ہے۔ جسے عہد حاضر کے لوگ تہذیب و اخلاق کہتے ہیں۔

"اسرار خودی" میں شاعری کی حقیقت اور اسلامی ادب کی تجدید کے سلسلے میں وہ لکھتا ہے۔

اے میان کیسہ ات نقد سخن
بر عیار زندگی او را بزن

آرٹ حسن ہے اور وہ آرزو پیدا کرتا ہے

آرٹ حسن ہے اور اقبال سمجھتا ہے کہ آرٹسٹ کا کام حسن کا اظہار ہے۔

سینۂ شاعر تجلی زار حسن
خیزد از سینائے او انوار حسن
از نگاہش خوب گردد خوب تر
فطرت از افسون او محبوب تر

اور وہ ہمیں بتاتا ہے کہ حسن کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ ہمارے دلوں میں کوئی تمنا، کوئی خواہش، کوئی آرزو پیدا کرے، کیونکہ

حسن خلاق بہار آرزوست
جلوہ اش پروردگار آرزوست

یوں اقبال آرٹ کو حسن کا ایک اظہار سمجھتا ہے۔ جس کا کام آرزو اور محبت کی تخلیق ہے، جس سے عالم وجود کی روشنی ہے اور اس کی نامعلوم ممکنات کی ترقی کا انحصار ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

زندگی مضمون تسخیر است و بس
آرزو افسون تسخیر است و بس
زندگی صید افگن و دام آرزو
حسن را از عشق پیغام آرزو

گویا آرٹ خود ایک منزل نہیں ہے بلکہ منزل تک پہنچنے کا محض ایک وسیلہ۔ یہ وہ قوت ہے جو حرکت پیدا کرتی ہے۔ اور یہ حرکت ختم ہونے والی نہیں ہوتی۔

آرٹ جذبات پرست نہیں ہونا چاہئے

ایک اور بات جس پر اقبال اس ضمن میں زور دیتا ہے یہ ہے کہ آرٹ میں محض جذبات پرستی نہیں ہونی چاہئے، اور آرٹسٹ کو فلاطون جیسے لوگوں کی تقلید نہیں کرنی چاہئے جو درحقیقت انسانوں کے بھیس میں بھیڑیں بکریاں ہیں، کیونکہ

فطرتش خوابید و خوابے آفرید

چشم ہوشش او سراب آذیہ

آرٹ روح پرور اور حیات بخش ہونا چاہیئے نہ کہ افیون کے دریا میں غرق۔ آرٹ کا کام حقیقت کو مشکل کرنا ہے۔

آرٹ کو اتنی بلندیوں پر پرواز نہیں کرنا چاہیئے کہ پھر اس کے لئے اپنے مسکن میں آنا ناممکن ہو جائے بلکہ اسے نیستان کی ایک نے کی طرح مجنوں کی طرف لیلیٰ کا پیغام لانا چاہیئے آرٹسٹ کو اس شہباز کی طرح ہونا چاہیئے جو بلندیوں پر اڑتا ہے لیکن اپنا شکار حاصل کرنے کے لئے نیچے بھی اترتا ہے۔

اقبال کا اپنا آرٹ اس معیار سے اتنا مطابق ہے کہ وہ زندگی اور اس کے ظہور کا بیان موت کی زبان سے بھی ادا کرنے سے احتراز نہیں کرتا۔ اس کی نظم خفتگان خاک سے استفسار جس میں اس نے موت کی دنیا پر تبصرہ کرتے ہوئے زندگی کا تذکرہ کیا ہے اس کی ایک مثال ہے۔

آرٹ ایک ذریعۂ تعلیم ہے

نیز آرٹ کا ایک اور پہلو اقبال کے نزدیک تعلیمی اور تبلیغی ہے۔ وہ کہتا ہے۔

کچھ جو سنتا ہوں تو اوروں کو سنانے کے لئے
دیکھتا ہوں کچھ تو اوروں کو دکھانے کے لئے

حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے آرٹسٹ کو معاشرہ کی آنکھوں کا درجہ دے دیا ہے۔

آرٹ نفس کا آئینہ ہے

اس کے علاوہ وہ آرٹ کو بالکل ایک ذاتی چیز سمجھتا ہے اس کے قول کے مطابق یہ کسی چیز کا عکس یا خاکہ نہیں بلکہ آرٹسٹ کے اپنے احساسات کی تصویر ہونا چاہیئے۔ اسے ایک فوٹو نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ایک تصویر، کیونکہ اول الذکر ایک بالکل بے جان شے ہے اور دوسری میں زندگی سانس لیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مغربی آرٹ میں سر سے سر خارجیت سمائی ہوئی ہے۔ مغرب میں آرٹ کسی چیز کے ایک ہو بہو مرقعے، ایک نقل کا نام ہے۔ جان اس میں بالکل نہیں ہوتی۔ آرٹ کو روح پرور، فرحدہ، زندگی بخش اور حسین صرف ذاتی احساسات کا ظہور ہی بنا سکتا ہے۔ اقبال اپنے کلام میں شروع سے لے کر آخر تک بیرونی اشیا کے ذریعے سے اپنے ذاتی احساسات بیان کرتا ہے۔ خواہ وہ ہمالیہ سے خطاب کرے، خواہ شمع سے، خواہ رات سے، خواہ خفتگانِ خاک سے، خواہ وہ بادلوں پر نظم لکھے یا موٹر پر، وہ ہمیشہ اپنے ذاتی احساسات کا اظہار کرتا ہے۔ غالب کے مندرجہ ذیل شعر میں یہ خیال بہت اچھی طرح ادا ہوا ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

آرٹ ایمائی ہے

ایک اور پہلو جس کا اظہار اقبال کرنا چاہتا ہے یہ ہے کہ آرٹ ایمائی ہے۔ مغرب کی کوشش یہ ہے کہ کسی چیز کی ہو بہو نقل پیش کرے۔ اس کے مدنظر صرف ذہانت ہے اور وہ انسانی قلب پر کسی قسم کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ وہ محنت کو کم کرتا ہے اور یوں مشکلات کی غیر موجودگی سے لطف اٹھاتا ہے۔ لیکن اقبال مشکلات اور محنت کا دلدادہ ہے اور وہ بہت کچھ قلب کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ آرٹ میں خلا ہونا ضروری ہے اور یہ قلب کا کام ہے کہ اس خلا کو پر کرے۔ اقبال کا شعر ہے:۔

برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائی است
حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

بجائے اس کے کہ آرٹ صحیح ہو اسے ایسا ہونا چاہیئے کہ وہ دل کی گیند کو لڑھکاتا پھرے اور اس کا کام نہ صرف دل میں سنسنی پیدا کر دینا ہے بلکہ اس کو درہم و برہم کر دینا بھی ہے۔

آرٹ اور آرٹسٹ کا مقصد

آرٹ کسی بیرونی شے کا غلام نہیں ہے بلکہ یہ خود آرٹسٹ کے اعلیٰ اور بلند جذبات کا اظہار ہے۔ اس لئے یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم جس چیز کی تصویر کھینچیں وہ ہماری تمام تر توجہ اپنے اندر جذب کر لے بلکہ اسے اس کے بنانے والے کے قلب کی دھندلی روشنی میں نظر آنا چاہیئے۔ آرٹ میں کسی خارجی شے کا وجود محض تقریب کے طور پر موجود ہونا چاہیئے۔ لیکن اصل مواد ہمیشہ آرٹسٹ کے حقیقی جذبات پر مشتمل ہونا چاہیئے جیسا کہ بندوق کے چلنے کا اصل سبب بارود ہے اگرچہ شعلہ اسے چلاتا ہے۔ اہمیت آرٹسٹ کو حاصل ہے ان اشیا کو نہیں جن کے متعلق آرٹسٹ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اقبال کہتا ہے:۔

تو قدر خویش ندانی بہا ازو گیرد
وگرنہ لعلِ درخشندہ پارۂ سنگ است

اسی خیال کو اس نے ایک اور طرح پر بھی ادا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

بہار برگ پراگندہ را بہم بربست
نگاہ ماست کہ بر لالہ رنگ و آب افزود

غلام اور آزاد اقوام کے آرٹ کا مقابلہ

زبور عجم میں اقبال نے ایک خاص باب غلام اقوام کے فنون کے

لئے وقف کیا ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ فنِ تعمیر صرف آزاد اقوام کا حصہ ہے اور اس لئے غلام اقوام کے سلسلے میں صرف موسیقی اور مصوری کا ذکر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے ان کی موسیقی موت کا راگ ہے اور وہ ایک بیوہ کے نالہ و فغاں سے زیادہ کچھ نہیں۔ ان کی شاعری ایسی ہے کہ اس کے الفاظ دیکھتے ہی ہماری ساری توجہ کو جذب کر لیتے ہیں۔ لیکن آزاد لوگوں کے روح افزا نغمے ہمیں الفاظ میں نہیں الجھاتے بلکہ اُن معانی تک لے جاتے ہیں جو ان کی تہ میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اقبال اس آدمی کو یوں پیش کرتا ہے۔

معنی آں باشد کہ بستاند ترا
بے نیاز از نقش گرداند ترا

شاعری کے فن کو انسان میں ایسا ذوق پیدا کر دینا چاہئے کہ وہ الفاظ کی بہتی ہوئی آبجو کے کنارے پر کھڑا نہ رہے بلکہ اس میں غوطہ لگا کر اس کے پوشیدہ معانی کی منزل تک پہنچ جائے۔ ایک غلام مصور کے کام میں کوئی ذاتی جوہر نہیں ہوتا۔ اسے اپنی ذات پر کوئی اعتماد نہیں ہوتا ہے۔ وہ طلسمِ اشیا کی سطحی خلیج کو عبور کر کے ایجاد و تخیل کے ساحل پر نہیں پہنچ سکتا۔ وہ ہر نئے خیال پر کانپ جاتا ہے اور پرانی وضع کی ہوئی ڈگر پر چل دیتا ہے۔ غلام آرٹسٹ کی ذہانت و قابلیت کی بجائے عوام الناس کا ذوق کرتا ہے۔ اور اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اس معیار کو حاصل کرے جو مقبولِ عام ہے خواہ وہ کتنا ہی پست کیوں نہ ہو۔ حسن تو وہ شے ہے جو ہمارے اپنے نفس میں موجود ہے لیکن ایسا آرٹسٹ اسے فطرت سے مستعار لے کر اس کی ایک نقل تیار کرتا ہے جو کچھ اسے ملتا ہے وہ لے لیتا ہے لیکن جسے اسے لینا چاہئے اور جو اس کے قلب میں پوشیدہ ہے اسے حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی ذات کو واقعیت کے اظہار کے لئے وقف کر دیتا ہے لیکن اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ حالانکہ آرٹ کا اصل کام یہ ہے کہ وہ واقعیت کو تخیل کے آسمان پر پہنچا دے اور یہ وہ جوہر ہے جو غلام آرٹسٹ میں قطعاً موجود نہیں ہوتا۔

واقعیت کا ارتفاع

یہاں میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ واقعیت کو کس طرح بلند کیا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے اقبال کی اردو نظم "میری دعا" میں سے میں ایک شعر پیش کرتا ہوں وہ کہتا ہے۔

ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو

جو باتیں اس شعر میں بیان کی گئی ہیں یہ ہیں کہ ایک پہاڑ ہے جو ایک دلفریب منظر پیش کر رہا ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہاں چشمے اور نہریں بھی ہیں اور ان نہروں میں موجیں بھی اٹھتی ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ آس پاس کی اشیا کا عکس پانی پر پڑ رہا ہے۔ یہاں شاعر نے ان حقیقتوں کی اصلیت تبدیل نہیں کی۔ اور ان میں کسی قسم کا تصنع پیدا نہیں کیا۔ شاعر نے ان واقعیتوں کو ایک مرکب تجربے میں یکجا کر دیا ہے اور ان کو ایک ایسی شکل دے دی ہے جس میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اس نے اپنے تصور کے ذریعے ان کو اس طرح اپنایا ہے کہ اس منظر کے ایک خاص اسلوب مشاہدہ پر زور پڑتا ہے یہاں شاعر نے واقعیت میں بلندی پیدا نہیں کی بلکہ اس خاص نقطۂ نظر کی تعیین کی ہے جس سے اس منظر کو ہمیں دیکھنا ہے۔ پانی کی موجوں کا اٹھ اٹھ کر کوہستان کے دلکش نظارے کو دیکھنا جب یہ نقش شاعر ہمارے شعور پر منتقل کرتا ہے تو منظر ایک بے مثال اور عدیم النظیر چیز بن جاتا ہے مشاہدہ اس طرح ایک تخیلی دنیا کا واقعہ نظر آتا ہے۔ ایک اور نقطۂ نظر سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان دو موجوں میں شاعر نے ہمارے مشاہدے کو مثالی اور عینی نہیں بنایا بلکہ موجوں کے اٹھ اٹھ کر دیکھنے کو بلند کر دیا ہے۔ پہاڑ کو ہر آدمی دیکھتا ہے اور اس کے حسن سے لطف اندوز ہوتا ہے، لیکن جب اس کو موجوں کی تخیلی آنکھ سے دیکھا جائے تو یہی منظر پہلے سے ہزار گنا خوبصورت ہو جاتا ہے ہر آرٹسٹ کو لازم ہے کہ وہ اسی طرح شدید واقعیتوں کو اپنے تخیل کے ذریعے بلند کرے اور جب وہ ایسا کرتا ہے تو اقبال کے بقول

حورِ او از حورِ جنت خوشتر است
منکرِ لات و مناتش کافر است

سچ ہے۔ واقعیت جب اس اعلیٰ و ارفع درجہ میں پہنچ جاتی ہے تو وہ ایک بت بن جاتی ہے اور ہر شخص کو لازم ہے کہ اس بت کے آگے اپنا سر خم کرے ورنہ یہ سمجھا جائیگا کہ وہ آرٹ جیسی نعمت سے محروم ہے۔ تخیل آرٹ کی روح ہے۔ یہ واقعیت کا درجہ بلند کر دیتی ہے اقبال کہتا ہے

آں ہنرمندے کہ بر فطرت فزود
راز خود را بر نگاہِ ما کشود

نتیجہ

غرض حقیقی آرٹ حسن کا وہ اظہار ہے جس کا مقصد اُس خواہش کی تخلیق ہے جو اپنے ساتھ محبت اور زندگی لائے۔ اس کا کام یہ ہے کہ یہ انسان کی ذات کو قوت اور ترقی کی طرف لے جائے۔ اقبال کہتا ہے:-

"تمام انسانی سرگرمیوں کا انتہائی مقصد زندگی ہے پُر شوکت، پُر قوت، ولولہ انگیز زندگی، تمام انسانی آرٹ کے پیشِ نظر یہی مقصد ہونا چاہئے۔ اور ہر چیز کی قدر اس کی حیات بخش قابلیت کے لحاظ سے مقرر کی جانی چاہئے۔ بلند ترین آرٹ وہ ہے جو ہماری سوئی ہوئی قوتِ ارادی کو بیدار کرے اور جو زندگی کے امتحانات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی ہم میں قوت پیدا کرے۔ ہر وہ چیز جو غنودگی طاری کرتی ہے جو ہماری آنکھیں بند کر دیتی ہے اور ہمیں آس پاس کی چیزیں دیکھنے نہیں دیتی جس کو قابو میں لانے ہی پر زندگی کا انحصار ہے زوال اور موت کا پیغام ہے۔ آرٹ کی خاطر آرٹ کا دلفریب نظریہ تنزل و زوال کی ایک عیارانہ ایجاد ہے جو زندگی اور قوت کی طرف سے ہٹا کر ہمیں دوسری جانب لے جاتی ہے۔"

اکبر علی

نشاطِ رفتہ

نہ وہ عالم جلوہ زارِ نشاط
نہ وہ جلوہ ہائے بہارِ نشاط

نہ وہ طاقتِ انتظاماتِ عیش
نہ وہ قدرتِ اختیارِ نشاط
نہ وہ فرصتِ انصراماتِ عیش
نہ وہ رخصتِ کاروبارِ نشاط

نہ وہ صورتِ ہستیٔ انبساط
نہ وہ جانِ امیدوارِ نشاط
نہ وہ شکلِ بدمستیٔ انبساط
نہ وہ خاطرِ دوستدارِ نشاط

نہ وہ سوزِ سازِ نوائے طرب
نہ وہ مطربِ نغمہ کارِ نشاط
نہ وہ مستیٔ جانفزائے طرب
نہ وہ ساقیٔ بادہ بارِ نشاط

نہ وہ محفلِ مستِ صہبائے کیف
نہ وہ جلسۂ بادہ خوارِ نشاط
نہ وہ صحبتِ غرقِ دریائے کیف
نہ وہ بادۂ خوشگوارِ نشاط

نہ وہ مجمعِ گلرخانِ صبیح
نہ وہ حسنِ صبحِ بہارِ نشاط
نہ وہ اجتماعِ بتانِ ملیح
نہ وہ لطفِ شبہائے تارِ نشاط

نہ وہ دورِ ایامِ لطف و خوشی — نہ وہ قسمتِ سازگارِ نشاط
نہ وہ عہدِ التیامِ لطف و خوشی — نہ وہ طالعِ خفتہ زارِ نشاط

نہ وہ ہر طرف جلسہائے طرب — نہ وہ ہر طرف انتشارِ نشاط
نہ وہ ہر طرف جلوہائے طرب — نہ وہ ہر طرف اشتہارِ نشاط

نہ وہ بزمِ عشرت، نہ وہ دورِ جام — نہ وہ گردشِ روزگارِ نشاط
نہ وہ عیش کے نو بہ نو اہتمام — نہ وہ رنگِ لیل و نہارِ نشاط

نہ وہ آرزو کامیابِ خوشی — نہ وہ شوقِ دل ہمکنارِ نشاط
نہ وہ خوش نصیبی، نہ وہ خوشدلی — نہ وہ زندگی تحتِ کارِ نشاط

اِدھر حالِ دل فرطِ غم سے نزار — اُدھر جانِ حسرت شعارِ نشاط
جسے دیکھیے، مضطرب بیقرار — جسے پوچھیے، سوگوارِ نشاط

بس آزاد! کب تک یہ اظہارِ غم
کہاں ہم، کہاں وہ بہارِ نشاط

حکیم آزاد انصاری

مچھلی

فرصت ہے تو کوئی شام دریائے نربدا کے کنارے کی چھوٹی دیہاتی سرائے میں گزاریئے۔ ہاں، لیکن بیٹھئے "ٹونٹیوں والے کمرے" میں۔ جہاں شراب چھان کر صراحیوں میں بھری جاتی ہے وہاں آپ کو ضرور دو ایک مچھیرے بیٹھے نظر آئیں گے جو اس وقت اپنی اپنی شراب میں گرم پانی اور میٹھا ڈال کر چسکیاں لے لے کر پی رہے ہوں گے۔ آدھ ہی گھنٹے میں وہ آپ کو ماہی گیری کے متعلق اتنی کہانیاں سنا ڈالیں گے کہ اسے ہضم کرنے کے کم از کم ایک مہینے تک ضرور آپ کے معدے میں گڑبڑ رہے گی۔

شام کا وقت تھا۔ میں اور عثمان سیر کے لئے چاند نگر روانہ ہوگئے واپس آتی دفعہ سستانے کیلئے اس چھوٹی سی سرائے میں جا داخل ہوئے یہ دریائے نربدا کے کنارے سے قریب ہی واقع ہے۔

مئے خانے میں پہنچے تو دیکھا کہ ایک بڈھا وہاں بیٹھا حقہ پی رہا ہے قدرتی امر تھا کہ ہمارے اور اس کے درمیان باتیں ہوں۔

وہ کہنے لگا "یار بڑا سہانا دن ہے"۔ ہم نے جواب دیا ہاں یار "دن تو کل بھی بڑا سہانا تھا"۔ پھر ہم سب نے ایک دوسرے سے کہنا شروع کیا کہ دن کل بھی سہانا ہوگا۔ آخر میں عثمان بڈھے سے کہنے لگا۔ "دیکھتے ہو اس دفعہ فصلیں بھی تو اچھی نظر آ رہی ہیں"۔

اب معلوم نہیں اس نے ہمارے کیا طور دیکھے اور کیوں یہ فرض کر لیا کہ ہم کوئی اجنبی ہیں، یہاں کی فضا سے بالکل ناآشنا، اور اگلی صبح ہمارا ارادہ ہے کہ یہاں سے چل دیں۔ خیر۔

باتوں میں جو ذرا وقفہ پڑا تو ہماری نگاہیں ادھر ادھر کمرے کا جائزہ لیتے لیتے بالآخر شیشے کے ایک پرانے سے گرد آلود "نمائشی صندوق" پر آ کر جم گئیں جو آتش دان سے بھی کہیں زیادہ اونچا نصب کر دیا گیا تھا۔ اس صندوق میں ایک بڑی سی مچھلی رکھی تھی۔ میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ خدایا اتنی بڑی مچھلی! . . . . . اور پہلی نظر میں تو میں نے درحقیقت یہی سمجھا کہ یہ باؤ مچھلی ہے۔

بوڑھا میری نظروں ہی سے سب معاملہ بھانپ گیا اور کہنے لگا "کیوں یار کیسی عجیب چیز ہے! بہت عمدہ!؟"

میں نے جواب دیا "عمدہ!!! اجی نایاب!!!"

عثمان بوڑھے سے کہنے لگا "کیوں میاں تمہارے خیال میں اس کا وزن کیا ہوگا؟"

اب یہ صاحب اپنی جگہ سے ذرا اوپر اُٹھے اور اپنے نیچے اپنا کوٹ سرکاتے ہوئے بولے "یہی نو سیر چھٹانک۔ آنے والے مہینے کی تین تاریخ تھی اسی دن میں نے اسے دریا سے پکڑ کر خشکی پر دے مارا۔ بس ادھر کانٹے میں ایک چھوٹی سی مچھلی لگائی، ڈوری دریا میں پھینکی اور پل کے عین نیچے سے اسے پکڑ لیا۔ لوگوں نے مجھے بتایا تھا کہ اس جگہ ایک بہت بڑی مچھلی رہتی ہے۔ میں نے سوچا چلو اسے پکڑ ہی لو۔ چنانچہ پکڑ لی میرے خیال میں اب آپ کو اتنی بڑی مچھلیاں بہت ہی کم نظر آئیں گی۔ اچھا صاحبو اب میں جاتا ہوں سلام"۔

یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا اور ہمیں تنہا چھوڑ گیا۔

اس کے بعد مجال ہے جو ہماری نظریں مچھلی سے پرے ہٹیں۔ کیا ہی مچھلی تھی، ہم اسے دیکھ رہے تھے کہ ایک مقامی قلی بھی جو ابھی ابھی سرائے میں داخل ہوا تھا ہاتھ میں شراب کا برتن لئے کمرے کے دروازے میں آیا اور مچھلی کی طرف ٹکر ٹکر دیکھنے لگا۔

عثمان اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہنے لگا "واللہ! بہت بڑی مچھلی ہے"۔

وہ کہنے لگا "آہاہا! صاحب واقعی آپ درست فرما رہے ہیں" پھر شراب کا برتن اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے بولا "جناب جب یہ مچھلی پکڑی گئی تھی آپ تو موجود نہیں تھے نا؟"

ہم نے جواب دیا "نہیں ہم تو اجنبی ہیں، اس علاقے سے بالکل ناواقف ہم کیا جانیں"۔

کہنے لگا آپ سے: بھلا پھر آپ کو کیا پتہ ہو سکتا ہے۔ ابھی کوئی پانچ سال گذرے ہونگے جب میں نے اسے پکڑا تھا۔"

میں بے اختیار بول اٹھا "او میاں کیا وہ تمہیں تھے؟ . . . . .
اچھا! . . . . . تمہیں نے اسے پکڑا تھا۔ بھئی واہ!"

ہمارے بوڑھے خوش باش دوست نے جواب دیا "جی حضور۔ بندے نے ہی اسے پکڑا تھا۔ ان دنوں دریا میں بند بندھا ہوا تھا۔ جمعہ کا دن تھا اور دوپہر کا وقت۔ اچھا اور سنئے اس کے متعلق سب سے دلچسپ بات تو یہ ہے کہ میں نے کانٹے میں ایک مکھی لگا کر اسے قابو کیا تھا۔ میں تو چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پکڑنے گیا تھا۔ اتنی بڑی مچھلی کا مجھے خواب و خیال بھی نہیں تھا اور جب میں نے اس مجسم وزن کو اپنی ڈوری کے سرے کے ساتھ دیکھا تو مارے دہشت کے میں وہیں کا وہیں رہ گیا۔ اور اب جناب اندازہ کرلیں کہ اس کا وزن تیرہ سیر ہوگا یا نہیں۔ اچھا جی اب جاتا ہوں سلام۔"

پانچ منٹ بعد ایک تیسرا آدمی اندر آیا جس نے بتایا کہ کس طرح اس نے ایک صبح سویرے ہی سویرے کانٹے میں ایک چھوٹی سی زرد زرد چھلکوں والی مچھلی لگا کر اسے پکڑا تھا . . . . . . یہ آدمی بھی چلا گیا اور ایک درمیانہ عمر کا مسخرہ جو بظاہر نہایت متین نظر آتا تھا اندر آ کر کھڑکی کے نزدیک بیٹھ گیا

"معاف فرمائیے، برا نہ مانئے۔ اتنے سوال کرنا ہے تو بڑی منہ چھوٹی سی بات لیکن ہم ہوئے اجنبی اس علاقے سے بالکل ناواقف۔ میں اور میرا بھائی آپ کے بڑے احسان مند ہونگے اور تا عمر آپ کے غلام رہیں گے اگر آپ ہمیں یہ بتانے کی تکلیف گوارا فرمائیں کہ یہ مچھلی۔ یہ دیو کی دیو، آپ نے کس طرح پکڑ لی تھی؟"

وہ آدمی نہایت حیرت و استعجاب سے کہنے لگا "میں! آپ کو کیسے پتہ چل گیا کہ یہ مچھلی میں نے پکڑی تھی؟"

ہم نے بتایا کہ ہمیں کسی نے بتایا تو نہیں یونہی ضمیر نے گواہی دی کہ یہ ضرور آپ ہی نے پکڑی ہوگی۔

مسخرا اجنبی قہقہہ لگا کر کہنے لگا "کمال ہو گیا! بھئی غضب ہو گیا! آپ بالکل درست فرما رہے ہیں جی۔ واقعی یہ میں نے ہی پکڑی تھی لیکن سوال تو یہ ہے کہ آخر آپ کو اس بات کا علم کیسے ہو گیا؟ آپ نے کیسے بوجھا؟ یار عجیب بات ہے!"

اس کے بعد اس نے بتایا کہ کس طرح اسے خشکی پر لانے میں اسے آدھ گھنٹے تک کشمکش کرنی پڑی اور اس کی چھڑی ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد اس نے بڑی احتیاط سے اس کا وزن کیا تو یہ تیرہ سیر وزنی نکلی۔

یہ آدمی بھی چلا گیا اور اب وہاں کا زمیندار ہمارے پاس آن بیٹھا۔ ہم نے اسے وہ تمام کہانیاں سنا دیں جو ہم اس مچھلی کے متعلق اب تک سن چکے تھے۔ اس نے ان مسخروں کی خوش گپیوں سے بڑا ہی لطف اٹھایا اور ہم سب قہقہے پر قہقہہ لگاتے رہے۔

ہمارے بوڑھے دیانتدار دوست نے کچھ سننے کے بعد پھر ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگا ذرا قیاس تو کرو اپنچو، جیا، سروں اور بابا دشن پ سے کہتے رہے ہیں کہ مچھلی ہم نے پکڑی تھی۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ خوب۔ خوب پکڑتے تم! اور پھر دے دیتے مجھے! کیوں، تم اور بھی بھرتی بہرے گہرے ہیں ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا!"

اس کے بعد بوڑھے زمیندار نے اس مچھلی کی اصلی کہانی بیان کرنی شروع کی۔

اب معلوم ہوا کہ آج سے برسوں پہلے جب کہ وہ بالکل چھوکرا ہی تھا یہ مچھلی اس نے پکڑی تھی۔ اس کارنامے میں ہنر اور شعور کو کوئی دخل نہیں تھا بلکہ اس میں اس قسمت کا ہاتھ تھا جو ہر وقت ان لڑکوں کا انتظار کرتی رہتی ہے جو کسی سہانی دوپہر کو سکول سے بھاگ کر کانٹے والی ڈوری کا ایک سرا درخت کے تنے سے باندھے مچھلیاں پکڑتے رہتے ہیں۔ اتنی بڑی مچھلی پکڑنے پر وہ گھر والوں کی مارپیٹ سے بھی بچ گیا تھا۔ اور اس کا استاد بھی عش عش کرتا رہ گیا تھا۔

یہ بیان دے کر وہ باہر نکل گیا۔ اور میں نے اور عثمان نے پھر مچھلی پر نظریں جما دیں۔

اف! کتنی بڑی مچھلی تھی عجیب تھی۔ اسے دیکھتے اور حیران ہوتے پھر دیکھتے اور پہلے سے بھی زیادہ حیران ہوتے۔

عثمان تو اسے ذرا قریب سے دیکھنے کے لئے اس قدر مضطرب ہوا کہ ایک کرسی کی پشت پر جا چڑھا۔ تاکہ ٹھیک نظر آئے۔

کرسی کھسک گئی اور عثمان نے اپنا آپ بچانے کے لئے نہایت وحشیانہ طریقے سے مچھلی کے صندوق پر ہاتھ جما لئے اور صندوق کڑکڑاہٹ کے ساتھ مع عثمان کے دھم سے نیچے آ رہا۔

میں لپک کر وہاں پہنچا اور نہایت فکر سے پوچھا کہ بھائی کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا۔

عثمان نے ادھر ادھر آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور نہایت احتیاط

سے آہستہ آہستہ ٹہلتے ہوئے جواب دیا۔ میرا خیال ہے نہیں۔ لیکن نقصان تو ہو ہی چکا تھا۔ مچھلی کے ہزار ریزے ہو گئے تھے۔ میں ہزار کہہ رہا ہوں ممکن ہے کہ نو سو ننانوے ہوئے ہوں۔ میں نے سوچا چلو اب انہیں گیا کیوں

یہ بات ذرا عجیب اور ناقابل یقین معلوم ہوتی تھی کہ یہ سوکھی ہوئی بھس بھری مچھلی اس طرح ریزے ریزے ہو جائے۔

اور یہ بات ہوتی بھی عجیب اور ناقابل یقین اگر یہ مچھلی سوکھی اور بھس بھری ہوتی۔ لیکن یہ تھی کب!

پہلے تو یہ سچ مچ مچھلی ہی تھی، سوکھی ہوئی۔ اور اب یہ ہا ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ اب!! ...... اب چکنی مٹی کے ننھے ننھے ریزے۔

(جیروم) مہدی علی خاں، کریم آباد

وہ کون ہے؟

موسم بہار میں
مہکے ہوئے پھولوں پر
شہد کی مکھیاں
کس کی یاد میں بے قرار ہو کر
بھنبھناتی ہیں؟
وہ کون ہے
جس کی یاد
بادِ صبا کی بھولی ہوئی سانس کو
روک دیتی ہے،
اور سحر کار آسمانوں کو
نقش و نگار سے آراستہ کرتی ہے؟
وہ کون ہے
جس کی سانس درختوں، پھولوں اور گھاس کو
خوشبو سے بھر دیتی ہے،
جس کا خیال ذروں کو
فضا میں مصروفِ رقص رکھتا ہے؟
وہ کون ہے
جس کی لہراتی ہوئی سرخ قبا
صبح و شام
مشتاق نگاہوں میں
اپنا پرتو ڈالتی ہوئی گذرتی ہے؟
آہ اے میرے محبوب
اگر تو کبھی ظاہر نہ ہوگا
تو تیرے حسن کے یہ پردے کیسے ہیں؟
تیری پازیبوں کی یہ جھنکار
ہر جگہ کیوں سنائی دیتی ہے
اس کا سحر کیوں کبھی نہیں مٹتا؟
اس شور میں میں ہمیشہ بھول جاتا ہوں
کہ تیرا تخت
میرے دل میں ہے۔

ترجمہ از بنگالی

مدرسے میں دن بھر کی سخت محنت کے بعد جب سعید گھر آیا تو اس کی ماں چائے پکا رہی تھی۔
وہ سستایا ہوا بولا "اماں میں پوچھتا ہوں یہ مدرسہ کس نے بنایا تھا؟"
ماں جو مصروفیت کے باعث اس سوال پر اس وقت زیادہ غور نہ کر سکتی تھی کہنے لگی "وہ ایک نہایت عقلمند بڈھا تھا۔"
سعید نے کہا "ہاں، جانے مجھے پہلے اس بات کا خیال کیوں نہ آیا کہ ایسے کام بڈھے ہی کیا کرتے ہیں۔"

لاہور

وہاں تک بے تکلف زندگی سے دل جو اکتایا
مجھے میرا مقدر کھینچ کر لاہور لے آیا

خدا کا نام لے کر ناخداؤں کے سہارے سے
مری کشتی چلی بحرِ تمدن کے کنارے سے

نگاہِ شوق کا گہوارہ تھیں تہذیب کی موجیں
خودی کے زور میں آوارہ تھیں تہذیب کی موجیں

تھپیڑے ہلکے ہلکے کھا رہی تھی عمر کی کشتی
کسی موہوم رُخ کو جا رہی تھی عمر کی کشتی

نگاہوں کے لئے جنت تھی اک ساحل کی شادابی
سراپا شوخیٔ فطرت تھی اک ساحل کی شادابی

ہر اک ذرے سے اک شانِ جمالی آشکارا تھی
کنارے پر جو شے موجود تھی وہ حسن آرا تھی

عجب رنگین لغزش تھی فضاؤں کی جوانی میں
سرور انگیز جنبش تھی ہواؤں کی روانی میں

گھٹاؤں سے برستی تھی شراب و شعر کی مستی
سرور و کیف سے آباد تھی اک دل نشیں بستی

فروغِ شامِ عشرت سے ستارے ماند تھے یکسر
بتانِ نور پیکر اس زمیں کے چاند تھے یکسر

غبارِ راہ زریں تھا یہاں کی رہگذاروں کا
یہ بستی کیا تھی اک فردوس تھا عشرت شعاروں کا

سرافرازی پہ طعنہ زن یہاں کی خاک کا رتبہ
نگوں سر اس زمیں کے سامنے افلاک کا رتبہ

بہاریں باغ جن سے ساحرا لموط شرمائے
نگاریں میکدے ایسے کہ کوثر کو بھی رشک آئے

مری حدِ نظر تک برق پارے رقص کرتے تھے
یہ ایسی سرزمیں تھی جس پہ تارے رقص کرتے تھے

سراپا ایک نغمہ جس کی موجوں میں دل آرائی
سراپا اک ترانہ جس کی تانوں میں جنوں زائی

نظر ساحل کی رنگینی میں گم تھی اور رواں کشتی
خدا جانے اسی عالم میں آ نکلی کہاں کشتی

نظر سے ہو چلے اوجھل کنارے کے حسیں منظر
وہ دلکش دلربا منظر، دل آرا دل نشیں منظر

سفینہ میرا آ پہنچا اچانک تند دھارے پر
بہا جاتا تھا بے تابی سے موجوں کے سہارے پر

[illegible] تھے [illegible] کے
نظر آیا ہواس و ہوش گم ہیں ناخداؤں کے

نظر آیا کہ ہے تہذیب کی ہر موج طوفانی
بہا لے جائے گی کشتی کو اب دریا کی طغیانی

ہویدا تند موجوں سے تباہی کے قرینے تھے
تصنّع کے بھنور تھے اور انسانی سفینے تھے

کہاں کی رہنمائی ناخداؤں کی لگاوٹ تھی
تکلف ہی تکلف تھا بناوٹ ہی بناوٹ تھی

مری حدِ نظر تک ایک عالم تھا اذیت کا
نظر آیا مجھے یاں نام ڈوبا آدمیت کا

کوئی کشتی اچانک جب بھنور میں آن پھنستی تھی
بھیانک موت کی آغوش میں تہذیب ہنستی تھی

مسرت غرقِ دریا تھی، جوانی غرقِ دریا تھی
شرافت اور محبت کی کہانی غرقِ دریا تھی

یہاں آکر شجاعت بزدلی کا درس لیتی تھی
متانت خود بھنور کے رُخ پہ کشتی موڑ دیتی تھی

ہلاکت چار سُو تھی مرثیہ خوانِ توانائی
یہاں شرمندۂ ہیجان تھی شانِ شکیبائی

سیاست اپنے ڈورے ڈالتی تھی نوجوانوں پر
ہوا جاتا تھا اک جادو وطن کے پاسبانوں پر

یہاں گھٹنوں میں سر دے دے کے روتی تھی حیاداری
ہوس کے لاف زن لب پر تھا دعوائے وفاداری

مسافر مضطرب تھے، ناخدا بے چین تھے سارے
دلِ انسانیت کا بار، ارمانوں کے پشتارے

نہ کوئی کام بنتا تھا، نہ کوئی کام آتا تھا
فقط رہ رہ کے ہونٹوں پر خدا کا نام آتا تھا

دعائیں تھیں کہ یارب پھر موافق کر ہواؤں کو
سفینے پھیرنے کی تاب دے ان ناخداؤں کو

بہت بے تاب تھی دنیا مگر کچھ بس نہ چلتا تھا
مسافر کیا یہاں تو ناخدا بھی ہاتھ ملتا تھا

یہاں پہنچا تو میں نے عافیت کی قدر پہچانی
ہوا معلوم یہ تہذیب ہے روحِ پریشانی

جنہیں روحِ روانِ زیست سمجھا تھا وہ ہنگامے
کھڑے تھے میری چاروں سمت دامن موت کا تھامے

سرابِ ارتقا دیکھا، فریبِ آرزو کھایا
دلِ سادہ کو تکلیف و الم میں مبتلا پایا

گرے اخلاق اور نیکی کے جوہر اشک بن بن کر
اٹھا دل میں خیالِ سادگی پھر رشک بن بن کر

جوانی اور خودداری کا حاصل کھو دیا میں نے
دُرِ مقصد کہاں پایا یہاں دل کھو دیا میں نے

شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل
نہنگانِ اجل کی تیغیں بیداد پر مائل

خدا نے دی اگر توفیق اور میں بچ رہا زندہ
کروں گا عمر بھر تہذیبِ انسانی کو شرمندہ

وقار انبالوی

پُراسرار ہاتھ

آدمیوں کا ہجوم غفیر مجسٹریٹ کے گرد دائرے کی شکل میں کھڑا تھا
مجسٹریٹ ایک پُراسرار واقعے کے متعلق اپنی رائے قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گذشتہ مہینے سے پیرس کے بڑے بڑے صاحبِ دماغ لوگ اس بعید الفہم واقعے کو معلوم کرنے کے لئے مقلیں لڑا چکے تھے۔ مگر کسی قابلِ وثوق نتیجے پر نہ پہنچ پائے تھے۔

مجسٹریٹ اپنی پیٹھ انگیٹھی کی جانب کئے کھڑا تھا، اور گواہیوں کے مختلف پہلوؤں پر قیاس آرائیاں کر رہا تھا مگر کوئی صحیح نتیجہ نہ نکال سکتا تھا

عورتوں کا ایک گروہ اس کے قریب جمع تھا۔ وہ سب کی سب چُپ چاپ کھڑی تھیں۔ اُن کی حیرت زدہ آنکھیں مجسٹریٹ کے متحرک ہونٹوں پر جمی ہوئی تھیں۔ جہاں سے سنجیدہ گفتگو کا ایک سیلاب بہہ رہا تھا وہ کانپ رہی تھیں، اور اُس خوف کی وجہ سے، جو ان کی روح میں سرایت کر رہا تھا حیرت زدہ معلوم ہوتی تھیں۔ ان میں سے ایک نے جس کا چہرہ دوسروں کی بہ نسبت زیادہ زرد ہو رہا تھا سکوت کے سلسلہ کو توڑ کر کہا۔

"کتنا دہشت انگیز ہے؟ . . . . نہیں، نہیں بلکہ فوق العادت کوئی شخص بھی اس کی تہ کو نہیں پہنچ سکتا۔"

مجسٹریٹ اس کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا۔

"ہاں، مادام! شاید کوئی اس کی تہ تک نہ پہنچ سکے۔ مگر لفظِ "فوق العادت" جو تم نے ابھی کہا ہے موجودہ معاملے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ ہم ایک جرم کے متعلق بحث کر رہے ہیں ـــ ایسا جرم جس کی تشکیل بڑی قابلیت کے ساتھ کی گئی ہو۔ اور جس کا ارتکاب بڑی ہوشیاری کے ساتھ ہوا ہو۔ اتنے پُراسرار طریق پر کہ ہم حالاتِ حاضرہ کے ماتحت اس کو حل کرنے سے قاصر ہوں۔ ایک دفعہ مجھے بھی ایسے ہی واقعے سے دوچار ہونا پڑا تھا جس میں دھوکے اور تحیّر کا عنصر موجود تھا اور آخر کار میں نے اس کو لاینحل سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔"

یہ سن کر متعدد عورتوں نے یک آواز ہو کر اضطراب کے ساتھ کہا "ہاں، ہاں۔ براہِ نوازش ضرور ہمیں اس کی روداد سنائیے"

مجسٹریٹ کے چہرے پر متانت آمیز تبسم کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے کہا۔

"مگر تمہیں ایک لمحہ بھی یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ یہ واقعہ فوق العادت واقعات میں سے ہے۔ نہیں، میں اسے ممکن الوقوع واقعات میں سے خیال کرتا ہوں۔ اگر ہم کسی واقعے کو سمجھ نہ سکیں اور اس کے لئے لفظِ 'فوق العادت' استعمال کریں تو یہ سراسر غلطی ہے۔ ہمیں اس کے لئے لفظ 'ناقابلِ فہم' استعمال کرنا چاہئے . . . . ہاں تو جس واقعہ کو میں ابھی بیان کرنے والا ہوں اس کے حالات اس درجہ استعجاب انگیز تھے کہ عوام کیا بلکہ خواص بھی اسے سن کر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ اس لئے ذرا گوشِ ہوش سے سنئے:۔

"ان دنوں میں اجاکو میں مجسٹریٹ تھا۔ اجاکو ایک چھوٹا سا خوشنما شہر ہے۔ اور ایک دلفریب جھیل پر واقع ہے۔ اس کو سربفلک پہاڑیوں نے ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ اس حصے میں جتنے قتل کے واقعات ظہور میں آتے تھے۔ ان کی تفتیش و تحقیق میرے سپرد تھی۔ کچھ واقعات تو ایسے تھے جو بلحاظ عظیم الشان، بربریت خیز، اور بہادرانہ ہونے کے اپنی مثال آپ تھے۔ اس ضلع میں ہم کو ایسے سفاکانہ انتقامات سے دوچار ہونا پڑا جو اس درجہ حیرت انگیز تھے کہ انسان کی عقل ان کو تسلیم نہیں کر سکتی: کارشین قانون کے مطابق مظلوم، ظالم سے ہر نوع کا بدلہ لے سکتا تھا۔ میں نے بوڑھے آدمیوں، ان کے بچوں، ان کے دوسرے عزیزوں کے گلے کٹتے دیکھے۔ میرا دل ایسے دہشت ناک واقعات سے لبریز ہے۔

ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ ایک انگریز نژاد نے جھیل کے آخری سرے پر ایک چھوٹا سا بنگلہ کرائے پر لیا ہے۔ اس کے ساتھ ایک نوکر بھی تھا جس کی خدمات اس نے مارسیلز سے آتے ہوئے راستے میں حاصل کی تھیں۔

تھوڑے ہی عرصے کے بعد ہر ایک شخص اس عجیب و غریب انگریز سے ربط ضبط پیدا کرنے کا خواہشمند ہونے لگا۔ وہ وہاں اکیلا رہا کرتا تھا، اور شکار کرنے یا مچھلی پکڑنے کے سوا کسی اور غرض سے باہر نہ نکلا کرتا

تھا۔ وہ کسی سے گفتگو نہ کیا کرتا تھا اور نہ شہر میں جایا کرتا تھا۔ مگر ہر روز صبح کے وقت پستول اور بندوق چلانے کی مشق کیا کرتا تھا۔

اس کے متعلق مختلف افواہیں اڑتی رہتی تھیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ایک اعلیٰ شخصیت کا مالک ہے اور کسی جرم کی بنا پر اس نے اپنے وطن کو خیر باد کہا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی مشہور تھا کہ وہ ایک خوفناک جرم کا مرتکب ہو کے یہاں پناہ گزین ہوا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کی زندگی اور شخصیت اور حالات کے متعلق بہت کچھ لکھ مارا تھا۔

ایک مسافر کی حیثیت سے میں کوشش کرتا تھا کہ اس آدمی کے حالات معلوم کروں مگر یہ میرے لئے ناممکن تھا۔ میں نے اپنا نام سب سے سرجان بتا رکھا تھا۔

میں نے نہایت غور سے اس کی ہر نقل و حرکت کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ مگر حقیقت میں میں اپنے ان شکوک پر یقین نہ کرتا تھا جو اس کے متعلق میرے دل میں پیدا ہو رہے تھے۔

لیکن جب اس کے متعلق افواہیں زیادہ اور عام ہونے لگیں تو میں نے اس اجنبی سے بذات خود ملنے کا ارادہ کیا۔ میں نے ہر روز شدید پابندی کے ساتھ اس کے بنگلے کے قریب شکار کرنے کی عادت ڈال لی۔ بہت عرصے تک میں موقع کی تاک میں رہا۔ حسن اتفاق سے میں نے بنگلے کے قریب ایک تیتر مارا۔ میرا کتا اسے میرے پاس لے آیا۔ میں اسے سرجان کے پاس لے گیا اور اپنے جسارت آمیز فعل کی معافی چاہتے ہوئے جانور اس کی خدمت میں پیش کر دیا۔

وہ نیم وحشی، دراز قامت، توانا اور خوش مزاج آدمی تھا۔ اس کا چہرہ اور بال سرخ تھے۔ اس میں انگریزوں کی سی اکڑفوں نام کو نہ تھی۔ اس نے فرانسیسی زبان میں جس میں انگریزیت نمایاں تھی نہایت گرمجوشی کے ساتھ میرا شکریہ ادا کیا۔

ایک ماہ کے عرصے میں ہم پانچ چھ دفعہ آپس میں گفتگو کر چکے تھے۔ ایک شام جب میں اس کے دروازے کے پاس سے گذر رہا تھا تو میں نے اسے اس کے ذاتی باغیچے میں سگریٹ پیتے دیکھا۔ وہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے سلام کیا۔ اس نے مجھے اندر آنے اور شراب کا ایک جام پینے کی دعوت دی۔ میں نے بغیر تامل کے حکم کی تعمیل کی۔ اس نے از حد ہمدردی اور خلوص سے میرا استقبال کیا۔ اور دیر تک فرانس کے متعلق مجھ سے جوش کے ساتھ گفتگو کرتا رہا۔

یہ دیکھ کر میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اور متانت آمیز انداز میں اس کی زندگی اور کاروبار کی بابت اس سے چند سوالات کئے۔ اس نے صاف گوئی سے کام لے کر بن جھجک جواب دیا کہ وہ افریقہ، ہندوستان اور امریکہ کا طویل سفر کر چکا ہے۔ اور ان ہی طولانی سفروں میں اسے بے شمار مہمات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس کے بعد اس نے بیسیوں شکار کے دلچسپ واقعات سنائے۔ اور چیتے، ہاتھی اور بن مانس کے متعلق اپنی حیرت انگیز معلومات مجھ سے بیان کیں۔

میں نے کہا۔

"یہ تمام کے تمام درندے بڑے ہیبت ناک ہوتے ہیں۔"

اس نے متبسم ہو کر جواب دیا۔

"نہیں نہیں، آدمی ہی سب سے زیادہ پُرخطر جاندار ہے۔" اور اس کا تبسم ایک خوش مذاق اور پُرسرور انگریز کی سی مسرت آمیز ہنسی میں تبدیل ہو گیا۔ پھر اس نے کہا۔ "ہاں میں نے بہت سے آدمیوں کا بھی شکار کیا ہے۔"

اس کے بعد وہ اسلحے کے متعلق گفتگو کرتا رہا۔ اور مختلف قسموں کی بندوقیں دکھانے کے لئے مجھے اندر لے گیا۔

اس کی بیٹھک میں سیاہ ریشمیں پردے لٹک رہے تھے۔ اور ان پر شوخ رنگ کے بڑے بڑے پھول آگ کے شعلوں کی طرح چمک رہے تھے۔

اس نے کہا۔

"یہ جاپانی پردے ہیں۔"

مگر ایک بڑی محراب کے مرکز میں ایک عجیب و غریب چیز نے میری نظروں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ سرخ مخمل کے بنے ہوئے صندوق پر ایک سیاہ چیز پڑی تھی۔ میں اس کے قریب گیا۔ وہ ایک ہاتھ تھا — انسانی ہاتھ! وہ سفید اور صاف استخوان کا ڈھانچہ نہ تھا، بلکہ ایک سیاہ خشک ہاتھ جس کے ناخن زرد رنگ کے تھے۔ پٹھوں پر گوشت نام کو نہ تھا اور ہڈیوں پر منجمد خون گرد کی طرح جما ہوا تھا۔ ہاتھ کلہاڑی کی ضرب سے بڑی خوبی اور صفائی کے ساتھ بازو کے وسط میں سے کاٹا گیا تھا۔ اس کی کلائی پر ایک بھاری بھرکم آہنی زنجیر پیچ و خم کھاتی ہوئی پڑی تھی اور ایک مضبوط چھلے سے بندھی تھی۔

میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ کیا ہے؟"

انگریز نے آہستگی سے جواب دیا۔

"یہ میرا بدترین دشمن ہے۔ یہ امریکا سے یہاں آیا ہے۔ تلوار سے کاٹا گیا ہے۔ اور اس کا گوشت آٹھ دن دھوپ میں رکھ کر خشک کیا گیا ہے۔ یہ میرے لئے بڑی نعمت ہے۔"

میں نے اس انسانی ہاتھ کو چھوا۔ اس کی انگلیاں بہت لمبی تھیں۔ اور پٹھوں کے ذریعے سے جڑی ہوئی تھیں۔ پٹھوں پر ابھی گوشت کے آثار دکھائی دیتے تھے۔ اس کے دیکھنے سے دل پر ہول طاری ہو جاتا تھا۔ اور اس کا اس طرح کٹ کر یہاں موجود ہونا کسی سنگین انتقام پر دلالت کرتا تھا۔

میں نے سرجان سے پوچھا۔

"جس آدمی کا یہ ہاتھ ہے وہ بہت طاقتور ہوگا۔"

سرجان نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔

"ہاں مگر میں اس سے زیادہ طاقتور نکلا۔ ۔ ۔ یہ زنجیر اسے پکڑنے کے لئے باندھی تھی۔"

میں نے سمجھا کہ سرجان مجھ سے مذاق کر رہا ہے اور کہا

"اب تو اس زنجیر کا کوئی فائدہ نہیں۔ ۔ ۔ یہ ہاتھ اب بھاگ نہیں سکتا!"

سرجان نے متانت آمیز آواز میں کہا۔

"یہ اکثر بھاگ جانے کی کوشش کیا کرتا ہے۔ اس لئے زنجیر نہایت ضروری ہے۔"

میں نے ایک تیز نگاہ سرجان کے چہرے پر ڈالی اور دل میں خیال کیا کہ یا تو اس کی عقل میں کچھ فتور ہے یا یہ ہنسی مخول میں بلیغ مذاق نہیں رکھتا۔ مگر اس کے چہرے کی چمک اور مسرت جوں کی توں قائم رہی۔ پھر میں نے اپنی گفتگو کا رخ دوسرے معاملات کی طرف بدلا۔ اور اس کی بندوقوں کی بہت تعریف کی۔ میں نے بھرے ہوئے تین ریوالور مختلف میزوں پر پڑے دیکھے۔ گویا اسے ہر وقت حملے کا خطرہ رہتا تھا۔

اس کے بعد کئی بار میری اس سے ملاقات ہوئی۔ مگر آخر کار میں نے اس کے ہاں جانا بند کر دیا۔ تمام لوگ اس کی اس مقام کی موجودگی سے باخبر ہو چکے تھے۔ مگر اس سے ان کا کوئی گہرا ربط ضبط نہ تھا۔

اسی ادھیڑ بن میں ایک سال گذر گیا۔ ایک دن صبح کے وقت — شاید نومبر کے آخری دنوں میں — میرے نوکر نے مجھے جگا کر کہا کہ سرجان گذشتہ رات قتل کر دیا گیا ہے۔

آدھ گھنٹے کے بعد میں کمشنر جنرل اور انسپکٹر پولیس کی معیت میں سرجان کے گھر میں داخل ہوا۔ نوکر سخت بدحواس ہو کر دروازے کے سامنے رو رہا تھا۔ پہلے میں نے اسی پر شک کیا۔ مگر بعد میں وہ معصوم ثابت ہوا۔

"مجرم کا آج تک کچھ پتہ نہیں چلا۔"

"ہاں جونہی کہ میں سرجان کی بیٹھک میں داخل ہوا میں نے دیکھا سرجان کی نعش پیٹھ کے بل کمرے کے وسط میں پڑی ہے۔ کمرے کے سامان کی بے ترتیبی اور پریشانی ظاہر کر رہی تھی کہ موت کسی زبردست کشمکش کا نتیجہ ہے۔ انگریز کا گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا۔ اس کا ورم زدہ چہرہ ایک بھیانک منظر پیش کر رہا تھا۔ اس کے بھینچے ہوئے دانتوں میں کوئی چیز پکڑی ہوئی تھی۔ اور اس کی گردن میں گویا شاید لوہے کی سلاخ سے پانچ سوراخ کئے گئے تھے۔ خون سے نعش لت پت پڑی تھی۔

ہمارے ساتھ ایک انگریز ڈاکٹر موت کا باعث معلوم کرنے کی خاطر بھیجا گیا تھا۔ اس نے طویل تحقیق کے بعد گلے پر زخموں کے نشان دیکھ کر کہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ انسانی گرفت سے پھانسی دیا گیا ہے۔

یہ سن کر میرے جسم میں ایک کپکپی سی طاری ہو گئی۔ میں نے دیوار کی طرف دیکھا۔ اس جگہ جہاں پہلے وہ پر اسرار ہاتھ رکھا رہتا تھا۔ ہاتھ وہاں موجود نہ تھا اور زنجیر ٹوٹی پڑی تھی۔

میں ایک مردے کی طرح بے حس و حرکت نعش کے پاس کھڑا ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اس کے بند منہ میں اس ہاتھ کی ایک انگلی جو دوسرے پورے پر سے کاٹی گئی تھی پڑی تھی۔

ہم نے باقاعدہ طور پر تحقیقات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ نہ کوئی دروازہ توڑا گیا تھا نہ کھڑکی توڑی گئی تھی۔ اور نہ کوئی چیز اپنی جگہ سے ہلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ دو نگہبان کتے بھی بے خبر سوئے پڑے تھے۔

نوکر نے ذیل کے الفاظ میں اپنا بیان دیا۔

"گذشتہ ماہ سے میرا آقا بڑے اضطراب کی حالت میں رہا کرتا تھا۔ اسے بہت سے خطوط موصول ہو چکے تھے جنہیں وہ ملتے ہی جلا دیا کرتا تھا۔ اکثر اوقات وہ گھوڑے کی چابک سے کر نہایت غصے میں اس خشک ہاتھ پر بڑے زور سے مارا کرتا تھا جو دیوار پر نصب تھا اور جو جرم کے وقت نہ معلوم کس پر اسرار طریق سے گم ہو چکا تھا۔

اس کی عادت تھی کہ وہ دیر سے سویا کرتا تھا۔ اور تمام کھڑکیاں

اور دروازے احتیاط سے مقفل کر لیا کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ کی پہنچ تک ہمیشہ ایک ایک ہتھیار رہا کرتا تھا۔ وہ رات کو اکثر بڑی اونچی آواز سے للکارا کرتا تھا۔ جیسے کسی سے نبرد آزمائی میں مصروف ہو۔ قتل کی رات اس سے کوئی آواز نہ نکلی۔ جب میں کھڑکی کھولنے آیا۔ تو میں نے سرجان کو مردہ پایا۔ مجھے کسی پر شک نہیں۔"

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ میں نے یہ حیرت انگیز واقعہ پبلک کے ہر ایک افسر کے کانوں تک پہنچا دیا اور مفصل تحقیقات ہوئی مگر کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

پھر قتل کے تین مہینے بعد مجھے ایک متوحش خواب آیا۔ میں نے اسی پر اسرار ہاتھ کو کمرے کے پردوں کے قریب بچھو اور گرگٹ کی صورت میں دوڑتے دیکھا۔ تین دفعہ میں جاگا، تین دفعہ میں اٹھا۔ اور تینوں دفعہ میں نے اس انسانی ہاتھ کو اپنے کمرے میں گھومتے پایا۔

دوسرے دن وہی ہاتھ میرے سامنے لایا گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ سرجان کی قبر پر سے اٹھایا گیا تھا...... ہاتھ کی چھنگلی غائب تھی۔!

تو معزز خواتین! یہ ہے میری کہانی۔ اس کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتا۔"

عورتیں یہ سن کر خوفزدہ ہو گئیں اور ان کے چہرے زرد پڑ گئے۔

ان میں سے ایک نے حیرت کے لہجے میں پوچھا

"مگر اس کا حل؟"

مجسٹریٹ فخریہ انداز میں ہنس پڑا۔ اس نے کہا

"خواتین! جو کچھ میرے فہم میں ہے اس سے میں تمہاری تسلی خاطر ہی کر سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ہاتھ کا اصلی مالک زندہ ہو گا۔ اور اپنے دوسرے سلامت ہاتھ سے وہ اس پُر اسرار ہاتھ کو لینے آیا ہو گا مگر یہ معلوم نہیں کہ وہ اس کو حاصل کرنے میں کامیاب کس طرح ہو گیا یہ ایک حل طلب معمّا ہے۔"

ایک نے ان میں سے بڑبڑا کر کہا

"یہ تشفی کُن حل نہیں ہو سکتا۔"

مجسٹریٹ نے ہنستے ہوئے فیصلہ کُن الفاظ میں جواب دیا

"کیا میں نے تم سے پہلے نہیں کہا تھا کہ تم میری کہانی کو تسلیم نہ کرو گی۔"

(موپاساں)

طاہر قریشی

ہم آہنگی

اے بلبلگانِ شاخساری — کاسودہ میانِ شاخسارید

ہرگاہ کہ ابرِ نوبہاری — بر عارضِ گل گلاب بارید

ہرگہ کہ زروئے مہر و یاری — یک انجمنے بباغ دارید

از راہِ وفا و دوست داری — واز بہرِ خدائے یاد آرید

زیں دُور فتادۂ دل افگار!

(مرزا ابراہیم بیگ خان آلفت مشہدی)

ساحل پہ ہو جب ہوائے سنبل — ہو رامش و رنگِ بادہ و گُل

ساقی کی نظر میں ہو تجمل — سینے پہ مچل رہی ہو کاکُل

اُس وقت مجھے بھی یاد کرنا

(رباعیاتِ رحل) (جوش ملیح آبادی)

غزل

نہیں کہ عشق نہیں ہے گل و سمن سے مجھے
دلِ فسردہ لئے جاتا ہے چمن سے مجھے

مثالِ شمع ہے رونا بھی اور جلنا بھی
یہی تو فائدہ ہے تیری انجمن سے مجھے

بڑھی ہے یاس سے کچھ ایسی وحشتِ خاطر
نکال کر ہی رہے گی یہ اب وطن سے مجھے

عزیز اگر نہیں رکھتا نہ رکھ ذلیل ہی رکھ
مگر نکال نہ تو اپنی انجمن سے مجھے

وطن سمجھنے لگا ہوں مَیں دشتِ غربت کو
زمانہ ہو گیا نکلے ہوئے وطن سے مجھے

مرے بھی داغِ جگر مثلِ لالہ ہیں رنگیں
ہے چشمک اُس گلِ خوبی کے بانکپن سے مجھے

چھپا نہ گوشہ نشینی سے رازِ دل وحشتؔ
کہ جانتا ہے زمانہ مرے سخن سے مجھے

رضا علی وحشت

تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں ہندوستانی فارسی کی نوعیت

عام طور پر یہ شکایت کی جاتی ہے کہ ہندوستان میں جو فارسی لکھی یا بولی جاتی ہے اس میں وہ مزا اور شیرینی نہیں جو ایرانیوں یا ایرانی مصنفوں کی زبان میں ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اگر ایک نظر سے دیکھا جائے تو مذکورہ الزام صحیح بھی ہے اس لئے کہ ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کے آخری دور میں یا اس سے کچھ عرصہ قبل بھی فارسی زبان میں جو کتابیں لکھی گئیں ان کی زبان اور ٹھیٹ ایرانی زبان میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مگر تیرھویں صدی کے شروع سے پندرھویں صدی کے نصف اول تک ہندوستانیوں نے جو بھی فارسی ادب پیش کیا وہ کسی ایرانی عالم کی تحریروں سے ہرگز کم نہیں۔ مثال کے طور پر امیر خسرو ہی کی تصانیف کو لیجئے۔ نیز حسن دہلوی اور بدر چاچ کے فارسی علمی کارناموں پر غور کیجئے جنہوں نے اپنے زمانہ میں نظم و ادب اور تصنیف و تالیف کی ایک دھوم مچا رکھی تھی اور اپنے دور کے مستند ادیب شمار کئے جاتے تھے ان بزرگوں کی تصانیف ایسی اعلیٰ پایہ کی ہیں کہ موجودہ روشن دور کے ایرانی عالم فاضل لوگ بھی ان جواہر پاروں کو عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں صرف یہی نہیں بلکہ سعدی اور جلال الدین رومی کے بعد ادبیت کا سہرا انہی مذکورۃ الصدر حضرات کے سر باندھا جاتا ہے۔

وہ ایرانی جو سب سے پہلے ہندوستان میں آئے اور جنہوں نے اسی جگہ کو اپنا وطن قرار دے لیا انہیں اپنی آبائی زبان کی پرداخت کا بہت خیال تھا۔ وہ اپنے آباؤ اجداد اور اہل ملک سے کہیں زیادہ فارسی زبان کی صفائی اور اس کی پاکیزگی کا خیال رکھتے تھے۔ اپنی اصلی زبان کو کسی دوسری زبان سے ملنے نہیں دیتے تھے اس لئے کہ وہ سمجھتے تھے کہ جب کوئی دو زبانیں آپس میں ملتی ہیں تو اس باہمی اختلاط کا نتیجہ دونوں پر برا اثر ڈالتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی آبائی زبان کی خاص طور پر دیکھ بھال کرتے تھے۔ مگر کب تک آخر کار ایک دور ایسا آیا کہ اس زبان کو غیروں سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ اکبر سے پہلے ہمایوں کے عہد تک یہ زبان بالکلیہ مسلمانوں کی ملک تھی شاید ایک آدھ ہندو اس سے واقف تھا لیکن اکبری دور میں اس پر فیاضانہ چھاپے ملنا شروع [illegible]۔ اکبر [illegible] کے زبردست مدبر اور سیاسی راجہ ٹوڈرمل نے اپنی قوم کی فلاح و بہبود اس کی سلامتی اور ترقی اسی میں دیکھی کہ ہندوؤں کو بھی فارسی زبان سے آشنا کر دیا جائے۔ چنانچہ اکبر کو کچھ ایسی پٹی پڑھائی کہ شہنشاہ نے فارسی زبان کے درباری اور دفتری زبان ہونے کا فرمان ہی جاری کر دیا۔ یہ مجبوری کی صورت تھی ہندو مسلمان جو کوئی بھی ہو جس کسی کو سرکاری ملازمت کرنا منظور ہوتا پہلے فارسی زبان سیکھنی پڑتی تھی۔ اس زمانہ میں فارسی کی وہی شکل تھی جو آج کل برطانوی ہند میں انگریزی زبان کی حیثیت ہے کچھ عرصہ بعد اس اختلاط کا یہ نتیجہ نکلا کہ ٹھیٹ ایرانی اور ہندوستانی فارسی میں ایک مابہ الامتیاز فرق پیدا ہو گیا۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے مغل حکمرانوں سے پہلے ہی ہندو امیر اور اہلِ اقتدار لوگ اس زبان سے آشنا ہو چلے تھے اور ان کی یہ کوشش جاری تھی کہ اس زبان پر عبور حاصل کیا جائے بقولِ فرشتہ مورخ تاریخِ ہند ہندوستانی فارسی ادب پر ہندوؤں کا اثر سکندر لودھی کے تخت پر متمکن ہونے کے سنہ یعنی ۱۴۸۹ء ہی سے ہو چلا تھا چنانچہ مورخ مذکور لکھتا ہے :-

"ہندوؤں نے فارسی ادب لکھنا اور پڑھنا شروع کیا۔ ان کی اس ابتدا کا زمانہ وہی ہے جو سکندر لودھی کی تخت نشینی کا زمانہ ہے اور اس سے قبل یہ قوم اس نئی زبان سے واقف نہیں تھی"۔ اب رہا یہ سوال کہ تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں جو فارسی زبان ہندوستان میں بولی یا لکھی جاتی تھی وہ کیسی اور کس نوعیت کی تھی۔ اس کی توضیح میں اس دور کے مشہور فارسی ادیب امیر خسرو کی وہ پُر از معلومات اور نہایت ہی دلچسپ بحث ذیل میں درج کرتے ہیں جو انہوں نے اپنی بے بہا اور لاجواب تصنیف غرۃ الکمال میں لکھی ہے۔

"سرزمین ہند کے موسیقی دان اور خصوصاً وہ لوگ جو در اصل غیر ملکی ہیں۔ لیکن اب جنہوں نے عروس البلاد دلی کو اپنا مسکن بنا لیا ہے۔ اس فن میں اپنے نایاب کمالات اور کامل عبور کے باعث دنیا کے کسی بادر گوشہ کے زبردست سے زبردست ماہرِ فن کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ فنِ موسیقی میں آج ان کا ثانی کوئی نہیں۔ اس لحاظ سے تو

کوئی عربی النسل انسان نہ کوئی خراسانی یا ترک نہ کوئی ہندوستانی الاصل کوئی مسلم شخص اور نہ کوئی دوسرا شخص جو دوسری اسلامی ریاستوں سے ہجرت کرکے ہندوستان آیا اور پایۂ تخت دہلی میں بس گیا ہو یا یہ کہ ملتان اور لکھنؤ میں سکونت پذیر ہو گیا ہو نہیں ہو سکتا ہے۔ ان حالتوں میں اسکی مادری زبان اس غیر ملک کی اجنبی زبان کے اثر سے کچھ نہ کچھ ضرور بگڑ جائیگی۔ ہاں اس کی حفاظت اور بچاؤ کی ایک اور صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اگر ایسا نو وارد بجائے مذکورہ مقامات میں اقامت گزیں ہونے کے گجرات مالوہ یا دیوگری جیسے خالص ہندو تمدن اور ہندو معاشرت کے ملکوں میں بس جائے تو اس کی زبان اس قدر خراب نہ ہو گی جیسا امکان پہلی شکل میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اگر صورت حال مابعد الذکر طریقہ پر ہو تو یقینی طور پر وہ اپنی اصلی مادری بولی بغیر کسی تغیر و تبدل کے بولے گا اور اس کی زبان کو کسی قسم کا اندیشہ نہ ہو گا۔ مثال کے طور پر ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر وہ شخص مذکورہ مقامات میں سے کسی ایک مقام پر آکر بس گیا ہے اور وہ عربی نسل کا انسان ہے تو یہاں بھی اپنی ٹھیٹ عربی بولی ہی بولے گا۔ دوسری زبان کا اس کی بولی پر کوئی اثر نہ ہو گا۔ اس لئے کہ ایک نو وارد اور اجنبی شخص سے باہم اختلاط کی بہت کم توقع ہو سکتی ہے اور سب سے بڑی دوسری بات یہ ہے کہ گجراتی مالوی یا دیوگری کی زبانوں اور عربی زبان میں کسی قسم کا ربط ضبط اور کوئی لسانی تعلق ہی نہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ پانی اور تیل آپس میں مل جائیں بالکل اسی طرح وہ غیر ملکی اور اجنبی ہستی اس بات پر قادر نہیں ہو سکتی کہ مسکونہ مقام کی زبان کو اس طرح بولا جانے جیسے اپنی ہی زبان بول رہے ہیں بلحاظ زمانہ کے اعتبار سے ایسا شخص جب مسکونہ مقام کی زبان کو اختیار بھی کر لیتا ہے تو اس کی گفتگو اور اس کی ٹوٹی پھوٹی اجنبی بولی سے غیریت کی بو آتی ہے اور اس اہم راز کو منکشف کرتی ہے کہ یہ ضرور کوئی غیر ملکی ہے۔ اگر کوئی غیر مہذب شہری یا کوئی دیہاتی شخص دلی میں بس جائے اور وہاں کے باشندوں سے شیر و شکر بھی ہو جائے اور اس خطے کی مروجہ زبان کو صاف بولنے بھی تو کیا ہوا۔ یہ شخص وہ بات کہاں پیدا کر سکتا ہے جو دلی کے فارسی بولنے والوں میں ہے۔ چاہے وہ فارسی پر کتنا ہی عبور کیوں نہ حاصل کرلے کبھی نہ کبھی کسی روز مرہ یا کسی محاورہ کی ادائی کے وقت وہ گرفت میں آجاتا ہے۔ ایسے ہی مواقع پر اہل زبان اور غیر اہل زبان کا فرق معلوم ہو جاتا ہے نیز اس شخص کی جس کو اپنی زبان پر عبور حاصل تھا غلطی پکڑی جاتی ہے۔

ایک خراسانی، عراقی، شیرازی یا کوئی ترک جو بے حد لکھا پڑھا ہو، ہوشیار اور چالاک کیوں نہ ہو جب کبھی ہندوستانی یا فارسی بولے گا بغیر غلطی کئے نہیں رہ سکتا۔ معمولی تو معمولی ایسے عالم فاضل اجنبی سے بھی غلطی کا امکان ہو سکتا ہے جس نے غیر زبان پر عبور حاصل کرنے کے لئے جان توڑ کوششیں کی ہوں اور جو محفل میں بلبلِ ہزار داستان کہلاتا ہو۔ ان تمام محنتوں اور مصیبتوں کے باوجود آخری نتیجہ یہی ہوتا ہے، کہ کبھی نہ کبھی اس سے لغزش ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن ایسے منشی جن کی بود و باش اور پیدائش سرزمین ہند ہی کی ہو خصوصاً شہر دلی کے باشندے تھوڑی سی محنت کے بعد غیر زبانوں پر ایسا عبور حاصل کر سکتے ہیں کہ گویا انہی کی زبان تھی۔ نثر اور نظم میں ایسے کمالات اور جوہر دکھاتے ہیں کہ ان کی زبان میں غیریت یا اجنبیت کا شائبہ تک نہیں ہونے پاتا۔ ان میں خاص کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ جس ملک میں چلے جاتے ہیں اس ملک کی زبان بعینہٖ اختیار کر لیتے ہیں۔ اور تجربہ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ہمارے یہاں کے بہت سے ایسے آدمی جنہوں نے تمام عمر میں کبھی عربستان کی صورت تک نہ دیکھی تھی۔ انہوں نے عربی زبان پر ایسا عبور حاصل کر لیا کہ بعض صورتوں میں اچھے اچھے عربی النسل اساتذۂ وقت کو وہ بات اور کمالِ فن حاصل نہ ہو سکا۔ عرب صرف اپنی زبان کی حد تک بلیغ اور ہوشیار ہیں۔ لیکن ان میں ہماری فارسی سیکھنے کی مطلق صلاحیت نہیں ہے حتیٰ کہ سالہا سال کی محنتوں کے بعد بھی وہ فارسی زبان صحیح نہیں ادا کر سکتے۔

میں چند ایسے تازیوں سے واقف ہوں جو ہندوستان آنے کے بعد ضرورتِ زمانہ کے لحاظ سے محنت و مشقت کرکے ترکی سیکھ گئے اور اس زبان کو اس صفائی کے ساتھ ادا کرتے تھے کہ ان کے غیر ترک ہونے میں شبہ ہوتا تھا وہ اس زبان کو اس فصاحت اور بلاغت، ایسی تیزی اور روانی کے ساتھ ادا کرتے تھے جس کو سن کر اہلِ زبان تک حیرت سے دانت میں انگلی پکڑ لیتے تھے۔ ایرانیوں سے بالراست جو فارسی زبان حاصل کی گئی ہے اس بارے میں صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ اہلِ ایران کے تمام اسلوبوں میں سب سے بہتر اسلوب ماوراء دجلہ و فرات کے مقامات کا ہے اور یہ اسلوب ہندوستان کی فارسی زبان کے اسلوب سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ اس لئے کہ اہلِ خراسان لفظ چہ کو چی کہتے ہیں اور ان میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو کجا کو کُجو کہتا ہے۔ یہ جو کچھ بھی بیان ہوا صرف بولنے کی حد تک ہے۔ مگر یہی لوگ جب لکھتے ہیں [illegible] لکھتے ہیں نہ کہ چی اسی طرح کجا لکھا جاتا ہے کجو ہرگز نہیں لکھتے [illegible] ان کا صحیح تلفظ وہی ہے جو لکھا جاتا ہے۔ اسی قبیل کے اور بہت [illegible] تک اور بھی ہے

ادا کئے جاتے ہیں لیکن ان کو بعینہٖ لکھ دیا جائے تو وہی الفاظ غلط ہو جاتے ہیں مذکورہ بحث خطۂ ایران اور ایرانیوں سے مختص تھی کہ خود اہلِ زبان کے ہاں ان کی زبان میں کس کس قسم کے اختلافات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ مگر ایک غیر ملک ہندوستان پر نظر ڈالیے کہ اس وسیع ملک میں جو فارسی زبان رائج ہے اس کا کیا حال ہے اور یہاں پر کس حد تک اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ آپ یقین ملئے کہ یہ امر بلا مبالغہ اور بغیر کسی پس و پیش کے آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے کہ ہندوستان جیسے بسیط ملک میں دریائے سندھ کے کناروں سے لے کر سواحلِ ہند تک جو فارسی زبان رائج ہے اس میں ذرہ برابر فرق نہیں اور ہر مقام کی زبان میں بالکل یکسانی ہے گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے گوشے گوشے میں ایک ہی مکتب کے فارغ التحصیل اور ایک ہی چشمے کے فیض یاب لوگ مختلف حصوں میں جا بسے ہیں جن سب کی بولی ایک ہی ہے۔

اب تک جو بھی مواد پیش کیا گیا اس سے اسی بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں تیرہویں اور چودہویں صدی عیسوی میں فارسی زبان کے اسلوب کا جو معیار قائم تھا وہ محض ماورائے دجلہ و فرات کے اسلوبِ بیان پر منحصر تھا نہ کہ شیراز و اصفہان یا ایران کے خاص خاص مقامات کے طرزِ بیان اور ادائے اسلوب پر۔ بہر حال آخر میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اوائل زمانہ میں ہندوستان میں جو فارسی زبان رائج تھی وہ بجائے خود یہاں کے لوگوں کی مادری زبان بن گئی تھی۔

غلام محمد خاں

"......" سے!

بھولنے والے! یاد ہے؟ —
ہماری پہلی ملاقات!
جب ہم گم سم ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے!
ہمارے دل باتیں کرنے کو دھڑک رہے تھے!
زبانیں خاموش تھیں!...
نگاہیں کئی بار اٹھیں، اور جھک گئیں!
آہ! تمہیں کچھ یاد ہے؟...

اس کے بعد،
وہ رنگیں لمحات —
— پیہم ملاقاتوں کے!
— خاموش پیغاموں کے!
جب راتیں صبح کی امید میں بسر ہوتیں!
اور دن؟.. آہ! وہ دن!
خوشی و سرور سے پُر کیف!.. نشاط و انبساط سے سرشار!

پھر،
تمہاری خفگی!
میری التجائیں! آرزوئیں! خوشامدیں! منتیں۔
لاحاصل! ناکام! بے سود! بیکار!
میری بے کسی! لاچاری!...
آہ! وہ ایام!
جب دن اذیت، کرب، بے چینی اور تڑپ میں گزرتے!
اور راتیں؟.. آہ! وہ راتیں!...
آہوں اور آنسوؤں سے بیتاب! امید سے بیگانہ!
تمہیں کچھ یاد ہے؟.. بھولنے والے!

پھر
میری قسمت کا بدل جانا!
رخصت ہوتے ہوئے تمہارا مسکرانا!
جاتے جاتے
ایک نظر سے، ایک تبسم سے،
میری تمناؤں کو، ارمانوں کو بیدار کر دینا!
مجھے اپنی یاد میں تڑپنے کے لئے چھوڑ جانا!...
آہ! کچھ یاد ہے؟.. بھولنے والے!...

تمنا

غزل

سمجھ لے دیکھ کر خود نبضِ بسمل دیکھنے والے
دکھائیں کیا تجھے بیتابیٔ دل دیکھنے والے

مری گردن میں ہاتھ اپنے حمائل دیکھنے والے
یہی ہے جذبۂ دل جذبۂ دل دیکھنے والے

ہوا ہے خاک اگر بن جا غبارِ پردۂ لیلےٰ
بگولے کی طرح اٹھ اٹھ کے محمل دیکھنے والے

ہنسی سمجھے تھے قلبِ مضطرب پر ہاتھ کا رکھنا
تڑپ کر رو دئے بیتابیٔ دل دیکھنے والے

کمانِ غمزہ میں تیرِ نگہ زہ کر چکا کوئی
نویداے جنبشِ مژگانِ قاتل دیکھنے والے

نہ چھٹ جائے کہیں رنگِ حنا دستِ حنائی سے
کفِ افسوس مل کر خوں بھرا دل دیکھنے والے

سوالِ وصل کا بس بن چکا اب اتنا ہی کافی ہے
ادا سے مسکرا دے روئے سائل دیکھنے والے

جو ٹکڑا جس جگہ کا ہو وہیں رکھ دے تو بہتر ہے
مرا حسرت زدہ ٹوٹا ہوا دل دیکھنے والے

تہِ شمشیرِ قاتل دیکھ اس حسرت سے اے بسمل
نگاہِ یاس کے ہو جائیں قائل دیکھنے والے

خدا شاہد یہ تیری بیکسی ہے قابلِ عبرت
فلک کو یاس سے منزل بہ منزل دیکھنے والے

بتانِ شوخ کو دل دیکھنے کا صدقؔ دعویٰ ہے
مرے اشعار تو دیکھیں مرا دل دیکھنے والے

صدقؔ جائسی

زرقاء

(ایک مکالمہ اور افسانہ)

(۱)
مکالمہ

احمد۔ تم تو یہ چاہتے ہو کہ کسی غیر معمولی جناتی طاقت سے رات بھر میں قصر تعمیر کر ڈالو۔ ایک عمارت کے تیار کرنے پر وقت لگے گا۔ پہلے اس کے لئے ہر ضروری مسالہ موجود ہونا چاہئے۔ اینٹ چونا لکڑی لوہا سب کچھ۔ معمار اور مزدور ہونے چاہئیں تاکہ وہ اس مسالہ سے تعمیر کا کام شروع کریں۔ پہلے بنیادیں بھری جائیں گی پھر ان میں دیواریں تیار ہونگی اور پھر لکڑی لوہا مزدور اٹھا کر اوپر لے جائیں گے اور چھتیں ڈالی جائیں گی۔ ہر ایک کام بتدریج ہوگا اور اپنے اپنے وقت پر۔

مختار۔ نہیں میں اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ قومیں بنتے دیر نہیں لگاتی ہیں۔ وہ معرضِ وجود میں آجاتی ہیں اور ہمسایہ ملکوں کو پتہ تک نہیں چلتا۔ جب نپولین نے فرانس کا جھنڈا یورپ کے تمام ملکوں میں گاڑ دیا تو اس نے کیا اس عظیم الشان سلطنت کو معماری طریقوں سے تیار کیا تھا؟ نہیں وہ ظاہر ہوا اور اس کے ظاہر ہوتے ہی دولتِ فرانس کا قصرِ عالی شان ایک جنبش سے دنیا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اسی طرح مصطفٰے کمال نے ایک آن کی آن میں ایک باعزت ترکی کی بنیاد رکھ دی۔ مسولینی نے بھی ایسا ہی کیا۔ ہمیں بھی کسی زبردست شخصیت کی ضرورت ہے جو ایک افلاس زدہ پابند اور پس ماندہ ملک کو آنِ واحد میں دوسروں کے ہم پلہ کر دے۔

احمد۔ یہ باتیں حالات پر منحصر ہیں۔ اگر مصطفٰے نے جدید ترکی کی اور مسولینی نے موجودہ اٹلی کی دیکھتے دیکھتے بنیاد ڈال دی تو اس کی وجہ سیاسیاتِ وقت اور موزوں معاملات تھی۔ اگر نپولین نے ایک قلیل عرصہ میں فرانس کو ایک قابلِ رشک سلطنت بنا دیا تو اس کی وجہ تھی اور وہ وجہ یہی تھی کہ عوام کی سیاسی تربیت ہو چکی تھی اور جس قومیت کی روح کو ژان دارک نے بیدار کیا تھا وہ پوری پرورش پانے کے بعد تمنائے عروج میں بدل چکی تھی۔ لیکن ہمارے ملک اور جمہور کی عادات مختلف، ان کی تربیت مختلف، ان کے خیالات مختلف، صدیوں کی غلامی کے اثرات سے پیدا شدہ ذہنیت مختلف، ایسے ملکوں میں اس قسم کے کرشمے نہیں ہوا کرتے۔ ان کو بلند کرنے کے لئے بتدریج کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک رعیت کو جمہور میں تبدیل کرنے پر وقت لگتا ہے۔ یہاں بتدریج حصولِ حکومتِ خود اختیاری کا اصول ہی کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ ہمیں درجہ بدرجہ قدم بقدم منزل بمنزل آگے بڑھنا چاہئے۔

مختار۔ ہرگز نہیں۔ درجہ بدرجہ بڑھنے سے دنیا کے ساتھ سینہ بسینہ چلنا محال ہے۔ ہمیں ایک جست میں دنیا کے برابر ہونے کی ضرورت ہے اور ایسا کرنے کے لئے ایک بلند، زبردست پُر استقلال مقناطیسی کشش رکھنے والی شخصیت کی ضرورت ہے جو ہمیں صرف حکم دے جس کی تعمیل کے لئے ہمارا ذوقِ جنون کی حد کو پہنچ جائے اور ہم تمام رکاوٹوں کو پھلانگ کر صفِ اولیں میں جا کھڑے ہوں۔ یہ ایک ایسا انسان ہو جس کے دماغ سے برقی موجیں اٹھیں اور ہم سب کو مسحور کر لیں۔ یہ انسان ایسا ہونا چاہئے کہ ہم اپنی رضا پر قادر ہوں اور جس کی رضا ہم سب کی رضا پر قابض ہو جائے۔ ایسا انسان کہ اس کی ہستی میں ہم سب کی ہستیاں کھو جائیں اور اس کی آواز ہم سب کی آواز ہو۔ مگر خوش قسمتی سے ایسا راہبرِ کامل ہمیں نصیب ہو جائے تو برسوں کیا مہینوں میں سب ہماری ہستی کا احساس کرنے لگیں اور ہمارا بھی لوہا ماننا چاہئے۔ یہ بنیادیں کھودنا

اور ان میں یا نیٹیں بھرنا قبریں کھودنا اور ان میں نسلوں کے مردے گاڑنا ہے۔ میں اس کا قائل نہیں۔

احمد ۔ یہ تمہاری بھول ہے مگر ذرا سوچو تو مان جاؤ۔ انیس سو بیس، انیس سو تیس صرف دس سال۔ دس سال کے قلیل عرصے میں بتدریج کام کرنے سے ملک کہاں سے کہاں جا پہنچا ہے۔ کیا بلحاظ سیاسیات اور کیا بلحاظ معاشیات ملک میں کس قدر بیداری ہے۔ کیا پہلے اس کا کسی کو خواب و خیال بھی آیا تھا۔ پہلے ہندو تھے نہ مسلمان، نہ نمایندگی کے جھگڑے اور نہ حقوقِ انسانی کے تقاضے۔ ہندو مسلم فسادات اور مناقشات وغیرہ سب بیداری کے نشان ہیں اور یہ جداگانہ اور مخلوط نیابت کے مطالبے قوم کے مختلف عنصروں میں توازن قائم کرنے یا ان کو ایک صف میں لانے کی تحریکیں ہیں تاکہ سب بیک وقت ایک مقام سے آگے قدم بڑھانا شروع کریں۔ دس بیس تیس سال قوموں کی زندگیوں میں لمحوں کے برابر ہوتے ہیں۔

مختار ۔ بالکل نہیں۔ یہ دس بیس سال جن کو آپ لمحے بتا رہے ہیں زندگی کی میعادیں ہوتی ہیں۔ ان کے گذرنے کو صبر و تحمل سے دیکھنا موقعوں کو کھونا اور قیمتی وقت کو ضائع کرنا ہے۔ ایک بلند اور زبردست تحریک کی لہر کسی ہٹلر کسی مسولینی کی شخصیت سے اٹھے تو فوراً پستیاں بلندیوں میں منتقل ہو جائیں۔

احمد ۔ یہاں یہ ممکن نہیں، موجودہ طریقہ ہی ان حالات میں زیادہ مناسب ہے۔ ہم آخر بڑھ تو رہے ہیں۔ "دیر آید درست آید"۔ تعجیل سے توقف بہتر ہے کیونکہ سوچنے سمجھنے کے لئے موقع مل جاتا ہے۔

مختار ۔ جو شخصیتیں قوموں کو منتقل کرتی ہیں ان کے لئے تعجیل اور توقف دونوں لفظ بے معنی ہوتے ہیں۔ وہ کسی غیبی چشمۂ کیفیات سے فیضان حاصل کر کے اسے آگے قوم میں منتقل کر دیتی ہیں۔ ایسی شخصیتیں نہ سوچنے کے لئے رکتی ہیں نہ سمجھنے کے لئے ٹھیرتی ہیں۔ ان کے احساسات غیر شعوری طور پر بیدار اور زندہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ وہ کسی سماوی طاقت کی طرف سے القا حاصل کرتی ہیں۔ خلوص جذبہ اور ذوقِ عمل نے [illegible] ان کے لئے [illegible] ہیں۔

احمد ۔ تو کیا [illegible] شخصیت [illegible] اور

دوسری کا تیسری سے اس طرح جوڑتا ہے کہ پھر ان میں ایک ایسا تعلق ایک ایسا لگاؤ قائم ہو جائے کہ افتراق و انشقاق کا امکان نہ رہے۔ ہمیں دیہات کا قصبات سے اور قصبات کا شہروں سے۔ کاشتکار کا زمیندار سے اور زمیندار کا بیوپاری سے اور دیہاتی آبادی کا قصباتی آبادی سے اس طرح تعلق قائم کرنا ہے کہ ایک کی ہستی دوسرے کے بغیر اور دوسرے کی تیسرے کے بغیر ناممکن ہو جائے۔ تمام ملک ذرائع رسل و رسائل تعلقاتِ تجارت اور صنعت و حرفت کی ضروریات سے ایک ہی شہر معلوم ہو۔ دیہاتی قصبات میں دیہاتی معلوم نہ ہوں اور قصباتی خصوصیات کی وجہ سے ممیز نہ ہوں۔ کسان کو ہر ملکی تجارت اور صنعت و حرفت سے اور تاجر یا صناع کو ہر زرعی معاملے سے لگاؤ ہو اور سب آبادی کیا کسان اور کیا تاجر یا صناع۔ سب تمام ملکی سیاسی اجتماعی تمدنی و ملی تحریکات میں حصہ لینے کے اہل ہوں۔ اگر تمام جماعتیں بلحاظِ عقل و دانش ایک خاص معیار پر آجائیں اور ان میں باہمی طور پر مالی توازن بھی قائم ہو جائے جیسا کہ امید ہے کہ ہو جائے گا تو قوم کو نہ تو کوئی اندرونی اور نہ کوئی بیرونی خطرہ رہتا ہے۔ گذشتہ زمانے میں جو بھی حملے ہوئے ان میں سے کسی ایک کا بھی تمام ملک نے ایک وجدانی حیثیت میں تدارک نہیں کیا تھا۔ شہر لوٹے تو دیہاتیوں نے پروا تک نہ کی اور علیحدہ رہے۔ شہریوں نے دیہاتیوں کو سیاسیات سے علیحدہ رکھا اور صرف باجگذار رعیت تصور کر کے مالیہ ہی وصول کرتے رہے۔ دیہاتی سیاسیات سے علیحدہ ہو کر اپنے آپ کو صرف مالیہ ادا کرنے والی غریب رعایا تصور کرنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو بھی فاتح ہوا اور اس نے مالیہ کا مطالبہ کیا انہوں نے حاضر کر دیا اور اپنی کھیتی باڑی کے کام میں مشغول ہو گئے۔ سیاسیات اور امورِ سلطنت کا کام شہریوں کے ہاتھ میں رہا۔ ایک ۹۰ فی صدی زراعتی ملک کا بیرونی حملوں سے تحفظ دس فی صدی کی قلیل شہری آبادی سے کیا ہو سکتا تھا۔ اگرچہ افواج میں دیہاتی ہوتے لیکن وہ صرف تنخواہ کے ملازم۔ انہیں یہ خیال ہی نہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے بال بچوں، ملک اور ننگ و ناموس کی حفاظت کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ وہ صرف ایک جابر، خود مختار، وقتی حاکم کے چہرے لڑ کر یا تنخواہ کے لالچ سے چلے آتے۔ مگر اگر تمام ملک ایک ہو جائے تو قومی جذبات سینوں میں موجزن ہوں تو بھلا کسی بیرونی حملہ آور کو جرأت

ہوسکتی ہے کہ وہ آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ اب دیہاتیوں کو سیاسیات
کے میدان میں لایا جا رہا ہے انہیں ملک کے اندرونی و بیرونی معاملات
میں حصہ دیا جانے لگا ہے۔ انہیں اس تربیت سے ذمہ داری کا احساس
ہوگا اور جب یہ احساس پوری طرح پیدا ہو جائے گا اس وقت ملک
کی اصل آبادی برسرکار ہوگی اور ہندوستان کسی سے نہیں دب
سکے گا۔ یہ تیاری کا وقت ہے اسے تیار کیا جا رہا ہے اور اس طویل
پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ابھی اور کافی وقت لگے گا۔ اب
تک جو کامیابی اس بارہ میں ہوئی ہے وہ بتدریج حاصل کی گئی ہے۔
بھلا آنِ واحد میں یہ سب کچھ جو اب تک کیا گیا ہے ہو سکتا تھا۔ نپولین
مسولینی، مصطفےٰ، ہٹلر موجودہ زمانہ کے ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا
کرتے۔ ان کے ظہور کے لئے ملک کو ابھی اور ترقی کرنی ہوگی۔ ایسی
نادرالوجود ہستیاں پیدا ہونگی لیکن اب سے سو سال بعد کے ہندوستان
میں۔ اور وہ بھی اس صورت میں کہ موجودہ ترقی کی رو غیر متوقع
حالات سے رک نہ جائے۔

مختار۔ میں بھلا کیونکر مانوں۔ مجھے احساس ہے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے
وہ ممکن ہے

احمد۔ یوں اس طرح جیسے حباب فوراً پیدا ہوتا ہے اور پھر ہوا کے ہلکے سے
جھونکے سے پھوٹ جاتا ہے۔ اگر اس طرح جلدی کوئی سلطنت قائم بھی
ہوتی ہے تو وہ جلدی تباہ ہو جاتی ہے۔ جو حکومت انقلاب سے پیدا
ہوتی ہے اس کو بھی استحکام نہیں ہوتا۔

(دونو گفتگو میں مشغول گاڑی کے قریب پہنچتے ہیں۔ ایک کسان بیلوں
کو ہانکتا چلا جا رہا ہے۔ اس کے پاس سے گذرتے ہیں تو وہ پوچھتا
ہے۔ کیوں بھائی بابو لوگ سیر کر آئے؟ دونوں رک جاتے ہیں اور
اس سے باتیں کرنے لگتے ہیں۔)

(۲)

افسانہ

زرقا۔ احمد! مختار بھی ایک عجیب انسان ہے۔ بے خوف اور نڈر۔ اس
دن تو میں اسے اپنے ساتھ لے جا کر پچھتائی۔ کنارے سے کوسوں
دور اور [illegible] ۔ نہ اسے اپنا خیال نہ میرا۔ بے تحاشا [illegible]
کو [illegible] میل فی گھنٹہ کی رفتار پر چلا رہا تھا [illegible]
تو کچھ پروا نہیں۔ اسے میری تو بھلا کیا پروا ہوتی مجھے اس سے
خوف آنے لگا تھا۔ میں ڈر رہی تھی کہ کہیں میرے مداخلت کرنے
سے برہم نہ ہو جائے۔ تیز سیدھی تیر کی طرح کشتی جا رہی تھی کہ
یکلخت سامنے ایک بڑی شارک (مچھلی) نمودار ہوئی۔ اور سطح
آب پر تیرنے لگی۔ وہ سیدھا جا رہا تھا مچھلی راستہ میں حائل تھی
اس نے کشتی کو ذرا نہ ٹھہرایا نہ موڑا۔ پہلے تو میں حوصلہ کرکے بیٹھی
رہی لیکن جب فاصلہ صرف ایک فرلانگ کا بلکہ اس سے بھی کم رہ
گیا تو مجھ پر فوری اس کی نیت کا انکشاف ہو گیا۔ خوف کے
مارے میری چیخ نکل گئی۔ میں اس سے چمٹنے لگی۔ اس نے ذرا
پروا نہ کی۔ بس گردن پھیر کر بے اعتنائی سے میری طرف دیکھا
اور پھر سامنے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے
وہ مجھے پہچانتا بھی نہ ہو۔ آناً فاناً کشتی شارک کے قریب پہنچی،
میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ میں نے ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانک
لیا۔ کشتی کی اوپر کو اٹھی ہوئی نوکیلی پیندہ شارک کے جسم سے چھوا
اور پھر تمام کشتی ایک سنسناہٹ سے اس کے اوپر سے پھسلتی ہوئی
ــ مجھے اس وقت بھی محسوس ہو رہا ہے ــ کئی فٹ دور جا پڑی
کشتی کے پیندے سے سطح آب سے ٹکرانے اور پھر پھسلنے سے
جو سرسراہٹ کی آواز پیدا ہوئی وہ اب بھی میرے کانوں میں
سنائی دے رہی ہے۔ میں سمجھی کہ بس اب کشتی الٹنے لگی۔ لیکن
کشتی پہلے سے بھی زیادہ رفتار پر آگے بڑھ رہی تھی۔ مختار کے
لب بند تھے آنکھیں سامنے کی فضا میں عین سیدھی کہیں جمی
ہوئی تھیں۔ میں گھبرا رہی تھی کہ آخر یہ جا کہاں رہا ہے۔ اس سے
دریافت کرنے کی مجھے جرأت نہ تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس
کے بازو کو چھوا اور لرزتی آواز سے پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ خلاف
توقع اس نے جواب دیا اور جواب صرف یہ کہ "وہاں"۔ میں نے
دوبارہ پوچھنے کی جرأت کی کہ وہاں کہاں؟ اب ایسا معلوم ہوا
کہ وہ کسی اور دنیا سے پھر اس دنیا میں آگیا ہے۔ کہنے لگا کہیں
نہیں! [illegible] پرے [illegible] آگے چل کر لوٹ
آئیں گے۔ میں [illegible] ہو کر لوٹنے کا انتظار کرنے لگی لیکن
لوٹا کہاں [illegible]
آگے جا [illegible] کشتی

نصف دائرہ بناتی ہوئی مڑی تو میں نے شکر کیا۔ میں پچھتا رہی تھی نہ اس کے ساتھ کیوں آئی۔ کیوں نہ تمہارا انتظار کیا۔ اس وقت یا تو سمندر کی روح اس میں حلول کر رہی تھی یا اس کی روح سمندر کی وسعتوں کے ساتھ اپنی وسعتوں کا مقابلہ کر رہی تھی۔ میری ہستی، اپنی جان، کشتی وغیرہ کا خیال اس کے ذہن سے بہت دور تھا۔ اس وقت وہ تھا اور سمندر۔ جا رہا تھا اور اس طرح جس طرح مختارِ کل ہو۔ آخر جب ہم ساحل سے کافی قریب آ گئے تو ایک شارک پھر نمودار ہوئی۔ اس کو دیکھنے لگا اور رفتار کم کر لی۔ وہ شارک کو تیرتے دیکھ کر مسکرایا اور کہنے لگا۔ کس قدر آزاد معلوم ہوتی ہے۔ سمندر اس کی اقلیم ہے۔ یہ وحید ہے اور فتح چاہتی ہے۔ بلا شرکتِ غیرے سمندر پر حکومت کرنے کی خواہاں ہوتی ہے۔ قدرت نے اس میں یہ بات رکھ دی ہے۔ اب آپ فلسفی بن بیٹھے اور وہ بھی اپنی قسم کے۔ خیر شارک غوطہ لگا گئی اور اس نے رفتار تیز کر دی مجھے ہر لمحہ خوف تھا کہ وہ جنون کی سی کیفیت پھر نہ طاری ہو جائے۔ لیکن عجیب بات یہ کہ اس کے ساتھ ہونے سے مجھے اپنے محفوظ رہنے کا کلی اعتماد تھا۔ اس کے کیرکٹر کا یہ پہلو مجھ سے ابھی تک پوشیدہ تھا۔ جس دن وہ ڈاک پر اس مرہٹہ قلی کی خاطر لڑائی مول لینے لگا تھا مجھے ذرا خیال سا پیدا ہوا تھا کہ اس میں کوئی غیر معمولی چیز موجود ہے۔ تب تو میں یہی سمجھی تھی کہ اس کا دماغی توازن قائم نہیں۔ لیکن بعد میں جب وہ مجھ سے ذرا زیادہ آزادانہ ملنے لگا تو معلوم ہوا کہ نہیں دماغ وغیرہ درست ہے اور وہ ایک نہایت معقول انسان ہے۔

احمد۔ مختار اصل میں اعتدال پسند واقع نہیں ہوا۔ انتہا پسند ہے۔ اگر دوست بنتا ہے تو صد درجہ کا مخلص۔ اور اگر دشمن بنتا ہے تو وہ بھی پرلے درجہ کا متنفر۔ اسے سرحدی پٹھانوں سے عناد ہے۔ وہ ان کو جب کبھی کہیں یہاں ہندوستان میں دیکھتا ہے کڑھتا ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ یہاں آ کر کماتے ہیں ڈراتے بھی ہیں اور ڈرا کر لوٹتے بھی ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ خود ایک غریب قوم ہو کر یہاں کے لوگوں کو سود پر قرضہ دیتے پھرتے ہیں اور پھر وصولی چھری دکھا کر کرتے ہیں۔ مختار کو اس وجہ سے ان لوگوں سے عناد ہے وہ وہاں اپنے صوبہ میں پنجابیوں کو ہزار ہزار طعنے دیا کرتا ہے کہ ان میں ذرا حمیت نہیں کہ وہ ان ایسے ڈنگے سرحدیوں سے دب جاتے ہیں۔ وہ ان کے اس طرح دبنے کو قومی کمزوری پر محمول کرتا ہے۔ ان دنوں جب یہاں بمبئی میں سرحدیوں کے ساتھ فساد ہوا ہے وہ خوش تھا۔ اسی عناد کی وجہ سے وہ اس دن ان سرحدیوں سے لڑنے کو آمادہ ہو گیا تھا۔ وہ لوگوں میں ان کے خلاف ایک روح پیدا کرنے کا خواہاں ہے۔ اور جب کبھی اس کا موقع ملے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کے لئے بھی تیار رہتا ہے۔

زرقاء۔ احمد! وہ انسان ہی خوب ہے۔ یہاں جب تھا تو اس کی گفتگو سے یہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ اس میں اس قدر جذبہ موجود ہے۔ سیدھا سادھا رنجاں مرنج صاف گو سا آدمی معلوم ہوتا۔ لیکن خدا کی پناہ! وہ سمندر والا مختار۔ جانے کیا بلا تھی۔ جان خطرے میں ڈال کر وہ خوش ہو رہا تھا۔ میلانِ طبیعت کی تشفی کر رہا تھا۔ اس دن اس نے غضب کیا ہے۔ عجیب انسان۔ قابلِ قدر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

احمد۔ پیاری زرقاء اب چونکہ ہم مختار کے متعلق دلچسپی سے گفتگو کرنے لگے ہیں میں تمہیں کچھ اور بھی بتانا چاہتا ہوں۔ لیکن وہ ایک ایسا معاملہ ہے کہ اس کے متعلق باتیں کرتے وقت ہم کو اپنے ازدواجی تعلقات کو بھول جانا چاہئے اور احساسات اور ذاتیات سے بالاتر ہو کر گفتگو کرنا چاہئے۔ کیوں!

زرقاء۔ ہاں . . . . درست۔

احمد۔ میں اور مختار ایک گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ پہلے سکول میں اور پھر کالج میں بھی اکٹھے پڑھے۔ ایک دفعہ کوئی تین چار سال ہوئے ہونگے ہم گرمیوں کی چھٹیوں میں گاؤں واپس گئے۔ دیہات میں تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے کوئی سوسائٹی تو ہوتی نہیں لہٰذا ہم اکثر ایک دوسرے کی صحبت میں رہتے۔ ایکدن ہم باہر کھیتوں میں سیر کے لئے گئے اور بحث شروع ہو گئی۔ موضوع یہ تھا کہ آیا ہندوستان کو اہلیت حاصل کر کے بتدریج حکومت خود اختیاری حاصل کرنا چاہئے یا انقلاب برپا کر کے کسی مصطفیٰ مسولینی یا ہٹلر کی مدد سے؟ میں اول الذکر طریقہ کا حامی تھا۔ وہ آخر الذکر طریقہ پر ایمان رکھتا تھا۔ ہم کافی دیر اس بحث میں گھومتے رہے اور ہمارے درمیان ایک طویل مباحثہ ہوا۔ اس نے [illegible] میں نے اپنی بات ثابت کرنے کی کوشش کی۔ نتیجہ وہی ہوا جو بحثوں کا ہوا کرتا ہے۔ میں نے اس کی بات نہ مانی اور اس نے میری [illegible] تسلیم نہ کیا

اور آخر تھک کر ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ یہ بحث اس وقت ہوئی جبکہ ہم فورٹ آباد میں تھے۔ ہم نے ڈگریاں لیں۔ وہ اپنے نصب العین کی تلاش میں کہیں کلکتہ کی طرف چلا گیا۔ مجھے مصوروں سے لگاؤ تھا میں نے اس فن میں بدرجۂ اتم استعداد حاصل کرنے کے لئے مختلف استادوں سے فیض حاصل کرنا شروع کیا۔ اسی سلسلہ میں میں پہلے بھی ایک دو دفعہ بمبئی آ چکا ہوں۔ مختار کے حالات بدل گئے۔ اسے اپنے کام کو چھوڑ کر پھر پنجاب واپس آنا پڑا۔ اب یہاں آنے سے پیشتر وہ وہیں تھا۔ بمبئی وہ ایک خاص غرض سے آیا تھا۔ اور وہ غرض یہ تھی کہ مجھے واپس پنجاب لے جائے۔ میں یہاں اپنے رشتہ داروں کی مرضی کے خلاف آیا تھا اور ان کے کہنے پر وہ مجھے یہاں سے لے جانے کے لئے آیا تھا۔ میں نے اسے اچانک اس دن دیکھا تھا۔ پہلے مجھے اس سے ملنے کی خوشی ہوئی کیونکہ وہ میرا دوست تھا اور ہم نے کئی سال اکٹھے گزارے تھے۔ بعد میں جب ابتدائی جوش ذرا کم ہوا تو میں نے خطرہ محسوس کیا کہ مختار کا آنا بے وجہ نہیں۔ وہ مجھے واپس چلنے کے لئے کہے گا۔ میرے لئے اس کی بات کا ٹالنا مشکل ہوگا۔ لیکن ایک بات میرے حق میں ہو گئی۔ اور وہ تمہاری موجودگی تھی۔ مختار بظاہر سخت بے حس اور بے درد سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن دراصل دل بھی رکھتا ہے اور کبھی کبھی نہیں بلکہ اکثر و بیشتر اسے رحم بھی آ جایا کرتا ہے۔ اس نے تمہیں میرے ساتھ دیکھا۔ بھانپ گیا۔ ایک دن میں نے جب اس سے بمبئی آنے کی غرض دریافت کی تو اتنا کہہ کر چپ ہو گیا کہ تمہیں واپس لاہور لے جانے کے لئے آیا تھا۔ میں اپنی جگہ ڈرا لیکن اس نے دوبارہ اس کا تذکرہ نہ کیا۔ میں روز یہی توقع کرتا کہ بس آج ضرور کہے گا اور بڑی مشکل ہو گی۔ خیر وقت ٹلتا رہا۔ وہ ایک اور کھیل میں مشغول ہو گیا۔ اس کی شخصیت میں ایک خاص اثر ہے۔ اس اثر کو تم نے بھی محسوس کیا اور اس کی طرف کھنچ گئیں۔ مختار کے سیدھے پن کے پس پردہ انسانی فطرت اور انسانی خیالات کو معلوم کرنے کی غیر معمولی قوت پنہاں ہے۔ وہ تمہارے رجحانات کو اس سے پیشتر کہ تمہیں پتہ چلتا تاڑ گیا۔ اس نے تمہاری لطیف، خوش وضع، حسن پسند اور سکون پسند فطرت کا مطالعہ کیا اور تمہیں اپنے مخصوص انداز و وضع سے کھینچنے [illegible] کھینچنا شروع کر دیا۔ اس وقت اس کے [illegible] دریافت کر لیا کہ [illegible]

اصول کہ متضاد قطبین ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں۔ کا سا ایک اصول نفسیات میں بھی موجود ہے۔ اور وہ یہ کہ بعض حالتوں میں ضدین باہمی طور پر ایک دوسرے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ مختار نے اسی اصول پر عمل کیا اور اس کا تجربہ ۹۰ فی صدی کامیاب ثابت ہوا۔ بجریپائی اور شارک والا واقعہ جو تم نے سنایا اس کی فطرت کے عین مطابق تھا۔

آزمایند صاحب قلب سلیم   نزد رعود را از مہمات عظیم

وہ ایک جذباتی انسان ہے اور اس طرح کہ اس کا دل اگر آتش فشانیاں کر رہا ہوتا ہے تو ساتھ ہی اس کا دماغ برفباری میں مصروف ہوتا ہے۔ وہ ایک تجربہ کر رہا تھا اس طرح اس نے ایک تیر سے اپنے دل کی طاقت کی آزمائش کی اگر اس کی طرف سے ذرا اور حوصلہ افزائی یا اقدام ہوتا تو تم اپنے کو کھو بیٹھی ہوتیں۔ میں خاموش دیکھ رہا تھا۔ میرے بس کی بات نہ تھی اگر کچھ کرتا تو الٹا نقصان ہوتا۔ تم ہی مخالفت کرتیں۔ مجھے سوائے اس اصول پر کاربند ہونے کے چارہ نہ رہا کہ صبر کے ساتھ انتظار کروں اور امید رکھوں۔ چیز عشق اور رقابت کا سلسلہ ہی نہ تھا۔ وہ مختلف شخصیتیں اور اس تین چار سال پہلے کے باعث کہ بھی اس میں دخل تھا۔ اس نے تمہیں ایک سلطنت تصور کر کے اپنے اور میرے درمیان رکھ لیا۔ میں نے تمہارے دل تک بتدریج رسائی پکڑ تم پر اپنا اثر ڈالا تھا۔ اس نے ایک دو نشستوں میں تمہیں اپنا گرویدہ بنا لیا اور مجھے دکھا دیا۔ باہر پھینکا۔ اس نے اپنے اصولوں کی صحت کا ثبوت دے دیا اور تمہیں جیت لیا اور وہ زبردست قوت عمل بنا۔ وہ اگر فطرت بنا لیسی شخصیت کے اثر اور ایک فوری انقلاب اور ہنگامہ آرائی ہے۔

زرقا — بالکل درست۔ اس کی موجودگی میں تمہاری شخصیت دب جاتی تھی۔ اس کا سایہ تم پر پڑ جاتا تھا اور کسی غیر شعوری تقابلے تم موجود وقت کے ہمراہ رہتے تھے۔

احمد — لیکن آخری فتح میری ہے۔ وہ تمہیں پھر میرے ہاتھوں میں چھوڑ گیا۔ انقلاب سے جو حکومتیں قائم کی جاتی ہیں ان کو استحکام کبھی نصیب نہیں ہوتا۔ ان میں ہمیشہ تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے اور دوسرے مختار سے شخصوں کو حصول جد و جہد اور تسخیر ہی دلچسپی ہوتی ہے وہ حاصل کر کے متواتر زیر نگیں اور برقرار رکھنا نہیں جانتے۔ کل گیا اور پھر اگر کسی اور نصب العین کے حصول کے درپے ہو گئے۔ جو چیز جلدی مل جاتی ہے جلدی ہی کھو دی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کی قدر نہیں ہوتی۔

زرقا — تم واقعی عجیب انسان ہو۔

یہ کہہ کر وہ ایک طرف منہ موڑ کر زمین کی طرف دیکھنے لگی اور پھر مسکراتے ہوئے [illegible] بہار کی سیڑھی چلنے لگی۔ اس حالت میں احمد نے [illegible] اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا [illegible] سر [illegible] کے سینہ پر رکھ کر [illegible] اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

[illegible] مستقل [illegible]

جوانی

(سانیٹ)

بہار و شعر و مستی کو لئے دامانِ رنگیں میں
جوانی ہر نظر کو حسن کا پیغام دیتی ہے
امید و آرزو اور شوق کے ایوانِ رنگیں میں
شرابِ بے خودی ہر دل کو صبح و شام دیتی ہے

جوانی سرمدی نغمے وہ دنیا کو سناتی ہے
جنہیں سن کر یقیں انساں کو آجاتا ہے ہستی پر
کہیں چشمے بہاتی ہے کہیں غنچے کھلاتی ہے
یہی مجبور کرتی ہے چمن کو خود پرستی پر

دلِ آزاد میرا بے نیازِ عقل و ایماں ہے
چلاتا ہے یہ جس رستے پہ اُس رستے پہ چلتا ہوں
نہ ڈر تنقیدِ عالم کا، نہ خوفِ غیظِ یزداں ہے
جوانی ڈھالتی ہے مجھ کو جس سانچے میں ڈھلتا ہوں
یہی دن ہیں جوانی کے محبت کے مسرت کے
ضعیفوں کو مبارک حوصلے زہد و عبادت کے

ضیا فتح آبادی

غزل

ترے وحشی بھری دنیا کو ویرانہ سمجھتے ہیں
مگر ہر ایک ویرانے کو اک دنیا سمجھتے ہیں

طلسمِ رنگ و بو کو اہلِ دل کیا کیا سمجھتے ہیں
کبھی پردہ سمجھتے ہیں کبھی جلوہ سمجھتے ہیں

نہ ہم ایسا سمجھتے تھے نہ ہم ایسا سمجھتے ہیں
مگر اے دوست تیرے جور کو سب کیا سمجھتے ہیں

کہیں ہو تیرے دیوانے ٹھہر جائیں تو زنداں ہے
جدھر کو منہ اٹھا کر چل پڑے صحرا سمجھتے ہیں

ہمارا حال سننے والے تیرے ضبط کے صدقے
یہ رہ رہ کر ترا ہم مسکرا دینا سمجھتے ہیں

امیدوں میں بھی اُن کی ایک شانِ بے نیازی ہے
ہر آسانی کا جو دشوار ہو جانا سمجھتے ہیں

جہاں کی فطرتِ بیگانہ میں جو کیفِ غم بھر دیں
وہی جینا سمجھتے ہیں وہی مرنا سمجھتے ہیں

بھلا دیں ایک مدت کی جفائیں اس نے یہ کہہ کر
تجھے اپنا سمجھتے تھے تجھے اپنا سمجھتے ہیں

یہی ضد ہے تو خیر آنکھیں اٹھاتے ہیں کسی جا.
مگر اے دل ہم اس میں جان کا کھٹکا سمجھتے ہیں

نہیں آساں اے دل دردِ فرقت میں سنبھل جانا
سحر ہونے کو ہم بھی رات کٹ جانا سمجھتے ہیں

ہمیں مایوسیٔ فرقت میں رو لینے دو جی بھر کر
نہیں ہوتا ہے کچھ رونے سے ہم اتنا سمجھتے ہیں

مکاں سے لامکاں تک موج خیزی ہے محبت کی
نہ ہم خطرہ سمجھتے ہیں نہ ہم دریا سمجھتے ہیں

فراقؔ اکثر کوئی ہر اک سے بیگانہ سا رہتا ہے
بس اتنے پر کسی کو لوگ دیوانہ سمجھتے ہیں

فراقؔ گورکھپوری

عمل تنویم

سب سے بڑی اور شاید سب سے زیادہ مضحکہ خیز انسان کی غلطی اس قسم کے الفاظ وضع کرنا ہے جیسے "مافوق العادت" اور "مافوق الانسان"، جن سے مطلب اُن طاقتوں کا ذکر کرنا ہے جو انسان کی فہم سے بالاتر اور اس کے ذہن و عقل کی دسترس سے باہر ہیں۔ اس نے غلطی سے، غالباً معصومیت سے اپنی دنیا میں اس قسم کی طاقتوں کو داخل کیا اور اپنی قدرت کا بہت کم اندازہ لگایا۔ خدا نے دراصل انسان کی ترقی میں کوئی چیز پوری طرح حائل نہیں کی ہے۔ "من و تو" کا امتیاز اٹھا کر انسان خدا بھی بن سکتا ہے جو چیز اس کو اس قسم کے غلط اعتقادات قائم کرنے پر مجبور کرتی ہے اس کا سبب اس کی جہالت اور اس قسم کے واقعات کی نادر الوقوع نوعیت ہے۔ وہ کسی چیز کو اس لئے مافوق الانسان سمجھتا ہے کہ وہ اس سے کماحقہٗ باخبر نہیں اور اس لئے کہ وہ بہت کم وقوع میں آتی ہے۔ جب وہ ظہور پذیر ہوتی ہے تو وہ خوفزدہ ہو جاتا ہے، اور اپنی طاقتوں کی ایک قطعی مگر پھر بھی "قابلِ عبور" حد قائم کر دیتا ہے اگرچہ اس کے دل میں یہ پوشیدہ خواہش ہوتی ہے کہ کسی طرح وہ اس "غیر انسانی" طاقت کو مغلوب کر سکے۔ لیکن جب اس کی حقیقت اس پر منکشف ہو جاتی ہے تو اس کے تمام خوف ایک "خندۂ دنداں نما" میں تبدیل ہو جاتے ہیں، اور وہ اس پر کامل قبضہ کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

عمل تنویم یا مصنوعی ذرائع سے خواب آوری کا فن ایک مدتِ مدید سے مافوق العادت سمجھا گیا ہے۔ اور ان صورتوں میں بھی خوف و ہراس کی نظر سے دیکھا گیا جب کہ وہ اکثر خطرناک ترین امراض کے لئے نہایت درجہ مؤثر طریقِ علاج ثابت ہوا۔ اس کا اصلی سبب عاملین کی حقیقی ناواقفیت تھی، اور اس کے علاوہ یہ بہت کم عمل میں لایا جاتا تھا۔

زمانۂ سلف میں دنیا کے ہر حصے میں اس فن کے عامل اور عالم موجود تھے جو ایک راز کی طرح سے محفوظ رکھتے تھے اور راز[illegible] کو سینہ بسینہ اس علم سے واقف کرتے تھے،

دنیا اس فن سے کس طرح آگاہ ہوئی؟ یہ اب تک تاریخ کا ایک صفحۂ تاریک ہے۔ پرانے لوگ اس سے واقف تھے اور وہ بڑے عزّ و وقار سے دیکھے جاتے تھے۔ قدیم ہندوستان کے مشہور سادھو اور جوگی اس کا علم رکھتے تھے۔ وہ دل کی باتیں بتانے میں مہارت رکھتے تھے۔ فالج اور جھاڑ وغیرہ کے مریضوں کو اچھا کر سکتے تھے، دور بیٹھے لوگوں پر اثر کر سکتے تھے، اور مردہ روحوں کو بُلا سکتے تھے۔ مؤرّخ اور کیرو دیدہ اس امر پر متفق ہیں کہ ان کی یہ تمام حرکات عمل تنویم ہی کا کرشمہ تھیں۔ یہ ان کی فرقہ کی پوشیدہ ملکیت تھی، اور غیر لوگوں کے تفحص و تحقیق سے اس کی حفاظت ان کا جماعتی فرض تھا۔ رفتہ رفتہ ان لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا، ہر ملک میں یہ لوگ پھیل گئے اور یہ عمل بھی بہت عام ہو گیا۔ اکثر یہ لوگوں کی رائے کے خلاف اثر پیدا کرتے، جس سے جمہور بہت پریشان اور برگشتہ ہوئے اور اس کو جادو اور ٹونے کے خراب ناموں سے موسوم کیا۔ عاملین جادوگر کہلائے اور حقارت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔ وہ قتل کئے گئے، قید کئے گئے اور برباد کر کے انسانی آبادیات سے خارج کر دئے گئے۔ چودھویں اور پندرھویں صدی میں بہت سے ماہران فن جلا کر خاکستر کر دئے گئے۔ خصوصاً فرانس میں اس قسم کے بہت سے لوگوں پر مظالم ہوئے۔

باوجود ان تمام باتوں کے اس کام نے اب مستقل فن کی صورت اختیار کر لی ہے۔ موجودہ تحقیق کی روشنی نے اب تاریکیاں دور کر دی ہیں، اور یہ فن اب ہر دلعزیز ہو گیا ہے۔ اس کا غیر انسانی عنصر فنا ہو چکا ہے، اور اب اس میں کوئی بات عجیب و غریب باقی نہیں رہی ہے۔ انسان نے یہ علم دریافت کر لیا ہے اور یورپ میں اکثر جگہ اس فن میں دستگاہ حاصل کرنے کے لئے اسکول قائم ہو گئے ہیں۔ اس لئے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ اس میں کوئی بات حیرت [illegible]

ہر شخص اثرِ شخصیت رکھتا ہے۔ اور تنویم ایک فن ہے جو اسے کم و بیش نمایاں استعمال سکھاتا ہے۔ ہر شخص یہ مقناطیسی خواب دوسرے پر طاری کر سکتا ہے۔ اگر عامل آہنی ارادہ، تمرکزِ نفس اور تیز نظر کا مالک ہے تو وہ نہایت آسانی سے اس شخص کو معمول بنا سکتا ہے جو ایک ضعیف دل و دماغ اور زود اثر و متلون فطرت کا حامل ہو۔ ایک نفوذ پذیر نگاہ کے علاوہ عامل کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ معمول کے خیالات کو ایک مرکز پر لائے اور اپنے احکامات کو بار بار حاکمانہ لہجے میں دہرائے۔ یہ تکرار احکامات جو معمول سے کی جاتی ہے اصطلاحاً "تاثر" کہلاتی ہے۔ معمول کے جسم پر ہاتھ پھیرنا بھی خواب آوری میں ممد اور معاون ہوتا ہے۔

بقول ڈاکٹر سلومان (ایک موجودہ ماہرِ فن) تنویمی حالت (عملِ تنویم) چار حصوں میں منقسم ہے۔ اول وہ جبکہ عامل متواتر اور مسلسل معمول کی آنکھوں پر آنکھیں جمائے رہتا ہے اور اسے چند باتیں کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ معمول باوجود ذی شعور اور باحواس ہونے کے اس کے خلاف کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ دوم وہ جبکہ تمام حواس ہونے کے باوجود وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنی آنکھیں بند کرے۔ سوم وہ جب اس کی شعوریت سرد ہو جاتی ہے۔ نبض چلنا اور خون کا دورہ مدھم ہو جاتا ہے۔ وہ اس منزل پر ہر وہ حکم جو اس کو دیا جاتا ہے بجا لاتا ہے۔ حال ہی میں ایک شخص نے اپنے معمول کو یہ حکم دیا کہ وہ ایک مردہ شخص کے گولی مار دے اور بعدہٗ خود اپنے کو ہلاک کر دے چنانچہ اس کے احکامات کی حرف بحرف تعمیل کی گئی۔ چہارم منزل وہ کہ جب اس کی ذہنی قابلیتیں اس درجہ تیز اور سریع الحس ہو جاتی ہیں کہ مستقبل کے واقعات بیان کر سکتا ہے۔ ایک مرتبہ مصر میں ایک معمول نے روئی کی قیمت میں انحطاط کے بارے میں پیشگوئی کی جو بعد میں صحیح نکلی اسی طرح ایک شخص نے پیشگوئی کی کہ سعد زغلول پاشا قلیل مدت کے لئے وزیر ہوں گے، اور آخر واقعات نے اس امر کی تائید کی۔

یہ مقناطیسی لاشعوریت انسانوں ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک شخص انسان کے علاوہ شیر، بھیڑیا، کتا، بلی، سانپ وغیرہ جانوروں پر بھی عمل کر سکتا ہے۔ السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا کے ایک حال کے پرچہ میں ایک شخص دکھلایا گیا تھا جو شیر اور سانپ وغیرہ پر عملِ تنویم کرنے میں مشق رکھتا تھا۔

انسان کے علاوہ جانور بھی تنویمی قوت رکھتے ہیں۔ شاید انہیں اس فن کا علم اس وقت سے ہے جب انسان بالکل ہی بے علم تھا۔ وہ اکثر اس کی مشق کرتے ہیں جو عموماً ان کے لئے خوراک کی صورت میں مددگار ہوتی ہے بلی عملِ تنویم کی ماہر ہے۔ ایک چوہا ہرگز اس کے سامنے بھاگنے کی جرأت نہیں کر سکتا اگر دونوں کی نگاہیں مل گئی ہیں یا ان کا تصادم ہو گیا ہے۔ یہی عمل شیر کا بھی ہے۔ سانپ بھی ماہر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے کبھی کبھی انسان کو بھی مسحور کر لیا ہے۔

تنویم کی حیثیت ایک فن کی سی ہے جو ایک مستقل مشق کے بعد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بعض اوقات انسان بھی مثل جانوروں کے اس قابلیت کا فطرتاً آئینہ دار ہوتا ہے۔ لوگ اس سے بے خبر ہو سکتے ہیں، لیکن وہ اس کے مالک ضرور ہیں۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر ایک شخص کسی ایسی عورت سے عشق کرنے لگتا ہے جو کوئی حسن و خوبی نہیں رکھتی۔ اس کا راز اسی مقناطیسیت میں مضمر ہے جو اس میں فطرتاً اس عورت کو ودیعت کی گئی ہے جس کو فغانی شیرازی نے "بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست" سے تعبیر کیا ہے۔ حافظ نے اس نفسیاتی کیفیت کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

لطیفہ ایست نہانی کہ عشق از و خیزد   کہ نام آں نہ لبِ لعل و خطِ زنگاریست
جمالِ شخص نہ چشم ست و زلف و عارض و خال   ہزار نکتہ درین کار و بارِ دلداریست

سعدیؒ نے اس کو "سرِ خدائی" سمجھا ہے اور ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں "ہر چہ در دل فرود آید در دیدہ نکو نماید" یہی وجہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ فلاں عورت خوبصورت ہے۔ لیکن اگر ہم سے پوچھا جائے کہ وہ خوبصورتی کہاں ہے تو ہماری زبان محض طلبگارِ سکوت ہو گی اور ہم کچھ بھی نہ بتا سکیں گے۔ ہم کشش محسوس کرتے ہیں اور اس طرف کھنچ جاتے ہیں اور بس! اس کی وجہ محض تنویمی قوت ہے!

دنیا کی اکثر اولوالعزم ہستیاں اس خصوصیت کی حامل رہی ہیں اور ان کی کامیابی بھی ایک حد تک اسی قابلیت کی مرہونِ احسان ہے۔ ملکہ وکٹوریہ، جون آف آرک اور نپولین یہ سحر آفریں طاقت رکھتے تھے اور ہم جانتے ہیں کہ آج یہ غیر فانی ہستیاں ہیں موجودہ فضائے عالم جن سے روشن اور تابناک ستاروں سے مزین ہے اسمیں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر گریٹا گاربو، روڈالف ولینٹینو، اور جون کرافورڈ ہیں۔ ان کی شہرت کا سبب بھی مقناطیسی اثر ہے، جس کے وہ غیر شعوری طور پر مالک ہیں جب وہ پردے پر جلوہ نما ہوتے ہیں تو تمام حاضرین کو مسحور کر لیتے ہیں۔

موجودہ انسان اس فن کی طرف نہایت مشتاقانہ گامزن ہے۔ اس کا یہ اشتیاق اگر تشنۂ تکمیل نہ رہا تو کیا سکون، امن اور مسرت حاصل ہو سکے گی اور ایسا تمام امراض کیلئے مع بیماریٔ عشق "علاج" تجویز کر سکے گا (جیسا کہ مسٹر ایچ۔ جی۔ ولز نے تحریر کیا ہے) اور "مافوق العادت" اور "مافوق الانسان" کے طلسم سے برأت حاصل کر لیگا؟ یا کہ جرائم میں آسان اور سہل الحصول ذرائع کی فراہمی کے باعث اضافہ ہو جائے گا اور اس طرح غیر قانونی حرکات کی فراوانی کے سبب امن عالم میں خلل واقع ہو جائے گا؟ اس کے متعلق قبل از وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا ہمیں واقعات کا انتظار اور مطالعہ کرنا چاہیئے۔

خواجہ احمد، ۱۹۳۰ء

غزل

وہ آ رہے ہیں بہار در بر، لئے ہوئے حشرِ زندگی کا
ٹھہر ٹھہر گریۂ مسرت بھرم نہ کھل جائے عاشقی کا

نظر پہ جلووں کی حکمرانی دلوں پہ مایوسیوں کا پہرا
اگر چھڑا لے امید دامن کہاں ٹھکانا ہے آدمی کا

نگاہِ ساقی کی میفروشی خرد کو جھولا جھلا رہی ہے
برس رہے ہیں خودی کے نغمے یہ فیض ہے سازِ بیخودی کا

زمیں کے ذروں پہ خواب طاری فلک پہ تاروں کی بند آنکھیں
یہ زندگی کی سحر تو دیکھو سماں ہے سب شامِ زندگی کا

جبیں ہے نقشِ قدم پہ ان کے خلافِ آئینِ رسمِ الفت
جبیں پہ نقشِ قدم ہے لازم گرا نہ معیار عاشقی کا

ہے ختم اب جانکنی کا منظر نگاہ سجدے میں جھک چکی ہے
خدا خدا کر کے مدتوں میں خمار ٹوٹا ہے زندگی کا

وفا کے جوہر دلوں کے دولتکدے سے ناپید ہو چکے ہیں
دہائی اے دشمنو دہائی فریب خوردہ ہوں دوستی کا!

ہوا موافق بھی ہو تو کیا ہے نہیں بدلتا نظامِ فطرت
دم آ کے ساحل پہ ٹوٹتا ہے شناورِ بحرِ زندگی کا

ہر ایک سجدہ خودی کے دامن پہ داغ محسوس ہو رہا ہے
دلِ توہم پرست آخر مآل دیکھا نا بندگی کا!

نگاہ کو خوفِ دشت کی دلفریب افتاد سے بچا لے
اسیرِ نیرنگیٔ تجلی یہ ہے تماشا رواروی کا

متانتوں کو کچل کے آنسو مژہ پہ کیوں تھرتھرا رہے ہیں
کہو تو احسان حال کیا ہے مزاج کیسا ہے بیکسی کا

احسان بن دانش

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

(۱)

پروفیسر رشید کی چوتھی شادی تھی۔ پہلی بیوی مرگئی، دوسری کو طلاق دے دیا، تیسری بھاگ گئی اور اب چوتھی بیوی کو آئے ہوئے دو ہی چار دن گذرے تھے۔ آج رات ولیمے کی دعوت تھی۔ مہمانوں میں زیادہ تر کالج کے لکچرار اور پروفیسر صاحبان تھے۔ گو آٹھ بج چکے تھے اور مہمانوں پر بھوک کا رہ رہ کر حملہ ہو رہا تھا کیونکہ بعض معاشیات کے پروفیسروں نے سہ پہر کی چائے بھی نہیں پی تھی۔ لیکن دستر خوان ابھی تیار نہ ہوا تھا۔ اس لئے مجبوراً لوگوں کو اپنی عنانِ توجہ دوسری طرف پھیرنی پڑی۔ پانچ پانچ سات سات کی ایک ٹولی بن گئی اور کوائفِ عالم پر گرمجوشی کے ساتھ تبادلۂ خیال ہونے لگا۔ معاشیات کے پروفیسر آئن سٹائن کی جدید تھیوری سمجھنے میں سر کھپا رہے تھے۔ ریاضی کے پروفیسر صاحبان برنارڈ شا کے ڈراموں پر تنقید کر رہے تھے۔ فلسفہ کے پروفیسر سر بکار تھے کہ آیا مستقبل قریب میں ایک عالمگیر جنگ ہوگی یا نہیں۔ اور دینیات کے مولوی صاحبان کساد بازاری سے بحث کرتے ہوئے اس موضوع پر آ رہے تھے کہ آیا ایسی حالت میں سود جائز ہے یا ناجائز؟ عوام البتہ علمی موضوع پر گفتگو نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ جنّوں اور بھوتوں کے واقعات جو اُن کے ساتھ یا ان کے دوستوں کے ساتھ گذر چکے ہیں بیان کر رہے تھے۔

(۲)

پروفیسر رشید دستر خوان پر ایک آخری تنقیدی نظر ڈالنے کے لئے ہال میں داخل ہوا۔ اس وقت سوائے اس کی سلیقہ شعار ماما رحیمن کے اور کوئی نہ تھا۔ دستر خوان بالکل لیس تھا۔ رحیمن اپنی دو منزلہ توند کے ساتھ کبھی دستر خوان کے اس کونے پر آتی تھی اور کبھی اس کونے پر۔ کبھی اس پلیٹ کو درست کرتی اور کبھی اس پلیٹ کو۔ وہ اس الٹ پھیر میں اتنی محو تھی کہ رشید کی موجودگی کا بھی اسکو علم نہ ہوا۔

"کیوں رحیمن مچھلی کے کباب کہاں ہیں؟" رشید نے چوطرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے بعد پوچھا۔

رحیمن چونکی۔ پلٹ کر دیکھا۔ مسکرائی اور کولھوں پر ہاتھ رکھ کر بولی: "اے وہ کیا دھرے ہیں؟"

اور جلدی جلدی لڑھکتی ہوئی جا کر ایک ڈش پر سے ڈھکی ہوئی پلیٹ اٹھائی۔ رشید بھی ساتھ ساتھ ڈش کے قریب پہنچ چکا تھا۔ پلیٹ کا اٹھانا تھا کہ گرم بھاپ کی لپٹ اور خوشبودار مسالے کی مہک نے رشید کو بے قابو کر دیا۔ اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اور اس نے بے ساختہ چٹخارہ لیا۔ رحیمن بھی قریب ہی بلی کی طرح زبان چاٹ رہی تھی۔ عین اسی وقت ڈاکٹر سعید نے ہال کا دریچہ کھولا۔ گردن اندر ڈالی اور اس غیر متوقع آواز سے چونک کر پکارا۔

"رحیمن تمانا تو یہ کون خوش قسمت تھا جسکے لبوں کو آج یہ فخر حاصل ہوا .... اوہو یہ تو پروفیسر رشید خود ہیں۔ سچ ہے کہ 'اوّل خویش بعد درویش'۔"

"ہشت! میں نے کسی کا بوسہ نہیں لیا" رشید جھنجھلا کر بولا۔ "میں تو لذیذ مچھلی کو دیکھ کر چٹخارے لے رہا تھا اور آپ کچھ اور سمجھ رہے ہیں لاحول ولا۔ عجب شخص ہے۔"

"ہا ہا ہا" سعید نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا اور گردن اندر کھینچ لی رشید کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔

"شیطان کہیں کا .... کہیں بات کا بتنگڑ نہ بنائے" اور رشید چڑ کر ایک ایک سے کتا نہ پھرے .... بدتمیز کہیں کا" رشید بڑبڑا رہا تھا۔

(۳)

رشید باہر آیا اور مہمانوں کے بھرے مجمع میں سعید کو تلاش کرنے لگا۔ اس کے چہرے سے پریشانی اور اضطراب کے [illegible]

آنکھیں پھاڑے چاروں طرف گھورنے لگا۔ یکایک اس کی نظر ایک مختصر سی ٹولی پر پڑی جس کے بیچوں بیچ سعید ہاتھ نچا نچا کر کچھ کہہ رہا تھا اور لوگ قہقہے پر قہقہہ لگا رہے تھے۔

میں خوب سمجھتا ہوں اس نابکار کی عادت کو۔ ہو نہ ہو میرا ہی قصہ خوب خوب نمک مرچ لگا کر بیان کر رہا ہوگا" سعید سے شبہ کیا: "مردود کمین کا .... لعنت بھیجو تو سہی سب کے سب کس مزے سے سُن رہے ہیں۔ وہ تو اس گپ باز کے ہر ہر فقرے کو واقعہ سمجھ کر محظوظ ہو رہے ہیں .... نامعقول۔ کمینہ .... مجھے بھی ایسی ترکیب کرنی چاہیئے کہ اس سنئے کی شیخی کرکری ہو جائے کیوں نہ میں ہی سارا واقعہ من و عن بیان کر دوں اور اس مسخرے کے دانت کھٹے کر دوں ......"

رشید غصے میں اپنے ہونٹ چبا رہا تھا۔ دانت پیستے ہوئے نظیر کی طرف بڑھا اور کہنے لگا: "میں دسترخوان پہ آخری نظر ڈالنے کے لئے ہال میں گیا .... میں جانتا ہوں کہ تم مچھلی کے بے حد شائق ہو۔ اسی خیال سے میں نے عمدہ کباب منگوائے۔ ہمارے ہاں کا باورچی بڑے لذیذ کباب لگاتا ہے۔ تم شاید ایک مرتبہ کھا بھی چکے ہو۔ ہاں تو خیر بات رہی جاتی ہے۔ ایک بڑا زبردست لطیفہ ہوا۔ میں مچھلی کے کباب دیکھنے دسترخوان پر گیا اور پلیٹ پر نظر پڑتے ہی میں نے بے ساختہ چٹخارہ لیا۔ اس قدر لذیذ بو آئی کہ میں ایسا کرنے پر مجبور تھا۔ عین اسی وقت نامعقول سعید نے دریچہ کھولا اور چٹخارے کی آواز سن کر کہا "ہا ہا! آپ کسی کا بوسہ لے رہے ہیں؟" دیکھو تو بے وقوف کو۔ میں بھلا بوسہ لے رہا تھا! ملا رحیمن کا! کمبخت کو بالکل سمجھ ہی نہیں ہے۔"

"کس کو سمجھ نہیں؟" بشیر جو دور تھا اور صرف آخری فقرہ سُن سکا تھا قریب آ کر دلچسپی لیتے ہوئے بولا:۔

"سعید کو .... بات یہ ہوئی کہ میں ہال میں گیا۔ دسترخوان دیکھنے کے لئے ...." اس نے رحیمن اور مچھلی کی ساری داستان دہرائی "سوچو تو سہی بھلا مجھے ایسی کیا پڑی تھی کہ رحیمن کا بوسہ لیتا ......" رشید پلٹا تو رحیم قریب دکھائی دیا۔

"ہم ابھی سعید کا ذکر کر رہے تھے" رشید نے رحیم سے کہنا شروع کیا: "ال [illegible] کمبخت کہتا ہے میں اور رحیمن پاس پاس کھڑے ہیں بس اتنی سی بات [illegible] اور اس نے سارا قصہ گھڑ دیا۔ کس مزے سے پوچھتا ہے "آپ [illegible] کا بوسہ لے رہے تھے؟" کہو کیسے قسم کا آدمی ہو خیال تو کرو [illegible] شخص کہاں تک ایسی نازیبا حرکت کر سکتا ہے

اور وہ بھی ہمارا رحیمن کے ساتھ۔ لا حول ولا .... عجیب بیوقوف ہے"

"کون بیوقوف ہے؟" وحید نے قریب سے گذرتے ہوئے پوچھا۔

"وہی سعید۔ اور کون ہو سکتا ہے۔ میں دسترخوان پر ایک نظر ڈالنے گیا اور ...." رشید نے رام کہانی شروع سے آخر تک پھر سنائی۔

مہمان جب دسترخوان پر پہنچے تو اُن میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو رشید اور رحیمن کے قصے سے واقف نہ ہو۔

"اب اسے ہر شخص سے کہنے دو" رشید نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "جب وہ کسی سے کہنا شروع کرے گا تو لوگ کہیں گے: ہشت چپ رہو ہمیں سارا قصہ معلوم ...... ہا ہا ہا"

اس خیال سے رشید اس قدر مطمئن ہوا کہ دسترخوان پر دو چار لقمے زیادہ کھا گیا۔

(۴)

دوسری صبح رشید اپنی اور رحیمن کی بابت سب کچھ بھول چکا تھا ناشتے کے بعد کالج جانے کی تیاریاں کر ہی رہا تھا کہ اس کے چچا نے بلا بھیجا۔

"رشید! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے" رشید کے چچا نے کہا۔

"ارشاد فرمایئے":۔

"حالانکہ ماشاء اللہ تم خود سمجھدار ہو۔ لیکن بعض دفعہ اپنی آنکھ کا شہتیر خود کو دکھائی نہیں دیتا۔ اس لئے میں نے مناسب خیال کیا کہ تمہیں اس سے آگاہ کر دوں ......"

رشید کچھ اس طرح حواس باختہ نظر آ رہا تھا کہ چچا کو کہنا پڑا۔ "کیا تم ابھی تک نہیں سمجھے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ میری مراد یقیناً رحیمن والے قصے ہی سے ہے ......"

رشید کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ حیران تھا کہ اس کے کان کیا سُن رہے ہیں۔

"تمہاری چوتھی شادی ہوئے وہی چار دن گذرے ہیں۔ اور تم اس معاملے میں کچھ اول ہی سے بدنام ہو پھر تمہیں اس قسم کی فضول حرکت کی کل شام جرأت کیسے ہوئی۔ اگر یہ خبر تمہاری سسرال تک پہنچ جائے تو خیال کرو تمہارا کیا حشر ہوگا ...."

رشید کی حالت یہ تھی کہ کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں۔ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ گویا خشک ہزاروں مکھیاں اس کے جسم سے چمٹی ہوئی ہیں اور اپنی زہریلے ڈنکوں سے بدن چھلنی کر رہی ہیں اس کے منہ سے ایک حرف بھی نہ نکلا اور بغیر کچھ کہے سنے چپکے سے کھسک گیا۔

(۵)

پرنسپل صاحب گھومتے ہوئے اس کلاس کی طرف آ نکلے جہاں رشید لیکچر دے رہا تھا۔ رشید کو دیکھ کر وہ مُڑے۔ اشارے سے بلایا اور کہا۔

"پروفیسر رشید کیا میں آپ سے کچھ کہہ سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں!"

"مگر وہ خانگی معاملہ ہے اور مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ برا نہ مانیں!"

"کیا مجال" کہنے کو تو کہہ دیا رشید نے مگر دل دھڑکنے لگا کہ یا الٰہی وہ کونسا خانگی معاملہ ہے جس کا پرنسپل صاحب ذکر کرنے والے ہیں کہیں..... وہ....

"میں پرنسپل کی حیثیت سے نہیں" پرنسپل صاحب نے آہستہ سے کان میں کہنا شروع کیا "بلکہ ایک دوست کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ —— کہ آپ —— کہ آپ (بہت دھیمی آواز سے) ہمارا رحیمن سے علانیہ تعلق نہ کریں۔ یوں تو ہر شخص غلطی کرتا ہے لیکن تعجب ہے کہ آپ جیسا تجربہ کار شخص اس طرح کھلے بندوں اپنے تعلقات کا اظہار کرے۔ پہلی، دوسری، تیسری نہیں چوتھی شادی ہے آپ کی اور ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے۔ خدانخواستہ اگر خبر ہو جائے آپ کی ننھی نویلی دلہن کو آپ کے گل کھلنے کی تو بڑا غضب ہو جائے۔ اور نہ جانے کیا.........."

رشید میں اب اس کے آگے سننے کی تاب نہ رہی۔ بے تحاشا ڈائس سے اتر کر کالج سے نکل گیا اور گھر کا رخ کیا۔

رستے میں در و دیوار اسی کی طرف ٹکٹکی لگائے گھور رہے تھے اور ہر آواز رحیمن والا قصہ کہہ رہی تھی۔ اس کے حواس سلب ہونے لگے۔ اس نے اپنی چال تیز کر دی۔ پاؤں کی چاپ میں وہ لعن طعن سن رہا تھا۔ سڑک چھوڑ کر گلی کوچوں میں گھس پڑا اور دیوانہ وار دوڑنے لگا۔ شریر لڑکوں نے تماشا بنایا۔ قہقہوں کے نعرے لگاتے وہ پیچھے پیچھے دوڑنے لگے ——

(۶)

گھر پہنچ کر رشید نے بیوی سے کہا کہ رحیمن کا حساب چکا دو۔

بیوی کے ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسم کھیل رہا تھا۔

رشید سوچنے لگا کہ یہ تبسم طنز آمیز ہے یا مسرت کا۔

رحیمن تنخواہ لے میاں کو آخری سلام کر چلتی بنی۔ رشید کا دل [illegible] کھانا [illegible] دسترخوان بچھا تو رشید اسی ادھیڑبن میں [illegible]

[illegible]

[illegible]

بھی تو سنئے کہ اس کے لئے کس مکان دیکھ آئے کون سا محل چن لیا۔ اچھا کیا ہوتے ایسے مکان میں رکھنے کا انتظام کر دیا۔ جیسا کہ ظلم کرتی تھا اس بیچاری کو یہاں ....

رشید نے جو یہ سنا تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے دل میں کہا "ایک نشہ عجیب ہے ہم نے تو سمجھا کہ اس بینڈک کو گھر سے نکال دیا کہ غلط فہمی رفع ہو گئی مگر یہاں تو کچھ اور ہی گل کھلا۔ لاحول ولا" دسترخوان سے اٹھا اور سیدھا سعید کے گھر پہنچا۔

(۷)

"جھوٹی تہمت لگانے والے" رشید گرجنے لگا۔ اس کا چہرہ غصے سے تمتا رہا تھا اور سرخ انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ "ساری دنیا میں مجھے بدنام کر کے تجھے کیا ملا۔ کس قدر بے دلیری سے تو نے کام لیا۔ خواہ مخواہ میری آبرو پر پانی پھیر۔ نامعقول کہیں کا۔ کمینہ۔ پاجی!——"

"جھوٹی تہمت لگانے والا۔ کمینہ پاجی..... ہیں! میں کیا سن رہا ہوں۔ تمہارا اس سے کیا مطلب ہے۔ آخر تم کس غلط فہمی میں مبتلا ہو؟" سعید نے تعجب سے کہا۔

"بس بس چنگاری ڈال جلا دو۔ جلا کر مٹی ہو گئی۔ کیسے معصوم بنتے ہیں۔ گویا کہ آپ نے رحیمن والا قصہ مشہور ہی نہیں کیا۔ منہ در منہ کرتے ہو دل گردہ تو دیکھو آپ کا۔"

سعید کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جلد جلد جھپکنے لگیں۔ اس کے چہرے کی شگفتگی رخصت ہو گئی۔ خلاف عادت کسی قدر بلند آواز میں کہنا شروع کیا "اگر میں نے ایک حرف بھی اس واقعے کے متعلق اپنی زبان سے نکالا ہو۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں ——"

سعید کے الفاظ میں معصومیت کی جھلک تھی —— القصہ کہ رشید بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کو یقین ہو گیا کہ سعید نے اسے بدنام نہیں کیا۔

"لیکن پھر کون ہو سکتا ہے" رشید نے دل میں کہا "رحیم، وحید، نذیر...... کون؟"

سید بادشاہ حسین

رحیم آباد دکن

تاثرات

زمانے میں آرام و راحت کہاں ہے
یہاں آسماں ہے وہاں آسماں ہے

میں قائل ہوں دیر و حرم کا بھی لیکن
ترا آستاں پھر ترا آستاں ہے

محبت کے رہرو کو تنہا نہ سمجھو
طلب راہبر ہے، جنوں پاسباں ہے

زمانے کی سب راحتیں ہیں مسلّم
غموں سے مگر مجھ کو فرصت کہاں ہے

قفس سے ہی اب ہمنشیں دل لگا لے
یہی گلستاں ہے، یہی آشیاں ہے

گناہوں سے مجھ کو ڈراتا ہے زاہد!
ابھی تو مری ہر تمنا جواں ہے

میں اُس طبعِ نازک پہ شیدا ہوں ماہر
کہ حرفِ تمنا بھی جس پر گراں ہے

ماہر القادری

---

(۲)

سمجھتا ہوں میں سب کچھ، صرف سمجھانا نہیں آتا
تڑپتا ہوں مگر اوروں کو تڑپانا نہیں آتا

مرے اشعار مثلِ آئینہ شفاف ہوتے ہیں
مجھے مفہوم کو لفظوں میں اُلجھانا نہیں آتا

میں اپنی مشکلوں کو دعوتِ پیکار دیتا ہوں
مجھے یوں عاجزی کے ساتھ غم کھانا نہیں آتا

میں ناکامِ مسرت ہوں مگر ہنستا ہی رہتا ہوں
کروں کیا مجھ کو قبل از موت مرجانا نہیں آتا

یہ میری زیست خود اک مستقل طوفان ہے اختر
مجھے ان غم کے طوفانوں سے گھبرانا نہیں آتا

خط

"کیا ننھی فردوسا اندر ہے؟"

بڑھی مارگریزی دروازے پر دستک دے کر سُرخ پتھر کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ قسمت نے اُسے ایسی ہی سیڑھیوں پر بیٹھنے کے لئے پیدا کیا تھا۔ صرف اسی مکان پر نہیں بلکہ کئی مکانوں کے سامنے سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے اسے کبھی صبح سے شام اور کبھی شام سے سویرا ہو جاتا تھا۔ ان سیڑھیوں پر بیٹھ کر یا تو وہ سو جایا کرتی تھی یا خاموش آنسوؤں کا تار اس کی آنکھوں سے بندھا رہتا تھا۔ جب کبھی کوئی راہگیر ایک پیسہ یا روٹی کا ٹکڑا اس کی جھولی میں ڈالتا تو اسے ایسا معلوم ہوتا کہ اس کی آنکھیں دریا اُنڈیل کر باہر پھینک رہی ہیں جو عنقریب دُنیا کو بہا کر لے جائے گا۔

موٹا کھدر کا لباس جس کے پیوند بھی پھٹ چکے تھے وہ صبح شام، جاگتے سوتے، سردی گرمی پہنے رہتی تھی۔ چلتے وقت لڑکھڑاتی تھی، زیادہ تھک جاتی تھی تو کسی مکان کی بیرونی سیڑھی پر بیٹھ جاتی تھی۔ غالباً کثرتِ گریہ کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں ایک دہشت ناک چمک ہر وقت نمایاں رہتی تھی۔ جھُریوں والا چہرہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کسی دھوبی نے کپڑا نچوڑ کر پھینک دیا ہو اور اُس میں دو آنکھوں کی چمک ——— زمانۂ فراموش کا عہد ——— مجسم۔

سوکھے اور اُلجھے ہوئے بالوں کی دو بے ترتیب لٹیں کانوں پر پڑی ہوئی ہوتیں جن میں بڑے بڑے وزنی بالے لٹک رہے ہوتے۔

ڈیوڑھی میں بیٹھی ہوئی عورتوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ ان عورتوں کا تقریباً سارا دن وہیں بیٹھے ادھر اُدھر کی باتوں میں گزرتا تھا۔ ان میں سے کچھ چرخے لے کر بیٹھ جاتیں اور کچھ سُوت کاتتیں۔ گلیوں میں ننگے دھڑنگے بچے جن کے بدن دُھوپ سے سیاہ ہو گئے تھے کھیل رہے تھے۔ اِدھر اُدھر مرغیاں غلاظت کُرید رہی تھیں۔

اُس دن عورتیں اُن لوگوں کے متعلق باتیں کر رہی تھیں جو کل ترکِ وطن کر کے جنوبی امریکہ کی طرف جا رہے تھے۔

ایک بولی "سنا ہے سکو ما بھی جا رہا ہے اس کے پیچھے تو بیوی اور تین ننھے بچے ہیں!"

دوسری بولی "ہاں! ذرا سکو رنڈا کی طرف دیکھو، پانچ بچے اور حاملہ بیوی چھوڑ چلا ہے۔"

تیسری نے گلا پھُلا کر کہا "اری بہن! کیا یہ سچ ہے کہ رونکا اپنے بارہ برس کے لونڈے کو بھی ساتھ لے جا رہا ہے۔ اوئی توبہ! یہ مرد بھی عجیب قسم کے ہیں اس لونڈے کو تو اپنی ماں کے پاس چھوڑ جاتا۔ اس بیچاری کا کیا حال ہوگا۔"

چوتھی نے ساتویں درانتے سے چیخ چیخ کر دانت دکھاتے ہوئے کہا "رات تم نے سُنا! لگارسی کے گھر میں تو کہرام مچا ہوا تھا۔ ان کا لڑکا ناسو جو ابھی ابھی کالج سے آیا ہے ہجرت کرنے کی ٹھان چکا ہے ——— آہ! کس قدر خوبصورت اور نوجوان لڑکا ہے!"

بوڑھی مارگریزی یہ تمام باتیں سامنے بیٹھی سنتی رہی لیکن آخری خبر سے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہ نکلا۔

آج چودہ برس ہو گئے کہ اس کے دو بیٹے اسی طرح امریکہ کی طرف گئے اور واپس آنے کا وعدہ کر گئے لیکن نہ آئے۔ اتنی دولت کمائی کہ اس کے نشے میں اپنی ماں کو بھی بھول گئے۔ ماں کو کیسے قرار آئے۔ بیچاری کے پاس یہی دولت تھی وہ اغیار کے ہاتھوں چڑھ گئی۔ ان کے فراق میں اپنا متاعِ ہوش و حواس کھو بیٹھی ہے۔ ہر سال جب نیا قافلہ امریکہ کو جاتا ہے تو وہ ننھی فردوسا سے خط لکھواتی ہے اور کسی نوجوان کی منت سماجت کرتی ہے کہ یہ خط اس کے بیٹوں تک پہنچا دے اور بعد میں سب رونے والی عورتوں کے ساتھ مل کر وہ قافلے کو خیرباد کہتی ہے۔

اس دفعہ بھی قافلہ روانہ ہونے والا تھا اور وہ خط لکھوانے کے لئے ننھی فردوسا کے گھر تک آئی تھی۔ ایک نوجوان جو کل روانہ ہونے والا تھا پاس سے گزرا تو بڑھیا نہایت بھوکی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بولا

"کیوں ری بڑھی! میری طرف اس طرح کیوں دیکھ رہی ہے؛ کیا میری آنکھیں نکال کے کھا جائے گی؟"

"نہیں بیٹا! میں تمہاری آنکھوں پر رشک کر رہی ہوں کہ یہ میرے بیٹوں کو دیکھیں گی۔ اگر تم اُن سے ملو تو اتنا کہہ دینا کہ اب تمہاری ماں میں جُدائی کی تاب نہیں ہے۔ وہ آٹھوں پہر روتی رہتی ہے.... یہی حال ہے تو تم اس کو چند دنوں تک زندہ نہ پاؤ گے!"

نوجوان سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ اسی اثنا میں ننھی فروسا نے دروازہ کھولا تو ایسا معلوم ہوا کہ تاریک اور گھناؤنی گلی میں آفتاب طلوع ہوگیا۔ وہ بے حد حسین تھی۔ چہرے کا ہر ایک نقش علیحدہ علیحدہ کرن کی طرح چمک رہا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور سُرخ ہونٹ عجیب رعنائی پیدا کر رہے تھے۔ لمبے سیاہ بال گردن سے ہوکر کمر تک پہنچ گئے تھے۔ سینے پر زرد رنگ کا رومال لٹک رہا تھا۔

شادی کے دو سال بعد وہ بیوہ ہوگئی تھی۔ اس نے دوسرا بیاہ کیا تھا۔ لیکن پانچ سال ہوئے اس کا دُوسرا خاوند اس کو چھوڑ کر امریکہ چلا گیا تھا۔

اس نے باہر نکلتے ہی کہا۔

"اخا! یہاں تو چچا جاگر بڑے زور شور سے تقریر کر رہے ہیں!"

اس نے بوڑھے جاگر کو جو گلی کی نکڑ میں کھڑا ہجرت کرنے والوں کے خلاف سرگرم تقریر تھا کہا۔ "چچا جاگر! کیوں یونہی مفت میں اپنا دماغ کھپا رہے ہو! یہ بھاگا بھاگ تو یونہی لگی رہے گی۔ تم گھبراتے کیوں ہو؟ —— ہم عورتیں زمینوں میں ہل چلا لیں گی ——" اس کے بعد فروسا بلند قہقہہ کے ساتھ ہنس پڑی۔

بوڑھا بھی طنزیہ لہجے میں ہنس پڑا۔ پھر کہنے لگا۔

"تم عورتیں —— ! تم تو صرف رونا ہی جانتی ہو اور بس"

"کیوں چچا! تم نے مجھے بھی کبھی روتے ہوئے دیکھا!"

"تمہیں تو اپنے پہلے خاوند کی موت پر بھی رونا نہ آیا تھا!" یہ طنز بھی گھونسا نوجوان عورت کے دل پر پڑا لیکن اس نے فوراً سنبھل کر کہا۔

"میرے بڈھے چچا! کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو! اگر میں اپنے شوہر سے پہلے مرجاتی تو کیا وہ دوسری شادی نہ کرتا! —— آخر ہم عورتوں نے کیا قصور کیا ہے —— ! جو بات مرد کرتے ہیں خواہ وہ کتنی ہی معیوب ہو اسے مُستحسن تصور کیا جاتا ہے اور اگر عورت ذات اسی فعل کو کرے تو اسے انتہائی قابل مذمت خیال کیا جاتا ہے۔ ذرا اس بڑھیا کی طرف دیکھو! رونے کے لئے یہی کافی ہے!"

"اونہہ! بڑھیا کو تو رونے کا عارضہ لاحق ہوگیا ہے۔" اس پر گلی کی سب عورتیں ہنس پڑیں۔

بڑھیا کا چہرہ غصہ سے تمتما اُٹھا۔

"میرے دو چاند سے نوجوان بیٹے ہاتھ سے چھن گئے اور تم کہتے ہو کہ نہ روؤں ..... کیا اب بھی نہ روؤں!"

بڑھیا کی آواز بھرا چکی تھی۔

ننھی فروسا نے کہا۔

"جی ہاں! بڑے خوبصورت تھے ..... بالکل چاند سے ... ... خود تو وہاں سونا اُچھال رہے ہیں اور تمہیں یہاں دردر کی گدائی کے لئے چھوڑ دیا ہے ..... ایسی اولاد کے لئے کیا رونا!"

"بیٹی! ماں کا دل نہایت رقیق ہوتا ہے۔ ماتا جی بھلا ایسا لین دین کا معاملہ بھلا ماں بیٹوں میں کیسے ہوسکتا ہے!"

"تو ہم اس کا کیا علاج کریں! لوگ تو کہتے ہیں کہ تمہارا سلوک ہی بُرا تھا اسی لئے وہ گھر کو لات مار کر نکل گئے۔"

بوڑھی کی آنکھوں کے سُرخ ڈورے باہر نکل آئے۔ اس نے جھلا کر کہا۔

"کس کا! ..... میرا ..... میں جو اُن کی ماں ہوں ..... کون موذی کہتا ہے!"

پاس ہی سے ایک عورت نے کہا۔

"دادی اماں! تم کیوں روتی ہو! ننھی تو تم سے مذاق کر رہی ہے"

اس پر فروسا کھلکھلا کر ہنس پڑی اور پھر نہایت ملاطفت سے بڑھیا کی طرف متوجہ ہوئی۔

"ہاں دادی اماں! تمہیں کیا چاہئے!"

بڑھیا نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور ایک شکن خوردہ کاغذ اور لفافہ نکالا اور پھر فروسا کی طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھا۔

"بیٹی! اگر حسب معمول تم مجھ پر عنایت کرو تو ——"

"کیا! اور خط لکھواؤ گی!"

"ہاں بیٹی! تم نہایت نیک لڑکی ——"

فروسا کو معلوم تھا کہ اب اس سے چھٹکارا مشکل ہے۔

"بڑھیا! تم نے مجھے بڑی طرح ستا رکھا ہے اچھا! اندر آجاؤ!"

ننھی قلم دوات لے کر بیٹھ گئی

"اب جلدی کرو۔ لکھواؤ!"

بڑھیا نے کھانس کر لکھوانا شروع کیا۔

"پیارے بیٹو! اب میرے پاس رونے کے لئے آنکھیں نہیں ہیں ۔۔۔۔۔۔

اس کے بعد اس نے ٹھنڈا سانس لیا۔ فردوسا نے بھی ایک مصنوعی آہ بھری۔

"۔۔۔ کیونکہ میری آنکھوں میں تم کو ایک بار اور صرف ایک بار دیکھنے کے لئے آگ بھڑک رہی ہے"

"اب جلدی جلدی لکھواتی جاؤ نا۔ شاید یہ بات تم تین دفعہ لکھ ۔۔۔"

"بیٹی! اس میں کونسا عیب ہے جو اب بھی لکھ دوں ۔۔۔ تو ۔۔۔ پیارے بیٹو! ۔۔۔"

"کیا پھر نئے سرے سے شروع ہوگئی ہو؟"

"نہیں بیٹی! اب نئی بات لکھوانے لگی ہوں نا۔ ہاں ۔۔۔ پیارے بیٹو! تمہاری ماں وعدہ کرتی ہے اور قسم کھاتی ہے کہ اگر تم یہاں واپس آ جاؤ تو وہ اپنا مکان تمہیں دے دے گی"

اس پر ننھی بے اختیار ہنس پڑی۔

"اری پگلی! وہ تمہاری گھاس پھوس کی کٹیا کو کیا کریں گے جبکہ وہ خود محلوں میں عیش کر رہے ہیں"

"بیٹی! جس طرح میں کہتی ہوں تم اُسی طرح لکھتی جاؤ۔ تمہیں معلوم نہیں اپنے وطن کی کٹیا باہر کے سونے کے محلوں سے بھی زیادہ قیمتی ہوتی ہے"

"اچھا! تو میں نے وہ بھی لکھ دیا۔ اور کیا لکھنا ہے؟"

"بس یہی 'پیارے بیٹو! اب سردی کڑاکے کی شروع ہوگی میرے پاس کوئی گرم کپڑا نہیں ہے۔ تمہاری بوڑھی غریب ماں رات کو ٹھٹھر جاتی ہے۔ اس کے لئے صرف پانچ روپے بھیج دو تاکہ وہ کمبل خرید لے'"

"بس اتنا ہی کافی ہے" یہ کہہ کر ننھی نے لفافہ بند کر دیا۔

"بیٹی! سب کچھ لکھ دیا؟ کٹیا ۔۔۔ پانچ روپے ۔۔۔ کمبل ۔۔۔؟" بڑھیا نے حیرت سے پوچھا کیونکہ فردوسا نے نہایت جلدی کے ساتھ لفافہ بند کیا تھا۔

"ہاں! ہاں!! میں نے سب لکھ دیا ہے"

"اچھی طرح لکھ دیا ہے؟"

"ہاں! ہاں!!" یہ فردوسا نے ماتھے پر بل لا کر کہا۔

"بیٹی! مجھ غریب پر اتنی ناراض نہ ہو۔ میں بے کس بھلا تمہیں اس کا کیا صلہ دے سکتی ہوں۔ خدا تمہیں اس کا اجر دے گا"

اس نے لفافے کو سینے کے ساتھ لگا لیا اور کسی شخص کی تلاش میں چل نکلی۔ جو اس خط کو اس کے بیٹوں تک پہنچا دے۔

(اخذ و ترجمہ)

خلیل بی اے

غزل

جبیں کو کون زمیں پر گھسا نہیں سکتا — مگر جو اُس نے لکھا ہے مٹا نہیں سکتا

نہ پوچھ دردِ محبت کی لذتیں زاہد — یہ لطف وہ ہے کہ تُو جس کو پا نہیں سکتا

مَیں لاکھ بار بُھلا دوں تری محبت کو
ترے خیال کو لیکن بُھلا نہیں سکتا

حیات اللہ شہید

غزل

غم سے گر آزاد کرو گے — اور مجھے ناشاد کرو گے

تم سے اور اُمید وفا کی؟ — تم اور مجھ کو یاد کرو گے؟

ویراں ہے آغوشِ محبت — کب اس کو آباد کرو گے؟

عہدِ وفا کو بھولنے والو — تم کیا مجھ کو یاد کرو گے

آخر وہ ناشاد رہے گا — تم جس دل کو شاد کرو گے

میری وفائیں، اپنی جفائیں — یاد آئیں گی یاد کرو گے

میری طرح سے تم بھی اِک دن — ق — تڑپو گے، فریاد کرو گے

ختم ہوئے انداز جفا کے — اور ابھی برباد کرو گے

کون پھر اُس کو شاد کرے گا — جس کو تم ناشاد کرو گے

رہنے بھی دو عذرِ جفا کو — اور ستم ایجاد کرو گے

دادِ وفا سمجھیں گے اسکو — ہم پر جو بیداد کرو گے

دیکھو! ہم کو بھول نہ جانا — بھولو گے تو یاد کرو گے

لے کر نام حفیظ کسی کا
کب تک یوں فریاد کرو گے

حفیظ ہوشیارپوری

اُن بن

کس بدھ بیتے گی اُن بن کالی رات؟

بجلی پل پل چھن چھن تڑپے
بادل کڑ کڑ کڑ کڑ کڑکے
پانی رم جھم رم جھم برسے

آئی جوبن پر برسات

کس بدھ بیتے گی، اُن بن کالی رات؟

میں بھرتی ہوں ٹھنڈی آہیں
میں تکتی ہوں اُن کی راہیں
وہ اور مجھ پاپن کو چاہیں؟

یہ تو ہے انہونی بات

کس بدھ بیتے گی، اُن بن کالی رات؟

کیا جانے کیا گذرے مجھ پر؟
جی گھبراتا ہے رہ رہ کر
ایسا سونا ہے اُن بن گھر

جیسے کوئی رُکھ بن پات

کس بدھ بیتے گی، اُن بن کالی رات؟

امرچند قیس جالندھری

ہماری جُرأت کا امتحان

میں ایک ایسی عورت کو جانتا ہوں جس کو اپنی زندگی میں بہت سے آلام برداشت کرنے پڑے ۔ اس کا اکلوتا بیٹا جنگِ عظیم میں کام آیا اور اُس کی ماں اور خاوند وبائے نمونیا کا شکار ہو گئے۔ ان مصائب سے اس کا دِل ٹوٹ گیا۔ اور وہ محسوس کرنے لگی کہ اب اس کی زندگی کسی کام کی نہیں ۔ اس نے اپنے دِل سے غم و الم کے تاریک بادل نہ ہٹائے ، بلکہ آج تک ستمہائے روزگار پر نوحہ کناں ہے۔ اور کسے معلوم ہے کہ یہ دِل شکستہ خاتون کب تک فغان و نزاری میں مصروف رہے گی ؟

اب غور کیجیے ۔ جب دنیا میں اس قسم کے آدمی موجود ہیں جو مصائب سے بہت تنگ ہیں ۔ اور جنہیں ہماری اعانت اور ہمدردی کی اشد ضرورت ہے تو پھر یہ کس قدر شرم کا مقام ہے کہ ہم خود ہی شکارِ یاس ہو جائیں اور مشکلات کے مقابلہ میں ہتھیار ڈال دیں ۔ اس لئے میرے دوست ! کہ ہماری عزیز ترین امیدوں کا خون ہو گیا ؟ اور حالات نے ہمارا ساتھ نہیں دیا ؟ لیکن ہمارا یہ عذر قابلِ تسلیم نہیں ۔ ہم اپنی خواہشات سے کیوں دستکش ہوں ۔ کیوں نہ ہم استقلال سے کام کرتے جائیں ۔ اور تحمل سے نتیجے کے منتظر رہیں ۔ ہماری مشکلات اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہم نے پوری محنت سے کام نہیں کیا ۔ ہم دنیا میں اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ اچھے کام سرانجام دیتے رہیں ۔ اور اگر ہم نے مشکلات سے ڈر کر اپنا کام ادھورا چھوڑ دیا یا نیکی اور صداقت کی جنگ لڑنے میں حصہ نہ لیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے اپنا فرض ادا نہیں کیا ۔

تھوڑا عرصہ ہوا ۔ میں ایک ایسی عورت کا حال پڑھ رہا تھا جس کے بچے اور دیگر لواحقین نہنگ اجل کا لقمہ بن گئے تھے ایک مدت تک وہ اپنی موت کی دعائیں مانگتی رہی ۔ لیکن آخر کار ایک یتیمانہ سی خوبصورت بچی نے جس کو مادرانہ شفقت کی ضرورت تھی اس کی طبیعت کو جذب کر لیا ۔ دِل شکستہ عورت اس بچی سے محبت کرتی اور اس کی خدمت کو مقدس فرض سمجھتی ۔ کہتے ہیں گذشتہ بیس برس میں اس نے دو سو سے زیادہ ایسی لڑکیوں کو یتیمی کی مصیبتوں سے بچا کر مستقبل کی تربیت یافتہ مائیں بنایا ۔

قدرت ہم پر مہربان ہے ۔ وہ لاثانی حکیم ہے ۔ جو ہمارے زخموں پر مرہم کا پھاہا رکھتی ہے ۔ اور ہماری روحانی بیماریوں کو عجیب طریقے سے دُور کر دیتی ہے ۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ زندگی ہمارے لئے ناقابلِ برداشت "دکھ" ہوتی ۔ کیونکہ یہاں بہت تھوڑے ایسے آدمی ہیں جو اپنے آپ کو رنج و غم کی تباہ کاریوں سے بچا سکتے ہیں ۔

دنیا میں اب بھی ایسے آدمی موجود ہیں ۔ جنہوں نے رہت رہی کے باوجود بہت نقصان اٹھایا ۔ لیکن پیس بجبیں نہ ہوئے ، کیوں کہ وہ شکست ناآشنا ہیں اور ناکامیوں کو کامیابی کا زینہ سمجھتے ہیں ۔ کسی آدمی کی قابلیت کا جوہر اُسی وقت کھلتا ہے جب حالات ناموافق ہوں مگر وہ نہ گھبرائے ۔ جب رستہ تاریک ہو مگر وہ منزلِ مقصود کو نہ بھولے اور جب دوست اسے کہیں کہ تم بیوقوف ہو جو قسمت کے برخلاف نبرد آزما ہوتے ہو مگر وہ ان کی اس نصیحت کی پروا نہ کرے ۔

اس بات کی پروا نہ کرو کہ راہ پُرخار ہے یا بوجھ زیادہ ہے ، ثابت قدم رہو اور بوجھ نیچے نہ پھینکو ، اور اس وقت کا انتظار کرو جب مصیبت کے یہ تاریک بادل دُور ہو جائیں گے ۔ پھر تم منزلِ مقصود پر پہنچ جاؤ گے ۔

"آخری فیصلہ" رہینِ منت ہے ۔ تمہاری جرأت قابلیت اور قوتِ انتخاب کا ۔ جب تک دنیا تمہیں تاریک نظر آتی رہے گی تمہیں کامیابی کا قلعہ ناقابلِ تسخیر معلوم ہوتا رہے گا ، جب تک تم اپنے مستقبل کے نصب العین قایم نہ کر لو گے اس وقت تک تم اپنی بہتری کیلئے آگے نہ بڑھ سکو گے کیونکہ بزدلی کامیابی کی دشمن ہے ۔

میں ایسے آدمیوں کو جانتا ہوں جنہوں نے روپیہ حاصل کرنے کے لئے اپنا گھر اور سارا اثاثہ فروخت کر دیا - ان کو وہم تھا - کہ بغیر اس کے وہ اپنے کاروبار میں نقصان اٹھائیں گے - ان کی اس بے وجہ گھبراہٹ ہی نے ان کو محروم کامیابی رکھا۔

پروا نہ کرو کہ تمہاری موجودہ حالت کس قدر ناتسلی بخش ہے - اور تمہارا مستقبل بظاہر کس قدر تاریک - اپنے مرکز سے نگاہ نہ ہٹاؤ - اپنے ارادہ پر قائم رہو ہر وقت اپنے مقصد کو سامنے رکھو - اپنی کامیابی کا یقین کرو - اپنے آپ کو وہ آدمی سمجھو جو بننا چاہتے ہو - نگاہوں میں انفعال نہ پیدا ہونے دو - عدم اعتماد کو دل میں داخل نہ ہونے دو اور پوری قوت سے آگے بڑھو - یہی ہے صحیح راستہ جو تمہیں کامیابی کے مندر میں لے جائے گا، اور یہی ہے وہ مرہم جس سے تمہارے زخموں کا اندمال ہوگا۔

جو آدمی بلند نظر نہیں ہے، جو اپنی بیقراری اور ناامیدی پر قابو نہیں پا سکتا، وہ زندگی کی برکتوں سے محروم رہتا ہے - تم کو چاہیئے کہ جب تمہیں زندگی کی سختیوں کا مقابلہ کرنا پڑے تو اُن کو اپنے مقصد کے مطابق بنا لو - جس طرح سیپی اپنے خول میں پڑی ہوئی ریت کو جب باہر نہیں نکال سکتی تو موتی بنا دیتی ہے۔

ایک اپاہج عورت لکھتی ہے "میرے پاس دنیا کو دینے کے لئے سوائے میرے حالات کے اور کوئی شئے نہیں تھی - اس لئے میں نے تہیہ کر لیا کہ میں اپنا دکھڑا رو کر کسی کو غمگین نہ کروں گی - مجھے اپنی مصیبت پر رونا آتا تھا، مگر میں مسکراتی تھی - میں اپنی بدقسمتی پر بھی خندہ زن رہتی تھی - میرا مدعا یہ تھا کہ مجھ سے ہر آدمی مسکراہٹ اور پاکیزہ خیالات لے کر جاتے - اب میں نہ صرف دوسروں کو خوش کرتی ہوں بلکہ خود بھی شراب مسرت سے مخمور رہتی ہوں" اور یہ اُس عورت کی حالت ہے جو برسوں سے اپنے گھر سے باہر نہیں [illegible] ہر وقت بستر پر پڑی رہتی ہے اور کمرے کی کھڑکیوں سے صرف درختوں کی چوٹیاں دیکھ سکتی ہے - بزدل اور مایوس لوگ اس کے پاس آتے ہیں - اور جرأت اور امید کی دولت لے جاتے ہیں - اس کے تمام بدن میں جگہ جگہ درد ہوتا ہے - مگر اس کی آنکھیں پھر بھی مسکراتی ہیں

کیا کوئی آدمی اس عورت کو جو اپنے احباب کو خوشی اور امید کا تحفہ دیتی ہے اس لئے مفلس اور ناکام کہہ سکتا ہے - کہ وہ برسوں سے اپنے کمرے میں مقید ہے؟ نہیں حقیقت میں وہ کامران ہے - اس کے پاس لازوال دولت ہے، وہ دولت جو غم ناامیدی اور دکھ کو دُور کرتی ہے، جو کبھی چرائی یا کھوئی نہیں جا سکتی، جو سورج کی روشنی کی طرح سب کو فیض پہنچاتی ہے۔

سچ ہے وہ دل جو سچائی کی دولت کا مخزن ہے - وہ خود غرضی کم بینی اور جسمانی عوارض پر فتح پاتا ہے - اپنے اندر جھانکو بزدلی اور بیماری کے خیالات کو باہر نکال پھینکو - تم ان پر فتح حاصل کرو - خدا کی کائنات کو دیکھو - اور Henley کے ہمنوا ہو کر یہ گیت گاؤ -

"شب کی تاریکی نے ایک عالم کو محیط کر رکھا ہے
لیکن مجھے کیا
جب کہ میری روح غیر مفتوح ہے"

تم خواہ کسی حالت میں ہو - جرأت کو نہ چھوڑو مستقل مزاجی اور خندہ روئی سے کام سرانجام دیتے رہو اور خداوند کی عنایات پر بھروسا رکھو - یہ ہمارا فرض ہے اور یہی ہماری پیدائش کی غرض ہے۔

(ماخوذ)

میر زمان خاں

خاتون - دیکھو میاں ڈرائیور، میں چاہتی ہوں کہ تم گاڑی نہایت احتیاط سے چلاؤ - جب تم کسی چوک پر پہنچو تو اس وقت تک ٹھیرے رہو جب تک پولیس والا تمہیں چلنے کے لئے نہ کہے، اور اگر سڑک بہت پھسلنی ہو رہی ہو تو نہایت آہستہ چلاؤ۔

ڈرائیور - بہت اچھا بیگم صاحبہ - لیکن بیگم صاحبہ اگر حادثہ پیش آجائے تو آپ کو کون سے ہسپتال میں پہنچایا جائے؟

دو آتشہ

(درد)

آں جلوہ بدیدہ ، یار خواہد گردید
رازش ہمہ آشکار خواہد گردید
ما آئینہ ایم و خود پرست است نگار
ناچار بما دوچار خواہد گردید

(ہاتف)

ہاتف! تو کہ جسمِ ناتوانے داری
چوں شمع ، بلب رسیدہ جانے داری
از داغِ غمِ یار چہ آمد بہ سرت
تقریر بکن! تو ہم زبانے داری

(قاآنی)

دوشینہ نہادم بر ہش مست و خراب
از نشۂ عشقِ او نہ از بادۂ ناب
دانست کہ عاشقم، ولے می پرسید
ایں کیست ؟ کجائیست ؟ چرا خوردہ شراب؟

(غالب)

اوراقِ زمانہ در نوشتیم و گذشت
در فنِ سخن یگانہ گشتیم و گذشت
مے بود دوائے ما بہ پیری غالب
ناں [illegible]ام گذشتیم و گذشت

(۱)

مجھ سے یہ اجتناب، نہ آئے گا اُس کو راس
ہوگا نظر نواز، وہ حسنِ نظر شناس
میں آئینہ ہوں، دوست ہے خود بین و خود پرست
وہ آپ چل کے آئے گا ناچار میرے پاس

(۲)

دل کو ٹٹول! تجزیۂ واردات کر
اے دوست! شرحِ سوز و گدازِ حیات کر
گزری ہے تیرے قلب پہ کیا فیضِ عشق سے؟
تیرے دہن میں بھی ہے زباں، تو بھی بات کر

(۳)

کل اُس کی راہ میں مَیں پڑا تھا خراب حال
لاریب اُس کے عشق کا نشہ تھا بے حساب
پہچانتا تھا خوب، مگر پوچھنے لگا!!!
آیا کہاں سے؟ کون ہے؟ کیوں اس نے پی شراب؟

(۴)

احوالِ دہر خوب لکھے اور گذر گئی!
یکتائے فنِ شعر ہوئے اور گذر گئی!
مے تھی کفیلِ زیست بڑھاپے میں اے ندیم!
اُس سے بھی نامراد رہے اور گذر گئی!

عدم

اقرارِ گناہ

Edward Varal Lucas کو جدید Lamb کہا جاتا ہے۔ اس کی قوتِ مشاہدہ نہایت اچھی ہے اور جو مسرت اسے اس سے حاصل ہوتی ہے اسے دوسروں تک پہنچانے میں وہ سب سے زیادہ خوشی محسوس کرتا ہے۔

میں اپنے دل میں یہ راز لئے مرنا پسند نہیں کرتا ... میں سب کہانی سنانا چاہتا ہوں اور پھر چین سے مرنے کا متمنی ہوں ... خیر اب میں اس کی ابتدا کرتا ہوں۔

میں اپنے خوشنما مکان میں اکلوتا کتا تھا۔ میری مالکہ ایک حسین عورت تھی اور اس کے لباس میں لانبے لانبے دامن ہوتے تھے جن پر مجھے لیٹنے کی اجازت تھی۔ میرا آقا ایک خوبصورت آدمی تھا اور ٹہلنے کا شائق، وہ دونوں کو دوست تھے اور کھانے پر چھوٹی چھوٹی ہڈیوں اور بسکٹوں سے میری تواضع کیا کرتے تھے اور آگ کے قریب لیٹنے سے منع نہ کرتے تھے جہاں میں سب سے زیادہ رہنا پسند کرتا تھا۔ حقیقت میں سب سے اچھی جگہ مکان کی بالائی منزل تھی، لیکن نیچے کی جگہ بھی اچھی تھی کیونکہ لڑکیاں مجھے ستاتی نہ تھیں۔

اور وہاں ایک ملازم تھا [illegible] نامی، جو مجھے پابندیٔ اوقات کے ساتھ کھلایا کرتا تھا اور جس کے ساتھ میں اس کے رہبر کی حیثیت سے تھوڑی دور چلتا تھا، لیکن اس پر بھی میں یہ دیکھتا تھا کہ وہ لوگوں کے دلوں میں یہ خیال قائم کرنا چاہتا ہے کہ میں اسی کا ذاتی کتا ہوں۔

لندن میں کینسنگٹن نام کے باغ کے قریب ہی ایک مکان تھا جہاں میرے بہت سے دوست رہتے تھے۔ ملک میں میں بڑا خوش قسمت تھا کیونکہ ہم ہر بہار کے موسم میں ایک ایسی جگہ اٹھ جاتے تھے جہاں بہت سے خرگوش ہوتے تھے اور حالانکہ میں ان میں سے کسی کو پکڑ نہ سکتا تھا لیکن ان کی بزدلی سے خوش ہوا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ یہاں بہت سے [illegible] میدان لیٹنے اور دھوپ کا لطف اٹھانے کے لئے موجود تھے۔

آپ سمجھ سکتے ہیں میں کس قدر مسرور ہوں گا۔ اسی قدر خوش تھا [illegible] اب یہاں سے میری کہانی شروع ہوتی ہے۔

ایک دن میرا آقا حسبِ معمول جب شام کو مکان واپس آیا تو ایک بات خلافِ توقع تھی یعنی اس کے ہاتھ میں ایک ٹوکری بھی تھی۔ "مچھلی ہوگی" میں نے بغیر سوچے سمجھے خیال کر لیا "بلی کا کھانا ہوگا یا پھل"۔ غرض یوں ہی خیال آرائیاں شروع کر دیں لیکن یہ تمام تخیل غلط ثابت ہوا کیونکہ اس ٹوکری میں سے اس نے ایک چھوٹی سی کالی چیز ——— اس قسم کی ایک چیز جسے چھوٹے شکاری کتوں میں شامل کیا جا سکتا ہے اور جس سے ہمیشہ مجھے نفرت رہی ہے ——— باہر نکالی، میں شاید آپ جانتے ہوں گے ایک شکاری کتا [illegible] شکار کھیلنے والا۔

"دیکھو رش" اس نے کہا "رش میرا نام ہے" "ہم تمہارے لئے ایک ساتھی لائے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اسے میرے قریب کر دیا۔ ساتھی! کچھ دن تک، مجھے اس کے اظہار میں کچھ تامل تھا، میں اس کے قریب نہ گیا اور اپنی مالکہ اور آقا سے بھی دور دور رہا، ذرا ان کو سزا دینے کے لئے اگرچہ مجھے اس کا احساس تھا کہ وہ اپنے نئے کھلونے کو دیکھنے میں زیادہ مشغول رہتے ہیں۔ اور پھر رفتہ رفتہ میں ان کے پاس آنے جانے لگا اور اپنی پرانی عادتیں پھر اختیار کر لیں۔

لیکن یہ چیز کتنی مختلف تھی! کھانے کے اوقات پہ جہاں مجھے تمام ٹکڑے اور ہڈیاں ملا کرتی تھیں اب صرف ان کا آدھا حصہ ملتا۔ پہلے جب میرا آقا سیٹی بجایا کرتا تھا تو وہ میرے لئے ہوتی تھی لیکن اب وہ دوسرے کے واسطے بھی ہو سکتی تھی۔ اور ایسا اکثر ہوتا کہ وہ مجھ سے قبل وہاں پہنچ گیا۔ مختصر یہ کہ اب میں ہی ایک اکیلا کتا نہ تھا۔

چند ہفتے تک تو ان حالات میں کوئی رد و بدل نہ ہوا یہاں تک کہ ایک دن ہیری جس نام سے وہ پکارتے تھے بیمار ہو گیا [illegible] اس کی نسبت پر اظہار [illegible]

تھا، اپنی دُم کو ساکن رکھنے میں مجھے بڑی دقت پیش آئی کیونکہ وہ ہلنے سے رُکتی نہ تھی اور جب میں نے اپنی ملکہ کو یہ کہتے سُنا "اچھا پیارے! اب صرف رش ہی ہمارا کتا ہوگا" تو مجھے اپنے جذبات کو چھپانے میں بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔

اس روز سے میری تمام پرانی خوشیاں واپس آگئیں، مجھے میری جگہ پھر مل گئی، آتش دان کے قریب آزادی سے پھرنا مجھے دوبارہ نصیب ہوگیا، اب تمام ٹکڑوں اور ہڈیوں کا مالک میں ہوگیا، سب مجھ ہی کو پیار کرنے لگے اور اب روزانہ ان کی تفریح کے وقت میں ان کے ساتھ جانے لگا۔ میرے آقا کی شان و شوکت بڑھ گئی اور میری ملکہ کے حسن میں اضافہ ہوگیا۔

لیکن افسوس! انسان بڑی جلدی تبدیل کردینے والے ارادے رکھتا ہے۔ اس کا دماغ ہی کچھ اس قسم کا واقع ہوا ہے۔ ایک روز قیامت ٹوٹ پڑی، ایک دوسری ڈگری میں سے ایک نیا کتا نکل کھڑا ہوا لیکن اس مرتبہ ایک خاص چیز یعنی وہ کتا جسے جنگلی مرغ کے شکار میں استعمال کیا جاتا ہے اور جو اپنے ادراک و چستی کے لئے مشہور ہے۔ سب سے پہلے وہ میری طرف بڑھا اور اپنے بھیانک تیز دانت میرے کان پر مارے، قدرتاً اس پر مجھے خفا ہونا چاہئے تھا جس کا اظہار میں نے یوں کیا کہ اس کے کاٹ کھایا جس پر وہ کمرے میں گھومنے اور چیخنے لگا۔ آقا نے دروازہ کھولا اور مجھے سختی سے باہر نکل جانے کا حکم دیا اور ملکہ محترمہ نے اسے اپنی گود میں لے لیا اور پیار کیا — نیک آغاز!

غرض اس طرح دن گزرتے رہے، ابتدا میں اس جملہ کی شکایت کرنے یا ان لوگوں کی بیزاری سے اور اپنے حاصل کئے ہوئے حقوق کے کھو دینے پر اپنی انتہائی ناراضگی کے اظہار میں مجھے شرم سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ بہرحال اب پھر آتش دان میرے حصہ میں نہ رہا اور مجھے پہلے سے آدھے ٹکڑے اور ہڈیاں ملنے لگیں اور جب میرا آقا اپنی چٹکی بجاتا تو میں پہلے وہاں پہنچ جاتا کیونکہ یہ چھوٹے کتے بہت سست ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ جب ونسنٹ مجھے باہر لے جاتا تو اسے بھی ساتھ لے لیتا تھا۔

بعد میں اچھے تعلقات قائم رکھنے کے خیال سے میں نے اس چھوٹے بے تمیز کے ساتھ کھیلنا بھی شروع کر دیا لیکن اس سے کسی قدر نفرت کرتا تھا اور اس [illegible] جملے۔

ایک [illegible] سے دور کرنے کی ترکیب سوچ رہا تھا ایک بہت ہی اچھا خیال میرے دماغ میں آیا جو اچھوتا اور چمکیلا اُسی وقت تھا اور جسے اب میں بہتیرا خیال کرتا ہوں۔ اس قسم کے کتوں کی عادت جیسا کہ شاید آپ کو معلوم ہے، ایسی ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے مخلص ہونے کے ساتھ ہی ایک شخص کے بہت ہی وفادار ہوتے ہیں۔ یہ چھوٹا کتا بہت ہی کم عمر تھا اور خانگی معاملات کے متعلق بہت کم واقفیت رکھتا تھا، وہ قدرتاً درجہ اور قسم کی بابت کچھ نہ جانتا تھا۔ میری ترکیب اس کی ناواقفیت اور ملائمت سے فائدہ اٹھانے اور اس کے دل میں یہ خیال پیدا کرکے کہ ونسنٹ اس کا آقا ہے اس کی تمام توجہ اور محبت اس کی جانب منعطف کرنے کی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس طرح ہمارا اصل مالک اس بات کا یقین کرلے گا کہ وہ کتا اس سے زیادہ ونسنٹ کو چاہتا ہے اور یوں اس سے غیر دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے اسے آزاد کردے گا یعنی کسی دوسرے شخص کو دے دیگا یا ونسنٹ کو بھی اس کے ساتھ ملازمت سے برطرف کردے گا۔

اور ایسا ہی ہوا، اسکیم پوری طرح کامیاب ہوگئی۔ چھوٹے کتے نے اپنے کو ونسنٹ سے منسلک سمجھ لیا اور اس میں مستقل رہا۔ کوئی چیز اسے اس سے دور نہ رکھ سکتی تھی یہاں تک کہ اگر اوپر زینے پر چڑھنے کے لئے کہا جاتا تو وہ گھڑی گھڑی دروازہ کی طرف آتا اور اپنے خیال کے مطابق اپنے آقا کے لئے چیختا۔

اصلی آقا بہت ناراض تھا "لے جاؤ اس کتے کو" وہ اکثر کہا کرتا تھا۔ "ایسے کتے کے رکھنے سے کیا فائدہ جو مجھ سے محبت نہیں کرتا" اور پھر وہ اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھ لیتا اور کہتا کہ یہ محبت کرنے والا اور فرمانبردار ہے۔ یہاں تک کہ پھر مجھے کسی طرف دیکھنا بھی دشوار ہو جاتا — ایک دن تمام کام جیسا کہ میں نے سوچ رکھا تھا تکمیل کو پہنچ گیا اور چھوٹا کتا ایک ہمسایہ کو دے دیا گیا۔

اُس وقت سے پھر کبھی میں خوش نہ رہا اس لئے کہ میں نے اپنے عزیز آقا اور ملکہ کے کتے کو ان سے جُدا کر دیا اور جہاں میرا دل ہونا چاہئے تھا وہاں اپنے حسد اور خود غرضی سے ایک پتھر رکھ لیا۔ بیچارے ونسنٹ کا دل ٹوٹ گیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ سمجھ گیا ہے کہ اس کام میں میرا بھی ہاتھ تھا۔ کیونکہ اس کا برتاؤ پہلا سا نہ رہا تھا۔ ہاں! میں نے ایک ذلیل حرکت کی جس کا مجھے افسوس ہے۔ میں نے ایک ایسا کام کیا جو نہ میرے ساتھیوں اور نہ کسی شریف آدمی کو کرنا چاہئے۔ مجھے ایک دفعہ اور زندہ رہنے دو تاکہ میں پھر تسکین سے آخری سانسیں لے سکوں۔

دلیپ [illegible] مصطفیٰ آبادی

درسِ محبّت

دوست ملا تھا تجھ کو کیسا حیف اتنا بھی یاد نہیں
جان فدا کرتا تھا جس پر دل میں اُسکی یاد نہیں!

گردشِ دوراں نے جب اُس کو آہ شکستہ حال کیا
دیکھ کر اُس کے حالِ زبوں کو تُو نے کچھ نہ ملال کیا

کون شکستہ حال کہاں ہے یہ بھی دھیان آیا نہ تجھے
آہ تصور نے ایسے محسن کے تڑپایا نہ تجھے

پاس تھا اپنے قول کا جسکو تُو نے کچھ اُسکا پاس کیا
آمد و رفتِ دیرینہ کا بھول کے بھی احساس کیا؟

اُس کے درد سے واقف ہو کر تُو نے خبر کیا لی اُس کی
فرضِ محبت جان کے دل سے کیا کوئی خدمت کی اُس کی؟

دل تیرا اُس دوست کا ناحق وقفِ سحر لسانی تھا
میری سمجھ میں اب آیا وہ جمع و خرجِ زبانی تھا

نادان انساں! تیری دولت تیرے ساتھ نہ جائے گی
لیلیٰ مطلب دُور رہے گی تیرے پاس نہ آئے گی

حصر فقط تجھ ہی پر کیا ہے تُو ہی اک غیر دوست نہیں
دوست بہت ملتے ہیں لیکن اِن میں اکثر دوست نہیں

دوست نہیں جو نام کی خاطر اپنے دوست کے کام آئے
دوست وہ ہے لوگوں کی زباں پر جس کا مثلاً نام آئے

علی منظور حیدرآبادی

انتقام

(ذیل کی کہانی تاریخ انگلستان کے اُس زمانہ سے تعلق رکھتی ہے جب اہلِ سکاٹ لینڈ نے انگلستان کی ایک زبردست جماعت کے ساتھ خفیہ سازش کر رکھی تھی تاکہ نظامِ سلطنت کو اُلٹ کر خاندانِ سٹورٹ کو برسرِ اقتدار لایا جائے۔ اس خاندان کا رکن جو تختِ انگلستان کے حقدار ہونے کا مدعی تھا اس وقت فرانس میں تھا اور اس میں اور سازشیوں میں پوشیدہ خط وکتابت جاری تھی۔ ان سیاسی حالات سے ایک شخص ناجائز فائدہ اُٹھا کر اپنی ذاتی اغراض کی تکمیل کرنا چاہتا ہے۔ اس کا عبرتناک انجام جیسا کچھ ہوا کہانی میں واضح طور پر دکھایا گیا ہے۔ محلِ وقوع لنڈن کا ایک ہوٹل ہے۔)

آدھی رات کا وقت تھا، چاند پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا جبکہ مسٹر ہیری ام نے سرائے کے پھاٹک پر زور سے دستک دینے کے لئے اپنے ہاتھ کو اٹھایا مگر پھر کسی خیال سے اس نے ہاتھ کو پیچھے ہٹا لیا اور مڑ کر اُس طرف دیکھنے لگا جدھر سے وہ آیا تھا۔

یہ رات بڑے دن کی رات تھی اور حسبِ معمول سردی شدت کی پڑ رہی تھی۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ مسٹر ہیری ام اپنے دھندلے اور لمبے سائے کو جو اُس کے سڈول جسم کی وجاہت کا مسخ شدہ عکس تھا حقارت اور نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا ہوا واپس پھرا اور ٹمپل بار کا راستہ لیا جو وہاں سے مشرق کی جانب واقع تھا۔ معزز اُمراء کے بے سُرے گیتوں کی آوازیں ان عالیشان محلات سے جو اطرافِ راہ پر کہیں کہیں واقع تھے اس کے کان میں پڑتی۔ کبھی کوئی تنہا راہگیر جو اپنے مشاغل سے دیر سے فارغ ہو کر اپنی آرام گاہ کو جا رہا ہوتا گرم لبادے میں آنکھوں تک ڈھپا ہوا اُسے ملتا۔ بازار کے تاریک کونوں سے بیکس اور مفلس انسانوں کی دردناک [illegible] اور بے تابانہ آہیں اپنے آپ کو فضا میں ضائع کر دیتیں۔ مگر مسٹر ہیری ام [illegible] خراماں اپنے اس تمام ماحول سے اور لہو کو جما دینے والی سردی کے احساس سے بے پروا ایک ہاتھ سے اپنا قبضۂ شمشیر تھامے اور دوسرے میں اپنی قیمتی چھڑی پکڑے ٹمپل بار کو جا رہا تھا۔

وہاں پہنچ کر وہ علامت کے سائے میں ٹھیر گیا اور اپنی چھڑی سے ٹیک لگا کر اس نے اپنی تیز چمکیلی آنکھوں کو جنہیں قدرت نے ایک خوش وضع چہرے میں لگایا تھا اُٹھایا اور بڑے غور سے ان ننگی آہنی سلاخوں کو جو ایک بڑی اور بلند محراب کے اوپر لگی ہوئی تھیں دیکھنے لگا۔ ایک ہیبتناک منظر اس کے سامنے تھا۔ کئی لاشیں ان سلاخوں کے اوپر لٹکی تھیں اور اپنی [illegible] ان کی سڑاند ہوا کو متعفن کئے ہوئے تھی۔ ایک جگہ پر مسٹر ہیری ام نے اپنی تیز نگاہ کو جمایا۔ یہ لاش حال ہی میں وہاں چڑھائی گئی تھی اور دوسری لاشوں کی بہ نسبت بہت کم بوسیدہ تھی۔ یہاں تک کہ اس کے خط وخال بھی آسانی سے شناخت کئے جا سکتے تھے اگرچہ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں، سکڑے ہوئے چہرے اور کھلے ہوئے منہ کو دیکھ کر ڈر لگتا تھا تاہم چہرے کی تراش اور عام انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ زندگی میں قدرت نے اس کو جوانی کی دلفریب رعنائی اور دوسرے جسمانی محاسن سے کامل طور پر نوازا تھا۔ اسے دیکھ کر مسٹر ہیری ام مسکرایا۔ اپنی جیب سے نسوار کی ڈبیا نکال کر ایک چٹکی لی، اپنے ناک کے پاس لایا اور اسے نہایت مزے سے سونگھا۔

اس روز بے شمار آنکھیں اس لرزا دینے والی صورت کو وہاں دیکھ چکی تھیں مگر کسی میں تسکین بغض وعناد کی وہ جھلک نہ پائی گئی تھی جو اس وقت ہیری ام کی آنکھوں میں نظر آ رہی تھی۔ اس نے ایک بہت دھیمی آواز میں لاش کو خطاب کر کے کہا: "کہئے میرے آقا، نواب عالیجاہ اب آپ کا کیا حال ہے؟ وہ وجاہت اور وقار کہاں ہے جس پر آپ کو ناز ہوا کرتا تھا۔ اب تو آپ کو دیکھ کر باربرا کے وہ کانپ اُٹھے گی جیسا کہ وہ کبھی مجھے دیکھ کر حقارت اور غصے سے کانپ جایا کرتی تھی۔ آہ! میری پیاری باربرا! میری مغرور پُر رعونت باربرا! کیا اب تم اس چہرہ کو چومنا پسند کرو گی؟ بخدا مجھے اس میں بڑا شک ہے۔ سو آخر کار میرے نواب عالیجاہ آپ اپنی منزلِ مقصود کو پہنچ گئے مگر آپ کے چہرے کا منظر اب ایسا دلکش نہیں۔ ذرا اور ٹھیرئیے ہوا، بارش اور دھوپ کے اثرات آپ کی اس شانِ دلربائی میں معتدبہ اضافہ کر دیں گے۔ آخر کار میں نے آپ کو منزلِ مقصود پر پہنچا دیا اور یہیں میں آپ کو چھوڑتا ہوں۔ تاکہ اپنے ساتھیوں کی ہمراہی میں آپ [illegible] اور ہوا کو ناپاک کریں۔ اُدھر

سرحد کے اُس پار رہا کرتا ہے۔ تمہارے عشق و محبت کی پیاسی بلیما۔ کیا اب بھی میرے لئے وہ ویسی ہی سنگدل رہے گی؛ اب جلد ہی معلوم ہو جائیگا۔ سو میرے نواب عالیجاہ۔ یہ بڑا دن آپ کو مبارک ہو۔ خدا کرے کہ مظالمہ آپ کو اتنی جلدی بھول جائے جتنی جلدی کہ آپ مرنا اور لوسیہ بھنا شروع کریں۔"

"کیا حضور مجھ سے بات کر رہے تھے؟"

ایک لحظہ کے لئے مسٹر میری ام خاموش کھڑا رہا۔ پھر وہ اپنی تلوار کے قبضہ کو گرفت میں لیتے ہوئے تیزی سے مُڑا اور اس نے دیکھا کہ ایک قد آور شخص جو ایک لمبا ڈھیلا چغہ پہنے ہوئے تھا اور جس کا چہرہ اس کی ٹوپی کے چوڑے حاشیے کے سائے میں چھپا ہوا تھا اس کے پاس ہی کھڑا تھا۔ اس شخص نے پھر پوچھا "صاحب! کیا آپ مجھ سے بات کر رہے تھے؟"

جواب میں مسٹر میری ام نے جلدی سے چند قدم پیچھے ہٹ کر اپنی تلوار کو نیام سے نکالا اور دھمکی کے طرز پر اجنبی کی طرف اُٹھا کر تحکمانہ آواز میں کہا "اپنا سر اُٹھاؤ تاکہ میں تمہارا چہرہ دیکھ سکوں"۔ اجنبی نے ایسا ہی کیا اس کا چہرہ دُبلا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں دونوں طرف نمایاں طور پر باہر کو نکلی ہوئی تھیں اور سر کے بال بُھورے تھے۔ مسٹر میری ام نے چیں بجبیں ہو کر کہا "شاید تم سکاٹ لینڈ کے باشندے ہو"۔

"ہاں۔ میں ہوں"۔

"خوب! تو یہاں تمہارا ایک اور ہموطن بھی ہے"۔ اور یہ کہہ کر مسٹر میری ام نے اپنی چھڑی کے ساتھ اس تازہ لاش کی طرف اشارہ کیا۔

"میری بات غور اور دھیان سے سنو مگر ہوشیار رہنا۔ مبادا تمہارا بھی یہی حشر ہو۔ خبردار! میرے رستے سے ہٹ جاؤ"۔

وہ شخص جلدی سے ایک طرف ہو گیا۔ میری ام نے تلوار کو نیام میں کیا اور یہ دیکھ کر کہ اجنبی بہت غور سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے اس نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ گھبراہٹ سے اپنی جیب میں ڈال لیا اور پھر کڑک کر اس اجنبی سے پوچھا "شیطان تو کیا دیکھ رہا ہے؟"

"جناب کچھ نہیں۔ صرف یہ کہ آپ نے ایک انگلی کھو دی ہے"۔ اور اس شخص نے تعجب اور دہشت سے اپنا سر دھنتے ہوئے کہا "میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ابھی تک آپ قانون میں ہیں کیونکہ آپ نے ابھی فرمایا تھا کہ ہم اہل سکاٹ لینڈ کے لئے کچھ ایسی عزت نہیں ہے۔ تعجب ہی ضعف ہوتا ہوں"۔ یہ کہہ کر اس نے کسی طرف چلنا شروع کیا اور چلا گیا۔ جب وہ اس کی شکل دھندلی ہو کر کے وسیع سایوں کی تاریکی میں غائب ہو گئی تو میری ام نے اپنی راہ لی۔ ایک دفعہ جب اس نے پھر کر دیکھا تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے دو آدمی اس اندھیرے میں دبکے بیٹھے ہیں تاکہ اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں۔ اس پر میری ام کا قدم خود بخود تیز ہو گیا اور ہوٹل کے دروازے پر پہنچکر اس نے نہایت بیتابی کی حالت میں اس زور سے دستک دی کہ ساری دیوار ہل گئی۔ غور سے سُنکر پاسبان جاب مشعل ہاتھ میں لئے فوراً باہر آیا اور میری ام کو دیکھ کر بولا۔

"او ہو! یہ آپ دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے"۔

"کیا میرے بعد کوئی شخص میرے متعلق دریافت کرنے کیلئے آیا تھا؟"

"جناب نہیں۔ آپ مہربانی سے اندر تشریف لے آئیں۔ سردی سخت ہے اور میرے کمرے میں خوب آگ جل رہی ہے جو آپ کا ایک ایک عضو گرم کر دیگی"۔

"بہت اچھا"۔

میری ام جاب کے ہمراہ کمرے کے اندر چلا گیا۔ آگ کی حرارت نے اس کے جسم میں تازہ [illegible] آتشدان کے قریب بیٹھکر اور اپنی ٹانگوں کو آگ کی طرف پھیلا کر وہ بولا "جاب تم تو خوب آرام سے بسر کر رہے ہو"۔

"جی [illegible] آپ نے اس تازہ لاش کو جو آج سُولی پر چڑھائی گئی ہے دیکھا؟"

"ہاں سرسری نظر سے"۔

"آج ہی صبح یہ وہاں لائی گئی ہے۔ سر اور چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نعش کسی نوجوان امیر کی ہے جو بہت وجیہ تھا"۔

"مگر جاب یہ کون شخص تھا؟"

"سکاٹ لینڈ کے باغی اُمرا میں سے ایک ہے جسے کل سزائے موت دی گئی اگرچہ یہ افواہ بہت گرم ہے کہ یہ امیر بے قصور تھا یا کم از کم اتنا قصوروار نہیں تھا جتنا کہ اس کے دوسرے ہمسر ہیں جو نوز سلامت ٹلا چھپے ہیں"۔

"ہاں تو یہ افواہ ہے۔ لوگ اور کیا کہتے ہیں؟"

"یہی کہ جعلی شہادت پر اس کو سزا دی گئی اور مخبر کی تلاش کی جا رہی ہے"۔

مسٹر میری ام نے یہ سُن کر کھلا اندازمیں ہم ۔۔۔ آنکھوں سے آگ کی طرف دیکھا اور اپنی ران پر چٹکی لی اور کہا کہ جاب! مجھے اُمید نہیں کہ مخبر کو وہ لوگ ڈھونڈ سکیں۔

میں ۔۔۔ جانتا ہوں کہ جو کم ۔۔۔ بھی ۔۔۔ مجھے مخبری سے سخت نفرت ہے۔

۔۔۔ ایک ۔۔۔ کہ ۔۔۔ کون تھا؟"

"میں نے سنا ہے کہ مخبر اس امیر کا کوئی چچیرا بھائی تھا۔"

"عجیب۔ معلوم نہیں بعض اوقات لوگ صحیح واقعات کو کہاں سے سُن گن پاتے ہیں مگر باوجود ان سب باتوں کے اس میں تو ذرہ بھر بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ وہ نوجوان امیرزادہ کامل و اکمل طور پر مر گیا۔"

"ہاں صاحب۔ مگر کیسی حسرتناک موت ہے!"

"نہیں۔ تلوار سے سر کا قلم کیا جانا تو ایک سریع اور اس لئے آسان موت ہے۔"

"ممکن ہے مگر قتل سے پہلے کے حالات پر تو ذرا غور کیجئے سپاہیوں کے پہرے، تماشائیوں کے گروہ، ان کے نعرے، پھر جلاد اور اس کی تلوار کیسا بھیانک اور لرزہ خیز منظر ہے۔ اس کے علاوہ یہ شخص بالکل عنفوانِ شباب میں تھا۔ اور بڑے دل کی تقریب، اس عمر میں اور ایسے موقع پر مارا جانا یقیناً غایت درجے کی بدقسمتی اور حرماں نصیبی کی دلیل ہے۔"

اتنے میں دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ میری آم بجلی کی تیزی سے جاب کو پیچھے چھوڑ کر باہر لپکا اور اپنی تلوار کو تھام کر فوراً دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی ایک دھیمی آواز نے اسے یوں مخاطب کیا: "اے نیل خدا کا شکر ہے کہ آخر میں نے تمہیں پا لیا"۔ معاً تاریکی میں سے ایک لپٹی لپٹائی شکل نمودار ہوئی جس نے اپنے سفید ہاتھوں کو پھیلایا۔ جاب نے حماقت آمیز لہجے میں کہا "بخدا یہ تو کوئی جوان عورت ہے۔"

میری آم نے مدھم آواز سے جس میں پریشانی اور گھبراہٹ ملی ہوئی تھی اس شکل کو خطاب کر کے کہا "باربرا!" اور یہ کہہ کر اس نے اسکے دونوں خوبصورت ہاتھوں کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور ایک ہاتھ اپنے بازو میں حائل کر کے جلدی سے اسے اپنے کمرے کی خلوت میں لے گیا۔ جاب کو جو انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا ایسا معلوم ہوا گویا کوئی سیاہ سی شکل رات کے گھنے اندھیرے میں ان کے پیچھے پیچھے سائے کی طرح جا رہی ہے مگر اسے محض اپنا تصور خیال کر کے وہ واپس کوٹھری میں آ گیا اور دروازہ بند کر کے سو رہا۔

اپنی آرامگاہ میں پہنچ کر میری آم نے کہا "باربرا! تم اور یہاں لندن میں! سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا یہ سچ مچ تم ہی ہو؟"

"نیل۔ کیوں نہیں کیا یہ ناممکن ہے!"

"مجھے [illegible] تمہاری پہلی ملاقات کے وقت سے شمار [illegible] ہے"

"بے شک۔ میں اب عمر میں ایک سال زیادہ اور اسی نسبت سے بوجھ میں بھی پہلے سے بڑھ کر ہوں۔"

"اور رحم دل اور مہربان تر۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ تم وہی بد دماغ اور بے مہر باربرا ہو جس نے مجھے اپنے کمرے سے دھکے دے کر نکلوا دیا تھا۔"

"بلاشبہ میں اب وہ باربرا نہیں رہی نیل۔"

"اور تم کیوں یہاں آئیں! کونسی چیز تم کو میرے پاس لے آئی؟"

"میں آئی کہ میں اب دُنیا میں اکیلی ہوں اور تم . . . . . تم کبھی مجھے چاہتے تھے۔"

"کبھی! تمہاری محبت تو ہمیشہ کے لئے میرے دل میں پیوست ہو چکی ہے۔ میں نے اس ساعت کے لئے ایک عمر انتظار کیا ہے۔ اور آج . . . آج رات . . . . . او باربرا! تمہاری صورت کیسی پیاری ہے اور تم کانپ کیوں رہی ہو؟ کیا تمہیں سردی لگ رہی ہے؟"

"ہاں نیل! میرا جسم سردی سے شل ہو رہا ہے۔ میرا خون میری رگوں میں جم گیا ہے۔"

"تو آؤ اس آگ کے پاس بیٹھ جاؤ۔" اتنے میں کسی چیز کی آہٹ اسے سنائی دی۔ تو اس نے باربرا سے پوچھا "کیا تم نے بھی کوئی ہلکا سا شور سُنا؟"

"مگر اس وقت تو ہوا بالکل بند ہے۔"

"تو شاید کسی دروازے یا کھڑکی کا کواڑ ہلا ہو گا۔ تم کیوں اتنا وہم کر رہی ہو؟"

میری آم نے باربرا کو ایک بڑی آرام کرسی میں بٹھا دیا۔ آگ کو تیز کر دیا اور جلدی سے برانڈی کا ایک گلاس بھر کر دیا۔ پھر باربرا کے حسن سے اپنی آنکھوں کو سیراب کرتے ہوئے اس نے کہا "میری روحِ رواں! تم بہت تھکی ہوئی ہو۔"

"ہاں نیل۔"

"اور پہلے سے بھی حسین ہو۔" یہ کہہ کر اس نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر زور سے کھینچا۔ مگر باربرا نے اپنی نظر کو جلتی ہوئی آگ پر جما کر کہا "نیل ظالموں نے کل یاس کو مار ڈالا۔"

میری آم نے جواب میں [illegible] کہا "ہاں میں نے بھی ایسا ہی سُنا ہے۔"

"اور میں نے اس کے قتل کا دلدوز منظر اپنی ان آنکھوں سے دیکھا اس نے بھی اپنی زندگی کی آخری ساعتوں میں مجھے ڈھونڈا اور بے شمار مخلوق کے اس جم غفیر میں ہماری آنکھیں ایک دوسرے سے مل گئیں۔ وہ ہنسا۔ ہاں۔ وہ ہنسا۔ مگر اُف اس کے مُنہ کی زردی!"

"تمہارا افسوس بار برا بالکل بے جا ہے۔ جو ہونا تھا ہو گیا گئی گذری باتوں پر تأسف بے سُود ہے۔ بے شک راڈرک کی موت بڑی حسرتناک اور رنجدہ ہے۔ مگر اس نے اس کی مصائب کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اب اس سانحے کو بھول جاؤ مستقبل کا خیال کرو۔ میں تجویز کر رہا تھا کہ کل تم سے ملنے کے لئے سکاٹ لینڈ روانہ ہو جاؤں"

باربرا نے ایک سرد آہ بھر کر کہا "بیکس مظلوم راڈرک۔ آہ ناکردہ گناہ راڈرک۔ وہ کتنا بہادر تھا مگر آخری وقت اس کے جسم کو کانپتے ہوئے دیکھکر پتھر سے پتھر دل بھی رحم سے بھر جاتا تھا"

میری ام نے زہر کے گھونٹ پیتے ہوئے کہا "خوب! تو آپ نے محض اس کی خاطر لندن آنے کی تکلیف گوارا کی!"

"نہیں نیل تم کو بچانے کے لئے — تمہاری خاطر"

"مجھے! باربرا مجھے کس سے بچانے کے لئے!"

اس نے پھر ایک آہ سرد کھینچ کر کہا "ایک بے فائدہ گناہ سے یعنی تمہارے جیسے بھائی راڈرک کے قتل کے گناہ سے!"

یہ سُن کر میری ام غیظ و غضب کے عالم میں دیوانہ وار کانپتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ایک طوفان کی سی تاریکی چھا گئی۔ وہ بولا "اچھا میری محترمہ! تم مجھے قاتل کہنے کی جرأت کرتی ہو!"

مگر اس کی اس گرمیٔ کلام نے باربرا کو خس بھر بھی متأثر نہ کیا اور وہ اسی برجستہ اور دھیمے لہجے میں بولی "ہاں۔ میں تمہیں قاتل کہتی ہوں کیونکہ تم نے اُس مجرمانہ خط کو جو فرانس سے اس کے نام آ رہا تھا راستے میں روک کر پکڑوا دیا۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں نے اس کے خلاف جاسوسی کی اور جعلی شہادت بنائی۔ ہاں میں جانتی ہوں کہ تمہیں غریب راڈرک کی موت کا سبب ہوئے اور یہ سب کچھ تم نے میری محبت کی خاطر کیا"

"اچھا تم میں اتنی جرأت ہے کہ تم مجھے . . . . . ."

"مجھے اس حقیقت کا بخوبی علم ہے" اتنا کہہ کر وہ نہایت ہی لبریز ایک گہری اور عمیق ہو پیوست ہو جانے والی نگاہ سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگی۔ اس پُرسکون امتحان نے میری ام کی بے شرمی اور خیرہ چشمی کو جڑ سے ہلا دیا اور اس کی تیز آنکھیں جھک گئیں۔ آخر باربرا بولی۔

"افسوس صد افسوس نیل تمہیں معلوم ہونا چاہئے تھا کہ میرا دل تمہاری ملکیت ہو چکا ہے"

میری ام کا سانس گھٹنے لگا اور خاموش اور مبہوت وہ ایک قدم پیچھے ہٹا مگر اُس کی آنکھیں ٹکٹکی باندھے باربرا کو دیکھ رہی تھیں۔

لیکن باربرا نے اسی باوقار اور پُرسکون لہجے میں اپنے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا "تو میں اسی غرض سے آئی تھی کہ اس حقیقت سے تمہیں آگاہ کر دوں۔ مگر افسوس کہ رستے میں مجھے دیر ہو گئی اور میں لندن اُس وقت پہنچی جب وہ بیچارہ مر رہا تھا اور تم جس سے مجھے محبت تھی اس کے قاتل بن چکے تھے"

میری ام دہشت زدہ پُرخوف آنکھوں سے باربرا کو دیکھنے لگا اور تنگیٔ تنفس کی حالت میں بولا "بخدا باربرا اگر یہ سب سچ ہے تو . . . . . . مگر نہیں تمہارا تو شروع سے یہی وطیرہ رہا۔ تم ہمیشہ راڈرک کے گیت گاتی رہیں۔ ہمیشہ اس کا نام تمہارا ورد زبان رہا۔ وہی تمہارے لئے سب کچھ تھا اور تم نے کبھی آنکھ اُٹھا کر بھی میری طرف نہ دیکھا۔ میں نے بارہا اس حقیقت کو اپنے دل میں محسوس کیا اور تمہاری آنکھوں میں دیکھا"

باربرا جلدی سے اُٹھی اور ایک پُرزور آواز میں بولی "او کج چشم سیاہ باطن۔ میں اُس وقت بھی تمہیں کو چاہتی تھی اور خدا مجھے معاف کرے میں اب بھی تمہیں ہی چاہتی ہوں"

میری ام نے مسرت تسخیر میں ایک نعرہ لگایا اور چلایا "باربرا! او باربرا!!" یہ کہہ کر اس نے اپنے بازوؤں کو اس کی طرف بڑھایا۔ مگر باربرا اس سے بچ کر پیچھے کو ہٹی اور بولی "خبردار! مجھے مت چھونا۔ تمہارے ہاتھ بے گناہ راڈرک کے خون سے سُرخ ہیں"

"مگر باربرا تمہیں تو مجھ سے محبت ہے! تم تو مجھے چاہتی ہو!"

"ہاں ہاں۔ مگر تمہارا گناہ ہمارے درمیان حائل ہے"

"باربرا! عشق اندھا ہوتا ہے۔ عشق سب کچھ فراموش کر دیتا ہے"

"یہ سچ ہے مگر پہلے اقبال جرم ہونا چاہئے"

"اقبال جرم؟"

"اونیل! میں کیونکر تمہاری آغوش میں آ سکتی ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ گناہ بغیر اقرار اور توبہ کے بخشا جائے"

"تو ایسا ہی ہو گا" اس نے اپنے کانپتے ہونٹوں سے اس کو

پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور چھاتی سے لگا لیا۔ پھر یوں گویا ہوا "تو اب سنو مجھے تم سے بے حد، بے حساب، بے شمار محبت تھی اور ہے۔ اور اس اندیشہ سے کہ مبادا وہ اُلّو امیر زادہ مجھے تم سے محروم کر دے میں نے اسے اپنے رستے سے ہٹانے کے ذرائع اختیار کئے"۔

"یعنی او ذلیل، اُس خط کے ذریعہ سے؟"

"اُسی خط کے ذریعہ سے"۔

"جس میں تم نے جاسوسی کی جس کی وجہ سے اس کی گردن تلوار کی نذر ہوئی"۔

"ہاں! میں نے ہی کی اور اب . . . . اے بآربا تم میری ہو"۔

لیکن باربا کے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے ایک ہولناک چیخ نکلی جو لحظہ بلحظہ بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔ اس نے اوذیل کی ڈھیلی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑا کر فرش پر آرام کرسی کے سامنے زانوؤں کے بل گرا دیا۔ اور سر کو جھکا کر اپنے منہ کو دونوں بازوؤں کی لپیٹ میں چھپا لیا۔ اُس وقت کمرے میں بھیانک سی خاموشی چھا گئی۔ اور اس خاموشی میں کھڑکی سے خفیف سی سرسراہٹ سنائی دی۔ میرتی ام نے پھر کر دیکھا اور دیکھتے ہی سکتے کے عالم میں رہ گیا۔ کیونکہ کھڑکی کے شیشوں کے پاس اسے ایک خوفناک چہرہ، ایک زرد، گول ہیبت ناک چہرہ دکھائی دیا جس کی آنکھیں اپنی گھنے دار بھنوؤں کے نیچے سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں اور جس کا دہشت ناک منہ کھلا تھا۔ شیشوں کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ کھڑکی کے کواڑ کھل گئے اور ایسا معلوم ہوا گویا وہ فوق الفطرت شکل ہوا کے سرد جھونکے پر سوار ہو کر کمرے میں داخل ہو گئی۔

میرتی ام نے ایک لرزہ خیز چیخ ماری اور ڈگمگا کر پیچھے کو گر پڑا۔ اس کا جسم بالکل بے حس و حرکت تھا اور اس کی کشادہ پتھرائی ہوئی آنکھیں چھت کی کڑیوں کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ وہ اس شکل کو نہ دیکھ سکا جو معاً رینگتی ہوئی دزدیدہ طور پر کمرے میں داخل ہوئی، ایک لمبا دبلا آدمی جس کے سر پر سُرخ بال تھے، اور نہ اُس آواز کو سن سکا جو زیر لب یہ کہہ رہی تھی "محترمہ اب سب کچھ ٹھیک ہے۔ آپ باہر چلی جائیں۔ باقی معاملے کو میں نبٹ لوں گا۔ اس میں زیادہ دیر نہیں لگے گی"۔

دوسرے دن علی الصباح حباب اپنی خوابگاہ سے نکلا اور اپنی گرم پوشش میں از سر تا پا لپٹا ہوا ناشتے کے لئے اپنے گھر کو چلا۔ ہوا سخت سرد تھی اور گھنٹوں کی سُریلی آوازیں جو بڑے دن کی تقریب کے اعزاز میں بج رہے تھے سننے والوں کے دلوں میں سرود پیدا کر رہی تھیں۔ چلتے چلتے حباب از روئے استعجاب چپل بار کے قریب پہنچ کر ذرا ٹھیر گیا اور سر اُٹھا کر اس نوجوان امیر زادے کی لاش کو جو کل وہاں دیکھی گئی تھی اور دن بھر لوگوں کی نظروں کا نشانہ بنی رہی تھی دیکھنے لگا مگر اس کی حیرت اور تعجب کی کوئی حد نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اس لاش کی جگہ ایک اور لاش نصب ہے جس کا چہرہ زرد مگر خوبصورت تھا اور جس کے سر کے سیاہ بال صبح کی ہوا میں بکھرے ہوئے تھے یعنی میرتی ام کی لاش ✦

(ترجمہ)

عبدالرحمٰن

رباعی

[illegible] چمن سے ایک اک برس بیتا

[illegible] حسرت و افسوس میں بیتا

تھی جیتے جی ملاقات کی حسرت اے شیخ

کیوں ان سے مری ملاقات [illegible]

علی منظور

بزمِ ادب

انگریزی

مغربی تہذیب ایک مغربی کی نظر میں

حیرت کی بات ہے کہ ماضی کے سبق کے باوجود وہ مجنونانہ دوڑ جو ذاتی دولت کو کامیابی کا سب سے بڑا معیار سمجھ رہی ہے بدستور جاری ہے، ایک روز مؤرخین ہمارے عہد کا مطالعہ کریں گے اور اُن باتوں کو واضح طور پر دیکھیں گے جو آج ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں، وہ کہیں گے کہ "ان لوگوں نے سائنس اور ایجاد کو اپنی روزمرہ زندگی میں استعمال کیا، تاہم زندگی کو حقیقۃً رہنے کے قابل نہ بنا سکے اور انہیں اعلےٰ فہم اور تعلیم کے ترقی یافتہ طریقے حاصل تھے پھر بھی بحیثیت مجموعی انہوں نے زندگی کی کامیابی کے نصب العینوں کو پست ہی رکھا۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک حیرت انگیز بلند مادی تہذیب کے ساتھ ان پست نصب العینوں کی آویزش ہی بنیادی سبب تھی اکثر قومی جنگوں اور ملکی لڑائیوں، بےچینی، مصیبت، تشکک اور امن و مسرت کے عدمِ استقلال کا جو اس زمانے عہد کی خصوصیات تھیں"۔

ہم اپنی تہذیب کی ترقی کے ایک نازک درجہ پر پہنچ گئے ہیں، یہ امر کہ ہم آگے اور اوپر جائیں گے یا پیچھے اور نیچے کی طرف واپس آئیں گے اس پر منحصر ہے کہ زمانۂ موجودہ کا بچہ کیا بنتا ہے۔ بڑا ہو کر وہ جو کچھ کرے گا وہی اہمیت رکھتا ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ اہمیت اس کے مطمحِ نظر کی ہوگی، اگر ہم دانشمند ہیں تو ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ وہ جو آج ایک بچہ ہے اور کل ملک کا ایک فرد ہونے والا ہے زندگی کے غلط معیاروں سے گمراہ نہ ہونے پائے۔ تمام والدین اور اساتذہ کو جو نہ صرف کل کے بچے والے افراد بلکہ قوم سے متعلق بھی اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہیں چاہیئے کہ استقلال کے ساتھ بچوں کے ذہن میں اشیا کی قدر و قادرہ کا ایک صحیح تر احساس پیدا کرتے رہیں۔ بہ نسبت ان جھوٹی جماعتوں کے احساس کے جنہوں نے گذشتہ جنگ کو لابدی بنا دیا، یا بہ نسبت اُس نسل کے احساس کے جو زمانہ جنگ کے بعد رونما ہوئی اور جس کا عقیدہ یہ ہے کہ دولت طاقت ہے اور ان ہی دونوں کا اجتماع زندگی کا سب سے بڑا انعام ہے۔

ترقی یافتہ تعلیم اور وہ تمام معاشرتی و اجتماعی اصلاحیں جن کے لئے ہم اس قدر مصارف برداشت کر رہے ہیں، یہ سب اندر سے بوسیدہ اور فاسد ہونے کے باعث کچھ بھی مفید ثابت نہ ہوں گی جب تک کہ زمانہ موجودہ کے بچوں کو سب سے بڑے سبق کی تعلیم نہ دی جائے۔ اور انہیں اُن غلط معیاروں سے نفرت نہ دلا دی جائے جو قدیم روایات میں سے اکثر راہ میں داخل ہیں۔

جنگ کے بعد کا دَور اپنی عدیم المثال حرصِ دولت اور حرصِ تعیش کے لئے نمایاں ہے، یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ تمام طبقے نفس پرستی کے جذبہ سے مغلوب ہیں، ہر سال عیش و عشرت کے تمام اقسام پر اخراجات بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ قوم میں روٹی گوشت کے مصارف کی بہ نسبت شراب کے مصارف بہت زیادہ ہیں۔ آپ ایسے بیشمار نوجوان مردوں اور عورتوں کو دیکھیں گے جن کی زندگی کا خاص مقصد عیش و تفریح ہے وہ دوسروں کو نقصان پہنچا کر بھی اسے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

یہ لوگ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے، لیکن جو بچے کہ آئندہ بیس سال کے اندر بڑھ کر جوان ہوں گے اصلی اور حقیقی اہمیت ان کی ہے۔ اور یہ ہمارا ایک انفرادی اور قومی فرض سمجھنا چاہیئے کہ انہیں مروجہ ممنوعات و رسومات سے آلودہ و گمراہ نہ ہونے دیا جائے۔

(ہیبرٹ جرنل)

"معارف"

مذہب کیا ہے؟

(حکمائے مغرب کے خیالات)

جان سٹوارٹ مل کہتا ہے :-

خواہشات اور احساسات کی زبردست تحریک اور ان کا میلان بجانب ایک مکمل اعلیٰ ترین ہستی کے جسے نفس النفائس تسلیم کیا جائے اور جو خواہشات کی تمام اسفل ہستیوں سے منزہ و بالاتر ہو "مذہب" کا نچوڑ اور اس کی روح ہے"

پروفیسر میکس مُلر اپنی کتاب "ابتدائے مذاہب" میں لکھتا ہے :-

"مذہب وہ متحرک قوت ہے جس سے انسان لامحدود (خدا) کو پہچانتا ہے"

بینجمن کِڈ اپنی کتاب "سوشل ایوولیوشن" میں فرماتے ہیں :-

ایمان و یقین کی کوئی قسم "مذہب" نہیں کہلا سکتی جب تک کہ اس میں شخصی، اخلاقی و دینوی کے لئے "وراء البرہان" اجازت نہ پائی جائے،

جیمس مارٹینو اپنی کتاب "مطالعۂ مذہب" میں فرماتے ہیں -

"ایک حی و قیوم خدا پر یعنی ایک ایسے دماغ دانا اور علوی پر جو تمام کائنات پر حکمران ہے اور انسان سے اخلاقاً منسوب ہے، ایمان رکھنے کا نام "مذہب" ہے -

رومانس "مذہب کے متعلق چند خیالات" کے صفحہ ۴۱ پر رقمطراز ہیں :-

کوئی نظریہ جسے "مذہب" کے نام سے پکارا جا سکتا ہے اس کے اختصاصی خط و خال یہ ہیں کہ وہ اشیاء کے مصدر یا مصادر اولین کے متعلق بیان کرے اور پھر وہ اس مصدر اولین کو عقل کل - قائم بالذات اور ذاتی فطرت کہے "مذہب ورا العقل" یا "مذہب قانونِ فطرت" یا "مذہب اخلاق" وغیرہ وغیرہ کہنا جس میں کہ علتِ اولیٰ کی ذات متعین نہ ہو محض بے معنی ہے - ایسا ہی لایعنی جیسا کوئی "مربع مثلث" یا "دلالتِ استوا" کے متعلق کہے ؛

پادری جارج ہاجس حکیم الٰہیات امریکہ فرماتے ہیں -

"ایک نادیدہ طاقت (جو کائنات عالم و انسان پر ہر طرح حاوی و حکمران ہے) انہیں بناتی ہے اور ان کی پرورش کرتی ہے، کے احساس کا نام "مذہب" ہے اور پھر اسی نادیدہ طاقت کو اپنے اندر بھی محسوس کریں جو ہمارا "نفسِ حقیقی" ہے اور جو ہماری "ذاتِ طبعی" سے جدا ہے اور غیر فانی ہے "روحِ انسانی" اور "ذاتِ الٰہی" کے صحیح رشتے کے تعین کرنے کی کوشش کا نام "مذہب" ہے"۔

سیموئیل شلمان حکیم الٰہیات جو شہر نیویارک امریکہ میں جامعہ بیت ایل کے ربی ہیں - اور شریعت موسوی کے ایک رکنِ اعظم ہیں - فرماتے ہیں -

"مذہب میں دو عنصر ہیں انسان اور خدا - یہ ہر دو عناصر لاینفک ہیں اگر موخر الذکر (یعنی خدا) کو مٹا دیا جائے تو باقی جو رہ جائیگا وہ ایک "فلسفۂ زندگی" ہوگا نہ کہ "مذہب"۔

پروفیسر جان آگسٹس زین حکیم الٰہیات فرماتے ہیں :-

"یقیناً "مذہب" ایک ذاتی رشتہ ہے مخلوق و محکوم "انسان" اور خالق و آقا خدا کے درمیان - اس کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ انسان کا بے اختیارانہ و مجبورانہ اپنے آپ کو محکومی کے لئے خدا کے سپرد کر دینے کا نام "مذہب" ہے یعنی اس "ذاتِ علی الاطلاق و فوق الفطرت" کے سپرد کرنا جس کے دستِ نگر ہونے کا انسان کو احساس ہے اور جس کی قوی امداد کی ضرورت کو وہ محسوس کرتا ہے اور اسی ذات کو وہ اپنی تکمیل اور امن و انبساط کا سرچشمہ سمجھتا ہے -"

ڈاکٹر چارلس ایمن ڈیل ایم اے ایل ایل ڈی مذہب کے لغوی معنی یوں ارشاد فرماتے ہیں -

اس احساسِ تقدس کا نام "مذہب" ہے جو انسان کو حضرتِ باری تعالیٰ کا ہے۔ خدا کو موجود سمجھنا اس سے محبت کرنا اور اس کی اطاعت کرنا ہی مذہب ہے"

جان سپارگو اپنی کتاب "مارکسین سوشلزم" صفحہ ۳۴۲-۳۴۳ پر لکھتا ہے -

ہم مختصراً کہہ سکتے ہیں کہ انسان کا ایک اعلیٰ و بالا قوت خدا میں ایمان رکھنے اور اس کی پرستش کرنے اور اپنی زندگی کو اسی خدا کی مرضی یا خواہش یا احکام کے مطابق بسر کرنے کا نام "مذہب" ہے۔

چنانچہ اصولِ مذہب یہ ہیں :-

(ا) حاکم کائنات "خدا" پر ایمان لانا اور اس کی پرستش کرنا۔

(ب) اس بات پر ایمان لانا کہ انسان کی ایک روحانی ہستی یا روح بھی ہے جو ازلی ابدی و غیر فانی ہے

(ج) اس بات پر ایمان لانا کہ انسان کی انتہائی بہتری اور خوشی ابدی اور اخلاقی اسی میں ہے کہ وہ مرضی و منشائے خداوندی کے مطابق بسر کرے۔

(د) اس بات پر ایمان لانا کہ چونکہ "اخوتِ انسانی" "ربوبیتِ خداوندی" پر منحصر ہے اس لئے تمام انسانی بہتری و بہبودی ارادۂ خداوندی کے سامنے سرِ اطاعت خم کر دینے میں ہے"

"بنت البحر"

تھکے ماندے جہازران آہستہ آہستہ کشتیاں چلا رہے تھے۔
یکایک، سبز ساحل اور دوڑتی ہوئی موجوں کے درمیان
انہوں نے دیکھا۔
پیارے چہرے! بھرے بازو! گداز سینے!
ننھے ننھے سنہری تاروں سے لپٹے ہوئے!
ان کی آنکھیں خوف و حیرانی سے کھلی ہوئی تھیں،
کہ تیز موسیقی سمندری ہوا میں مل ہوئی آئی:-
"کہاں؟ کہاں جا رہے ہو؟ اے نوجوان جہازران!
نہ جاؤ! نہ بھاگو!
کہاں جا رہے ہو؟ —— دُور!
اونچے سبز میدانوں ——
پھول سے اَٹے ہوئے حسین ساحلوں ——
—— کو چھوڑ کر
جہاں دن رات ——
چشمے موجوں کو بلاتے ہیں!
جھرنے پہاڑوں سے دوڑ کر آتے ہیں!
اور وادی کی سبز گہرائیوں میں،
نقرئی، ارغوانی سیپیوں کو،
اپنی ٹھنڈک سے تر و تازہ کرتے ہیں!...
اور جہاں، دوب کے میدان میں،
سفید پھولوں کی چادر پھیلی ہوئی ہے!...
یہاں آؤ! یہاں آؤ!
اپنے بادبان لپیٹ لو!
یہاں آؤ! ہمارے پاس!
آؤ!...... کھیلو!
ہم تمام دن تمہیں اپنے گیت سنائیں گے!
جہازران اپنے بادبان لپیٹ لو!....
یہاں مسرت بخش وادیاں اور پہاڑ ہیں!
یہاں نسیم خوش خوش گاتی ہے!
یہاں موجوں پر چمکیلی کرنیں ناچتی ہیں!
اور قوسِ قزح بنتی ہے!.....
آؤ! یہاں آؤ! دیکھو،
کیسے قوسِ قزح موجوں اور ریت کے ذرات پر دوڑتی ہے!
آؤ! تمہاری آمد مبارک ہوگی!
آؤ! ہمارے آقا بنو،
ہم تمہاری دلہنیں بنیں گے!
ہمارے سرخ ہونٹوں کے شیریں بوسے لو!
ہماری سریلی باتیں سنو!
آہ! سنو! سنو! ——
تمہارے دل دھڑک اٹھیں گے،
خوشی، محبت اور انبساط سے!.....
آہ! سنو! سنو! ——
تمہاری آنکھیں چمک اٹھیں گی،
جب نقرئی تاروں کی جھنکار
ہوا میں بلند ہوگی! ——
تمہیں ایسا ساحل کہاں ملے گا؟......
....
کہاں جا رہے ہو؟ سنو! ٹھہرو!
"جہازران! جہازران!
نہ بھاگو............"

تمنائی

روسی

جُدائی

میں جوانی کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا کہ اتنے میں مجھے ایک نوجوان خوبصورت لڑکی انہی سیڑھیوں پر چڑھتی ہوئی ملی اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے اس کی جانب۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں اور بے خود ہو کر رہ گئیں۔

وہ بے حد خوبرو تھی - گلاب کا پھول اور شفق کا رنگ دونوں اس کے سامنے حقیر تھے +

سرو شرمندہ تھا، نرگس پانی پانی تھی - چاندہم کو چھپ چھپ کر دیکھنے لگا +

اس کی شوخ آنکھیں محبت سے لبریز اور اس کا خوبصورت چہرہ گویا حسن و جمال کی دنیا +

آخر ایک مقام آگیا جہاں میں اس کا ساتھ نہ دے سکا - وطن کی خدمت کرنے کے جرم میں مجھے جلا وطنی کی سزا دی گئی - اب میں اپنے وطن مالوف کو خیرباد کہنے کو تھا +

جدائی کی گھڑی نازک ہوتی ہے +

میں نے کہا "میری پیاری - خدا حافظ! اب ہم جدا ہوتے ہیں - اگر خدا نے ملایا تو پھر ملیں گے......؟

یہ سنتے ہی اس کا چہرہ زرد پڑ گیا - وہ سخت بے قرار ہوگئی اس کے چہرے پر افسردگی چھاگئی - وہ رونے لگی اور جھپٹ میرے پاؤں پر گر پڑی - اس کی سسکیاں فضا میں پریشان ہوگئیں - میں باچشم نم اس سے رخصت ہوا - مگر آج تک فضاؤں میں یہ آواز سنتا ہوں :-

ابھی نہ جاؤ ——— ابھی نہ جاؤ ——— مجھے بھی لے چلو +

ا - س - اقبال

خنجر

مجھے تجھ سے محبت ہے ——— اے میرے آہنی خنجر!
اے میرے رفیق! سرد اور چمکیلے!!
غمناک جدائی کے موقع پر
جب دستِ نازک نے تجھے بطور تحفہ پیش کیا
صرف اسی وقت خون کی سرخ بوندوں کی بجائے
تیری دھار پر چمکتا ہوا آنسو ——— الفت کا بے بہا موتی نظر آیا
مجھ پر جمی ہوئی سی شرمگیں آنکھیں
ایک پوشیدہ غم میں ڈوبی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں +

جیسے تیرا پھل شعلوں کی سرخ زبانوں سے کھیل رہا ہو ———
وہ شعلے جو کبھی مغموم تاریکی سے نکل کر پھر بھڑک اٹھتے ہوں -
محبت کے پیمانِ خاموش!
غم آفریں زندگی کو خوشتر بنانے والے!
ایک جہاں گرد کے لئے مشعلِ راہ!
روحانی قوت! میں تجھے ہرگز دھوکا نہ دوں گا
بلکہ تیری طرح زندگی بسر کروں گا ——— اے میرے خنجر!!

(رمنتوف) سعادت

اردو

وادیٔ پنہاں

وقت کے دریا میں اُٹھی تھی ابھی پہلی ہی لہر
چند انسانوں نے لی اک وادیٔ پنہاں کی راہ؛
مل گئی آغوشِ رحمت میں پناہ
کر لیا تعمیر اک موسیقی و عشرت کا شہر!
مشرق و مغرب کے پار
زندگی اور موت کی فرسودہ راہوں سے دُور؛
جس جگہ سے آسماں کا قافلہ لیتا ہے نور،
جس جگہ ہر صبح کو ملتا ہے ایمائے ظہور،

اور بنے جاتے ہیں راتوں کے لئے خوابوں کے تار!
سیکھتی ہے جس جگہ پرواز حور،
اور فرشتوں کو جہاں ملتا ہے آہنگ سُرود،
غم نصیب اہرمنوں کو گریہ و آہ و فغاں!
گم شدہ، آوارہ انسانوں کی بستی ہے وہاں!
کاش بتلا دے کوئی،
مجھ کو بھی اس وادیٔ پنہاں کی راہ!
مجھ کو بھی ان کی طرح حسن و مسرت کی تلاش!

زندگی کے تازہ جولاں گاہ کی !
کوئی لے جائے مجھے،
اس جہاں کے کہنہ آہنگِ مسلسل کے پرے،
سرزمینِ زیست کی افسردہ محفل سے پرے،
دیکھ لے اک بار کاش،
اُس جہاں کا منظرِ رنگیں، نگاہ
جس جگہ ہے قہقہوں کا اک درخشندہ وفور،
جس جگہ سے آسماں کا قافلہ لیتا ہے نور
جس کی رفعت دیکھ کر خود ہمت یزداں ہے چور
جس جگہ ہے وقت اک پیہم سرود
(منتشر ہوتا نہیں اس زندگی کا تار و پود!)
اور جہاں اہرمنوں کا بھی نہیں کچھ اختیار،
مشرق و مغرب کے پار

(ن۔ م۔ راشد)

"ہمایوں"

خدا کا نوشتہ

خدا نے لکھ دیا ہے:-
اُس پھول پر جو ہوا کو خوشبو کی دلاویزی دیتا ہے
اُس بادِ سحر پر جو پھولوں سے لدی ہوئی شاخ کو ٹھوکے دیتی ہے
اُس قطرۂ باراں پر جو سیپ کے سینے پر مچل کر موتی بنتا ہے
اُس گوہرِ شبنم پر جو گھاس کی پتی پر تھرکتا ہے
اس چادرِ آب پر جو شعاع کی جھلمل جھلمل سے چمکتی ہے
اُس بانسی ہار پر جو شبِ عشرت کی یادگار رہنے کے لئے اپنی بہار کھوتا ہے
اس شعاعِ آفتاب پر جو غریب کی کٹیا اور امیر کے دو محلے کو یکساں نوازتی ہے
خدا نے ان سب پر لکھ دیا ہے:........ خدا نے ان سب پر لکھ دیا ہے........ یہی کہ.....
اس دنیا میں کوئی شخص صرف اپنے لئے زندہ نہیں رہ سکتا۔

"زمانہ"

کیفیات

آنسو۔ جذبات کے سامنے اعترافِ شکست کا اظہار
قہقہہ۔ اگر اضطراری ہے تو احساسِ تفوق کا ناقابلِ برداشت اثر اور اگر ارادی ہے تو کسی شدید غم کو دبانے کی ناکام کوشش جو دل کو مضطرب تڑپنا دیتی ہے۔
غصہ۔ کسی غلطی کے انتباہ پر احساسِ خودداری کی پُر درد چیخ اور غرور بیجا کی شکست کا پُرشور اعلان۔
سوچنا۔ دنیائے احساس سے گریز کی کوشش۔ اپنے نفس سے رسم دوستی یا میدانِ عمل سے بھاگ کر قلعۂ ہوائی میں پناہ لینی۔
خندہ پیشانی۔ دوسروں کو مغالطہ میں ڈالنے کی کوشش بیجا جس سے ہر شخص واقف ہوتا ہے، مگر بوقتِ اظہار اس کا احساس نہیں ہوتا کہ اس سے اتنا ہی واقف ہے۔
شعر۔ کسی شدید جذبہ کے دب جانے سے مجبور ہو کر دوسری لطیف صورت سے اظہار۔
خوشی۔ طمانیتِ قلب کا دوسرا نام ہے۔ یہی حاصلِ زندگی ہے۔
عشرت۔ غم کو بہلانے کا خوشگوار لیکن غلط طریقہ۔ اس کو عارضی خوشی بھی کہہ سکتے ہیں۔
غم۔ خوشی کو عشرت پر قربان کر کے کھو دینے کا احساسِ ملامت جو خوشی کی طرح پائدار ہے۔
ہمدردی۔ اپنی ذات کو دوسرے کی ذات میں مخلوط کر کے سبب معنی افسوس، زیادہ تر یہ دھوکا دینے کا آلہ ہے۔
دوستی۔ اپنی کمزوری کا سہارا۔ جذبۂ افسوس کے اظہار کا موقع، اور اپنی ناشکورسی کی قدر دانی کا آئینہ۔

یار باشی۔ تنہائی میں ضمیر کے نشتر سے محفوظ کرنے والی سپر۔ رشک و رقابت کا خلوص و ہمدردی کے پیرایہ میں اظہار۔ یہ عشرت کی ایک قسم ہے۔

گانا بجانا۔ عارضی شور و شغب اور ہنگامہ سے ضمیر کی ملامت کرنے والی آواز گم کرنے کی کوشش۔

گنگنانا۔ دبے ہوئے جذبات کا لطیف اظہار، حسرت و مایوسی کا اپنے نفس سے اعتراف۔ یا جذبۂ جنسی کے سمجھ میں نہ آنے والے جوش کا لطیف پیرایہ میں اظہار۔

سید وصی رضا، بی اے

ہندی

آنسو

آنسو!......

ہاں! ہاں تم ہو! تمہارا پریتم کی یاد میں نکلنا اچھا ہی ہے کیا کہوں پریتم ملن کی امید میں ہی دل کی آنکھیں اتنی دیر تک تمہیں اپنی پلکوں میں چھپائے رہیں۔ کس امید پر — صرف پریتم ملن کی امید پر — کیوں ٹھیک ہے نا دل میں طرح طرح کی امیدیں دکھا کر تمہیں ڈھارس بندھائی پھر کیا ہوا! پریتم نے آہستہ سے پکارا۔ "پیا"... ری! امیدیں ایک دم نہ معلوم کہاں غائب ہو گئیں۔ میں نے اپنا سر اس کی گود میں رکھ دیا۔ آنکھیں بھی دل میں بند ہو گئیں۔ بیتابی نے اپنی طاقت کھو دی۔

آہ پھر کیا تھا۔ تمہارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ رہی۔ بہت دنوں سے تم یہ موقع تلاش کر رہے تھے۔ ایک دم پلکوں سے باہر ہو کر گالوں کو چومتے ہوئے چھاتی پر گرنے لگے۔ دل مسرت خیز غم سے کانپ اٹھا۔

دل کے مالک نے تمہیں اپنے دامن سے پونچھتے ہوئے باریک آواز میں کہا۔ پیاری......

میں بھی کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اپنے دل کی تکلیف کو ان سے بانٹنا چاہتی تھی، لیکن ہوا کیا؟ کچھ بھی نہ کہنے پائی تھی کہ آنسوؤں کی جھڑی چھم چھم برسنے لگی——

ان کے قدم چھونے سے بھی محروم رہ گئی۔ امیدوں پر پانی پھر گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ دل نے پکارا "ظالم" اس کے جواب میں آنسو بولے...... "بے وقوف! ہاں ٹھیک"...... کائنات کے معصوم دل نے بھی آنسو بہاتے ہوئے پکارا...... "بے وقوف"......

(سید شرف الحسن آروی)

عورت

۱۔ اے قدرت کاملہ! خدا کے بعد ہمیں تیری ہی پرستش کرنی چاہیے ہم تیرے ہی احسان مند اور رہین منت ہیں۔ خدا نے ہمیں زندگی بخشی اور تو نے ہمیں زندہ کیا۔

(ڈیوڈمی)

۲۔ بلند خیال عورت مرد کی زندگی کا پروردگار ہوتی ہے (ہنری ونسنٹ)

۳۔ عورت کی ایک چمکتی ہوئی نظر ہمارے مستعار اور مستبد قوانین سے زیادہ طاقتور اور اس کا ایک قطرہ اشک ہمارے بسیط مباحثے سے قوی تر ہے۔

(ٹامسن)

۴۔ عورت کا حسن جس میں کہ ترحم کی ایک نظر میرے دل کے جذبات میں تلاطم برپا کر دیتی ہے۔

(شکسپیئر)

۵۔ میں زندگی سے کبھی لطف اندوز نہیں ہوا۔ ہاں مجھے یاد ہے ایک بار اور وہ اس وقت جبکہ ایک محبت نواز اور ایک نیک دل عورت نے اپنے حسین اور پاکیزہ الفاظ میں میری ہمت افزائی کی۔

([illegible])

۶۔ [illegible]

۷۔ [illegible] ہے۔

([illegible] فضل اللہ)

فہرستِ مضامین "ادبی دُنیا"

بابت ماہِ جولائی ۱۹۳۴ء

جلد ۱۰ — تصاویر — نمبر ۴

(۱) دین و دُنیا ——— (۲) بہن بھائی

سالانہ چندہ چار روپے سات آنے مع محصولِ ڈاک اور وی پی نو آنے کل پانچ روپے ممالکِ غیر سے دس شلنگ

بزمِ ادب

صلائے عام

سید علی منظور صاحب حیدرآباد دکن سے تحریر فرماتے ہیں:۔

ادب نواز! میں آپ کی بالغ نظری کا ایک زمانے سے قائل ہوں۔ "دورِ جاہلیت" کیا بھلایا جاسکتا ہے؟ اب تو آپ ادبی دنیا کے مالک ہیں، علم و ادب کی خدمت کیجئے میں ہی نہیں ہزاروں آپکی صلائے عام کے منتظر ہیں۔ ارشاد ہو کہ دعوت کا انتظام آپنے کس پیمانے پر کیا ہے؟ فرمائیے یہ بازاری پرچے یعنی تجارتی پرچے کب تک فروغ پاتے رہینگے۔ پیر و مرشد ادبی دنیا بھیجئے اور ضرور بھیجئے مگر بذریعۂ وی پی۔ مفت میں قبول نہیں کروں گا۔

ہماری بلاغتِ نظر کے متعلق سید صاحب نے جس حسنِ ظن کا اظہار فرمایا اور ادبی دنیا کی قلمی اور مالی اعانت میں جس فیاضی سے حصہ لیا، ہم اس کے لئے اُن کے تہ دل سے ممنون ہیں، انہوں نے یکمشت اپنی متعدد نظمیں اور بہت سی رباعیات ہمیں بھیجی ہیں جو وقتاً فوقتاً ادبی دنیا میں شائع ہوتی رہیں گی، ہمیں یہ سن کر خوشی ہوئی کہ سید صاحب ایسے ہزاروں نکتہ دان اصحاب ادبی دنیا کی صلائے عام کے منتظر ہیں۔ رہا یہ سوال کہ ہم نے دعوت کا انتظام کس پیمانے پر کیا ہے؟ تو اس کا جواب ہماری طرف سے یہ ہے کہ

کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

ایسے مہمان جو خود میزبان کو اپنی حکمت و بصیرت کی شراب سے چھکا جائیں کیا اس کے لئے کچھ کم برکت و سعادت کا موجب ہوں گے۔ لیکن اس سے پہلے بھی ادبی دنیا کے صفحات کسی خاص طبقے کے لئے مخصوص نہیں ہیں اس کے قلمی معاونین کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ ایک طرف اس میں ہندوستان کے وہ مشہور ادیب لکھتے ہیں جن کی فضیلت مسلم ہے۔ اور دوسری طرف یہ اُن حضرات کو بھی نہیں چھوڑتا، جو اپنے جوہرِ قابل کو سینوں میں چھپا چھپا کر رکھنے کے عادی ہیں۔ انہیں قارونیوں میں سے ایک ہمارے دوست حمدی صاحب ہیں جن کا ذوق نہایت سلیم واقع ہوا ہے۔ اور جو بیسیوں کسی انگریزی چیز کو اس طرح اپناتے ہیں کہ اس میں اجنبیت نام کو بھی باقی نہیں رہتی۔ ایک اور صاحب ہیں حضرتِ کامران ایم۔ اے۔ ان کا ایک مضمون "لائبریری" اس مہینے کے پرچے میں شائع ہوا ہے۔ ناظرین اسے پڑھ کر خود محسوس کریں گے کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے مزاح نویس ہیں۔ ان کے پاس اس قسم کے کئی مضامین لکھے پڑے ہیں اور ہیں بھی غالباً ادبی دنیا کے لئے، لیکن اگر ہم اِن سے کہیں کہ صاحب وہ سب مضامین ہمیں دیجئے تو یقین جانئے کہ وہ کبھی ایسا ذکر کریں گے لیکن ان کے برخلاف جملۂ معترضہ کے طور پر حضرتِ قدم ہیں جو اپنی رو غیر مطبوعہ بیاضیں "ادبی دنیا" کو دیکر نئی نظمیں بھی بھیجتے رہتے ہیں، اور آپ دیکھتے ہیں کہ اُن کی نادر ترکیبیں، اُن کی اچھوتی تشبیہیں، اُن کا الوکھا تخیل اپنا جواب نہیں رکھتا۔ ایسے ہی خانہ براندازوں میں سے حضرتِ کلیم ایم۔ اے۔ ہیں جنہوں نے اگرچہ

انگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

کہہ کر کچھ عرصہ کے لئے مضمون نگاری سے رخصت حاصل کر لی تھی، مگر اب ہم نے اُن کی یہ رخصت منسوخ کر دی ہے اور آئندہ پرچے کے لئے اُنہیں ضرور کچھ نہ کچھ لکھنا پڑیگا۔ پھر حضرتِ نسیم رضوانی ہیں جنہیں ہم شمار تو فیاضوں کے زمرے میں کرینگے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہیں گے کہ قبلہ دو پرچے آپ کے مضمون کے بغیر شائع ہو گئے۔ اور وہ مضمون جو آپ نے بھیجے تھے ہم نے سالنامے کے لئے محفوظ کر لیا ہے۔

جملۂ معترضہ تو ختم ہو گیا لیکن اب اصل موضوع کی طرف کیسے متوجہ ہوں کہ مجھے بھائی شاہد کی "نگاہِ اوّلین" بلکہ نگاہِ التفات کا شکریہ بھی ادا کرنا ہے۔ جون کے "ساقی" میں اُنہوں نے لکھا ہے:۔

لاہور کے مشہور رسالے ادبی دنیا نے منصور احمد کی ادارت میں لائقِ رشک ترقی کی ہے (خدا نظرِ بد سے بچائے) دسویں جلد کا آغاز بڑی تقطیع سے ہوا ہے اور مضامین کے اعتبار سے بھی اپریل کا پرچہ گزشتہ پرچوں پر نمایاں فوقیت رکھتا ہے۔ اس سائز کے ۹۴ صفحات کو سابقہ سائز کے ۱۴۰ صفحات کے برابر سمجھنا چاہئے۔ جن حضرات کو بہترین جدید لٹریچر کا شوق ہے ادبی دنیا کے مستقل خریدار بن کر کوڑیوں کے مول اُسے حاصل کر سکتے ہیں۔

ادبی دنیا کے متعلق یہ ایک ایسے مبصر کی رائے ہے کہ اگر کہا جائے کہ جدید ہندوستانی ادیب نے اُسی کے گھر میں جنم لیا تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ "ساقی" کے ذریعے سے وہ اردو ادب کی جو گراں پایہ خدمت انجام دے رہے ہیں اس کی نظیر ہمیں دوسرے رسائل میں بہت کم ملتی ہے۔ عام نمبروں کے علاوہ سال بھر میں وہ تین چار خاص نمبر نکالتے ہیں اور یہ خاص نمبر محض اچھے مضامین کے مجموعے نہیں ہوتے بلکہ ان میں حقیقتاً کوئی خصوصیت ہوتی ہے جولائی کا "ساقی" افسانہ نمبر ہے اور اس میں اُنہوں نے ایک ہی پلاٹ پر بارہ مشہور ادیبوں سے افسانے لکھوائے ہیں، ہر ادیب کے مختلف اسلوبِ بیان اور کردار نگاری میں مختلف نقطۂ نظر نے ان بارہ افسانوں میں ایک ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے جو نہ صرف تفریح کی حیثیت سے قابلِ تعریف ہے بلکہ اسلوب اور کردار کا مطالعہ کرنے والوں کیلئے علمی حیثیت سے بھی بہت مفید ثابت ہوگی ان بارہ افسانوں کے علاوہ چھ اور بلند پایہ اور دلچسپ افسانے اس نمبر کی زینت ہیں۔

منصور احمد

آئینۂ عالم

تعلیم اور حیدر آباد دکن

عثمانیہ یونیورسٹی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز

عثمانیہ یونیورسٹی جو ہندوستان بھر میں اپنی قسم کی تنہا یونیورسٹی ہے جہاں کلیتہً ایک دیسی زبان یعنی اردو میں تعلیم دی جاتی ہے اپنی ہنگامہ خیز زندگی کے سولہ سال پورے کر چکی ہے چند روز ہوئے اعلیحضرت نظام نے حیدر آباد سے چند میل کے فاصلہ پر اڈی کامٹ میں اس کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھ کر اس کی تاریخ میں ایک نئے اور عظیم الشان باب کا اضافہ کیا ہے۔

اب تک یونیورسٹی کو اپنے کام میں جو کامیابی ہوئی اس کا ذکر ڈاکٹر ٹیگور کے الفاظ میں کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ حال ہی میں جب وہ حیدر آباد تشریف لے گئے تو انہوں نے طلبہ کے ایک مجمعِ عظیم کے سامنے کہا: "مجھے اس امر کا اقرار کرنا چاہیئے کہ جب اعلیٰ حضرت نظام کی حکومت کی طرف سے اس یونیورسٹی کے قیام کی تجویز کی گئی اور اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا گیا تو ماہرینِ تعلیم کی اس کثیر جماعت میں سے جنہیں اس یونیورسٹی کی کامیابی میں شک تھا ایک میں بھی تھا۔ مگر سر اکبر حیدری نے جنہیں میں اس یونیورسٹی کا [illegible] کہوں گا، اس یاس انگیز مخالفت کے باوجود ہمت نہ ہاری اور اپنی تجویز کو بروئے کار لانے کے لئے سرگرمِ عمل رہے چنانچہ میں آج یہ کہنے میں خوشی محسوس کرتا ہوں کہ یہ یونیورسٹی کامیابی کی ایک عظیم الشان مثال ہے۔ میں آپ کی یونیورسٹی کی عملی ترقی کا مطالعہ ابتدا ہی سے نہایت دلچسپی کے ساتھ کرتا رہا ہوں اور آج میں سر اکبر حیدری کو اس عظیم کامیابی پر تہِ دل سے مبارک باد دیتا ہوں جو انہیں ایک ایسے جرأت آزما تجربے میں حاصل ہوئی ہے۔"

لیکن اس عرصے میں یونیورسٹی کو بہت سی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا جن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنی عمارت سے محروم تھی۔ یونیورسٹی کے مختلف شعبے کرائے کے مختلف مکانوں میں قائم ہیں جن پر سالانہ ایک لاکھ روپیہ صرف ہو جاتا ہے۔ یہ مکان شہر کے مختلف حصوں میں واقع ہیں اور اس لئے طلباء اور اساتذہ کو تعلیم و تعلم میں کئی دقتیں پیش آتی ہیں۔

جس عمارت کا سنگِ بنیاد حضورِ نظام نے رکھا ہے وہ ایک اقامتی یونیورسٹی ہے اور وہ ہندوستان میں اپنی قسم کی پہلی یونیورسٹی ہوگی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس پر کئی کروڑ روپیہ صرف ہو جائے گا۔

اس کے بانیوں کا خیال ہے کہ جب یہ تیار ہو جائے گی تو ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اس کی نظیر نہیں مل سکے گی بلکہ صرف دنیا کی مشہور یونیورسٹیاں آکسفورڈ، کیمبرج، پرنس ٹون اور ہارورڈ اس کا مقابلہ کر سکیں گی کیونکہ حیدر آباد کے دو بہترین انجینیر مسٹر علی رضا سپرنٹنڈنگ انجینیر اور نواب زین یار جنگ شاہی آرکیٹکٹ نے یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں کی ساخت، لوازمات اور سازو سامان کا مشاہدہ کرنے کے بعد اس یونیورسٹی کی تعمیر کا کام شروع کیا ہے۔

اڈی کامٹ میں یونیورسٹی کی عمارات ڈیڑھ ہزار ایکڑ زمین میں ہندی اسلامی طرز پر تعمیر کی جائیں گی۔ اس میں اس برہمنی طرزِ تعمیر کی آمیزش بھی ہوگی جس کے لئے ایلورا اور اجنٹا کے غار مشہور ہیں۔ ان عمارات میں ان تمام ادبیات و علوم کے شعبے قائم کئے جائیں گے جن میں ہندوستانی اور یورپی زبانیں، قانون، دینیات، تاریخ، فلسفہ، معقولیات، کلاسکس، کیمیا، طبیعیات، ریاضیات، معاشیات اور انجینیرنگ شامل ہیں۔

توقع کی جاتی ہے کہ کچھ عرصے کے بعد فنونِ لطیفہ کا ایک شعبہ بھی قائم کیا

جائے گا جس میں سر اکبر حیدری بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ جنگلات اور زراعت کے کالج اور خواتین کے لئے ایک کالج اور اقامت خانہ بھی تعمیر کیا جائے گا۔

یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں کا نہایت غائر نظر سے مطالعہ کیا گیا ہے اور جو چیزیں وہاں دیکھی گئی ہیں انہیں یونیورسٹی کی مجوزہ عمارت کے نقشے میں شامل کیا گیا ہے۔ سینٹ ہال، انتظامی دفاتر اور لائبریری مرکز میں بنیں گے۔

دارالترجمہ، مطبع، بوٹنیکل گارڈنز، تالاب، عجائب خانہ، بازار، وائس چانسلر اور پروفیسروں کے بنگلے اور دوسرے عملے کے مکانات تعلیمی عمارت کے علاوہ ہوں گے۔

فی الحال اس سکیم کے لئے حکومت کی طرف سے ستر لاکھ روپیہ منظور ہوا ہے اور گزشتہ مارچ سے کام شروع کر دیا گیا ہے۔ دس لاکھ روپیہ اُن عارضی عمارات پر صرف ہوگا جن میں موجودہ شعبہ ہائے تعلیم منتقل کئے جائیں گے۔ اور جو آئندہ ستمبر تک مکمل ہو جائیں گی۔ باقی روپے سے یونیورسٹی کی حدود کے اندر سڑکیں اور روشیں بنائی جائیں گی۔ پانی کے نل لگائے جائیں گے۔ پانی کے نکاس کے لئے نالیاں بنیں گی۔ بجلی کا انتظام کیا جائے گا۔ اور ایک آرٹس کالج تعمیر ہوگا جس پر ستائیس لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ پانچ سو طلبہ کے لئے اقامت خانے بھی زیرِ تعمیر ہیں۔

فی الحال کُل اراضی یعنی ڈیڑھ ہزار ایکڑ میں سے صرف چھ سو ایکڑ پر کام کی ابتدا کی گئی ہے۔

درسی کتابوں کے طریقِ انتخاب میں تبدیلی

پنجاب ٹیکسٹ بُک انکوائری کمیٹی نے ایسی تجاویز پیش کی ہیں کہ درسی کتابوں کے طریقِ انتخاب میں ان سے ایک انقلاب انگیز تبدیلی پیدا ہو جائیگی ۳۱ مارچ ۱۹۳۷ء سے وہ کئی سو کتابیں جو اس وقت پنجاب کے مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں، نئی تجاویز کے مطابق نصابِ تعلیم نہ رہیں گی۔ اُن کی جگہ نئی کتابیں لے لیں گی جو اس اثنا میں تیار ہو رہی ہیں۔

مصنفین اور ناشرین وقتاً فوقتاً کسی خاص جماعت یا جماعتوں کے لئے کتابیں یا کتابوں کے سلسلے تیار کر کے پیش کرتے رہیں گے مثلاً مڈل کی تین جماعتوں کے لئے تاریخ ہند کی تین کتابوں کا ایک سلسلہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

یہ کتابیں دو نقادوں کو بھیج دی جائیں گی جن کا انتخاب قطعی سمجھا جائیگا۔ اگر ان دو میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اس صورت میں ایک تیسرے شخص سے رائے لے لی جائے گی۔

ہر جماعت کے لئے ہر مضمون پر پانچ متبادل کتابیں یا کتابوں کے سلسلے منتخب کئے جائیں گے۔ اور ہیڈ ماسٹر کو اختیار ہوگا کہ اُن میں سے کوئی سی کتابیں چُن لے۔

کتابوں کے ہر سٹ کی طباعت و اشاعت کا اجارہ ایک ہی ناشر کو دیا جائے گا تاکہ کوئی ناشر کسی ہیڈ ماسٹر کے پاس کسی خاص کتاب کو بیچنے کی تحریص محسوس نہ کرے۔

کتابوں کے ہر سٹ کا اجارہ سب سے زیادہ معاوضہ دینے والے ناشر کو ملے گا محکمۂ تعلیمات کی ٹیکسٹ بُک کمیٹی اپنے مصارف کے لئے اس میں سے تھوڑی سی رقم رکھ کر باقی روپیہ اُن مصنفین کے درمیان برابر برابر تقسیم کر دے گی جن کی کتابیں اس سٹ میں شامل ہوں گی۔ گویا اگر کوئی ہیڈ ماسٹر ایک کتاب کی بجائے دوسری کتاب اپنے مدرسے کے لئے انتخاب کرے تو اُس کا اثر نہ تو اُس اجارہ دار پر پڑے گا جو اس کتاب کو بیچتا ہے نہ ان میں سے کسی پر جو اس سٹ کی دوسری کتابوں کے مصنفین ہیں۔

تحقیقاتی کمیٹی کے اکثر ارکان نے محسوس کیا ہے کہ دیانت دار نقاد حاصل کرنے میں مشکل پیش آئے گی۔ کیونکہ ناشر کے نقطۂ نظر سے جو اپنی کتاب منظوری کے لئے پیش کرتا ہے مجوزہ سکیم کے ماتحت ہر بات کا انحصار اُس رائے پر ہے جو ایک نقاد اس کی کتاب کے متعلق قائم کرتا ہے چنانچہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ہر کتاب کے دو نقادوں میں سے ایک پنجابی ہو اور دوسرا غیر پنجابی۔ لیکن یہ اہم سوال کہ ہر کتاب کے لئے نقادوں کا انتخاب کون کرے حل نہ ہو سکا

پیرس میں بین الاقوامی انجمنِ خواتین کے اجلاس

۲؍ جولائی کو پیرس میں بین الاقوامی انجمن خواتین کا جلسہ منعقد ہوا جس میں دنیا بھر کی عورتوں اور بچوں کے مفادات کے اہم مسائل پر بحث کی گئی۔ یہ انجمن جس کی بنیاد ۱۹۰۴ء میں رکھی گئی، اُس وقت سے لے کر اب تک اُن معاشرتی، اقتصادی اور قانونی مشکلات کو دور کرنے کے لئے مسلسل کام کر رہی ہے جو عورتوں کی ترقی کی راہ میں سدِ راہ بنی رہی ہیں۔ اس انجمن نے

وہ دن بھی دیکھے ہیں جب عورتوں کو گھروں کے اندر بند رکھا جاتا تھا، جہاں وہ جہالت اور اوہام پرستی میں گرفتار رہتی تھیں اور جنگ کے بعد کا وہ "روشن زمانہ" بھی دیکھا ہے جب عورتیں قومی اور ملکی کاموں میں شریک ہوئیں اور انہوں نے ہر شعبۂ زندگی میں مردوں کے برابر اپنے حقوق کا مطالبہ کیا۔ بیداری کی اس جد وجہد کا سہرا کلیۃً بین الاقوامی انجمن کے سر ہے اور اب مختلف اقوام کی چالیس نسوانی انجمنیں اس کے ساتھ ملحق ہیں جن کی رکنیت دنیا کی چار کروڑ خواتین پر مشتمل ہے۔

بین الاقوامی انجمن کا صدر مقام اب پیرس میں ہے اور ۲ر جولائی سے لے کر ۱۲ر جولائی تک اس کے اجلاس ہوں گے۔ متعدد بین الاقوامی انجمنیں ان اجلاسوں میں اپنے نمائندے بھیج کر شریک ہو رہی ہیں۔ مثلاً انجمنِ اقوام، بین الاقوامی ادارۂ عمال اور انجمنِ اتحادِ خیال۔

قومی انجمنِ خواتینِ ہند کی طرف سے جو بین الاقوامی انجمنِ خواتین کے ساتھ شامل ہے، بمبئی کی یہ چار خواتین نمائندگی کر رہی ہیں۔ مسز مانک لال پریم چند، مسز نگرکار، مسز کرپالنی اور مسز واہ۔ مختلف صوبجاتی انجمنوں کی نمائندہ خواتین بھی شریک ہو رہی ہیں۔

دس دن کا پروگرام رسمی استقبال، عام جلسوں، مجلسِ منتظمہ کے جلسوں اور خاص خاص تعلیمی، معاشرتی اور صنعتی ادارات کی سیر پر مشتمل ہوگا۔ ۵ر جولائی کے دن بلدیۂ پیرس کی طرف سے بیرونی نمائندوں کا استقبال کیا جائے گا۔ اس کے بعد کچھ اور سرکاری استقبال ہوں گے اور ۱۱ر جولائی کو قومی انجمنِ خواتینِ فرانس کی طرف سے الوداعی دعوت دی جائے گی۔

جلسوں کے دوران میں تین عام اجلاس بھی ہوں گے۔ ان میں دنیا کی ترقی اور امن کی اہمیت پر تقریریں ہوں گی۔ ان کے موضوع اس قسم کے ہوں گے۔ امن اور اطمینانِ اجتماعی، امن بذریعۂ تعلیم، سینما اور عوام پر اس کا اثر، اخبارات کا ذہنیتِ عامہ پر اثر۔ عورتوں کو کام کرنے کا حق، دیسی نسلوں میں مردوں، عورتوں اور بچوں کے انفرادی حقوق۔ جن میں بیوی کو گرو رکھنے، متبنیٰ کرنے، شادی بیاہ کی رسوم اور غلامی پر خاص طور سے بحث کی جائیگی

ان سب مسائل میں سے عورتوں کو کام کرنے کے استحقاق کا مسئلہ جنسِ لطیف کے لئے سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ بعض ممالک میں عورتوں کو کام سے روکنے کی غیر مستحسن کوششیں ہو رہی ہیں اور یہ کوششیں صریح مخالفت ہے اس اصول کی کہ کام انسان کی عزت اور آزادی کے لئے ایک لازمی چیز ہے۔

بین الاقوامی انجمنِ خواتین نے اس اصول کی حفاظت کے لئے اس کی پابندی کی نگرانی کے لئے اور جو اثر انہیں حاصل ہے اس کی تمام قوت کے ساتھ ان پابندیوں کی مخالفت کرنے کے لئے جو عورتوں کے حقوق پر عائد کی جائیں، خصوصاً شادی شدہ عورتوں کے کاروبار یا ملازمت اختیار کرنے کے حق کی حفاظت کے لئے تمام اقوام کی نسوانی انجمنوں کو دعوت دی ہے۔

مذکورہ بالا رجعت پسندانہ کوششوں کے خلاف احتجاج کے طور پر اپنی آواز بلند کرنے کی غرض سے عورتیں پیرس کے بازاروں میں جلوس کی شکل میں گزریں گی۔

کیا تمدنِ جدید کا گہوارہ ایران ہے؟

حال ہی میں ملکِ ایران میں جو اکتشافات ہوئے ہیں اُن سے اس امر کا امکان پیدا ہو گیا ہے کہ ہمارے موجودہ تمدن کا آغاز اُس تمدن سے ہوا جو دورہا دور گزرے قدیم ایران میں پیدا ہوا تھا۔

انسٹیٹیوٹ آف پرشین آرٹ اینڈ آرکی ٹیکچر کے صدر فرینکلن ماٹ گنٹر کہتے ہیں کہ عراقِ عرب کے قدیم ادب سے اس بات کا زبردست ثبوت ملتا ہے کہ عراقِ عرب کا تمدن مشرق سے یہاں آیا تھا۔ یہ سب جانتے ہیں کہ مصری تمدن نے ارتقا کی منازل طے نہیں کی تھیں۔ یہ یکایک ایک نہایت اعلیٰ اور آراستہ شکل میں نمودار ہوا تھا۔ اس لئے یہ بھی ضرور کسی دوسری جگہ سے آیا ہوگا۔ اس کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ گاتھی آرٹ کے بہت سے خط و خال مثلاً نوکدار محراب، زینہ نما پشتہ اور بہت سی دوسری مخصوص شکلیں قدیم ایرانی تعمیرات سے مستعار لی گئی تھیں۔

اسی غرض سے ہماری انجمن ایرانی تہذیب کی تحقیقات کا کام کر رہی ہے جو حفریات کا ذوق رکھنے والوں کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ۱۹۳۰ء سے اب تک جو اکتشافات ہوئے ہیں ان سے بہت سے امور پر روشنی پڑتی ہے ۱۹۳۰ء سے پہلے امریکن ایران میں بہت تھوڑا کام کر سکتے تھے کیونکہ کھدائی کا اجارہ اُس وقت تنہا فرانسیسیوں کے پاس تھا۔ اب ہم نے ایک قدیم ساسانی شہر اور محل پر سے خاک کا پردہ اٹھایا ہے جس کی تاریخِ تعمیر ... ۲ قبل مسیح ثابت ہوئی ہے۔ اس سطح سے اوپر دوسری تہذیبوں کا ایک پورا سلسلہ ملا ہے جس میں ۱۵۰۰ء تک کی مختلف منازلِ ارتقا کا پتہ چلتا ہے۔

منصور احمد

دنیا کی ترقی میں عورتوں کا حصّہ

ایک مغربی حکیم کے خیالات

برنارڈ شا کے محبوب عقائد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ زمانۂ قدیم میں جب نوعِ انسان کے تحفظ کا کام عورت اور مرد میں تقسیم ہوا تو جو حصہ عورت کو تفویض کیا گیا یعنی بچے پیدا کرنا، پالنا اور تربیت کرنا، صرف وہی اہم اور باقی رہنے والا تھا۔

اس کے باوجود ہزار ہا سال سے مردوں نے نہایت سنجیدگی اور یقین کے ساتھ صرف اپنی نوع کو دنیا میں اہمیت دی اور اپنے آپ کو کائنات کا مالک سمجھا۔ کیونکہ شکار کرنے اور مچھلیاں پکڑنے کے لئے، کہ مرد اور اس کے کنبے کی گزران کے یہی دو ذریعے تھے، ایک مادی طور پر غریب اور مخالف دنیا میں کچھ کم جدوجہد کی ضرورت نہ تھی۔

فرصت کے اوقات۔ جب کرۂ ارض پر زندگی آسان تر ہو گئی تو وقت کا گزارنا مرد کے لئے مشکل ہو گیا اپنے فرصت کے اوقات کے لئے مشغولیت بہم پہنچانے کی غرض سے اس نے تمدن، صنعت، حکمت، اور جنگ ایجاد کی۔ چونکہ بچے پیدا کرنے اور ان کی پرورش کے کام سے وہ سبکدوش تھا اس لئے اس نے خیالات اور تصورات پیدا کرنے اور پرورش کرنے شروع کر دیئے۔

جب مرد کو مشکلات کا سامنا نہ ہو اور اسے اس پر غلبہ حاصل کرنے کا موقع نہ ملے تو وہ بیزار ہو جاتا ہے۔ عورت اُس وقت بیزار ہوتی ہے جب نہ وہ کسی سے محبت کرتی ہو اور نہ کوئی دوسرا اس سے محبت کرتا ہو۔ مرد ایک موجد ہے اور سب سے زیادہ خوشی اسے اُس وقت ہوتی ہے جب وہ کوئی کل بنا کر کائنات میں تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔ عورت نظم ونسق میں تبدیلی پسند نہیں کرتی، اور صرف اُس وقت خوش ہوتی ہے جب اسے اپنے گھر کے امن وآسائش میں اپنی سیدھی سادھی قدیم مصروفیتیں حاصل ہوتی ہیں۔ آج کے دن تک ہر جگہ ہزاروں گھروں میں عورتیں کشیدہ کاڑھتی ہیں، کھانا پکاتی ہیں اور اپنے بچے پالتی ہیں۔ حالانکہ ان کے مرد میکانیکی کرامات کی گردش سے اپنا دل بہلاتے ہیں۔

فرانسیسی فلسفی الیین کہتا ہے کہ مرد نے جتنی چیزیں بنائی ہیں ان سب پر ضرورت کی مہر ثبت ہے۔ اس کے گھر کی چھت کا یہ مقصد ہے کہ وہ اسے دھوپ اور بارش سے بچائے۔ اس نے اپنی کشتیوں اور گاڑیوں کو ایسا بنایا ہے کہ وہ ہوا کا مقابلہ بخوبی کر سکتی ہیں۔ اس کے برعکس عورت نے جو چیز بنائی اس پر انسانی جسم کا نشان ہے۔ اس کے کوچ کے گدے آہستہ آہستہ جسم کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور اسے برقرار رکھتے ہیں۔ اس کے آئینوں میں اس کے چہرے کا انعکاس ہوتا ہے۔ ایک مرد کے گھر سادہ لباس میں سختی، اختصار اور سادگی ہوتی ہے، مگر عورت کا لباس نرم خوبصورت اور دلکش ہوتا ہے۔

عورت حسّاس ہے۔ یہ ہیں دو قلوب کی مختلف نوعیتوں کے سادہ مگر نہایت نمایاں خاکے مرد نظریے اور عقاید وضع کرتا ہے۔ وہ ایک فلسفی ہے، ایک ریاضی دان اور ایک عالم مابعد الطبیعیات۔ عورت جو انقلاب کو پسند نہیں کرتی صرف اس شخص کے عقاید میں دلچسپی لیتی ہے جس سے اس کو محبت ہوتی ہے۔ یا اس شخص کے عقاید میں جس سے اس کو محبت تو ہوتی ہے لیکن جو اس سے تغافل کا برتاؤ کرتا ہے۔ اس معاملے میں مادام دو سیتل کے الفاظ یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ وہ کہتی ہے "ایک عورت کے لئے فلسفے کے معنی کسی چہیتے کی دانشمندانہ نوحہ گری سے زیادہ کچھ نہیں۔"

اُس مرد کی تکمیل جو حقیقت میں مرد ہو اس سے بہتر صورت میں اور کسی طریق پر نہیں ہو سکتی کہ اس کے پہلو میں ایک عورت ہو جو حقیقت میں عورت ہو، ایک بیوی، ایک رفیق یا ایک دوست۔ یہی کہ فضیلہ سے وہ اپنی نوع کے خیال سے وابستہ ہے جس کو ایک عورتوں کا دشمن ہمیشہ نظر انداز کرتا ہے۔ ایک مرد کا خیال الگ ہے اور ایسی باتیں معلوم

کرنے کے لئے جن کا کوئی وجود نہ ہو فلک الافلاک پر پہنچ جاتا ہے، مگر ایک عورت کا تخیل لرش زمین پر چلتا ہے۔ وہ ہر روز اسی ایک راستے پر گامزن ہوتا ہے اور اگر کبھی ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ اسے بھی مرد کے ساتھ پرواز کرنی پڑے تو عورت اپنے ساتھ ایک کتاب بھی لے جاتی ہے۔ تاکہ ایتھر میں پہنچ کر بھی انسانی جذبات اور تھوڑی سی گرمی اس کے ساتھ ہوں۔

اگرچہ عورتیں خیالی سیاسیات کو پسند نہیں کرتیں لیکن انہوں نے حقیقی سیاسیات میں بھی کوئی اضافہ نہیں کیا۔ حالانکہ وہ سیاسیات کو حد سے زیادہ خیالی باتوں سے پاک کر کے بنی نوع انسان کی بڑی خدمت کر سکتی تھیں۔ لیکن اس عملی سیاست کو جو ایک خانہ دار بی بی کے ساتھ مخصوص ہے اُسے مبہم، بے سر و پا اور اکثر خطرناک ثابت ہونے والی وہمی سیاسیات سے ملایا بھی کیوں جائے؟

عورتیں سیاسیات کو حسِ مشترک اور حفظانِ صحت کا مسئلہ بنا لیتی ہیں اور موخر الذکر کا ایک نظام وضع کرتی ہیں جو اُن کے لیے باعثِ صد فخر و ناز ہوتا ہے۔ کیا اب بھی ہم یہ سوال کر سکتے ہیں کہ ان میں سے کون سی سیاسیات بہتر ہیں؟ بہترین عورتیں وہ ہیں جو اپنے گھروں کی وفادار ہیں۔ اگر کسی سیاسی جماعت کی غلطی سے یا جنگ کی وجہ سے اشیاء خورد نی کی قیمتیں چڑھ جائیں تو مرد اپنی جماعت کے وفادار رہتے ہیں اور اس کی مدافعت کرتے ہیں، لیکن عورتیں، خواہ انہیں اپنے جماعتی تعلقات کو قطع بھی کرنا پڑے امن کی اور اپنے گھر کی حفاظت کرتی ہیں۔

فرق۔ ہم پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ ہم عورت اور مرد کی ذہنیت کا اس طرح تجزیہ کیوں کر رہے ہیں جبکہ عورتیں بھی بعینہٖ اسی طرح زندگی کا مطالعہ کرتی ہیں جس طرح مرد کرتے ہیں اور انہیں بھی مردوں ہی کی طرح کشمکشِ حیات سے دوچار ہونا پڑتا ہے؟ ہم اس زمانے میں نہیں رہتے جب ایک عام عورت سے کم و بیش ایسا سلوک کیا جاتا تھا جیسے وہ زر و جواہر سے آراستہ ایک خوبصورت ہتھیار ہو جس کی نمائش تو فخر کے ساتھ کی جا سکے لیکن جس سے جنگ میں کوئی کام نہ لیا جائے۔ ایک طبیب عورت جو کسی شفاخانے میں کام کرتی ہو اور اپنے شوہر سے کاروباری موضوع پر بحث بھی کر سکتی ہو کس بات میں اس سے مختلف ہے اور کیا اس میں سرے سے کوئی فرق ہے بھی یا نہیں؟

ہاں فرق ضرور ہے اور وہ یہ کہ اپنے افعال میں مرد ہمیشہ مرد رہتا ہے اور عورت ہمیشہ عورت۔ ایک نوجوان لڑکی اگر وہ چاہتی ہے پہلے ضرورت ہے تو وہ ایک نوجوان مرد کی روحانی زندگی میں حصہ لے سکتی ہے۔ انگلیاں اٹھا لے وہ جنگ کو پسند کرتی ہیں لیکن جرمن اولمپس کی جنگجو دوشیزہ برائن ہلڈ جب تک محبت نہیں کرتی اس وقت تک مغلوب نہیں ہو سکتی، مگر جب وہ سیگفرنڈ سے محبت کرنے لگتی ہے تو کمزور اور بے دست و پا ہو جاتی ہے۔ اگرچہ سوویٹ روس کی عورتوں کے لئے مردانہ علم اور ضبط و نظام ایک اعلیٰ درجے کی صفت سمجھی گئی پھر بھی وہ عورتیں ہی رہیں اور حسیات و جذبات کے لحاظ سے وہ ویسی ہی ہیں جیسی دنیا کی دوسری عورتیں ہیں۔

ایک عورت کسی اہم کاروبار کا انتظام کر سکتی ہے، اور بعض عورتیں اپنا کام غیر معمولی قابلیت سے چلا رہی ہیں، لیکن یہ ایک ایسا شغل ہے جس میں عورت کبھی خوش نہیں ہوتی۔ ایک نہایت کامیاب کاروباری عورت نے ایک دفعہ مجھ سے کہا کہ عمر بھر اس کے دل میں ایک خواہش رہی اور وہ یہ کہ کاش کوئی ایسا آدمی مل جائے جو اس کے کندھوں سے یہ بوجھ اٹھا لے اور وہ خوشی سے اس کے مددگار کے طور پر کام کرنے کے لئے تیار تھی۔

عورت کا حقیقی دائرۂ عمل عورتیں اعلیٰ درجے کی شریک کار اور مددگار ہوتی ہیں، ان میں تخلیقی قابلیت نہیں ہوتی، اگرچہ اس کلیہ میں کئی ایک استثنائیں بھی ہیں۔

حاشا میرا مطلب یہ نہیں کہ عورت کی توہین کروں۔ میں صرف اس کو اس کا حقیقی درجہ دینا چاہتا ہوں۔ باستثنائے چند عورتیں خلاق نہیں بنیں، نہ سخت مشقت کے لئے پیدا ہوئی ہیں۔ صنعت مرد کا پیشہ ہے، جو اس کی بے مصرف سرگرمیوں کا نشہ ہے۔ عورت کی حقیقی تخلیق بچہ ہے۔ میں نے ایک دفعہ عہدِ حاضر کی ایک بہت بڑی عورت کو اس کے بچے کے ساتھ دیکھا جو ابھی مسکرانا سیکھ رہا تھا۔ دنیا اس وقت اس سے بہت دور معلوم ہوتی تھی اسے اس کے تبسم کے سوا اور کسی چیز کی پروا نہ تھی۔

بہت زیادہ توقعات جیسا کہ بائرن نے کہا ہے، مصیبت یہ ہے کہ عورتوں کے ساتھ رہنا بھی مشکل ہے۔ اور ان کے بغیر رہنا بھی مشکل۔ لیکن*

* بائرن نے یہ اس لئے کہا کہ سب خود غرض آدمیوں کی طرح اسے بھی عورتوں سے بہت زیادہ توقعات تھیں، اور اسی لئے وہ ان میں سے کسی کے ساتھ نباہ نہیں کر سکا۔

حقیقت یہ ہے کہ اوسط حالات میں ہر مرد اُن سے نباہ کر سکتا ہے، بلکہ غالباً ان کے بغیر کوئی رہ ہی نہیں سکتا۔ ایک خالص مردانہ تہذیب جیسی قدیم یونان کی تھی، سیاسیات، مابعد الطبیعیات اور خود بینی کی وجہ سے برباد ہو گئی۔

سچ یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں کے مادی اور روحانی اتحاد کے بغیر حقیقی تمدن تعمیر ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ گھر کے سادہ حسن اور حقیقی قدر و منزلت کی طرف مرد کی رہبری صرف عورت کر سکتی ہے۔

منصور احمد

غزل

جانتے ہیں، قادرِ ہر کار تم، بیکار ہم
مانتے ہیں، فاعلِ مختار تم، ناچار ہم

اب ہمیں جب دیکھئے، ہم شاغلِ تسبیحِ دوست
اب ہمیں جب پوچھئے، محوِ خیالِ یار ہم

حسن کی اقلیم کے مغرور شاہنشاہ تم
عشق کی سرکار کے بدبخت خدمتگار ہم

آج فرصت مل چکی ہے آرزوئے زیست سے
آج رخصت چاہتے ہیں اے غمِ دلدار ہم

چھوڑ بیٹھے عشق میں قیدِ مذاہب کا خیال
توڑ بیٹھے رشتہ ہائے سبحہ و زنار ہم

یہ بھی الفت کوئی الفت ہے کہ یکرنگی نہیں
یہ بھی نسبت کوئی نسبت ہے کہ گل تم خار ہم

کاش! ہمدردوں کے دل تابِ سماعت لا سکیں
آج کرنا چاہتے ہیں درد کا اظہار ہم

المدد، اے رہنمائے راہِ الفت! المدد
پہلی منزل ہے اور اس پر موت سے دوچار ہم

خود ہمیں رحم آگیا کون و مکاں کے حال پر
ورنہ لا سکتے تھے تابِ جلوۂ دیدار ہم

جب صدا آئی کہ "بارِ عشق اٹھا سکتا ہے کون"
ہم بڑھے اور بے دھڑک بولے کہ "ہم تیار ہم"

کاش! مرکز کی کشش مرکز کی جانب کھینچ لے
گردِ مرکز گھومتے ہیں صورتِ پرکار ہم

دوستوں کو وحشتیں ہیں دشمنوں کو نفرتیں
یار پر بھی بار ہم، اغیار پر بھی بار ہم

اب ہمیں آزاد! تم آزاد کہنا چھوڑ دو
قیدیٔ ادبار ہم، زندانیٔ افکار ہم

حکیم آزاد انصاری

لائبریری

اخبار اور رسالے پڑھنے کے دو طریقے ہیں۔ قیمتاً یا مفت۔ اخبار خرید کر پڑھنے والے عموماً گھر بیٹھ کر پڑھتے ہیں اور مفت خوان حضرات ریڈنگ روم یا لائبریری میں جاتے ہیں۔ لیکن آجکل مفت خوانی کا ایک نیا طریقہ ایجاد ہوا ہے، جسے چند بزرگ برسرِ بازار استعمال فرماتے ہیں۔ وہ یوں کہ آپ اخبار فروش چھوکرے سے اس وعدہ پر اخبار لے کر دیکھتے ہیں کہ اگر خبریں اچھی ہوئیں تو خرید لیں گے لیکن رجسٹرڈ نمبر سے لے کر "بھنوں کا بھلا ہوگا" تک تلاوت فرما کر واپس کر دیتے ہیں کہ "بابا کیا بیچ رہے ہو لڑائی کی تو کوئی خبر ہی نہیں، کوئی پڑھنے کی چیز بیچا کرو"۔

انہیں مفت خوانوں کی ایک دوسری اور نادر قسم ہے۔ یہ وہ ہیں جو کسی شامت کے مارے کو اخبار پڑھتا دیکھ لیں تو بلا خوفِ قانون اس کا تعاقب شروع کر دیتے ہیں اور غریب کے شانوں پر سے اخبار پر جھپٹنے لگتے ہیں۔ ایک لمحے میں خواہ ایک لفظ پڑھا جائے خواہ ڈیڑھ، وار پر وار کئے جاتے ہیں، اور جس طرح دانہ دانہ کر کے ایک مرغ دانوں کا ڈھیر ختم کر لیتا ہے مفت خوان بھی لفظ لفظ پر جھپٹ کر اخبار کے اُس پار ہو جاتے ہیں۔ گویا یہ حضرات اخبار پڑھتے نہیں، اخبار چُگتے ہیں۔ اخبار بینوں میں یہ اچھوت طبقہ ہے اور ان کا سُدھار کسی گاندھی وا ندھی سے ممکن نہیں اگر کسی زیادہ موٹے اور تیار لیڈر کو اس میں شک ہے تو آئیں میدان میں اور تھوڑا سا سدھار پرچار کر کے شک رفع فرمائیں۔ مگر اتنا یاد رکھیں کہ اگر سدھار کے وقت کہیں ہاتھ میں اخبار کا پرچہ ہو، تو پھر ایک "ٹنکچر آئیوڈین" کی شیشی بھی ہمراہ لائیں۔ نہایت مفید ثابت ہوگی۔ اس مخلصانہ مشورہ کے بعد

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

آغا صاحب یادش بخیر، پیدائشی مفت خوان ہیں لیکن خوبیٔ قسمت سے لائبریری والی قسم سے ہیں۔ اچھوت طبقہ سے جنہیں طبعاً یا نسلاً کوئی تعلق نہیں، اور اسی لئے ہماری نظروں سے زیادہ گرنے سے بچے ہوئے ہیں۔ خیر نظروں سے گرنا گرانا تو ان کی عدم موجودگی کی باتیں ہیں، ان کے ساتھ تو لائبریری کو میلی نگاہ سے دیکھنے کے لئے بھی آہنی عینکوں کے علاوہ مکمل زرہ بکتر کی ضرورت ہے۔

لائبریری میں پڑھنا ان کا آبائی پیشہ ہے جو رفتہ رفتہ مذہب کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ قیمتاً اخبار پڑھنا ان کے نزدیک دہریہ پن ہے۔ تعصب کا یہ عالم ہے کہ جو سوختہ بخت ان کے سامنے اخبار خریدنے کی ایک خفیف سی تائید بھی کر بیٹھے اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ عذابِ قیامت اسے کوئی ازکمی چیز معلوم نہ ہوگی۔ آپ کو لائبریری کی تبلیغ کا خبط ہے۔ جس طرح مالیخولیا کے مریض کو وقفوں کے بعد جنون کے دَورے پڑتے ہیں، عین اسی طرح آغا صاحب کو تبلیغ کے دَورے پڑتے ہیں۔ اور دعا ہے کہ خدا عامۃ الناس کو اس عذاب سے محفوظ رکھے جو آپ نے چند ایسے دَوروں میں خاکسار پر نازل کیا ہے۔

بایں ہمہ جب تک ہمارے بٹوے کے حلق سے ایک آنے تک آمد و رفت جاری رہی ہم اخبار خریدنے سے باز نہ آئے اور آغا صاحب کی لائبریری پرستی کو وہی وقعت دی جو اس سے پہلے قومی تحریکات کو دی جاتی تھی۔ لیکن جب مہینے کی چھبیسویں تاریخ آئی اور ہم پر روشن ہوا کہ ہمارے بٹوے کا شغل ہوا خوری کے سوا کچھ نہیں اور یہ کہ اخبار اور رسالے بدستور بکتے ہیں، برستے نہیں تو لائبریری کے محاسن ہم پر بلا مشقت واضح ہونے لگے۔ جونہی کہیں سے "آج کا تازہ پرچہ" کی آواز آتی ہمارا ہاتھ بٹوے میں کہنیوں تک گھس جاتا اور ایک ایک انگلی تلاش میں بٹوے کے شکم کا اس طرح جائزہ لیتا جیسے باورچی دیگچہ مانجتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے اگر کچھ حاصل ہوتا تو وہ ماشہ بھر کوڑا کرکٹ مع تمام

ہواخوروں کے بٹوؤں اور جیبوں کے کونوں میں جمع رہتا ہے۔ جی چاہتا کہ ان چھوکروں سے اخبار نوچ کر نو دو گیارہ ہو جاؤں لیکن اپنی عجیب الطرفینی ایسے فعل سے باز رکھتی +

آخر جب اخباروں کا مسلسل فاقہ صحت پر اثر انداز ہونے لگا۔ تو ہم نے علمی ضرورت اور جسمی مصلحت کو مدِنظر رکھتے ہوئے آغا صاحب کی طرف رجوع کیا۔ اور صاحب کے جونہی ان کی حرکات سے تبلیغی دورے کے آثار نمایاں ہوئے ہم فوراً سراپا آمین ہو گئے، اور مفت خوانی کی سند بھی لے کر اپنے مرشد کے زیرِ سایہ لائبریری کو ہو لئے۔

لائبریری میں داخل ہوتے ہی ایک قدِآدم میز دھری تھی جس پر دو انگریزی اخباروں کو آہنی سلاخوں میں جکڑ کر لِٹا رکھا تھا۔ یہ غالباً حفظِ ماتقدم کے طور پر کیا گیا تھا۔ کیونکہ انگریزوں نے تجارت کے بہانے سارے ملک پر قبضہ کر کے اپنی ساکھ اس قدر بگاڑ لی ہے کہ ان کے اخباروں کو بھی مشکیں باندھ کر رکھا جاتا ہے۔ مبادا کہیں زمیندار و انقلاب پر ہی ہلّہ بول دیں اور لائبریری پر حقِ ملکیت جا بیٹھیں +

ان دو مفید اخباروں میں سے ایک "ٹائمز آف انڈیا" کا پرچہ تھا۔ جس کے ہر صفحہ سے دو دو خانہ ساز انگریز چمٹ رہے تھے۔ جب تک صرف ٹائی اور پتلون معیارِ تہذیب تھا، انگریز بننے کے لئے ایک کباڑی کی دوستی یا دوسرے کباڑی کی چوری ہی کافی تھی۔ لیکن جب سے نصابِ تہذیب میں انگریزی اخباروں کی تلاوت بھی داخل کر دی گئی ہے ہونے والے انگریزوں کی مشقت میں بے حد اضافہ ہو گیا ہے۔ بیچاروں کو اخبار کی ہر سطر اشوک کا کتبہ معلوم ہوتی ہے لیکن باایں ہمہ مبتلائے تہذیب کا عشق اس قدر بے اختیار ہے کہ خواہ سمجھیں خواہ نہ سمجھیں آٹھوں پہر اخبار کریدتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت لائبریری میں وہ حضرات بھی جن کی شکلیں باوجود کارٹائی کے بے حد سودیشی معلوم ہوتی تھیں اور جن کے چہروں سے اُردودانی بھی مشکل سے ٹپکتی تھی انگریزی اخباروں سے اس قدر بخیہ ہو گئے تھے گویا انہیں کے سایہ میں چھوٹے سے بڑے ہوئے ہیں۔ پھر ان جعلی انگریزوں کا اندازِ مطالعہ بھی نرالا تھا۔ پڑھتے پڑھتے سطروں کے درمیان اس سنجیدگی سے سر ہلاتے اور منہ بناتے تھے۔ گویا قدم قدم پر انہیں ایڈیٹر کی رائے سے اتفاق و اختلاف ہو رہا تھا۔ حالانکہ حقیقت میں سب کے سب یا تو "ضرورت ہے" والے اشتہاروں کے مطالعہ سے اپنی بیکاری کو بہلا رہے تھے۔ یا سینما اور تھیئیٹر کے اشتہاروں میں ایکٹرسوں کی تصویریں دیکھ کر آنکھیں سینک رہے تھے اور بیچارے ایڈیٹر کے باتصویر مقالہ کو اس ناراضگی سے اُلٹتے تھے گویا اس نے ایسی چیز کو اخبار میں شامل کر کے اخبار کا ستیاناس کر دیا تھا +

میرے سامنے، کچھ فاصلے پر "ٹائمز آف انڈیا" کا وہ صفحہ تھا جس پر مہاتما گاندھی کی تصویر تھی اور ساتھ ہی ان کے متعلق کوئی خبر درج تھی خیر خبر کے متعلق تو میں فرض کر سکتا تھا کہ گرفتاری کی نہیں تو رہائی کی ہو گی اور برت رکھنے کی نہیں تو برت توڑنے کی ہو گی، لیکن تصویر دیکھنے کے لئے میں کسی قدر بیتاب سا ہو گیا، اور پڑھنے والوں کے درمیان سے گھس کر اس صفحے تک پہنچنا چاہا۔ لیکن میرے گھسنے کے دوران میں دو تیز دھار کہنیاں میری پسلیوں کے پار سی ہو گئیں۔ میں نے غور سے اپنا محلِ وقوع دیکھا تو معلوم ہوا کہ مجھے میز سے پورے پانچ گز پیچھے دھکیل دیا گیا تھا،

سب سے پہلا سبق جو لائبریری میں میں نے سیکھا یہ تھا کہ جس بے تکلفی سے اپنے خریدے ہوئے اخباروں پر دست درازی کی جاتی ہے اگر لائبریری کے اخباروں پر بھی دُہرائی جائے تو عموماً کہنیاں کھانی پڑتی ہیں +

اس بیش قیمت اصول کو دریافت کرنے کے بعد مجھ میں ایک قدرتی تحمل آ گیا اور ایک امیدوارانہ شکل بنا کر اتنے فاصلے پر جا کھڑا ہوا جہاں کہنیوں کا وار بچا سکتا تھا، اور یہ بھی ظاہر کر سکتا تھا کہ ڈر کر پیچھے کھڑا ہوں ورنہ جی تو اخبار پڑھنے کو چاہتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی پیچھے مڑ کر دیکھتا میں ایک مظلوم کا حلیہ اختیار کر لیتا کہ شاید رحم کھائے اور اخبار پڑھنے کے لئے جگہ دے دے ٭

خدا جانے ایک صاحب کے دل میں رحم ہی آیا تھا، یا اخبار حفظ فرما چکے تھے بمشکل تمام اپنے آپ کو میز سے اُدھیڑ کر پیچھے ہٹے۔ گو اعتبار نہ آتا تھا کہ یہ شخص "لاٹھی چارج" کے بغیر یہاں سے ٹلے گا۔ کم بخت میز سے کافی دُور جا چکا تھا لیکن ابھی مڑ کر دیکھتا جاتا تھا اور واپس آ جانے والی شکلیں بناتا تھا۔ آخر جب دروازے سے بالکل غروب ہو گیا تو میں دبے پاؤں اس کی خالی کردہ جگہ پر جا کھڑا ہوا ٭

میرے سامنے گاندھی جی کی تصویر والا ورق تھا، جو میز پر دیوار کی طرح عموداً کھڑا تھا۔ اس طرح ایک صفحے پر میں مسلط تھا اور دوسری جانب میرا ہمسایہ قابض تھا ٭

یہ مہاتما جی کی نئی تصویر تھی اور چونکہ مہاتما جی کی تصویر خصوصاً نئی، عام انسانوں کی تصویروں سے بہت زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔ میں اسے کچھ اسی غور و شوق سے دیکھنے لگا جس سے آثارِ قدیمہ —— مثلاً قطب صاحب کی لاٹھ، مصر کے مینار وغیرہ ——

میں ابھی صاحبِ سواراج کے کانوں کی وسعت کی داد دے رہا تھا کہ آنحضور کے عین دہن سے ایک چاقو کا پھل نمودار ہوا۔ ایک تصویر کے منہ سے زبان کا نکلنا بھی معجزہ سے کم نہیں، پورے چاقو کا برآمد ہونا تو نہ صرف معجزہ تھا بلکہ کسی حد تک دہشت انگیزی بھی تھی۔ خصوصاً بانیٔ عدم تشدد کی تصویر کا یہ شعبدہ سراسر حیران کن تھا۔ لیکن میں ابھی جی بھر کر حیران بھی نہ ہونے پایا تھا کہ چاقو کے پھل نے ایک فوری حرکت کی اور ایک لمحے میں مہاتما کے مُنہ سے نکل کر ان کے عارض و سینہ کو چیرتا اخبار سے ایک مستطیل شکل کا ٹکڑا کاٹ کر غائب ہو گیا۔

اس عمل کے بعد مہاتما جی کی باقی ماندہ تصویر ایک آنکھ نصف ناک، ½ ٹھوڑی اور ⅔ سینے پر منقسم تھی۔ بھارت ماتا کے سب سے بڑے رہنما کو اس رقت آفریں حلیہ میں دیکھ کر مجھے لطیف سا طیش آ گیا، اور میں نے نیم غصہ و نیم احتیاط سے ورق کی دوسری جانب دیکھا۔ حضرت ہمسایہ کے ایک ہاتھ میں چاقو تھا اور دوسرے میں کالی ناس ——— ایک دانتوں کا منجن ہے ——— کے مفت نمونے کا کوپن، جسے اشتہار میں سے کاٹا گیا تھا۔ اسی کوپن کے ساتھ خاکم بدہن مہاتما جی کے گم گشتہ اعضا لٹک رہے تھے۔ میں نے کسی قدر بگڑ کر اس گستاخ شخص کے چہرے کو دیکھنا چاہا۔ لیکن دیکھنا ہی تھا کہ اس نے اپنی کہنیوں کو جنبش دینے کا ارادہ کیا اور میرا بگاڑ نرم ہوتا ہوتا خوف اور آخر کار خوشامد میں تحلیل ہو گیا۔ میرے منہ سے نکل گیا

"آپ بڑے اچھے آدمی ہیں۔"

کہنے لگا "بکو مت"

میں نے بدستور ڈر کر پوچھا "میں جا سکتا ہوں؟"

اس کے جواب میں اس نے مجھے بازو سے پکڑا۔ اور اس بے تکلفی سے لائبریری کے مرکز کی جانب دھکیل دیا، جیسے ایک شاطر مخالف کا پیادہ مار کر باہر پھینک دیتا ہے۔ اب میں لائبریری کے اُس مقام پر تھا جہاں دو طویل و عریض میزیں دھری تھیں اور ان کی ہر چہار جانب بیس پچیس آدمی کرسیاں ڈالے رسالے پڑھ رہے تھے۔ اور ان میں سے چند میرے حادثہ سے دِل بہلا رہے تھے۔

شریف آدمیوں کا قاعدہ ہے کہ جب کبھی انہیں ایسا گرم و سرد واقعہ پیش آتا ہے تو اپنی خفت چھپانے کے لیے گنگنانا شروع کر دیتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ میں نے بھی خوبیٔ قسمت سے کسی زمانہ میں ایک ہارمونیم گائیڈ کا مطالعہ کر رکھا تھا۔ فوراً تیسری سپتک میں سا رے گا رے گا ما، الاپنا شروع کر دیا۔ لیکن ابھی سرگم ختم نہ ہونے پائی تھی کہ حاضرین نے مختلف النوع آوازیں بلند کیں۔

"ارے۔ ابے گانے والے۔ لائبریری ہے جی لائبریری۔ اخ مخ فخ۔ نکالو تان سین کو"

علاوہ ازیں چند بداندیشوں نے کچھ ایسے کھردرے کلمے بھی کہہ دیئے جن سے ہماری شان پر نامناسب روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی۔ بہرحال اس حادثہ اور اس بوچھاڑ کے بعد میرے دماغ میں چند فی صدی ہوش باقی تھا۔ اس قلیل ہوش کی مدد سے میں نے سوچا کہ چپکے سے کسی کرسی پر بیٹھ جانا اچھا ہے۔ کھڑا رہنے سے تو مفت میں ——— یعنی بغیر ٹکٹ کے ——— تماشا بن رہا ہوں۔

پاس ایک خالی کرسی پڑی تھی جس پر میں نے بیٹھنے کا ارادہ کیا اور بیٹھنا شروع کیا۔ روزمرہ کا تجربہ ہے کہ کرسی پر بیٹھتے وقت تھوڑا سا جسم جھکانے سے آدمی کرسی پر پہنچ جاتا ہے لیکن میں حیران تھا کہ میں نیچے ہی نیچے جا رہا تھا لیکن درمیان میں کرسی حائل نہ ہوتی تھی۔ قصہ مختصر خاکسار دھڑام سے زمین پر جا رہا۔ صدمے کے اثرات مختلف اعضائے بدن پر مختلف تھے۔ معلوم ہوتا تھا کوئی اناڑی ہماری پشت پر ٹھیکے کرنے کی مشق کر رہا ہے جو ریڑھ کی ہڈی کے اس سرے سے لے کر دماغ کے اس پار ہو جاتا ہے۔ آنکھوں کی کیفیت یہ تھی کہ گرد و پیش کی تمام جاندار اور بے جان اشیا جمناسٹک کرتی معلوم ہوتی تھیں سنبھلنے پر مڑ کر جو دیکھا تو ایک دوسرے صاحب کرسی کھینچ کرے جا رہے تھے اور پڑھنے والے قہقہوں کے درمیان تفریح میں مشغول تھے۔

اس شرم سے مجھے جس شدت سے پسینہ آ رہا تھا میں نے اندازہ لگایا کہ اگر تھوڑی دیر اور جاری رہا تو میں ہڈیوں سمیت پگھل جاؤں گا۔ لیکن خوش قسمتی سے اس موقع پر لائبریری میں لائبریرین آ داخل ہوا اور تمام حاضرین خاموشی سے پڑھنے کیطرف متوجہ ہو گئے۔ لائبریرین تھوڑی دیر بعد چلا گیا لیکن میں اِن غنیمت کی گھڑیوں میں اپنی اصلی حالت پر واپس آ گیا اور ایک دوسری کرسی پر پوری کامیابی کے ساتھ بیٹھ گیا۔

میرے آگے وہ میز تھی جو رسالوں کے لیے مخصوص تھی سب رسالے اس وقت پڑھے جا رہے تھے۔ صرف ایک رسالہ جو بظاہر کافی

مسر معلوم ہوتا تھا۔ فارغ تھا۔ میں نے اس کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ لیکن میری انگلیاں ابھی اس کے کونے تک پہنچی تھیں کہ دوسرے کونے پر مخالف جانب سے پنجہ گرا۔ مجھے یقین تھا کہ میری انگلیاں چند سیکنڈ پہلے پہنچی ہیں لہذا رسالہ میرا ہے۔ لیکن کیا دیکھتا ہوں کہ میرے حریف کا پنجہ شکنجے کی شکل اختیار کرنے لگا۔ تکے کا دیکھنا تھا کہ میرا بازو اس پھرتی سے میرے پہلو میں واپس آگیا جیسے ربڑ کا سانپ کھینچ کر چھوڑنے کے بعد اپنی جگہ پر واپس آجاتا ہے۔

میں مایوس ہونے کو تھا کہ میں نے دیکھا۔ میرا دایاں ہمسایہ اپنا رسالہ قریباً ختم کرنے والا ہے۔ صرف آخری ورق باقی ہے۔ میں گھات میں بیٹھ گیا کہ جوں ہی رسالہ رکھے گا میں اچک لوں گا۔ دو منٹ گذرے۔ رسالہ ختم ہو گیا۔ اب شرافت کا تقاضا تو یہ تھا کہ رسالہ میز پر رکھ دیتا لیکن جناب ہمسایہ رسالے کو بستر کی طرح لپیٹ کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ میز کی اس جانب ایک اور صاحبزادے ایسے ہی فعل کا ارتکاب کر رہے تھے۔ جونہی دونوں کی نگاہیں لڑیں باہم رسالے تبدیل کر لئے۔ میں ہمسائے کی خود غرضی اور سفاکی پر خون کا گھونٹ پی گیا اور شکر ہے اللہ کا میں نے اپنی زبان اور ہاتھوں پر حسب ضرورت قابو پالیا۔ ورنہ غصہ میں کیا کچھ ناممکن تھا۔

میں اپنے غصے اور مایوسی کا موازنہ کر رہا تھا کہ میرا دوسرا ہمسایہ اس قدر اچانک رسالہ پھینک کر اٹھا۔ گویا لائبریری میں داخل ہونے سے پہلے بلو پلز (Blue Pills.) کھا کر آیا تھا۔ میں نے کچھ خدا کا شکر ادا کیا، اور کچھ جلاب کی گولیوں کا، اور رسالہ اٹھا لیا۔ میں اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھا کہ ایک ایسا رسالہ مل گیا تھا جس کا میں تنہا مالک تھا۔ بہرحال احتیاطاً میں نے رسالے کو غیر معمولی طاقت سے ہاتھوں میں پکڑا، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر گرفت ذرا ڈھیلی پڑ گئی تو رسالہ پھڑ پھڑا کر اڑ جائے گا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ میرے پاس رسالے کا آنا کوئی ایسا واقعہ نہیں جو بعد میں حاسد ہمسایوں کے لئے بہانہ فساد بنے تو مجھے یقین ہو گیا کہ آخر ہماری عیش و عشرت کا دور بھی شروع ہو ہی گیا۔ چنانچہ انتہائی لطف و سرور کے عالم میں رسالے کا پہلا ورق الٹا۔ فہرست مضامین کے نون تک ہی نگاہ پہنچی تھی کہ پیچھے سے کسی نے دہشت زدہ لہجے میں میرے کان میں کہا۔

"تمہاری پیٹھ پر ایک مہیب و مہلک بھڑ بیٹھی ہوئی ہے۔"

میں ایک بھڑ سے اس قدر ڈرتا ہوں جتنا ایک شریف آدمی کو دس بھڑیوں سے ڈرنا چاہیئے اور میری پشت نشین بھڑ کے تو اوصاف ہی اس قدر ہراس انگیز بتلائے گئے تھے کہ میری روح حلق میں آگر اٹک گئی گویا چاہے تو واپس جائے چاہے تو اٹکی رہے۔ یہ صاف خطرناک حالت تھی۔ چنانچہ میں گیند کی طرح کرسی سے اچھلا اور ورکوٹ کو بدن سے اس طرح چھیل پھینکا جیسے کیلے کی چھال اتار دی جاتی ہے لیکن حیرانی تھی کہ بھڑ کا کوئی پتہ نہ تھا۔ غالباً میری پشت پر کوئی ایسا موذی جانور بیٹھا ہی نہ تھا۔ میں نے اپنے اطلاع دہندہ سے پوچھنا چاہا کہ آخر اس مذاق کے کیا معنی؟ لیکن دیکھا تو وہ حضرت نہایت اطمینان سے میری کرسی پر بیٹھ کر میرا رسالہ پڑھ رہے تھے اور وقتاً فوقتاً اپنی کہنیوں اور میری پہلیوں پر ایک مشترک نگاہ ڈال لیتے تھے۔ میں دل میں رو رو کر کہتا تھا۔

"کاش بی اے میں ایک سال فیل ہو لیتا۔ لیکن گلکا تو سیکھ لیتا"

اب گلکے کی عدم موجودگی میں مؤثر ترین ہتھیار بددعائیں تھیں جن کا اس آزادی سے استعمال کیا کہ ہر زبان میں غاصب پر صرف کر دیں۔ لائبریری اور اس کے متعلقین پر بھی جی بھر کر دانت پیسے اور بڑبڑاتا ہوا لائبریری سے باہر چل کھڑا ہوا۔ لائبریری کے دروازے پر ایک مریل سا جاپانی ساخت کا چپڑاسی کھڑا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کسی نے انسانی ڈھیر پر چمڑے کا رنگ مل دیا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ لائبریری کا عضو ضعیف یہ چپڑاسی ہی ہے۔ چلو اسی پر نزلہ انتقام گرائیں اور ایک مکے سے اس کی ہڈیوں کا ربط برہم کر دیں۔ لیکن تھوڑے فاصلہ پر ایک گاما نما چپڑاسی کھڑا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اسی مریل چپڑاسی کی حفاظت کے لئے کھڑا کیا گیا ہے۔ لہذا مکے والی تجویز تو میں نے یک لخت واپس لے لی۔ البتہ باہر نکلتے وقت مریل چپڑاسی کو نہایت ہی قہر آلود نگاہ سے دیکھا اور اس طرح غصے کی ایک کسر ٹھنڈی کرنی چاہی۔ لیکن ایک قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ لاغر چپڑاسی نے میری پشت کو چھو کر کہا۔

"صاحب یہ کیا لئے جا رہے ہو؟"

میں نے نہایت حقارت سے گھور کر جواب دیا "کیا کہا؟"

کہنے لگا "یہ ہاتھ میں کیا ہے؟"

مجھے کمزور آدمیوں پر بڑی روانی سے غصہ آتا ہے۔ چنانچہ کہا "ہاتھ کے کچھ لگتے، تجھے کیا؟"

کہنے لگا "بتانا پڑے گا صاحب"

اب حقیقت یہ ہے کہ میرے ہاتھ میں کوئی قابل اعتراض چیز نہ تھی۔ فقط ایک کاغذ کا پلندہ تھا جو شاید لائبریری سے میرے ہاتھ میں چلا آیا تھا لہذا میں نے کچھ اس چپڑاسی کو شرمندہ کرنے کی خاطر

اور پھر ڈانٹنے کے لئے کہا۔

"پاگل چپڑاسی۔ یہ تو کاغذ کا ٹکڑا ہے۔ تمہیں چپڑاسی کس نے بنا دیا؟" کہنے لگا "تو کاغذ ہی کیوں لے جا رہے ہو۔ رسالوں کے ورق پھاڑنا جرم ہے"۔

میں حیران تھا۔ کہ کیا سچ مچ یہ ذلیل سا آدمی مجھ سے لڑنے کی گستاخی کرنا چاہتا ہے۔ میں نے حتی المقدور نتھنے پھلا کر کہا:۔

"میاں مکوڑے، بکو مت۔ کاغذ لے جا رہے ہیں۔ اچھا کرتے ہیں اور دیکھو ابھی دو منٹ ہوئے ہمارا ارادہ تمہیں پیٹنے کا تھا۔ لیکن ذاتی آرام کی خاطر رحم کھا لیا۔ اب اگر زبان ہلائی تو ہم ہاتھ ہلا دیں گے"۔

اتنے میں دوسرا چپڑاسی بھی سرکتا سرکتا پاس آ گیا اور کہنے لگا۔

"بابو جی" "زبان سنبھالئے۔ ایک تو چوری کی ہے۔ دوسرے ڈانٹ بتاتے ہو"۔

چوری کا لفظ سن کر میں بلبلا اٹھا۔ اتفاقاً وہ کاغذ کا ٹکڑا میرے ہاتھ میں چلا آیا تھا۔ لیکن اس فعل کو چوری کہنا انتہا درجے کا مبالغہ تھا اور اس سے پرلے درجے کی میری توہین تھی۔ ادھر میں نے دیکھا کہ فلسفہ نفسیات کے مطابق مجھ میں غصہ کی تمام علامتیں یکے بعد دیگرے ظاہر ہو رہی تھیں اور میں کچھ آگ بگولا سا ہو رہا تھا۔ دوڑا دوڑا لائبریرین کے دفتر میں گیا اور کہا:۔

"صاحب آپ کے چپڑاسیوں نے میری ہتک کر دی ہے۔ وہ سزا کے مستحق ہیں"۔

چپڑاسی بھی میرے پیچھے پیچھے دفتر میں جا پہنچے۔ میری شکایت کے جواب میں دونوں یک زبان ہو کر بولے "حضور اس بابو نے چوری کی ہے"۔

یہ اہانت آمیز فقرہ میرے کانوں پر اس طرح گرا گویا کسی نے جونکوں کا گچھا میرے کانوں پر لگا دیا تھا اور میرے چوری کے الزام کو دہرایا جا رہا تھا۔ یہ گستاخی صاف طور پر ناقابلِ برداشت تھی۔ میں بھی درمیانہ قسم کا انسان تھا۔ پیغمبر تو تھا نہیں کہ قصور معاف کرتا پھرتا۔ موٹے چپڑاسی سے قطع نظر کر کے مریل چپڑاسی کو ایک ایسا مکا لگایا کہ وہ ہڈیوں کی بھول بھلیاں ٹوٹ پھوٹ کر زمین پر بچھ گئیں۔

دوسرا چپڑاسی فوراً بول اٹھا "اف مر گیا"۔

مکے کے عواقب دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ میرا ارادہ اتنا سخت مکا مارنے کا نہ تھا جتنا کہ مجھ سے سرزد ہوا تھا۔ بہرحال اب میرا غیظ و غضب بتدریج خوف و ندامت میں تبدیل ہو رہا تھا، اور میری آنکھوں کے سامنے قید، جیل، مشقت، کالا پانی، پھانسی یکے بعد دیگرے آتے اور غائب ہوتے تھے۔

لائبریرین نے فوراً پولیس کو ٹیلیفون کیا، اور مجھے حکم دیا۔

"اس کونے میں آ کر کھڑے ہو جاؤ"۔

میں اس کونے میں کھڑا ہو گیا۔ ڈر رہا تھا، اور شدت سے میرا بدن کمزور مقامات پر بری طرح کانپ رہا تھا۔ میں چاہتا تھا۔ کاش چپڑاسی کو مکا نہ لگاتا۔ کاش چپڑاسی مکے کا وار بچا لیتا۔ کاش اسے مکے کی جگہ ایک معمولی گالی دے دیتا۔ کاش دنیا میں مکے کا وجود ہی نہ ہوتا۔ کاش میں چپڑاسی ہوتا اور چپڑاسی میں۔

لائبریرین نے مجھ سے نام۔ سکونت۔ قوم اور پیشہ وغیرہ کی تفصیل پوچھی۔ سینہ پر ہاتھ دھر کر میں نے یہ خاندانی اسرار فاش کئے۔ لیکن ہر سوال کا صحیح اور برخوردارانہ جواب دیا کہ شاید یہی لائبریرین کی خوشنودیٔ طبع کا باعث ہو اور شاید یہ سمجھ لے کہ ہے تو شریف زادہ اتفاقاً جرم کر بیٹھا ہے۔

اسی اثنا میں دفتر میں ایک ہلاکو شکل کنسٹیبل داخل ہوا۔

لائبریرین داستانِ واردات دہرانے لگا اور کنسٹیبل فردِ جرم مرتب کرنے لگا۔ مابدولت کے دل و دماغ کی عجیب کیفیت تھی۔ کبھی جی چاہتا کہ یہاں سے بھاگ نکلوں اور بازار میں گم ہو جاؤں۔ لیکن جب کنسٹیبل پر نگاہ پڑتی تو یہ خیال دماغ سے جڑ سے نکل گیا۔ پھر چاہتا کاش چپڑاسی اٹھ کر کہہ دے کہ ہم نے صلح کر لی اور ہم یہاں سے ہنستے ہنستے رخصت ہو جائیں۔ دفعتہً خیال آیا کہ پولیس کا واحد علاج تو رشوت ہے۔ اور کچھ غور و فکر کے بعد معلوم ہوا کہ کنسٹیبل اور دیانت دار تو کچھ حسنِ ظن سا ہے۔ رشوت دینا ہی صحیح حکمت عملی ہے۔ لیکن رشوت دینے ہی کو تھا کہ یاد آیا بٹوا خالی ہے مجھے یقین ہو گیا کہ برے دن آنے والے ہیں۔ آخر دو جرموں کا مجرم ہوں بچنا دشوار ہے البتہ قسمت اچھی ہو تو شاید سزا میں تخفیف ہو جائے۔ چنانچہ خدا سے دعا مانگتا:۔

"الٰہی! قید سے بچانا۔ جرمانہ جتنا ہوا ادا کر دوں گا۔ اگر قید ناگزیر ہے تو مشقت سے بچانا۔ میں قید محض کا خوگر ہوں اور اگر مشقت لازمی ہے تو کوئی لطیف سی مشقت کرانا۔ مثلاً ان پڑھ قیدیوں کے خط لکھنا اور پڑھنا۔ لیکن اے خدا! چنے پیسنے اور کولہو چلانے سے خاص طور پر محفوظ رکھنا۔ ہاں البتہ پھانسی پر چنوں اور کولہو ہی کو ترجیح دیتا ہوں۔ خدایا الٰہی

تو نے اس دفعہ بچا لیا تو پانچ وقت نماز پڑھا کروں گا
روزے رکھوں گا اور یتیموں کا مال ہرگز نہ کھاؤں
گا - الٰہی اگر تو نے میرے بچاؤ کا کوئی انتظام نہ
کیا تو یاد رکھ ایک سچے مسلمان کی جان جائیگی
اور ع

"پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دُنیا"

انہیں خیالات میں تھا - کہ کنسٹبل بولا :-

"بابو جی لایئے ہاتھ"

میں سمجھا شاید بے قصور سمجھ کر رہا کرنا چاہتا ہے - اور رہا کرنے سے پہلے ہاتھ ملانا چاہتا ہے - حیران تھا کہ دعا کس قدر تیر بہدف ورزد اثر نکلی - آہ! ساتھ ہی لارڈی کے لئے بھی کیوں دُعا نہ کی بہرکیف میں نے ذرا مسکرا کر کنسٹبل کی جانب ہاتھ بڑھا دیا - لیکن جب دیکھا کہ سمتِ مخالف سے ہاتھ کی بجائے ہتھکڑی نمودار ہو رہی ہے تو مجھے محسوس ہوا کہ میری روح پسلیوں کے نیچے پھڑ پھڑا رہی ہے +

قصہ کوتاہ بندہ گرفتار کر لیا گیا - آگے آگے کنسٹبل تھا اس کے پیچھے ایک آہنی زنجیر اور اس زنجیر کے انجام پر میں - اب اگر کوئی آدمی پہلے کنسٹبل کو دروازے پر باہر نکلتے دیکھتا - اس کے بعد زنجیر کو تو یہی خیال کرتا کہ زنجیر کے بعد بندر نکلے گا - آہ ہمارے متعلق کیا یہی بدگمانی بداندیشی ممکن تھی؟ اور سچ مچ جب ہم دفتر سے جا رہے تھے تو مرِیل چپڑاسی نے آنکھ کھولی اور مجھے اس حالت میں دیکھ کر کہنے لگا "صرف ڈگڈگی کی کسر ہے"

جب میں نے دیکھا کہ چپڑاسی تو زندہ ہے اور پھانسی کا اندیشہ قبل از وقت ہے تو اس بے خطر ماحول میں میرے غصے کو نمائش کا موقع ملا - میں حقیقت میں بپھرنا چاہتا تھا - لیکن آہ! میرے ہاتھ بندھے تھے - میں چاہتا کاش میں آزاد ہوتا اور اس چپڑاسی سے رہی سہی زندگی بھی نچوڑ لیتا - بہرحال میں نے قسم کھائی کہ اگر قسمت میں رہائی لکھی ہے تو قید سے واپس آ کر اسے بس فنا ہی کر دوں گا - پھر خواہ پھانسی کے تختے پر ہی لٹکا دیا جاؤں +

لائبریری کے دروازے سے نکل رہا تھا کہ آغا صاحب پر نگاہ پڑی - ہجومِ حوادث میں میں بھول گیا تھا کہ میری مصیبتوں کا بانی تو یہی شخص تھا - اپنی قسم میں جو ابھی تازہ تازہ کھائی تھی ایک خفیف سی ترمیم کر لی اور وہ یہ کہ رہا ہو کر پہلے اس آغا کو تلف کروں گا اور بعد میں چپڑاسی کو +

کامران - ایم - اے -

اقوالِ زرّیں

ناکامیاں، کامیابیوں کے ستونِ اساسی ہیں —
(ویلز کی ایک کہاوت)

ناسازگار حالات ہمارے گرد وپیش تکالیف کا بے پناہ طوفان برپا کیے رہتے ہیں - جن کا سامنا کرنے کے لئے آدمی اپنی مخفی طاقت کو کام میں لا کر وہ کارہائے نمایاں انجام دیتا ہے جو اس کی شہرت پر مہرِ تکمیل ثبت کر دیتے ہیں +
(ایڈیسن)

کسی مصیبت زدہ آدمی کی مخلصانہ امداد اس میں نہیں کہ ہم بذاتِ خود اس کا بوجھ ہلکا کریں، بلکہ اس کی صحیح امداد یہ ہے کہ ہم اس کی طاقت کو اس کے ہاتھوں کارفرما کر کے اس میں کس بوجھ کی برداشت کا مادہ پیدا کریں +
(فلپس بروکس)

جو فتوحات آسانی سے حاصل ہو جاتی ہیں وہ بالکل بے حقیقت سمجھی جاتی ہیں ...... صرف وہی فتوحات قابلِ تعریف ہوتی ہیں جو خونریز جنگ کے بعد حاصل ہوں +
(بیچر)

وہ جو ہم سے کشتی کرتا ہے، ہماری طاقت کو زیادہ کرتا ہے اور ہماری مہارت کی تکمیل کرتا ہے ... ہمارا مدِ مقابل ہی ہمارا بہترین مددگار رہے + (برک)

طاہر قریشی

بابل کے کھنڈروں میں چند گھنٹے

عراق کی ایک ایک ٹھیکری قدامت کی مستقل تاریخ ہے، دُنیا کے متعدد تمدنوں کے جبروت، اُس کے آغوش میں محوِ خواب ہیں، اس سرزمین نے اِس قدر عظیم الشان انقلابات کو واقعات کی آنکھ سے دیکھا ہے جس کے صرف تصور سے دل و دماغ میں ہیجان بپا ہو جاتا ہے اور عبرت کے سینکڑوں خاکوں کی ترتیب میں نگاہ محو ہو جاتی ہے، عراق کا ایک گوشہ نمرود کی جھوٹی خدائی کے افسانے سنا رہا ہے، تو دوسری طرف سے حضرتِ خلیل علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ثبات و استقلال کی صدائیں آتی ہیں۔ کہیں کلدانیوں کی سطوت کے مٹے ہوئے نقوش کی کوئی جھلک نظر آتی ہے، تو کسی پردے سے اہلِ نینوا کی عمرانیت و تہذیب کی شمعِ کشتہ کا دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ شہر حلہ کے قریب سے گذریئے تو بابل کے کھنڈروں کو دیکھ کر دنیا کی بے ثباتی پر جی کھول کر ماتم کیجیئے، سلمانؓ پاک کے قریب جائیے تو طاقِ کسریٰ کے شکستہ حصّے کو دیکھ کر مدائن کی تاراج شدہ رعونت سے عبرت حاصل کیجیئے، بغداد شریف کی گلیوں سے گزرتے وقت بنو عباس کے جاہ و جلال کو یاد کر کے، خوب روییئے، جنرل موڈ (Gen. Maude) کے مجسمہ کو رود بِجلہ کے قریب دیکھ کر اسلامی حکومت کی شکست و ریخت پر خون کے آنسو بہایئے۔ میں نے عراق کے سفر میں ان تمام عبرتکدوں کا مشاہدہ کیا، جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یقین جانیئے کہ عہدِ رفتہ کے دھندلے نقش نے میرے دل میں چٹکی لی، اور ماضی کے ہر ویرانے کو دیکھ کر میرے دل میں عبرت کے سینکڑوں کانٹے ٹوٹ کر رہ گئے میں بیک وقت عبرت کے تمام مناظر آپ کے سامنے پیش کرنے کی خود میں سکت نہیں پاتا، ایک اور صرف ایک منظر پیش کرنا چاہتا ہوں، جو بابل کے کھنڈروں سے عبارت ہے۔ اپنے عینی مشاہدات ضبطِ قلم کرنے سے قبل میں چاہتا ہوں کہ بابل کی مختصر تاریخ سے آپکو رُوشناس کراؤں، تا کہ اس کی انقلابی قدامت کی غیر معمولی اہمیت آپ کے پیشِ نظر رہے اور اسی روشنی میں آپ میرے مضمون کا مطالعہ فرمائیں۔

بابل کی تاریخ :-

بابل کا اوّلین بادشاہ نمرود تھا، مشرق کے قریب قریب تمام فرمانروا اس کے باجگذار تھے۔ اور جو اپنی پوزیشن کے استحکام کے باعث خراج ادا نہ کرتے تھے، ان کا نام کم از کم نمرود کے نیاز مندوں کی فہرست میں درج تھا۔ ایسے آزاد فرمان روا جشنِ نوروز کے موقع پر تحائف اور ہدایا، نمرود کی بارگاہ میں گذرانتے تھے۔ نمرود بچپن ہی سے انانیت کا پتلا، اور نخوت و غرور کا مجسمہ تھا۔ شہنشاہی کے زینہ پر پہنچ کر اس کا دماغ اور بگڑ گیا۔ اور اس نے اپنی خدائی کا اعلان کر کے خود کو سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ اس دَور میں اگرچہ کواکب پرستی عام ہو گئی تھی، اور نظریۂ توحید دماغوں سے قریب قریب محو ہو گیا تھا مگر ابھی ایسی سعید روحیں اس زمانہ میں بھی موجود تھیں جو خدا کے نام میں ایک خاص لذت محسوس کرتی تھیں اور غیر اللہ کی پرستش کے تصور سے اُن کو دُکھ ہوتا تھا اس قسم کے لوگوں نے نمرود کے خدائی احکام کی خلاف ورزی کی، مگر اس کے جبر و ستم نے ان خدا پرستوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ کچھ لوگوں نے مجبور ہو کر ہجرت کی۔ بعض کو موت کے تلخ جام پینا پڑے۔ صرف چند نفوس ایسے باقی رہ گئے، جو تلواروں کے سایہ میں بھی خدا کا نام لیتے تھے، بہرحال ان پاک نفوس کو اگر خارج کر دیا جائے تو یہ کہنا بالکل غلط نہ ہوگا کہ سارا عراق اور اس کے قرب وجوار کے باشندے نمرود کو پوجتے تھے، جب صبح کے وقت نمرود، بابل میں اپنی محلسرا کے بالاخانہ پر آ کر بیٹھتا تھا اور اس کی نظر نیچے کے حصّے پر پڑتی تھی تو وہ ہزاروں پیشانیوں کو اپنے حضور سجدہ ریز پاتا تھا، نمرود نے

اپنی محسرائے کو اس ترتیب کے ساتھ تعمیر کرایا تھا، کہ وہ اس قسم کے منظرِ پرستش کو زیادہ سے زیادہ آسانی کے ساتھ دیکھ سکے۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ میں نمرود کی جھوٹی خدائی پر تباہی آئی اور اس کے چراغِ حیات کو خدائے حقیقی کے حکم کے ادنےٰ جھونکے نے گل کر دیا۔

نمرود کے جانشینوں نے کوئی خاص شہرت حاصل نہ کی۔ نمرود جو شہنشاہی کا ایک خاکہ قائم کر گیا تھا وہ اسی کو سنبھالے بیٹھے رہے۔ مگر چونکہ ان میں خود کوئی خاص جوہر موجود نہ تھا۔ لہذا باجگزار فرمانرواؤں کی عقیدت کا جوش بھی کم ہو گیا۔ لیکن ان تمام کمزوریوں کے باوجود شہنشاہِ بابل کے زمان کو پڑھتے وقت، بادشاہوں کے ہاتھ کپکپا جاتے تھے۔ نمرود کی اولاد میں سب سے زیادہ شہرت "اُور خامس" کو حاصل ہوئی اس کا نام اور بعض حالات ان اینٹوں پر مسماری خط میں کندہ ملے ہیں جو حال میں زمین سے نکالی گئی ہیں۔ مسماری رسم الخط کا اوّل تو پڑھنا بہت وقت طلب ہے پھر اتنے دن خاک میں دبے رہنے کے بعد عبارت کے نقوش بہت دھندلے ہو گئے ہیں۔ تاہم ماہرینِ رسم الخط نے اس عبارت کو پڑھ کر اس زمانہ کے تمدن اور طرزِ حکومت کے بارے میں بہت کچھ اشارات دیئے ہیں۔ "اُور خامس" کے بعد خاندانِ نمرود کا شیرازہ بکھر گیا۔ پہلے تو ملحقات کے فرمانرواؤں نے خود مختاری کا اعلان کیا، اس کے بعد خود عراق کے جنگجو امرا نے اپنی اپنی سیادت الگ قائم کر لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آلِ نمرود کی شہنشاہی کی جڑیں کھوکھلی ہو گئیں، اور ایرانی فرمانروا نے آلِ نمرود کو شکست دے کر بابل کو فتح کر لیا، تقریباً دو سو پچیس سال تک بابل، ایرانی حکومت کے زیرِ نگیں رہا۔ ایرانی بہت متعصب تھے، بابلیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس نسلی امتیاز و فخر کا یہ نتیجہ ہوا کہ اہلِ بابل کے دلوں میں بھی ایرانی حکومت کی جانب سے گرہ پڑ گئی، ظاہر ہے کہ رعایا کی بددلی کے بعد کوئی جابر سے جابر حکومت بھی زیادہ دن قائم نہیں رہ سکتی، لہذا ایرانیوں کو بھی بابل سے دستکش ہونا پڑا اور ۲۲۲۵ قبل مسیح میں بابل میں ایک اور سلطنت قائم ہو گئی، جس کا نام "املائی" تھا۔ اسی خاندان کے ایک بادشاہ "کو دولا اومر" سے حضرت ابراہیم خلیل علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے مقابلہ فرمایا تھا اور آپ فتح یاب ہوئے تھے۔

انقلابات کا تسلسل:-

تقریباً ۲۰۰۰ ق م میں بابل پر کلدانیوں نے قبضہ کیا، اور ساڑھے چار سو برس تک ان کا پرچم حکومت یہاں لہراتا رہا۔ مگر انقلاباتِ عالم کی آندھیوں نے اس پرچم کو بھی سرنگوں کر دیا، اور کلدانیوں کی جگہ مصریوں نے حاصل کی۔ مصری ۱۳۰۰ قبلِ مسیح تک حکمران رہے اشوریوں نے مصریوں کو شکست دے کر اپنی حکومت قائم کی اشوری حکومت کو بھی انقلاب کی تنگ وادی سے گذرنا پڑا اور ۵۳۹ء میں "کورش" شاہِ ایران نے ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ "اُر" اور "بابل" کے کھنڈروں سے جنہیں حال ہی میں محکمۂ اکتشافاتِ حجریہ نے کھدوا ہے، اشوری حکمرانوں کے بہت سے مجسمے، اسلحہ اور دیگر قسم کا سامان برآمد ہوا ہے۔ تمام برآمد شدہ اشیا بغداد کے عجائب خانے میں رکھی ہوئی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اشوری بادشاہوں کو تصویر کشی کا بہت ذوق تھا، اور شاہی خواتین، زیوروں میں لدی رہتی تھیں۔

بابل اور نینوا میں ہمیشہ سے رقابت چلی آتی تھی۔ وہ ایک دوسرے کی بربادی پر تلے ہوئے تھے۔ جب بابلی شہنشاہوں کا آفتابِ اقبال نصف النہار پر تھا، اس وقت بھی نینوا کے خوددار فرمانروا مساویانہ طور پر ہدایا و تحائف کی ترسیل کے سوا کسی طرح بھی اُن سے دب کر نہ رہتے تھے، بابلی فرمانروا، جو غرور و نخوت کے پتلے تھے، اس رقابت اور ہمسری کو کب گوارا کر سکتے تھے، لہذا انھوں نے وقتاً فوقتاً نینوا پر چڑھائیاں کیں، مگر اہلِ بابل کی یورشوں کا "زور" اہلِ نینوا کی مردانگی و شجاعت کے "افعی" کا حریف نہ بن سکا۔ اہلِ نینوا بڑے مصلحت شناس تھے۔ انہوں نے مدافعت کے علاوہ کبھی کھل کر جارحانہ کارروائی نہ کی۔ کیونکہ بابل کی حکومت سے ٹکرانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ مگر آٹھویں صدی عیسوی میں جب بابلی فرماں روا کمزور ہو گئے تو اہلِ نینوا نے بابل پر ہلہ بول دیا، اور ۶۲۵ ق م میں بابل فتح کر لیا۔ اہلِ بابل اپنے پرانے رقیب کی سیادت کو کب ماننے والے تھے، انھوں نے سازباز کر کے ایرانیوں کو ملا لیا، اور تازہ دم ایرانیوں کی مدد سے ۶۰۶ ق م میں نینوا والوں کو بابل سے نکال باہر کیا۔

اہلِ نینوا کے اخراج کے بعد بھی بابلیوں کا جوشِ انتقام ٹھنڈا نہ ہوا - انھوں نے نینوا پر شدید یورش کی - اہلِ نینوا ابھی پہلی شکست ہی سے نہ سنبھل پائے تھے کہ ایک دوسرا پہاڑ سر پر ٹوٹ پڑا - انھوں نے مقابلہ کیا - لیکن مست ہاتھیوں کے گلوں کا زخمی بلیں کیا مقابلہ کرسکتی تھیں - نتیجہ یہ ہوا کہ نینوا والوں کو ایک ایسی شدید شکست کا سامنا کرنا پڑا، جس نے ان کے اقبال و تمدن کے چراغ کو ہمیشہ کے لئے گل کر دیا، ان کے شہر ویران کئے گئے - فلک بوس محلوں کو ڈھایا گیا، نوجوانوں کو ذبح کیا گیا - غرض بابلی سیلاب نے نینوا کے تمدن کو تباہ کر ڈالا اور ان کا نام و نشان بھی صفحۂ ہستی پر باقی نہ رہا +

بابل کی تعمیر

نینوا کے بعد ہی "بخت نصر" ظاہر ہوا۔ بخت نصر کو بڑے سکون و اطمینان کا زمانہ ملا - نینوا کی حکومت جو بابل کی قدیم رقیب تھی تباہ ہو چکی تھی - ایرانیوں سے بھی اکثر چھیڑ چھاڑ رہا کرتی تھی "یورشِ نینوا" کے بعد سے وہ بھی دوست ہو گئے، نینوا کی ساری دولت بابل میں آ چکی تھی - لہذا اس طرف سے بھی اس کو اطمینان تھا - دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ جن بادشاہوں کو امن و اطمینان نصیب ہوا ہے انھوں نے تعمیرات کی جانب بہت کچھ توجہ کی ہے - اس سلسلے میں شاہجہان کا نام پیش کیا جا سکتا ہے جس کے اطمینان خیز عہدِ حکومت کا افسانہ تاج محل کا ہر مرمریں کنگرہ سناتا ہے - یونان کے مشہور مؤرخ ہیروڈوٹس نے لکھا ہے کہ بخت نصر نے بابل کی از سرِ نو تعمیر کا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے اس بات کا اعلان کیا کہ وہ بابل کو ایسی طرز پر تعمیر کرنا چاہتا ہے کہ دنیا نینوا کی شان و شوکت کو بھول جائے چنانچہ نینوا کے قیدیوں اور معماروں سے یہ کام لیا گیا - ہیروڈوٹس نے بابل کی سیاحت کی تھی، وہ لکھتا ہے کہ شہر کے وسط میں دریا بہتا تھا، اور شہر بیس میل کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا - چاروں طرف ۳۵۰ فٹ بلند اور ۸۷ فٹ چوڑی شہر پناہ تھی - اس میں پیتل کے سو پھاٹک تھے - پھاٹکوں کے ستون اور چھتیں بھی پیتل کی تھیں +

بخت نصر کو اگر "شداد ثانی" کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا اس نے عراق کے مرغزاروں میں ایک دوسری "ارم" کھڑی کر دی جس نے واقعی نینوا کی شان و شوکت کو گرد کر دیا - ہر پیشے کے لوگوں کے لئے علیحدہ علیحدہ محلے قائم کئے گئے - مختلف قسم کے مسقف بازار بنائے گئے، دریا کے کنارے تفریح گاہیں قایم کی گئیں - جہاں حسین لڑکیاں پھولوں کے ہار بیچتی تھیں - یہ حال تو عام شہر کی آبادی کا تھا اور شاہی محلوں کا کیا پوچھنا، ان کی ایک ایک محراب فنِ تعمیر کا شاہکار تھی - آخر میں جا کر بخت نصر پر بھی محاربات کا بھوت سوار ہوا - اس نے بیت المقدس کو برباد کر کے یہودیوں کو قید کر لیا +

مناظرِ عبرت

ہم نجفِ اشرف کی زیارت سے مشرف ہو کر کوفہ آئے اور کوفہ سے حضرت ذوالکفل پیغمبر کے مزار پر حاضری دیتے ہوئے حلہ پہنچے - حلہ چھوٹا سا شہر ہے - لیکن بہت ہی بارونق ہے یہاں پر متصرف (کلکٹر) رہتا ہے، اس سبب سے قریوں کے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں - حلہ سے تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر بابل کے کھنڈر واقع ہیں - جب ہماری موٹر بابل کے قریب پہنچی تو ایک کمسن عراقی لڑکے نے خود کو بطور راہبر (Guide) پیش کیا - ہمارے نوخیز رہبر کی عمر مشکل سے دس گیارہ سال کی ہوگی نیچا کرتہ پہنے ہوئے تھا جو بہت میلا تھا - چہرہ گرد آلود تھا - ہاتھ میں ایک بدصورت سی لکڑی تھی - سر پر رومال بندھا ہوا تھا - لیکن اس ہیئت کے باوجود ذہانت کا پتلا اور فطانت کا مجسمہ تھا - عربی تو خیر اس کی مادری زبان تھی، انگریزی بہت اچھی بولتا - اردو سے بھی قدرے واقف تھا - ہر چیز کی تفصیلات اس کو ازبر تھیں - یہ بیچارہ کھنڈروں کے چکر کاٹا رہتا ہے - جب کوئی سیاح ادھر آ نکلتا ہے تو اس کی رہبری کے فرائض انجام دے کر کچھ پیدا کر لیتا ہے

وہ بابل جس کی جزئی تفصیل ہیروڈوٹس نے پیش کی ہے اب خاک کے تودوں میں تبدیل ہو گیا ہے، کئی میل تک ریت کے تودوں کا سلسلہ نظر آتا ہے جو اس برباد شدہ حالت میں بھی اپنی عظمت کا ثبوت دے رہے ہیں - شہر کے بازاروں، کاروان سراؤں اور تفریح گاہوں کا ایک دھندلا سا نقش بھی باقی نہیں رہا - پہلے بابل کے وسط میں دریا موجیں مارتا تھا اب اس کے کھنڈروں میں سے ہو کر ریل کی پٹڑی گذرتی ہے، اور صبح و شام ریل کا انجن دھوئیں اڑاتا ہوا ان شاہی محلوں کے قریب سے گزر جاتا ہے جہاں بڑے بڑے بادشاہوں کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتے تھے ۔

شاہی محلوں کے آس پاس مٹی کے انبار لگے ہوئے ہیں محکمہ اکتشافاتِ اثریہ کی سعی و توجہ سے قبل یہ کھنڈر مٹی میں دبے ہوئے تھے۔ بڑی کوششوں کے بعد ان باقیماندہ آثار کو نکالا گیا ہے۔ محکمہ مذکورہ کی کوششیں قریب قریب ختم ہو چکی ہیں اور آسودگانِ بابل کو شاید اب بہت زیادہ عرصہ تک کے لئے نہ چھیڑا جائے گا۔

چاہِ بابل۔

ہاروت و ماروت کا ذکر قرآن شریف میں آیا ہے بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ فرشتے اسی کنوئیں میں قید کر دیئے گئے تھے۔ عراقی حسینوں کی دلفریبی کے ہوشربا مناظر میری آنکھوں نے دیکھے ہیں، پس کچھ مستبعد نہیں ہے اگر ان غارتگرانِ صبر و ہوش کا جادو فرشتوں پر بھی چل گیا ہو اور انہوں نے اپنی کائناتِ اتقا کو اُن رنگین رخساروں پر قربان کر دیا ہو، جن کی جھلک دلوں کو بے قرار کر دیتی ہے۔ یہ کنواں گرد سے اٹ گیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو تین گز کا عمق ہو گا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کو مصلحتاً بند کرا دیا گیا ہے۔ اس "بیئرِ معطلہ" میں کیا اسرار مکتوم ہیں۔ اس کا علم خدا کو ہو گا +

عظیم الشان حمام۔

چاہِ بابل سے تھوڑے فاصلے پر "حمام" ہے۔ بخت نصر کے عہد میں اس حمام کی ہیئت نہ معلوم کیا ہو گی۔ اس وقت تو ایک زینہ باقی ہے جو نیچے زمین میں پانی تک چلا گیا ہے، پانی اب تک دکھائی دیتا ہے، لیکن استعمال ہونے کے باعث بہت گدلا ہے۔ زینہ کے پہلو میں بعض شکستہ دیواریں نظر آتی ہیں، جو حمام کی عمارت سے ہی متعلق معلوم ہوتی ہیں۔ میرے خیال میں یہ حمام کے کمروں کی دیواریں ہیں جہاں لباس تبدیل کیا جاتا ہو گا۔ عہدِ قدیم کی جو اشیا برآمد ہوئی ہیں ان سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی عورتوں کو بناؤ سنگار کا بہت شوق تھا، کیا عجب ہے کہ حمام کے قریب کے کمروں میں شاہی خواتین کو خاص طور پر سنوارا جاتا ہو +

ایوانِ خاص۔

حمام سے چند قدم کے فاصلے پر قصرِ خاص ہے جو اس وقت خاک کا عظیم الشان تودہ ہے۔ صرف ایک چبوترے اور ایک آدھ شکستہ دیوار باقی رہ گئی ہے، یہ چبوترے شاہی تخت کا کام دیتے تھے جن پر بیش بہا قالین بچھے رہتے تھے۔ یہ قصر بادشاہ کا خاص کمرہ تھا، جہاں عیش و نشاط کا بازار گرم رہتا تھا۔ نوجوان چھوکریاں ساقی گری کرتی تھیں، خوب صورت اور خوش اندام لڑکیاں رقص کرتی تھیں، حسین لڑکے چنگ و بربط نوازتے تھے، ایوان کی دیواریں پکھراج اور یاقوت سے لدی رہتی تھیں۔ سینکڑوں سیر عود اور عنبر سلگتا تھا، کافوری شمعوں کی کثرت سے رات میں دن کا منظر نظر آتا تھا، یہ ایوان بادشاہ کی خلوت گاہ تھا۔ صرف بعض ضروری مشوروں کے لئے مدبرِ عظیم (چیف منسٹر) کو بھی کبھی کبھی آنے کی اجازت مل جاتی تھی، اس شکستہ قصر کی وسعت سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ واقعی پرلطف شاندار محل ہو گا، اور اس کو حمام سے زیادہ مضبوط بنایا گیا ہو گا، مگر حیرت ہے کہ حمام تو شکستہ حالت میں موجود ہے اور اس مستحکم قصر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، لیکن اس میں حیرت کی کیا بات ہے، انسان کے قیاس و اندازہ کے طلسم قدرت اسی طرح توڑتی رہتی ہے +

باغہائے معلق۔

قصرِ خاص سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر باغہائے معلق ہیں جن کے شکستہ ستون باقی رہ گئے ہیں، مؤرخین نے لکھا ہے کہ بخت نصر نے اپنی بیوی کے خوش کرنے کے لئے یہ باغ بنوائے تھے۔ ممکن ہے کہ ان چمنستانوں کی تعمیر و ترتیب کے دیگر اسباب میں ایک سبب بیوی کی خوشنودی بھی ہو، مگر میری ذاتی رائے یہ ہے کہ عراق میں گرمی بلا کی پڑتی ہے اور دوپہر کو تو آگ برستی ہے لہذا خاص طور پر گرمیوں میں رہنے کے لئے ان باغوں کو تعمیر کیا گیا۔ ان باغوں کی تفصیل آگے آتی ہے جو میرے اس خیال کی تصدیق کرتی ہے۔ ہوشیار انجینئروں نے کچھ اس ترتیب کے ساتھ پشتے لگا کر ستون بنائے تھے کہ ان کی چھتوں پر جو پودے لگے ہوئے تھے وہ بالکل معلق معلوم ہوتے تھے، بعض تناور سایہ دار درخت بھی لگائے گئے تھے۔ پانی کا ایسا اچھا انتظام کیا گیا تھا کہ تمام باغ تھوڑی دیر میں سیراب ہو جاتا تھا۔ روشوں کے وسط میں جا بجا فوارے موتی برساتے تھے۔ بعض دیواروں پر آبشار رواں تھے اور ان آبشاروں

کو جو موج ہوا چھو کر آتی تھی اسی کے محاذ میں شاہی نشست ہوتی تھی۔ ان باغوں کے لئے ایسے خوشنما پرندے مہیا کئے گئے تھے جو خوبصورت ہونے کے علاوہ خوش الحان بھی تھے۔ بخت نصر کی یہ جنت ارضی بھی حوروں سے خالی نہ تھی، آبشاروں اور فواروں کی جھرمٹ پھولوں کی کیاریوں، اور سبزہ زار کے آغوش میں بربط نوازی ہوتی تھی، شراب کے جام چلتے تھے اور حسین گانے والیاں مست ہو کر پھولوں سے کھیلتی تھیں، بعض پودے اس قسم کے تھے جن کے پھول پتیوں پر شراب چھڑکی جاتی تھی، تو وہ اور زیادہ شاداب ہو جاتی تھیں۔ ان طلسمی باغوں کے شکستہ ستون، اینٹوں کے بنے ہوئے ہیں جو بہت بلند ہیں۔

معبد

معبد کی صرف چند شکستہ دیواریں باقی رہ گئی ہیں۔ ان دیواروں پر بعض خونخوار جانوروں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ اینٹوں پر رنگ و روغن کر کے یہ تصاویر مرتب کی گئی ہیں۔ بعض تصاویر کے رنگ اگرچہ دھندلے ہو گئے ہیں۔ تاہم تصاویر بالکل صاف نظر آتی ہیں۔ ہندوستان میں جس طرح سانپ کو پوجتے ہیں اسی طرح اس دور کے لوگ خونخوار جانوروں کی پرستش کرتے تھے۔ یہ معبد خاص شاہی خاندان کے لئے مخصوص تھا، چھوٹے طبقے کے افراد یہاں جھانک بھی نہ سکتے تھے اس معبد کے محافظ کو بہت ہی مقدس سمجھا جاتا تھا، اور جب کبھی یہ بابل کے شہر سے گزرتا تھا تو خلق خدا عقیدت کے مارے اس پر ٹوٹ پڑتی تھی۔ شکستہ دیواروں کی وضعیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس معبد کا گنبد بلا شک نہایت ہوگا اب تو ایک غار نظر آتا ہے۔

شیر کا عجیب و غریب کا مجسمہ :-

معبد کے بعد غاروں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو شاہی عمارتوں کے نقوش ہیں۔ بعض غار بہت گہرے ہیں۔ ان غاروں کے بیچ میں شیر کا مجسمہ رکھا ہوا ہے یہ مجسمہ سیاہ پتھر کا ہے۔ تناسب جسمانی کے اعتبار سے اس کی ساخت اچھی ہے۔ شیر کے نیچے ایک عورت کا مجسمہ ہے جو چت لیٹی ہوئی ہے۔ نہ معلوم اس مجسمے کا کیا منشا ہے؟ جب محکمۂ آثار قدیمہ نے بابلی کھنڈروں کی کھدائی کی تو یہ مجسمہ مٹی کے نیچے سے برآمد ہوا۔ اب اس کو ایک اونچے چبوترے پر رکھ دیا گیا ہے۔ میری رائے میں اس شیر کی پرستش کی جاتی ہوگی۔ عورت کے مجسمہ کے امتزاج سے یہ بات ترشح ہوتی ہے کہ شاید عورتیں خاص طور پر اس کی پوجا کرتی ہوں گی۔

شارعِ خسروی :-

معبد اور قصر کے قریب ہی ایک فراخ و وسیع راستے کے نشانات پائے جاتے ہیں، جو بادشاہ کی سواری کے لئے مخصوص تھا یہ راستہ اس قدر چوڑا ہے کہ دس بارہ گھوڑے برابر اس پر سے وقت واحد میں گذر سکتے ہیں اس راستہ کے محلِ وقوع سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ غالباً ہر شاہی عمارت کے صدر دروازے کے پاس سے یہ راستہ گذرتا ہوگا۔ آج کل جیسا کہ سڑکوں پر کولتار بچھاتے ہیں اسی قسم کا سیاہ مسالہ اس سڑک پر بچھا ہوا تھا۔

درسِ عبرت :-

اس عبرت کدے کو دیکھنے کے بعد اپنے نوخیز گائیڈ کو ہم نے چند فلس (عراقی سکہ) دیئے اُس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے گڈ بائی کہا، اور ہم وہاں سے بغداد پاک کے لئے روانہ ہو گئے آہ! بخت نصر کو کیا خبر تھی، کہ اس نے جس طلسمی عمارت پر بے شمار دولت صرف کی تھی اس کا آئندہ چل کر یہ مصرف ہوگا کہ ایک عراقی لڑکا اس کے شکستہ آثار کو دکھا کر چند پیسے پیدا کر لیا کرے گا۔ سچ ہے نیرنگ و تحسین ہے وہ روح جو ان عبرتکدوں کے مناظر سے متاثر ہو کر خالقِ کائنات کی یاد میں محو ہو گئی۔

منظور حسین ہمدم القادری

تجلّیات

مائلِ دیں دِلِ دیوانہ ہمارا نہ ہُوا
وعظ برسوں سُنے سر سجدے میں مارا نہ ہُوا

اُس کے افسانے سے ہے گرمِ طرب ہر محفل
گرچہ وہ حُسن کبھی انجمن آرا نہ ہُوا

میں ہوں اُس نازِ مجسم کی داؤں کا شہید
کہ جو اِک بار ہُوا ناز دوبارا نہ ہُوا

آتشِ شوق بھڑک اُٹھی بھبوکا بن کر
اِک قیامت ہوئی دہن کا اشارا نہ ہُوا

خوفِ رسوائی سے اُس پردہ نشیں کے ہم کو
زہر کھانے کا غمِ ہجر میں یارا نہ ہُوا

پرسشِ حال میں ہے تذکرۂ غیر کی چھیڑ
دشمنی یہ تو ہوئی مجھ سے مدارا نہ ہُوا

اِک کرم پر تھا ترے شوق کی ہستی کا مدار
تجھ کو اے شوخ مگر یہ بھی گوارا نہ ہُوا

اور اب کس سے زمانے میں ہو امیدِ وفا
جس کو ہونا تھا ہمارا وہ ہمارا نہ ہُوا

جو ہُوا اپنی غرض کا ہُوا بندہ ہمدم
کوئی میرا نہ ہُوا، کوئی تمہارا نہ ہُوا

کس لئے ترکِ محبت کے تھے دعوے اے دل
جبکہ دو دن بھی بغیر اُس کے گذارا نہ ہُوا

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے
وہ ملے بھی تو ہمیں دید کا یارا نہ ہُوا

کہنے کو اور بھی کہتے ہیں حدیثِ اُلفت
کوئی اکبر سا جہاں میں غزل آرا نہ ہُوا

جلال الدین اکبر

خواب آور

میرے مکان کے سامنے رنگی ہوئی چاندی کی ایک بے شکن چادر کی مانند، دریا بہہ رہا تھا۔ — خوبصورت، اور سکوں کی حد تک سست رفتار۔ لمبے اور گھنے درختوں کی ایک طویل قطار، ایک رُخ سے دوسرے رُخ تک پھیلی ہوئی تھی۔

درختوں کے پتے زندگی کے ایک مسرت بخش احساس سے، تازگی، دلکشی، اور شباب کے احساس سے — سہلکھا رہے تھے، ہوا میں ہلکا ہلکا نغمہ تھا؛ اور سورج، بار بار جھک کر دریا کی سطح کو چوم رہا تھا؛

بہت دیر تک اس منظر کی جاذبیت میں رہ کر یکایک خیال آیا کہ، نوکر میز پر اخبار رکھ گیا ہے؛ اٹھا کر پڑھنے لگا؛ دوسرے صفحہ پر خودکشی کے حادثوں کے اعداد دیئے تھے جن سے معلوم ہوا کہ محض گذشتہ سال میں تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار اشخاص نے خودکشی سے جان کھوئی

اس قسم کی خبریں اور واقعات مجھے ہمیشہ تصور میں گرفتار چھوڑ جاتے ہیں؛ یہاں تک کہ بعض اوقات تو میں محسوس کرنے لگتا ہوں کہ تخیل کا حد سے زیادہ مجبور ہونا بھی اسی قدر محرومی ہے جس قدر اُس سے یکسر عاری ہونا؛ یہ اعداد پڑھ کر میں حسبِ معمول فکر میں ڈوب گیا۔

چند ہی لمحے بعد میری آنکھوں کے سامنے اس خود مظلوم گروہ کی تصویریں یکے بعد دیگرے گذرنی شروع ہو گئیں؛

ایک شخص نظر آیا کہ ایک ہوٹل کے کمرے میں مجروح و بسمل پڑا ہوا ہے جبڑا ٹوٹا ہوا ہے، سر پاش پاش ہو چکا ہے؛ اور موت نزع انگیز آہستگی کے ساتھ اس کے جسم و دماغ پر غلبہ پا رہی ہے؛

منظر بدل گیا، ایک اور شخص دکھائی دیا؛ جو ایک بند کمرے میں آرام کرسی پر بیٹھا ہے؛ سامنے میز پر سُرخ لیبل لگی ہوئی ایک شیشی رکھی ہے۔ وہ اُس کی طرف حسرت آلود نظر سے دیکھتا ہے۔ گویا اسکی آنکھیں گھورتے گھورتے بینائی سے عاری ہو جائیں گی۔ پھر وہ خاموشی سے ڈاٹ کھولتا ہے؛ اور شیشی کو حلق میں الٹ لیتا ہے؛

اُسکے چہرہ پر درد انگیز کیفیت طاری ہے؛ ہونٹ شدت کرب سے کانپتے ہیں آنکھوں میں ہراس جھلک رہی ہے۔

ایک اور شخص نظر آیا؛ کہ ایک درخت سے لٹک رہا ہے آنکھیں اُبلی ہوئی ہیں؛ زبان باہر لٹک رہی ہے، نیچے پتھر سے دبا ہوا ایک کاغذ کا پرچہ رکھا ہے؛

یہ تصویر بھی گذر گئی؛ ایک سنسان و نیم شکستہ پل پر بے چینی سے ٹہلتا ہوا ایک اور شخص نظر آیا؛ پل کی محرابوں میں سے پانی آہستہ آہستہ بہہ رہا ہے۔ ایک لطیف سرگوشی کے ساتھ؛ وہ پانی کو نہیں دیکھتا محض اُس کی خنک بو سونگھتا ہے؛ دور ایک گھڑیال کی آواز سنائی دیتی ہے؛ پھر دفعتہً گرد و پیش کی تاریک و وسیع خاموشی کو چیرتی ہوئی ایک وزنی چیز پانی میں گرتی ہے؛ —— چند چھینٹیں سنائی دیتی ہیں؛ پانی پر انسانی ہاتھوں کے دو تین تھپیڑے! —— پھر وہی خاموشی!

خدا معلوم اسی طرح، خیال ہی خیال میں، کتنی دیر تک یہ مصیبتیں برداشت کرتا رہا؛ یہ موتیں مرتا رہا؛ لیکن جب میں نے چونک کر دیوار پر لٹکا ہوا گھنٹا دیکھا، تو صرف پندرہ منٹ گذرے تھے؛ لیکن اس پندرہ منٹ کے قلیل وقفے میں، نہایت تیز رفتاری کے ساتھ میں نے خودکشی کی زہرہ گدازیاں برداشت کرتی تھیں؛ — گویا صدیاں گذر گئیں اور میرا دماغ تناسخ کے سینکڑوں مرحلے طے کر گیا؛

میرے دل میں خدا کے متعلق باغیانہ خیالات پیدا ہونے شروع ہو گئے؛ اور میں نے رنجیدہ ہو کر کہا "دنیا نام ہی محرومیوں کا ہے؛ اپنی بدقسمتیوں کا؛ محبوبوں سے مفارقت کا"؛ اور خودکشی؟ خودکشی اُن لوگوں کی طاقت ہے؛ جن کی طاقت زائل ہو چکی ہو؛ اُن کی امید ہے جو امید کرتے کرتے تھک گئے ہوں

بیشک اس زندگی میں تمام دروازے مسدود ہو جانے کے بعد بھی، ایک دروازہ باقی رہتا ہے؛ جسے کھول کر انسان ہمیشہ زندگی کے دوسرے رُخ پہنچ سکتا ہے؛ کم از کم فطرت نے اس عظیم قیدخانہ

میں ایک راہِ فرار ضرور چھوڑ دی ہے۔ اور اس بے رحم دنیا میں یہی کیا کم رحمدلی ہے"

. . . .

اسی طرح غور کرتے کرتے، میں نے اپنے سامنے کے منظر کو بتدریج دھندلا ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ برآمدہ، دریا، اخبار ہر چیز پر ایک عجیب قسم کی غیرواقعیت سی طاری ہونے لگی۔ لیکن جلد ہی دماغ پھر سرعت سے مصروفِ عمل ہو گیا۔

میرے سامنے ایک وسیع و خوبصورت شہر تھا۔ میں اُس میں بہت دیر تک آوارہ پھرتا رہا ۔۔۔ مکانوں، تھیٹروں، اور سکولوں کو دیکھتا ہوا۔ پھر دفعتہً ایک عالی شان عمارت پر نظر پڑی، دروازے پر لٹکے ہوئے سیاہ جھنڈے کو دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا۔

ادارۂ مماتِ خود اختیاری

سامنے لکڑی کی بنچ پر چند دربان بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اندر کی طرف جھانکا تو ایک وسیع ہال نظر آیا۔ اتنے میں دربان نے اٹھ کر پوچھا

"آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے، جناب؟"

"محض یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ کونسی جگہ ہے؟"

"بس؟"

"ہاں!"

"مگر کیا آپ اِس ادارے کے سکرٹری صاحب سے ملنا پسند نہ کریں گے"

"بیکار اُن کا حرج کرنے سے کیا فائدہ؟"

"نہیں جناب حرج کیسا۔ اُن کا تو کام یہی ہے۔"

"بہت اچھا۔ چلو"

ہم چند صحنوں میں سے گذرے جن میں کچھ بڈھے آدمی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ایک جانب ایک میز بچھی ہوئی تھی اور اُس کے گرد چار شخص بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ دوسری طرف کچھ لوگ صوفوں پر دراز سگریٹ پی رہے تھے۔ پھر مجھے ایک نہایت خوبصورت کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں کا تمام سامانِ آرائش سیاہ تھا۔ غالباً اسی وجہ سے کمرے کی فضا کچھ ماتمی سی تھی۔ لیکن جس حسنِ مذاق کے ساتھ ہر چیز آراستہ کی گئی تھی وہ بے حد دلکش تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک لمبی لکھنے کی میز تھی۔ جس پر ایک شخص بیٹھا خط لکھ رہا تھا۔ پاس ہی راکھ جھاڑنے کے ظرف میں ایک خوشبودار سگار جل رہا تھا۔ سکرٹری صاحب فراپست قد اور مائل بہ فربہی، میرے استقبال کو اُٹھے ملازم دروازہ بند کر کے چلا گیا۔

سکرٹری صاحب عامیانہ انداز میں بولے "میرے لائق کارِ خدمت؟"

"تکلیف دہی کو معاف فرمائیگا ادھر سے گذر رہا تھا اور اِس کے نام نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ اسی کے متعلق کچھ اور معلوم کرنا چاہتا ہوں"

جواب دینے سے قبل، سکرٹری صاحب مسکرائے پھر اطمینان کے لہجے میں بولے "جناب یہاں مرنے کے خواہشمند حضرات کو نفاست اور خاموشی کے ساتھ مارا جاتا ہے"

سکرٹری صاحب کا بیان بجائے خود حیرت انگیز نہ تھا۔ مگر میں خود متعجب تھا۔ کہ اِس سیارے پر جہاں تہذیب نام افادیت اور خود غرضی کا ہے۔ جہاں کے باشندے "آزادی" اور "انسانیت" کے نام پر مٹ جانے کا دعوےٰ کرتے ہیں مگر جو "انسانیت" اور "آزادی" کے صحیح مفہوم سے بھی کلیتاً نابلد ہیں ۔۔۔ کسی ایسی جگہ ایک ایسی رسم کا متمدن عزم ممکن ہے؟

میں نے کہا "مگر یہ ہوا کیونکر؟"

"جناب ۱۹۳۵ء کی مردم شماری کے بعد خود کشیوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی تھی کہ فوری تدابیر اختیار کرنا ناگزیر ہو گیا۔ لوگ اپنے تئیں ہلاک کئے جا رہے تھے۔ گلیوں میں، جلسوں میں، ہوٹلوں میں سینما گھروں میں، ریل گاڑیوں میں ۔۔۔ ہر جگہ۔ ان لوگوں کے نزدیک جو میری مانند حقیقتاً زندگی سے محبت کرتے ہیں۔ یہ واقعات بدنما تھے اس کے علاوہ بچوں کے کردار کو اس اخلاقی بزدلی سے محفوظ رکھنے کے لئے بھی، خود کشیوں کو ایک مرکز پر لانا اشد ضروری تھا۔"

"لیکن اس قدر سرعت سے خود کشیوں کی تعداد بڑھنے کا کیا سبب تھا؟"

"میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ مگر میرا خیال ہے کہ لوگ دُنیا کو ضرورت سے زیادہ فرسودہ سمجھنے لگے ہیں۔ وہ چیزیں جو ہمارے اجداد کے زمانے میں اسرارِ قدرت سمجھی جاتی تھیں اب جدید علم کی روشنی میں مضحکہ خیز حد تک عامیانہ معلوم ہونے لگی ہیں۔ ہم اپنی قسمتوں کو قناعت کے

ساتھ قبول کرینگی بجائے محض ایک جابر، خود مختار بادشاہ کے حکم کی طرح برداشت کر رہے ہیں۔ بھلا غور تو کیجئے کہ آج کل نعدیوں کی بھی کم و بیش وہی حالت ہے، جو حکومتوں کی ہم فیصلہ کرتے ہیں کہ ہمیں ہر مقام پر دھوکا دیا جا رہا ہے۔ اور ہم احتجاج کے طور پر اس تمام کاروبار سے بے تعلقی کا اعلان کر دیتے ہیں۔ جب ہم صریح طور پر دیکھتے ہیں کہ خدا انسانوں کو دھوکا دے رہا ہے۔ ان کے ساتھ جھوٹ بول رہا ہے انکو بیہودہ سو لوٹ رہا ہے بالکل اسی طرح جیسے ایک نمائندہ اپنے علاقہ کے لوگوں کے ساتھ کرتا ہے۔ تو ہم سخت برہم ہوتے ہیں۔ اور چونکہ سیاسی نمائندوں کی مانند بہر حال ہم ایک نیا خدا انہیں مقرر کر سکتے! لہٰذا ایسی نامعقول اور مہمل جگہ سے ہجرت کر جاتے ہیں جہاں جمہور کے حقوق کو سخت بے دردی کے ساتھ پامال کیا جاتا ہے۔"

"واقعی"!

"مگر مجھے اُن سے شکایت نہیں: نہ خدا ہی سے ہے۔ آپ جانتے ہیں یہ تو انسان کے اخلاقی اور مذہبی نظریوں پر منحصر ہے۔"

"میں نے کہا بیشک، مگر آپ کے ادارے کا طریق عمل کیا ہے؟ کیا آپ بتانا پسند کرینگے؟"

"یقیناً" جناب آپ جب چاہیں، ہمارے ادارے کے ممبر بن سکتے ہیں! وہ ایک کلب ہے۔"

"کلب؟"

"بیشک کلب، اور ایسا کلب جسے ملک کے بہترین دماغوں، اور سب سے زیادہ سلجھے ہوئے ذہنوں نے ترتیب دیا ہے۔"

پھر سکرٹری صاحب نہایت زندہ دلی کے انداز میں ہنسے اور میں تحیر عرض کرتا ہوں کہ یہاں کے باشندے اس کلب کو نے حد پسند کرتے ہیں!"

"اچھا؟"

جی ہاں!"

آپ مجھے متعجب کئے جا رہے ہیں!"

جی نہیں تعجب کی کیا بات ہے؟ وہ دیکھتے ہیں کہ یہاں کے ممبر موت سے قطعاً نہیں ڈرتے۔ اور جو شخص موت سے نہیں ڈرتا وہ یقیناً دنیا میں خوش رہ کر زندگی گذارتا ہے! زندہ دل آدمی کو ہر شخص پسند کرتا ہے۔"

مگر جب وہ لوگ اپنے آپ کو ہلاک نہیں کرتے تو اس کلب کے ممبر کیوں بنتے ہیں؟!

خود کشی پر مجبور ہوئے بغیر، ہر شخص یہاں کا ممبر بن سکتا ہے۔

"پھر ــــ؟"

"مجھے بیان کرنے دیجئے۔ خود کشیوں کی تعداد کو بڑھتا دیکھ کر اور اس کریہہ اور نفرت انگیز منظر سے گھبرا کر جو اس قسم کے واقعات کا لازمہ ہے، چند ذہین اور خدا ترس لوگوں نے اس کے انسداد کے واسطے ایک ایسی انجمن بنائی جس نے دنیا کے بدقسمت اشخاص کے واسطے ایک بے درد موت کا انتظام کیا۔

"جی ــــ"

"جی ہاں تو ایک ایسی انجمن کی بنیاد ڈالی گئی جس کے تمام افراد، دور اندیش، مسرت پسند اور متین الفکر تھے۔ اور جو دنیا کے سب سے بڑے شہر میں ایک مندر تعمیر کرنا چاہتے تھے! ایک ایسا مندر جس کا مذہب مطلق موت سے نہ ڈرنا۔ شروع شروع میں تو یہ انجمن مشتبہ سمجھی گئی اور لوگ اس پھٹکتے ڈرتے تھے لیکن پھر بانیانِ انجمن نے ایک بہت بڑی مجلس منعقد کی اور رسم افتتاح نہایت شان کے ساتھ ادا کی گئی تقریریں ہوئیں۔ ڈرامے تمثیل کئے گئے بعض لا بے گئے پھول برسے اور نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ملک ٹوٹ پڑا! اور انجمن چل پڑی!"

"مجنونوں کے ساتھ! کس قدر وحشت خیز مذاق ہے!"

"بالکل نہیں! آخر موت کو اسقدر اندوہناک سمجھنے میں کیا خصوصی ہے؟ خصوصاً اس صورت میں کہ ہماری انجمن نے اُسے اسقدر سہل، خوشگوار اور ایک خاص حد تک ــــ "دلفریب" بنا دیا ہے۔ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ انسان کی کتنی بڑی فتح ہے۔"

"اچھا! تماشوں اور جلسوں میں تو لوگوں کا شامل ہونا قرین قیاس ہے! مگر یہ تو بتائیے کہ..... اُس..... کے واسطے بھی کوئی آتا ہے؟"

"ابتدا میں ــــ نہیں، لوگ اعتماد نہ کرتے تھے۔"

"لیکن بعد میں؟"

"ہاں بعد میں آنے شروع ہو گئے!"

"کتنے؟"

"بیسیوں، آجکل روزانہ اوسط پچاس اور ساٹھ کے درمیان ہے۔ اب مرنے والے جن میں اکثر عورتیں تقریباً ختم ہو چکی ہیں!"

"ابتدا کس نے کی؟"

"ایک ممبر نے"

"ایک خداترس ممبر نے"

"جی نہیں ایک مفلوک الحال، برباد شدہ — ممبر نے جو کامل تین ماہ سے ہر روز جوئے میں ہارا کرتا تھا!"

"جی — !"

دوسرا ایک انگریز تھا — مالیخولیا کا مریض۔ اس کے بعد ہم نے نہایت شدت کے ساتھ اخباروں میں اشتہار دیئے — اپنے خاص طریقوں کے متعلق۔ ہم نے محض وہی طریقے مشتہر کئے جو ہم جانتے تھے کہ لوگوں کو متوجہ کرنے میں کامیاب ہونگے! آجکل آپ یہ سن کر متحیر ہونگے کہ ہمارے کرم فرماؤں میں زیادہ تر مزدور پیشہ جماعتوں کے افراد ہیں!"

"لیکن وہ خاص طریقے کیا ہیں؟"

"آپ میرے ساتھ چلنا پسند کریں تو میں آپ کو دکھا سکتا ہوں"

"ضرور — بھلا مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے!"

سکرٹری صاحب نے اپنی ٹوپی اٹھائی۔ اور دروازہ کھول کر مجھے چلنے کا اشارہ کیا ایک کمرہ طے کیا جس میں بہت سے لوگ بیٹھے مختلف طریقوں سے جؤا کھیل رہے تھے۔ پھر اور کمروں میں سے گذرے، ہر جگہ مسرت اور شادمانی نظر آتی تھی! تمام عمارت قہقہوں کی آوازسے گونج رہی تھی مجھے حیرت ہوئی کہ موت سے اسقدر قریب رہ کر بھی یہ لوگ اسقدر خوش و خرم زندگی گذار سکتے ہیں!

شاید میرے چہرے سے سکرٹری صاحب نے میرے خیالات کا اندازہ لگا لیا!

"جناب ابھی آپ نے یہاں کا دیکھا کیا ہے، میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا کلب دنیا کے دلچسپ ترین مقامات میں سے ہے، ہر طرف سے لوگ ممبر بننے کے واسطے دوڑے آتے ہیں محض اس لئے کہ موت سے ڈرنے کا زمانہ ختم ہو رہا ہے! اور کسی چیز سے نفرت کرنے کا عہد مدت ہوئی تمام ہو چکا۔ ہمارا کلب موت کے پہلو میں ایک ایسا غیر فانی عنصر پیدا کرنا چاہتا ہے جو موت سے بے تکلف آنکھ ملائے اور کہے درست کیا حال ہے — یہی وجہ ہے، کہ یہ کلب آج ملک کی سب سے زیادہ ہردلعزیز جگہ ہے۔"

"اور اس کے باوجود یہاں ہر روز اسقدر خودکشیاں ہوتی ہیں؟"

"میں نے عرض کیا نا کہ پچاس اور ساٹھ کے درمیان اونچے طبقہ کے اشخاص بہت کم ہوتے ہیں لیکن افلاس زدہ لوگ بیسیوں آتے ہیں — متوسط طبقہ بھی کافی تعداد بھیجتا ہے!"

"اور یہ .... سب کچھ ..... کیا کس طرح جاتا ہے؟"

"بہت آسانی اور آرام کے ساتھ! آہستہ آہستہ انسان پر ایک غنودگی سی طاری کی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ دماغ بالکل معطل ہو جاتا ہے پھر ......"

"اور آلۂ عمل کیا ہے؟"

"ایک گیس ہے جسے ہمارے کلب کے ایک ممبر نے ایجاد کیا ہے۔ اور جسکا حقِ استعمال کلب کے نام محفوظ ہے، عمارت کی دوسری طرف تین چھوٹے چھوٹے دروازے گلیوں میں کھلتے ہیں! یہ عام لوگوں کے واسطے ہیں جب کوئی مرد یا عورت دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو ہم اس سے اسکی حالت کے متعلق سوالات کرتے ہیں۔ پھر حفاظت اور مدد کے وعدے کر کے اسے اس حرکت سے باز رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں!"

"مگر حفاظت اور مدد کے لئے اسقدر روپیہ کہاں سے آتا ہے؟"

"روپیہ بہت۔ اول تو ممبری کی فیس بہت زیادہ ہے! اسی سے کافی رقم وصول ہو جاتی ہے۔ پھر عطایا! اس کے علاوہ جب کوئی امیر آدمی خودکشی کرتا ہے تو ہمیں ایک ہزار روپیہ ملتا ہے۔ آپ جانتے ہیں امیر شخص تو مرتا بھی وضعداری کے ساتھ ہے! غریب آدمی خیرات پر جیتا ہے اور خیرات پر ہی ......"

"مگر آپ کو کیسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص غریب ہے؟"

"یہ اندازہ لگا لینا کیا دشوار ہے! علاوہ ازیں ہر ایسے شخص کو مقامی پولیس سے مفلسی کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اُف آپ کو اندازہ نہیں کہ وہ کس انداز سے داخل ہوتے ہیں! میں خود اس حصے میں محض ایک مرتبہ گیا ہوں۔ آرائش وغیرہ کا انتظام وہاں بھی اسی قدر عمدہ ہے مگر وہاں کے لوگ ..... بس اگر آپ انہیں دیکھیں تو پتہ چلے۔ بڈھے آدمی ضعیف اور کمزور میلے کچیلے! پھٹے پرانے لباس قحط زدہ چہرے سسکتی ہوئی عورتیں، مفلوج بیمار! مجھے ایک بوڑھی ستاسی سالہ عورت سے گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ اسکی تمام اولاد اسکے سامنے مر گئی تھی! اور اب اولاد کی

اور وہ میں بھی کوئی باقی نہ تھا۔ بس بیان نہیں کر سکتا کہ میری کیا حالت ہوئی بہت لوگ ایسے بھی آتے ہیں جو بولتے ہی نہیں سوائے وہ کہاں ہے کے۔ اُن لوگوں کو ہم اندر بلا لیتے ہیں"۔ اور فوراً ۔۔۔ کام تمام ۔۔ ہو جاتا ہے"۔

میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا۔ "اور ۔۔۔۔ وہ کہاں ہے؟"

"یہ رہا"۔

سکرٹری صاحب نے دروازہ کھولا، اور کہا "تشریف لائیے دیکھیئے یہ کمرہ ممبروں کے واسطے مخصوص ہے۔ اور یہی کمرہ سب سے کم استعمال ہوتا ہے۔ اب تک محض گیارہ مرتبہ اس سے کام لیا گیا ہے۔ آئیے نا!"

میں قدرے جھجکا۔ مگر پھر اندر داخل ہو ہی گیا۔ کمرہ کیا نگار خانہ تھا دیواریں سرتاپا خوش رنگ اور خوش وضع ریشمیں پردوں سے ڈھکی ہوئی تھیں جن پر کلابتوں سے دلکش مناظر کڑھے ہوئے تھے۔ روشندانوں میں سے ہلکے نیلگوں نرم گلابی، اور لطیف سبز رنگ کی روشنی چھن چھن کر کمرے کی فضا میں ایک عجیب شاعرانہ کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ جا بجا گدے دار کرسیاں اور صوفے بچھے ہوئے تھے۔ جن کے چاروں طرف خوشنما، اور نازک تپائیوں پر قسم قسم کے عمدہ شاندار و خوبصورت گلدستے، لطیف و دلکش پھول خصوصاً گلاب۔ کرسیوں کے سامنے چھوٹی چھوٹی میزیں تھیں جن پر ایک ایک دو دو کتابیں رکھی تھیں، کہیں کہیں خوبصورت منقش ڈبوں میں سگار سگریٹ بھی رکھے ہوئے تھے۔ مگر جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متحیر کیا وہ سفید پھولدار چینی کا ایک خوبصورت برتن تھا جس میں کوئی سیاہ چیز رکھی ہوئی تھی ۔۔۔ لوبان کی قسم کی"۔

میرے چہرے سے حیرت کا اظہار ہوا تو سکرٹری صاحب نے کہا "پریشان نہ ہوجئے۔ لوگ یہاں کبھی کبھی محض تفریحاً بھی آتے ہیں اور پھر تھوڑے وقفے کے بعد چلے گئے"۔

"عام لوگوں کے کمرے بھی بالکل اسی وضع کے ہیں۔ صرف وہ اس سے مقابلتاً ذرا سادہ ہیں"۔

میں نے ایک سوال کیا۔ سکرٹری صاحب نے انگلی سے ایک آرام کرسی کی طرف اشارہ کیا جس پر نہایت قیمتی بادامی رنگ کا سفید پھولدار ریشم منڈھا ہوا تھا۔ کرسی کے پیچھے گملے میں ایک طویل پودا لگا ہوا تھا جسکا نام مجھے معلوم نہیں۔ اور اس کے نیچے اور چاروں طرف گلاب کے پھولوں کا بستر سا تھا۔

سکرٹری نے نیچی آواز میں کہا۔ "پھولوں کا بستر، اور خوشبو ہمیشہ ایک نہیں رکھی جاتی۔ یہ خودکشی کرنے والے کی پسند پر موقوف ہے ہماری کمپنی کا قاعدہ ہے کہ مرتے وقت آپ پر اسی پھول کی خوشبو اور منظر طاری رہیگا جس کو آپ پسند کریں۔ گیس بالکل غیر مرئی ہے! کیا آپ ایک سیکنڈ کے لئے اُسے سونگھنا نہ چاہیں گے؟"

میں نے کہا "جی نہیں! معاف کیجئے ابھی نہیں"۔

سکرٹری صاحب ہنسنے لگے "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچیگا! میں خود کئی بار اسکا تجربہ کر چکا ہوں!"

میں نے بزدل معلوم ہونے سے ڈر کر کہا! "اچھا میں تیار ہوں! سنگھائیے"۔

"تو خواب آور پر تشریف رکھیئے"۔

میرا دل دھڑک رہا تھا! ممکن ہے جسم پر ہلکی سی لرزش بھی طاری ہو لیکن دل کڑا کر کے میں نے اپنے تئیں اس کرسی پر ڈال دیا۔ فوراً ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں گلاب کی بھینی بھینی خوشبو میں گھلا جا رہا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دماغ مخمور ہوا جا رہا ہے! میں نے منہ کھول کھول کر دو تین لمبے لمبے سانس لئے پھر فراموشی طاری ہونا شروع ہوئی غفلت سی ..... میرے ہاتھ کو پکڑ کر کسی نے زور سے جھٹکا دیا "جناب! آپ واقعی خودکشی پر آمادہ ہیں!"

. . . .

لیکن اُس وقت میں نے ایک آواز سنی، ایک سچ مچ کی آواز۔ کوئی شخص نہایت عقیدت کے ساتھ کہہ رہا تھا! "آداب عرض جناب کیسا مزاج ہے؟"

خواب رخصت ہو گیا۔ سامنے سورج کی قدرے تیز روشنی میں دریا بہہ رہا تھا اور میرے مکان کے بالکل نیچے سے قصبے کا سپاہی سرخ پگڑی پہنے ہوئے گذر رہا تھا"۔

"اچھے ہو قادر؟" میں نے کہا "کدھر چلدیئے بھئی!"

ابھی جانا وانا کہاں تھا۔ یعنی دریا میں سے ایک شخص کی لاش ملی ہو سامنے پل کے قریب کچھ لوگ مچھلی کا شکار کھیل رہے تھے کہ ایک بھاری سی چیز کانٹے میں اٹک گئی کھینچ کر دیکھا تو ایک ادھیڑ آدمی کا جسم تھا اسکی رپورٹ کرنے جا رہا ہوں

سید معین الحق حقی

جُدائی

(سانیٹ)

جُدائی آہ یہ اک لفظ کتنا یاس آگیں ہے
تصوّر اس کا اُمیدوں پہ پانی پھیر دیتا ہے
ہزاروں کوس اِس سے منزلِ آرام و تسکیں ہے
جو اِس سے ہو گیا واقف وہ پھر کب چین لیتا ہے

جُدائی باغ کی رنگینیوں کو چھین لیتی ہے
شراب و رقص کے نغمے بُھلا دیتی ہے انساں کو
جہاں آرائیوں، خود بینیوں کو چھین لیتی ہے
جوانی کے چڑھاؤ میں گرا دیتی ہے انساں کو

یہ سب کچھ ہے مگر مجبور ہے میرا دلِ محزوں
محبت پرورش پاتی رہی ہے اِس کے دامن میں
جمالِ حُسن سے مہجور ہے میرا دلِ محزوں
جمالِ حُسن، تڑپایا تھا جس نے مجھکو ساون میں
ترے ہاتھوں میں دے دی ہے عنانِ آرزو میں نے
بھروسے پر وفا کے چھوڑ دی ہے جستجو میں نے

ضیا فتح آبادی

لاکاردیرا

..... وہ کل تین تھے۔ حقیقۃً وہی تین! ——— روزا، پینن اور "لاکاردیرا"!

چراگاہ، پہاڑی کے دامن میں ایک مخملی مثلث کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا نچلا زاویہ اُدھیڑ سے کھنچ جاتی ہوئی ریلوے لائن تک پہنچ گیا تھا۔ ایک کونے میں کھڑا ہوا تار برقی کا کھمبا روزا اور پینن کے لئے باہر کی دُنیا کا واحد نمائندہ تھا ——— اُس دُنیا کا جو اُن کے لئے اجنبی تھی! پُراسرار! ڈرنے اور نفرت کرنے کے لائق!

اس خاموش کھڑے ہوئے کھمبے کو روز دیکھتے دیکھتے پینن آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ ایک سوکھا ہوا درخت ہے اور اس کی چوٹی پر رکھا ہوا چینی کا پیالہ کوئی عجیب پھل! ..... اور اس لئے وہ اب کھمبے پر چڑھ کر اوپر تک پہنچ جاتا ... لیکن اس سفید طلسمی پیالے کو چھونے کی اسے ہمت نہ ہوتی تھی۔ عجیب طرح کا ڈر معلوم ہونے لگتا ... اور یہ خوف اُس وقت تک اس کے دل میں رہتا جب تک وہ کھسکتا ہوا نیچے پہنچ کر نرم گھاس پر پاؤں نہ رکھ لیتا!

روزا اتنی دلیر تو نہ تھی لیکن اس اجنبی دنیا کے نمائندے میں اس کے لئے کچھ کم دلچسپی نہ تھی! گھنٹوں وہ چُپ چاپ کھمبے کے نیچے بیٹھی ہوا کے چلنے سے تاروں کی سنسناہٹ کے سحر انگیز نغمہ کو سنتی رہتی جو منوبر کی سسکیوں سے مل کر اس کے کانوں تک پہنچتا۔

تاروں کا یہ شور روزا کے لئے کبھی تو صرف موسیقی ہوتا اور کبھی پیغام! ایک اجنبی سے دوسرے اجنبی کے پاس! .... دُنیا کے ایک طرف کے لوگ دوسری طرف کے لوگوں سے کیا گفتگو کرتے ہیں؟ یہ جاننے کی اسے ذرا بھی خواہش نہ تھی۔ اُسے اس سے کچھ غرض نہ تھی! وہ تو صرف آواز کو سنتی، اس کے راز اور نغمے کی مِلی جُلی آواز کو!

"لاکاردیرا" اپنے ساتھیوں سے زیادہ جہاندیدہ تھی۔ وہ دنیا سے الگ تھلگ رہنا چاہتی تھی۔ وہ تار کے کھمبے کو دُور ہی سے دیکھتی اور اسے ایک ایسی بے جان چیز سمجھتی جس سے سوا بدن رگڑنے کے اور کوئی کام نہ لیا جا سکتا ہو!

"کاردیرا" ایک گائے تھی! سن رسیدہ! .... گھنٹوں وہ چراگاہ میں لیٹی رہتی، خیالات میں گم! زندگی کے چین، فطرت کے اطمینان، فضا کے سکون سے لطف اٹھاتی ہوئی!

وہ بچوں کے ساتھ کھیل میں شریک ہوتی۔ بچے، روزا اور پینن ——— اس کی حفاظت کے لئے متعین تھے۔ "لاکاردیرا" کی حفاظت کے لئے! کہ اسے چراگاہ میں رکھیں اور احاطے کو پھاند کر ریلوے لائن کے پاس چلے جانے سے روکیں! کتنا مضحکہ خیز خیال ہے! .... وہ کیوں بھلا احاطے کو پھاندتی؟ .... اسے کیا پڑی تھی کہ ریلوے لائن کے پاس جاتی؛ .... وہ تو اسی میں خوش تھی کہ ہری ہری گھاس بغیر سر اٹھائے چُپ چاپ چرے جائے، اور اس کے بعد سبز مخملی فرش پر لیٹ جائے اور سوچے .... اور تکلیف نہ اُٹھانے کی خوشی سے محظوظ ہو! .... صرف زندہ رہنا ہی اس کی تمام خواہش تھی۔ اس کے علاوہ خواہ مخواہ خطروں میں پڑنے سے کیا فائدہ!...

ریلوے لائن کے کھلنے کے وقت البتہ اس کے سکون میں خلل پڑا تھا۔ پہلی گاڑی کو دیکھ کر وہ مارے خوف کے آپے سے باہر ہو گئی تھی۔ اور پتھر کی دیوار پھاند کر دوسرے مویشیوں کے ساتھ سراسیمگی میں دوڑنے لگی تھی! ... یہ ڈر کئی دن تک قائم رہا تھا اور ہر مرتبہ انجن کو سُرنگ کے دہانے پر دیکھ کر اس کا دل دہل جاتا تھا!

رفتہ رفتہ اسے معلوم ہو گیا کہ گاڑی بے ضرر چیز ہے۔ اس کا ڈر صرف وہم تھا۔ گاڑی آتی اور اپنی تمام ہیبت ناکیوں کے باوجود گذر جاتی۔ اس کا ڈر کم ہو گیا اور سر جھکا کر اس سے بچنے کے لئے طیار رہنا اس نے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد وہ بیٹھے ہی بیٹھے گاڑی کو دیکھتی اور آخر کار اس نے دیکھنا بھی چھوڑ دیا!

روزا اور پینن کے لئے گاڑی کی آمد میں ایک نئی دلچسپی کا سامان تھا۔ پہلے پہل تو اُنھوں نے توہم آمیز خوف کے ساتھ عجیب طرح کی خوشی محسوس کی۔ وہ چیخ چیخ کر دیوانوں کی طرح ناچتے پھرے! .... اور تب اس لوہے کے عظیم الشان سانپ کو اجنبیوں کے بوجھ سے لدے ہوئے دن میں کئی کئی بار تیزی سے گزرتے ہوئے دیکھنا ایک قسم کی تفریح ہو کر رہ گیا!

لیکن ریل اور تار برقی تو صرف عارضی ہنگامے تھے جو چراگاہ کی سنسانیت کے ہمہ گیر سمندر میں غرق ہو گئے! نہ تو وہاں کوئی انسانی شکل نظر پڑتی اور نہ باہر کی دُنیا کی کوئی آواز ہی آتی۔ بالکل تنہائی تھی! بالکل سناٹا!...

ہر صبح آفتاب کی جلتی ہوئی کرنوں کے نیچے طرح طرح کے کیڑوں اور جھینگروں کی آواز کے درمیان بچے اور گائے گھر واپس جانے کو دوپہر کا انتظار کرتے...... اور پھر سہ پہر کی طویل ساعتوں میں رات کے آنے کا!.....

سائے بڑھنا شروع ہوتے، چڑیاں خاموش ہو جاتیں اور آسمان کے تاریک ترین حصوں میں اِکّے دُکّے ستارے نکل آتے!... فطرت کی سنجیدہ اور متین خاموشی بچوں کی روحوں میں منعکس ہوتی.... اور "لاکاردیرا" کے نزدیک وہ چپ چاپ بیٹھے رہتے، خواب انگیز خاموشی میں، جس میں کبھی کبھی گائے کے گلے کی گھنٹی کی دھیمی ٹن ٹن مخل ہو جاتی!....

ہر سے بیج کی دو دالوں کی طرح بچے ایک دوسرے کیلئے لاینفک تھے۔ دونوں ایک تھے! ان کے ننھے دماغ ایک دوسرے کی تفریق و امتیاز سے ناواقف تھے! ایک معصوم محبت کا رشتہ انہیں جکڑے ہوئے تھا۔ ان کی یہ محبت "لاکاردیرا" کو بھی اپنے حلقے میں لئے ہوئے تھی۔ مہربان شفیق گائے!... اور جہاں تک ممکن تھا وہ بھی اپنے ناقابلِ اظہار طریقہ سے بچوں کی محبت کا جواب دیتی!.... اُن بچوں کی اُلفت کا جو اس کی حفاظت پر مامور تھے۔ جب بچے اس کی مرضی کے خلاف اپنے کھیلوں میں اسے شریک کرکے اسے تکلیف پہنچاتے تو وہ تعجب انگیز صبر و برداشت کا اظہار کرتی۔

انتن دی چنتا نے حال ہی میں یہ چراگاہ خریدی تھی اور "لاکاردیرا" اس کے رسیلے چارے سے خوب خوب لطف اندوز ہوتی تھی۔ پہلے اسے سڑک پر گھوم گھوم کر اس کے کنارے پر اُگے ہوئے گھاسوں کو چرنا پڑتا تھا۔ تنگی کے اُس زمانے میں روزا اور پینن اس کے لئے اچھی اچھی گھاس کی جگہ تلاش کرتے اور کھلے چرنے والے مویشیوں کے ساتھ عام طور سے جو بدسلوکی کی جاتی ہے اس سے بچاتے۔ اور تھان پر بندھے رہنے کے دنوں میں بھی وہ روزا اور پینن کی توجہ اور التفات کی ممنون تھی! پھر بچہ جننے سے اس کے دودھ چھڑانے تک کے اہم وقت میں جب یہ سوال زیر بحث تھا کہ کتنا دودھ دوہا جائے اور کتنا بچے کیلئے چھوڑا جائے اس وقت بھی روزا اور پینن ہمیشہ "لاکاردیرا" کی طرفداری کرتے۔ وہ چپ چاپ بچے کو کھول دیتے اور بچہ اُچھلتا کودتا دیوانہ وار دوڑ کر اپنی ماں کے پاس پہنچ جاتا..... اور گائے پیار اور شکر گذاری کی نظروں سے مہربان روزا اور پینن کی طرف سر گھما کر دیکھنے لگتی!......

ایسے رشتے نہیں ٹوٹتے!.... ایسی باتیں بھلائی نہیں جاتیں!.....

انتن دی چنتا آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کی قسمت ہی خراب ہے اور مویشی بڑھانے کا سنہری خواب پورا نہیں ہو سکتا، کیونکہ مزارکفایت اور انتظام سے ایک گائے خریدنے کے بعد یہی نہیں کہ وہ دوسری نہیں خرید سکا بلکہ وہ مالگذاری بھی ادا نہ کر سکا! "لاکاردیرا" ہی اس کے ادا کرنے کی تنہا صورت تھی اور اس نے اس تلخ حقیقت کو محسوس کیا کہ باوجود اس کے کہ وہ خاندان کی ایک فرد خیال کی جاتی تھی اسے علیحدہ کرنا ہی پڑے گا!

اس کی بیوی نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں اپنی تھکی ہوئی آنکھیں "لاکاردیرا" کی طرف گھما دی تھیں گویا خاموشی سے اس سے التجا کی تھی کہ اس کے بعد بچوں کی ماں بنے اور ان سے وہ محبت کرے جس سے باپ کا دل ناواقف ہے!

انتن دی چنتا کو بھی اس کا احساس تھا اور اس لئے اس نے گائے کے فروخت کرنے کی ضرورت کا اظہار بچوں سے نہیں کیا۔

سنیچر کی ایک صبح کو جب کہ روزا اور پینن ابھی سو رہے تھے۔ وہ چپ چاپ "لاکاردیرا" کو لے کر گیچن کی طرف روانہ ہو گیا لیکن اس کا دل اُداس تھا! غمگین!

جاگنے پر بچے اپنے باپ کے اس یکایک چلے جانے کی کوئی وجہ نہ سمجھ سکے لیکن انہیں یقین تھا کہ گائے زبردستی لے جائی گئی ہو گی اور جب شام کے وقت انتن خستہ و پریشان، گرد آلود، گائے کو لئے ہوئے واپس آیا اور انہیں اپنے سفر کی کوئی وجہ نہ بتلائی تو انہیں خطرے کا احساس ہوا! گائے نہیں بکی۔ اس نے قیمت اتنی زیادہ رکھ دی تھی کہ کوئی بھی اتنے پر رضامند نہ ہوا۔

جب سے روزا اور پینن نے محسوس کیا کہ کوئی مصیبت آنے والی ہے ان کا اطمینان غائب ہو گیا۔ اور ایک روز جب مالک کے آدمی مکان سے نکال دینے کی دھمکیاں لے کر آئے تو ان کا خیال یقین بن گیا!

تو "لاکاردیرا" بیچ دی جائے گی؟... اور محض تھوڑی سی رقم کے لئے!....

دوسرے سنیچر کو پینن بھی باپ کے ساتھ بازار گیا۔ اس نے قصابوں کو خون آلود چھریاں لئے دہشت بھری نظروں سے دیکھا۔ انہیں میں سے ایک نے گائے خرید لی۔ نشان دے دیا گیا اور گائے گھر واپس لائی گئی۔ گھنٹی تمام راستہ اُداسی سے ٹن ٹن کرتی آئی۔ انتن خاموش تھا۔ لڑکے کی آنکھیں سرخ تھیں اور سوجی ہوئیں!

اور روزآ نے جب فروخت ہونے کا حال سُنا تو "لاکاردیرا" کی گردن سے لپٹ کر سسکنے لگی!

بعد کے چند دن بہت اُداسی میں گزرے! "لاکاردیرا" اپنی قسمت سے بے خبر اُسی طرح مطمئن تھی، لیکن روزآ اور بیتن گھاس پر چپ چاپ لیٹے ہوئے سخت بے چینی سے مستقبل کو سوچتے!

تار برقی کے تاروں اور گذرنے والی ریلوں کو وہ بڑی نفرت سے دیکھتے کیونکہ یہ اُس دنیا سے متعلق تھے جو ان کی سمجھ سے باہر تھی! وہ دنیا جو آن سے ان کے تنہا دوست اور ساتھی کو چھین رہی تھی!

کچھ ہی دن بعد جُدائی ہوئی۔ قصاب طے شدہ رقم لے کر آ گیا۔ انتن نے اسے چائے کا ایک پیالہ پیش کیا اور اس سے گائے کی صفتیں بیان کرنے لگا۔ وہ سمجھ ہی نہ سکتا تھا کہ وہ ایک مہربان مالک کے پاس دودھ دینے کو نہیں جا رہی تھی! قصاب مُسکرا رہا تھا کیونکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے! . . . . .

پیتن اور روزا ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے دور سے "دشمن" کو دیکھ رہے تھے اور بڑے افسوس سے گذشتہ دنوں کا خیال کر رہے تھے، جس کے ساتھ "لاکاردیرا" کی یاد بھی ملی ہوئی تھی۔ جب وہ لے جائی جانے لگی تو دونوں اس کے گلے سے لپٹ گئے اور اس کا مُنہ چومنے لگے! . . . .

تنگ سڑک پر ناراضمند گائے اور اس کے لے جانے والے کے ساتھ ساتھ وہ کچھ دُور تک گئے اور آخرکار رُک کر اپنی پیاری گائے کو جھاڑیوں کے سائے میں غائب ہوجاتے دیکھا! ان کی مُنہ بولی ماں ہمیشہ کے لئے اُن سے جُدا ہو گئی!

"خدا حافظ! کاردیرا!" روزآ نے پھُوٹ پھُوٹ کر روتے ہوئے کہا۔

"خدا حافظ! کاردیرا!" بیتن نے بھی بھرائی ہوئی آواز میں کہا!

"خدا حافظ!" دور سے گائے کی گھنٹی نے آخری مرتبہ جواب دیا اور اس کی افسوسناک آواز رات کی دوسری آوازوں میں کھو گئی!

دوسرے روز سویرے روزآ اور بیتن چراگاہ میں گئے۔ اس کی تنہائی کبھی اتنی تکلیف دہ نہ تھی۔ آج سے پہلے کبھی وہ ایسی ویران نہ معلوم ہوئی تھی! . . . .

یکایک سُرنگ کے دہانے پر دھُواں نظر آیا اور ریل آئی! ڈبے جیسی ایک گاڑی میں جس میں لوہے کی تیلی پتلی سلاخیں لگی ہوئی تھیں مویشی بھرے ہوئے تھے!

بچوں نے ریل پر گھونسا تانا۔ دُنیا کی غارت گری کا انہیں اب پورا یقین ہوگیا!

"لوگ اسے مذبح کی طرف لئے جا رہے ہیں!"

"خدا حافظ! کاردیرا!"

"خدا حافظ! کاردیرا!"

اور بیتن اور روزآ نے نفرت سے ریل اور تار کے کھمبے کو دیکھا۔ یہ اُس سنگدل دُنیا کے نمائندے تھے جو صرف اپنی خونخواری کی تسکین کے لئے ان کے برسوں کے ساتھی کو لئے جا رہی تھی!

"خدا حافظ! کاردیرا!"

"خدا حافظ! کاردیرا!"

ترجمہ
(م ال س)

تمنائی

پیاری ونا

دیکھوں گا جب آپ سے [illegible] کروں گا
[illegible] کروں گا

دنیا میں کسی [illegible] اظہار محبت
تیرے لئے اے جانِ تمنا [illegible]

[illegible] بیدی

داستانِ وفا

ہو چکا ختم امتحانِ وفا   دِل میں اک داغ ہے نشانِ وفا
مَیں ہوں اور دردِ جانستانِ وفا   جان جائے کہ آئے جانِ وفا

کسی صُورت مجھے قرار آئے!

زندگانی ہے یا مصیبت ہے   اپنے جینے پہ مجھکو حیرت ہے
کچھ نہ پُوچھو جو دل کی حالت ہے   مجھکو تم سے بہت محبّت ہے

کاش تُم کو بھی اعتبار آئے!

کیوں علاجِ دلِ فگار کروں   کیوں وفاؤں کا انتظار کروں
پیار تم کو ہزار بار کروں   میں کسی اور کو نہ پیار کروں

اِس قدر تم کو مجھ پہ پیار آئے!

نگہِ شوق کی تھی غمّازی   یا اُن آنکھوں کی فتنہ پردازی
اپنی قسمت میں تھی سرفرازی   جیت لی ہمنے عشق کی بازی

ایک دِل تھا سو وہ بھی ہار آئے!

وہ بھلاتے رہے مجھے اکثر   نہ ہوئی لُطف کی نظر مجھ پر
اُن کو بیگانۂ وفا پا کر   مَیں نے چاہا تھا بھول جاؤں مگر

وہ مجھے یاد بار بار آئے!

دِلِ مضطر بُرا کیا تُو نے   اُن کو درد آشنا کیا تُو نے
شرمسارِ جفا کیا تُو نے   جذبۂ شوق! کیا کیا تُو نے

وہ مرے پاس اشکبار آئے!

کون جانے یہ راز کی باتیں   کون سمجھے یہ پیار کی گھاتیں
کِس نے کاٹی ہیں ہجر کی راتیں   کِس کو ہیں یاد وہ ملاقاتیں

کیوں کوئی بن کے غمگسار آئے؟

یاد اُس کی نہ دِل سے جائیگی   یہ خلش عمر بھر ستائیگی
میری آنکھوں کو خوں رُلائیگی   یہ جوانی ہے پھر نہ آئیگی

دل نہیں ہے کہ بار بار آئے!

حفیظ ہوشیارپوری

چھلاوہ

کیمڈن ٹاؤن کے دو تنگ بازاروں کے ہلکے نیلے سائے میں کونے پر کی مٹھائی کی دُکان سگار کے جلتے ہوئے ٹکڑے کی طرح مایوں کھینچ کر آتشبازی کے چکر کی طرح جگمگا رہی تھی۔ بجلی کے رنگین قمقموں کی روشنی جب سبز، گہرے نیلے اور سُرخ ابرق میں لپٹی ہوئی چاکلیٹ پر پڑتی تھی اور اس کا عکس دُکان کے بڑے بڑے آئینوں میں دکھائی دیتا تھا تو رنگوں کی آمیزش قوسِ قزح کا سماں پیش کرتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آنکھ ذائقے پر سبقت لے گئی ہے اور چاکلیٹ کو کھانے کے بجائے ان کا نظارہ کرنا زیادہ دل پسند ہے۔ اس رنگینی سے لُطف اندوز ہونے کے لئے شہر کے چھوٹے چھوٹے لڑکے دُکان پر اکثر جمع ہو جایا کرتے تھے لیکن لڑکوں ہی پر کیا منحصر ہے دکان کی آرائش نوجوانوں کو بھی کھینچ لاتی۔ اس وقت بھی ایک چوبیس سالہ جوان دُکان کے باہر کھڑا دیکھ رہا ہے، لیکن اس کی نظریں چاکلیٹ کے ٹکڑوں ہی تک نہیں پہنچتیں بلکہ غالباً کچھ اور چیز ہے جو اس کے لئے دلچسپی کا سامان بہم پہنچا رہی ہے۔

نوجوان قد آور لیکن جسم کا ذرا بھاری تھا۔ اس کے بال سنہری تھے۔ چہرے سے چنچلی ٹپکتی تھی اگرچہ چال سے سست معلوم ہوتا تھا۔ اس کی بغل میں نقاشی کے چند نمونے تھے جن کو وہ ایک کتاب فروش کے ہاتھ بیچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ نوجوان کا گذارا تصویروں کی فروخت ہی پر تھا کیونکہ جب سے اس کے امیر چچا نے اس کو کسی مجلس میں اشتراکیت کے مسئلے پر بحث کرنے کی وجہ سے عاق کر دیا تھا اس کے پاس کھانے پینے کے لئے کم گنجائش ہوا کرتی تھی۔ اس کا نام جان لٹن بل انگس تھا۔

نوجوان کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد دُکان میں داخل ہوا اور پچھلے کمرے میں جہاں لوگوں کے بیٹھنے کے لئے کرسیوں کا انتظام کیا گیا تھا چلا گیا۔ اس نے اپنی ٹوپی خدمتگار خاتون کو سلام کرنے کے لئے اُٹھائی اور ایک کُرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔ خاتون کا رنگ قدرے سانولا تھا۔ چہرہ اگر قطعی طور پر خوبصورت نہیں تو جاذبِ توجہ ضرور تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ تھیں اور اس نے سیاہ رنگ کا ایک چُست گاؤن پہن رکھا تھا۔

نوجوان نے ایک لمحے کے انتظار کے بعد خاتون سے ایک مطمئن لہجے میں کہا کہ وہ اسے ایک آنے والی چھوٹی ڈبل روٹی اور قہوے کی پیالی لا دے لیکن پیشتر اس کے کہ وہ واپس ہو نوجوان نے کہا "اور ——— اور میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ شادی کر لو"!

"تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں اس قسم کا مذاق پسند نہیں کرتی"۔ خاتون نے ذرا تیزی سے جواب دیا۔

نوجوان نے متانت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیکن مذاق کیسا۔ یہ تو بالکل ڈبل روٹی کے سودے کی طرح ایک اہم معاملہ ہے اُسی طرح مہنگا ہے بدہضمی پیدا کرتا ہے اور اسی طرح تکلیف دہ ہے"!

سانولے رنگ کی خاتون جو اس دوران میں نوجوان کے چہرے کا غور سے مطالعہ کر رہی تھی ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد مسکرائی اور اس کے پاس آ کر کُرسی پر بیٹھ گئی۔

"تم جانتی ہو کہ یہ کتنا تکلیف دہ امر ہے۔ میرے لئے یہ ڈبل روٹیاں کھانا ایک مصیبت ہے اور ممکن ہے کہ ایک آنے والی ڈبل روٹی چند ہی دنوں میں دو آنے والے کیک میں تبدیل ہو جائے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اگر ہم نے آپس میں شادی کر لی تو میں یہ فضول مرکتیں چھوڑ دوں گا"۔

خاتون اُٹھی اور کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ ظاہراً وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔ کھڑکی کے پاس کھڑے رہنے کے بعد جب وہ ایک خاص انداز سے مڑی تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے اس معمے کو اپنے دل میں حل کر لیا ہے۔ لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ نوجوان الماری کی مختلف اشیا اُٹھا اُٹھا کر بڑی احتیاط سے میز پر ترتیب دے رہا ہے۔ اس نے سینڈوچ کی پلیٹوں کے علاوہ رنگین مٹھائی کی تمام قسمیں جمع کر دی تھیں اور پورٹ اور شیری کے ساتھ ان سب کے درمیان وہ بڑا سا سفید کیک جو اس وقت تک دکان کی زینت تھا، رکھ دیا تھا۔

"بھلا تم یہ کیا کر رہے ہو" خاتون نے غصے سے پوچھا۔

"میری پیاری لالا میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں"

"خدا کے لئے اس قسم کی گفتگو کو ختم کرو ——— میں یہ پوچھتی ہوں یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"بس ہو رہی ایک پرتکلف کھانے کی تیاری!"

"لیکن یہ کیا ہے؟" لارا نے کھانڈ کے سفید انبار کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔

"مسز انگس یہ ایک ویڈنگ کیک ہے!"

لارا بڑبڑاتی ہوئی میز کی طرف آئی اور کیک کو لے جا کر الماری میں رکھ دیا۔ پھر واپس آکر اپنی خوبصورت کہنیاں میز پر رکھتے ہوئے بے چینی سے بولی۔

"تم مجھے سوچنے کے لئے وقت بھی تو نہیں دیتے!"

"مگر میں اس قدر بے وقوف تو نہیں۔"

وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن اس وقت مسکرانے کی بجائے اس کا چہرہ سنجیدہ تھا۔

"مسٹر انگس" آخر اس نے کہنا شروع کیا۔ "پیشتر اس کے کہ تم اس قسم کی کوئی اور فضول حرکت کرو میں تمہیں اپنے متعلق کچھ بتانا چاہتی ہوں۔" "بخوشی۔ اور اگر تم میرے متعلق بھی کچھ کہنا چاہو تو میں بسر و چشم حاضر ہوں۔"

"خدایا! ذرا ایک منٹ کے لئے تو خاموش رہو۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جو میرے لئے باعثِ شرم ہو بلکہ اتنی اہم بھی نہیں کہ مجھے اس کا ذکر کرنے میں تامل ہو لیکن تم اس کو کیا کہو گے اگر کوئی بات بلا وجہ مجھے ایک بھیانک خواب کی طرح تنگ کرتی رہے۔"

"اس صورت میں میری تجویز یہ ہے کہ تم ویڈنگ کیک کو دوبارہ اُٹھا لاؤ۔"

"خیر تمہیں پہلے میری داستان سننی ہوگی۔ سب سے پہلے میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ میرے والد لڈبری میں ایک شراب کی دکان کے مالک تھے جس کا نام "ریڈ فش" تھا۔ میں اس میں لوگوں کو شراب پلانے پر مامور تھی۔"

"تبھی تو میں حیران تھا کہ اس جگہ کی فضا مخمور کیوں ہے۔" انگس نے کہا۔

"لڈبری مشرقی تحصیلوں میں ایک چھوٹی سی خاموش چراگاہ ہے اور اگر کوئی قابلِ ذکر شخص ہماری دکان پر آیا کرتے تھے تو وہ صرف مختلف کمپنیوں کے سفری ایجنٹ ہوتے تھے۔ باقی رہے خاص لڈبری کے لوگ تو ان سے تو خدا ہی پناہ دے۔ گندے اور کمینے، جن کے [illegible] بالنے کے لئے بھی کافی سرمایہ نہ تھا؛ اور جن کا شغل اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ صبح سے شام تک شراب خانے میں گذار دیں، یا میلے کچیلے کپڑوں میں بیٹھ کر گھوڑوں پر شرطیں لگایا کریں۔ ان میں بھی بہت سے ہماری طرف رخ نہ کرتے۔ صرف دو شخص تھے جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ اکثر ہماری دکان پر آیا کرتے تھے بلکہ صبح اور شام ایک دفعہ ہو جانا ان کا معمول تھا۔ ان میں سے ایک بونے قد کا چھوٹا سا آدمی تھا۔ آنکھیں تیز اور چمکدار تھیں۔ چہرے پر چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی تھی اور ہمیشہ ضرورت سے زیادہ کپڑے پہنے رکھتا تھا۔ اس کی خواہش یہی ہوتی کہ لوگ اسے شریف زادہ خیال کریں۔ لیکن اگر کوئی چیز اسے اپنے مقصد میں ناکامیاب رکھتی تو وہ اس کی نفاست پسندی تھی۔ اگرچہ بے وقوف نہ تھا لیکن سست اور کم فہم تھا فضول اور بے فائدہ باتوں میں اسے زیادہ دلچسپی تھی مثلاً مداری کے کھیل اچھے جانتا تھا۔ پندرہ بیس دیا سلائیوں کو اس طرح ترتیب دیتا کہ آگ لگانے پر وہ آتشبازی کی طرح یکدم جل اٹھتیں۔ کبھی کیلے کو چھیل کر ناچنے والی گڑیا بنا لیتا یا پانچ سگاروں سے ایک اچھلنے والا کنگرو۔ اس کا نام اسوڈ مرسمتھ تھا۔"

"دوسرا بالکل معمولی ہیئت کا لمبا اور چھریرے بدن کا خاموش آدمی تھا۔ لیکن نہ معلوم مجھے اس سے کیوں ڈر لگتا تھا۔ اس کے بال ہلکے سنہری تھے اس کی ناک ستواں اور کافی اُٹھی ہوئی تھی۔ شاید اسے خوبصورت کہا جا سکتا لیکن اس کی ایک آنکھ اس قدر بھینگی تھی کہ میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ جب وہ میری طرف دیکھتا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ میں اس دنیا میں موجود ہی نہیں۔ شاید چہرے کے اس نقص نے اسے تیز مزاج اور ترش رو بنا دیا تھا کیونکہ جب سمتھ ہر جگہ اور ہر وقت اپنی بندر کی سی حرکتیں کرتا رہتا اور لوگوں کو اپنے مداری کے کرتب دکھاتا رہتا تو جیمس ویلکن (کیونکہ یہی اس کا نام تھا) چپکا صحن میں بیٹھا ہوا شراب پیتا رہتا اور اگر اس سے تنگ آ جاتا تو اکیلا تاریک اور سنسان میدانوں میں چکر لگانے چلا جاتا تاہم سمتھ کو بھی اپنے بونے قد سے عار تھی اور اس کا ذکر کرنے سے اکثر کتراتا تھا۔ اسی لئے جب دونوں نے ایک ہی ہفتے میں مجھ سے شادی کی استدعا کی تو میں ششدر سی رہ گئی اور سوچنے لگی کہ اس آفت سے کیسے چھٹکارا ہو!"

"تاہم میں نے اس خیال سے کہ وہ میرے انکار کی وجہ اپنی

کر یہ المنظری کو وہ مجھیں اور اس کو نذرت سے منسوب نہ کر لیں ان سے کہا کہ میرے خیالات شادی کے متعلق کسی قدر عجیب ہیں اور میں اس کے خلاف ہوں کہ لوگ اپنی تمام عمر ورثہ کی جائداد پر گزارہ کیا کریں اس لئے جب تک وہ کوئی نمایاں کام نہیں کرتے یا اپنے لئے ایک باحیثیت روزگار تلاش نہیں کر لیتے میں اُن سے شادی کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اگرچہ میں اپنے اس فعل پر ہمیشہ نادم رہی ہوں لیکن میں کر بھی کیا سکتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اسے اتنی اہمیت نہ دینگے اور میں ان کی ناگوار توجہات سے محفوظ ہوں گی (اور واقعی میں کچھ عرصہ تک بچی بھی رہی) لیکن میری توقعات کے خلاف مجھے دوسرے دن معلوم ہوا کہ دونوں تلاشِ معاش کے لئے لڈبری چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ میں نے آج تک ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا، البتہ اس لمبے سمتھ کے مجھے دو خط آ چکے ہیں جو عجیب اور اضطراب انگیز تھے۔"

"کبھی دوسرے کے متعلق بھی کوئی خبر ملی؟" انگس نے پوچھا۔

"نہیں۔ اس نے مجھے کبھی کوئی خط نہیں لکھا اور سمتھ کی پہلی چٹھی میں بھی فقط اتنا درج تھا کہ وہ ولکین کے ساتھ لندن روانہ ہوا لیکن چونکہ ولکین تیز رو تھا اس لئے اس کا ساتھ نہ دے سکا۔ راستے میں ایک سفری سرکس سے اس کی واقفیت ہو گئی۔ چونکہ وہ لمبا تھا اور مداری کا تماشا کرنا بھی جانتا تھا اس لئے اس کا کام بن گیا اور وہ ایجویریم بھیج دیا گیا اور خدا جانے وہاں کیا کیا کرتب کرتا رہا۔ یہ اس کی پہلی چٹھی تھی لیکن دوسری بہت ہی عجیب اور حیران کن تھی۔"

انگس نے قہوہ ختم کیا اور لالا کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ایک خاص انداز سے مسکرا رہی تھی۔

اس نے کہنا شروع کیا۔ "شاید تم نے سمتھ سائلنٹ سروس کے متعلق سنا ہوگا۔ مجھے ٹھیک طور پر معلوم نہیں لیکن کہتے ہیں کہ گھڑی کے پُرزوں کے اصول پر بنی ہوئی یہ کوئی کل ہے۔ بٹن کو دبایئے بہرہ حاضر ہو جائے گا۔ دستے کو گھمایئے دس خادمائیں موجود ہو جائیں گی اور پھر لُطف یہ کہ نہ تو بہو شراب پیتا ہے اور نہ ہی خادماؤں کی ناز برداری کرنی پڑتی ہے۔ تم نے دیواروں پر اشتہار تو ضرور دیکھے ہوں گے۔ خیر یہ کل کچھ بھی ہو لیکن سمتھ نے لاکھوں روپیہ کما لیا ہے اور سچ پوچھو تو میں خوش بھی ہوں کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا لیکن ڈر تو یہ ہے کہ کہیں کسی روز آ کر مجھ سے یہ نہ کہے کہ "لو میں نے کامیابی حاصل کر لی اب اپنا وعدہ پورا کرو۔"

خاتون خاموش ہو گئی لیکن انگس نے اس کے جواب میں فقط اتنا پوچھا "اور اُس دوسرے آدمی کا کیا حشر ہوا؟"

لالا ہوپ یکدم کھڑی ہو گئی اور قدرے اضطراب سے کہنے لگی: "میرے دوست! تم بھی عجیب آدمی ہو۔ ہاں تم نے درست کہا۔ اس کے متعلق مجھے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ شاید وہ مر چکا ہے ——— میں نہیں کہہ سکتی کہ وہ کہاں ہے لیکن وہی ہے جس کا مجھے خطرہ ہے۔ وہ میرے راستے میں حائل ہے۔ میں اس سے ڈرتی ہوں۔ اس نے مجھے پاگل سا بنا رکھا ہے۔ ہاں میں پاگل ہوں کیونکہ میں نے اس کی آواز سنی ہے اور اس کو ایسی جگہ محسوس کیا ہے جہاں اس کا موجود ہونا ناممکن ہے:"

"تاہم اس کی میعاد اب جب کہ تم نے کسی کو اپنا ہمراز بنانا پسند کیا ہے ختم ہو چکی ہے" انگس نے کامل اعتماد سے کہا "خواہ وہ شیطان ہی کیوں نہ ہو نہیں سکتا۔ اکیلے میں انسان واقعی پاگل ہو جاتا ہے۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ تم نے اپنے بھینگے دوست کو کب بولتے ہوئے سُنا؟"

"میں نے جیمس ولکین کو اتنے ہی یقین سے سنتے سُنا ہے جتنا کہ میں تم سے گفتگو کر رہی ہوں"۔ خاتون نے مستعدی سے کہا "وہاں کوئی نہ تھا۔ میں دُکان کے باہر کھڑی تھی اور دونوں بازاروں کو بخوبی دیکھ سکتی تھی۔ میں نہیں جانتی کہ وہ کس قسم کی ہنسی تھی کیونکہ وہ اتنی ہی عجیب تھی جتنا کہ اس کا بھینگا پن۔ پورے ایک سال سے مجھے اس کے متعلق کوئی خبر نہ ملی تھی۔ لیکن حیرت ہے کہ اس کے چند سیکنڈ بعد مجھے سمتھ کی پہلی چٹھی ملی۔"

"لیکن کیا ولکین کی روح نے کبھی کوئی اور بات بھی کی؟" انگس نے پوچھا۔

لالا ٹھٹک گئی اور کہنے لگی "ہاں۔ میں اسموڈور سمتھ کی دوسری چٹھی ختم کر کے اس کی کامیابی پر غور کر رہی تھی کہ میں نے سنا ولکین کہہ رہا تھا "اس کے باوجود وہ تمہارے ساتھ شادی نہ کر سکے گا۔" بالکل صاف الفاظ تھے جیسے وہ کمرے ہی میں موجود ہو . . . . . آہ کس قدر تکلیف دِہ واقعہ ہے۔ شاید میں سچ مچ ہی پاگل ہو گئی ہوں۔"

"اگر تم پاگل ہوتیں" انگس نے کہا "تو اُلٹا اپنے آپ کو عقلمند سمجھتیں۔ پھر بھی میں مانتا ہوں کہ بات کچھ عجیب سی ضرور ہے۔ بہرحال دو دماغ ہمیشہ ایک سے بہتر ہوتے ہیں اور اگر تم میری سنو تو ———"

وہ ابھی فقرہ ختم نہ کرنے پایا تھا کہ باہر سے ایک شور سنائی دیا۔ جیسے کسی لوہے کی چیز کو زمین پر رگڑا جائے اور اُسی وقت ایک چھوٹا سا آدمی اونچی ٹوپی پہنے دُکان کے دروازے میں ہانپتا ہوا آن کھڑا ہوا۔

دیا۔ انگس نے جس کی ہر بات اس وقت تک مذاق کا رنگ لئے ہوئے تھی ذرا سنجیدگی اختیار کر لی۔ اور وہ اجنبی سے ملنے کے لئے باہر چلا گیا۔ ایک ہی نگاہ میں انگس کو معلوم ہو گیا کہ اس شخص کو ضرور کسی سے محبت ہے۔ اساس کا چھوٹا قد، ترشی ہوئی ڈاڑھی، چالاک آنکھیں اور کانپتی ہوئی انگلیاں اس بات کا کافی ثبوت تھیں کہ وہ سمتھ ہے، وہی اسموڈور سمتھ جس کے متعلق وہ دو منٹ ہوئے گفتگو کر رہے تھے اور جو کیلے کے چھلکوں اور دیاسلائی کی ڈبیوں سے گڑیاں بنایا کرتا تھا، اور جو اب لوہے کے خاموش خانسامے اور سنہ اترانے والی خادماؤں کے بنانے میں مشغول تھا اور جن کے ذریعے وہ لاکھوں روپیہ کما چکا تھا۔ ایک لمحے کے لئے دونوں نے ایک دوسرے کو رقیبانہ خندہ پیشانی سے دیکھا۔

مسٹر سمتھ نے اس رقابت کا کوئی ذکر نہ کیا اور محض اتنا پوچھا۔

"کیا مس ہوپ نے کھڑکی میں اس چیز کو بھی دیکھا ہے؟"

"کس چیز کو؟" انگس نے تعجب سے دُہرایا۔

"مزید وضاحت کیلئے وقت نہیں ہے۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ یہاں ایک کھیل کھیلا جا رہا ہے جس کے متعلق بہتر ہے کہ جلد از جلد تفتیش کی جائے۔" چھوٹے سے لکھ پتی نے اپنی چمکتی ہوئی چھڑی سے کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سمتھ کے ساتھ انگس نے باہر جا کر دیکھا کہ کھڑکی کے شیشے پر ایک لمبا سا اسٹامپ کا کاغذ چسپاں تھا جو یقیناً اس سے پہلے وہاں موجود نہ تھا اور جس پر مندرجہ ذیل عبارت سرخ روشنائی میں لکھی ہوئی تھی۔

"اگر تم نے سمتھ کے ساتھ شادی کر لی تو تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔"

"لارا!" انگس نے اپنا سنہری سر دکان کے اندر داخل کرتے ہوئے کہا "تم پاگل نہیں ہو!"

"یہ ویلکن کی تحریر ہے" سمتھ نے ترشی سے کہا "میں نے اُسے عرصے سے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ مجھے تنگ کرتا رہتا ہے۔ پچھلے ہی دو ہفتوں میں مجھے کم از کم ایسے پانچ خط آ چکے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے مکان پر انہیں کون لے جاتا ہے۔ چوکیدار سے پوچھا ہے وہ بھی کچھ نہیں بتا سکا کہتا ہے اس نے ایسا کوئی مشکوک شخص نہیں دیکھا اور اب اسی جگہ دیکھ لو۔ اس نے یہ پاکھنڈ کھیلا ہے جب کہ دکان میں لوگ ——"

"بالکل درست۔ جبکہ دکان میں لوگ چائے نوش کر رہے ہیں" انگس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "جناب میں آپ کی دانشمندی اور معاملہ فہمی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ واقعی ہمیں فالتو باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ وہ ابھی دُور نہ گیا ہوگا کیونکہ میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ دس منٹ پہلے کھڑکی کے پاس کوئی نہ تھا۔ اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بہت دُور چلا گیا ہو کیونکہ ہمیں معلوم نہیں کہ وہ کونسے راستے سے اور کہاں گیا ہے۔ سمتھ! میری رائے میں تو ہمیں یہ معاملہ کسی پرائیویٹ جاسوس کے ہاتھ میں دے دینا چاہئے۔ میں ایک شخص فلیمبو سے واقف ہوں وہ نہایت چالاک اور ایماندار آدمی ہے۔ اُس نے پہلے بھی ایسے کئی ایک معموں کو سلجھایا ہے۔ اس کا مکان لکھنو مینشن ہیمپسٹڈ میں واقع ہے۔"

"خوب۔ میں بھی کونے پر ہمالیہ مینشن میں رہتا ہوں۔ کیا تم میرے ہمراہ چل سکو گے۔ میں اپنے مکان پر تمہیں ویلکن کی وہ عجیب و غریب تحریریں دکھاؤں گا اور پھر تم جا کر اپنے مخبر دوست سے مل بھی آنا۔"

"تم بہت ہوشیار ہو" انگس نے ملائمت سے کہا "ہم جتنی جلدی کام شروع کر دیں اتنا ہی بہتر ہے۔"

دونوں خاتون سے رسمی طور پر رخصت ہو کر موٹر میں بیٹھ گئے۔ بازار کے نکڑ پر انہیں ایک بہت بڑا اشتہار سمتھ سائلنٹ سروس کے متعلق نظر آیا۔ سر کے بغیر ایک بڑی سی گڑیا کے ہاتھ میں ایک دیگچی تھی اور اس کے نیچے یہ الفاظ درج تھے "خانساماں جو کبھی بڑبڑاتا نہیں"۔

"میں انہیں اپنے مکان میں استعمال کرتا ہوں" سمتھ نے مسکراتے ہوئے کہا "کچھ اشتہار بازی کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ سہولت رہتی ہے۔ اور سچ پوچھو تو متعلقہ بٹن دبانے پر گھڑی کے اصول پر بنے ہوئے لوہے کے یہ کھلونے تمہارے لئے کوئلہ، شراب یا ٹائم ٹیبل نوکروں سے جلدی لا دیتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ لوہے کے یہی کھلونے ایک حد تک بیکار رہیں۔"

"بیکار رہیں! وہ کیسے؟"

"ہاں۔ بیکار رہیں کیونکہ یہ مجھے نہیں بتا سکتے کہ ہر روز خطوں میں مجھے دھمکیاں کون لکھتا ہے۔"

سمتھ کی موٹر اسی کی طرح تیز رفتار تھی اور لوہے کے کھلونوں کی طرح اسی کی ایجاد کردہ۔ اگر وہ اشتہار بازی میں تاک تھا تو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسے اپنی چیزوں پر کامل اعتبار تھا۔ جب وہ شام کی خاموش فضا میں پہاڑی پر چڑھ رہے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہوا میں ہلکے ہلکے اُڑ رہے ہوں۔ تھوڑی ہی دیر میں گھومتے ہوئے راستے

پر انہیں چکر آنے لگے۔ نیچے لنڈن دکھائی دیتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے مکان ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے سلیٹ کے سیاہ پہاڑ کے ساتھ کوئی ہرا سمندر واقع ہو۔ پہاڑی اگر زیادہ نہیں تو ایڈنبرگ جتنی ڈھلوان ضرور تھی۔ مکانات کی اونچائیاں چبوتروں کی طرح تھیں جو ایک دوسرے کے اوپر بنائے گئے ہوں۔ ہمالیہ مینشن ان سب کے اوپر سورج کی کرنوں میں چمک رہا تھا۔ اور موڑ مڑنے کے بعد جب وہ یکدم ہمالیہ مینشن کے سامنے آئے تو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی بند مکان میں ایک قیدی کو یکدم کھڑکی کھول دینے پر باہر باغ کے منظر سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیا جائے۔ مینشن کے سامنے ایک چھوٹا سا باغ تھا جس میں ایک مصنوعی نہر بہتی تھی۔ جب وہ اس باغ کے پاس سے گزر رہے تھے تو انہیں ایک سبزی والے کی دکان نظر آئی اور ساتھ ہی انگس نے سڑک پر چوک میں دُور ایک سپاہی کھڑا ہُوا دیکھا۔ فضا کی اس خاموشی میں یہی دو شخص تھے جو ان کے علاوہ اس وقت وہاں موجود تھے لیکن انگس کو ایسا معلوم ہُوا جیسے وہ لنڈن کی رومان کا ایک حصّہ ہیں اور ایک افسانہ ہے جس کے یہ دونوں ہیرو ہیں۔

موٹر مکان کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی اور سمتھ نے اُترتے ہی دربان سے پُوچھا کہ کیا کوئی شخص یا کوئی چیز مکان کے گرد مشتبہ طور پر چکر تو نہیں لگاتی رہی۔ دربان نے نہایت اطمینان سے کہا کہ اس نے مکان کے آس پاس کسی مشکوک آدمی کو نہیں دیکھا۔ یہ معلوم کر لینے پر متعجب انگس اور سمتھ دونوں لفٹ کے ذریعے سے مکان کی سب سے اوپر کی منزل پر آ گئے۔

"ذرا ایک منٹ کے لئے یہاں آؤ۔ میں تمہیں ولکن کے خطوط دکھانا چاہتا ہوں پھر اس کے بعد جا کر تم اپنے دوست کو بُلا لانا"۔

اس نے دیوار میں کسی بٹن کو دبایا اور دروازہ خودبخود کُھل گیا۔

داخل ہوتے ہی انگس نے دیکھا کہ کمرہ کافی فراخ ہے اس کے علاوہ اس میں اور کوئی خوبی نہ تھی کہ دونوں جانب دیواروں کے ساتھ وہی لوہے کے کھلونے رکھے ہوئے تھے جیسے کسی درزی کی دکان میں لکڑی کی مورتیں ہوتی ہیں اور اُنہیں مورتوں کی طرح اُن کے سر غائب تھے۔ شانے چپکے اور سینے کبوتروں کی طرح اُبھرے ہوئے تھے۔ انسان کے ساتھ اُن کو کوئی مناسبت نہ تھی۔ ہاتھوں کی بجائے دو بڑے بڑے کنڈے لگے تھے اور باہم امتیاز کرنے کے لئے ان پر سُرخ کالا یا ہرا رنگ کیا گیا تھا۔ اس سے زیادہ ان میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ یہاں اس وقت کسی نے ان پر دوبارہ نظر ڈالنے کی زحمت گوارا کی اور کرتا بھی کیوں کہ ایک ان سے بھی زیادہ دلچسپ چیز دو نو قطاروں کے درمیان پڑی ہوئی تھی جس کو سمتھ نے اندر آتے ہی اُٹھا لیا۔ یہ ایک ردی سا کاغذ کا چھوٹا سا ٹکڑا تھا جس پر لکھا تھا "اگر تم آج اُس سے ملے ہو تو میں تمہیں قتل کر دوں گا"۔

کمرے میں ایک لمحے کے لئے خاموشی طاری ہو گئی۔ پھر آسودہ سمتھ نے کہا "کیا تم وسکی پیو گے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے لئے اس وقت وسکی کے سوا کوئی بہتر چیز نہیں"۔

"ہاں شکریہ!" انگس نے غمگین لہجے میں جواب دیا "لیکن مجھے تو یہ معاملہ بڑا ٹیڑھا معلوم ہوتا ہے۔ مجھے اپنے دوست کے پاس ابھی وقت چلے جانا چاہیئے"۔

"درست ۔ بالکل درست" سمتھ نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تم سے جتنی جلدی ہو سکے اُسے جا کر لے آؤ"۔

لیکن جس وقت انگس جانے کے لئے دروازہ بند کرنے لگا تو اس نے دیکھا کہ سمتھ نے ایک بٹن دبایا اور ان میں سے ایک کل نے آگے بڑھ کر اس کے سامنے شراب کی بوتل اور ایک گلاس لا کر رکھ دیا۔ اُس وقت اسے ایسا محسوس ہُوا کہ شاید لوہے کی ان کلوں میں سہمے ہوئے سمتھ کو چھوڑ کر جانا مناسب نہیں۔

پہلی منزل پر انگس کو ایک شخص بالٹی کو ٹانکا لگاتے ہوئے نظر آیا۔ قریب جا کر انگس نے اسے روپے وغیرہ کا لالچ دے کر کہا کہ جب تک وہ واپس نہ آئے اس کو چاہیئے کہ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ نیچے اُتر کر اس نے دربان سے بھی یہی وعدہ لیا اور سڑک پر سپاہی کے پاس پہنچ کر اسے اچھی طرح تاکید کی کہ چوک کو چھوڑ کر نہ جائے اور ہر اجنبی کی جو مکان کی طرف رُخ کرے تاک میں رہے۔ انگس ہر طرح کی احتیاط ملحوظ رکھ چکا لیکن پھر بھی اسے اطمینان نہ ہُوا۔ باغ کے قریب سبزی والے کی دُکان پر چلغوزے لینے کی غرض سے کھڑا ہو گیا اور باتوں باتوں میں سبزی والے کو پکا کر لیا کہ کچھ بھی کیوں نہ ہو انگس کی واپسی تک وہ اس جگہ سے علیحدہ نہ ہو گا۔ اگرچہ سبزی والے نے کہا کہ مطلع ابر آلود ہے شاید بارش ہو اور برف پڑنے لگے اس لئے وہ جلدی واپس چلا جائے گا لیکن انگس نے کہا کہ تم سردی سے بچنے کے لئے اپنے ہی چلغوزے کھاتے رہو میں واپسی پر تمہارا حساب چکا دوں گا صرف تم اس تاڑ میں رہو کہ کوئی شخص مرد، بچہ یا عورت اس

مکان میں جانے نہیں پاتی۔ اتنا کہہ لینے کے بعد انگس نہایت ہوشیاری سے اپنے معتبر دوست کی طرف روانہ ہوا۔

"میں نے مکان کے گرد حلقہ بنالیا ہے۔ یہ چار عمل تو اُس کے ہمراز نہیں ہو سکتے" انگس سوچ رہا تھا۔

"لکھنؤ مینشن" اسی پہاڑی کے نچلے چبوترے پر تھا اور اگرچہ انگس کے معتبر دوست فلیمبو کا گھر سمتھ کے فلیٹ کی طرح لوہے کی ان عجیب وغریب کلوں سے آراستہ نہ تھا تاہم تمام ضروری اشیا اس میں مہیا تھیں اور اس میں ہر طرح کی آسائش موجود تھی۔ خود فلیمبو کا کمرہ اچھا خاصہ عجائب گھر کا کونہ معلوم ہوتا تھا۔ دیواروں پر طرح طرح کے آلات، بندوقیں اور چاقو چھریاں لٹکی ہوئی تھیں۔ بر کھیٹوں پر شراب پینے کی اطالوی صراحیاں۔ حبشیوں کے کھانا پکانے کے برتن سجے ہوئے تھے اور تو اور کمرے میں ایک ایرانی بلی بھی موجود تھی۔ فلیمبو کے ساتھ کمرے میں ایک رومن کیتھولک پادری بھی تھا۔

"یہ میرے دوست پادری براؤن ہیں" فلیمبو نے تعارف کے طور پر کہا "میری ہمیشہ یہی خواہش تھی کہ میں آپ دونوں کا تعارف کراؤں لیکن کبھی موقع ہی نہ ملا۔ آج موسم کیسا خوشگوار ہے لیکن شاید جنوبی حصے کے لوگوں کے لئے قدرے خنک ہو"

"ہاں میرا بھی خیال ہے کہ شاید مطلع صاف ہو جائے" انگس نے نیلے گدیلے کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں باہر تو برف بھی پڑنے لگی ہے" پادری نے خاموشی سے کہا اور سچ مچ کھڑکی کے شیشوں پر برف گر گر جمنی شروع ہو گئی تھی۔

"اچھا تو۔ فلیمبو!" انگس نے کہنا شروع کیا "میں ایک ضروری کام کے لئے تمہارے پاس آیا ہوں۔ بات یہ ہے کہ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک شخص کو تمہاری مدد درکار ہے۔ اس کو ایک نامعلوم اجنبی طرح طرح کے خط لکھ کر دھمکاتا رہتا ہے کہ تم قتل کر دیئے جاؤ گے۔ لطف یہ ہے کہ وہ دکھائی بالکل نہیں دیتا" اور انگس نے سمتھ کی ساری داستان لارا کی کہانی سے لیکر ویلکن کی بھیانک ہنسی تک سنادی لیکن جب وہ دکان کے شیشے پر چسپاں کاغذ تک آیا جس پر وہ عجیب سی تحریر درج تھی تو فلیمبو اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ بہتر ہے کہ تم مجھے باقی قصہ راستے میں سناؤ۔ معاملہ خطرناک معلوم ہوتا ہے اور ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے"

"بالکل درست" انگس نے تسلیم کیا "لیکن میرا خیال ہے وہ فی الحال محفوظ ہے کیونکہ میں نے چار آدمیوں کو مکان کی تاک میں لگا رکھا ہے۔ تاہم اچھا ہے کہ ہم وہاں جلدی پہنچ جائیں"

وہ سیڑھیوں سے اُتر کر ایک تنگ گلی میں ہو لئے۔ بڈھا پادری بھی پیچھے پیچھے تھا۔ کچھ دُور چلنے کے بعد اس نے اتنا کہا کہ برف کی تہ زمین پر کتنی جلدی موٹی ہو کر جم چلی ہے اور خاموش ہو گیا۔

مکان کے قریب پہنچتے تک انگس اپنی کہانی ختم کر چکا تھا چلغوزے والے سے پوچھا کہ کوئی مشکوک آدمی تو اس طرف سے نہیں گزرا تو اس نے حلفیہ جواب دیا کہ ہرگز کوئی ادھر سے نہیں گزرا۔ انگس نے اسے چلغوزوں کی قیمت ادا کر کے پھر پوچھا لیکن اس کا جواب اب بھی وہی تھا۔ پولیس مین سے پوچھا گیا تو اس نے نہایت جوش میں آکر کہا۔

"جناب عالی۔ مجھے اتنا عرصہ ملازمت میں گزرا۔ ہر طرح کے بدمعاش سے واسطہ پڑا ہے اور یہ ممکن نہیں کہ میری گرفت سے بڑے سے بڑا عیار بھی نکل جائے۔ میں ہر شخص کی تاڑ میں رہا ہوں اور شکر ہے کہ ادھر سے کوئی نہیں گزرا"

جب وہ دروازے پر پہنچے تو دربان نے اس سے بھی زیادہ وثوق سے ان کو یقین دلایا کہ کسی قسم کا کوئی آدمی دروازے سے نکل کر اوپر نہیں گیا۔ اس کا بیان تھا "میرا حق ہے کہ ہر شخص سے خواہ وہ نواب ہے یا معمولی حیثیت کا آدمی، پوچھوں کہ اس کا اس مکان میں کیا کام ہے اس لئے میری اجازت کے بغیر کوئی شخص اندر نہیں جا سکتا"

"تو کیا جب سے برف پڑنی شروع ہوئی ہے کوئی شخص اس مکان کے اندر یا باہر نہیں گیا" پادری براؤن نے اپنے غیر ضروری لہجے میں پوچھا۔

"یہاں کوئی نہیں آیا۔ آپ مجھ پر یقین کر سکتے ہیں" دربان نے ذرا وقار سے کہا۔

"تو پھر میں حیران ہوں کہ یہ کیا چیز ہے" پادری زمین پر چند قدموں کے نشانوں کو بغور دیکھ رہا تھا۔

سب کی نظریں زمین کی طرف جھکیں اور فلیمبو کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ دربان کی ٹانگوں کے عین بیچ میں انسانی قدموں کے نشان برف پر موجود تھے۔

"ہیں! کیا یہ وہی چھلاوا تو نہیں؟" انگس کے منہ سے بے اختیار

نکلا۔ اور دربان کو ایک طرف دھکیلتے ہوئے وہ تیزی سے سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ پیچھے پیچھے فلیمبو تھا لیکن پادری براؤن اسی جگہ کھڑا سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا اسے قدموں کے نشانوں سے بھی دلچسپی ہو رہی تھی۔

فلیمبو دروازہ توڑ کر اندر داخل ہونا چاہتا تھا لیکن انگس نے آگے بڑھ کر بٹن دبایا۔ دروازہ کھل گیا اور انگس کے دوست کو دروازہ توڑنے کی تکلیف دا اُٹھانی پڑی۔

ہال میں داخل ہونے پر انہیں وہی انسانی شکل کی کلیں دکھائی دیں۔ وہ اپنی اصلی جگہ پر موجود نہ تھیں بلکہ چند ایک کو کسی کام کے لئے اِدھر اُدھر کیا گیا تھا۔ کمرے میں اب اندھیرا ہو چلا تھا اور شفق کی سُرخی کھڑکی کے ذریعے سے داخل ہو کر آس پاس کی چیزوں کو اور بھی تاریکی میں ڈال رہی تھی۔ اس دھندلکے میں وہ کلیں اور بھی زیادہ انسان نما معلوم ہوتی تھیں۔ اس کے سوا کمرے میں اور کوئی تبدیلی نظر نہ آئی۔ البتہ جس جگہ پہلے سُرخ سیاہی سے لکھا ہُوا وہ کاغذ ملا تھا بالکل اسی جگہ اب ایک بڑا سا سُرخ دھبا تھا جیسے کسی نے دوات کی دوات اُلٹ دی ہو۔ لیکن وہ لال سیاہی کا دھبا نہ تھا۔

ایک فرانسیسی کی فہم و فراست سے فلیمبو فوراً بھانپ گیا کہ بات کیا ہے اور اس کے مُنہ سے بے اختیار نکلا "قتل ہو گیا!"

اس کے بعد فلیمبو نے کمرے کا کونہ کونہ چھان مارا۔ الماریوں کے اندر چارپائی کے نیچے کرسیوں کے پیچھے حتّٰی کہ ان انسان نما شیئوں کے گرد چکر لگا کر بھی ڈھونڈا لیکن اگر اسے خیال تھا کہ اس کے ہاتھ لاش آ جائے گی تو اس کا خیال غلط نکلا اور جب انگس بھی ایسی ہی بے سود کوشش کے بعد ہال کے وسط میں اس دھبے کے پاس آیا تو فلیمبو نے مجبور ہو کر کہا کہ "تمہارا اسمتھ رقاتل نہ صرف یہ کہ خود نظر نہیں آتا۔ بلکہ لوگوں کو قتل کر کے ان کو بھی غائب کر دیتا ہے۔"

انگس نے کمرے پر ایک اور نگاہ ڈالی اور ان انسانی شکلوں کو دیکھ کر کچھ کانپ سا گیا۔ غروب آفتاب کے بعد کمرے میں اندھیرا ہو چکا تھا اور اس اندھیرے میں وہ شکلیں اور بھی بھیانک معلوم ہو رہی تھیں۔ سُرخ دھبے کے بالکل اوپر ایک ایسی ہی کل کھڑی تھی۔ غالباً اسمتھ نے اپنی موت کے ایک لمحہ پہلے اسے کسی کام کے لئے بُلایا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ ادھ بچا اُٹھا ہوا تھا اور کمرے کی تاریکی میں انگس کو ایسا معلوم ہُوا جیسے یہی اس کی قاتل ہے لیکن اگر ایسا ہی تھا تو بھی اس نے اس کی لاش کیا کی؛

"کھا لیا!" کسی روح نے اس کے کان میں کہا اور ایک لمحے کے لئے انگس کی رُوح اس خیال سے کانپ اُٹھی کہ ایک صحیح و سالم انسان کو لوہے کی ان کلوں نے پُورا ہضم کر لیا۔

آخر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اپنے پریشان خیالات کو یکجا کرتے ہوئے فلیمبو کو مخاطب کیا۔

"تم نے دیکھا کہ بیچارا اسمتھ بادل کی طرح ہوا میں اُڑ گیا۔ سچ پُوچھو تو یہ داستان اس دنیا کی معلوم نہیں ہوتی۔"

"خواہ یہ داستان اس دُنیا کی ہے یا کسی اور کی مجھے تو اس کے سوا کچھ نہیں سُوجھتا کہ نیچے پہنچ کر میں اپنے دوست سے مشورہ لوں" فلیمبو نے جواب دیا۔

نیچے اُترتے ہوئے انہوں نے بھیر بالٹی والے سے پوچھا اس نے وہی جواب دیا کہ اس راستے سے کوئی شخص مکان میں نہ گیا تھا دربان بھی اپنی بات پر اڑا ہُوا تھا۔ سبزی والے کو بھی اپنی آنکھوں پر شُبہ کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہ تھی۔ اور جب انگس نے اپنے چوتھے گواہ سے بھی اس کی تصدیق کرنی چاہی تو وہ کہیں نظر نہ آیا۔ انتہائی حیرت سے اس نے مُڑ کر پوچھا "لیکن وہ پولیس مین کہاں ہے؟"

"اگر آپ ناراض نہ ہوں" پادری براؤن نے نہایت شائستگی سے کہا "یہ میرا قصور ہے میں نے ہی ایک بات معلوم کرنے کے لئے اسے کچھ دُور بھیجا ہے میرا خیال تھا کہ شاید مفید حالات معلوم ہو سکیں۔"

"کچھ بھی ہو لیکن مجھے اس کی سخت ضرورت ہے۔ بدقسمت اسمتھ نہ صرف قتل ہو چکا ہے بلکہ اس کی لاش بھی غائب ہو گئی ہے۔"

"وہ کیسے؟" پادری نے پوچھا۔

"پادری صاحب" فلیمبو نے بتایا "یہ میرے بس کی بات نہیں اس کی تہ کو پہنچنے کے لئے آپ ہی زیادہ موزوں ہیں کیونکہ کوئی دوست یا دشمن مکان میں نہیں گیا پھر بھی اسمتھ غائب ہے، جیسے اسے پریاں اُڑا کر لے گئی ہوں۔ اگر میں جن بھوتوں کی کہانیاں ——"

فلیمبو فقرہ ختم نہ کرنے پایا تھا کہ موٹے سپاہی دوڑتا ہُوا آیا۔

"آپ درست کہتے تھے" اس نے پادری براؤن کو مخاطب کیا "بیچارے اسمتھ کی لاش ابھی ابھی نہر میں سے ملی ہے۔"

انگس نے اپنا سر پکڑتے ہوئے کہا "یا اللہ! کیا وہ اپنے

آپ کو ڈبونے کے لئے خود ہی نہر کی طرف بھاگ گیا تھا؟"

"وہ ہرگز نیچے نہیں آیا" سپاہی نے کہا "اور نہ ہی اس نے نہر میں ڈوب کر خودکشی کی ہے بلکہ اس کی موت سینے میں چھری چبھ جانے کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔"

"اور تم نے کوئی شخص مکان میں آتا ہوا نہیں دیکھا؟" فلیمبو نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"آؤ ذرا سڑک پر تھوڑی دُور تک چلیں" پادری نے کہا۔

جب وہ موڑ پر پہنچے تو پادری نے کہا "اُف مجھ سے کتنی غلطی ہوئی۔ میں کانسٹبل سے یہ پوچھنا تو بھول ہی گیا کہ کیا وہاں ایک خاکی رنگ کا تھیلا بھی ملا کہ نہیں"۔

"کیوں۔ خاص خاکی رنگ کا تھیلا کس لئے؟"

"کیونکہ اگر تھیلا خاکی رنگ کا نہیں تو ہمیں ازسرِ نو تحقیقات کرنی پڑے گی، اور اگر تھیلا واقعی خاکی رنگ کا ہے تو سمجھ لو کہ معمّا حل ہو گیا"۔

"مجھے یہ سُن کر مسرت ہوئی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ شاید ہم نے تحقیقات شروع بھی نہیں کی" انگس نے جواب دیا۔

"کیوں نہ آپ ہمیں تمام قصہ بوضاحت سُنا دیں" فلیمبو نے نہایت سادگی سے طفلانہ انداز میں پوچھا۔

موڑ پھرنے کے بعد وہ تیز تیز چلنے لگے تھے۔ پادری براؤن خاموشی سے ان کو آگے آگے لئے جا رہا تھا۔ آخر اُس نے ایک معنی خیز لہجے میں کہا "کسی گتھی کو سلجھانے کے لئے میں فرضی ثبوتوں کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ اور خاصکر اس معاملے میں تو اس کے سوا مجھے اور طریقہ معلوم بھی نہ تھا۔ کیا تم نے اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ لوگ کبھی تمہارے الفاظ پر دھیان نہیں دیتے۔ وہ تمہاری بات کا جواب صحیح دے دیں گے یا تمہیں مطلوبہ خبر پہنچا دیں گے لیکن تمہارے الفاظ پر اُنہوں نے کبھی توجہ نہیں کی۔ مثلاً اگر کوئی خاتون کسی گاؤں میں عارضی طور پر رہائش اختیار کرلے اور آپ اس سے جا کر پوچھیں کہ یہاں کوئی اور بھی رہتا ہے تو وہ کبھی یہ نہ کہے گی کہ ہاں ایک بہرہ تین نوکر اور میری خادمہ بھی میرے ساتھ ہیں۔ اس کا بہرہ اور خادمہ خواہ اس وقت کمرے میں ہی کیوں نہ موجود ہوں اس کا جواب ہمیشہ یہی ہوگا نہیں میں اس جگہ بالکل اکیلی ہوں۔ مطلب یہ کہ میں نوع کے آدمی سے آپ کی مراد ہے وہ وہاں کوئی نہیں۔ اس کے برعکس اگر ایک ڈاکٹر جو کسی متعدی بیماری کا علاج کرنے کے لئے بُلایا گیا ہے اس سے یہی سوال کرے تو اس وقت خاتون کو بہرہ بھی یاد آجائے گا، نوکر بھی گِن دیگی اور خادمہ کا ذکر بھی خاص طور پر کرے گی۔ یہی نہیں تمام گفتگو کا موضوع ہی یہ ہوتا ہے۔ آپکے سوال کا جواب شاید درست مل جائے لیکن اُن الفاظ کو جو آپ نے سوال کے ادا کرنے میں استعمال کئے کوئی مدِ نظر نہیں رکھتا۔ بعینہٖ جب ان چار بھلے مانسوں نے کہا تھا کہ کوئی شخص مکان کے اندر داخل نہیں ہُوا تو اُن کا مطلب ایسے آدمی سے تھا جس پر عام حالات میں کسی قسم کا شُبہ نہیں کیا جا سکتا حالانکہ مکان کے اندر ایک آدمی ضرور گیا اور واپس بھی آیا لیکن ان میں سے کسی نے اس کو نہیں دیکھا"۔

"کیا تمہارا مطلب کسی چھلاوے سے ہے جو ہمیں نظر نہیں آتا" انگس نے پُوچھا۔

ایک منٹ کی خاموشی کے بعد پادری نے اسی سادگی سے پھر کہنا شروع کیا "ہمیں ایسے چھلاوے کا اس وقت تک کبھی خیال نہیں آتا جب تک کہ ہم خاص طور پر اُسی کے متعلق نہیں سوچتے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اب تک غائب رہا۔ مجھے بھی اس پر شبہ نہ ہوتا لیکن چند باتیں تھیں جو میری سمجھ میں نہ آئیں۔ مسٹر انگس نے ہمیں بتایا تھا کہ ویلکین عموماً سیر کرنے کے لئے بہت دُور نکل جاتا تھا کیوں؟ اُنہوں نے اشٹام کے کاغذ کا بھی ذکر کیا تھا۔ خاص اشٹام کا کاغذ کس لئے؟ اس کے علاوہ مس ہوپ نے ۔۔۔ دیکھئے ناراض نہ ہو جئے"۔ پادری نے انگس کے سر کی بے چین جنبش کو دیکھکر کہا "اس کے علاوہ مس ہوپ کا بیان تھا کہ وہ چٹھی ملنے کے وقت بالکل اکیلی تھی اور بازار میں بھی کوئی موجود نہ تھا حالانکہ یہ ناممکن ہے جس وقت اس نے چٹھی کھول کر پڑھنی شروع کی تو اُس وقت بھی وہاں کسی نہ کسی شخص کی موجودگی ضروری ہے خواہ مس ہوپ نے اسے عمداً دیکھنا پسند کیا یا نہیں"۔

"کیوں یہ ضروری کیسے ہے؟ بازار خالی بھی تو ہو سکتا ہے" انگس نے سوال کیا۔

"کیونکہ" پادری نے کہا "وہ زمانہ تو گذر گیا جب کبوتر خط لا کر دیا کرتے تھے آج کل تو خط پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ

کوئی قاصد چنا کیا جائے :

"کیا تمہارا مطلب ہے کہ ولکین اپنے رقیب کے خط اسے لاکر دیتا رہا ہے" فلیمبو نے پوچھا۔

"یقیناً ولکین ہی اپنے رقیب کے خط لالا کر دیتا رہا ہے ۔ اسے ایسا کرنا پڑتا تھا "

"آپ بتا کیوں نہیں دیتے ؟" فلیمبو نے بے چینی سے کہا "یہ چیستاں میری سمجھ میں تو نہیں آئی ۔ آخر اس شخص کا حلیہ کیا ہے جو ہمارے سامنے آتا ہے لیکن ہم اسے نہیں دیکھتے ۔ اسے عمداً نہیں دیکھتے ؟"

"وہ سُرخ گہری نیلی اور سنہری وردی پہنے ہوتا ہے" ۔ پادری نے تحقیق سے بیان کیا" اور اپنی اس عجیب و غریب وردی میں آٹھ انسانی آنکھوں کے سامنے ہمالیہ مینشن میں گیا ، اور سمتھ کو قتل کرنے کے بعد اس کی لاش خود اُٹھائے ہوئے واپس آیا "

"جناب پادری صاحب " انگس نے چلا کر پوچھا "کیا آپ پاگل ہو گئے ہیں یا میرا ہی دماغ کام نہیں کر رہا "

"آپ کا دماغ بالکل صحیح ہے ۔ فرق اتنا ہے کہ آپ اتنے محتاط نہیں ہیں اور اپنے اردگرد کی چیزوں کا جائزہ نہیں لیتے ۔ کیا آپ نے کبھی اس قسم کا شخص نہیں دیکھا ؟"

پادری نے دو چار قدم بڑھ کر ایک معمولی پوسٹ مین کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیئے جو ان کے دیکھے بغیر درختوں کے سائے میں پاس سے گزر گیا تھا ۔

نہ معلوم کیا وجہ ہے لیکن لوگ چٹھی رسانوں کو نظر انداز کرتے رہتے ہیں ۔ آخر وہ بھی ہماری طرح انسان ہیں اور ان کے پہلو میں بھی ایک انسانی دل ہے اور پھر وہ ایک خاکی رنگ کا تھیلا بھی اُٹھائے پھرتے ہیں جس میں ایک لاش بخوبی چھپائی جا سکتی ہے" پادری نے کہا ۔

لیکن پوسٹ مین نے مُڑ کر دیکھنے کی بجائے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی اور بھاگتے وقت باغ کی باڑ میں جا اُلجھا ۔ جب اس نے اپنا متحیر اور خوف زدہ چہرہ ان کی طرف کیا تو تینوں سکتے کی حالت میں کھڑے کے کھڑے رہ گئے ۔ ان کے سامنے والی کریہہ المنظر شکل بھیانک طور پر بھینگی تھی ۔

فلیمبو اپنی تلواروں ، نگینوں ، غالیچوں اور ایرانی بلی کے پاس واپس چلا گیا کیونکہ ایسے کئی اور کام باقی تھے جہاں اس کی ضرورت تھی ۔ جان ٹرن بل انگس اپنی خاتون کے پاس واپس چلا گیا اور اس سے شادی کر لی ۔ لیکن اکثر چاندنی راتوں میں پادری براؤن ایک قاتل کے ساتھ ان برفانی پہاڑیوں پر گشت لگاتا دیکھا گیا ، اور نہ معلوم کہ وہ آپس میں کیا گفتگو کرتے رہے ۔

("چسٹرٹن")

مقبول الٰہی بی اے (آنرز)

ہمتِ دل

ہمتِ دل خندہ زن ہے خندۂ برقِ سپہر پر
[illegible] سے بھی دل ابھی نہیں گھبرائے گا
سدِ رہ بن جان کا [illegible] کچھ بھی پروا نہیں
چل سکے گا آفتوں کا زور [illegible] کر رہا ہے
پھیلا [illegible] تیغ [illegible] پیش [illegible]

آرزو جلیلی

بیخودی

آسماں کو [illegible] اپنی [illegible] سے [illegible]
بیخودی میں پاس یاس اور حرماں سے دل بیگانہ تھا
ہم [illegible] ساز تھا میرا جنون [illegible]
بیخودی تھی [illegible] میں [illegible] اور میرا دل دیوانہ تھا

آرزو جلیلی

شبنم

(۱)

شب تارے گا رہے تھے

اِک نور کا سماں تھا

بھاگیسری کی دُھن میں ایسا الاپ چھیڑا

لیلائے کہکشاں نے

زہرہ کے دِل میں اُمڈا جذبوں کا ایک طوفاں

مستانہ وار اُٹھی

دیوانہ وار اُٹھی

نغموں کی لے سے گویا سرشار ہو کے اُٹھی

تصویرِ دلبری تھی

یا رقص کی پری تھی

جو رقص کر رہی تھی

زہرہ وہ اب نہیں تھی

حیرت کا ایک عالم محفل پہ چھا رہا تھا

ہالے میں چاند بیٹھا کچھ مسکرا رہا تھا

محسوس ہو رہا تھا

زہرہ کی بیکلی کو معلوم ہو چکا تھا

نیرنگِ رازِ فطرت:

لالہ نے جس کو سوزِ دردِ دوام سمجھا

بلبل نے بوئے گُل کا رنگیں پیام سمجھا

شامِ سیہ قبا نے آہنگِ نورِ جانا

تاروں کی دلکشی نے موجِ سرور جانا

انسان نے محبت کہہ کر جسے پکارا

زہرہ کی بیکلی نے وہ راز پا لیا تھا

اب اس کا رقص کیا تھا!

اُلفت کی بےخودی کی سرشار مستیاں تھیں

اور اس کے گیت:

اُلفت کی نغمہ زائیاں تھیں

جو حسرت دروں کی ہنگامہ کاریوں سے

بیتاب ہو کے آنسو بن کر ٹپک رہے تھے

(۲)

جاگی پری سحر کی

دوشِ نسیم پر وہ سیرِ چمن کو نکلی

تابندگی کی مرجیں اس کی جلو میں رقصاں

کلیوں پہ ننھے ننھے قطرے پڑے جو دیکھے

"اے اچھی کلیو تم کیوں روتی ہو؟"

اس نے پوچھا

اِک شاخِ گل پہ بلبل بیٹھا یہ سُن رہا تھا

میٹھے سے شوخ سُر میں اِک گیت اُس نے گایا

لے تھی اساوری کی

اِک گیت اُس نے گایا

دیکھا اِدھر اُدھر اور

پھر اُڑ گیا چمن سے

یہ گیت کیا تھا؟ دیکھو

وہ مسکرائیں کلیاں

رُوئے سحر پہ سُرخی کیوں دوڑی جا رہی ہے:

وہ آفتاب نکلا

وہ نور کی ردا میں اُس نے سحر کو ڈھانپا

خالد از لندن

گیت

تین تال (ایمن)

آوت ناہیں چین

پیا بن آوت ناہیں چین،

کارے کارے بدروا چھائے
بجلی کی ناگن لہرائے
کہہ کر پیتم ناہیں آئے

بیتی ساری رین،
پیا بن آوت ناہیں
چین،

سکھی باغ میں جھولا جھولے
مدھ ماتی جوبن پر پھولے
ساجن مجھ دکھیا کو بھولے،

رو رو کھوئے نین،
پیا بن آوت ناہیں
چین،

عابد لاہوری

برہن کا گیت

آئی بدری کاری کاری
ٹھنڈی ٹھنڈی پروا سنکی
رُت ہے پیاری پیاری
آئی بدری کاری کاری

جیسے جل بن ہرن ہو بیاکل
تیسے پی بن ناری
آئی بدری کاری کاری

آجا پیارے مان بھی جا اب
تُو جیتا میں ہاری
آئی بدری کاری کاری

امر چند قیس جالندھری

تہذیب

میری والدہ نے مجھے سرحد کے متعلق خوفناک فسانے بارہا سنائے تھے۔ اس لئے جب میں والدہ کے ہمراہ سرحد کو روانہ ہوا تو سراپا شوق بنا ہوا تھا۔ میرے والد کوہاٹ چھاؤنی میں فوجی افسر تھے۔ اُن کی زندگی کا اکثر حصہ سرحد کی چھاؤنیوں میں گذرا تھا۔ اس لئے وہ نڈر ہو کر قبائل کے لوگوں میں چلے جاتے تھے۔ اُن کے تعلقات بہت سے پٹھانوں کے ساتھ دوستانہ تھے۔

میری والدہ پٹھانوں سے بہت ڈرا کرتی تھیں۔ ولایت سے آتے وقت اُنہوں نے والد سے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ ایک سال سے زیادہ ہندوستان میں نہیں رہیں گی ابھی ہمیں آئے ہوئے چھ ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ سرحدی قبائل سے پھر معاملات بگڑ گئے۔ ہر وقت جان کا خوف رہنے لگا پٹھان دن دہاڑے انگریز بچوں کو اُٹھا لے جاتے تھے۔ ہمیں اپنے ہندوستانی نوکر پر بھی اعتبار نہ رہا تھا۔ میری والدہ میری بہت احتیاط کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ ایک دن افضل خان میرے والد کا ایک دوست جو سرحدی قبائل میں اہم شخصیت رکھتا تھا ملنے آیا۔ ازراہِ شفقت اُس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا تو والدہ اُس پر بہت خفا ہوئیں۔ افضل خاں نے ہنستے ہوئے کہا "میم صاحب یہ ہمارا اپنا لڑکا ہے۔ ہم اِس کی خبر گیری کرے گا"۔

اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد یکایک رات کے دس بجے معلوم ہوا کہ ڈاکا آ رہا ہے۔ اعدہ پیشتر اس کے کہ فوج کا انتظام کیا جاتا پٹھان بنگلے لوٹ چکے تھے۔ میری والدہ مجھے لے کر ایک تاریک کمرے میں گھس گئیں۔ مگر چند ہی منٹوں کے بعد ہمارے بنگلے میں بھی ہلڑ مچ گیا۔ ایک ظالم نے دروازے سے داخل ہوتے ہی ایک گولی ماری والدہ ایک چیخ مار کر ٹھنڈی ہو گئیں۔ مجھے پکو کر وہ مارنا ہی چاہتا تھا کہ افضل خاں کی گرجتی ہوئی آواز سنائی دی "ٹھہرو! ٹھہرو!" اور میں دوڑ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ اس کے بعد مجھے اُس وقت ہوش آیا جب میں افضل خاں کے گھر بستر پر پڑا سوچ رہا تھا کہ میں کہاں ہوں۔

میری زندگی کے بارہ سال اسی پُرجوش ماحول میں گزرے۔ افضل خاں نے مجھے اپنے لڑکے کے طور پر پالا۔ اس کے کوئی لڑکا نہ تھا۔ میں اپنی گذشتہ زندگی بھول چکا تھا۔ میرے ہاتھوں پر چند انگریزی حروف کے نشانات کے سوا کوئی چیز مجھے اُس زمانے کی یاد نہ دلاتی تھی۔ میری زندگی پُرلطف تھی۔ سرحد کی پہاڑیوں پر ریوڑوں کے ہمراہ سارا سارا دن ہنسی خوشی گذر جاتا۔ میں گاؤں کے تمام لڑکوں سے ہر بات میں ممتاز تھا۔ بہادری، دوڑ، سواری، نشانہ بازی، خوبصورتی، خوش پوشی، گانے بجانے غرض ہر معاملے میں میں مقابلتاً اچھا رہتا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر جگہ میری قدر تھی۔ ہاں کبھی کبھی مجھے نام و نسب کا طعنہ دے کر لڑکے تنگ کیا کرتے تھے۔ مگر ایسی حالت میں مجھے باپ کی طرف سے اجازت تھی کہ خوب مارو۔ میرا باپ افضل خاں میرے کارناموں پر فخر کیا کرتا تھا۔ اس کی بھانجی میرے ساتھ منسوب تھی۔ ایک خوبصورت گڑیا سی لڑکی۔

(۲)

دوستوں کے ہمراہ سیر کرنے پشاور آیا۔ اس سے پہلے بھی کئی دفعہ آ چکا تھا مگر قسمت کی بات واپسی پر پکڑا گیا۔ میرے نشانات پر تفتیش شروع ہوئی۔ ولایت میں میرے چچا کو اطلاع دی گئی۔ سرکار نے والد کی خدمات کے صلے میں مجھے پنشن دے کر انگلستان روانہ کر دیا۔

اُس وقت میری عمر سترہ سال کی تھی۔ انگریزی بالکل بھول چکا تھا اور یورپین سوسائٹی کے سامنے بالکل وحشی تھا۔ چچا نے میرے لئے اُستاد مقرر کئے جنہوں نے دن رات میرے دماغ میں مہذب دُنیا کے قوانین اور طریقے بھرنے شروع کئے۔ چچا نے مجھ پر بے دریغ روپیہ صرف کیا۔ میں نے سب کچھ سیکھا جو اس عمر میں ممکن ہے۔ دُنیا کی تمام محیر العقول نمائشوں سے روشناس کرایا گیا۔ میرے لئے یہ اجنبی زندگی بہت دلچسپ تھی۔ لنڈن کی کلبوں کے عریاں نظارے، موٹروں اور ٹراموں کی ریل پیل، اُونچے اُونچے محل، نظر نواز باغ، تھیئٹر اور سنیما کی بھیڑ بھاڑ، جلسے اور تماشے میرے لئے سب کچھ عجیب تماشا تھا — ایک نرالی دُنیا۔

اپنی گذشتہ پُرمصائب زندگی مجھے ایک خواب معلوم ہوتی تھی۔ علم کی ترقیاں، تمدن کی بلندیاں، سائنس کی نکتہ آفرینیاں، یہ تمام تغیرات بعض دفعہ مجھے نیم پاگل بنا دیتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ مجھے دوزخ سے بہشت میں پھینک دیا گیا ہے۔ مہذب دُنیا کے معاشرتی قوانین ہوسائٹی

کی رسوم، میل جول کے قواعد دیکھ کر مجھے پٹھان نرے وحشی معلوم ہوتے تھے اپنی موجودہ پُرآسائش زندگی کا اُس سخت کوش اور محنت پسند معاشرت سے مقابلہ کرتا تو مجھے ایک گونہ افسوس ہوتا تھا کہ میں نے اپنی زندگی کے بارہ سال بیکار کھوئے ہیں۔ میرے لنڈن پہنچنے کے دو سال بعد چچا فوت ہو گئے، انہوں نے بیشمار دولت میرے نام چھوڑی جو مجھے ساری عمر کے لئے کافی تھی۔ میں اس عرصہ میں مہذب دنیا کے رسم و رواج پورے طور پر اخذ کر چکا تھا، مگر میری بعض عادات میں ابھی "پٹھانیت" باقی تھی۔ بعض دفعہ یہی اجنبی خصائل مجھے سوسائٹی میں زیادہ محبوب بنا دیتے تھے۔ خوبصورت لڑکیاں میرے اکھڑ طرزِ گفتگو کو بہت پسند کرتی تھیں۔ احباب میرے اِرد گرد گھیرا ڈالکر بیٹھ جاتے اور سارا سارا دن اُس غیر مہذب دنیا کے عجیب و غریب قصّے سُنتے رہتے۔ اُن کی شادی بیاہ کی رسمیں، معاشرتی تعلقات، مہمان نوازی اور دوستی کی کہانیاں، قومی بغض اور دشمنی کے قصّے، بے قاعدہ اور خطرناک زندگی، بے آئین سرزمین، یہ سب کچھ اُن کے لئے الف لیلہ کی داستانیں تھیں اور میں سندباد جہازی کی طرح بیٹھ کر کہتا جاتا تھا۔ کافی عرصہ گزر جانے کے باوجود میری زبان اور لہجہ ابھی تک اجنبی تھا، نشتر کی جوشیلی ادا کے ساتھ میرا طرزِ کلام بہت پسند کیا جاتا تھا۔

یوں تو بہت سی لڑکیاں میری دوست تھیں، اور خصوصاً میری دولت اور بھی زیادہ کشش پیدا کر رہی تھی، ہر ایک مجھے جیتنے کے لئے ہمہ تن نمائش بن کر مجھے ملنے آیا کرتی، مگر ان میں میری آرنلڈ سب سے زیادہ شوخ اور مُنہ لگ تھی۔ وہ ایک فوجی کپتان کی لڑکی تھی۔ زندگی کے غموں سے آزاد، ایک شوخ تیتری کی طرح، ہر وقت چہچہاتی ہوئی بُلبل۔ وہ میرے وحشیانہ پن کو پسند کرتی اور مجھے اس کی بے پناہ شوخی محبوب تھی۔ ہماری دوستی بڑھتی گئی آخر اس کا انجام یہ ہُوا کہ ہم زندگی کے مستقل ساتھی بن گئے۔

(۳)

شادی کے بعد مجھے جلد ہی احساس ہونا شروع ہُوا کہ یہ تمام مکلّف زندگی ایک فریب ہے ایک مدہوش کن طلسم ہے جس میں تمام یورپ بےخبری سے دوڑا چلا جا رہا ہے۔ مہذب دنیا کی تمام دلچسپیاں میرے لئے خارستان بنتی جا رہی تھیں۔ سوسائٹی کے نمائشی قوانین کی خلافِ فطرت بے آہنگی مجھ پر بے نقاب ہو رہی تھی۔

"کتنی فضول زندگی ہے!" میں سوچا کرتا تھا "صبح اُٹھنے کے بعد کتنی لغو اور بیہودہ پابندیاں اپنے اوپر عاید کرنی پڑتی ہیں۔ مُنہ ہاتھ دھونے کے لئے خاص قوانین، روٹی کھانے کی خاص پابندیاں، کپڑے پہننے کے خاص طریقے، دوستوں سے ملنے کی مقررہ طرزیں، دیکھنے اور سننے کے قواعد، چلنے پھرنے کی خاص ادائیں گویا ہماری زندگی کی ہر ساعت قید میں ہے۔ ایک دوست سے ملنا ہے، پہلے اُسے اطلاع دے کر وقت طے کرو، پھر گھر جا کر کارڈ دو، ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر انتظار کرو۔ روٹی کھانے، کام کرنے، سیر کرنے، رات کو چلنے پھرنے اور سونے کے لئے الگ الگ فیشنوں کی پابندی کرو۔ ذرا چُوکے تو فوراً سوسائٹی کی اُنگلیوں کا نشانہ بن گئے کتنی جکڑی ہوئی زندگی ہے ایک لمحہ بھی فطرتی طور پر نہیں گزر سکتا۔ ایک ساعت کے لئے بغیر قوانین کے بسر نہیں ہوتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟"

مکلّف زندگی دولت اور عزت کی تمام دلکشیاں قلبی سکون اور دلی اطمینان حاصل کرنے کے ناقابل ہیں۔ جب دولت کے آرام و آسائش کے باوجود حقیقی مسرت حاصل نہ ہو تو انسان اپنے اُس ماحول کو یاد کرتا ہے جس میں اُس نے بچپن کی بے فکری کے دن گزارے ہوں۔ مجھے اب سچی دوستی، حقیقی ہمدردی اور اخوت کی تلاش تھی، جو شادی کے بعد بھی میں حاصل کر سکا۔ اگرچہ عیش و نشاط کے محلوں میں کھیل رہا تھا، عزت و ثروت میرے قدم چوم رہی تھی۔ مگر غیر مہذب دُنیا کا وہ اخلاص، سادگی اور بے ریا دوستی مجھے اس متمدن دُنیا میں کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ میں یہ فریب کارانہ تمدن شاید برداشت کر لیتا مگر میری شادی نے مجھے اور بھی زیادہ متنفر کر دیا۔ میری کی یہ خواہش کہ وہ دوستوں کے ہمراہ سینما جائے، میری پٹھانی فطرت کے خلاف تھی۔ میری کا یہ ارادہ کہ وہ کلب جا کر ٹینس کھیلے میری غیرت کے منافی تھا۔ میری کا یہ خیال کہ وہ پہلے کی طرح سوسائٹی کی بُلبل بن کر ہر ایک کا دل بہلاتی پھرے، میری سرشت کے برعکس تھا۔ مجھے ایسی بیوی کی ضرورت تھی جو افضل خان کی بیوی رقیہ کی طرح آنکھ کے اشارے پر کام کر سکے، جو میری بیماری پر رات بھر میرے سرہانے بیٹھ کر سر دبا سکے، جو میرے پسینے کی جگہ لہُو بہانے کو تیار رہے۔ میں اکثر شادی سے پیشتر بیوی کے جو خواب دیکھا کرتا تھا اُن میں ایک بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ اخلاص و محبت کی دیوی، ہمدردی اور اُلفت کا مجسمہ جو میرے دماغ میں متشکل تھا اُس کا یہاں نشان تک نہ تھا۔ کہاں "مہذب دنیا" کی عورت اور کہاں صحرا کی پابندیاں۔

اب میں ان مہمل پابندیوں اور خلافِ فطرت رسموں سے گھبرا اُٹھا مجھے پھر اُسی "وحشی" دُنیا کی آرزو ہونے لگی۔ اُس جنگلی "علاقہ" کا ذرہ ذرہ

مجھے کشش کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کاش میں پشاور نہ آتا اور آج اس شیطانی دُنیا کو نہ دیکھ سکتا!!" میں سوچا کرتا تھا "کتنے اچھے دن تھے! ہر شخص خلاص اور محبت سے سرشار! ہر بچہ سادگی اور سادہ لوحی کا مجسمہ۔ اباپ کے ہمراہ سرسبز کھیتوں میں کس آزادی سے میں کام کرتا تھا۔ افضل خاں کی بھانجی ۔ ۔ ۔ ۔ کتنی اچھی لڑکی تھی۔ خوبصورت، شرمیلی۔ اُس کی سیاہ آنکھوں میں کتنی حیا تھی۔ سنجیدہ اور خاموش۔ اُس کا پردہ اور میری چھپ چھپ کر اسے دیکھنے کی کوشش۔ میرے پیارے اور مخلص دوست اکبر خان۔ محبوب خان۔ جان محمد۔ شریف کی دل لگی اور مذاق۔ پہاڑوں کے کیف پرور منظر جنگلوں کی رُوح افزا فضائیں۔ رباب کی پُر لطف تانیں پشتو کے جوشیلے گیت سیر و شکار۔ کیا اچھے دن تھے۔ احمد زئی قبیلہ کے ساتھ ہمارا مقابلہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

گولیوں کی آواز اور تلواروں کی جھنکار میں وہ موسیقی تھی کہ مہذب دنیا کے تمام ہارمونیم اُس کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ گولیوں کی بارش میں ہم اپنے قبیلے کو رسد پہنچایا کرتے تھے۔ کس دلیری سے دوڑتے پھرتے تھے۔ ہر شخص اپنی حفاظت کا خود ذمہ دار تھا۔ کیا کیا شوق اور ولولے تھے۔ آہ! اُن وحشیانہ دنوں میں کتنی مسرتیں پوشیدہ تھیں۔ دلیری اور جوش اُن کی تعلیم تھی، سادگی اور غیرت مندی اُن کی خوراک۔

میرا تنفر بڑھ گیا۔ تہذیب کے ہر قانون کی اصلیت اور حقیقت مجھ پر بے نقاب ہو گئی۔ آخر اخباروں کے ذریعے سے مجھے معلوم ہوا کہ سرحد پر پھر جنگ شروع ہو گئی ہے۔ میں نے انگریزی حکومت کو درخواست دی کہ چونکہ میں اس ملک کے حالات، زبان اور ملک سے اچھی طرح واقف ہوں اس لئے مجھے خدمت کا موقع دیا جائے۔ درخواست منظور ہوئی۔ جلد ہی مجھے روانہ ہونا پڑا۔ تمام یورپ میں صرف مجھے اپنے چھوٹے لڑکے سے بچھڑنے کا افسوس تھا جس سے مجھے کچھ کچھ محبت ہو چلی تھی۔ ورنہ میں ہر چیز سے بھاگنا چاہتا تھا۔ اُس کے لئے میں اپنے چچا اور باپ کی تمام جائداد چھوڑ رہا تھا۔ میری بیوی میرے جانے پر خوش تھی کہ میں اُسے آزاد زندگی کے تمام اختیارات دے رہا ہوں۔ میں اپنے طور پر خوش تھا کہ ایک فریبکار مسحُور کُن سرزمین سے نجات مل رہی ہے۔

ایک ماہ بعد میں پشاور میں فوج کے ساتھ کوچ کر رہا تھا۔ میرا دِل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ بہادر سرزمین کا ہر سانس بہشت کی ہوا کا جھونکا معلوم ہو رہا تھا۔ فوجی کیمپ سے چوتھے روز میں غائب ہو چکا تھا۔ دو دن کے پہاڑی سفر کے بعد میں افضل خان کے قدموں میں تھا۔ آہ میرا بوڑھا باپ بستر سے اُٹھ بیٹھا اور مجھے گلے لگا کر جس اخلاص سے ملا میں ساری عمر نہیں بھُول سکتا۔ رقیہ کی آنکھوں میں فرطِ مسرت سے آنسو تھرتھرا رہے تھے۔ میرے ماتھے پر اُس نے بے شمار بوسوں کی بارش کر دی۔ میں اپنے حقیقی چچا کو مل کر بھی اتنا خوش نہ ہوا تھا۔ کتنا عجیب اخلاص اور کتنی سچی محبت ہے۔ میرا بال بال مسرت اور سرخوشی سے متوالا ہو رہا تھا۔ میں خوش تھا کہ اُس قابلِ نفرت سرزمین سے بہت دُور آ چکا ہوں۔ اُس کے شورش آلودہ شہروں اور معصیت پرور گلیوں کی بو آنک یہاں نہیں پہنچ سکتی۔

میری آمد پر گاؤں کے بچے بوڑھے دوڑ پڑے۔ ہر ایک کے چہرے پر مسرت مسکراتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ہر طرف مبارکباد کی صدائیں تھیں۔ میرا عجیب و غریب سفر، نرالی قید اور مہذب دُنیا کے عجائبات سُن سُن کر تمام دم بخود تھے۔ مگر میں سب کچھ بیان کرنے کے بعد اُن کے سامنے تصویر کا دُوسرا رُخ بھی رکھ دیتا تھا۔ تمدن کی آسائشوں اور عیش و نشاط کے تمام کاشانوں کے تذکروں کے بعد میں اُس دُنیا کا ملمع آلود چہرہ، فریب کار خوبصورتی، ریاکارانہ محبتیں، سراب نما نمائشیں سب بے نقاب کر دیتا۔ وہ تہذیب کی بے غیرتی، بے حمیتی، فریب کاری اور بزدلی پر نفرین کرتے ہوئے کہتے:۔

"شکر ہے کہ کافروں کے ملک سے بچ کر سلامت آ گئے"

ظفر خالد قریشی

راحت کدہ

محبت سے ہے لپٹائے ہُوئے خارِ تمنا کو
کہاں لے جاؤں یارب اپنے قلبِ ناشکیبا کو

مری فکرِ فلک پیما کی پرواز اِک قیامت ہے
فرازِ عرش سے دیکھا کیا نیرنگِ دُنیا کو

مکاں تو خوب ہیں لیکن مکیں ہی جب نہ ہوں ان میں
تو پھر کوئی کرے کیا کعبہ و دَیر و کلیسا کو

بتائیں کیا تجھے اب وحشتیں قلبِ پریشاں کی
لئے پھرتا ہے ہر ذرہ یہاں دامن میں صحرا کو

دلِ بیتاب کی منزل جو نکلی بھی تو کیا نکلی!
لحد نے لے لیا آغوش میں اس راہ پیما کو

الٰہی اِن بزرگوں سے ہوئی تھی کیا خطا ایسی!
ابد تک کر دیا ہے قید کیوں خضر و مسیحا کو

چمن میں، جلوۂ خورشید میں، مہتاب و انجم میں
نگاہیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں تیرے رُوئے زیبا کو

ترے معصوم جلووں کو ترستا ہوں مَیں اَے راحت!
مُبارک طُور کے شُعلے ہوں چشمِ شوقِ مُوسےٰ کو

اثر صہبائی

تہذیب امریکہ اور جرائم

امریکہ کے اخبارات و رسائل اور مصنفین کو اس کا بے حد اندیشہ ہے کہ اگر ان کی دماغی و ذہنی نشو و نما میں مشرقی خیالات کا ہلکا سا عکس بھی پڑ گیا تو ان کی تباہی و بربادی یقینی ہے۔ اُن کے نزدیک ایشیا، تہذیب امریکہ کے لئے، جو مہرِ منور کی طرح درخشاں اور روشن ہے، ایک بہت بڑی لعنت ہے۔ امریکن تہذیب کے پُرجوش حامی، جو مدعی ہیں اپنی پاکیزگیٔ نسل و قوم کے، ایشیا کی سفلی اور مجرمانہ ذہنیت کی بھیانک تصویر کھینچتے ہیں اور اپنے ہموطنوں کو آگاہ کرتے رہتے ہیں کہ "ارواحِ خبیثہ" ہم میں سرایت کر جائیں گی اگر ان کی نگرانی نہ کی گئی۔ مشرقی ذلت و خواری کی داستان کی اُس ملک میں اتنی مسلسل تبلیغ کی جا چکی ہے کہ اس کو تقریباً قومی حمایت و وفاداری کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ اگرچہ امریکہ کے باشندوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ ایشیا کے سرِ و قالب کو اپنے پیروں سے کچل ڈالیں، جس سے یقیناً حکومتِ جمہوری کی پاکیزگی کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ ہے، لیکن ہمارا خیال ہے کہ شاید خود اُن کی اخلاقی حالت کچھ کم باعثِ ذلت و رسوائی نہیں۔ کچھ بہت زمانہ نہیں گزرا کہ امریکہ کے ایک سیاست دان نے ریاست ہائے متحدہ کو دُنیا کی سب سے بڑی مجرمانہ قوم سے تعبیر کیا تھا۔

اخبارات کے ذریعہ روزانہ نہایت ہی بھیانک اور وحشیانہ نوعیت کے جرائم کی داستانیں شائع کی جاتی ہیں۔ شہر مساچوسٹس میں ایک جلسہ ہوتا ہے جس کو ناکام بنانے کے لئے اہلِ شہر مصمم ارادہ کر لیتے ہیں۔ اور اس 'شاہانہ جنگ' میں ہزاروں اشخاص شریک ہوتے ہیں۔ گولے، پتھر اور رانڈے وغیرہ کی خوب بارش ہوتی ہے، پولیس افسر کو پکڑ لیا جاتا ہے، اس کا ریوالور، تلوار اور وردی وغیرہ چھین لینے کے بعد، اسی طرح پولیس کے دیگر افراد کو بھی خوب زد و کوب کیا جاتا ہے۔

شکاگو یونیورسٹی کے دو طالب علم، جو نہایت شریف و متمول خاندانوں کے چشم و چراغ ہیں "مکمل جرم" کر لینے کا عزم کر لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک چھوٹے لڑکے کو اپنی موٹر میں بٹھا کر اس کا سر کچل ڈالتے ہیں اور اس معصوم [illegible] کو ایک پل کے نیچے پھینک کر فرار ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے [illegible] بیکسا [illegible] ..بنا کرنے ملک 'مہ [illegible]

الی نادس کا ایک نوجوان، جو جمہوریت کی جنگ میں کارہائے نمایاں انجام دے چکا ہے، اپنے گھر واپس آتا ہے، بوڑھے باپ کو دیکھتے ہی اس کے غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ فرمانبردار بیٹا باپ کے خنجر بھونک کر اس طرح اپنی آتشِ غیظ بجھاتا ہے۔

جنوبی ڈکوٹا کے کسی شہر میں دو عورتیں ایک بنک میں جاتی ہیں۔ ایک محاسب کو ریوالور دکھاتی ہے اور دوسری روپے پر نگاہ رکھتی ہے۔ بوڑھی عورت محاسب کی پیشانی پر ریوالور رکھ کر کہتی ہے "ہلنا نہیں، مجھے جان لینے سے نفرت ہے، میرا مقصد تو محض کاروبار ہے اور جب مجھے جرم کی ضرورت ہو گی میں اس پر عمل کروں گی"۔ چنانچہ یہ دولت سوانی مجرم موٹر میں فرار ہو جاتے ہیں جو پہلے سے ان کی منتظر ہے۔

یقیناً یہ واقعات اپنی انتہا کو پہنچ چکے ہیں اور اسی سبب سے ان کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ ان سے صاف ظاہر ہے کہ یہ سیلابِ جرائم کس سمت جا رہا ہے اور کس طرح اپنے ساتھ جمہوری حکومت کے منتشر اجزا کے خس و خاشاک کو اپنی رَو میں بہائے جا رہا ہے۔ امریکہ والے اپنے پندار میں علمبردار ہیں سب سے مکمل و ارفع تہذیب کے، لیکن واقعات شاہد ہیں کہ یہی قوم دُنیا میں سب سے زیادہ مجرمانہ ذہنیت کی مالک ہے۔

جج الفرڈ۔ جے۔ ٹیلے، جنرل سشن نیویارک کہتا ہے کہ "یہ ملک ایک ایسی لعنت میں گرفتار ہو چکا ہے جس سے اس کا شمار دُنیا میں سب سے زیادہ قانون شکن اقوام میں کیا جاتا ہے۔ آپ یقین کیجئے کہ ممالکِ متحدہ کو اپنے جُرم کا یقیناً اقبال کرنا پڑے گا"۔ یہ کہا جاتا ہے کہ آبادی کے تناسب کے لحاظ سے امریکہ میں بمقابلہ انگلستان، فرانس، اٹلی، جاپان، یا دنیا کے کسی متمدن ملک کی بہ نسبت جو اس ارضِ خاکی پر عالمِ وجود میں ہے زیادہ جرائم سرزد ہوتے ہیں۔

بہ حیثیتِ آبادی شکاگو امریکہ میں دوسرا سب سے بڑا شہر ہے اور دُنیا میں اس کا تیسرا نمبر ہے۔ لیکن شکاگو میں جرائم کا اوسط روزانہ ایک سے زیادہ ہے۔ سالِ رواں میں تین سو سینتیس قتل کئے گئے اور گذشتہ سال [illegible] دو سو ستر [illegible] ۲۱۱ [illegible] شکاگو محض [illegible] کا سب سے بڑا مرکز [illegible]

شہر نہیں ہے، بلکہ دُنیائے عیسائیت میں بھی اس کو اولیں مرتبہ حاصل ہے
حقیقت یہ ہے کہ یہ جرائم کی لہر نہیں بلکہ ایک زبردست طوفان ہے جو امریکہ
میں گذشتہ ربع صدی سے مسلسل تدریجی ترقی کر رہا ہے۔

ڈاکٹر فریڈرک۔ ایل۔ ہافمین کے بیان کے مطابق، جو پروڈنشل
انشورنس کمپنی میں اعداد و شمار کے ماہر ہیں، گذشتہ چوبیس سال میں قتل کی
تعداد دوگنی ہوگئی ہے۔ گذشتہ جنگِ یورپ میں چوبیس ہزار امریکن حفاظتِ
خود اختیاری میں قتل کئے گئے لیکن کیا یہ مقامِ حیرت نہیں کہ جنگِ عظیم
سے اب تک امریکہ میں قتل کی تعداد مندرجہ بالا تناسب سے بھی کہیں زیادہ ہے!
امریکہ کے ہولناک و وحشیانہ قتل کی تعداد گیارہ ہزار سالانہ سے بھی تجاوز کر
چکی ہے۔ گذشتہ پندرہ سال میں اس سلطنتِ جمہوری میں قتل کا تناسب
ہمیشہ اسی اور نوّے فی ہزار کے درمیان رہا ہے برخلاف اس کے جاپان،
برطانیہ عظمیٰ، آئرلینڈ، ہالینڈ، سوئٹزرلینڈ اور ناروے کی تعداد قتل تین سے
نو فی ہزار تک پہنچتی ہے۔ ڈاکٹر فریڈرک موصوف، جو اس موضوع کے متعلق
سب سے بڑی شخصیت تصور کئے جاتے ہیں، رقمطراز ہیں کہ "ہماری قومی زندگی
اب اس درجہ انحطاط کو پہنچ چکی ہے جہاں کوئی متنفس کسی وقت بھی صحیح و سلامت
نہیں۔ جرائم کا اقدام صدرجہ ظالمانہ اور سفاکانہ طریقہ سے کیا جاتا ہے اور
بیشتر اس نوع کے واقعات میں ایسی غیر معمولی دماغی ذہانت کا اظہار ہوتا ہے
جس سے حکام متحیر اور خود قانونی ثبوت و دلائل انگشت بدنداں ہیں"۔
بلاشبہ، یہ ہے تہذیبِ امریکہ کی ترقی پر ایک عجیب و حیرت انگیز تنقید!

ممالکِ متحدہ امریکہ کے ایسوشی ایٹڈ پریس کی تازہ رپورٹ کے
مطابق موٹر کے ذریعہ انسانی زندگی کے قتل و غارت کی تعداد گذشتہ سال
روزانہ ہر گھنٹے میں دو نفر تھی اور یہ ایک حقیقت ہے اور ناقابلِ تردید کہ
اس وقت امریکہ میں گاڑیوں کے ذریعہ اموات کی تعداد دنیا کے ہر ملک
سے زیادہ ہے۔ تیز رفتاری کے شوقین اپنی تفریحِ طبع کو انسانی زندگی کے
مقابلہ میں زیادہ مقدم سمجھتے ہیں۔ صرف شہر نیویارک میں تین سو بچوں کی
موتیں گاڑیوں کے ذریعہ وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ شکاگو میں دو سو بچوں
کا سالانہ اوسط ہے۔ اس طرح محض ان دونوں شہروں میں پانچ سو پچاس
بچے ہر سال گاڑیوں کے ذریعہ موت کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ اس تعداد
کے لحاظ سے بآسانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تمام ریاست ہائے متحدہ
میں تقریباً ساڑھے چار ہزار معصوم بچے آمد و رفت میں نذرِ اجل ہو جاتے ہیں۔
قتل و غارت کے ذریعہ امریکہ کے باشندوں کو اپنے مال و اسباب
کا شدید نقصان اُٹھانا پڑتا ہے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ریوالوروں کے
ذریعہ ریلیں روک لیتے ہیں، اور یہ واقعہ ہے کہ ریلوں میں ڈاکہ زنی اتنی
عام ہوگئی ہے کہ تقریباً دو سال سے ڈاک خانہ نے ملک کے بیشتر حصوں
میں رجسٹری شدہ پارسلوں کی آمد و رفت رات کی گاڑیوں سے بالکل
بند کر دی ہے۔ گھوڑا گاڑیاں روزِ روشن میں بھی حفاظتِ خود اختیاری
کے لئے اسلحۂ جنگ سے مسلح رہتی ہیں۔

گذشتہ اکتوبر میں شہر بوسٹن کے صدر ڈاکخانہ اور اس کے ۱۴
برانچ آفس مسلح قلعوں کی صورت میں تبدیل ہوگئے ہیں جن میں رائفل اور
پستول چلانے کے ماہرین ہر وقت نگہبانی کرتے رہتے ہیں۔ ڈاکخانہ
کا ہر کلرک جو کھلی ہوئی کھڑکی میں اپنا کام انجام دیتا ہے، ہمیشہ فوجی ریوالور
سے مسلح رہتا ہے۔ یہ کیفیت ہے اس بوسٹن کی جو امریکہ کا "ایتھنس" اور
تہذیبِ عالم کا مرکز خیال کیا جاتا ہے۔

سالِ گذشتہ امریکہ کے محض دو شہروں یعنی نیویارک اور شکاگو میں
اتنے اشخاص کو چوری اور لوٹ مار کے واقعات سے دوچار ہونا پڑا جتنا
کہ برطانوی کینیڈا کے ملک میں کل واردات وقوع پذیر ہوئی تھیں [illegible]
ہے۔ برنس، سابق صدر تحقیقاتِ محکمۂ عدالت نے اندازہ لگایا ہے کہ تین
کروڑ سالانہ کی جائداد ریلوں اور دُخانی جہازوں کے ذریعہ چُرائی جاتی ہے
یہ رپورٹ "نیویارک ٹائمس" کے ایک نمائندہ کے بیان کے مطابق ہے
امریکن بنکرز ایسوسی ایشن نے جو اعداد اگست ۱۹۲۲ء میں شائع کئے
تھے ان سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ محض اس کے ممبران
سے ایک سو چھتیس چوری اور تین سو اُنیس ڈاکہ زنی کے حادثات سرزد
ہوئے جو چھتیس لاکھ بہتر ہزار چار سو تریسٹھ روپیہ کے عظیم الشان نقصان
کے ذمہ دار ہیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ سال میں ہر روز بنک میں کوئی نہ
کوئی اہم چوری یا نقب زنی ہوتی ہے، یہ واضح رہے کہ اس بیان میں
وہ چوریاں اور حادثات شامل نہیں جو بنکوں میں اسی ایسوسی ایشن کے
غیر ممبروں کے ذریعہ سرزد ہوئی تھیں! کیا یہ بلا خوفِ تردید نہیں کہا جا
سکتا کہ امریکہ آبادی ہے محض ٹھگوں اور ڈاکوؤں کی؟ کیا یہ واقعہ نہیں
کہ امریکہ کے قومی عادات و خصائل میں مجرمانہ ذہنیت کا عنصر تمام و
کمال شامل ہے؟

یہ ناگفتہ بہ مجرمانہ اور غیر تادیبی حکومت کا وعدہ اُس ملک میں ہے
جسے فخر ہے اپنی پاکیزہ و اعلیٰ تہذیب پر۔ اس سے ہرگز یہ

مقصود نہیں کہ امریکہ کی مادی ترقی کو نظر انداز کر دیا جائے۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال کا زمانہ گزرا کہ یہ تیرہ نو آبادیاں سلطنتِ برطانیہ کے زیر نگیں تھیں لیکن صرف چار نسلوں ہی میں امریکن قوم نے ایک بر اعظم پر اپنا تسلط کر لیا، شہر آباد کئے اور بے اندازہ دولت کے انبار لگائے۔ ایسی حالت میں جبکہ دنیا کے دیگر ممالک سونے کی کمی کے باعث پریشان ہیں، ریاست ہائے متحدہ کی ملکیت میں دنیا کے کل نو بلین میں سے، ساڑھے چار بلین سونا موجود ہے۔ امریکہ کی مادی ترقی خواہ کتنی ہی حیرت انگیز کیوں نہ ہو لیکن وہ اس کے نقائص پر پردہ نہیں ڈال سکتی۔ اخلاقی و روحانی تاثرات کا فقدان ملک کی تمام فضا کو تیرہ و تار بنا رہا ہے۔ اندرونی انتشار، نسلی اختلاف اور مذہبی تعصب روز بروز بڑھتا جاتا ہے جس نے قدرتی طور پر رواداری کو، جو جمہوریت کی سب سے نمایاں علامت اور تہذیب کی پاکیزہ ترین خصوصیت ہے، بالکل فنا کر دیا ہے۔

کیا امریکہ کی اس قومی دیوانگی کی اصلاح کی کوئی صورت باقی ہے؟ جرائم کے انسداد کا واحد علاج عام طور پر سخت اور عبرت انگیز سزا تجویز کیا جاتا ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ پانچ لاکھ سے زیادہ اشخاص، جن میں مرد و عورت یکساں طور پر شامل ہیں، ہر سال ممالک متحدہ کے جیلوں میں محبوس رہتے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ، سزا کا موجودہ طریقہ آج بھی جرائم کے انسداد سے قاصر اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے یکسر نامکمل اور ناکام ثابت ہو چکا ہے۔

بعض ماہرین جرائم ان حادثات کی جذباتی اور دماغی وجود کی تحقیق میں مصروف ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر میکس جی۔ سیلپ، پروفیسر طبی ہاسپٹل اسکول نیویارک کا خیال ہے کہ جرائم کی زیادتی کا باعث دماغی رجحانات ہیں جو دماغی کمزوری کے باعث وقوع پذیر ہوتے ہیں اور یہی اُن کے نزدیک جذبۂ قومی کے انحطاط کا واحد اصلی سبب ہے۔

ان کا خیال ہے کہ اگر ہماری موجودہ رفتارِ ترقی قائم رہی تو ملکی تعمیر کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی۔ ہر قوم کی جذباتی استقامت میں ایک ناہموار راستہ ہوتا ہے جو من حیث القوم اس کی بنیادی ترقی کی اولین علامت ہے۔ لیکن ایک زمانہ ایسا بھی آتا ہے جس میں یہ جذباتی احساس ختم ہو جاتا ہے اور اسی منزل پر آ کر قوم میں زوال کے آثار ہویدا ہونے شروع ہوتے ہیں اور ہماری اس وقت بعینہٖ یہی کیفیت ہے: اخلاقی کمزوری ہی کے فقدان کے باعث جرائم، دماغی انتشار اور وحشیانہ ذہنیت پیدا ہوتی ہے۔ ہمیں اس امر سے بحث نہیں کہ امریکہ کی موجودہ مجرمانہ ذہنیت کے کے سدِ باب کے لئے کس نوع کی اصلاحات کی ضرورت ہے لیکن اس حقیقت سے اظہار کی یقیناً ضرورت ہے کہ امریکہ جو تمام عالم میں جرائم کا مرکز سمجھا جاتا ہے اس کا دعوائے تہذیب و شائستگی کس حد تک قابل تسلیم ہو سکتا ہے؟

مقبول الرحمٰن بھرایونی

قطعات

(۱)

کچھ ہوش کے شیدائی ہیں کچھ مدہوشی کے پروانے ہیں
سب اپنی دھن میں ڈوبے ہیں کیا ناداں کیا فرزانے ہیں
یہ دُنیا عقل و جنوں کا رنگا رنگ عجائب خانہ ہے
اس دنیا میں جو بستے ہیں کچھ عاقل کچھ دیوانے ہیں

(۲)

سیماب کی رُوحِ بے تابی ہے برق کے خوں کا چشمہ ہے
سمٹا ہوا میرے سینے میں صہبائے جنوں کا چشمہ ہے
یہ دل نہیں ہمدم مجھ کو قسم ہے عشق کے کیفِ محکم کی
جذبات کا اک آتش خانہ ہے سوزِ دروں کا چشمہ ہے

عدم

پھولوں کا خریدار

موسم گرما کی شام تھی۔ شہر کی رونق جو دوپہر کو پھیکی پڑ گئی تھی اب پھر دلفریب صورت اختیار کر چکی تھی۔ آفتاب کی کرنیں بلند درختوں کی چوٹیوں اور اونچی عمارتوں پر کھیل رہی تھیں۔ شاہراہ ایک ندی کے کنارے واقع تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ندی کے رُخ پر بڑی دور تک ایک خوش منظر تفریح گاہ بنی تھی۔ شام کی دلفریبی نے اس چمن کو دُلہن بنا دیا تھا۔ بینڈ کی سریلی آواز چمن کے اندر سامعہ نوازی میں مصروف تھی۔ خوش باش نوجوان دل بہلا رہے تھے۔ حسین عورتیں کچھ رَوِشوں پر مصروفِ خرام تھیں، کچھ چمن کے اُس کنارے پر جو ندی کی طرف تھا محوِ تماشا تھیں، اور کچھ اُن درختوں کے نیچے نشستوں پر بیٹھی تھیں، جو ایک شاعرانہ محویت میں بیلوں کو اپنے سینے سے لپٹائے ہوئے تھے۔ ساری فضا پر ایک سحر طاری تھا۔

چمن کے مقابل شاہراہ کی دوسری جانب بلند عمارتوں کے نیچے کئی پھول والوں کی دکانیں واقع تھیں۔ گلاب اور موتیا کی نکہت چھڑکاؤ کی ہوئی زمین کی خوشبو سے مل کر فضا کو مُعطّر کر رہی تھی۔

انہی میں ایک گُل فروش کی دوکان تھی جہاں سے ہر روز ایک نوجوان پھولوں کے زیور خریدا کرتا تھا۔ وہ اس گل فروش کا ایک مستقل خریدار تھا جو ہر روز شام کو اپنے مقررہ وقت پر آتا اور زیور بنوا کر لے جاتا۔ اُس کا زیور بنوانا گیا ہوتا تھا، پھول والے سے ایک خاصی دلچسپ تکرار ہوتی تھی۔

کبھی تو ہار تیار ہوتے وقت یہ شکایت ہوتی کہ "دیکھو تم نے پھول کتنی دور دور پروئے ہیں، اور وہ بھی سب اِکہرے"!

پھول والا کہتا "حضور اِکہرے موتیا میں خوشبو زیادہ ہوتی ہے"!

جواب ملتا "خیر اِکہرے اور دوہرے دونوں ملا کر پرو دو۔ اور دیکھو پھول قریب ہوں"!

کبھی یہ ہوتا کہ "یہ آج تم نے پہلے ہی ہار وغیرہ بنا کر کیوں رکھ دیئے ہوئے ہیں۔ بلا کہ پھر آئندہ سے میرے سامنے بنایا کرو ——— اور دیکھو آج یہ پہنچیاں اور بازو بند بھی کتنے ہلکے ہیں ——— میں یہ تو کبھی نہیں لوں گا۔ بھری بھری پہنچیاں بنا کر دو اور بازو بند بھی اِس سے اچھے ہوں ——— اور ذرا یہ کان کی چکریاں دیکھو کیسی بھدی کر دی ہیں۔ یہ تو نازک چیز ہے جتنی ہلکی ہو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ بڑی سخاوت کی کہ پھول اٹھا کر بھر دیئے ——— بھئی یہ کرو گے تو پھر میں بھی دوسری دوکان سے لینا شروع کر دونگا"!

یہ گفتگو سن کر پھول والا مسکراتا اور کہتا "حضور۔ میں تو آپ کا ہر حکم بجا لاتا ہوں۔ دوسری دوکان پر آپ کیوں جائیں گے ——— اللہ پہننے والوں کو سلامت رکھے"!

کئی روز سے گُل فروش کا گاہک پھول خریدنے نہیں آیا تھا۔

آج جمعرات تھی۔ وہی نوجوان پھولوں کا خریدار آیا اور پھول والے سے کہا:-

"پانچ آنے کے کھُلے پھول اور پانچ عود بتیاں بھی دے دو"

——— گُل فروش نے اپنے خریدار کو دیکھتے ہی کہا "اللہ کیوں حضور کیا غریبوں سے خفا ہو گئے۔ اب تو آپ اِدھر آتے ہی نہیں۔ کیا کہیں اور سے خرید رہے ہیں؟"

نوجوان کے چہرے پر ایک ہیجان سا نمودار ہوا۔ اُس نے دَبی ہوئی آواز سے جواب دیا "نہیں"!

گُل فروش پھول باندھنے میں مصروف ہو گیا اور اس دوران میں ایک دو شکایتی جملے اور بھی کہہ دیئے۔

پھول کی ٹوکری دیتے وقت جب اُس نے اپنے خریدار کے چہرے پر دوبارہ نظر ڈالی تو نوجوان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے۔ اُس نے ایک گہری آہ بھری اور پھول لے کر بازار کے ہجوم میں نظر سے اوجھل ہو گیا۔

"آشٹراگو"

باقیات

یہاں ہے ایک مرگِ ناگہاں کا آسرا باقی
نہ رہ جائے کوئی طرزِ ستم ناآشنا باقی

وہاں تم کب گئے کب آئے کیا گذری خدا جانے
مگر کوئے عدو میں ہے تمہارا نقشِ پا باقی

اُسے بھی التفاتِ یار کی حسرت میں کھو دے
ابھی کچھ حوصلہ دل میں ہے آہِ نارسا باقی

شکستِ عہد پر وہ بے مروّت کیوں ہوا نادم
مری بربادیوں کا کوئی ساماں رہ گیا باقی

ترے غم نے جلایا دل کو اشکوں نے بجھا ڈالا
مگر اب بھی ہر اس میں ایک دھیمی سی صدا باقی

کہیں ناکامیٔ تدبیر کا چرچا نہ ہو جائے
ابھی آزاد ہے صیاد اک نغمہ سرا باقی

ترے خنجر میں قاتل زندگی کی آرزو پائی
ترا احساں مری گردن پہ مر کر بھی رہا باقی

مری تخئیل کا مرہونِ منت ہے یہ ہنگامہ
جہانِ شوق میں جو کچھ بھی ہے تیرے سوا باقی

وہ آغازِ محبت اب فسانہ ہو چکا انور
کھٹکنے کے لیے دل میں رہا اک تیر سا باقی

لطیف انور گورداسپوری

انتقام کی رات

مطلع بالکل صاف تھا اور چاند ایک بھٹکی ہوئی کشتی کی طرح بادل کے سیمیں ٹکڑوں پر ہلکے ہلکے ہچکولے کھاتا ہوا جا رہا تھا۔

چاند کی چمکدار اور معصوم کرنیں سینۂ آب کو چیرتی ہوئی تلواروں کی طرح اندر گھسے جا رہی تھیں۔ ہر طرف خاموشی تھی ــــ بالکل اور مکمل! البتہ کبھی کبھی چپوؤں کی آواز مسحور کائنات کی خاموشی کو توڑ دیتی تھی اور ساحل دریا کے خوابیدہ تاریک بار گی مرتعش ہو جاتے تھے۔

گیارہ بجے کا عمل ہوگا، ایک کشتی ساحل کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ ملاح بڑی جانفشانی سے چپو چلا رہے تھے تاکہ جلد منزل مقصود تک پہنچ جائیں مگر ابھی کوئی پانچ میل کا فاصلہ اور رہ گیا تھا۔

صابی بولا "مازل! یہ تو اُس کی دین ہے ورنہ ہمارا یہ منہ کہاں کہ اس قدر قلیل عرصے میں اتنی دولت جمع کر سکتے!"

مازل نے ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہاں بھائی ــــ میرا دل چاہتا ہے کہ پر لگا کر اُڑ جاؤں اور اپنی چہیتی بیوی . . . . . ."

صابی نے آہستہ سے کہا "ٹھیک کہتے ہو دوست! یہی میری بھی تمنا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اپنی بیوی اور بچوں کو دیکھوں۔ ننھے اور معصوم، میری تو بس یہی کل دُنیا ہے"۔

کشتی کے کھیوا اپنے کام میں مصروف تھے۔ مازل نے ان کو دیکھتے ہوئے کہا "تمہاری رفتار بہت سُست ہے۔ نہ معلوم کتنی دیر اور لگے؟"

صابی کچھ سوچتے ہوئے بولا "پرسوں گاؤں کے مکھیا کا انتخاب ہوگا، مجھ کو بھی رائے دینی ہے"۔

مازل چند لمحے تک کچھ غور کرنے کے بعد بولا "مجھ پر غنودگی طاری ہو رہی ہے جب ہم ساحل کے لگ بھگ ہوں تو مجھے جگا دینا"۔

گاؤں کا مکھیا، سارے علاقے کا چودھری اور تمام آبادی کا حکمران بننا کون پسند نہیں کرتا! اور پھر خصوصاً جس کی جیبیں روپے سے پُر ہوں اور تھوڑی سی عزت بھی رکھتا ہو، وہ تو ضرور ہی چاہتا ہے کہ سب کا سردار بن کر رہے۔ یہی دن انتخاب کے تھے، جگہ جگہ پنچایتیں ہو رہی تھیں اور ہر گاؤں کا ایک مکھیا پسند کیا جا رہا تھا۔ مازل کافی دولت لے کر اپنے گاؤں واپس ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ لوگ اس کی عزت بھی کرتے تھے۔ چنانچہ اگر اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا کہ وہی سب کا چودھری بنے تو کوئی بے جا نہ تھا۔

انہی خیالات کی اُلجھن میں، چند موٹے موٹے رسّوں کو سر کے نیچے رکھ کر وہ لیٹ گیا اور نیند کی رانی اس کی آنکھوں میں تیرنے لگی۔ رات اور خاموش و پُرسکون! دن بھر کی تھکان اور نصف رات تک بیداری! لطیف ہوائیں اور جانفزا! نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بہت جلد سو گیا اور اس کے خیالات اُسے کشتی، سمندر، بیوی سب سے بھلا کر ایک نئی دُنیا میں لے گئے۔

لوگ کہتے ہیں کہ انسان سوتے میں اپنے خیالات کا عکس دیکھتا ہے، چنانچہ مازل خواب میں بھی انتخاب کے ہنگامے کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ گاؤں کے بڑے اور ذی اثر لوگوں نے صابی کو اپنا چودھری منتخب کر لیا ہے۔ وہ چونک پڑا، اُٹھ کھڑا ہوا، تعجب سے بہتی ہوئی کشتی اور مسکراتے ہوئے صابی کو دیکھا۔ اس کا چہرہ طیش سے تمتما اُٹھا اور آنکھیں غصے سے سُرخ ہو گئیں۔ اس نے دل میں سوچا "میں نے گاؤں میں ان کے لئے مندر بنوائے، شفاخانوں کو روپیہ دیا، محتاجوں کو خیرات دی اور اپاہجوں کی مدد کی، یہ لوگ اس کے بدلے یہ دیں گے کہ میرے ہوتے ہوئے ایک معمولی سے آدمی، غریب اور مفلس صابی کو اپنا سردار بنا لیں گے۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ لیکن بزرگ کہتے ہیں نصف رات کے قریب جو خواب نظر آئے اس کی تعبیر سچی ہوتی ہے۔ مگر نہیں، میری موجودگی میں کسی کو بھی گاؤں کا مکھیا بننے کی ہمت نہ ہوگی"۔ وہ انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں کشتی کے پچھلے حصے میں بھاری بھاری تختوں پر اُلجھے ہوئے قدم رکھتا ہوا ٹہلنے لگا۔ ساحل اب آدھ فرلانگ رہ گیا تھا۔ صابی بڑی محبت سے مخاطب ہو کر بولا "بھائی! کنارہ آ گیا، تم کچھ تھکے ہوئے سے معلوم ہوتے ہو"۔

"ہاں ہاں، میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ کشتی جلد کنارے سے لگا دو"۔ اس نے لاپرواہی سے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔

(۲)

کنارے پر اُتر کر دونوں بچپن کے دوست گاؤں کی طرف روانہ ہوئے۔ گھنے گھنے درخت ان کے راستے پر سایہ کئے ہوئے تھے اور ان کی پگڈنڈی کبھی کبھی کچی سڑک میں کھو جاتی تھی۔ وہ آگے ہی بڑھتے گئے یہاں تک کہ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں سے دو راستے جاتے تھے۔ ہاتھ پکڑتے ہوئے حازل بولا "آج تو اس راستے سے چلیں گے۔ یہاں سے کوئی جاتا ہی نہیں"۔

صابی حیرت سے بولا "بھلا یہاں سے کہاں جاؤ گے۔ اس طرف کوئی آمد و رفت ہی نہیں ہے۔ . . . . مگر تمہارے اصرار پر میں بھی راضی ہوں چلو ذرا سیر ہی رہے گی"۔ دونوں اس طرف چل دیئے۔ چاند اب پوری طرح چمک رہا تھا اور چاندنی رات معصوم دُلہن کی طرح مسکرا رہی تھی!

تھوڑی دُور ایک گھنے برگد کے نیچے پہنچ کر جس کی لمبی لمبی لٹیں اس کی درازیٔ عمر کا پتہ دے رہی تھیں، حازل نے کرخت آواز میں صابی سے کہا "کیا تم سمجھتے ہو کہ لوگ تمہیں گاؤں کا مکھیا بنا لیں گے!"

اس نے بغیر کچھ سوچے سمجھے جواب دیا "بھلا تمہاری موجودگی میں ——؟"

حازل نے گویا سنا ہی نہیں۔ وہ ایک خوفناک ہنسی ہنسا اور پہلو بچا کر پیچھے ہٹا اور پلٹ کر اس کے سینے میں اپنا خنجر گھونپ دیا۔

"آہ . . . . . " لڑکھڑا کر صابی گر پڑا۔ زخم کاری تھا بمشکل بولا "روپیہ تم مجھ سے مانگ ہی لیتے، میری جان کیوں لی، بھائی . . . اوہ! . . . . ."

"نہیں۔ روپے کی خاطر نہیں . . . . تم اب گاؤں کے مکھیا نہ بن سکو گے" اس نے اپنے تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں کو دانتوں سے دباتے ہوئے کہا۔

—— مرنے سے پہلے اس نے اپنا سر زمین سے اٹھایا اور بولا "اے چاند! میرے پیارے قاصد! میری بیوی اور معصوم بچوں کو اس ہولناک اور دردانگیز قتل کی اطلاع دے دینا —— ایک دوست کے ہاتھوں میرا قتل! آہ! مجھے یہ اُمید نہ تھی . . . . ."

حازل نے ایک حیرت انگیز قہقہہ لگایا "او ہو! چاند قاصد تھا! یہ ضرور میرے راز کا انکشاف کرے گا! آہا ہا ——"

"اے چاند!" وہ رُک رُک کر بولا "اگر تیری روشنی پاک اور میرا قتل بے گناہ ہے تو اس کا بدلہ ضرور لینا"۔

وہ خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد ایک چیخ ماری اور ہمیشہ کے لئے اپنی کہانی چاند کو سُنا کر اس دُنیا سے رُخصت ہو گیا۔ حازل نے اُسے اُس کی چادر میں لپیٹا اور ایک بڑی جھاڑی کے اندر اس کی لاش چھپا دی۔ پھر قریب سے لکڑیاں اور بڑے بڑے پتے جمع کر کے اس پر ڈال دیئے کہ کسی کو خبر نہ ہو اور گھر کی طرف روانہ ہُوا۔

وہ تمام راستے ہنستا ہُوا چلتا رہا۔ گھر پہنچ کر اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس کی بیوی باہر آئی۔ اُسے دیکھتے ہی خوشی کے مارے پھُولی نہ سمائی۔ وہ اندر گیا اور دولت کا ایک انبار، جو خود اس کی اور صابی کی چھینی ہوئی کمائی تھی، اپنی بیوی کے سامنے ڈال دی۔ وہ بہت خوش تھی، اس نے اسی وقت اس کے لئے بستر بچھایا اور آرام کرنے کو کہا لیکن وہ ہنسے جا رہا تھا جس سے اس کی بیوی کا تعجب لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہا تھا۔ اس نے اُس سے بارہا پوچھا مگر اس نے نہ بتلایا۔ اس پر اُسے غصہ سا آ گیا اور وہ پڑ کر سو گئی۔ رات کا باقی حصہ اس نے ہنسنے اور قہقہے لگانے میں گذارا۔ قہقہوں کی متواتر اور سخت آوازوں سے پڑوس کے لوگ جاگ اُٹھے۔ انہیں اس کی اس حماقت پر بے حد غصہ آیا لیکن آخر کو وہ گاؤں میں ساکھ رکھتا تھا۔ بچارے کر ہی کیا سکتے تھے۔ خاموش ہو گئے

صبح ہوتے ہوتے اُسے نیند آ گئی۔ کوئی دس گھڑیاں گزری ہونگی کہ وہ جاگ اُٹھا اور پھر وہی ہنسی، وہی قہقہے۔ آخر کار اس کی بیوی کے جسم میں برہمی سے خون دوڑنے لگا اور اس نے اپنی خوفناک آنکھیں اس کی طرف نکالتے ہوئے اس کا سبب پُوچھا۔ اس کی بیوی جب کبھی کسی بات پر ضد کرتی تو حازل مجبور ہو جاتا۔ جانتا تھا کہ برہما کی رہنے والی ہے۔ اس کی ہنسی کم ہو گئی اور وہ آہستہ سے بولا "بات یہ ہے کہ —— " اُس نے اس کو اپنے پاس بٹھا لیا اور کان میں سارا واقعہ سُنا کر کہنے لگا "کیوں! کس قدر بے وقوفی اور حماقت ہے بھلا کہیں چاند بھی قاصد ہُوا ہے؟ اور پھر وہ مجھ سے انتقام لے گا —— آہا ہا، آہا ہا —— " وہ پھر ہنسنے لگا اور اس کی بیوی بھی اس تمسخر میں حصہ لینے لگی۔ "بعض آدمی تو بالکل گدھے ہوتے ہیں" اس نے اس کے جواب میں کہا اور اس کے ساتھ خود بھی اپنا حلق پھاڑنے میں مصروف ہو گئی۔

(۳)

تیسرا روز تھا ——

حازل گاؤں کا مکھیا بنا دیا گیا اور لوگ خوش خوش اس کی تعریف کرنے آنے لگے۔ اس نے بہت سا روپیہ خیرات کیلئے مندر کے پنڈتوں کو بھجوایا اور بہت سا اناج غربا میں تقسیم کیا۔

حازل، گاؤں کا مکھیا، مکان میں داخل ہوا! - اس کی بیوی کھانے پکانے میں مصروف تھی۔ اس نے اُسے آواز دی۔ لیکن وہ نہ سُن سکی۔ اس پر وہ آگ بگولا ہو کر باورچیخانے پہنچا اور طیش میں آ کر ہنڈیا پھینک دی۔ تم جانتے ہو ایک بری عورت کا غصہ کس قدر خوفناک اور بے پناہ ہوتا ہے اور خصوصاً اُس وقت جب کہ اُس کی توہین کی گئی ہو۔ وہ غصے سے بے قابو ہو کر اس کی طرف لپکی مگر حازل بھاگ کر مکان سے باہر آ گیا۔ اُس نے معلوم اُسے کتنی گالیاں سُنائیں اور بُرا بھلا کہا۔ اس کی بری آواز پر اِدھر اُدھر سے لوگ جمع ہو گئے تو وہ طیش میں آ کر سب کچھ بھول گئی۔ اور بولی "اے لوگو! جسے تم اپنے گاؤں کا مکھیا بناتے ہو وہ قاتل ہے، قاتل! صابی کا قاتل! تمہیں معلوم ہے دریا سے ایک میل اِدھر جہاں دو پگڈنڈیاں جاتی ہیں وہاں گھنی جھاڑی میں کس کی نعش ہے؛ اسی بے گناہ صابی کی اور اس کا قاتل یہی بدمعاش، فریبی حازل ہے جو پنڈتوں کو دان اور غریبوں کو اناج دیتا ہے ——"

لوگوں میں ہلچل مچ گئی، عجلت سے لوگ اس طرف دوڑ پڑے۔ لاش نکالی گئی اور ثبوت مل گیا۔

حازل، گاؤں کا مکھیا، صابی کا قاتل تھا۔ بھلا سرکار کب چھوڑتی؛ انصاف کی نگاہ میں سب برابر ہیں اور خون کا بدلہ! پھانسی!

———

وہی چودھویں رات تھی ——

اور چاند بادل کے سفید ٹکڑوں سے راز و نیاز میں مصروف تھا۔ آدھی رات گزر چکی تھی اور چندرماں کی حسین کرنیں مرتعش پانی پر رقصاں تھیں۔ اُسی تاریک گھنے برگد کے درخت کے ایک موٹے تنے میں رسّی کا پھندا حازل کے گلے میں پڑا ہوا تھا، انتقام کی ہولناک مگر معصوم رات!

چاند نے جب اپنا فرض ادا کر دیا تو آج تیس دن کے بعد پھر اُسی طرح خوش اور مطمئن ایک کشتی کی طرح سفید بادلوں کے درمیان آسمان کے نیلے سمندر میں تیر رہا تھا۔ وہ قتل کی رات تھی۔

اور آج —— انتقام کی رات!

(مقتبس) —— صادق الخیری (دہلوی)

غزل

حقیقتوں پہ پڑے ہیں مجاز کے پردے
مجاز پر ہیں فریبِ مجاز کے پردے

نظارہ جلوۂ عریاں کا کیا کرے زاہد
خدا پہ ڈال دیئے ہیں نماز کے پردے

کہاں کا صبر کہاں کا قرار جذبۂ دل
اُٹھا دے بیچ سے راز و نیاز کے پردے

بہک گئی تھی یہ چشمِ نظارہ جو ایسے
تمام کھول دیئے رنگِ ناز کے پردے

نیازِ عشق پہ کہتے ہیں بے نیازی ہے
تری نظر میں ہیں سارے نیاز کے پردے

جیوکا میرٹھی

غزلیات

(۱)

محبت میں تیری ہے جینا ہی پینا — نہ پروائے ساغر نہ پروائے مینا
خزاں ہو گئی ہے بہارِ تمنا — عجب گل کھلائے بہار آفرینا
نگاہیں زمانے کی اُس پر جمی ہیں — کسے دیکھ بیٹھی مری چشمِ بینا
کسی سے ہیں وابستہ میری اُمیدیں — یہی میرا مرنا یہی میرا جینا
نگاہِ کرم تُو نے یہ بھی نہ چاہا — غمِ جاودانِ محبت بھی چھینا
خدا سے کریں شکوۂ ناخدا کیا — غنیمت ہے یہ بھی کہ ڈوبا سفینا

نظر یوں بھی کرتا ہے کوئی محبت
نہ کوئی سلیقہ نہ کوئی قرینہ

عبدالقیوم نظر

(۲)

بڑھ جائے دردِ دل تو گزر جائیں جاں سے ہم — کر لیں جو قفلِ ضبط کلیدِ فغاں سے ہم
طاقت بیاں کی نزع میں لائیں کہاں سے ہم — [illegible] دل نگہِ بے زباں سے ہم
پہنچے کہاں کرامتِ پیرِ مغاں سے ہم — باتیں زمیں پہ کرنے لگے آسماں سے ہم
بے خود ہوئے کرامتِ پیرِ مغاں سے ہم — لو بے نیاز ہو گئے دونوں جہاں سے ہم
دریا ہی کا نشاں تھا نہ ساحل ہی کا پتا — اُترے جو پار کشتیِ عمرِ رواں سے ہم
صیاد اب قفس کی جدائی ہے دلخراش — مانوس ہو چکے تھے نئے آشیاں سے ہم
رنگِ جنوں عیاں ہے جبینِ نیاز سے — ٹکرا رہے ہیں سر کو ترے آستاں سے ہم
راہِ طلب میں شوق کا عالم نہ پوچھیے — آگے ہزار گام رہے کارواں سے ہم
جب مٹ گیا ہمارا فسانہ تو ہم کہاں — ہم ہی جو داستاں ہیں تو ہیں داستاں سے ہم
آئے تھے دل میں شوق کی دُنیا لئے ہوئے — اِک داغ لے چلے ہیں ترے آستاں سے ہم
آنکھیں کھلیں تو صبحِ قیامت تھی سامنے — بیدار ہائے کب ہوئے خوابِ گراں سے ہم

اے نجم خامشی تھی مصائب کی پردہ دار
رُسوا ہوئے جہان میں ذوقِ بیاں سے ہم

نجم [illegible]

(۳)

تمہیں تو ہو وحشی بنا دینے والے — بڑے آئے اُلٹی سزا دینے والے
بڑے رحم والے، رُلا دینے والے — بنا کر تحمل کا دُعا دینے والے
مرے غم کی دُنیا بجاتی ہے [illegible] — [illegible] ہنسے لے دُعا دینے والے
گناہِ محبت کی عظمت تو دیکھو — کہ گھبرا گئے خود سزا دینے والے
ترا حسن رنگیں، ترا دل بھی رنگیں — محبت کو رنگیں بنا دینے والے
سب آرائشیں تیری خاطر تھیں ظالم — نشیمن کسی کا جلا دینے والے
بھلا کچھ تو تیرا بھی مقصود ہو گا — سراپا محبت بنا دینے والے
کہیں آئینے سے نہ یہ چھیڑ کرنا — مجھے دیکھ کر مسکرا دینے والے

خلش میری دنیا بھی جنت سے بڑھ کر
سلامت مرا دل دُکھا دینے والے

خلش [illegible]

(۴)

تری نگاہ نے دل کا قرار لوٹ لیا — سمجھ کے مجھ کو غریب الدیار لوٹ لیا
برا ہو بڑھ کے ترا دردِ دل دوا ہونا — کہ تُو نے لطفِ شبِ انتظار لوٹ لیا
پڑے ہیں بجھے بجھے سے صحنِ باغ میں غنچے — خزاں نے قافلۂ لالہ زار لوٹ لیا
وہ خوابِ عیش کی راتیں کہاں گئیں یارب — شبابِ مست کا کس نے خمار لوٹ لیا

قرار اس کو بھی یارب کہیں نصیب نہ ہو
دلِ شہید کا جس نے قرار لوٹ لیا

[illegible]

(۵)

ابھی کچھ دُور تھے ہم آشیاں سے — گری یک لخت بجلی آسماں سے
مسافر ہم نرالی وضع کے ہیں — نہیں معلوم آتے ہیں کہاں سے
وہیں ہم آج پھر کس مُنہ سے جائیں — نکلوائے گئے تھے کل جہاں سے
سفینہ ہو گیا جب نذرِ طوفاں — ہوئے بیدار ہم خوابِ گراں سے
ہمیں منظور جاں پر کھیل جانا — مگر فرمائیے اپنی زباں سے
اگر پہنچا دیا قسمت نے ہم کو — نہ اُٹھیں گے درِ پیرِ مغاں سے

جہاں پر ہم ہوئے تھے قتل ناظر
نظر آتے ہیں کچھ دھندلے نشاں سے

ناظر دہلوی

دنیائے ادب

اُردو

شعراور فلسفہ

شعراور فلسفہ کے مقابلہ سے فلسفہ کے نئے معانی پر روشنی پڑسکتی ہے۔ اکابر شعرا میں سے بعض زندگی کو محض بیان کرنے پر قانع نظر آتے ہیں۔ لیکن بعض اس کی توجیہ وتعبیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کی بدایت و نہایت، غرض وغایت نوعیت وماہیت کی تشریح کرتے ہیں، یہی فلسفی شعرا ہیں۔ روما کا مشہور شاعر لکری سیش فلسفی تھا، اپیکیورس نے فلسفہ کو اپنے شعر میں ادا کیا۔ اللہ کا انکار، حیاتِ بعدالموت کا انکار، طمانیتِ خاطر اور مسرت "ماہیتِ فطرت" والی شہرۂ آفاق نظم کے ہر شعر سے ظاہر ہے۔ خیام فلسفی شاعر ہے، اسرارِ ازل، ماہیتِ کائنات، غایتِ وجود، رازِ مسرت کے متعلق اس کے خیالات گو عقل کیلئے نہیں تاہم تخیل کے لئے نہایت خوشگوار ہیں ؎

اسرارِ ازل را نہ تو دانی و نہ من — ایں حرفِ معما نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پسِ پردہ گفتگوئی من و تو — چوں پردہ برافتد نہ تو مانی و نہ من

خیام اگر بادہ پرستی خوش باش — با لالہ رخے اگر نشستی خوش باش
چوں عاقبت کارِ جہاں نیستی است — انگار کہ نیستی چو ہستی خوش باش

ڈانٹے برترین فلسفی شاعر ہے وہ اپنی (Divine Comedy) میں، ہیں کائنات کی شکل وصورت سے انسان کی بدایت و نہایت سے، شر کی ابتدا اور اس کے علاج سے واقف کرتا ہے" فردوس (Paradise) کے تابناک اشعار میں ہم پڑھتے ہیں کہ قلبِ کائنات سے حبِ الٰہی کی مستنیر شعاع پیدا ہوتی ہے جس کا مقصد انسان کو معصیتوں سے پاک کرنا ہوتا ہے۔ جرمنی کا زبردست شاعر گیٹے بھی مفکر اور فلسفی ہے اس کی شاعری کا موضوع بھی نجاتِ انسانی ہے، لیکن اس کے نزدیک یہ زہد وتقویٰ سے نہیں تجربہ سے حاصل ہوتی ہے۔ ورڈ سورتھ کو اس نا قابلِ فہم عالم کے

بارِ گران نے عاجز کر رکھا تھا اور براؤننگ" نبامن نلب" خدا، صداقت ومحبت سے ہمیں تشفی بخشتا ہے۔

ان فلسفی شعرا کی حیرت ناک دلکشی اس امر کا انکشاف کرتی ہے کہ انسان کے سینہ میں" اسرارِ ازل" کو دریافت کرنے اور اس" حرفِ معمہ" کو پڑھنے کی کتنی زبردست خواہش موجود ہے اور ہم ان شعرا کے کلام سے کس قدر تسلی وآرام حاصل کرتے ہیں اور بعض دفعہ شاعری جزویست از پیغمبری کہہ اٹھتے ہیں۔ اسکی لس، سوفوکلیس۔ یوری پڈیس سب کے سب پیغامبر معلمِ اخلاق ومفکر تھے اور اپنی قوم کو انھوں نے اپنے پیغامات سے جگا دیا +

زمانۂ حال میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ ڈرامہ کس قدر فلسفیانہ بنتے جا رہے ہیں۔ ڈرامہ نویس حیات کے عمیق مسائل سے الجھ کر انھیں سلجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اِبسن اس نئے ڈرامہ کا منبع ہے جہاں بجائے شاعر وصناع کے مفکر ومعلم کام کرتا ہے، اِبسن قدامت کے اذکار رفتہ ومضر روایات سے نجات پانا چاہتا ہے اور اس کے ڈرامہ کے پڑھنے والوں یا دیکھنے والوں میں جو احساسات پیدا ہوتے ہیں وہ اس قدر جمالیاتی نہیں ہوتے جس قدر کہ تفکری۔ برنارڈ شا کے ڈراموں میں جمالیاتی عنصر صرف نام ہی کو رہ گیا ہے اور سوائے وعظ وتفلسف کے اب کچھ نہیں۔ اِبسن وشا، گالسورتی اور روسی اسکول کے مصنفین کی تصانیف میں جو حیرتناک دلچسپی لی جا رہی ہے اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ہم اپنے شکوک کو رفع کرنے، زندگی کے اسرار کو پانے کے کس قدر خواہاں ہوتے ہیں۔ بقول ایک فلسفی کے ہم مابعد الطبیعاتی حیوان ہیں۔ ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کشمکشِ حیات کے باطنی اصول کیا ہیں یہ تنازع ہمیں کس جانب لے جا رہا ہے، کیا انتخابِ فطرت کو رانہ ہے یا کوئی" رحمتِ غیب" اس کے تحت رہنمائی کر رہا ہے۔ بہرحال شاعری کا یہ فلسفیانہ

بجائے اس امر کا بین ثبوت ہے کہ فلسفے اور اس کے مسایل میں، جو زندگی کے مسایل ہیں، ہمیں اب گہری دلچسپی ہے اور روز بروز افزوں ہوتی جارہی ہے۔

"نگار"

وادئ گنگا میں ایک چاندنی رات

کرتے ہیں مسافر کو محبت سے اشارے
اے وادئ گنگا تیرے مستانہ نظارے

یہ چاندنی رات اور یہ پُرخواب فضائیں
اک موجِ طرب کی طرح بے تاب فضائیں
سبزے کا ہجوم اور یہ شاداب فضائیں

جھکے ہوئے نظارے ہیں، بہکے ہوئے تارے

یہ تارے ہیں یا نور کے میخانے ہیں آباد
معصوم فرشتوں کے سو کاشانے ہیں آباد
مخمور ہواؤں پہ پری خانے ہیں آباد

یا دامنِ افلاک میں رقصاں ہیں شرارے

مہتاب ہے یا نور کی خوابیدہ پری ہے
اک موتی کی دیوی ہو کہ مندر میں دھری ہے
مرمر کی صراحی ہے کہ سیمیں سے بھری ہے

اور تیرتی ہے نیل کی موجوں کے سہارے

نیندوں میں ہیں کھوئی ہوئی بیدار ہوائیں
تارے ہیں گہرریز، گہر بار ہوائیں
یہ نور میں بھیگی ہوئی سرشار ہوائیں

یا بال فشاں مستی و نکہت کے نظارے

صحرا ہیں کہ خوابیدہ نظاروں کے شبستاں
دامن میں لئے چاند ستاروں کے شبستاں
فردوس کی مدہوش بہاروں کے شبستاں

یا کھوئے ہوئے خواب کی دنیا کے نظارے

کرتے ہیں مسافر سے محبت کے اشارے
اے وادئ گنگا تیرے مستانہ نظارے

"ساقی"

روسی

فطرت

میں نے خواب میں دیکھا کہ میں زمین کی تہ میں بہت نیچے ایک بلند محراب دار چھت والے مندر میں ہوں۔ مندر ایک ایسی زمیں دوز روشنی سے منور تھا جس میں ہمواری اور یکسانی پائی جاتی تھی۔

مندر کے عین بیچ میں ایک شاندار عورت سبز رنگ کی قبا پہنے بیٹھی تھی اس نے اپنا سر اپنے ہاتھوں پر جھکا رکھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہے۔

اسے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ یہ عورت فطرت ہے، اور ایک پُراحترام ہیبت کے احساس نے چشم زدن میں میری روح کے انتہائی گوشوں تک سنسنی کی ایک لہر دوڑادی۔

میں نے اس کے قریب پہنچ کر تعظیم کے طور پر سر کو جھکادیا اور کہا: "اے ہم سب کی ماں! تو کیا سوچ رہی ہے؟ کیا انسان کی آیندہ تقدیر کا مسئلہ تیرے زیرِ غور ہے؟ یا یہ کہ وہ کس طرح انتہائی کمال اور بے پایاں مسرت کو حاصل کرسکتا ہے۔"

اس عورت نے آہستہ سے اپنی سیاہ فتنہ گر آنکھیں میری طرف اُٹھائیں۔ اس کے ہونٹوں کو ایک جنبش ہوئی اور ایک ٹھنکتی ہوئی آواز میرے کانوں میں آئی جیسے لوہے سے لوہا بج رہا ہو۔

"میں یہ سوچ رہی تھی کہ پِسُّو کی ٹانگوں کو اتنی طاقت کیسے بہم پہنچاؤں کہ وہ اپنے دشمنوں سے اور آسانی کے ساتھ بھاگ سکے حملے اور دفاع کا توازن ٹوٹ چکا ہے......... میں اسے پھر بحال کرنا چاہتی ہوں۔

میں نے جھجکتے ہوئے کہا: "یہ تو کیا سوچ رہی ہے؟ کیا ہم انسان، تیرے چاہیتے بچے نہیں ہیں؟"

عورت نے خفیف سی تیوری چڑھا کر کہا "ساری مخلوقات میرے بچے ہیں، میں ان سب کی یکساں نگہداشت کرتی ہوں، اور ان سب کو یکساں تباہ کرتی ہوں"

میں پھر ہچکچاتے ہوئے بولا "لیکن حق..... مقصد..... انصاف........"

وہی آہنی آواز پھر بلند ہوئی "یہ انسانوں کے الفاظ ہیں حق یا ناحق سے مجھے کچھ کام نہیں..... مقصد میرے لئے قانون نہیں بن سکتا— اور انصاف کیا بلا ہے؟ میں نے تجھے زندگی دی ہے، میں اسے لے لوں گی اور دوسروں کو دے دوں گی، خواہ کیڑے ہوں یا آدمی..... مجھے اس کی کچھ پروا نہیں..... اور تم بھلا اتنے میں اپنے آپ کا دھیان کرو، اور مجھے مت ستاؤ!"

میں ترکی بہ ترکی جواب دینا چاہتا تھا..... لیکن زمین میں سے ایک کھوکھلی سی آواز بلند ہوئی اور وہ کانپنے لگی، جس سے میں جاگ اُٹھا۔

چڑیا اور شاہیں

بعض اوقات ایک معمولی سا واقعہ انسان کی ساری کائنات کو بدل کر رکھ دیتا ہے!

میں بڑی سڑک پر چلا جا رہا تھا اور میرے خیالات پر غم و اندوہ نے قبضہ کر رکھا تھا۔

میرے دِل پر اُداسی نے ایک بوجھ سا ڈال رکھا تھا، اور میں سخت آزردہ خاطر ہو رہا تھا - میں نے اپنا سر اُٹھایا..... میرے سامنے سفیدے کے بلند درختوں کی دو قطاروں کے درمیان سڑک ایک تیر کی طرح دُور تک دکھائی دے رہی تھی۔

اور اس کے ایک طرف، سڑک کے ایک طرف، مجھ سے کوئی دس قدم کے فاصلے پر، بہار کی دھوپ کی تیز سنہری روشنی میں، چڑیوں کا ایک پورا گھرانا ایک دوسرے کے پیچھے پھدک رہا تھا، پھدک رہا تھا، خوش خوش، بے خوف ہو کر، خود اعتمادی کے ساتھ!

ان میں سے ایک، خصوصاً نہایت بے باکانہ انداز میں اپنا چھوٹا سا سینہ پھلائے، شوخی سے چہکتی ہوئی، باقی چڑیوں سے الگ ایک طرف چلی گئی - ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کہہ رہی ہے کہ میں کسی سے نہیں ڈرتی! ایک ننھے سے بہادر سپاہی کی طرح!

مگر اُسی وقت اوپر کی فضا کی بلندیوں میں ایک شاہیں چکر لگا رہا تھا، اور شاید اسی ننھے بہادر سپاہی پر جھپٹنے کے لئے تقدیر اسے یہاں لائی تھی۔

میں نے ان دونوں کی طرف دیکھا، ہنسا، اپنے آپ کو میں نے اچھی طرح جھنجوڑا، اور غمگین خیالات چشم زدن میں رخصت ہو گئے زندگی کے لئے میں نے نئے سرے سے اپنے دِل میں ایک بے باکانہ اور دلیرانہ جوش اور ولولہ محسوس کیا۔

مجھ پر بھی اسی طرح میرا شاہیں اُڑا کرے، مجھے اُس کی کچھ پروا نہیں، میں اپنی جدوجہد کو جاری رکھوں گا۔

میرے دل میں کیا خیال ہوگا؟

میرے دِل میں کیا خیال ہو گا، مرتے وقت، اگر میری قوتِ متخیلہ سلب نہ ہو گئی؟

کیا میرے دِل میں یہ خیال ہو گا کہ میں نے اپنی زندگی کو کس طرح بے مصرف کھو دیا، کس طرح میں سوتا رہا، غافل رہا، اور زندگی کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا سلیقہ کس قدر کم میں نے سیکھا؟

"کیا؟ موت آ گئی؟ اتنی جلد؟ ناممکن! کیوں مجھے ابھی تک کام کرنے کا کوئی وقت نہیں ملا..... میں ابھی تک آغاز کرنے کی تیاری میں مصروف رہا"

کیا میں اپنی گزشتہ زندگی کا خیال کروں گا اور مجھے خوشی کے وہ چند لمحات یاد آئیں گے جن کو میں نے اپنے عزیز ترین دوستوں کی معیت میں گزارا؟

کیا میری بیاں میرے سامنے آئیں گی اور اُس وقت ندامت کے دردِ جانسوز سے میری روح کو تڑپا یئں گی جب اسکی تلافی نہ ہو سکے گی؟ کیا مجھے اُس زندگی کا خیال آئے گا جو قبر کی منزل سے آگے میرا انتظار کر رہی ہے ...... اور کیا سچ مچ اس منزل سے پرے کوئی چیز ہمارا انتظار کرتی ہے؟

نہیں..... میرا خیال ہے کہ میں اُس وقت کچھ بھی سوچنے کی کوشش نہ کروں گا، اور اپنے آپ کو کسی معمولی سے واقعے کے ساتھ دلچسپی لینے پر مجبور کر دوں گا، محض اس لئے کہ اپنی توجہ کو اُس بھیانک اندھیرے سے دُور رکھ سکوں جس کی سیاہی مجھے نظر آ رہی ہے +

ایک دفعہ میں نے ایک شخص کو مرتے وقت دیکھا تھا۔ وہ مسلسل شکایت کر رہا تھا کہ لوگ اس کو بادام نہیں کھانے دیتے!......

اور صرف اس کی آنکھوں کی گہرائی میں جو لمحہ بہ لمحہ دھندلی ہوتی جا رہی تھیں ایک زخمی پرندے کے ٹوٹے ہوئے پر کی طرح کوئی چیز لرز رہی تھی، کشمکش میں مبتلا تھی +

منصور احمد

برف کا گالا

کس قدر شفاف، کس قدر حسین ہو تم
برف کے ننھے اولے!
اگر تمہیں غور سے دیکھا جائے
تو برف کی آخری دھاریاں پگھلتی دکھائی دیتی ہیں

اِسی طرح ہمارے آخری آنسو
کسی گزرے ہوئے غم کے لئے بہتے ہیں
جبکہ آنے والی خوشی کا پہلا خواب طلوع ہوتا ہے +

سعادت

انگریزی

تسلیم و رضا

مجھے زندگی کا حکم دو تو دل و جان سے تمہارا بن کر جیوں گا۔
محبت کا حکم دو تو ایک محبت بھرا دل تمہارے سامنے رکھ دوں گا
ایسا نازک اور محبت بھرا دل،
ایسا مضبوط اور آزاد دل،
کہ پہنائے عالم میں کہیں نہ مل سکے۔
اور اس دل کو اپنے پاس رہنے کا حکم دو گی، تو تمہارے فرمان کے احترام کی خاطر وہ تمہارے پاس رہے گا؛
اور میں اپنی بے دلی میں بھی اتنا دل رکھوں گا کہ تمہارے لئے آنسو بہا سکوں +

مجھے مایوس ہو جانے کا حکم دو تو میں امید سے ہاتھ دھو کر سامنے بیدِ مجنوں کے درخت کے نیچے جا لیٹوں گا
اور مر جانے کا حکم دو تو تمہاری خاطر
مر جانے کی جرأت بھی کر بیٹھوں گا۔
میری زندگی، میری محبت، میرا دل،
سب تمہاری ذات کے ساتھ وابستہ ہیں
تمہیں میری آنکھوں کا نور ہو۔
جتنی صلاحیتیں قدرت نے مجھے بخشی ہیں
وہ تمہارے ہی لئے زندہ رہنے اور تمہاری ہی خاطر مرنے کے لئے ہیں

بنامِ دوشیزگان

مردوں کی کمزوریوں کو نظرانداز نہ کر سکو تو محبت کی راہ میں کبھی
گامزن نہ ہو +
بسا اوقات وہ رقابت اور حسد کی آگ سے بھڑک بھی اٹھتے ہیں،
گو وجہ کم ہوتی ہے۔
اور رنج و اضطراب کی حالت میں وہ سر بزانو بھی ہو جایا کرتے ہیں
اور ایسی باتیں بھی کہہ اٹھتے ہیں کہ خود ہی فوراً پشیمان بھی ہو جائیں،
وہ مرد جو اپنا سرِ سجدہ ایک ہی کے سامنے خم کرتے ہیں
اظہارِ محبت کئی سے کر جاتے ہیں؛

کیونکہ حسن کو نفرت کی نگاہوں سے کب دیکھا جا سکتا ہے
خواہ مقصودِ نظر حسین ایک ہی ہو +
اظہارِ محبت ایک بھیس کے سوا اور ہے کیا؟
اور جہاں دل سچے بھی ہوں آنکھیں دغا کر سکتی ہیں +
اگر ان باتوں، اور ایسی ہی اور باتوں سے نباہ کر سکتی ہو
تو بیاہ ہو بھی، محبت بھی کرو، اور خوف بھی دل میں نہ لاؤ +

ملک محمد اسلم خاں ایم اے (کیمبرج) بیرسٹر ایٹ لا۔ لاہور

منازلِ حیات

جب ہم کمسن تھے تو اپنا پُرمسرت وقت باغ کی کیاریوں
میں کھیل کر صرف کیا کرتے تھے اور خوشبودار پھولوں کے گلدستے
بنایا کرتے تھے +
مجھے ہمیشہ نوشگفتہ پھولوں کی جستجو رہتی تھی اور ان کو تمہارے
حسین پاؤں پر نثار کیے بغیر قرار نہ آتا تھا +
لیکن بچپن کا زمانہ، موسمِ بہار گذر گیا +

پھر ہم نے شباب کی سرزمین میں قدم رکھا۔
شب کی تاریکیوں میں چھپ چھپ کر ہم ملتے
اور اکیلے بیٹھ کر محبت کے گیت گاتے۔
آہ اُس وقت راز کی باتیں جو عموماً تمہارے متعلق ہوا کرتی
تھیں ——— کس قدر دلچسپ ہوا کرتی تھیں۔
آہ ——— اب بھی ——— جب کبھی موسمِ بہار کی تاروں بھری
رات آتی ہی ہے تو آنکھوں سے سیلابِ اشک بہنے لگتا ہے اور دل دھڑکتا ہے +

اب ہم ایک دوسرے کے شریکِ زندگی ہیں۔
لیکن تمہارا سینہ جو کبھی محبت کے ترانوں سے آباد تھا آج
اُس مزار میں خوابیدہ ہے، جس پر پھول کھلتے ہیں اور پرندے آرام
کرتے ہیں +
لیکن میں اب بھی تمہارے مرقد پر بیٹھا رہتا ہوں،
اور اس غم کو عشاق کی ناکام محبت کے گیت گا گا کر مٹانے کی
کوشش کرتا ہوں۔
اور رنج و غم پر فتح پانا چاہتا ہوں۔
اگرچہ حسرت و یاس سے کنارہ کشی ناممکن ہے لیکن میں
اب بھی لڑکپن، جوانی اور ازدواجی زندگی سے اپنے آپ لطف اندوز
ہوتا محسوس کرتا ہوں +

تابش صدیقی

چینی

دریا کا ایک منظر

(چینی شاعر ینگ ٹی (سوئی خاندان کا بادشاہ ۶۱۷ء) کی ایک نظم)

شام کے وقت دریا ساکن اور خاموش ہوتا ہے،
بہار کی رنگینیاں عروج پر ہوتی ہیں،

دفعتاً دریا میں تموج پیدا ہوتا ہے اور چاند کو بہا لے جاتا ہے، اور اس کے بعد ہی ستاروں کا ایک قافلہ بہتا ہوا آتا ہے،

لڑکے کیلئے دُعا

(سُو ٹنگ پُو (۱۰۳۶ء ــ ۱۱۰۱ء) کی ایک نظم)

جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے،
لوگ اس کے ذہن کی ترقی کے لئے دُعا کرتے ہیں،
چونکہ میری ذہانت،
میری زندگی کی بربادی کا باعث ہوئی
بس یہ دعا کرتا ہوں
کہ میرا لڑکا جاہل اور بے وقوف ہو،
تاکہ وہ وزیرِ اعظم بن کر
امن و امان کی زندگی بسر کر سکے"

آرزو جلیلی

جاپانی

لطائف الادب

کیا ہے؟

دنیا ـــ ایک قطرۂ شبنم ہے،
قطرۂ شبنم بیشک اس کے سوا اور کچھ نہیں، بس بحرِ بے پایاں کا ایک قطرہ،
نہیں ساری دُنیا ایک لمحۂ زندگی ہے،
اور ساری زندگی ایک بحرِ عشق کی موجِ بیکراں +

شاخِ الفت

ننھی تیتری ـــ! خوشنما اور تھرتھرانے والی تیتری!
ننھی سی جان، گلاب کے پھول پر بیٹھ جائے تب بھی اسکی بے چینی نہیں جاتی ـ ہر وقت
پھڑپھڑاتی اور تڑپتی رہتی ہے۔
ہم بھی محبت کی شاخ پر یونہیں مضطرب و دلفگار رہتے ہیں +

طوالتِ جدائی

تاڑ کے اونچے درختو!
کیا تمہیں یاد ہے کہ کبھی ہم تمہارے سائے میں کھیلا کرتے تھے؟
وہ پُر مسرت زمانہ عرصہ ہوا ختم ہو گیا، کیا اب آیندہ یہ جدائی باقی نہ رہے گی۔
وہ پُر مسرت عہد کب آئے گا جو تمہارے سرو سہی جیسے قد سے بھی زیادہ طویل ہو گیا ہے،

بے موسم کی بہار

وہ پھول جو بے موسم کھلیں
کیسے عجیب اور دلفریب ہوتے ہیں!

دِل کا جہاز

کسی ملک کے ایک ساحل سے دو جہاز ایک ہی سمت کو روانہ ہوتے ہیں
مگر ان کی منزلِ مقصود معلوم ہوتی ہے،
لیکن ساحلِ دل سے دو جہاز عشق اور حسن روانہ ہوتے ہیں،
ان کی منزل نامعلوم ہوتی ہے،
دِل کے جہاز سب طوفان میں سے گزر جاتے ہیں اور دیگر جہاز غرق ہو جاتے ہیں +

اَبدی محبت

دو چیزیں ہمیشہ سے جاری ہیں اور کبھی نہ رکینگی،
یہ خدا کی خدائی میں پہلے بھی تھیں اور اب بھی ہیں، اور ہمیشہ رہیں گی۔
ـــــ پانی کی روانی ـــــ اور
محبت کی حکومت۔

ظفر قریشی دہلوی — "زمانہ"

نقد و نظر

مندرجۂ ذیل کتب میں سے پہلی نو کتابیں مکتبۂ جامعہ اسلامیہ، قرول باغ، دہلی کی مطبوعات ہیں اور لاہور میں قومی کتب خانہ ریلوے روڈ، سے مل سکتی ہیں یہ سب $\frac{20 \times 30}{16}$ کی تقطیع پر چھپی ہیں اور کتابت، طباعت اور کاغذ کے لحاظ سے نہایت دیدہ زیب ہیں:—

۱- رباعیاتِ اخگر - منشی امداد حسین صاحب اخگر مرادآبادی کی رباعیات کا مجموعہ ہے جسے سید محمد احمد صاحب ندوی نے مرتب کیا ہے - ابتدا میں مصنف کی تصویر، ان کے حالات اور ان کے کلام پر تبصرہ ہے اس کے بعد رباعیات پانچ عنوانات، معرفت، مذہب، اخلاق، مناظر اور جذبات پر مشتمل ہیں - اخگر عہدِ حاضر کے اُن چند اہلِ زبان شعرا میں سے ہیں جنہوں نے زبان سے زیادہ معانی کی طرف توجہ کی ہے، اور اسے ذریعۂ تفریح نہیں بنایا بلکہ ایک بلند مقام پر پہنچا دیا ہے ہم ان کے پانچوں ابواب میں سے ایک ایک رباعی نقل کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو ان کی شاعری کے متعلق کچھ اندازہ ہو سکے:

دنیا نے مجھے چھوڑ دیا خوب کیا — رخ اُن کی طرف موڑ دیا خوب کیا
میں دوڑا تھا سائے کو پکڑنے کیلئے — پاؤں کو مرے توڑ دیا خوب کیا

ثروت مری تو ہے میری حشمت تو ہے — تو شان ہے میری، میری شوکت تو ہے
میں مانگتا پھرتا ہوں تجھے غیروں سے — کھوئی ہوئی مجھ میں میری دولت تو ہے

ہے نفس نہایت ہی شرر انساں کا — بدیوں سے مرکب ہے خمیر انسان کا
اس شب کو بناتا ہے جو روزِ روشن — اخگر اسے کہتے ہیں ضمیر انسان کا

بد کو نہیں دنیا سے بدی کو میٹو — اندھوں کو نہیں بے بصری کو میٹو
باعث کو خرابی کے مٹا دو اخگر — [illegible] نہیں ہاں دردِ سری کو میٹو

اچھا تو ہے غفلت کا ہی پردہ دل پر — دھوکوں کا حواسوں کے ہی پہرہ دل پر
تاروں کے بھرو کے سے نہ جھانکو مجھ کو — رہنے دو کوئی دن مرا قبضہ دل پر

حجم ۱۰۰ صفحات - قیمت آٹھ آنے ۸ر

۲- جمال الدین افغانی:- یہ وہ خطبہ ہے جو ملک کے مشہور ادیب قاضی عبدالغفار صاحب نے ۲۱ر فروری ۱۹۳۲ء کو اُردو اکادمی کے دوسرے جلسے میں پڑھا تھا - قاضی صاحب سید جمال الدین مرحوم کی سیرت کے متعلق تحقیق میں مصروف ہیں اور وہ آپ کی ایک ایسی مبسوط سوانح عمری لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں جو بالفاظِ دیگر اسلامی ممالک کی تحریکِ آزادی کی تاریخ ہو گی - اپنے سفر یورپ کے دوران میں وہ اس کے لئے بہت سا ایسا مسالہ جمع کر چکے ہیں جو ابھی تک کسی کے ہاتھ نہیں لگا - سید جمال الدین افغانی گزشتہ صدی میں ملتِ اسلامیہ کی بیداری کے سب سے بڑے علمبردار تھے - وہ ایک ایسے عالم تھے جو مذہب اور سیاست دونوں کو سمجھتے تھے اور ان کی تحریر و تقریر میں ایسا سحر تھا جو مایوس اور مردہ دلوں میں امید اور زندگی پیدا کر دیتا تھا ان کی ساری زندگی جد و جہد اور عزم و استقلال کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے مسلمانوں کے لئے یہ پیغامِ حیات ہے، اور نوجوانوں کو خصوصاً ان کے حالات پیش نظر رکھنے چاہئیں کہ قوم کی فلاح و بہبود کا انحصار انہیں پر ہے - حجم ۰ صفحات - قیمت آٹھ آنے ۸ر

۳- سمندر کا عجائب خانہ، مؤلفہ جناب سید محمد عسکری جعفری

اس کتاب میں نہایت سلیس، آسان اور دلکش زبان میں بچوں کیلئے سمندر کے عجائبات کا ذکر کیا گیا ہے - اس میں سمندر کی وسعت، اس کی گہرائی، اس کی نباتات، اس کے حیوانات، اس کے سیپ اور موتی، سمندر کے جانوروں کی زندگی اور عادات اور سمندر کی گہرائیوں کے دلچسپ اسرار بیان کئے گئے ہیں - بچوں کے علاوہ بڑوں کیلئے بھی یہ کتاب معلومات کا ایک ذخیرہ اپنے اندر رکھتی ہے - کیونکہ ہم میں سے بہت کم یہ جانتے ہیں کہ سمندر کی تہ میں بھی فطرت نے زر و جواہر کے محل بنائے ہیں اور وہاں ایسے ایسے جانور رہتے ہیں جن پر نباتات کا دھوکا ہوتا ہے اور ایسے ایسے درخت اُگے ہیں جو بادی النظر میں جانور معلوم ہوتے ہیں - جہاں اس میں ہیبتناک اور خونخوار جانور ہیں اور وہیں بھولے بھالے بے ضرر جانور بھی ہیں اور ایسے جانور بھی جو اپنے اجسام میں سے روشنی پیدا کر کے سمندر کی پُراسرار تاریکی میں چراغاں کرتے ہیں - حجم ۱۴۸ صفحات قیمت بارہ آنے ۱۲ر

۴- سو شعروں کا سلسلہ - مکتبۂ جامعہ نے ہندوستان کے چار مشہور شعرا جگر، فانی، اصغر اور حسرت کے ایک ایک سو بہترین اشعار کا انتخاب شائع کیا ہے - یہ سلسلہ جیبی تقطیع پر نہایت دلکش انداز میں چھپا ہے، اور ایک ایسی مستحسن جدت ہے کہ اس سے شعرا کے کلام کی خصوصیات کا اندازہ بغیر کسی

محنت اور کاوش کے ہو سکتا ہے۔ ابتدا میں مختصر حالات اور شاعری پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ ہمارے پاس صرف اصغر اور جگر کے مجموعے پہنچے ہیں۔ اصغر کے انتخاب کلام میں بہت سے ایسے شعر رہ گئے ہیں جو منتخبہ اشعار سے بہتر تھے۔ جگر کے اشعار کا انتخاب بہت اچھا ہے۔ قیمت ۴ر فی مجموعہ

۵۔ شعرستان ۔ یہ سید محمود اعظم صاحب فہمی ترمذی کی ادبی اخلاقی اور قومی نظموں کا مجموعہ ہے۔ حضرتِ فہمی کا تعارف ملک سے ان کی دلچسپ اور ضخیم کتاب "تاریخِ ملل قدیمہ" کے ذریعے سے ہوا تھا، اور اسی سے ان کی پختگیٔ ذوق اور جوشِ عمل کا ثبوت ہمیں ملا تھا۔ اب انہوں نے اپنی نظموں کے دو مجموعے شائع کرکے یہ ثابت کردیا ہے کہ وہ ایک کامیاب نثار ہی نہیں بلکہ شاعر بھی ہیں۔ "شعرستان" کے آغاز میں حضرتِ جگر مرادآبادی کے "اشارات" اور سید ناصر علی صاحب ناصر آبادی کا مقدمہ شامل ہیں۔ ذوقِ عمل جوش اور پاکیزگی ان کے کلام کی خصوصیات ہیں، لیکن چونکہ انہوں نے موضوع ایسے انتخاب کئے ہیں جن میں لطافت پیدا کرنا قریب قریب محال ہے اس لئے ان کے بعض اشعار میں نثریت پیدا ہوگئی ہے۔ حجم ۱۲۰ صفحات قیمت ایک روپیہ (عہ ر)

۶۔ گلبانگ ۔ اس مجموعے میں فہمی صاحب کی تیرہ قومی اور وطنی نظمیں درج کی گئی ہیں۔ یہ حصۂ کلام قوم اور وطن کی محبت اور درد سے لبریز ہے۔ حجم ۴۰ صفحات۔ قیمت چھ آنے (۶ر)

۷۔ بچوں کی کتاب ۔ مصنفہ حامد علی صاحب بی اے ایل ٹی۔ اس کتاب میں بچوں کے لئے مضامین اور نظمیں لکھی ہیں۔ مضمون جہاں پُر از معلومات ہیں وہاں ان سب میں ایک نیک اور شریف بچے اسد کے کردار کو داخل کرکے کتاب کو زیادہ دلچسپ اور زیادہ مفید بنا دیا ہے کتاب میں تصویروں کے خاکے بھی دیئے ہیں جن کا بچے عکس اتار سکتے ہیں، اور ان میں رنگ بھر سکتے ہیں۔ حجم ۴۲ صفحے۔ قیمت ۴ر

۸۔ بچوں کی نظمیں ۔ مرتبہ جناب سعید نعمانی صاحب بی اے (جامعہ) اس مجموعے میں اقبال، حفیظ جالندھری، حامد اللہ افسر میرٹھی، وقار انبالوی اور ساغر نظامی وغیرہ حضرات کی وہ اخلاقی اور ادبی نظمیں جمع کی گئی ہیں جو انہوں نے آسان زبان میں بچوں کے لئے لکھیں۔ بہت دلکش مجموعہ ہے حجم ۴۲ صفحات قیمت

۹۔ تعلیمی کھیل ۔ از محمد عبد الغفار صاحب دہلوی۔ اس میں لکھنے پڑھنے اور حساب سے بچوں کو آشنا کرانے کے لئے تعلیمی کھیل وضع کئے گئے ہیں۔ کھیل بہت دلچسپ ہیں اور ہمارے خیال میں ان سے بچوں کی ابتدائی تعلیم میں خوب مدد مل سکتی ہے۔ حجم ۴۴ صفحات۔ قیمت ۶ر

نقد الادب ۔ پروفیسر حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی کی ایک اہم تصنیف ہے جس میں فنِ تنقید کی غرض و غایت پر بحث کی گئی ہے اور فنِ تنقید اور تاریخِ ارتقائے تنقید کے متعلق معلومات بہم پہنچائے ہیں۔ افلاطون کے زمانے سے لیکر اس وقت تک اس فن نے جتنی منزلیں طے کیں اور تنقید کے متعلق جتنے نظریے قائم ہوئے ان سب کا اس میں ذکر ہے۔ کتاب مندرجہ ذیل ابواب پر مشتمل ہے: تمہید، ادب اور فنونِ لطیفہ، تنقید یونانِ قدیم میں، تنقید ہندِ قدیم میں، تنقید زمانۂ مابعد میں، شاعری، بت تراشی اور مصوری؛ جمالیاتِ فنونِ لطیفہ، اصولِ تنقید کی تشکیل؛ تنقید کا مقصد اور عمل؛ ادب کا مطالعہ؛ اردو کے چند اصنافِ سخن۔ زبان و ادب کی ترقی اور نشو و نما کا انحصار فنِ تنقید پر ہے اور "نقد الادب" جیسی بلند پایہ کتابیں یقیناً ہمارے ادب کے لئے مفید ثابت ہوں گی اور فنِ تنقید کے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں ان کی اصلاح کریں گی۔ کتابت، طباعت اور کاغذ عمدہ۔ حجم ۲۲۵ صفحات قیمت مجلد دو روپے۔ ملنے کا پتہ: منشی نولکشور پریس، لکھنؤ +

زیب النسا ۔ اس نام کا ایک زنانہ ماہوار رسالہ لاہور سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ محترمہ صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ حیا اور محترمہ رشیدہ عصمت صاحبہ اس کی ایڈیٹر اور جائنٹ ایڈیٹر ہیں اور محترمہ بیگم شاہنواز صاحبہ اس کی سرپرستی فرما رہی ہیں۔ اس کا پہلا نمبر ہمارے سامنے ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ رسالے کے مہتمم نے اس کے لئے مشہور ادبا اور قابل خواتین کے مضامین مہیا کئے ہیں۔ تین تصویریں بھی رسالہ میں شامل ہیں۔ حجم ۴۶ صفحات۔ سالانہ چندہ تین روپے (صہ ر) فی پرچہ پانچ آنے (۵ر) پتہ:- دفتر رسالہ زیب النساء۔ کنہ گراں سٹریٹ۔ لاہور +

آستانہ ۔ یہ رسالہ جناب آخر چغتائی کے زیرِ اہتمام نکلا ہے اب تک اس کے دو نمبر ہماری نظر سے گذر چکے ہیں۔ مضامین کے انتخاب اور ترتیب میں ذوقِ سلیم سے کام لیا گیا ہے۔ اگرچہ لکھائی، چھپائی، اور کاغذ بہت اچھا نہیں تاہم رسالے کی یہ خصوصیت قابلِ ذکر ہے کہ اس کا سالانہ چندہ ایک روپیہ اور ایک پرچے کی قیمت دو آنے ہے، جو اس کی تصاویر اور حجم کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں +

پتہ:- دفتر رسالہ "آستانہ" بیرون موری دروازہ۔ لاہور +

—— منصور احمد

فہرستِ مضامینِ "ادبی دُنیا"

جلد ۱۰ بابت ماہِ اگست ۱۹۳۴ء نمبر ۵

تصویر۔ دانتے کا خواب

سالانہ چندہ چار روپے سات آنے محصول اور وی پی نو آنے کل پانچ روپے۔ ممالکِ غیر سے دس شلنگ

بزمِ ادب

طبعزاد افسانے کے لئے دس روپے ماہوار انعام

افسانے اور ترجمے

یہ ترجمے کا دور ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ دور ختم ہونے والا ہے اور تغیر کا عمل جاری ہو گیا ہے سب کے دل میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ تراجم کو چھوڑ کر توجہ تصانیف کی طرف مبذول کی جائے۔ ہندوستان ایک تہی مایہ ملک ہے جو فی الحال ترقی کے کسی جادے پر گامزن ہونے کی طاقت نہیں رکھتا۔ کلیتہً طبعزاد چیزیں تو انہیں سرزمینوں میں پیدا ہو سکتی ہیں جو نئی نئی تحریکات، ایجادات اور فلسفوں کا مرکز ہیں، اس لئے معلوم نہیں ابھی کب تک ہمیں یورپ کے علم و حکمت کی خوشہ چینی کرنی پڑتی ہے لیکن افسانہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے جسے بحیثیتِ فن اب ہم ان لوگوں سے کسی حد تک سیکھ چکے ہیں۔ افسانہ ہمارے جذبات اور ہماری زندگی کی تصویر ہوتا ہے۔ گزشتہ بیس سال کے عرصے میں ہماری معاشرت میں جو تبدیلیاں ہوئیں اور اب ہو رہی ہیں وہ اس قدر اہم ہیں کہ اگر ہمارے دلوں میں انہیں سپردِ قلم کرنے کی امنگ پیدا ہو تو کوئی تعجب نہیں۔

ہم اہلِ قلم سے طبعزاد افسانے لکھنے کی تحریک کرنے کا خیال کر ہی رہے تھے کہ سید وقار عظیم صاحب کا مضمون "افسانوں کے ترجمے" آ گیا۔ اس میں جہاں انھوں نے ترجمے کے فوائد کا ذکر کیا ہے وہاں اس کے نقصانات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ان نقصانوں کی تلافی بھی مشکل ہے جو ہمیں اٹھانے پڑے۔ ان کے ذکر میں کچھ دلفریبی نہیں لیکن اس کا احساس ضروری ہے کہ سب سے پہلی چیز جو ان ترجموں نے ہم سے چھین لی ہماری جدت ہے۔ ہمارے اچھے سے اچھے افسانہ نگار ترجمہ کرتے کرتے اس کے اس قدر عادی ہو گئے کہ اپنی سوچنے کی طاقت کھو بیٹھے سوچنے بیٹھے تو صرف وارینٹ کی تخیلوں نے دماغ میں چکر لگانے شروع کر دیے۔ قلم لے کر بیٹھے تو اُن کی فضا میں پلے ہوئے تشبیہ و استعارے سامنے آئے لکھنا شروع کیا تو اُن کے جملوں کی ترکیبوں نے لفظی شکلیں اختیار کر لیں۔ اب اس مرض کا علاج؟ ۔۔۔ کچھ نہیں ۔۔۔ نتیجہ؟ ۔۔۔ اپنی تخئیل مُردہ، اپنے رنگین تشبیہ اور استعارے تاریکی کے پردے میں، اپنی حسین اور دلکش ترکیبیں غائب۔ ہمارے رنگ ماند اُن کے رنگ شوخ۔ جامِ مشرق میں بادۂ مغرب گلشنِ ہند میں نخلِ فرنگ۔ انصاف کیجئے کہ اس میں وہ فطری دلکشی کہاں۔"

چند لفظوں میں یہی باتیں ہیں جن کے لئے طبعزاد لکھنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ اور بڑی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ہم اپنے ادب کو اپنی تہذیب اپنے تمدن، اپنی معاشرت اور اپنے جذبات کی تصویروں سے سجانا سیکھیں۔ "ادبی دنیا" اس تحریک کو تقویت دینے کے لئے ایک چھوٹا سا قدم اٹھا رہا ہے۔ آئندہ سے ہر ماہ ہمیں جو افسانے موصول ہوں گے ان میں سے بہترین طبعزاد افسانے کے لئے ہم نے مستقل طور پر دس روپے کا انعام مقرر کر دیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اہلِ قلم حضرات اس تحریک کا پُرجوش خیر مقدم کریں گے۔

ترجمے

آج کل ترجمے دو قسم کے ہو رہے ہیں۔ ایک کا نام تو ترجمہ کرنے والوں نے "آزاد ترجمہ" رکھ لیا ہے دوسرے کا نام ہم اپنی طرف سے "پابند ترجمہ" تجویز کر دیتے ہیں۔ آزاد ترجمہ کیا ہے؟ جو کلمات سمجھ میں آ جائیں اُن کا مفہوم بزعمِ خود لکھ دیا جائے اور جو سمجھ میں نہ آئیں انہیں بالکل چھوڑ دیا جائے۔ زبان پر قدرت نہ ہونے کے باعث اور الفاظ کا ذخیرہ کم ہونے کی

وجہ سے غیر زبان کی تراکیب اور الفاظ کے جو معنی تجویز کئے جاسکیں کر دیئے جائیں۔ ایسے ترجمے عموماً مبتدی کرتے ہیں۔ اور انہیں غالباً یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس سے مصنف کا مقصد خبط ہو کر رہ جاتا ہے۔ غالباً مشہور مختصر افسانہ نگار او ہنری کہتا ہے کہ تم میرے افسانے میں سے ایک لفظ نکال دو یا ایک لفظ بڑھا دو، میں ثابت کر دوں گا کہ تم نے میرے افسانے کا مفہوم بدل دیا ہے۔ اس بیچارے کو کیا خبر کہ ہندوستان میں ایسے ایسے فنّان بیٹھے ہیں جو اس کے افسانوں میں سے اگر نوے فی صدی الفاظ نکال دیں اور نوے فی صدی داخل بھی کر دیں تب بھی اس کے افسانے کا مفہوم نہیں بدلتا اور وہ اردو رسائل میں اُسی کے نام سے منسوب ہو کر چھپتے ہیں اب رہا "پابند ترجمہ"، پابند ترجمہ وہی ہے جو ہم تم اور میر کرتے ہیں۔ سو اس کے ذکر کی کچھ زیادہ ضرورت نہیں۔

سالنامہ

"ادبی دنیا" کا سالنامہ اس مرتبہ ہم بڑی تقطیع کے دو ڈھائی سو صفحات پر شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ پرچہ ہر لحاظ سے ایسا شاندار ہو گا کہ ۱۹۳۴ء کی کوئی ادبی تصنیف اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ ظاہر ہے کہ ایک اتنی ضخیم کتاب کی تیاری کے لئے بڑی محنت اور بڑا اہتمام درکار ہو گا۔ اس وقت تک تقریباً ایک سو صفحات کے مضامین جمع ہو چکے ہیں جن حضرات نے ابھی تک اپنے مضامین ارسال نہیں فرمائے ان کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ ایک ماہ تک اپنے بہترین مضامین اس پرچے کے لئے مرحمت فرما دیں۔ اس پرچے کے لئے اہلِ قلم کی تجاویز کو بھی شکریے کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔ اگر بعض معاونین اپنے ذخیرۂ تصاویر میں سے کچھ نایاب تصاویر سالنامے میں اشاعت کے لئے عنایت فرمائیں تو وہ تصاویر عکس لینے کے بعد نہایت احتیاط کے ساتھ ان کو واپس کر دی جائیں گی۔

حضرتِ جوش ملیح آبادی

جوش "ادبی دنیا" کے گزشتہ دور میں اس پرچے سے کچھ ناراض ہو گئے تھے لیکن ہماری ذات کی نسبت عابد کا یہ قول سچ نکلا کہ ہم ان سب ادبا کو اپنی بزم میں جمع کرنے میں کامیاب ہیں جو عموماً دوسری جگہ یکجا نہیں ہوتے۔ ہماری خوش قسمت اور ہمارے مخدوم و محترم حضرت آزاد انصاری کے کہنے پر جوش پھر "ادبی دنیا" میں رونق افروز ہو گئے ہیں۔ ان کی دو نہایت لطیف نظمیں ہمیں موصول ہوئی ہیں جو آیندہ پرچوں میں شائع ہوں گی۔

دانتے کا خواب

یہ برطانی مصور روزیٹی کی تصویر ہے۔ برطانیہ کے تمام مصوروں میں سے روزیٹی خصوصاً ایک ایسا شخص ہے جس کی تصویروں کو سمجھنے سے پہلے خود اس کو بحیثیتِ انسان سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے والدین اٹلی سے یہاں آ کر پناہ گزین ہوئے تھے۔ اس کا باپ ایک عالم تھا جسے اٹلی کے عظیم الشان شاعر دانتے کے کلام سے بڑی عقیدت تھی۔ اسی عقیدت کی وجہ سے اس نے اپنے بیٹے کا نام بھی دانتے رکھا۔ دانتے جبرئیل روزیٹی ۱۲ مئی ۱۸۲۸ء کو شارلٹ سٹریٹ، پورٹ لینڈ پیلس میں پیدا ہوا۔ جوانی کا ابتدائی زمانہ اس نے ایک ایسے گھر میں گزارا جہاں نہ صرف دانتے کا تذکرہ رہتا تھا بلکہ جہاں اس کا کلام نہایت اچھی طرح سمجھا بھی جاتا تھا۔ روزیٹی کو اس کے تمام اشعار زبانی یاد تھے۔ اور اس کی نظموں کا نشہ اس پہ تمام عمر رہا۔

۱۸۵۰ء میں ایک نوجوان مصور والٹر ڈیورل کو ایک حسین لڑکی ملی جو ایک درزی کی دکان پر کام کیا کرتی تھی۔ اس نے اسے اپنی تصویروں کے لئے انتخاب کیا اور روزیٹی سے اس کا تعارف کرایا۔ اسی وقت سے اس کا جنون انگیز چہرہ روزیٹی کی ہر تصویر میں رونما ہونے لگا۔ اور ۱۸۶۰ء میں اس نے اس لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔ وہ اثرات جو "دانتے کا خواب" کی تخلیق کے محرک ہوئے اب ہمارے سامنے ہیں۔ یہ تصویر ۱۸۷۱ء میں یعنی مصور کی محبوب بیوی کی موت کے نو سال بعد مکمل ہوئی۔ روزیٹی نے خود اس تصویر کی تشریح کی ہے۔ وہ لکھتا ہے "یہ ایک ایوانِ خواب کا منظر ہے، جہاں لالے کے پھول بکھرے ہوئے ہیں۔ یہاں بیٹرس دانتے کی محبوبہ ایک پلنگ پر اس طرح پڑی ہے جیسے ابھی مر کر گری ہے۔ محبت کے دیوتا نے اپنے تیر کا رخ خواب دیکھنے والے کی طرف کر رکھا ہے۔ اس تیر کے ساتھ ہی اس نے سیب کی ٹہنی بھی پکڑ رکھی ہے جس کے ساتھ کچھ کلیاں بھی لگی ہیں جب دیوتا بیٹرس کے قریب پہنچتا ہے تو ایک لمحے کے لئے جھک جاتا ہے اور اس کے لبوں کو وہ بوسہ دیتا ہے جو اسے اپنے عاشق کی طرف سے کبھی نہیں ملا۔ دو سبز پوش عورتیں بہار کے پھولوں سے بھری ہوئی ایک چادر تھامے کھڑی ہیں۔ ایک لمحے کے بعد وہ اسے بیٹرس پر ڈال دیں گی اور اس کے چہرے کو ہمیشہ کے لئے آنکھوں سے اوجھل کر دیں گی۔"

آئینۂ عالم

پیٹرہاف

سطوت از کوہ ستانند و بہ کاہے بخشند
کلہِ جم بہ گدائے سر راہے بخشند

بعض مقامات عجیب طریق پر تاریخی حادثات کا مورد و مرکز بنے رہتے ہیں۔ اُن انسانوں کی طرح جو عظیم الشان شخصیتوں کے مالک ہوتے ہیں یہ مقامات بھی انقلاب، ماحول اور حالات سے بے پروا اپنی زندگی گزار دیتے ہیں۔ پیٹرہاف ایسے ہی مقامات میں سے ایک خوبصورت مقام ہے یہاں روس کا شاہی خاندان اور امراو اعیان سلطنت رہتے تھے۔

یہ باغات جو اعلیٰ درجے کی صنعت کا نمونہ ہیں اور ایک زمانے میں امارت کی نمایش اور شرفاء دربار کے محدود حلقے کی تفریح کے لئے مخصوص تھے اب عوام کے لاکھوں افراد کی سیر گاہ بنے ہوئے ہیں۔

پیٹرہاف جو کسی زمانے میں روس کے بادشاہوں کے لئے مایۂ ناز تھا۔ آج سوویٹ حاکموں کے لئے مایۂ ناز ہے۔ اُس وقت یہ رُوسی شان و شوکت کی نمایش گاہ تھی۔ اب یہاں اشتراکی عدل و مساوات کا مظاہرہ ہوتا ہے اور اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ روسی کس طرح اپنے آثار قدیمہ کی حفاظت کرتے ہیں اور کس طرح انہیں عوام کی سیاسی تعلیم کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

ایک تفریح گاہ ہونے کے علاوہ پیٹرہاف اب انقلاب سے پہلے کی روسی "تاریخ" کا ایک وسیع عجائب خانہ ہے۔ اس کے اہم ترین باغات کی خوب غور و پرداخت کی جاتی ہے انقلاب کے ابتدائی سالوں میں جو فوارے ٹوٹ گئے تھے انہیں دوبارہ بنوا دیا گیا ہے محلات اور جہاں نما نقش و نگار سے دوبارہ آراستہ کئے گئے ہیں۔ اندرونی حصے نہایت اچھی حالت میں ہیں، اور روسی دربار کی صد سالہ زندگی کی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔ یہاں تربیت یافتہ رہبروں کا ایک پورا عملہ متعین ہے جو آنے والوں کو شاہی محلات کی سیر کراتا ہے۔

پیٹر اعظم، پہلا روسی شہنشاہ جس نے دوسو سال ہوئے تن تنہا روس کی کایا پلٹ کر رکھ دی تھی پیٹرہاف کا بانی مبانی ہے۔ اس نے یہ محلات یورپ کو یہ دکھانے کے لئے تعمیر کرائے تھے کہ روس کی وحشت کا زمانہ اب ختم ہو چکا ہے اور وہ اب ممالک غیر کے درباروں کی شوکت کا بخوبی مقابلہ کر سکتا ہے۔

پیٹر کی مسرور اور بے پرواہ بیٹی الزبتھ کے عہدِ حکومت میں پیٹرہاف نے اپنی موجودہ شکل اختیار کی۔ الزبتھ کی فرمایش پر اس کے خاص معمار راسٹرلی نے محل کو دوبارہ تعمیر کیا اور فواروں کی تعداد میں اضافہ کر دیا۔ اس کو پہلی دفعہ فرانسیسی ماہر تعمیرات لابلاں نے تعمیر کیا تھا۔ راسٹرلی نے اس کی فرانسیسی نزاکت کو روسی شوکت و جلال سے بدل دیا۔ انیسویں صدی کے نصف یعنی نکولاس اول کے عہدِ حکومت میں اس کی عظمت انتہا کو پہنچ گئی۔ وہ پیٹرہاف کا بے حد دلدادہ تھا۔ اور اس نے اسے عیش و عشرت کا سرچشمہ بنا دیا تھا۔

اگر آپ پیٹرہاف کو دیکھنا چاہتے ہیں تو شبر کے دن وہاں جائیے۔ یہ دن اس نئی دنیا میں اتوار کا مرادف ہے لیکن ہر چھٹے دن آتا ہے۔ اس دن یہاں لاکھوں آدمی جمع ہوتے ہیں۔

صبح کے وقت ہر طرف خاموشی ہوتی ہے۔ پھر چند آدمی گھاس پر ٹہلتے نظر آتے ہیں۔ کچھ ادھیڑ عمر کی عورتیں بنچوں پر بیٹھی کشیدہ کاری اور گپ بازی میں مصروف ہوتی ہیں۔ کچھ چھوٹے چھوٹے بچے خاموشی کے ساتھ روشوں پر کھیلتے پھرتے ہیں۔ دوپہر کے قریب پارک میں کثرت سے لوگ آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ سیر کرنے والے گروہ در گروہ ریل سے لبسوں سے اور سمندر کی جانب سے کشتیوں سے آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ دو بجے تک باغ میں ایک انبوہِ کثیر جمع ہو جاتا ہے۔

کبھی کبھی گاتے ہوئے لڑکوں کا ایک دستہ پاس سے گزر جاتا ہے۔ ان کی وضع قطع بالکل ایک جیسی ہوتی ہے لیکن عجیب بات ہے کہ یہ یکسانی اُن کے لباس میں نہیں پائی جاتی۔ اب تک سوویٹ حکومت صرف دایہ خانوں کے بچوں کے لئے لباس مہیا کر سکی ہے۔ دوسرے بچوں کو ابھی وہی مختلف الوضع کپڑے پہننے پڑتے ہیں جو بعد مشکل ان کے والدین ان کے لئے مہیا کرتے ہیں۔

مان پلیسر کے چھوٹے سے محل کے ساتھ ایک سایہ دار عمارت میں کھانے پینے کی میزوں کی کئی قطاریں لگی ہیں۔ مرد اور عورتیں جن کے سیفہانہ

لباس ان کے نفیس اور خوبصورت ماحول کا گویا جواب پیش کرتے ہیں۔ بیلدہ بیر پیتے ہیں اور سینڈوچ کھاتے ہیں کسی میز پر کوئی آدمی اپنا سر داغدار میز پوش پر رکھے گہری نیند پڑا سوتا ہے۔ دیکھنے والے کے دل میں سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا یہی وہ جگہ ہے جہاں شاہی دربار کی خواتین زرد جواہر اور گل و سوسن کی نمائش کے جلسے منعقد کیا کرتی تھیں!

"حجرہ"

ایک بڑے میدان میں "حجرے" کے قریب جہاں ایک دفعہ پیٹر نے اپنے خاص مہمانوں کو عیش و نشاط کی دعوت دی تھی اب عمال کی ایک منظم جماعت کی مستقل سیرگاہ بنی ہے۔ یہاں آئیے تو کچھ جوڑے ناچتے نظر آئیں گے، کچھ گھاس پہ بیٹھے دکھائی دیں گے۔

مختلف ٹولیاں رہبروں کے ساتھ نظر آئیں گی، جن میں زیادہ تر عورتیں ہوں گی، سروں پر چھوٹے چھوٹے بال، چھوٹے سائے زیب بدن اور چہرے پر قوت اور عزم راسخ کے آثار۔ وہ اپنے ساتھ والوں پر شاہی عادات و اطوار کے متعلق نفرت کا اظہار کرتی سنی جائیں گی۔ جہاں تک ہو سکے وہ تاریخ کی مارکسی تاویل کرتی ہیں اور اسے عوام کی ان تھک کشمکش کی روداد بتاتی ہیں۔

جب تین بجنے کو ہوتے ہیں اور دو گھنٹے کے لئے فوارے چلنے لگتے ہیں تو باہر ہجوم اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ یکایک درختوں کی جھلملیوں میں سے پانی اچھلتا جھاگ اڑاتا نظر آتا ہے۔ لوگ اٹھ بیٹھتے ہیں بچے شور مچاتے ہوئے دوڑتے ہیں۔ باغ میں زندگی کی روح پھنک جاتی ہے۔

مرکزی مقام پر سے — اس پل پر سے جو سمندر اور محل کی درمیانی نہر کو نصف راستے میں عبور کرتا ہے — سارے کا سارا منظر سحر انگیز طور پر خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ ہر چیز زیادہ روشن نظر آنے لگتی ہے۔ بُت زیادہ سنہری معلوم ہوتے ہیں۔ آبشاروں کی چادروں کی نیلی نیلی مصنوعی لہروں پر ایک اور ہی رنگ چھا جاتا ہے۔ محل نئے رنگ و روغن میں زیادہ صاف شفاف اور نشاط انگیز بن جاتا ہے۔ اور اس کے سامنے پانی بڑی بڑی دھاروں میں اچھلتا ہے، بھاری بھاری چادریں بن کر گرتا ہے۔ ناچتا، پھسلتا، موتی بکھیرتا سارے منظر پر پُرشوکت رنگینیوں کے پردے ڈالتا نظر آتا ہے۔

دائیں بائیں بیسیوں اور فوارے چلتے ہیں آدم اور حوا کے مجسمے پانی کی دھاروں کے درمیان کھڑے ہیں۔ پھولی ہوئی گالوں والے کتنے ہی کیوپڈ پانی کے لوٹے لئے ہوئے موجود ہیں جن میں سے پانی نہایت ہمواری کے ساتھ بہہ رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مان ٹلیسر میں دو سر پھولوں کے درمیان پانی کے بڑے بڑے پھول کھل رہے ہیں اور کانسے کے دیوتا سیال بلور کے ستون پایوں پر کھڑے ہیں۔

ایک پریوں کی سرزمین! انسان کے عشرت مآب تخیل کی شاداب ترین نمائش! دنیا کے دل پر اس کے مالکوں کے ذوق، امارت اور عظمت کا سکہ بٹھانے کے لئے ایک عجیب مقام! جب آپ اس کو دیکھیں گے تو روس کے شاہی دربار کی شوکت کا معراجِ کمال آپ کے تصور کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے گا۔

کیا ہی تقابل ہے! ایک سو تیس سال گزرے جو لوگ یہاں گامزن ہوتے تھے ان کے لباس از سر تا پا سونا اور چاندی ہوتے تھے تاکہ مجسموں کے سونے اور آبشاروں کی چاندی سے ان کا میل ہو جائے۔ اب یہاں آنے والے بالکل بے آب و رنگ کپڑے پہنتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ اُسی شان اور تمکنت سے یہاں چلتے پھرتے ہیں جس شان اور تمکنت سے اس کے قدیم مالک چلتے پھرتے تھے۔ وہ دن گزر گئے جب یہاں کے محافظوں کو ہدایت ہوتی تھی کہ ادنیٰ لباس والے کسی آدمی کو یہاں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ آج سب لوگ ادنیٰ لباس پہنتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اس عظمت و شوکت کے مالک ہیں۔ انسان مستفسرانہ نظروں سے سنہری دیوتاؤں کی طرف دیکھتا ہے۔ کیا انہیں معلوم ہے کہ ان کے ملک میں کیا انقلاب برپا ہوا ہے؟ وہ اب تک مطمئن کھڑے ہیں، اور ماحول کے مناظر سے اتنے ہی بے خبر ہیں جتنے ان کے نئے مالک ہیں۔

کالجوں کے گریجوایٹ اور کاروبار

کالج کے نوجوان گریجوایٹ جب کاروباری دنیا میں داخل ہوتے ہیں تو اپنے آپ کو بہت زیادہ قابل اور بہت زیادہ اہم سمجھتے ہیں، اور اس لئے جس کام کے وہ مستحق ہوتے ہیں اس سے بہتر کام کا مطالبہ کرتے ہیں۔

یہ ہے امریکہ کے کاروباری لوگوں کی ایک جماعت کی رائے جو انہوں نے ایک ایسے جلسے میں ظاہر کی جس میں ملک کے پانچ سو بڑے بڑے ماہرین صنعت و حرفت جمع تھے۔

لیکن ایک دوسرے طبقے کی رائے اس کے برعکس ہے۔ اُن کے نزدیک نوجوان گریجوایٹ زعم باطل اور غرور کے بجائے بہت زیادہ شک

اور خوف کا مالک ہوتا ہے۔ اور اسے اپنے پر اتنا اعتماد نہیں ہوتا کہ جس کام کے وہ قابل ہے اور جسے وہ کرنا چاہتا ہے اس پر بے تکلفی سے ہاتھ ڈال سکے

یہ مسلہ ان مختلف فیہ مسائل میں سے ایک ہے جو نوجوان گریجوایٹوں کے اول اول کوئی شغل اختیار کرنے کے متعلق پانچ سوبیانات سے اخذ کئے گئے۔ ان ایک لاکھ او رچھتیس ہزار نوجوان مردوں اور عورتوں کی فلاح و بہبود کے لئے جنہیں اسی ماہ سندیں حاصل ہونے والی ہیں تنقیدوں اور تجویزوں کا ایک طومار لگ گیا۔ اس کانفرنس کے ڈائرکٹر جارج بجو رنے اس جلسے کی مختصر روئیداد تیار کی ہے۔

ایک لیڈر کا ذل خوش کن بیان تھا کہ صنعت اور کاروبار کے امید واروں کا گرمجوشی سے استقبال کیا جائے گا۔ ایک اور شخص نے پُرامید لہجے میں کہا کہ ۱۹۳۴ء کے گریجوایٹ نوجوانوں کو کاروباری مشکلات پر غلبہ حاصل نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ایک نے کالج کے گریجوایٹوں کو ترجیح دی اور دوسرے نے باہر کے آدمیوں کو کاروبار کے لئے زیادہ مفید ثابت کیا۔ ایک شخص نے رائے دی کہ نوجوان کے لئے تحصیل علم کے بعد کوئی کام شروع کرنے سے پہلے ایک سال کے واسطے ہل چلانا لازمی قرار دینا چاہیے۔

بعض بڑے بڑے کاروباری لوگوں کی رائیں کہ ہندیوں کو کیا کرنا چاہیئے حسب ذیل ہیں:۔

ولیم بی گرین۔ صدر امریکن بریک شُو اینڈ فونڈری کمپنی ــــ اکثر گریجوایٹ یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ کون سا کام ان کے لئے موزوں ثابت ہوگا چونکہ میں ہوں انہیں استادوں اور دوستوں سے مدد حاصل کرنی چاہیئے

جارج ای بار کر، صدر بارکر پن کمپنی ــــ کالجوں کے اکثر گریجوایٹ زینے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھنا نہیں چاہتے۔ بلکہ زمین سے کافی بلندی سے آغاز کرنا چاہتے ہیں۔

ڈیلاس واکر، جنرل منیجر آر ایچ میسی اینڈ کمپنی ــــ کام تلاش کرنے والوں کے لئے اعتماد نفس نہایت ضروری ہے۔ اگر کالج کے گریجوایٹوں میں یہ چیز کسی قدر زیادہ ہوتی تو جس کام سے انھیں دلچسپی ہوتی ہے اس کے حاصل کرنے میں انہیں بڑی آسانی رہتی۔ کالج سے تعلیم حاصل کرنے والی نوجوان عورتیں مردوں سے بہت زیادہ اعتماد کی مالک ہوتی ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتیں مردوں کی بہ نسبت کم عمر میں دماغی پختگی حاصل کرلیتی ہیں۔

میجر جنرل جیمز جی ہاربورڈ، صدر ریڈیو کارپوریشن آف امریکہ ــــ مبتدی کو پیش آنے والی مشکلات کے خیال سے شکست نہیں کھانی چاہئے

اے وائن برگ، صدر کاربونا پراڈکٹ کمپنی ــــ کامیابی کا بہترین گُر یہ ہے کہ ایسا شغل تلاش کیا جائے جہاں آپ کسی کارخانے کے منتظم کے نائب یا معتمد کی حیثیت سے کام کرسکیں کیونکہ اس حیثیت میں آپ کاروبار کے نشیب و فراز سے واقف ہوجائیں گے۔ اس کے علاوہ ہر شخص کو مختصر نویسی سیکھنی چاہیے۔

میکس ایپٹین، صدر جنرل امریکن ٹرانسپورٹیشن کمپنی شکاگو ــــ وہی پرانی نصیحت بڑی کارآمد ہے۔ ہر شخص کو پہلے یہ سوچنا چاہیئے کہ اسے سب سے زیادہ کس کام سے دلچسپی ہے۔ بہت سے نوجوان وہی کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جو ان کے والدین ان کے لئے پسند کرتے ہیں۔ ایک پرانا مقولہ ہے کہ ہر شخص وہی کام اچھی طرح کرسکتا ہے جس کی اس میں استعداد ہو اور جس کی طرف اس کا رجحان ہو۔ زندگی میں بہت سی ناکامیوں کی وجہ غلط آغاز ہے۔ لیکن یہ بات بھی میرے مدنظر ہے کہ بہت سے لوگ انتخاب نہیں کرسکتے۔

نیل ڈیمپیر راس، ناظم وار العرب ــــ ایسے دلچسپ میدان تلاش کرو جہاں بہت زیادہ ہجوم بھی نہ ہو اور حقیقی کامیابی کی امید بھی ہو۔

جی آر ہینکس، صدر ویئر وارٹن آئرن اینڈ سٹیل کمپنی ــــ امریکا کی صنعت اور تجارت مجبور ہے کہ وہ جس قدر گریجوایٹ جذب کرسکے کرے اس سے ان کی صرف یہ خود غرضانہ کوشش ہی کامیاب نہیں ہوتی کہ ان کے دفتروں اور کارخانوں کا عملہ قابل ہوتا ہے بلکہ قومی اقتصادیات کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔

ہاورڈ کونلے، صدر روالورتھ کمپنی ــــ کساد بازاری کا زمانہ جب کاروبار پر ایک سکون کی سی حالت طاری ہوتی ہے بہترین وقت ہے جس میں نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ منعطف ہونی چاہئے۔

زار و آغا

اس کے پیش بہادل و دماغ کی مانگ

گذشتہ مہینے دنیا کے معمر ترین آدمی زار و آغا کی موت سے ایک ہیجان پیدا ہوگیا، اور دوست احباب ہزاروں کی تعداد میں شفاخانے کے گرد جمع ہوگئے۔

کچھ دیر کے بعد امریکا سے ایک تار موصول ہوا جس میں نعش کے لئے ایک

خطیر رقم پیش کی گئی تھی۔

اس اثنا میں زارو آغا کی لڑکی اور بعض دوسرے رشتہ دار نعش حاصل کرنے کے لئے شفا خانے کے باہر کھڑے تھے۔ وہ اسے آلاتِ جراحی سے آلودہ ہوئے بغیر اسلامی قاعدے کے مطابق دفن کر دینا چاہتے تھے۔

لیکن ناظمِ شفا خانہ نے اُس وقت تک نعش دینے سے انکار کر دیا جب تک وزارتِ صحتِ عامہ انگورہ کی طرف سے ہدایات موصول نہ ہو جائیں بعد میں معلوم ہوا کہ وزیرِ اعظم عصمت پاشا اور وزیرِ صحتِ عامہ نے فیصلہ کیا ہے کہ نعش جامعۂ قسطنطنیہ کو دے دی جائے جہاں اس پر عملِ جراحی کیا جائیگا۔

عملِ جراحی ڈاکٹر ستوارٹز کریں گے جو ایک جرمن پروفیسر ہیں اور ترکی حکومت کے لئے کام کر رہے ہیں۔ توقع کی جاتی ہے کہ معائنے کے ذریعے سے زارو آغا کی حقیقی عمر اور اس بڑی عمر میں اس کے دل و دماغ کی کیفیت معلوم کی جائے گی۔ جو اطبا شفا خانے میں زارو آغا کا علاج کر رہے تھے انھوں نے ایکس ریز کے ذریعے سے اس کی ہڈیوں کی ایک تصویر اتاری تھی جس سے اس کی عمر کا اندازہ ایک سو بیس سال ہوتا ہے۔ اس عمل سے سنا ہے کہ زارو آغا بہت تنگ آ گیا اور اس کی صحت اتنی گر گئی کہ وہ پھر نہ سنبھل سکی۔

اگرچہ زارو آغا کا یہ قول درست معلوم نہیں ہوتا کہ وہ نپولین بونا پارٹ کے حملۂ مصر کے وقت موجود تھا اور اس نے اُسے عکہ کے مقام پر لڑتے بھی دیکھا تھا تاہم یہ ممکن ہے کہ جب اس نے واٹرلو کے میدان میں شکست کھائی ہو تو اس وقت زارو بارہ ماہ کا ایک بچہ ہو۔

وہ عام طور پر کہا کرتا تھا کہ مجھے یاد ہے کہ جب امریکا میں جنگِ آزادی کا آغاز ہوا تو قسطنطنیہ میں ایک ہیجان برپا ہو گیا تھا اور شام کی لڑائی کے دوران میں میں نے نپولین کو سبز کوٹ پہنے ایک سفید گھوڑے پر سوار دیکھا تھا۔

وہ یہ بھی کہا کرتا تھا کہ جب لارڈ بائرن نے اپنی زندگی یونان کی آزادی کے لئے پیش کر دی تھی تو میں یونان کی جنگ میں شامل ہوا تھا۔

اس کا یہ دعوےٰ کہ وہ دنیا کا معمر ترین آدمی ہے ۱۹۳۰ء تک دنیا کو معلوم نہ تھا۔ اس اعلان کے بعد اسے بیسیوں دعوت نامے موصول ہوئے وہ امریکا پہنچا اور وہاں کے لوگوں نے اسے دنیا کا آٹھواں عجوبہ سمجھ کر دیکھا۔

امریکا کے اس سفر کے بعد زارو آغا ۱۹۳۱ء میں انگلستان گیا اور وہاں ایک سرکس میں شامل ہو گیا۔ بروک لینڈز میں وہ ہوائی جہاز پر سوار ہوا اور اس نے کہا کہ نپولین کے بعد ہوائی جہاز میں اڑنا دنیا کا سب سے زیادہ سنسنی پیدا کرنے والا واقعہ ہے۔ وہ دار العوام میں بھی گیا۔ لیکن اس کے متعلق اُس نے کچھ نہ کہا۔

۱۹۳۲ء میں کنسنگٹن کے ایک ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے اُسے غش آ گیا۔ لیکن شفا خانے میں جا کر معلوم ہوا کہ ہضم کی خفیف سی خرابی کے سوا اس کی طبیعت میں اور کوئی نقص نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ زارو آغا کی بارہ مرتبہ شادی ہوئی چھتیس بچوں میں سے اس کی صرف ایک لڑکی زندہ ہے جس کی عمر سینسٹھ سال ہے۔ اس کے تیس سے زاید پوتے پوتیاں موجود ہیں۔

وہ نہ شراب پیتا تھا نہ تمباکو، اور بڑی حد تک سبزی خور تھا۔ میٹھی چیزوں سے اسے بڑی رغبت تھی۔

اس کے رشتہ دار کہتے ہیں کہ اس نے پیچھے کچھ نہیں چھوڑا۔ آخری ایام میں اسے بلدیۂ استنبول کی طرف سے سات پونڈ ماہانہ پنشن ملتی تھی۔

ہنڈن برگ

۲ اگست کو برلن سے خبر موصول ہوئی تھی کہ فیلڈ مارشل فان ہنڈن برگ صدر جمہوریۂ جرمنی کا انتقال ہو گیا۔ اس کی موت کے ساتھ دو عجیب اتفاقات وابستہ ہیں۔ ایک یہ کہ اس نے اتنی ہی عمر پائی جتنی اس کے باپ نے پائی تھی یعنی چھیاسی سال اور نو ماہ اور دوسرا یہ کہ اس کا انتقال اُس دن ہوا جس دن جنگِ عظیم کے آغاز کی بیسویں سالگرہ تھی۔ ہنڈن برگ ایک بہترین سپاہی، ایک بہترین مدبر اور ایک بہترین دوست تھا۔

اس کی سپاہیانہ قابلیت سے متاثر ہو کر قیصر نے اسے فیلڈ مارشل بنا دیا، اس کی تدبیر نے باوجود انقلاب کے اسے صدرِ جمہوریہ کا عہدہ دلوایا اور اس کی دوستی کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس بات پر ہمیشہ اس کا ایمان رہا کہ ایک وقت آئے گا جب جرمنی کو قیصر کی ضرورت پڑے گی اور قیصر کبھی نہ کبھی ضرور اس ملک کا بادشاہ ہو کر رہے گا۔ موت سے کچھ دیر پہلے جب اس کے ہوش و حواس زائل ہو رہے تھے اور اس کے دل کی حرکت کمزور ہو رہی تھی کہا جاتا ہے کہ اس نے معزول قیصر کو اپنی وفاداری کا آخری پیغام بھیجا +

منصور احمد

محبّت کا خواب

عشق کی خلاّق فطرت حدِ امکاں سے پرے
کرتی ہے تعمیر اک روشن ترین دنیائے خواب
وقت کی زنجیر اور قیدِ تعیّن توڑ کر
بخش دیتی ہے اسے کچھ سرمدی جلوؤں کی تاب

عشق کی دنیا سے آتا ہے جوانی کا نشہ
عشق کی دنیا سے آتا ہے حسین بچوں کا خواب
عشق کی دنیا سے آتا ہے طلسمِ رنگ و نُور
عشق کی دنیا سے آتا ہے جنوں پرور سحاب
عشق کی دنیا سے آتی ہے جواں صبحِ بہار
عشق کی دنیا سے آتی ہے حسیں شامِ شباب
عشق کی دنیا ہے مرکز ہر سرور و لطف کا
عشق کی دنیا کے تحفے رنگ و بُو عطر و شراب
عشق کی دنیا میں تارے پھول، موجِ نسیم
عشق کی دنیا میں نغمہ زن ہے زہرہ کا رباب
بزمِ امکاں میں نظر آتا ہے جو حسن و جمال
عشق نے بخشی ہے دنیا کو یہ خیراتِ شباب
کس قدر رنگین ہے سراک تصورِ عشق کا!
صحنِ گلشن کی حسیں راتوں کو آتا ہے حجاب
عشق کی ہر آرزو ہے کس قدر پاکیزہ تر
محوِ حیرت ہے ملائک کا تقدس اور شباب
عشق کا ہر ایک لمحہ کس قدر ہے پائیدار!
موت شرماتی ہے لیکن دے نہیں سکتی جواب
عشق کی مایوسیاں ہیں حسن کو پیغامِ مرگ
کتنی درد انگیز کتنی مایۂ رنج و عذاب
عشق کے خوابِ پریشاں پر اجل شرمندہ ہے
اضطرابِ درد سے لرزاں ہے شاعر کا رباب

اے حیاتِ جاوداں اے مرگِ سرفرازِ عشق
ڈال لے اک بار مجھ پر بھی نگاہِ انتخاب

وقار انبالوی

داستانِ راز

کرسمس کی شام تھی۔ سابین ہاؤس کے ڈائننگ ہال میں انیس افراد شریکِ دعوت تھے۔ دس مرد اور نو عورتیں۔ تمام نشستیں پُر تھیں۔ صرف ایک کرسی خالی پڑی تھی۔ میزبان سر جان سابین اٹھا اور اہلِ مجلس سے یوں مخاطب ہوا "معاف فرمائیے میری بیوی دعوت میں شریک نہیں ہو سکی۔ آپ کھانا شروع کریں۔ شاید کچھ عرصے کے بعد وہ بھی آجائے"۔

اہلِ مجلس میں ایک شخص رابرٹ تھا۔ وہ صرف اپنے دوست رچرڈ کی وساطت سے اس دعوت میں شریک ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تمام حاضرین کو اجنبی معلوم ہوتا تھا۔

دعوت شروع ہوئی۔ تمام مہمانوں نے کھانا شروع کیا۔ گو یہ دعوت محفلِ عشرت کے نام سے موسوم کی جاتی تھی۔ لیکن پھر بھی وہاں غیر معمولی خاموشی مسلط تھی۔ فضا ایسی پُرسکون تھی گویا وہاں کوئی بیٹھا ہی نہیں۔ بجلی کے قمقموں سے کمرہ جگمگ جگمگ کر رہا تھا، لیکن پھر بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاروں طرف افسردگی چھائی ہوئی ہے۔

رابرٹ آج سے پہلے کبھی ایسی دعوت میں شریک نہ ہوا تھا۔ وہ تمام حالات پر غور کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بار بار خالی کرسی کی طرف اٹھتی تھیں۔ اس کے دل میں رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ اس بارے میں اپنے دوست رچرڈ سے استفسار کرے لیکن آدابِ محفل کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ خاموش رہا۔

اُس نے میزبان کے چہرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ زرد رنگ، چہرے سے آثارِ سیاست نمایاں، سیاہ آنکھیں اندر کی جانب دھنسی ہوئیں اور سر پر بھورے رنگ کے بال۔ وہ پریشان اور متفکر نظر آتا تھا۔ وہ از خود اپنی زبان نہ کھولتا تھا صرف بوقتِ ضرورت مختصر سی گفتگو کرتا تھا۔ اُس کی آنکھیں بار بار خالی کرسی اور دروازے کی جانب اٹھتی تھیں۔ ذرا کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دیتی تو وہ جھٹ چوکنا ہو جاتا۔ رابرٹ کو ایسا معلوم ہوا گویا میزبان کسی کا چار آنکھوں سے منتظر ہے۔

دعوت ختم ہو گئی۔ سب اٹھ کر باہر جانے لگے تو رابرٹ نے اپنے دوست رچرڈ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال میں وہ کرسی خالی ہی رہی ہے" اس نے یہ الفاظ نہایت آہستہ کہے تاکہ میزبان جو اپنے دو لنگوٹیے یاروں سے مصروفِ گفتگو تھا سُن نہ پائے۔

رچرڈ نے مستفسرانہ انداز سے کہا "کیا تم پسند کرو گے کہ میں تمہیں اُن تمام حالات کو دُہراؤں جو آج سے بیس سال پہلے اسی دن اسی کمرہ میں ظہور پذیر ہوئے تھے"۔

اس سے رابرٹ کی حیرانی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ اور اُس نے بیتابی سے کہا۔ "رچرڈ، ضرور بتاؤ۔ مجھے اس واقعے کے متعلق کچھ پتہ نہیں میں آج سے پہلے کبھی اس کمرے میں نہیں آیا"۔

ہاں ہاں۔ یہی بات ہے جو تم اتنے بے قرار ہو رہے ہو لیکن ذرا سوچو تو سہی کہ اُس سال تم نے کوئی غیر معمولی کام سرانجام تو نہیں دیا تھا"۔

"اچھا میں سوچتا ہوں۔ تم کہتے ہو کہ یہ واقعہ آج سے بیس سال پہلے ظہور پذیر ہوا تھا یعنی ۱۹۱۴ء میں۔ ٹھیک ہے نا"۔

"قطعی طور پر"۔

"۱۹۱۴ء" رابرٹ نے سر کھجلاتے ہوئے کہا۔ دفعتاً اُس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ "اب مجھے یاد آیا میں اُس سال اپنی بیوی کو ساتھ لے کر پہاڑ پر گیا ہوا تھا کیونکہ اس کی صحت کچھ خراب سی تھی"۔

"بس بس معاملہ صاف ہو گیا"۔ رچرڈ نے جواب دیا۔

رابرٹ کی نیلگوں آنکھیں رچرڈ پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس نے متعجب ہو کر کہا۔ "بتاؤ بھی نا آخر کہ بات کیا ہے۔ اُس سال کیا واقعہ پیش آیا تھا؟"

اس اثنا میں میزبان اور اُس کے دوستوں کی گفتگو ختم ہو چکی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھے اور باہر جانے لگے۔ "ساتھ کے کمرے میں محفلِ رقص و سرود گرم ہونے والی ہے۔ بات چیت ختم کر کے اُدھر آجائیے گا"۔ میزبان نے دروازے سے باہر جاتے ہوئے کہا۔

اب وہ اکیلے رہ گئے تھے۔ رابرٹ نے پھر سلسلۂ کلام شروع کر دیا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ یہ کرسی کسی پُراسرار داستان سے تعلق رکھتی ہے!"

"بیشک۔ سنو میں نہیں چاہتا کہ زیادہ دیر تک تم کو اس راز سے محروم رکھوں"

"یہ خوب۔ کیا کرسمس کی شام ایسی داستانوں کے لئے مخصوص نہیں ہوتی؟"

رچرڈ خاموش رہا اور سگار کا کش لگا کر یوں گویا ہوا۔

"آج سے بیس سال پہلے بھی میں اس گھر میں مہمان تھا۔ آج سے بیس سال پہلے اس گاؤں کے گرجا گھر میں سر جان سابین کی شادی ہوئی۔ آج سے بیس سال پہلے اس کی رفیقۂ حیات اس کرسی سے اٹھ کر باہر گئی اور ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی"۔

سر جان سابین اوائلِ عمری ہی میں تند و تیز مزاج رکھتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا

کہ کوئی شخص اس کے کام میں مداخلت کرے۔ ابھی وہ عہدِ شباب ہی میں تھا کہ والدین کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا، اور بہت سی دولت اس کے ہاتھ لگی۔ یا یوں کہئے کہ اُسے اپنی خواہش کے مطابق ہر کام سر انجام دینے کا ایک ذریعہ مل گیا۔

"آج سے بیس سال پہلے اُس نے ایک خوبصورت دوشیزہ سے جس کی عمر تیرہ برس کے قریب ہوگی شادی کی خواہش ظاہر کی۔ یقین جانئے وہ لڑکی سراپا حسن و محبت تھی۔ جب سر جان ہابرن کے دیگر رشتہ داروں کو اس کے متعلق خبر ملی تو انھوں نے بے شمار سوالات پوچھنے شروع کر دیئے۔ یہ لڑکی کون ہے؟ کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ جان ہابرن سے اس کی کیسے ملاقات ہوئی؟

"چونکہ صاحب موصوف کچھ مغرور اور ضدی تھا اس لئے اس نے ان سوالات کا جواب دینے سے صاف انکار کر دیا۔ رشتہ داروں نے قطعِ تعلق کی دھمکی دی، مگر سب بے سود۔ دنیا کی کوئی طاقت اُسے اپنے آہنی عزم سے ایک قدم پیچھے نہ ہٹا سکی۔

کرسمس کے دن اُن کی شادی کی رسوم ادا کی گئیں۔ اسی شام جان ہابرن نے اپنے اٹھارہ دوستوں کو دعوت پر مدعو کیا۔ اسی شام انیس اشخاص نے اسی کمرے میں کھانا تناول کیا۔ جان ہابرن میز کے ایک کنارے پر ایک خوشنما کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور اُس کے ساتھ کی کرسی پر جسے آپ خالی دیکھ رہے ہیں اُس کی رفیقۂ حیات تھی۔

دعوت بڑی شاندار تھی۔ شراب پانی کی طرح استعمال میں لائی گئی۔ کھانے پینے کی اشیا تیار کرنے میں نہایت فراخ دلی سے کام لیا گیا۔ جب محفل خوب گرم تھی، جام پر جام لنڈھائے جا رہے تھے اُس کی بیوی اپنی کرسی سے اٹھی اور باہر چلی گئی۔

"ایک ملازم نے اُسے باہر جاتے ہوئے بھی دیکھا لیکن خاموش رہا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ کسی ضروری کام کے لئے باہر گئی ہے ابھی واپس آجائے گی جب وہ واپس ہی نہ آئی تو اُس کے دل میں شک پیدا ہوگیا، اور اُس نے سر جان ہابرن کو تمام حالات سے مطلع کر دیا۔ فوراً تلاش شروع کی گئی مگر اُس کا کچھ پتہ نہ چلا۔"

رچرڈ اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔

"کیا بعد میں وہ واپس آگئی تھی۔" رابرٹ نے پوچھا جو اس داستان کو خاص دلچسپی سے سن رہا تھا۔

"نہیں۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ کیوں چلی گئی تھی؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" رچرڈ نے دبی زبان سے کہا۔

"کیا اس کی تہہ میں کوئی خانگی تنازعہ ہے؟"

"بالکل نہیں۔"

"کیا کوئی گذشتہ واقعہ ان حالات کا ذمہ دار ہے؟"

"شاید" رچرڈ نے کہا "لیکن یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ قبل از شادی ان کے درمیان کسی قسم کا سلسلۂ خط و کتابت جاری نہ تھا۔"

"بیچارے جان ہابرن نے اُسے ڈھونڈنے کے لئے کافی ہاتھ پاؤں مارے ہوں گے!"

"ممکن نہیں۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ کسی دن وہ خود بخود واپس آجائے گی۔ لیکن جب اُس کی امید یاس میں مبدل ہوگئی تو اس نے پولیس میں اطلاع کر دی۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے ذاتی جاسوس بھی مقرر کر دیئے مگر نتیجہ ہر حال میں ناکامی ہی رہا۔"

"لیکن اُس کی شکل یاد اب تک اس کے دل میں قائم ہے۔" رابرٹ نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"اُس نے اب بھی اس سے ملنے کی امید بدستور لگا رکھی ہے۔ واقعی یہ یاس آمیز تمنا جنون کے درجے تک پہنچ گئی ہے۔ اُسے اب بھی یہ کامل یقین ہے کہ وہ کرسمس کی شام کو اسی دروازے سے اندر آکر اپنی اصلی نشست پر بیٹھ جائے گی۔

"یہی وجہ ہے کہ وہ ہر سال کرسمس کی شام کو اپنے اٹھارہ دوستوں کو مدعو کرتا ہے۔ اور اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اُن میں زیادہ سے زیادہ وہ اشخاص ہوں جو آج سے بیس سال پہلے اس دعوت میں شریک ہوئے تھے۔ ہر سال یہ محفل اسی طرح گرم ہوتی ہے۔ ہر سال یہ کرسی اسی طرح خالی پڑی رہتی ہے اور ہر سال محفل کے آغاز پر سر جان ہابرن یہ الفاظ دہرایا کرتے ہیں "معاف فرمایئے، میری بیوی دعوت میں شریک نہیں ہو سکی۔ آپ کھانا شروع کریں شاید کچھ عرصے کے بعد وہ بھی آجائے۔"

"آہ اُسے اپنی بیوی سے کتنی محبت ہے۔ اس کے گم ہونے کا اُسے کتنا قلق ہے!"

"تم دیکھتے نہیں کہ بیچارے کی غم و اندوہ سے کیا حالت ہوگئی ہے!" رچرڈ نے جھنجلاتے ہوئے کہا

"کیا اس کی کوئی فوٹو بھی نہیں۔"

"خوش قسمتی سے اُن کی شادی کے دن کسی دوست نے اُن کی تصویر اتاری تھی۔ جان ہابرن نے اس تصویر کو بڑے سائز میں منتقل کرا لیا ہے۔ وہ تصویر خوابگاہ میں آویزاں ہے۔ آؤ تمہیں بھی دکھاؤں۔"

رابرٹ اور رچرڈ سیڑھیاں چڑھ کر مہمان کی خوابگاہ میں پہنچ گئے۔

"وہ دیکھو چاندی کے فریم والی تصویر" رچرڈ نے ایک تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ رابرٹ تصویر دیکھتے ہی کچھ ٹھٹک سا گیا۔ اور پھر اُسے نہایت غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے سے پریشانی کے آثار جھلک رہے تھے۔

"کیا بات ہے؟ کیا تم نے اسے پہچان لیا ہے؟" رچرڈ نے جلدی سے پوچھا۔

رابرٹ نے صاف انکار کر دیا اور کہا "نہیں بلکہ میں اس کے حُسن کو دیکھ کر متحیر سا ہوگیا تھا۔ اُف اتنا دلربا چہرہ۔"

جب تصویر دیکھنے کے بعد رابرٹ اور رچرڈ سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ رابرٹ کے دماغ میں خیالات نے ایک ہیجان برپا کر رکھا تھا۔ اس تصویر نے اُس کی بیوی کے گذشتہ حالات روزِ روشن کی طرح عیاں کر دیئے تھے۔ اور اُسے معلوم ہوگیا تھا کہ وہ کیوں ایک نوجوان کے ساتھ گھر سے غیر حاضر رہی تھی۔"

(ترجمہ) روشن نکودری

ایک تخئیل

ایک مرتبہ تین بہنیں محبت، شہرت اور عزت ایک سبزہ زار میں ملیں جہاں ایک تیز رو ندی نے وادی کے مصور میدان کو خود رو پھولوں اور تاک کی لامتناہی بیلوں سے نظر فریب بنا دیا تھا۔ ہر ایک نے اپنے ماضی کی دلچسپ داستان ایک دوسری کو سنائی اور اس طرح اچانک ملنے پر اپنے تاثرات کا اظہار نہایت لطیف پیرائے میں کیا۔ حتیٰ کہ اس دل خوش کن ذکر میں کافی وقت دیکھتے دیکھتے گزر گیا۔

یکایک محبت اٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی:۔

"بہنو! اب ہمیں رخصت ہونا چاہیئے۔ میرے کانوں میں بادۂ الفت سے مخمور ہونے والے نوجوانوں اور حسن کی ضیا پاشی کرنے والی الہڑ لڑکیوں کی آوازیں آ رہی ہیں.....

میں وہاں جاؤں گی جہاں شبِ مہتاب میں جوئبار کے کنارے محبت بھرے دل وصال کے لئے بے چین ہیں!

"پھولوں سے لدے ہوئے گلزار میں جہاں ایک دل زدہ نوجوان ایک شرمیلی لڑکی سے گلاب کا ایک سرخ پھول..... "محبت کی نشانی"..... دینے کے لئے ٹوٹے پھوٹے ایک جملے کا خواہشمند ہے!

"بلند اور عالی شان عمارتوں میں جن کے کمرے بے شمار شمعوں سے منور کئے گئے ہیں۔ اور دیبا و حریر سے بنے ہوئے نرم نرم گدیلوں پر اپنے محبوب سے روٹھ کر آنسو بہانے والی بھولی رانی کے پاس!!

"فطرت پرست دہقانوں کے پاس جو سبز کھیتوں میں گاتے ہوئے کام کرتے ہیں!

"کہ ان کے قول، عمل اور زندگی میں اپنی روح پھونک دوں۔ کائنات میں میرے سریلے نغموں اور ڈھارس بندھانے والے لفظوں کی سخت ضرورت ہے! ہاں بہنو! جب وارفتگانِ الفت کے جوش و خروش میں کمی ہوگی اور محبت کے نشے پرستار وصالِ محبوب سے شادکام ہو جائیں گے تو میں پھر آؤں گی اور اسی مقام پر تم سے ملوں گی"!

شہرت نے اپنے لباس کو سنوارتے ہوئے کہا:۔

"ہاں بہنو! اپنے اپنے فرائض انجام دے کر ہم اپنی فرصت کی گھڑیاں اسی لالہ زار میں ہنسی خوشی سے گذار سکتی ہیں۔

"سنو کہ مجھے بلایا جا رہا ہے ——— میرے لب سے نکلے ہوئے وہ چند الفاظ سننے کو جن کے لئے لوگ اپنی عزیز جانیں تک تلف کر رہے ہیں!

"سہیلیو! جنگ کے وحشت ناک میدان سے آہ و بکا اور نالہ و فریاد کی صدائیں آ رہی ہیں لیکن دوسری طرف جانبازی، ہمت اور شجاعت کی داد دی جا رہی ہے!!

"معمولی سپاہی ہوں یا پختہ کار جنگجو صرف مجھے حاصل کرنے کے لئے جسے لمحہ بھر قیام نہیں توپ و تفنگ کے منہ میں بے جگری سے گھس رہے ہیں!

"رزم سے ہٹو تو بزم میں بھی میری موجودگی کی سخت ضرورت ہے چنگ و رباب کی نقرئی آوازوں میں صرف میرے گیت بھرے ہیں!!

"دنیا کی نگاہیں بیتاب ہیں کہ میرے ہاتھوں سے سرفراز ہونے والے کو فوراً آسمانِ شہرت پر جلوہ گر دیکھیں!

"ہاں! جب اپنے فرائض سے کچھ عرصے کے لئے سبکدوش ہو جاؤں تو یہیں میں بھی تمہاری شریکِ عشرت بنوں گی....."

عزت نہایت سنجیدہ چہرہ بنا کر اٹھی لیکن یکایک ایک نامعلوم غم کی جھلک اس کے چہرے پر ظاہر ہونے لگی۔ وہ اپنی شریکِ مسرت بہنوں کی طرف نگاہیں جمائے چند قدم پیچھے ہٹ گئی اور رنجیدہ آواز میں کہنے لگی:۔

"سکھیو! تمہارا کہا سر آنکھوں پر ———

"فرض کی بجا آوری اور اس سے سبکدوشی کے پُر مسرت لمحات تمہیں مبارک ہوں!

"میرا فرض یہی ہے کہ جس جگہ سے میں چلی جاؤں وہاں پھر واپس نہ آؤں! اچھا خدا حافظ!"

چہرے پر مغموم مسکراہٹ کے ساتھ وہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی۔

ہمنوا حیدرآبادی

غزل

یہ شیدائے اصنام ہے اور بس
وہ عبدِ در و بام ہے اور بس

کلِ آفاق ابتک باین عقل ورائے
گرفتارِ اوہام ہے اور بس

وجودِ وفا کی تلاشیں عبث
فقط نام ہی نام ہے اور بس

نہ اذکارِ دنیا نہ افکارِ دیں
حدیثِ مے و جام ہے اور بس

وہی ہم ہیں اور شغلِ بیکارِ عشق
وہی فرصتِ تام ہے اور بس

زمانہ ہے اور کوشش و جد و جہد
مگر ہم ہیں آرام ہے اور بس

نہ آزاد مے کش، نہ شاہد پرست
وہ کمبخت بدنام ہے اور بس

حکیم آزاد انصاری

افسانوں کے ترجمے

ترجمہ بھی کس قدر دلچسپ چیز ہے! چیزوں کو گھر سے بے گھر کرنا! ولایت کی چیزوں کو لاکر ہندوستان میں پھینک دینا، بنگال کی آزاد فضاؤں کو پنجاب کی سرزمینوں میں قید کرنا، روشنیوں کو تاریکی کی طرف لے جانا، خیالات کو اس بزم سے اس بزم میں لاکر بٹھا دینا، نظامِ تخیل کو درہم برہم کر دینا، دوسروں کی ادبی بلندیوں کو اپنا بنا لینا، غرض اسی قسم کے الٹ پھیر کا نام لوگوں نے "ترجمہ" رکھ لیا ہے۔

ترجمہ سے کب اور کس وقت کام لیا جاتا ہے۔ کیوں اس کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس کی طرف رجوع کرنے سے کون کون سے فائدے اور نقصانات ہوتے ہیں۔ ان چیزوں کے جاننے کی کوشش خود ترجمہ کی حقیقت سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ سنئیے۔

ہر ادب کی ابتدا عموماً تالیفوں اور تصنیفوں سے ہوتی ہے۔ جب یہ خزانہ ذرا ابھر جاتا ہے تو ملک کے ادیب کسی کشور کشا سلطان کی طرح ادھر اُدھر نظر دوڑانی شروع کرتے ہیں کبھی اس ملک کے خزانوں کو تاکا کبھی اس ملک کی جواہرات پر نظر دوڑائی۔ کبھی ادھر لپکے کبھی اُدھر جا گے۔ آخر ایک چیز کی طرف رجوع ہو گئے۔ کسی انقلابی رہنما سے ان حملوں میں کامیابی حاصل کی اور کوئی نہ کوئی ادبی جواہر پارہ مٹھی میں دبا کر فخر کرتے ہوئے اپنے ملک میں واپس آگئے۔ قوم کی آنکھیں اس نئے حسن کے دیکھنے کی عادی نہیں تھیں۔ جس نے دیکھا آنکھیں پھاڑ دیں۔ نہ منہ سے آہ نکلی نہ واہ۔ لانے والے کو بھی افسوس ہوا کہ اس کی کوششیں بیکار گئیں۔ آخر جدت نے کوئی نہ کوئی راہ نکال لی۔ اور اس ادبی عروس کو اپنی قوم کا جامہ پہنایا۔ ظاہری حسن و خوبی میں جو یہ نمایاں جلوہ رونما ہوا تو آنکھوں نے اس سحر کی لذتیں محسوس کرنی شروع کیں اور دل نے تحسین کی نذر اس کے قدموں پر بھینٹ چڑھائی اس انقلابی ابتدا کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے شوخ مزاج ادیبوں نے بھی اس کا اتباع کرنا شروع کیا اور ادب اس نئی ادبی فضا کے جلووں سے جگمگانے لگا۔ یہ ہوئیں ترجمہ کی کارفرمائیاں۔

اب ہماری زبان کی داستان سُنئیے۔ اردو میں بھی شروع میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ اسی فطری طریقہ پر شروع ہوا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں فارسی کے ترجمے ہونے شروع ہو گئے۔ لیکن ابتدائی دوروں کے بعد یہ سلسلہ کسی قدر کم ہو گیا اور لوگوں نے ترجمہ کی طرف سے اپنے خیالات کو ہٹا لیا۔ فورٹ ولیم کالج قائم ہونے کے بعد اس روش میں پھر جان پڑ گئی اور ترجمے کثرت سے ہونے لگے۔ مغربیت نے جوں جوں اپنا اثر اور زیادہ کیا۔ ان ترجموں کی تعداد بڑھتی گئی۔ دہلی کالج کے قائم ہونے سے انگریزی تصنیفوں کے ترجموں کی بھی مستقل ابتدا ہو گئی۔ لیکن اب تک جتنے ترجمے ہوئے ان میں ادبیت برائے نام تھی۔ ادبی ترجمے بیسویں صدی کے شروع میں ہوئے۔ ان ترجموں میں زیادہ تعداد سائنس کے مختلف شعبوں کی کتابوں کی تھی۔ ذرا اور وقت گذرا تو افسانے نے اپنا اثر دلوں پر جمایا اور جہاں طبع زاد افسانے لکھے گئے وہاں دوسری طرف انگریزی مصنفوں کی روحیں اردو کے قالب میں ڈھالی جانے لگیں۔

افسانوی دنیا میں اس ادبی انقلاب سے ادب اور زبان کو بہت سے فائدے ہوئے۔ یہ فائدے دو قسم کے ہیں۔ پہلے وہ جن کا تعلق روح سے ہے دوسرے وہ جنہیں جسم یا ڈھانچا کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ اول خیال میں دوسرے زبان میں۔

ترجمہ کرتے وقت ہم کتنی ہی کوشش کریں یا دوسرے لفظوں میں اصل شکل کو کتنا ہی مسخ کرنا چاہیں اس کے کچھ نہ کچھ خط و خال باقی رہ جائیں گے۔ روح کی تبدیلی اگر غیر ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اس لیے سب سے پہلی چیز جو ہمارے افسانوں کو روسی، فرانسیسی، انگریزی اور امریکن افسانوں سے حاصل ہوئی وہ اُن کی انفیاتی ذہنیت تھی۔ چونکہ یورپ کی قوموں کا ذہنی عروج ہندوستان سے بہت پہلے ہو چکا تھا اس لئے اُن کی گفتار، کردار، عمل اور علم ہر چیز میں ایک باقاعدگی پیدا ہو گئی تھی۔ چونکہ افسانے انسانی زندگی کے صحیح مرقعے ہیں اور اُن میں فطری آب و رنگ کا بھرنا اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک افسانہ نگار تعفنات کے ہر پہلو سے واقف نہ ہو اس لئے یورپ کے افسانہ نگاروں نے اپنے

افسانوں میں باقاعدگی اور یکسانیت پیدا کرنے کے لئے ہر قدم پر نفسیات سے
کام لیا۔ ہر کردار فعل اور گفتار کو پہلے نفسیات کی میزان پر تولا اور اُسے ہر طرح
پرکھ کر کھوٹے کھرے کی تمیز کر کے اپنے کام میں لائے۔ اور اس لئے ان فسانوں
میں جہاں دلچسپی اور کیف ہے وہاں حقیقت کی ایک دنیا بھی پوشیدہ اور پڑھنے
والا جو لطف یا سرور حاصل کرتا ہے وہ خود اپنی دنیا میں رہ کر۔ اردو کے افسانوں
میں اب تک یہ بہت بڑی کمزوری تھی۔ افسانہ نگار دلچسپی کو اپنا مقصد سمجھتے تھے
اور اس کے نیچے حقیقت کے عنصر کو بالکل نظرانداز کر دیتے تھے لیکن جب سے
اردو میں یورپ کی زبانوں سے ترجمے ہونے شروع ہوگئے۔ اردو کے افسانہ
نگار بھی اس ذہنیت سے بے حد متاثر ہوئے۔ اور اس لئے ہمارے
افسانوں کو بھی وہی وسیع اور بلند درجہ حاصل ہو گیا جو دوسری قوموں کے
افسانوں کو تھا۔

اردو کے افسانوں میں جو رجحانات اس وقت بہت زیادہ شدت
کے ساتھ عمل کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہماری سوسائٹی
یا ہمارے افسانہ نگاروں کے گروہ نے عورت کو ایک ایسی شخصیت دے دی
ہے جس پر سماج کے حُسن و تبسم کا دارومدار ہے۔ یورپ میں عورت کو سوسائٹی میں
ایک بہت بلند اور دلکش مرتبہ حاصل ہے۔ وہاں کی کائنات کا ہر ذرہ اسی
دلفریب مخلوق کے حُسن کی چمک سے روشن ہے۔ اس لئے افسانہ نگاروں
نے بھی اپنی داستانوں کی دلکشی بڑھانے کے لئے اُسے کسی نہ کسی پہلو سے
اپنے افسانوں میں شامل کر لیا۔ اردو میں ترجمہ کرنے والوں کو بھی اس حُسن نے
بہت لبھایا اور اب جسے دیکھئے اسی دلفریب دام میں گرفتار ہے جو ہے
وہ عورت کے گُن گا رہا ہے۔ چونکہ فطرت نے عورت میں کچھ ایسی دلکشیاں
پیدا کی ہیں جو انسان کو کہیں اور نہیں مل سکتیں اس لئے جو افسانے اُن کے
ذکر کا مرکز تھے وہ بھی دلکش سمجھے گئے اور اردو افسانہ نگاری کی دنیا میں اس
طرح ایک نئے حُسن کا اضافہ ہوا۔ افسانہ نگاری کی دنیا میں ترجموں نے ایک اور
نفسیاتی حسن یہ پیدا کیا کہ ہمارے افسانہ نگار کردار نگاری کو بھی اُس کا ایک
اہم جزو سمجھنے لگے۔ اب تک جو افسانہ نگاری ہوتی تھی اس میں حیاتِ انسانی
کے صرف روشن پہلو دکھاتے تھے۔ ہیرو کو افسانہ لکھنے سے پہلے جن صفات
کے ساتھ منسوب کیا جاتا تھا وہ اس میں شروع سے آخر تک باقی رہتی
تھیں۔ اور وہ بجائے ایک فطری انسان ہونے کے محاسن کا پُتلا بن کر رہ جاتا
تھا۔ افسانہ پڑھنے والے اس کمی کو وسیع نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ انگریزی
افسانوں میں عموماً کردار نگاری میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ
فطرت کے بالکل مطابق ہوں ان میں واقعات برابر انقلاب پیدا کرتے رہیں۔
غم اور خوشیاں رفتہ رفتہ کردارِ انسانی کو مختلف منزلوں سے لے گزریں
اس چیز کو انگریزی کی اصطلاح میں کردار کا ارتقا یا Caracter
in the making کہتے ہیں۔ اردو کے افسانوں میں
یہ حُسن بھی اب بدرجۂ اتم پیدا ہوگیا ہے۔ اور اس کی وجہ سے وہ فطرت
سے بہت قریب ہوگئے ہیں۔

تعیّنات نے انگریزی افسانوں کے انجام میں ایک خاص بات پیدا
کر دی تھی کہ وہ ہر طرح فطرت کے مطابق ہوتے تھے۔ واقعات کبھی اس
طرح کے ہوتے ہیں کہ اُن کا انجام طرب ہو اور کبھی اس طرح کے کہ اُن کا
فطری انجام حُزن ہو خواہ اس انجام کا نتیجہ ہیرو پر اچھا پڑے یا نہ پڑے۔
اردو میں افسانوں کے انجام میں اس بات کا خیال ضروری تھا کہ ہیرو
کا انجام طرب و انبساط ہو۔ وہ اپنی امیدوں میں کامرانی حاصل کرے لیکن
انگریزی ترجموں کے اثر نے یہ قید بھی ہٹا دی۔ اور اب افسانے طرب
کے علاوہ حُزن پر بھی ختم ہونے لگے بلکہ کبھی کبھی اُن میں زیادہ ادبیت پیدا
کرنے کے لئے انہیں تذبذب پر ختم کیا گیا۔ ظاہر بین نظریں اُسے بری نظر
سے دیکھتی ہیں لیکن بلند مذاق کے نزدیک یہ چیزیں حد کیف آگیں ہے
انگریزی افسانوں کے علاوہ ہماری زبان میں جاپانی۔ ایرانی اور
بنگالی افسانوں کے بھی ترجمے ہوئے اور ان زبانوں اور قوموں سے بھی
ہماری افسانہ نگاری نے بہت سے فائدے حاصل کئے۔ جاپان کی سادہ
مگر پرکیف تخئیلیں ایران کی شاعرانہ نزاکتیں اور بنگال کے سحر آگیں شعر
اور نغمے ہماری زبان اور ادب کے خزانے میں بے بہا جواہر کی طرح
داخل ہوگئے۔ اور جہاں ہم ایک طرف مغرب کی حقیقت طرازیوں کا لطف
لے رہے تھے وہاں مشرق کی سامعہ نواز اور روح افزا شعریت اور
موسیقی نے ہماری دنیا کو روحانی فضاؤں تک پہنچا دیا۔

اس کے علاوہ ترجموں سے عام طور پر جو فائدہ ہمیں ہوا اُن میں
سب سے بڑا یہ ہے کہ انگلستان، امریکہ، روس، چین، جاپان اور ایران
کی روشن اور تاریک فطرتیں ہماری نظروں کے سامنے پھرنے لگیں۔
افسانوں نے وہ کام کیا جو تاریخ نہیں کر سکتی تھی۔ تاریخ میں ہم صرف
واقعات کی تفصیلیں پڑھ سکتے ہیں کشت و خون کے افسانوں کی یادیں
اُسے پڑھ کر تازہ ہو سکتی ہیں۔ ملک کی بہادری کے کارنامے ہمارے دلوں
کو گرما سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہے لیکن ہمارے دلوں کو ہماری روحوں

کو ایک دوسرے سے وابستہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کی روزانہ زندگی کے واقعات اور فطرتوں سے واقف ہوں۔ یہی آئینہ ہمارے دلوں میں باہمی ربط و ضبط اور محبت کی جھلک پیدا کر سکتا ہے۔ افسانوں میں تاریخ نہیں کشت و خون کے افسانے نہیں، بہادری کے مرقعے نہیں — اس میں صرف ہماری مختصر اور سادی زندگی کی تصویریں ہیں جو ہمارے دلوں پر محبت کے نقش جماتی ہیں۔ اس لئے ان ترجموں کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے۔ کہ انھوں نے مختلف قوموں کے درمیان ایک روحانی تعلق پیدا کر دیا۔

حُسن کی تصویریں دلکش ہوتی ہیں لیکن ان کا حُسن اس وقت تک زیادہ دلفریب نہیں ہوتا جب تک انہیں عیوب کی روشنی میں نہ دیکھا جائے اس میں کوئی شک نہیں کہ ان ترجموں نے ہم میں بہت سی خوبیاں پیدا کر دیں لیکن اُن نقصانوں کی تلافی بھی مشکل ہے جو ہمیں اٹھانے پڑے۔ ان کے ذکر میں کچھ دلفریبی نہیں لیکن اس کا احساس ضروری ہے اس لئے سنئے کہ سب سے پہلی چیز جو ان ترجموں نے ہم سے چھین لی ہماری جدت ہے۔ ہمارے اچھے سے اچھے افسانہ نگار ترجمہ کرتے کرتے اس کے اس قدر عادی ہو گئے کہ اپنی سوچنے کی طاقت کھو بیٹھے۔ سوچنے بیٹھے تو چیخوف اور ایبح کی تخئیلوں نے دماغ میں چکر لگانے شروع کر دیئے قلم لے کر بیٹھے تو ان کی فضا میں پلے ہوئے تشبیہ اور استعارے سامنے آئے۔ لکھنا شروع کیا تو ان کے جملوں کی ترکیبوں نے لفظی شکلیں اختیار کر لیں۔ اب اس مرض کا علاج ؟ — کچھ نہیں۔ نتیجہ۔ اپنی تخئیل مردہ اپنے رنگیں تشبیہ اور استعارے تاریکی کے پردے میں۔ اپنی حسین اور دلکش ترکیبیں غائب۔ ہمارے رنگ ماند۔ اُن کے رنگ شوخ۔ جامِ مشرق میں بادۂ مغرب۔ گلشنِ ہند میں نخلِ فرنگ۔ انصاف کیجئے کہ اس میں وہ فطری دلکشی کہاں۔ — آنکھوں نے اس میں دلکشی محسوس کرنی شروع کر دی تو افسانہ نگاروں نے اپنی تخئیلوں کی طرف دھیان دینا بھی چھوڑ دیا۔

اس کا ایک دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ افسانوی دنیا کی جان ملکی ادب کی روح، قومی دلکشی کا سرمایہ۔ مقامی رنگ — اس میں سے بالکل غائب ہو گیا۔ اگر ترجمے نہ ہوتے تو افسانوں میں جو کچھ ہوتا اپنا ہوتا۔ اپنے خیالات، اپنی باتیں، اپنی بزمیں، اپنے جام اور اُن میں اپنی شراب وہی نغمے وہی رقص۔ وہی پھول وہی بوٹے — سادگیوں میں رنگینیاں اور رنگینیوں میں سادگیاں لیکن اب دنیا نرالی ہو گئی اگر کوئی دوسری قوم والا ان ترجمہ کئے ہوئے افسانوں کو دیکھے تو ہماری صحیح فطرتوں اور زندگیوں کا اندازہ بھی مشکل سے کر سکتا ہے۔

خیالات اور ان کی ترکیب میں اتنے انقلاب ہونے کے علاوہ ایک اور انقلاب زبان کی روش میں پیدا ہوا۔ ترجمے کرنے کے وقت ترجمہ کرنے والوں کو اُن ہی زبانوں کی تخئیلوں سے سابقہ پڑا اس لئے استعارے اور تشبیہیں بھی وہی کام میں لائے گئے۔ چنانچہ ہماری زبان کا خزانہ زیادہ مالامال بنا۔ دوسرے جملوں کی ترکیبیں اور اُن کی ترتیب بھی کبھی کبھی اسی قسم کی لانی پڑی۔ شروع میں تو یہ چیزیں بہت اچھی لگیں لیکن بعد کو ان کی غلط ترکیبیں ان کا ان مل بے جوڑ ارتباط زبان کے لئے بار بن گیا۔ ممکن ہے کہ آنے والا زمانہ ان چیزوں کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھنے لگے۔

اس عام روش کے متعلق اتنی باتیں جاننے کے بعد اگر ہم فرداً فرداً اُردو کے ایسے افسانہ نگاروں کا ذکر کریں جو اس روش کے دلدادہ ہیں تو شاید داستان زیادہ طویل ہو جائے لیکن مختصر طور پر بتانا بھی ضروری ہے کہ اس روش نے عملی طور پر کس طرح سجاد حیدر، منصور احمد، حامد علی خاں، خواجہ منظور، شاہد اور جلیل کی فطرتوں کو اُن کے راستے سے الگ ہٹا دیا۔

سجاد حیدر کے شروع کے افسانے پڑھ کر دیکھئے ان میں روحانی جذبہ کس قدر پُر کیف طریقہ سے اپنے جلوے دکھا رہا ہے۔ جب سے انھوں نے ترکی افسانوں کے ترجمہ کرنے شروع کئے اُن کی فطرت میں تبدیلی پیدا ہو گئی اور اس کے بعد کے طبع زاد افسانوں میں بھی ترکی تخئیل، استعارے، تشبیہیں اور لطافتیں اور ساتھ ساتھ لفظوں اور فقروں کی بندشوں اور ترکیبوں نے اپنا کتنا گہرا اثر کر لیا ہے۔

سجاد حیدر کے بعد منصور احمد، حامد علی خاں، خواجہ منظور، جلیل کے افسانوں کی حالت ہی دوسری ہے ان کے طبع زاد افسانوں کو ایک طرف رکھو اور ترجموں کو دوسری طرف دونوں کو الگ الگ پڑھو میرے نزدیک تو دونوں میں یکساں کیفیتیں ہیں وہی روسی تخئیل وہی پلاٹ کی ترتیب اور وہی ہیئت کسی میں بال برابر بھی فرق نہیں۔

شاہد کا رنگ بھی جداگانہ ہے وہ طویل افسانے لکھتے ہیں اور طویل ہی ترجمے بھی کرتے ہیں۔ لیکن ترجموں کے لئے انتخاب بھی ایسے ہی افسانے کا ہوتا ہے جیسی اُن کی تخئیل ہے۔ یا میرے نزدیک تو یہ ہے کہ اُن کی فطری تخئیل بھی اسی طرف مائل ہوتی ہے۔ جدید ترجموں کی روش نے انھیں چلنے کا عادی بنا دیا ہے۔ اب آپ ہی بتلایئے کہ کیا ان باتوں کے دیکھنے کے بعد بھی ترجموں کے عالمگیر اثر کے ماننے میں کوئی شبہ باقی رہ جاتا ہے۔

سید وقار عظیم

تجدیدِ محبت

آج تک یاد ہے آغازِ محبت مجھ کو
مضطرب رکھتی تھی بیتابیٔ فرقت مجھ کو
خلشِ دردِ جدائی تھی قیامت مجھ کو
اور یہی درد تھا سرمایۂ راحت مجھ کو

خوفِ رسوائی سے گو بند زباں رہتی تھی
آرزو دل کی نگاہوں سے عیاں رہتی تھی

اسقدر ہو گئی وارفتہ طبیعت میری
دیکھی جاتی تھی زمانے سے نہ حالت میری
بسکہ آئینہ مرے دل کا تھی صورت میری
بن گئی دہر میں افسانہ محبت میری

تم کو ہر بات پہ میں جانِ وفا کہتا تھا
برملا کہتا تھا اے دوست اسد کہتا تھا

حُسن مجبورِ جفا ہے مجھے معلوم نہ تھا
یہ وفاؤں کا صلہ ہے مجھے معلوم نہ تھا
رنج قسمت میں لکھا ہے مجھے معلوم نہ تھا
آج معلوم ہوا ہے مجھے معلوم نہ تھا

کچھ خبر تھی نہ محبت کی غم انجامی کی
آ، دیکھ مجھے تصویر ہوں ناکامی کی

نخوتِ حُسن میں کیوں رسمِ وفا بھول گئے
درد بخشا تھا مگر اس کی دوا بھول گئے
اپنے ہر عہد کو تم نام خدا بھول گئے
بھول کر بھی نہ مجھے یاد کیا بھول گئے

تم نے کس شوق سے پیمانِ وفا باندھا تھا
توڑنے کو مگر اے جانِ وفا باندھا تھا

دیکھو! میں اب بھی تمہیں جانِ وفا کہتا ہوں
جوشِ الفت میں کچھ اس سے بھی سوا کہتا ہوں
جانے دیوانگیٔ شوق میں کیا کہتا ہوں
بات کہنے کی نہیں، تم کو خدا کہتا ہوں

تم نے کیوں قدر نہ کی میری وفاداری کی
انتہا بھی کوئی ہوتی ہے دل آزاری کی

کس لئے نقشِ وفا دل سے مٹایا تم نے ایک مجبورِ محبت کو بُھلایا تم نے
جو نہ دیکھا تھا وہ آنکھوں کو دکھایا تم نے کیوں مجھے اپنی نگاہوں سے گرایا تم نے

تم اسی بات پہ کیا ناز کیا کرتے تھے
"ہم وفادار ہیں" ہر وقت کہا کرتے تھے

خیر اچھا ہوا جو کچھ بھی ہوا، خوب ہوا تم اگر بھول گئے رسمِ وفا خوب ہوا
ہو سکی تم سے نہ اس دل کی دوا خوب ہوا یاد آیا مجھے آخر کو خدا خوب ہوا

لیکن اے راحتِ جاں! تم کو بھلاؤں کیونکر
دل سے اس نقشِ محبت کو مٹاؤں کیونکر

میں وہی دل بھی وہی دل کی تمنا بھی وہی تم وہی اور تمہارا رخِ زیبا بھی وہی
گلۂ جور وہی شکوۂ بے جا بھی وہی لطفِ امروز وہی وعدۂ فردا بھی وہی

تم سے ہے پیار مجھے تم سے محبت ہے مجھے
اپنی محرومیٔ قسمت کی شکایت ہے مجھے

دہر میں حسنِ جفا کار کا چرچا نہ کروں نہ کروں، تم سے وفا کا بھی تقاضا نہ کروں
آنکھ اٹھا کر میں کبھی اور کو دیکھا نہ کروں نگہِ شوق کو آوارہ و رسوا نہ کروں

میری تقدیر! اگر راس آیا نہ پیمانِ وفا
تم کو کس منہ سے کہوں منکرِ ایمانِ وفا

دشمنِ اہلِ وفا گرچہ زمانہ ہوگا یونہی رنگیں مری الفت کا فسانہ ہوگا
مرا ہر شعر محبت کا ترانہ ہوگا تم سے اظہارِ تمنا کا بہانا نہ ہوگا

جو کوئی کر نہ سکے کر کے دکھا دوں تم کو
خود جیوں زندۂ جاوید بنا دوں تم کو

حفیظ ہوشیارپوری

بیم و رجا کی ہولناک گھڑیاں

مجھے ایک خوفناک اقرار کرنا ہے۔ اور وہ یہ کہ مجھے آسیب ہے۔ اگر آپ لوگ ایک سو سال تک بھی قیاس آرائیاں کرتے رہیں کہ یہ آسیب کس چیز کا ہے تو آپ کبھی دریافت نہیں کر سکیں گے۔ آئیے میں آپ کو بتاتا ہوں۔ شاید آپ سن کر ہنسیں گے مگر ساری سرگذشت سن کر آپ کا دل ہل جائے گا۔ اور خوف و حیرت سے آپ کانپ اٹھیں گے۔ مجھ کو خوابگاہ کے ایک شمعدان کا آسیب ہے۔ اس کا تصور ایک جن یا پری کی طرح میرے دل و دماغ اور میری زندگی کے موجودہ ایام پر حاوی ہے۔ کاش یہ آسیب کسی نادر اور خوشگوار چیز کا ہوتا۔ مثلاً کسی خوبصورت عورت کا یا سونے اور چاندی کی کانوں کا یا کہنہ شراب کے کسی زیر زمین ذخیرہ خانہ کا یا کسی پُرشکوہ سواری اور گھوڑوں کا۔ مگر چونکہ ایسا نہیں بلکہ یہ ایک نہایت ہی عام اور معمولی چیز کا آسیب ہے۔ میں اسے نہایت دیانتداری کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ اس امید پر کہ آپ میری داستان گوشِ دل سے سنیں گے۔ آسیب عام طور پر کسی شدید خوف کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور مجھ کو اس کمبخت شمعدان نے اس قدر ڈرایا کہ میں ایک عرصہ تک بالکل بے ہوش رہا۔ میں کوئی بودا اور کمزور دل آدمی بھی نہیں ہوں۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ اپنی یہ آپ بیتی بلا کم و کاست اور بلا تامل بیان کر رہا ہوں۔ اس کی دلچسپ مگر ہولناک تفصیلات حسب ذیل ہیں:۔

یہ ۱۸۱۹ء یا ۱۸۲۰ء کا واقعہ ہے کہ ہسپانیہ کے جنوبی امریکہ کے مقبوضات نے باہمی مل کر اپنی حکومت آپ قایم کر لی۔ پرانی اور نئی سلطنتوں میں بہت سی خونریز لڑائیاں ہوئیں۔ انگلستان اور آئرلینڈ کے بیکاروں کو فاقہ کشی سے نجات حاصل کرنے کا ایک سنہری موقع ملا اور وہ کثرت سے نئی حکومت کی فوجوں میں بھرتی ہو گئے۔ سوداگروں نے بھی اس سے مستفید ہونے میں کاہلی نہ کی۔ اور سامانِ رسد و حرب افراط کے ساتھ نئی حکومت کو بھیجا جانے لگا۔ میں ان دنوں میں لنڈن کی ایک جہازران کمپنی کے ایک جہاز پر ملازم تھا۔ چنانچہ ہمارے جہاز پر بھی کمپنی نے بہت سا بارود لاد کر سالِ مذکورہ با میں ہمیں نئی حکومت کے افسروں کی طرف روانہ کر دیا۔

کپتان کے سوا کمپنی کی ہدایات کا ہم میں سے کسی کو علم نہ تھا۔ اور وہ اُن ہدایات کو پسند نہیں کرتا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ تختۂ جہاز پر بارود کے کتنے پیپے تھے۔ نہ یہ کہ ہر ایک میں بارود کی کس قدر مقدار بھری تھی مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ بارود کے سوا اور کوئی سامان جہاز میں موجود نہ تھا۔ یہ جہاز چھوٹا سا تھا اور صرف آٹھ آدمی اس پر کام کرتے تھے۔ اگرچہ یہ تعداد کسی طرح کافی نہ تھی اور ہمیں دن بھر محنتِ شاقہ کرنی پڑتی تھی۔ مگر اس کے عوض اور دیگر مخاطرہ و مہالک کے بدلے جن سے ہمارا سامنا یقینی تھا ہمیں معقول تنخواہیں دی جاتی تھیں۔

سامانِ باربرداری کی نوعیت کے پیشِ نظر ہم پر بے شمار ایسی پابندیاں اور قیود لگائی گئیں تھیں جو بہت دق کرنے والی تھیں۔ مثلاً یہ کہ ہمیں حقہ نہیں پینا چاہیئے۔ اپنی بتیوں کو نہایت احتیاط سے جلانا اور رکھنا چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ مگر ہمارا کپتان جو ان قوانین کا سرچشمہ تھا اپنے آپ کو ان سے آزاد سمجھتا اور جو کہتا خود کبھی نہ کرتا۔ ہمیں مطلقاً اجازت نہ تھی کہ روشن بتی ہاتھ میں لے کر نچلے تختے پر جائیں۔ ناخدا اس حکم سے مستثنیٰ تھا۔ اور وہ جب کبھی نیچے اترتا یا اپنے کمرے کی میز پر بحری نقشوں کا مطالعہ کرتا تو اپنی مخصوص بتی استعمال کرتا۔

یہ بتی ایک باورچی خانے کی موم بتی تھی اور ایک پرانے ٹوٹے پھوٹے پیچیدہ سے شمعدان میں جس کا رنگ و روغن تمام گھس کر اکھڑ چکا تھا اور بلندی کی بین صاف نظر آتی تھی رکھی جاتی تھی۔ اگر وہ بجائے اس بھدی بتی کے کوئی لیمپ یا لالٹین استعمال کرتا تو بہت موزوں اور مناسب ہوتا۔ مگر عجیب بات تو یہ ہے کہ اس کو اس بتی سے بہت پیار تھا۔ اور مجھ کو بعد میں اسی بتی کا آسیب ہو گیا۔ تو خیر ہم اپنے اس چھوٹے سے جہاز میں روانہ ہوئے۔ اور ایک کامیاب سفر کے بعد بخیر و عافیت جنوبی امریکہ کے ساحل پر پہنچ گئے۔ کپتان نے مجھے حکم دیا کہ میں خشکی پر جا کر آس پاس کا علاقہ اچھی طرح دیکھ بھال لوں۔ چنانچہ ضروری تحقیق کے بعد میں واپس آیا۔ مگر جب ناخدا نے میرا بیان سنا تو اس نے اپنی ہدایات کی فہرست اور نقشے کو دیکھ کر جہاز کا رخ ذرا مشرق کی طرف کر دیا اور [illegible] جب تک

میں ہم ساحل پر جا پہنچے۔ میں جہاز کے بہاؤ کو بنظر غائر دیکھتا رہا۔ کیونکہ ہم اس نامعلوم ساحل پر موجوں کے رخ سے بالکل ناآشنا تھے۔ ہمیں حیرانی تھی کہ ناخدا نے کیوں ابھی تک لنگر نہیں ڈالا۔ مگر دریافت کرنے پر اس نے کہا کہ ہمیں جہاز پر سے بطور نشانی کے روشنی دکھانی چاہیئے۔ اور اس کے جواب میں کسی روشنی کا انتظار کرنا چاہیئے۔ چنانچہ ہم نے بہت انتظار کیا مگر کوئی ایسی روشنی ساحل پر نمودار نہ ہوئی۔ ہوا بالکل بند تھی اور ستارے چمک رہے تھے۔ کم از کم ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد بجائے روشنی کے ہم کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کشتی جس میں دو آدمی سوار تھے۔ ہماری طرف آ رہی ہے

ہم نے ان کو آواز دی اور جواب میں انھوں نے کہا کہ "ہم دوست" ہیں اور ساتھ ہی ہماری کشتی کے نام سے انھوں نے ہمیں پکارا۔ چنانچہ وہ دونوں ہمارے جہاز پر آ گئے۔

ان میں سے ایک نے ہمارے ناخدا کو ایک رقعہ دیا جو اس نے مجھے بھی دکھایا۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ وہ حصۂ ساحل جہاں ہم ٹھیرے ہیں پرانی حکومت کے جاسوسوں کی جولانگاہ ہونے کی وجہ سے غیر محفوظ ہے اور آپ حاملانِ رقعہ کو اجازت دیں کہ جس مقام پر وہ مناسب سمجھیں آپ کے جہاز کو لے جائیں۔ رقعہ دینے کے بعد ان میں سے ایک تو واپس چلا گیا اور دوسرے نے رقعہ کے مضمون کے مطابق جہاز کو اپنی تحویل میں کر لیا۔ اس شخص نے ہمارے جہاز کو دوسرے دن کی دوپہر تک ساحل سے بہت فاصلے پر رکھا کیونکہ بظاہر اس کی ہدایات میں یہ بات شامل تھی کہ اس کو ساحل سے اتنی دور رکھے کہ اس پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔ چنانچہ سہ پہر کو اپنے جہاز کا رخ بدلا اور دوسری بار ساحل کے نزدیک آئے۔ اس وقت تک کوئی آدھی رات گذر چکی ہوگی۔

یہ شخص جسے ہمارے جہاز کا راہبر بنایا گیا تھا۔ بدنیت اور بدمعاش سا معلوم ہوتا تھا۔ بدن کا پتلا، بزدل، اور پہلے درجے کا جھگڑالو تھا۔ اور خواہ مخواہ ہمارے آدمیوں سے بدزبانی سے پیش آتا تھا۔ ہمارے آدمی اس کی سختی سے اس قدر تنگ آ گئے کہ ان میں سے ہر ایک تیار تھا کہ اسے دھکے دے کر سمندر میں گرا دے۔ مگر میں نے انھیں روکے رکھا اور سمجھایا کہ چونکہ ہدایت کے مطابق ہمیں یہ شخص بطور رہبر کے دیا گیا ہے۔ اس لئے [illegible] سے درگذر کا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ مگر شومئ قسمت سے شام کے [illegible] اس کے اور میرے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ جہاز بنا [illegible] کے ذخیرے میں گھس جائے مگر میں نے اسے روکا اور کہا کہ یہ [illegible]

قواعد کے خلاف ہے۔ اس پر وہ بڑا برہم ہوا اور مجھے ایک طرف دھکیل کر چاہتا تھا کہ تیزی سے میرے پاس سے گذر جائے مگر میں نے بھی اس کے جواب میں اس کو دھکا دیا اور وہ گر گیا۔ مگر فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور چاقو سے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے چاقو تو اس کے ہاتھ سے چھین کر سمندر میں پھینک دیا اور تین چار تھپڑ اس کے بدوضع منہ پر رسید کئے۔ مار کھا کر اس نے ایک تیز زہر آلود نگاہ مجھ پر ڈالی جس کا مطلب اس وقت تو میں نہ سمجھا مگر بعد میں میرے آلام اور مصائب نے اس نگاہ کے مفہوم کو مجھ پر پوری طرح واضح کر دیا ساحل کے قریب آ کر ہم نے اس کی ہدایت کے مطابق لنگر ڈالا۔

گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا اور ہوا بالکل بند تھی: ناخدا ہمارے دو آدمیوں سمیت پہرے پر تھا۔ اس راہبر کے سوا باقی سب لوگ نچلے تختے پر چلے گئے تھے اور وہ سانپ کی طرح کنڈلی مارے جہاز کے اگلے حصے پر لیٹا تھا۔ میرا پہرہ چار بجے صبح شروع ہوتا تھا۔ مگر میں رات کی ہیئت راہبر کے انداز اور عام صورتِ حالات سے ہرگز مطمئن نہ تھا اور اس لئے تن بتقدیر وہیں پڑا رہا۔ سونے سے قبل آخری واقعہ جس کا مجھے علم ہے یہ تھا کہ ہمارے ناخدا نے آہستہ سے میرے کان میں کہا کہ میں بھی صورتِ حالات سے سخت غیر مطمئن ہوں اور نیچے جا کر اپنی ہدایات کی فہرست کو میں پھر دیکھتا ہوں۔ یہ آخری واقعہ تھا جو مجھے یاد ہے۔ اس کے بعد مجھ پر نیند غالب آ گئی اور میں سو گیا۔ دنگے فساد کے شور نے مجھے بیدار کر دیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ میرے منہ میں کپڑا ٹھونسا جا رہا ہے۔ ایک آدمی میری چھاتی پر اور دوسرا ٹانگوں پر سوار ہے۔ چنانچہ آن کی آن میں میری مشکیں کس لی گئیں۔

ہمارا جہاز ہسپانیہ والوں یعنی پرانی حکومت کے آدمیوں کے قبضے میں تھا جو کثیر تعداد میں دھڑا دھڑ اس پر آ رہے تھے۔ میں نے متواتر چھ بھاری چیزوں کے پانی میں گرنے کی آوازیں سنیں۔ ایک شخص نے میرے سامنے کپتان کے دل میں خنجر گھونپ کر اسے ہلاک کر دیا۔ اور اس کے بعد جلد ہی پانی میں گرنے کی ساتویں آواز کو میں نے سنا۔ میرے سوا ہمارے جہاز کے باقی سب آدمیوں کو قتل کر کے سمندر میں پھینک دیا گیا۔ مگر میری جان بخشی کیوں کی گئی؟ اس بھید کو میں اس وقت سمجھا جب وہ خبیث راہبر اپنی لالٹین ہاتھ میں لئے میرے اوپر یہ دیکھنے کے لئے جھکا کہ میں کون ہوں۔ اس وقت ایک شیطانی مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمایاں تھی اور اس نے اپنے سر کو اس طرح حرکت دی گویا کہتا ہے کہ تم وہی ہو جس نے مجھے دھکا دیا تھا اور میرے منہ پر تھپڑ لگائے تھے۔ اب میں تمہیں اس کا مزہ چکھاؤں گا۔

میں نہ ہِل سکتا تھا اور نہ بول سکتا تھا۔ مگر میں دیکھ سکتا تھا کہ ہسپانیہ والے بڑی سرعت سے جہاز کا سامان اُتارنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

چنانچہ وہ چند چھوٹی کشتیوں کو جہاز کے پاس لائے۔ اور ان میں تمام اسباب لاد کر ان کو یکے بعد دیگرے روانہ کر دیا۔ ان کے تمام آدمی بڑی سرگرمی سے کام کر رہے تھے۔ مگر وہ خبیث اور ناپاک شخص لالٹین ہاتھ میں پکڑے وقتاً فوقتاً میرے پاس آکر مجھے دیکھتا اور اسی انداز سے مسکراتا اور سر سے اشارہ کرتا۔ اس کی روش نے مجھے بہت خائف کر دیا۔ میرے ہاتھ پاؤں اور تمام اعضا جکڑے ہوئے تھے۔ منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ اور میں ہلنے سے بالکل عاجز تھا۔ میری حالت موت سے بدتر تھی۔ رات بیت رہی تھی۔ ہسپانی حکومت کے کارندے ہمارے جہاز کا بہت سا اسباب کشتیوں میں روانہ کر چکے تھے۔ مگر بہت سا ابھی باقی تھا اس کو وہ نہ لے جا سکے۔ اور دن کی روشنی نمودار ہونے سے پہلے پہلے جہاز کو چھوڑ کر بھاگ گئے ظاہر تھا کہ میرا دشمن ہسپانوی حکومت کا جاسوس تھا جس نے اپنی عیاری سے ان لوگوں کا اعتبار حاصل کیا تھا جن کو ہمارے جہاز کا سامان وصول کرنا تھا۔ وہ یا اس کے مالک کسی طرح ہمارے جہاز کے سامان کی نوعیت کو سمجھ گئے تھے۔ اسی لئے وہ جہاز کو رات کے وقت ایک ایسے مقام پر لے گیا جہاں وہ بے خطر اور بآسانی جہاز کو لوٹ سکیں۔ یہ سب کچھ عیاں تھا۔ مگر یہ کہ اس جاسوس کا اب مجھ سے کیا مطلب ہے یا وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتا ہے۔ یہ ایک ایسی بات تھی جو میری سمجھ سے باہر تھی۔

مگر جو کچھ اس نے مجھ سے کیا اس کی داستان سُن کر آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔

جب ہسپانوی ڈاکو قتل و غارت کے بعد جہاز کو چھوڑ کر چلے گئے تو وہ جاسوس اور دو ہسپانوی ملاح ٹھیرے رہے۔ یہ ملاح مجھ کو اسی بے بسی کی حالت میں جہاز کے عرشے میں لے گئے اور انھوں نے مضبوط رسیوں کے ساتھ مجھے فرش کے ساتھ جکڑ دیا۔ اس طرح کہ میں کروٹ تو بدل سکوں مگر فرش پر لیٹ کر اپنی جگہ تبدیل کرنا میرے لئے ناممکن تھا مجھے اس طرح باندھ کر وہ دونوں چلے گئے۔ اور میں تقریباً پانچ منٹ تک اس سخت تاریکی میں رہا۔ اذیت اور خوف کے مارے میرا دل اس تیزی سے دھڑک رہا تھا گویا پسلی کے باہر جا پڑے گا۔ اس کے بعد وہ جاسوس تنہا آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ہمارے جہاز ران کا وہی چھوٹا سا شمعدان اور دوسرے میں ایک

لمبا اور سوتی دھاگے کا ایک بنڈل تھا جس کو تیل سے اچھی طرح چرب کیا گیا تھا موجود تھا۔ اس نے شمعدان کو جس میں ایک ننھی موم بتی جل رہی تھی فرش پر میرے منہ سے کوئی دو فٹ دور دیوار کے پاس رکھ دیا۔ اس کی روشنی مدھم سی تھی تاہم اس کی مدد سے میں نے دیکھا کہ فرش پر بارود کے تقریباً ایک درجن پیپے میرے آس پاس رکھے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھتے ہی میں اس کی تمام تجویز کو فوراً سمجھ گیا۔ اور بھیانک انجام کا نقشہ ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ خوف و ہراس سے میں کانپ اٹھا اور پسینہ پسینہ ہو گیا۔

اس کے بعد وہ بارود کے ایک پیپے کی طرف جو دیوار کے ساتھ پڑا تھا گیا۔ اور اپنے برمے سے اس کے ایک پہلو میں سوراخ کیا حتیٰ کہ سیاہ بارود اس میں سے نکل کر اس کی ہتھیلی پر گرنے لگا۔ ایک مٹھی بھر مقدار کے نکال لینے کے بعد اس نے سوراخ کو دھاگے کی گولی کا ایک سرا ٹھونس کر بند کر دیا اور وہ بارود جو اس کی مٹھی میں تھا دھاگے کی تمام لمبائی پر اچھی طرح سے مل دیا۔ اس طرح کہ بال بھر جگہ بھی خالی نہ رہی۔ اس سے فارغ ہو کر دوسری بات جو اس شیطان سیرت جاسوس نے کی یہ تھی کہ دھاگے کے دوسرے سرے کو جلتی ہوئی موم بتی کے پاس لایا اور شعلے سے نیچے بتی کی لمبائی کے ایک تہائی فاصلے پر اس کو بتی کے گرد لپیٹ دیا اور کئی پیچ دیئے پھر اس نے میرے تمام اعضا اور رسیوں کو بغور دیکھا اور اطمینان کر لیا۔ وہ مضبوطی سے جکڑے ہوئے ہیں اور کوئی بند ڈھیلا تو نہیں ہے۔ اس کے بعد بڑی متانت سے میرے سر کی طرف بڑھا اور آہستہ سے میرے کان میں کہنے لگا۔ اب تم جلد ہی جہاز کے پرزوں کے ساتھ ہی فضاء بالا کی سیر کرو گے۔ یہ کہہ کر وہ نابود ہو گیا۔ اور میری آنکھیں اُسی ساعت سے موم بتی پر گڑ گئیں۔ اور میں اُس فاصلے کے ذریعے سے جو بتی کے شعلے اور دھاگے کے درمیان تھا اپنی درازیٔ حیات کا تخمینہ لگانے لگا۔ میرا قیاس تھا کہ معمولی حالت میں دو گھنٹے میں شعلہ دھاگے تک جا پہنچے گا۔ گویا میں اپنی زندگی کو شمع کے ساتھ جلتے اور گھٹتے دیکھ رہا تھا۔ مگر میں کا مداوا کرنے سے محض عاجز تھا۔ وسیع سمندر کی ویران سطح پر تنہا، مقید، جہاز کے پیندے کے تختوں سے سختی سے جکڑا ہوا، زبان بند۔ میں نہ اپنی مدد آپ کر سکتا تھا اور نہ دوسروں کو اپنی مدد کے لئے بلا سکتا تھا۔ اگرچہ میں موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہر لحظہ قریب سے قریب تر آتے دیکھ رہا تھا لیکن حیرت ہے کہ اس ہولناک انجام کے تصور نے قبل اس کے

دھاگا اور بارود کے کنستر مل کر میرا خاتمہ کر دیتے مجھے مار نہ ڈالا وقت کا کچھ حصہ تو میرے ہوش و حواس بجا رہے مگر آخر عذابِ تخیل کی شدت نے مجھے بے ہوش کر دیا۔ خدا جانے کتنا عرصہ وہ غشی مجھ پر طاری رہی۔ خفیف سا ہوش آنے پر میں نے اپنے ہاتھوں کو چھڑانے کی دیوانہ وار کوشش شروع کی۔ مگر جوں جوں میں اپنے بازوؤں کو زور سے تانتا اور کھینچتا وہ رسیاں میرے گوشت میں اور بھی گہری کھبتیں۔ یہاں تک کہ میرے بازو خون کی وجہ سے لہولہان ہو گئے۔ باوجود اس تمام جد و جہد کے میں اپنے بازوؤں کو حرکت دینے پر قادر نہ ہو سکا۔ ٹانگوں کو آزاد کرنے کا اس سے بھی بہت کم امکان تھا۔

خلاصی کی یہ کوشش جان توڑ کوشش تھی۔ میرا دم ٹوٹنے لگا۔ آپ کو یاد رہے کہ میرے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا جس کی وجہ سے میں منہ سے سانس نہیں لے سکتا تھا اور صرف ناک کے رستے پورا بھر کر سانس لینا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اس بے سود زور آزمائی سے تنگ آ کر آخر میں نے یہ کوشش چھوڑ دی اور چپ چاپ پڑ رہا۔

تھوڑا سا آرام لینے کے بعد میرا سانس پھر درست ہو گیا۔ میری آنکھیں موم بتی پر گڑی ہوئی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے مجھے خیال آیا کہ سانس کو اکٹھا کر کے پورے زور سے بتی کو پھونک لگاؤں کہ شاید اس طرح شعلہ بجھ جائے۔ مگر بتی مجھ سے اس قدر دور تھی کہ سانس کی ہوا کا وہاں تک پہنچنا محالات سے تھا۔ پھر بھی حالتِ اضطرار میں نے بار بار کوشش کی مگر بتی نہ بجھی پر نہ بجھی۔ اس تمام وقفے میں بتی کا گل دم بدم بڑھتا گیا۔ اور شعلے اور دھاگے کا درمیانی فاصلہ جس پر میری زندگی کا دار و مدار تھا کم سے کمتر ہوتا گیا۔ اور میں نے اندازہ کیا کہ شاید ڈیڑھ گھنٹہ میری زندگی کا باقی ہے صرف ڈیڑھ گھنٹہ! کیا یہ ممکن تھا کہ اس عرصے میں کوئی کشتی کنارے سے میرے جہاز کی طرف آئے۔ ساحل خواہ ہمارے دشمنوں کے قبضے میں ہو یا دوستوں کے قبضے میں، دیر و زود کوئی کشتی جہاز کی تفتیش کے لئے ضرور یہاں آئے گی، کیونکہ میرا جہاز ایک اجنبی جہاز تھا۔ مگر جس بات سے مجھے سب سے زیادہ سروکار تھا یہ تھی کہ کتنی جلدی؟ میرے قید خانے کے چھت میں تختوں کے درمیان ایک درز تھی جس سے باہر کی کچھ روشنی اندر آتی تھی۔ ابھی بہت سویرا تھا۔ ساحل پر قریب و جوار میں کوئی آبادی نہ تھی۔ اور اس پر طرہ یہ کہ ہوا بالکل ساکن تھی۔ اگر میری زندگی کے چھ گھنٹے [illegible] باقی ہوتے تو کسی کشتی کے ادھر آنے کا امکان ہو سکتا تھا۔ مگر موجودہ حالات میں

ڈیڑھ گھنٹے کے اندر جو گھٹ کر اب سوا گھنٹہ رہ گیا تھا میرے بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی۔ اتنی سویرے ایک بالکل غیر آباد جگہ اور ایسی پُرسکوت فضا میں میری مدد کو کون پہنچ سکتا تھا۔ اس تلخ حقیقت کو محسوس کر کے میں نے پھر ایک جنون کی سی حالت میں ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے اور اس طرح اپنے زخموں کو اور گہرا اور خوں چکاں کر لیا۔ درد کی شدت سے مجبور ہو کر میں نے ایک دفعہ اور اس لاحاصل کوشش کو چھوڑ دیا اور بے حرکت پڑا رہا مگر میرے کان کسی کشتی کے چلنے کی آواز کے سخت منتظر تھے لیکن افسوس کوئی ایسی آواز نہ آئی۔ سمندر پر چاروں طرف سناٹے کا عالم تھا۔ سوا گھنٹہ! میرے اللہ! پاؤ گھنٹہ میں بتی کا گل خوفناک سرعت کے ساتھ بڑھ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب یہ جلد ہی گر پڑے گا۔ اور اگر گر کر یہ اس دھاگے کے اوپر جا پڑا تو بس میری زندگی کا خاتمہ ہے۔ اس صورت میں میری مدتِ حیات دس منٹ سے زیادہ نہ ہو سکتی تھی۔

اس انکشاف نے میرے دماغ میں خیالات کی ایک نئی رو پیدا کر دی۔ میں سوچنے لگا کہ بارود کے دھماکے سے ہوا میں اڑ کر مرنا کس قسم کی موت ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ دردناک اور مشکل ہو۔ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا ناگہان اور جلد واقع ہونا اس کی تکلیف کو کم کر دے۔ شاید ایک ہی زور کا بھبکا میرے اندر یا باہر یا دونوں جگہ میرے مایۂ حیات کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے لئے کافی ہو اور اس کے زور سے میرا جسم ایک چشم زدن میں ہزارہا چھوٹے چھوٹے ریزوں کی شکل میں فضا میں اڑ جائے۔ میں یہ تصور کرنے سے قاصر تھا کہ اس قسم کی موت کیا احساس پیدا کرے گی۔ اور اس پر بھی کہ یہ واقعہ ہائلہ کس طرح سے ظہور میں آئے گا۔ الغرض اسی الجھن میں غلطاں و پیچاں میرے حواس ایک دفعہ اور مجھ سے رخصت ہو گئے۔

جب پھر مجھے کچھ ہوش آیا اور ہوش کے ساتھ قوتِ تخیل بھی لوٹ آئی تو میں نے دیکھا کہ بتی کا گل پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ لمبا ہو گیا تھا۔ شعلہ دھوئیں میں گھرا ہوا تھا اور گل کا نچلا حصہ اتنا موٹا اور بھاری ہو گیا تھا کہ میرا خیال تھا کہ ابھی گرا کہ گرا۔

اس مایوسی اور ہول نے میرے خیالات کو ایک اور طرف پھیر دیا۔ میں نے اپنے دل میں خدا کی بارگاہ میں دعا کرنے کی کوشش کی۔ دل ہی میں کیونکہ منہ میں کپڑا ہونے کی وجہ سے میں بول نہ سکتا تھا۔ میں ہر چند کوشش کرتا مگر جلتی ہوئی بتی کی ہر لحظہ گھٹنے والی لمبائی میرے خیالات کو چھوڑ منتشر کر دیتی۔ آخر آنکھوں کو بند کر کے ایک سمت کوشش کے بعد میں [illegible]

کو ایک روحانی مرکز پر لانے میں کامیاب ہوگیا اور ایک مختصر سی دعا میرے دل کی گہرائیوں سے اوپر کو اٹھتی ہوئی معلوم ہوئی جس کا مفہوم یہ تھا کہ اے میرے پروردگار میری بوڑھی ماں اور میری بہن کو برکت دیجیو اور میرے گناہوں کو بخشیو۔ اتنے میں میری آنکھیں خود بخود پھر کھل گئیں۔ اور اس روح فرسا بتی کے نظارے نے میری تمام روحانی اور دماغی یکسوئی کو جلا کر راکھ کر دیا۔

دنیا و مافیہا سے بے خبر میرے خیالات اس وقت بتی کے جلتے ہوئے گل پر مرکوز تھے۔ اس وقت مجھے اور کسی چیز کا احساس نہ تھا۔ آخر یہ گل ذرا اور بھی بڑھا، کچھ لرزا اور ایک طرف جھکا۔ پھر اپنی آتشیں سرخی و سیاہی کو لئے ہوئے بارود آلود دھاگے کو چھوئے بغیر شمعدان کے پیندے پر آ پڑا۔ گویا ایک خطرے سے تقدیر نے مجھے بچا لیا مگر دوسرے خطرے کا علم اور اپنے مہلک انجام کا یقین مجھے دیوانہ کئے دیتا تھا۔ یہاں تک کہ خوف اور گھبراہٹ کی شدت نے مجھے پھر ایک دفعہ بیہوش کر دیا۔ جب میرے حواس کچھ ٹھکانے ہوئے تو میں نے چاہا کہ صبح کی روشنی کو جو چھت کی درزیں سے آنی شروع ہوگئی تھی دیکھوں مگر بتی کے شعلے میں کسی زبردست طلسم کی طاقت تھی کہ میری آنکھوں کو اپنے پر سے ہٹنے ہی نہ دیتی تھی۔ میں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ کسی طرح اُن کو اس درز کی طرف پھیروں مگر مجھ سے ایسا نہ ہوسکا اس شعلے سے میری سخت جنگ تھی اور اس جنگ میں مجھے نیچا دیکھنا پڑا شعلے کی طاقت میری تمام جسمانی، دماغی اور روحانی طاقتوں پر غالب تھی اور میں بدستور ٹکٹکی باندھے اس روح فریب آتشیں جادو کو دیکھتا رہا۔ آنکھوں کو بند کرنا بھی میرے لئے محال ہوگیا۔ گل دوسری بار بڑا ہونے لگا اور شعلے اور دھاگے کا درمیانی فاصلہ صرف ایک انچ یا اس سے بھی کچھ کم رہ گیا۔

میں اس فکر میں غرق تھا کہ یہ ایک انچ مجھ کو کتنا وقت اور زندہ رہنے دے گا۔ پون گھنٹہ؟ نصف گھنٹہ؟ پچاس منٹ؟ بیس منٹ؟ یا کیا؟ سکون و آرام سے جلتا ہوا ایک انچ بھر موم بیس منٹ سے زیادہ جلے گا۔ ایک انچ بھر موم! اس بات کے تصور نے کہ ایک انچ بھر موم ایک انسان کے جسم و روح کی مصاحبت کو بیس منٹ کے لئے مفارقت سے روک سکتا ہے۔ مجھے بحر تحیر میں ڈال دیا کیا یہ تعجب انگیز نہیں کہ جس بات سے دنیا کا طاقتور سے طاقتور بادشاہ بھی معذور ہے اس پر ایک انچ بھر موم کو قدرت ہو۔ میں ابھی اُدھیڑ بن ہی میں تھا کہ شعلے کے سمٹنے میری تمام جولانی خیال [illegible] ایک دفعہ [illegible] سے وقفے کے

بعد میں پھر سوچنے لگا مگر اس دفعہ کچھ عجیب انداز سے خیالات کے جوش سے دماغ ابل رہا تھا معلوم ہوتا تھا کہ شاید ان کی حدت میرے سر کو پھاڑ دے گی۔ اس اندرونی طوفان کے دوران میں میں نے دیکھا کہ میری ماں اور بہن دونوں بالجسد میرے پاس موجود ہیں اور میری بہن حسب عادت مسکرا رہی ہے۔ یکلخت اس کی مسکراہٹ گریہ و بکا سے بدل گئی۔ اور وہ چیختی چلاتی مدد کے لئے آوازیں دیتی ہوئی آتشیں غبار میں گھومنے لگی پھر اس کی آوازیں بتدریج مدھم ہونے لگیں۔ حتےٰ کہ بالکل خاموش ہو گئیں اور سناٹا چھا گیا۔ وہ جل گئی تھی۔ آتشیں غبار نے اس کو بھسم کر دیا ایسا معلوم ہوا گویا ہر ایک چیز اس غبار میں لپٹی ہوئی ہے۔ ہر ایک جگہ اور ہر ایک چیز پر وہ دھند چھا گئی۔ تمام جگہ آگ ہی آگ دکھائی دیتی تھی۔ آخر اس ہولناک بادل نے مجھے بھی سمیٹ لیا اور میرے ہوش رخصت ہو گئے۔ ساتھ ہی وہ جہاز، سمندر، میری اپنی ذات غرض کہ تمام کائنات اور اس کے احساسات بھی جاتے رہے۔ اور میں غشی کے بے پایاں خلا میں تیرنے لگا۔

اس کے بعد کے واقعات کا مجھے کوئی علم نہیں۔ یہاں تک کہ میں ایک نفیس اور آرام دہ بستر میں بیدار ہوا۔ مجھ جیسے دو گنوار میرے سرھانے کھڑے تھے۔ اور ایک شائستہ اور مہذب سا آدمی پائنتی کی طرف کھڑا میری طرف غور سے تک رہا تھا۔ صبح سات بجے کا وقت معلوم ہوتا تھا۔ میری نیند یعنی وہ حالت جو مجھے نیند جیسی معلوم ہوتی تھی لگاتار آٹھ ماہ اور اس سے کچھ زائد عرصے تک رہی۔ میں اپنے ہموطنوں کے درمیان تھا۔ وہ موٹے سے آدمی میرے محافظ تھے اور شریف وضع شخص ڈاکٹر۔ ان آٹھ مہینوں میں میں نے کیا کہا اور کیا کیا مجھے اس کا کوئی علم نہیں اور نہ کبھی ہوگا میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں ایک ایسی حالت سے بیدار ہوا جو مجھے ایک لمبی نیند معلوم ہوتی تھی بیداری کے دو مہینے بعد ڈاکٹر نے مجھے چند ایک سوال پوچھنے کی اجازت دی۔

ساحل کا وہ حصہ جہاں ہمارا جہاز لے جایا گیا تھا ایسا علیٰحدہ اور غیر آباد واقع ہوا تھا کہ ہسپانوی ڈاکوؤں کو یقین ہوگیا کہ اگر وہ قتل و غارت کی مہم کو رات کے پردے میں سر انجام دینا چاہیں تو کوئی طاقت ان سے متعرض نہیں ہوگی۔

مجھے خلاصی دینے والے خشکی سے نہیں بلکہ سمندر ہی سے آئے

ایک امریکی جہاز نے دن چڑھے میرے والے جہاز کو دیکھا۔ اور چونکہ کپتان کے پاس سکونِ ہوا کی وجہ سے فالتو وقت تھا اور میرا جہاز ایک ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں کسی جہاز کے ٹھیرنے کی کوئی وجہ نہ ہو سکتی تھی۔ اس لئے اس نے اپنے چند ملاحوں کو ایک کشتی میں بھیجا کہ ضروری حالات دریافت کریں۔

جہاز کو خالی اور غیر آباد پا کر جب وہ لوگ اندر آ گئے تو انھوں نے بیندے پر ایک خفیف سی روشنی جلتی ہوئی دیکھی۔ جب وہ لوگ نیچے اترے تو شعلہ اُس بارود آلود رسّی سے صرف ایک باریک دھاگے کی موٹائی کے فاصلہ پر تھا۔ اور اگر ان کا افسر جو ایک تیز فہم اور عقلِ رسا کا مالک تھا فوراً اس رسّی کو اپنے چاقو سے دو ٹکڑے نہ کر دیتا تو بلاشبہ وہ لوگ میرے اور میرے جہاز سمیت ایک آن کی آن میں فنا ہو چکے تھے۔ ان سفاک ہسپانیوں کا کیا حشر ہوا اور وہ اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے یا نہیں اس کے متعلق بھی میں نے اُس دن سے لے کر آج تک کچھ نہیں سنا۔

جہاز کے متعلق مجھے اتنا معلوم ہوا کہ وہ اُن امریکنوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ انھوں نے مجھے اسی بے ہوشی کی حالت میں میری زادبوم میں پہنچا دیا ہے۔ اور اس کے قریباً ایک سال بعد صحت یاب ہو کر میں شفاخانے سے نکلا۔ اب میں بفضلِ خدا بھلا چنگا ہوں۔ اتنا ضرور ہے کہ اس ظالم شمعدان کا تصور جب کبھی بھی میرے دماغ میں آ جائے مجھ کو پسینے میں شرابور کر دیتا ہے اور میں مارے خوف کے کانپنے لگتا ہوں ✦

ترجمہ

پروفیسر عبدالرحمٰن ایم۔ اے

کیسی ہے تیری پریت

سجن! کیسی ہے تیری پریت

رونے سے ہے کام کسی کو

تُو گاتا ہے گیت

سجن! کیسی ہے تیری پریت

سولی پر وہ جیون کاٹے

تو ہو جس کا میت

سجن! کیسی ہے تیری پریت

چیت چُرا کر آنکھ چُرانا

اُلٹی ہے یہ ریت

سجن! کیسی ہے تیری پریت

وہ رات

اب تک ہے یاد وہ شبِ مہتاب ہمنشیں
جو بن کے رہ گئی ہے بس اک خواب ہمنشیں

تیرے لبوں پہ چھایا ہوا اک سرور تھا
ہلکے سے اک لطیف تبسّم کا نور تھا

مخمور چاندنی میں ترا پیکرِ حسیں!
معلوم ہو رہا تھا کوئی خوابِ عنبریں

اترا ہوا تھا عرش سے اک کیفِ سرمدی
پھیلی ہوئی تھی بربطِ زہرہ کی راگنی

تیری حسین زلفوں پہ تھی چاندنی نثار
قربان ہو رہی تھی ترے جسم پر بہار

زلفوں کی طرح بکھرے ہوئے تیرے ہار تھے
میرے حواس تیری نظر پر نثار تھے

تیری ہر ایک سانس میں تھی مے ملی ہوئی
میرے جوان دل کی کلی تھی کھلی ہوئی

بھولا ہوا تھا میں کہ مری اوقات کیا مری
دنیا سے کھو چکی تھی مجھے میری بیخودی

میں تھا مرا غرور تھا اور تیری ذات تھی
اے ہمنشیں وہ رات بھی کیا مست رات تھی

وہ رات پھر بھی آئے گی کیا؟ پوچھتا ہوں میں
اُس رات کی تلاش میں کھویا گیا ہوں میں

عدمؔ

احسن الکلام

نام کس بنیاد پر لوں عشقِ بے بنیاد کا
یاد ہے سر پھوڑ کر مرنا مجھے فرہاد کا

جب سے دیکھا ہے نشیمن بلبلِ ناشاد کا
اپنے گھر میں دل ذرا لگتا نہیں صیاد کا

روز کی پامالیوں سے تنگ ہے ہر چند دل
در نہیں چھٹتا ہے لیکن اک ستم ایجاد کا

موسمِ گل آتے ہی کلیوں کی باچھیں کھل گئیں
شورِ بلبل بن گیا نغمہ مبارکباد کا

کاٹ دی شہ رگ مری دھوکے میں ہفت اندام کے
زندگی سے تنگ تھا ممنون ہوں فصاد کا

دل سمجھتا ہے کہ میں جاتا ہوں کوئے یار میں
میں سمجھتا ہوں مسافر ہے عدم آباد کا

آپ کی تصویر نے اس کو کیا عالم شناس
آپ کی تشہیر سے شہرہ ہوا بہزاد کا

ایک میری سخت جانی کب تک آڑے آئیگی
دل ترا پتھر کا ہے خنجر ترا فولاد کا

اے سرشکِ غم برس! اے آہِ پرتاثیر چل!
وہ اٹھانا چاہتے ہیں لطف ابر و باد کا

اپنے ہم پیشے کی ناکامی سے خوش ہوتا ہے کون
کیوں نہ مجھ کو رنج ہو محرومیٔ فرہاد کا

ہوں اسی بحرِ رواں کا میں بھی احسن اک حباب
فیض ہے دنیا میں جاری جس جہاں استاد کا

احسن مارہروی

مغربی تہذیب

(۱)

اُس مسابقت کی بنا پر جو مشرق کو مغرب سے ہے اکثر و بیشتر ہم مغربی تہذیب پر نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں لیکن باوجود اس نکتہ چینی کے ہم اُس کے اثرات سے نہیں بچ سکے۔ مشرق اس وقت مغربیت کے رنگ میں رنگا جا رہا ہے۔

لیکن یہ رنگ محض سطحی ہے۔ ہم ظواہر کو مغربی تہذیب تصور کر کے اُن پر کاربند تو ہو جاتے ہیں لیکن جب جغرافیائی اور اقتصادی حالات کی بنا پر چند مجبوریاں سدِ راہ ہوتی ہیں تو ان سے بیزار ہو کر مغربی تہذیب پر نکتہ چینی شروع کر دیتے ہیں اور یہ محض اُن ظاہری اثرات کے متعلق خوردہ بینی تک ہی محدود رہتی ہے۔ تہذیب کو جس سے مراد وہ اصول، طریق اور دستور ہوتے ہیں جن کی مدد سے فرد کو اس کی ذات اور اس کی جماعت کے لئے مفید بنایا جاتا ہے سمجھنے کی ہم کبھی کوشش نہیں کرتے۔ ہم نے ان معانی میں مغربی تہذیب کو جاننے کی شاذ و نادر ہی کوشش کی ہوگی۔ بسا اوقات تہذیب اور اس سے پیدا ہونے والے ظواہر میں تمیز نہیں کی جاتی۔ تہذیب بنیادی اصولوں کا مجموعہ ہوتی ہے اور ظواہر اس تہذیب سے پیدا ہونے والے ان ضمنی اثرات پر مشتمل ہوتے ہیں جن میں وضع قطع، چال ڈھال، طرزِ گفتار، اطوار، سلیقہ اور لباس وغیرہ سی چیزیں شامل ہیں۔ اکثر جب ہم کسی تہذیب پر نکتہ چینی کرتے ہیں تو اُس وقت تہذیب سے ہماری مراد اس کے یہی ظواہر ہوتے ہیں۔ حالانکہ ان ظواہر کی اتنی اہمیت نہیں ہونی چاہیئے جتنی کہ اس تہذیب کے بنیادی اصولوں کو حاصل ہے۔

اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو مغربی تہذیب کی تہہ میں جتنے بھی اصول کارفرما ہیں ان سب کی بنا فقط ایک خیال ہے۔ اس خیال کو خواہ مطمحِ نظر کہیں یا نصب العین کے نام سے موسوم کریں کوئی خاص فرق نہیں پڑیگا۔ قرونِ وسطیٰ میں تمام مغرب کی ذہنیت میں ایک تبدیلی واقع ہوئی جسے نشاۃ ثانیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ نشاۃ ثانیہ سے پہلے دنیا اور خاصکر مغرب کا نصب العین رہبانیت کی تحریک سے نفس کشی یا اہانتِ نفس تھا لیکن اس کے بعد یہ نصب العین بدل گیا اور اس کی جگہ ایک ایسے نصب العین نے لی جو اس کے بالکل ضد تھا یعنی اثباتِ نفس۔ اب چونکہ لوگوں کا مطمحِ نظر بالکل مختلف ہو گیا تھا۔ وہ نفس کشی، ترکِ نفس، نفیِ خودی، گوشہ نشینی وغیرہ کو بھول کر اثباتِ خودی کے قائل ہو گئے۔ اور ان میں احساسِ فروتنی کے دور ہونے سے احساسِ برتری پیدا ہو گیا جس کا لازمی نتیجہ انفرادیت یا ارتقائے شخصی تھا۔

مغربی تہذیب کی تہہ میں جو پانچ بنیادی اصول کارفرما ہیں۔ ان میں سے سب سے پہلا اور سب سے زیادہ اہم ارتقائے تشخص کا خیال ہے۔ باقی کے چار اصول جو بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر اس سے پیدا ہوئے یہ ہیں:۔

۱۔ پابندیِ آئین ۲۔ آزادہ روی ۳۔ قومیت ۴۔ جمہوریت۔ قرونِ وسطیٰ کی بیشتر سیاسیات یا اجتماعیات میں عوام کے مختلف گروہوں یا جماعتوں کو اہمیت دی جایا کرتی تھی لیکن جونہی ارتقائے تشخص لوگوں کا نصب العین بنا یہ اہمیت فردِ واحد کو ملنے لگی۔ کیونکہ اس کی طرف سے اس کا مطالبہ پُرزور ہونے لگا تھا۔ ارتقائے تشخص سے مراد خاص اثرات پیدا کرنے کے لئے شخصیت کی جسمانی و باطنی خصوصیات کو ترقی دینا تھا یعنی اثباتِ نفس۔ اثباتِ نفس سے انسانی تگ و تاز کے لئے دو راستے کھل گئے۔ اول اجتماعیات میں تالیفِ قلوب یعنی فرد کا اپنی ذاتی خصوصیات کے طفیل جماعت میں تسلط جما کر اس کی رہبری کرنا۔ دوم قدرت میں تسخیرِ عناصر یعنی سائنس کی ترقی جس میں آرٹ بھی شامل ہے کیونکہ یہ بھی شخصیت کے نفسی تاثرات کا عناصر کے ذریعے اظہار ہوتا ہے۔

خویش را چوں از خودی محکم کنی
تو اگر خواہی جہاں برہم کنی

اگر کسی جماعت کے ایک فرد کو ایک خاص شخصیت حاصل ہو اور اس میں خودی یا "میں ہوں" کا خیال بدرجۂ اتم محکم ہو جائے تو پھر پابندیِ قانون کے بغیر اس جماعت کا قائم رہنا ناممکن ہوتا ہے۔ اس لئے انفرادیت کا اگر ایک طرف تقاضا یہ تھا کہ فرد کی ذاتی مرضی پر کوئی پابندی عاید نہ ہو اور وہ آزاد ہو تو دوسری طرف اس کو اس بات کی بھی ضرورت تھی کہ فرد کی ہستی محفوظ ہو جائے اس لئے اگر جماعت کے افراد میں آزادہ روی تھی تو اس کے ساتھ ہی اُن میں آئین کی پابندی اور قانون کے احترام کا جذبہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ لہٰذا آزادی

سے چھوڑ دی جانے لگی۔ وہ یہ تھی۔ جماعت کے اپنے وضع کردہ قوانین کو اپنے سب
پر نافذ کرنا اور ان کے سامنے تمام افراد کو مساوی حیثیت عطا کرنا۔ اس کا اثر یہ ہوا
کہ قانون نے فرد کی ذاتی آزادی کو بچایا۔ اور فرد میں آزاد رہنے کی تمنا نے قانون
کو غیر ضروری طور پر سخت، کڑا یا ناقابلِ ترمیم اور ہنگامی حالات سے بے نیاز
نہ ہونے دیا۔ اور چونکہ ضروریاتِ زمانہ کے مطابق اس میں ترمیم ہوتی گئی اس
لئے وہ ترقی کی راہ میں حائل نہ ہوا حتیٰ کہ انفرادیت زمانیت میں بدل کر تسخیرِ
قدرت کی طرف مائل ہوئی۔ سائنس نے ترقی کی اور ان ذرائع کی مدد سے
جو قدرت کو رام کرنے سے اہلِ یورپ کو ہاتھ لگے انھوں نے استیلا و غلبہ
حاصل کیا اور دنیا پر چھا گئے۔ اگر قانون ناقابلِ ترمیم ہوتا تو سائنس کی ترقی
نہ ہوتی اور اس کے ذریعے سے جو فائدہ آج یورپ کو ہوا ہے کبھی نہ ہوتا۔ انفرادیت
کا چوتھا اثر یہ تھا کہ جماعت کا ہر رکن اپنے آپ کو دوسرے رکن کے برابر سمجھنے لگا
یعنی مساوات کا خیال پیدا ہو گیا جس کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا تھا کہ شہنشاہیت کا
قلع قمع ہو جاتا اور عوام جمہوریت کے دلدادہ بن جاتے۔ جمہوریت کے معنی
ایک نکتۂ نگاہ سے یہ بھی ہونے لگے کہ ایک ایسی حکومت جس میں ہر فرد واحد
کو اپنے ذاتی جوہر یا کمال کی بنا پر برسرِکار آنے کے موقع میسر آسکے۔

ارتقائے تشخص کے نصب العین نے جو پانچویں بات اہلِ مغرب
میں پیدا کی وہ وطنیت کا جذبہ تھا۔ جماعت فرد کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اگر
فرد "دامنِ من خویش را خوئے خودی ہست" کا قائل ہوتا ہے تو جماعت
میں یہ خیال بدرجۂ اتم عملاً ظاہر ہو جاتا ہے۔ جماعت بھی اثباتِ خودی
کے اصول پر محکم ہو کر شہامت چاہنے لگتی ہے۔ لیکن اس کے لئے افراد کو
ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کرنا اور ان میں یکسانیت اور یگانگت پیدا
کرنا لازمی ہوتا ہے۔ اور یہ وہ جذبہ ہے جسے عام طور پر وطنیت یا قومیت
وغیرہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ نسلی، ملکی اور دیگر جغرافیائی حالات کی
وجہ سے کسی خاص ملک کے باشندوں میں یہ جذبہ پہلے سے موجود تو ہوتا
ہے لیکن اس کا شعوری طور پر احساس پیدا نہیں ہوا ہوتا۔ لیکن جب جماعت
میں خودی کا جذبہ پیدا ہو کر نفسِ اجتماعیہ کا اظہار یعنی استیلا اور استبداد
چاہتا ہے تو یہ جذبہ شعوری طور پر ظاہر ہو کر ان کو ایک کر دیتا ہے۔
اور چونکہ فرد کا مفاد جماعت کے مفاد کے مقابلہ میں کچھ اہمیت نہیں رکھتا
[illegible] قربان کیا جا سکتا ہے۔ مغربی تہذیب کا ایک یہ درخشاں
[illegible]ت کے وسیع مفاد کے مقابلہ میں اپنی ذات کو قربان کر
[illegible] ملک نے ایک دوسرے

کو مغلوب کرنے کی کوشش کی لیکن چونکہ وطنیت کا جذبہ ہر ملک میں [illegible]
تھا اس لئے کوئی غیر ملک دوسرے ملک پر تا دیر غلبہ قائم نہ رکھ سکا۔ اور جب
مختلف یورپین ممالک ہر اعتبار سے ایک دوسرے کے ہم پلہ ہو گئے اور استیلا
کی خواہش یورپ میں رہ کر پوری نہ ہو سکی تو انھوں نے دوسرے براعظموں
کی طرف رخ کیا۔ ایشیا، افریقہ، امریکہ، اور آسٹریلیا میں وہ کامیاب ہو گئے۔

زندگانی قوتِ پیدا استے ؛ اصلِ او از ذوقِ استیلا ستے

ان کے علاوہ ایک ضمنی نتیجہ جو انفرادیت سے مترتب ہوا۔ وہ کنبے
یا خاندان کی اہمیت کی کمی اور کنبے کی طرف سے عاید ہونے والی ذمہ داریوں کو
فرد کی آزادی پر مشتمل تھا۔ ہر بالغ شخص اپنے آپ کو اپنے سیاہ و سفید کا مالک
سمجھنے لگا۔ والدین اور بہن بھائیوں سے مل کر جو ایک کنبہ بنتا ہے اس کی
ایک حد تک تنسیخ ہو گئی۔ بعض اوقات انسان اپنے آپ کو خطرے میں محض اس لئے
نہیں ڈالتا کہ اس کے کنبے کے باقی افراد کو اس کے ہلاک ہو جانے یا اس کو
کسی قسم کے نقصان پہنچنے سے تکلیف نہ ہو۔ اگرچہ یہ ایک قسم کا ایثار ہے لیکن مانعِ
جرأت۔ اگر کنبے کے افراد کا آپس میں اس قسم کا تعلق قائم نہ رہے تو فرد چونکہ اس پر
اوروں کی طرف سے کوئی ذمہ داریاں عاید نہیں ہو سکتیں نڈر ہو جاتا ہے اور
کسی زیادہ اعلیٰ و ارفع مفاد کی خاطر اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے سے دریغ
نہیں کرتا۔ اسے برتری حاصل کرنے کی خواہش کو کنبہ کی خاطر قربان کرنے کی
ضرورت نہیں پڑتی۔ اس کی ذاتی سرگرمیاں نہیں رکتیں اور سائنس کی ترقی
ماند نہیں پڑتی۔ تحقیق و تدقیق، سیر و سیاحت، ایجاد و دریافت کا جذبہ جو اس
وقت یورپ میں موجود ہے اس کی وجہ کنبے کے علائق کی کمی اور فرد کی
محکم شخصیت ہے۔

ممکناتِ قوتِ مردانِ کار ؛ گردد از مشکل پسندی آشکار

ان بنیادی اصولوں کو بیان کر دینے کے بعد ہم مغربی تمدن کے چند
ظواہر کو لیتے ہیں۔ جن سے اس وقت مشرق اور اہلِ مغرب خود بیزار نظر آتے
ہیں۔ یہ ظواہر لباس کی دیدہ زیبی، سامانِ تزئینِ حسن، نمودِ حسن اور دیگر کردار کی
اخلاق پر منتج لوازم پر مشتمل ہیں۔ لوگ ان ظواہر ہی کو مغربی تہذیب سمجھ کر اس
سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ یہ ظواہر صرف چند حالات کی وجہ سے اہلِ یورپ
میں پیدا ہو گئے تھے۔ شروع میں ان کی وجہ تشخص ہی تھا جس سے انہی میں افراد
اپنی شخصیت کو ہر طرح ممتاز دکھانے کے متمنی تھے۔ اس کے لئے متناسب الاعضا
خوبصورت جسموں کی اور ان پر اچھے لباسوں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ یہی
خیال [illegible]

موجودہ ہوس کا مادی زندگی جنگِ عظیم کی متعاقب ہے تیرتکلف اور خلاف اخلاق اطوار جنگ ہی کا نتیجہ ہیں۔ جنگِ عظیم یورپ کے لئے ایک سخت ترین مصیبت تھی۔ اہلِ مغرب لاکھوں کی تعداد میں جنگ میں شامل ہوئے۔ ان کو بھوک پیاس تھکاوٹ، بیماری، غریب الوطنی ایسے ہر قسم کے مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ مورچوں کی زندگی سے اکتا گئے۔ کئی سال کے بعد جب جنگ ختم ہوئی اور جو بچے وہ واپس گھروں کو گئے تو ان میں ایک ردِ عمل شروع ہوا۔ جنگ سے واپس آنے کے بعد وہ اس پر کاربند تھے کہ:۔

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

عیش پرستی اور ہوس پرستی بڑھ گئی۔ اس وجہ سے تھیٹروں اور شراب خانوں کی رونق میں اضافہ ہو گیا۔ تھیٹروں کے ممبروں نے وہی چیزیں بہم پہنچائیں جن کا مطالبہ تھا۔ یورپ کی زندگی غیر متین ہو گئی۔ ننگ عیش و عشرت بڑھ گیا۔ گندمیں، سیسے، اینڈ لیلیں اور باز دہوس کی توجہ منعطف کرانے کے لئے برہنہ ہو گئے۔ لپ سٹک پوڈر وغیرہ کا استعمال بھی شروع ہوا اور آغاز میں یہ سب کچھ تھیٹروں تک ہی محدود تھا۔ لیکن بعد میں عام سوسائٹی میں پھیل گیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جنگ میں بہت سے مرد مارے گئے تھے۔ اور مردوں کی تعداد عورتوں کے مقابلے میں کم ہو گئی تھی۔ نتیجتاً اس سے عورتوں میں ایک جدوجہد کا بازار گرم ہو گیا۔ چنانچہ ہر قسم کے حربے استعمال کئے جانے لگے۔ زیبائش اور تزئینِ حسن و نمودِ حسن کی تدبیریں عام سوسائٹی نے اختیار کر لیں۔ اور مردانہ جذبات سے ہر ممکن طریقہ سے اپیل کرنا شروع کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ (Slimming) سلمنگ یا جسم پتلا کرنے کی تہ میں بھی یہی راز پنہاں ہے کہ عورت کی کمزوری کی طرف توجہ دلا کر مرد کے رحم کے جذبات سے اپیل کی جائے کہ مغربی، مددگار اور محافظ بننے پر آمادہ ہو۔ جس طرح اہلِ مشرق اور خاص طور پر اہلِ ہند مغربی تہذیب کے دیگر ظواہر کی نقل کرتے ہیں دختران ہند نے بھی ان نئے علامات کو اپنا شعار بنانا شروع کر دیا ہے۔ مگر تعلیم یافتہ ابنائے وطن کی اچھی مغربی پوشش کا مقابلہ اُن کی ردی جسمانی حالت سے لیا جائے تو حافظ کا کلمۂ زریں خدا معصر یاد آتا ہے۔ ابنائے وطن اگر جسمانی اور باطنی خوبیوں سے عاری ہوں گے تو صرف مغربی لباس اور زبان انہیں حکمرانوں کے ہم پلہ نہیں بنا سکتے، کیونکہ یہ مغربی حکمران اخلاص، اتحاد، اشتراکِ عمل اور ایثار سے ہے ع

خویش را از خوبیوں آوردہ اند

کاش کہ اہلِ مشرق مغربی تہذیب کی حقیقت کو جانیں اور اس کے ان بنیادی اصولوں پر کاربند ہوں جن پر عمل پیرا ہونے سے یورپ نے موجودہ امتیاز حاصل کیا ہے۔ ظاہریت کی نقل کرنا آسان ہے۔ لیکن حقیقت کو سمجھ کر اس کے مطابق عمل کرنا مشکل۔ جن معانی میں مغربی تہذیب کو یہاں پیش کیا گیا ہے۔ اگر ہم ان کے مطابق مہذب ہو جائیں تو یہ ہماری عین خوش قسمتی ہوگی۔ ورنہ مغربیت محض لباس اور زبان تک ہی محدود نہیں۔ اگر ہم اس کو انہیں چیزوں تک محدود کرنے پر مُصر ہوں گے تو معدودین مشرق کا یہ خیال مفادِ مشرقی کے پیشِ نظر بہت درست ہے۔

"طبِ مغرب کے مزے میٹھے اثر خواب آور ہے"

رسالہ، کفایت علی

طائرِ دل

میرے دل، دستوں کے پرندے نے اپنا آسمان تیری آنکھوں میں پا لیا ہے۔
وہ صبح کا گہوارہ
اور ستاروں کی دنیا ہیں۔
میرے نغماتِ محبت ان کی گہرائیوں میں کھو گئے ہیں۔
مجھے اُن کی غیر محدود فضا کی تنہائیوں میں پرفشاں ہونے دو،
اور مجھے ان کے بادلوں کے پردوں کو چیر کر
اپنے پروں کو ان کی روشنی میں پھیلانے دو۔
(ترجمہ انگریزی)

ہاشم [illegible]
[illegible]

برکھا رُت میں

سیجا سونی، رین اداس
بالم کب آئے گا پاس

ساون کی یہ شام گھٹائیں
یہ ٹھنڈی سرمست ہوائیں
میرے من میں آگ لگائیں
اور تیرا پردیس میں باس
سیجا سونی رین اداس
بالم کب آئے گا پاس؟

یہ بھیانک اور کالی راتیں
یہ لمبے دن یہ برساتیں
یاد آتی ہیں تیری باتیں
جاگ اٹھی ہے پریم کی پیاس
سیجا سونی، رین اداس
بالم! کب آئے گا پاس؟

رہ رہ کر اٹھتی ہے پیر
آنکھیں برساتی ہیں نیر
کون بندھائے میری دھیر!
کون بندھائے میری آس؟
سیجا سونی، رین اداس
بالم! کب آئے گا پاس

امر چند قیس جالندھری

اخبار "موت"

جنگِ عظیم میں تقریباً پچیس ہزار پونڈ کمانے کے بعد مسٹر اولڈہم نے لنکاشائر کو خیرباد کہی اور اپنی بیوی کے ساتھ بے فیئر میں ایک عالیشان مکان لے کر رہنے لگا تو میاں بیوی کو صبح شام ایک دوسرے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ ایک دن وہ اسی طرح ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے کہ مسز اولڈہم نے کہا۔

"تم کوئی اخبار کیوں نہیں خرید لیتے؟"

"کیونکہ میں اپنا روپیہ ضائع کرنا نہیں چاہتا"۔

"لیکن لارڈ نارتھ کلف، لارڈ راتھرمیر، لارڈ بیور بروک اور سر ایڈورڈ ہلٹن ہی کو دیکھ لو سبھی کامیاب ہیں"۔

"مگر ان کے خلاف میں یہ جوئے کی بازی نہیں لگا سکتا۔ وہ پریس کے رگ رگ تک اپنی مضبوط گرفت میں لئے ہوئے ہیں۔ بہتر ہو اگر تم اپنا وقت دوسری سکیموں کے سوچنے میں صرف کیا کرو"۔

"ٹام! دیکھو ہم بہت سے لوگوں سے زیادہ امیر ہیں لیکن پھر بھی ہمارا کوئی واقف نہیں۔ ہمارا وقت ہمیشہ تنہائی میں گزرتا ہے۔ اس سے تو وگین میں ہم زیادہ خوش تھے۔ اگر تم کوئی اخبار خرید لو تو بہت سے لوگ تمہارے دوست بن جائیں گے"۔

"اور سارا روپیہ صرف ہو جائے" ٹام نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں یہ مجھے پسند نہیں"۔

مسز اولڈہم نے ایک سرد آہ بھری اور گفتگو کا موضوع تبدیل کرتی ہوئی نوکروں اور ان کی شرارتوں کا ذکر کرنے لگی۔ ٹام بیچارہ جہاں تک ایک خوددار خاوند سن سکتا ہے سنتا رہا، اور جب تنگ آ گیا تو اٹھ کر سیوائے ہوٹل کے سموک روم میں چلا گیا۔ یہاں اس کو اپنے لنکاشائر کے دوستوں سے ملنے کا اکثر موقع ملتا رہتا تھا۔

جب وہ شام کو واپس آیا تو سیدھا اپنی بیوی کی خوابگاہ کی طرف گیا، اس کو جگایا اور یہ کہہ کر سخت حیرت میں ڈال دیا کہ میں نے اخبار نکالنے کا ارادہ کر لیا ہے کیوں اب خوش ہو۔

مسز اولڈہم جانتی تھی کہ گھر میں ہمیشہ اسی کی بات مانی جاتی ہے۔ لیکن وہ اس وقت اپنے خاوند کی فرمانبرداری پر بے حد خوش ہوئی۔ وہ کہنے لگی "اچھا ذرا مجھے بھی تو اس فیصلے کے متعلق کچھ بتاؤ"۔

اولڈہم کہنے لگا "ہوٹل میں ہم کوئی چار آدمی تھے۔ میرے سوا سبھی کا کسی نہ کسی اخبار سے تعلق تھا اور اسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک نے کہا تعجب ہے کہ جب کاروباری اخبار ایسی اچھی طرح چل رہے ہیں تو کسی کو ایسے اخبار کی کیوں نہیں سوجھتی جس میں تمام اموات کا ذکر ہو۔ مرنے والوں کے حالاتِ زندگی شائع کئے جائیں اور مُردوں کی تجہیز و تکفین کے لئے تجاویز پیش کر کے لوگوں کو سہولت بہم پہنچائی جائے۔

"میں نے اس شخص سے کہا کیا آپ میرے ساتھ شراب کا جام نوش کریں گے؟"

اس نے جواب دیا "مجھے کوئی اعتراض تو نہیں"۔ اور جب ہم شراب پی رہے تھے۔ تو میں نے اس سے اخبار کے متعلق تمام حالات دریافت کئے۔ اس نے کہا "تمہیں معلوم ہی ہے کہ لوگوں کے لئے مُردوں کی تجہیز و تکفین کا انتظام کرنے والوں کو کتنی آمدنی ہے۔ اللہ بخشے تمہارے بڈھے ابا جی تو اسی کام میں تھے۔ اور دیکھ لو جب مرے تو کتنا روپیہ چھوڑ گئے۔ میں بھی اپنے اخبار کا نام "موت" رکھوں گا۔ اس میں ہر موت کا اشتہار چھپا کرے گا۔ میرے ایجنٹ ہر شہر میں پھرا کریں گے اور جس گھر میں کوئی موت ہو جایا کرے گی وہاں جا کر مرحوم کے حالاتِ زندگی اور اگر ہو سکا تو فوٹو بھی حاصل کیا کریں گے۔ ہر شخص کم از کم دو پاؤنڈ تو ضرور دے گا اور اخبار کی سو کاپیاں بھی خریدے گا۔ پھر امیر لوگ تو اور بھی زیادہ ادا کیا کریں گے!

"میں نے پوچھا" تمہارے خیال میں اخبار کی اشاعت کتنی ہو جائیگی؟"

"ملک میں ہر سال پانچ سے چھ لاکھ تک لوگ مرتے ہیں۔ ان میں سے بچوں کو مفلسوں کو چھوڑ کر باقی کم از کم بیس فی صدی تو ضرور ایسے ہوں گے جن کے لواحقین میرا اخبار خریدا کریں گے۔ ان کی تعداد بھی ایک لاکھ تک پہنچتی ہے یعنی سالانہ آمدنی دو لاکھ ہوئی۔ اگر اس میں سے پچاس فی صدی اخراجات کر دیئے جائیں تو آپ نے دیکھا سال میں ایک لاکھ پونڈ بخوبی بچ رہتے [illegible]۔ ابھی اس میں ان اشتہارات کی اجرت تو شامل [illegible]

کرنے والے دکانداروں سے وصول ہوا کرے گی۔ اور ممکن ہے غمگین اور آزردہ دل لوگ بھی ہمارا اخبار خرید لیا کریں۔ میں اخبار کی تعداد اشاعت کا اندازہ نہیں لگا سکتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ہمیں کبھی نقصان نہیں ہو سکتا۔ لوگ دن رات مرتے ہیں۔ موت کوئی تجارت نہیں جس کو کساد بازاری کا ڈر ہو۔ صابون سازی سے یہ کام بدرجہا بہتر ہے۔ اکثر لوگ نہاتے نہیں لیکن مرتے سبھی ہیں"۔

پھر ٹام نے کمال فخر کے ساتھ اپنی بیوی سے کہا "پیاری میں سچ کہتا ہوں کہ خوشی سے میں اس وقت پھولا نہیں سماسکتا۔ نوجوان کی رخصت سے پیشتر ہی میں نے اسے پانچ پاؤنڈ فی ہفتہ پر منیجر کی حیثیت میں ملازم رکھ لیا اور آمدنی کا کچھ حصہ دینے کا بھی وعدہ کیا"۔

مسز اولڈھم نے خوف محسوس کرتے ہوئے کہا "لیکن ٹام! میری مراد اس قسم کے اخبار سے تو نہ تھی۔ کیسی خوفناک تجویز ہے۔ میں نہیں جانتی یہ سب کچھ تم کر کیسے سکوگے جب کہ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تمہارا دل بہت کمزور ہو گیا ہے۔ کم از کم مجھے امید ہے کہ تم اپنا نام اس پر نہ لکھواؤ گے۔

کیوں ٹام! دیکھو ایسی باتوں کو جاننے والے کیسی بری بات ہے کہ ہمارے والد بزرگوار صرف اس وجہ سے لوگوں میں مشہور ہوں کہ وہ مردوں کو کفن پہنایا کرتے تھے۔

"اچھا پیاری میں تھوڑے پر ہی اکتفا کروں گا۔ زیادہ روپیہ نہ لگاؤں گا۔ لیکن یہ میں تمہیں بتا دوں کہ کام اچھا ہے۔ ہمارے مطبع میں بلاوے کے کارڈ چھپا کریں گے۔ مشہور مشہور قبرستانوں کی تصاویر شائع ہوں گی کہ لوگ اپنے عزیزوں کو وہاں دفن کریں۔ یہاں ایک شاعر گرے نامی رہتا ہے جس نے وہ مشہور نوحہ لکھا ہے۔ ہم اس کی خدمات حاصل کریں گے اور اس سے کہیں گے کہ ہمارے لئے بھی ایک نظم لکھ دے"۔

"لیکن ٹام! وہ تو مر چکا ہے"۔

"تو کیا حرج ہے۔ ایسے کئی شاعر مارے مارے پھرتے ہیں جو کہیں سے ایک پاؤنڈ مل جانا بھی غنیمت سمجھتے ہیں۔ ایسی نظموں کے ہمیں پیسے بھی ضروری طور پر زیادہ ملا کریں گے۔ باربرا سچ کہتا اگر خدانخواستہ ہمارا ولیم بچپن ہی میں مر جاتا تو اخبار کی پیشانی پر اس کے فوٹو اور اس کی یاد میں ایک خوبصورت سی نظم شائع کرنے کے لئے کیا تم دو پونڈ نہ دے دیتیں۔

باربرا نے جواب دیا "سے ہے ایسا تم کیا کہہ رہے ہو ایسی بھی کیا بات ہے میں تو چار پونڈ دے دوں لیکن اس وقت سو رہی ہیں۔ صبح اٹھ کر سوچا جائے گا۔

دوسرے دن صبح ایک شخص مسٹر اولڈھم سے ملنے آیا۔ اور دونوں کمرہ بیٹھک کے آپس میں گفتگو کرتے رہے وہ نئے اخبار کے متعلق تجاویز سوچ رہے تھے۔ آخر انھوں نے فیصلہ کیا کہ ملک کے اطراف و جوانب میں مردوں کو کفن پہنانے والے دکانداروں کو چٹھیاں لکھی جائیں۔ لندن کے قبرستانوں کے منتظموں سے خط و کتابت کی جائے اور ایک کمپنی بنام "موت لمیٹڈ" رجسٹر کرا لی جائے۔ نمونے کی ایک سادہ کاپی بھی شائع کی گئی جس کے ٹائیٹل پیج پر ایک غمگین اور افسردہ خاتون کی تصویر تھی جو ایک قبر پر بیٹھی ہوئی ماتم کر رہی تھی۔

اولڈھم جلد باز تو تھا ہی اس نے دو سو نہایت غمگین صورت والے ایجنٹ بھی رکھ لئے۔ ان کا کام "موت لمیٹڈ" کی نمایندگی اور سیاہ چمکدار ٹاپ ہیٹ اور سیاہ فراک کوٹ پہنے رہنا تھا۔ ان کے بازوؤں پر ماتمی نشان کی سیاہ پٹیاں ہر وقت بندھی رہتی تھیں۔ وہ مرحوم کے گھر جاتے۔ ہمدردی کا اظہار کرتے۔ پسماندگان کو صبر کی تلقین کرتے اور ان کی خواہش کے بموجب مرحوم کے جنازے کی فوٹو اور دیگر حالاتِ زندگی نظم یا نثر میں بغرض اشاعت حاصل کرتے۔ یہی نہیں بلکہ مرحوم کے گھر کی یا باغ میں ٹہلتے ہوئے، مطالعہ میں مشغول یا موٹر چلاتے ہوئے خود مرحوم کی فوٹو تھوڑے سے خرچ پر چھپوانے کا وعدہ کرتے۔ غرض اخبار کو غم کی تجارت کرنے کے سو ڈھنگ مل گئے اور انھوں نے اس سے پوری طرح فایدہ اٹھانے کی مکمل کوشش کی۔

ان بکھیڑوں سے فارغ ہو کر جب اولڈھم گھر آیا تو نہایت فخر سے اپنی بیوی سے کہنے لگا۔

"پیاری باربرا، دیکھو میں نہ کہتا تھا۔ پہلی ہی اشاعت میں ہمیں سو پاؤنڈ سے زیادہ کا فایدہ ہوگا"۔

باربرا نے پوچھا "پہلا نمبر کب تک شائع ہوگا؟"

"ایک ہفتے بعد آج کے دن پہلا نمبر ایک لاکھ چھپے گا۔ اور کوئی پرچہ واپس نہ ہوگا۔ تمام کاپیاں غمگین بیواؤں، غمزدہ خاوندوں اور دردمند رشتہ داروں کے ہاتھ فروخت ہو چکی ہیں۔ واقعی وہ دو سو ایجنٹ اپنا حق نمک ادا کر رہے ہیں۔ کتنی دانشمندی تھی کہ میں نے ان کو ملازم رکھ لیا۔ اور پھر کس سہولت سے صرف اخبار میں "ضرورت ہے" کے کالم میں ایک اشتہار دیا تھا کہ وہ تمام اصحاب جو زندگی سے بیزار ہو چکے ہیں پوسٹ بکس نمبر ۱ سے خط و کتابت کریں۔ دس پاؤنڈ فی ہفتہ ملا کرے گا۔ دوسرے ہی دن دو سو سے زیادہ ایجنٹ میری حسب منشا دفتر میں حاضر تھے۔ ان میں سے کئی ایک شکل سے ہی جب میں نے انہیں بتایا

کہ کمپنی کی طرف سے انھیں ایک سوٹ کالی ٹائی، چمڑے کے کالے دستانے اور ایک ٹاپ ہیٹ بھی دے گا۔"

"خیر کچھ بھی ہو کہیں نقصان نہ اٹھا بیٹھنا۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ کس طرح ایک خود دار عورت گھر میں خاوند کی لاش ہوتے ہوئے تمہارے ایجنٹوں سے کاروباری گفت و شنید کرے گی۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے دوست کچھ خاک بھی نہ کر سکیں گے۔ انھیں کوئی گھر میں بھی نہ گھسنے دے گا۔"

"اخاہ۔ یہی تو تمہیں معلوم نہیں۔ تم غم کے فلسفے ہی کو نہیں سمجھتیں۔ ایسے وقت میں انسان عقل و خرد کھو بیٹھتا ہے۔ اور جو بات اسے کہی جائے اس کو ماننے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک عورت جو ساری عمر اپنے خاوند سے متنفر رہی ہو اس کی موت پر دو چار آنسو ضرور بہائے گی اگرچہ اس کا وقار اس بات پر مجبور کرے گا کہ وہ نئے سے نئے فیشن کا ماتمی لباس پہنے لیکن وہ ایک مستعد ایجنٹ سے جس کو پچیس فی صدی کمیشن اور بونس ملے گا۔ جھگڑا نہ کر سکے گی اور وہی کرے گی جو وہ اسے کرنے کے لئے کہے گا۔"

"میں تو ہرگز نہ کروں۔ ایسے ایجنٹوں کو فوراً ہی گھر سے باہر نکلوا دوں۔"

اولڈہم ہنسا اور کہنے لگا "سبھی عورتیں تم جیسی عقلمند نہیں ہوتیں۔ ہمارا ادارہ اس قیاس پر ہے کہ اکثر لوگ کبھی کبھی بیوقوف بھی بنائے جا سکتے ہیں۔ اور خاص کر اس وقت جب ان کو کوئی صدمہ پہنچا ہو۔"

~~~

مسز اولڈہم دوسرے دن اپنی آراستہ بیٹھک میں بیٹھی تھی۔ خادم نے آکر اطلاع دی کہ ایک شخص اس سے ملنا چاہتا ہے۔

مسز اولڈہم نے پوچھا "کس قسم کا شخص!"

خادم نے جواب دیا "میں نہیں کہہ سکتا۔ کوئی فقیر تو ہے نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مُردوں کو کفن پہنانے والا ہو۔"

مسز اولڈہم کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ "اس سے کہو اندر آجائے۔"

اس نے یہ کہا اور پیشتر اس کے کہ اجنبی اٹھ کر مسز اولڈہم جان گئی کہ وہ کون ہے

"مادام مجھے نہایت افسوس ہے کہ آپ کے محترم شوہر ایک گھنٹہ ہوا اس دنیا کو خیرباد کہہ گئے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ موت حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے واقع ہوئی۔ مجھے آپ سے کمال ہمدردی ہے اور دعا ہے کہ خدائے ذوالجلال مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔"

مسز اولڈہم یہ خبر پاتے ہی بے ہوش ہو گئی۔ اجنبی نے کوٹ کی جیب سے سونگھنے کی دوائیں نکالیں اور مخصوص کاروباری انداز میں مسز اولڈہم کو سُنگھا کر ہوش میں لانے لگا۔ اور جب تک ہوش آنے کے بعد وہ ہلکی ہلکی ہچکیاں نہ لینے لگی وہ بالکل خاموش رہا۔

پھر کہنے لگا "کیا ہم یہ المناک واقعہ اور مرحوم کی زندگی کے مکمل حالات مع ان کی فوٹو کے اخبار کے ایک پورے صفحے پر شائع کر دیں؟ اجرت صرف پچیس پاؤنڈ ہوگی۔ اور اگر آپ کہیں تو اخبار کی پانچ سو کاپیاں بھی چھ پنس فی کاپی کے حساب سے مخصوص دوستوں اور رشتہ داروں کے نام بھیج دی جائیں میرے خیال میں پانچ سو کافی ہوں گی۔"

مسز اولڈہم غم سے نڈھال ہو رہی تھی۔ اپنی حالت کا تصور بھی اس کے لئے اندوہگین تھا۔ اس لئے جب اس غمگین صورت ایجنٹ نے آرڈر فارم نکال کر پیش کیا تو اس نے پڑھے بغیر اس پر دستخط کر دیئے۔ فقط اتنا دیکھا کہ فارم کے چاروں طرف ایک سیاہ لکیر کھنچی ہوئی تھی۔

شام کو کلب میں ایک ساتھی نے پوچھا "کہو براؤن آج دن کیسے گزرا؟"

"نہایت شاندار۔ اولڈہم کی بیوی سے ہی مجھے اٹھائیس پاؤنڈ کا آرڈر مل گیا تھا۔ اب تو اسی ہفتہ میں مجھے بیس پاؤنڈ ضرور بچ رہیں گے۔"

"بھئی واقعی اخبار کامیاب رہا۔ افسوس کہ بیچارا اولڈہم پہلے نمبر کے شائع ہونے تک زندہ نہ رہ سکا۔ میں نے سنا ہے کہ تقریباً پچیس کا فائدہ رہے گا۔"

(ترجمہ)

مقبول الٰہی بی اے (آنرز)

مینائیں اچھلتی ہیں سبو پھوٹتے ہیں ساقی کے تصدق کہ مزے لوٹتے ہیں

گرتے ہیں قدح سے قطرہائے صہبا یا تارے مہتاب سے ٹوٹتے ہیں

سعید احمد اعجاز
~~~

شاعرہ اور بلبل

بلبل سے خطاب

خونِ جگر رو رو کے بلبل!
تجھ کو ملا اک پھول
طوفاں خیز ہوا سے بلبل
سوکھ گیا وہ پھول
خونِ جگر رو رو کے بلبل!
تجھ کو ملا اک پھول
بادِ خزاں نے تجھ سے بلبل!
چھین لیا وہ پھول
مت رو بلبل! چپ رہ بلبل!
پھول گیا تو جانے دے
مت رو بلبل! چپ رہ بلبل!
موسمِ گل پھر آنے دے

بلبل کا جواب

پھول گیا تو جانے دوں؟
موسمِ گل پھر آنے دوں؟
موسمِ گل پھر آئے گا؛
پھول بہت سے لائے گا؟
آہ مگر یہ پھول!
ہائے مرا یہ پھول!

جانِ تمنا روحِ محبت!
آہ، وہ میرے دل کی راحت!
روح کو کیسے جانے دوں؟
جان کو کیسے جانے دوں؟
راحتِ دل کو جانے دوں!
ہائے ذرا بتلاؤ تو!

پہلو میں اس کے گذری راتیں
پیار، محبت کی وہ باتیں
کیسے بھولوں کیسے بھولیں!
ہائے ذرا بتلاؤ تو!
ظالم "بادِ خزاں" نے آکر
"طوفاں خیز" ہوا نے آکر
پھول کو مجھ سے چھین لیا ہے
دل کو میرے توڑ دیا ہے
کیسے آئے مجھ کو چین؟
ہائے ذرا بتلاؤ تو!
رو رو کر میں جان دے دوں گی
دل کو جگر کو خوں کر دوں گی
کیسے بھلا خاموش رہوں میں
ہائے ذرا بتلاؤ تو!

تمنائی

بہار میں

جب بہار کے خوشگوار دن آتے ہیں، اور سوئی ہوئی زمین جاگ کر سبز لباس پہن لیتی ہے، اور جب عنبر افشاں ہوا ہمارے چہرے سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی ہمارے پھیپھڑوں اور دل تک پہنچ جاتی ہے تو ہم بے اندازہ مسرت اور ادھر ادھر بے مقصد پھرنے کی انتہائی خواہش محسوس کرتے ہیں تاکہ بہار کی تمام شگفتگی اپنے اندر جذب کر لیں۔ پچھلے سال سردی چونکہ بہت کڑاکے کی پڑی تھی اس لئے اب کے بہار کی آمد پر یہ کیف انگیز خواہش پوری جوانی پر تھی۔

ایک صبح جو میں اٹھا تو میں نے کھڑکی میں سے نیلگوں آسمان پر نگاہ ڈالی جو صبح میں زیادہ روشن معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت بلبلیں درختوں پر بیٹھی بلند آواز سے بہار کے ترانے گا رہی تھیں۔ نیچے بازار میں لوگوں کی مسرت آمیز آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں اٹھا اور دل میں مسرتوں کا ایک طوفان لئے چل پڑا ——— نہ معلوم کہاں؟ میں نے راستے میں ہر شخص کو خنداں و فرحاں دیکھا۔ مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا گویا شگفتگی ہر ایک چیز میں سرایت کر گئی ہے۔

اُس وقت سارے شہر پر عشق و محبت کی ہوا چل رہی تھی۔ نوجوان عورتیں جن کی دلربا آنکھوں کی گہرائیوں میں محبت جھلک رہی تھی۔ دلکش انداز سے صبح کا ہلکا پھلکا لباس زیبِ تن کئے خراماں خراماں ہوا خوری کر رہی تھیں۔

میں چلتا چلتا دریائے سین کے کنارے پر پہنچ گیا ——— نہ معلوم کیوں اور کس طرح؟ دخانی کشتیاں شہر سودس کو جانے کے لئے بالکل تیار تھیں۔ میں ایک کشتی میں جو مسافروں سے لبالب بھری تھی، بیٹھ گیا۔

میرے پاس ایک عورت بیٹھی تھی ——— ایک خوش شکل، محنت و مشقت کرنے والی لڑکی، جو خالص ایرانی حُسن کا نمونہ تھی۔ اس کا سر چھوٹا سا تھا۔ سر پر چکدار گھنگھریالے بال تھے جو کانوں کی لوؤں کو چھوتے ہوئے اس کی گردن پر لہرا رہے تھے۔ جب ہوا ذرا جنبش کرتی تھی تو وہ بھی ایک دل کش انداز کے ساتھ رقص کرنے لگ جاتے تھے۔ اور اس وقت وہ اس قدر جاذبِ نگاہ معلوم ہوتے تھے کہ آدمی کا دل بے اختیار انہیں چومنے کو چاہتا تھا۔

میں مسلسل جھکی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے میری جانب سر موڑا اور پھر جلدی سے نظر نیچے جھکا لی۔ اس کے سرخ سرخ تبسم ریز ہونٹوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ابھی ان سے ہنسی کا ایک سیلاب بہہ نکلے گا۔

وسیع دریا خاموشی کے ساتھ چل رہا تھا۔ فضا پر سکون اور روح افزا تھی اور اس میں زندگی کا ایک سمندر موجزن معلوم ہوتا تھا۔ ہر جگہ خوش آیند آوازوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس لڑکی نے اپنی آنکھیں اوپر کو اٹھائیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ فیصلہ کن انداز سے ہنس رہی تھی۔ وہ اس وقت بڑی خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ اور میں نے اس کی اس مختصر سی نگاہ میں انتھاہ گہرائیاں اور وہ تمام کی تمام شعریت، جو ہمارے خوابوں میں نمودار ہوتی ہے۔ اور وہ مسرت جسے ہم پیہم کوششوں کے ساتھ تلاش کرتے ہیں ——— اور جس سے میں اب تک ناآشنا تھا ——— دیکھ رہا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ ابھی بازو پھیلا کر اس پیکرِ حسن کو اٹھائے جاؤں، اور اس کے کانوں کو دنیائے عشق کے شیریں نغموں سے بھر دوں۔

میں ابھی اس سے بولنے ہی لگا تھا کہ کسی نے آکر میرے کاندھے کو چھوا۔ میں نے حیرانی سے مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک معمولی سا آدمی تھا ——— نہ زیادہ بوڑھا، نہ جوان! وہ میری طرف حسرت آمیز نظروں سے تک رہا تھا۔ اس نے کہا:۔

"میں آپ کے ساتھ کوئی بات کرنا چاہتا ہوں"۔

میں نے غضب آلود نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے دوبارہ کہا۔

"نہایت اہم بات ہے"۔

میں اٹھا اور کشتی کے دوسرے سرے تک اس کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ اس نے کہا۔

"جب جاڑا، شدید سردی، ٹھنڈک، اور برفانی ہوا ساتھ لئے آتا ہے تو ڈاکٹر لوگ ہر ایک سے کہا کرتے ہیں، اپنے پاؤں کو گرم رکھو، یخ بستہ سردی پھیپھڑوں کے ورم، وجع مفاصل، اور ذات الصدر سے اپنے آپ کو بچاؤ تو تم ذرا زیادہ محتاط ہو جاتے ہو۔ تم فلالین کے کپڑے، گرم کوٹ

اور موٹے موٹے بوٹ پہنتے ہو پھر بھی تمہیں دو ماہ بستر میں گذارنے پڑتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور جب موسم بہار، سر سبز پتوں، پھولوں، فرحت افزا ٹھنڈی ہواؤں اور مہکتے ہوئے سبز و شاداب کھیتوں کو ساتھ لے کر آتا ہے تو تم اپنے جسم میں عجیب سی بے چینی اور ارتعاش محسوس کرتے ہو اور تمہیں کوئی نہیں کہتا۔ موسیو! محبت سے بچو۔ وہ کمین گاہوں میں چھپی رہتی ہے۔ اس نے بے اندازہ جال بچھا رکھے ہیں۔ اس کے ہتھیار آج کل بہت تیز ہیں، اور اس کی فریب کاریاں حیرت انگیز ہیں! اس لئے محبت سے بچو! ہاں محبت سے خبردار رہو! یہ سردی اور وجع مفاصل سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ کسی کو بھی نہیں چھوڑتی، اور ہر شخص کو ناقابلِ تلافی گناہوں کے ارتکاب پر مجبور کر دیتی ہے۔

"ہاں ہاں، موسیو! حکومتِ فرانس کو چاہئے کہ وہ دیواروں پر اہم اطلاعات بدیں الفاظ چسپاں کر دے "بہار کی آمد۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اہلِ فرانس محبت سے بچیں"!

"چونکہ گورنمنٹ یہ کام کرنے کے لئے طیار نہیں۔ اس لئے میں ہی اس کو شروع کرتا ہوں۔ اور میں تم سے کہتا ہوں کہ محبت سے بچو۔ وہ تمہیں پھسلانے کی خاطر بالکل طیار بیٹھی ہے۔ میرا یہ فرض ہے کہ تمہیں اس امر سے آگاہ کروں"۔

میں اس تنہا آدمی کو دیکھ کر سخت حیران ہوا۔ اور مرعوب کُن انداز میں بولا۔

"موسیو! خبردار! تم ایک ایسے معاملے میں دخل دے رہے ہو جو کسی حیثیت سے بھی تم سے متعلق نہیں"۔

اس نے ذرا خشمگیں ہو کر کہا۔

"موسیو! موسیو!! اگر میں کسی شخص کو ڈوبتے دیکھوں تو کیا میرا فرض یہ ہے کہ اُسے ڈوبنے دوں؟ لو سنو، میری کہانی اور تم دیکھو گے کہ میں نے تم سے ایسا کہنے کی جرأت کیوں کی ہے۔

"یہ گزشتہ سال اسی موسم کا واقعہ ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر پہلے مجھے تم کو یہ بتانا چاہئے کہ میں کلرک ہوں۔ جہاں میرا کمرہ ہے وہاں سے آسمان صاف نظر آتا ہے اور اکثر اوقات میرے دل میں قدرتی مناظر سے لطف اٹھانے اور اچھلنے کودنے کی خواہش پیدا ہوتی رہتی ہے۔

"ایک دن یہی آزادانہ پھرنے کا بھوت مجھ پر سوار ہو گیا۔ گو میں اپنی اس خواہش کو مستحسن خیال نہیں کرتا تھا۔ پھر بھی میں اپنے افسر کے پاس چلا گیا۔ میرا افسر ایک پست قامت بدمزاج انسان تھا۔ وہ ہر وقت غصے کی حالت میں رہتا تھا۔ میں نے اس کو بتایا کہ میری طبیعت اس وقت اچھی نہیں۔ اس نے میری طرف دیکھا اور کہا "مجھے تمہاری بات پر یقین تو نہیں آتا مگر خیر تم اب چلے ہی جاؤ۔ میرے دفتر کا انحصار کچھ تم ایسے کام چوروں پر نہیں ہے"۔

"میں اُسی وقت چل پڑا اور دریائے سین پر پہنچ گیا۔ وہ دن بھی آج کی طرح خوشگوار تھا۔ میں نے کشتی سے کرسینٹ کلاوڈ کا راستہ لیا۔ آہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر میرا افسر اس وقت مجھے دفتر سے باہر نکلنے کی اجازت نہ دیتا!

"میں اُس وقت خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ کشتی، دریا، درخت، مکانات اور دوسرے مسافر جو میرے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ غرض کہ ہر چیز مجھے دلکش معلوم ہوتی تھی۔ میرے دل میں کسی کو چومنے کی بے اندازہ خواہش پیدا ہو رہی تھی۔ خواہ کوئی چیز ہی ہو۔ ۔ ۔ ! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آہ اس جذبے کی پشت پر محبت کار فرما تھی!

"اچانک گھاٹ پر سے ایک چھوٹا سا پارسل ہاتھ میں لئے ایک لڑکی کشتی پر سوار ہوئی اور میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ وہ از سر تا پا حسین تھی۔ مگر موسیو! یہ بڑی عجیب بات ہے کہ بہار کے ان خوشگوار دنوں میں عورتیں ہمیں زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی ہیں۔ ان دنوں اُن کا حسن حد درجہ جذبات پرور ہوتا ہے اور ہمیں ان کے دیکھنے میں ایسا ہی لطف آتا ہے جیسے پنیر کھانے کے بعد کوئی شراب پی لے!

"میں نے اس کی طرف دیکھا اور اس نے میری طرف دیکھا، بالکل اسی طرح جیسے اس لڑکی نے تمہارے ساتھ کیا ہے۔ نگاہوں کے اس طرح کبھی کبھی دوچار ہونے سے میں نے محسوس کیا کہ اب ہم کو گفتگو کا سلسلہ شروع کرنے میں حجاب مانع نہیں اس لئے میں نے مہرِ سکوت توڑی اور اس نے بھی اسی آشنا انداز میں جواب دیا۔

"وہ سینٹ کلاوڈ کے مقام پر کشتی سے اتری۔ میں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اس نے ڈاکخانہ میں جا کر پارسل دیا اور پھر واپس چلی آئی میں اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا "یہ جنگل بھی کتنا پیارا معلوم ہوتا ہے"۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا "ہاں"! میں نے کہا "مادموزیل! ہم کیوں نہ یہاں سیر کریں؟

اس نے میری طرف تیز نگاہ سے دیکھا۔ گویا وہ جانچنا چاہتی تھی

کہ میں کیسا ہوں کسی قدر تامل کے بعد اس نے میری تجویز قبول کر لی۔۔۔۔

اب ہم پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔ نناوہ پتوں کی باریک باریک تہوں کے نیچے اونچی اونچی گھاس اگ رہی تھی اور اس پر سورج کی روشنی سیلاب کی طرح پڑ رہی تھی گھاس کے نیچے چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے اور درختوں پہ پرند شیریں نغمے گا رہے تھے میری محبوبہ اس بہار آفریں اور نشہ بار ہوا سے متاثر ہو کر قلانچیں بھرنے لگی۔ اور میں اس کے پیچھے پیچھے اچھلنے کودنے لگا۔ آہ موسیو! بعض اوقات فہم و ادراک کو مسحور کر چکنے کے بعد ہم اس سے کس درجہ بے نیاز ہو جاتے ہیں!

"پھر ہم اسی دیوانگی میں ادھر ادھر کے گیت گانے لگے ——

بلبل کے شیریں نغمے ہاں بلبل کے وجد انگیز نغمے! آہ موسیو! ایسے گیت گا کر ہم ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ مجھ پر یقین کرو کہ تم کبھی ایسی عورت سے شادی نہ کرنا جس کی آواز حد درجہ خوش آیند ہو!

وہ جلد ہی تھک گئی۔ اور ہم ایک سرسبز ڈھلان پر بیٹھ گئے میں نے اس کے نرم اور نازک سفید ہاتھ جن کو سوئی کے داغوں نے گلنار کر رکھا تھا اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور ان کو دیکھ کر دل میں سوچنے لگا۔ یہ محبت و مشقت کے پاک نشانات ہیں۔

ہم دیر تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے محبت و الفت کے دلپذیر اثرات سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ آہ عورت کی آنکھ میں کس قدر قوت جاذبہ ہوتی ہے! اور وہ کتنی جلدی ہمیں مسخر کر کے ہم پر قابو پا لیتی ہے! لوگ کہتے ہیں کہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ہم دل کی حالت معلوم کر لیتے ہیں۔ آہ اگر ہم ایک دوسرے کے دل کو دیکھ سکیں تو ہم اکثر حالات میں ندامت انگیز افعال سے بچے رہیں۔

میں فرط الفت میں دیوانہ سا ہو رہا تھا میں نے اپنے دل کی تمام الفت اس کی آنکھوں کے سامنے رکھ دی۔ اس نے مجھ پر ایک ترچھی نگاہ ڈالی۔ گویا وہ کہہ رہی تھی کیا الفت ہی ایسی چیز ہے جس کے ذریعے سے ہم عورتیں آدمی کو بیوقوف بنا کر اسے اپنے ماتحت کر لیتی ہیں۔

"جب ہم الفت سے اچھی طرح سیر ہو چکے تو ہم سینٹ کلاؤڈ کی طرف چل پڑے میں پیرس تک اس کے ساتھ رہا وہ کچھ غمگین سی معلوم ہوتی تھی میں نے پوچھا

"کیا بات ہے"؟

اور اس نے کہا "میں سوچ رہی ہوں کہ آج کا دن ان خوشگوار ترین دنوں میں سے ہے جو ہماری تمام زندگی میں بہت ہی کم آتے ہیں" یہ سن کر میرا دل اس زور سے دھک دھک کرنے لگا جیسے وہ میری پسلیوں اور سینے سے ابھی باہر نکلا جاتا ہے۔

"پیرس میں میں اسے ہر اتوار کو ملا کرتا تھا۔ اور اسے مختلف پر بہار مقامات پر لئے پھرتا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ اب اسے اپنی رفیقۂ حیات بنائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تو تین ماہ کے بعد اس سے شادی کر لی۔

"موسیو! تم اس انسان کی ناگفتہ بہ حالت کا اندازہ نہیں لگا سکتے جو ایک معمولی سا کلرک ہو اور ہر وقت الفت کے ترانے گاتا رہے

"تو اس طرح میں نے الفت میں پڑ کر شادی کر لی۔ وہ میرا نام لے کر مجھے پکارتی تھی اور دن رات بے معنی چڑ چڑ کرتی رہتی تھی اور بلند آواز میں گیت گاتی رہتی تھی اور گلے بیچنے والوں سے لڑتی رہتی تھی۔ اور اپنے خانگی حالات دوسروں پر ظاہر کر دیتی تھی۔ اور اس کا سر ہمیشہ عجیب و غریب کہانیوں، توہمات، حسد اور غیر معقول خیالات کی آماجگاہ بنا رہتا تھا —— اس قدر کہ جب میں اس سے کوئی بات کرتا تھا تو اس کے جاہلانہ جواب پر مجھے رونا آتا تھا!"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ وہ اس طویل گفتگو کی وجہ سے ہانپ رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور اس کی حالت زار پر رحم کھانے لگا۔ میں اسے جواب دینے ہی لگا تھا کہ کشتی اچانک کھڑی ہو گئی ہم اس وقت سینٹ کلاؤڈ پر تھے۔ لڑکی، جو اب تک میرے تمام خیالات کا مرکز بنی ہوئی تھی، اترنے کے لئے اٹھی۔ وہ ترچھی نگاہوں اور دزدیدہ تبسم سے میرے دل کو بھاتی ہوئی میرے پاس سے گذر گئی —— ایسے تبسم کے ساتھ جو ہمیں دیوانگی کے انتہائی درجے تک پہنچا دیتا ہے —— اس نے پلیٹ فارم پر قدم رکھا ہی تھا کہ میں اسے پکڑنے کے لئے دوڑا مگر میرے ہمسائے نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ میں نے جھٹکا دے کر اسے ایک طرف ہٹا دیا مگر اس نے جلدی سے میرے کوٹ کا ایک سرا پکڑ لیا۔ اور یہ کہتے ہوئے مجھے پیچھے کھینچنے لگا "مت جاؤ ... مت جاؤ ..." اس نے یہ الفاظ اتنی بلند آواز میں کہے کہ تمام آدمی ہماری طرف دیکھ کر ہنسنے لگے میں وہیں کا وہیں غصے سے بھرا ساکن و جامد کھڑا رہ گیا کیونکہ کشتی چل پڑی

اس وقت میری محبوبہ پلیٹ فارم پر کھڑی میری طرف حسرت خیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میرا ہمسایہ فرط انبساط میں تالیاں بجاتے ہوئے میرے کان میں کہنے لگا "دیکھو! میں نے تمہارے ساتھ بڑی نیکی کی ہے"۔

(موپاساں)

طاہر قریشی

دریغا کہ عہدِ جوانی گزشت

انقلابِ دوراں پر اشکِ خوں بہانا ہے کام کا یہ رونا ہے کام کا رُلانا ہے
سچ ہے فکرِ مستقبل ایک تازیانہ ہے حدِ شیب میں آخر تم کو بھی تو آنا ہے
دوستو! ادھر آؤ دردِ دل سنانا ہے
بے وفا جوانی کا یاد کچھ فسانہ ہے وہ بھی اک زمانہ تھا یہ بھی اک زمانہ ہے

جاذبِ دل و دیدہ اُف وہ چال مستانہ لغزشِ ضعیفی سے جس کا طرز بیگانہ
وہ شباب کی مستی وہ ادائے رندانہ وہ سرور خیز آنکھیں ذوق بخشِ میخانہ
اب کہاں وہ مے خانہ اب کہاں وہ پیمانہ
عبرت آفریں کتنا آہ یہ فسانہ ہے وہ بھی اک زمانہ تھا یہ بھی اک زمانہ ہے

انقلاب اثر ڈالے جس کی شادمانی پر کیوں نہ اُس کا دل مائل ہو گا نوحہ خوانی پر
حادثوں کی آندھی یوں آئے زندگانی پر اب بھی ہیں نہ ہوں گریاں اپنی خستہ جانی پر
ماتم اے ضعیفی کر رحلتِ جوانی پر
رحلتِ جوانی کا نوحہ اب سنانا ہے وہ بھی اک زمانہ تھا یہ بھی اک زمانہ ہے

وہ مئے محبت کے جام پے بہ پے پینا نشہ وہ جوانی کا بے سبو چہ و مینا
وہ بھرے بھرے بازو وہ بھرا بھرا سینہ خود کبھی میں کرتا تھا طے عروج کا زینہ
مشکل اب نقاہت کی وجہ سے ہوا جینا
اس فتادگی کا بھی کیا کوئی ٹھکانہ ہے وہ بھی اک زمانہ تھا یہ بھی اک زمانہ ہے

اشکِ ستہ حالی میں کیا ہو خواہشِ تزئیں رخصتِ جوانی نے کر دیا مجھے غمگیں
رعشہ دار ہاتھوں پر جتنی جھرّیاں دیکھیں دل پہ برچھیاں میں نے آہ اتنی ہی کھائیں
کیونکر اب نظر آئے مجھ کو صورتِ تسکیں
پیر ہوں، جوانی کا بارِ غم اٹھانا ہے وہ بھی اک زمانہ تھا، یہ بھی اک زمانہ ہے

علی منظور حیدرآبادی

دولت حاکم نہیں محکوم ہے

دماغ بہ کیف روح کی معراج ہے۔ دماغ، زندگی کا صرف ایک لازمی عنصر نہیں ہے جوہر حیات ہے۔ اس کی تہذیب سے زینہ بہ زینہ مقاصد کی سیڑھیاں طے کی جاتی ہیں۔ اور اگر آپ کی زندگی غیر مفید ہے تو دوسروں کے لئے بھی اور خود آپ کے لئے بھی بارِ دوش ہو جائے گی۔ دولت صرف خدمت کر سکتی ہے، دماغ خلاق ہے۔ دماغ جہاں کہیں سرگرم عمل ہو جائے دولت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے اور ہوتی رہے گی۔ کارلس پی رومولو نے کیا لطیف فقرہ لکھا ہے۔ "دولت میں اطاعت اور تجارت کا مادہ ہے۔ مگر وہ تخلیق میں سراسر نکمی ہے۔" غلبہ کا خلاصہ نذرِ نگاہ ہے۔

آپ لوگوں کی حیات میں آج کا دن عظیم ہے۔ میں آپ کے سامنے حاضر ہوا ہوں مگر قدم رک رک کر اٹھتے ہیں اور آواز لڑکھڑائی جا رہی ہے میں افتتاحی مقرر ہوں مجھ سے کچھ ایسے منتر پوچھے گئے ہیں جن کے ذریعے سے آپ اپنی پیاری سرزمین سے مصیبتوں کے دل بادلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہٹا دیں۔ آپ جس منزل پر پہنچنے والے ہیں میں وہاں سے کب کا گزر چکا ہوں میری آنکھیں ان نظاروں سے لطف اٹھا چکی ہیں جو آپ کی نگاہ سے گزرنے والے ہیں سرد و گرم چکھ چکا ہوں، دنیا دیکھ چکا ہوں۔ وہ دروازہ جس میں داخل ہو کر دنیائے ظفر میں جایا جاتا ہے مقفل اور سربمہر ہے۔ سنئے ایک لفظ بتا دوں، جو کھل جا سم سم کا کام دے سکے۔

میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں مگر میرے جیب میں کامیابی کی کنجی موجود نہیں ہے۔ بھلا وہ چیز کہاں سے دوں جو خود میری گرہ میں نہ ہو۔ میں اس چیز کے حاصل کرنے کی تدبیر بتا ہی نہیں سکتا جس کی کوئی ایسی مکمل تعریف نہ ہو کہ ایک ہی لباس ہر جسم پر ٹھیک اتر سکے میں کامیاب بننے کی راہ نہیں دکھا سکتا۔ اس لئے کہ کامیابی سراب ہے۔ اضافی ہے اور بے نیازِ تعریف ہے۔

تکمیلِ مقصد کے متعلق جو چاہے کہہ لیجئے۔ یہ ایک ایسی الجھی ہوئی گتھی ہے جس کے سلجھانے کی فکر ہر شخص نے، ہر تہذیب نے ہر زمانے میں کی ہے۔ یہاں تک کہ تمدن کے گہوارے میں شیر خواروں نے بھی ہاتھ پاؤں پٹکے ہیں۔

تکمیل کیا ہے؟ مقصد کسے کہتے ہیں؟ اس کا علم صرف آپ کو ہے اور آپ ہی کو رہے گا۔

مگر یہ میں جانتا ہوں اور آپ بھی جانتے ہیں کہ ہم سب زائرین۔ آپ کا سفر شروع ہونے والا ہے۔ آپ کے مقصد کا شوالہ سڑک کے اس موڑ پر سامنے ہے۔ مگر تھوڑی دور ہے۔ یہی شوالہ سب کچھ ہے اور اسی شوالے میں اس بڑے بت کی پوجا ہوتی ہے جس کا نام ہے نصب العین۔

آپ اس کی پرستش کرتے ہیں اس لئے کہ یہ آپ ہی کا ہے، آپ ہی نے اس کو ظاہر کیا ہے اور صرف آپ ہی کے سینے میں اس کا راز محفوظ ہے اور چونکہ یہ چیز آپ ہی کی ہے نہ مجھے اختیار ہے نہ کسی دوسرے مقرر کو حق ہے کہ آپ سے چھین کر اس کی تحلیل کرے یا چیر پھاڑ سے کام لے کر دوسروں کو دکھائے۔ اگر میں یا کوئی اور مقرر آپ کو حصول کی راہیں بتائے تو شرافت و دیانت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگ جائے گا۔ پہلا جرم خود پرستی ہوگا۔ دوسری شکل ذاتی غرور کا آئینہ ہوگی۔

آپ اگر جاننے کے لئے بے چین نہیں ہیں کہ آپ کو سڑک کے اس موڑ کے بعد کونسی چیز ملے گی یا یہ کہ کوئی چیز ملے گی بھی کہ نہیں تو اتنا معلوم کرنے کے لئے یقیناً مضطر ہیں کہ رہ گزاری کا جو سفر درپیش ہے۔ اس میں کیا کیا مصائب جھیلنے پڑتے ہیں۔ سنئے یہ ایک کھلا ہوا راز ہے ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ اٹھارہ برس پہلے میں بھی یہیں تھا جہاں آپ ہیں میں بھی آپ ہی کی طرح شاید مستقبل کے چہرے سے نقاب طلسم دور کر دینے کے لئے بے چین تھا۔ مگر آپ ہی کی طرح میں بھی بے بس اور بے کس کھڑا ہوا تھا جیسے کوئی مادر زاد اندھا کسی چیز کی تلاش میں ادھر ادھر ہاتھ دوڑائے اس گھڑی سے اب تک حجاب نقاب تھوڑا سا دور ہو چکا ہے۔ میں نے جو کچھ دیکھا ہے اور مجھ پر جو کچھ گذری ہے۔ وہ میری معلومات کا ایک جزو ہے۔ میری حیات کا ایک جزو ہے۔ جوانی کو حق ہے کہ بوڑھاپے کے تجربوں سے فائدہ اٹھائے۔ میں بھی آپ بیتی کی ایک چلتی پھرتی تصویر آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تصویر جاذبِ نگاہ نقش و نگار کی حامل تو ہے مگر مکمل نہیں ہے۔ آپ خود

دیکھ لیجئے گا کہ جگہ جگہ سیاہ دھبے بھی ہیں، اور شفق کی سرخی میں رات کی سیاہی بھی مخلوط ہے۔ اور یہی چیز آپ کو عالمِ حیات میں بھی ملے گی۔ یہ خوب سمجھ رکھئے کہ نقابِ مستقبل دور ہوتے ہی آپ کو جو چیز ملے گی وہ حیات ہے ایسی حیات جس میں نام کو بھی استقلال نہیں، جو صرف مسلسل تغیر میں کسی حد تک مستقل ہے۔ جہاں گھاٹیوں کے بعد چوٹیاں، نور کے دوش بدوش سایہ ہمیشہ رہتا ہے۔ اور اگر یہ ہو تو زندگی زندگی ہی نہ ہو۔

لیجئے حجاب دور ہو گیا۔ اب آپ کو کیا نظر آتا ہے؟ دیکھئے کیسے قلیل زادِ راہ کے ساتھ آپ سفر پر روانہ ہو رہے ہیں۔ آج کی دنیا خاموش غمگین اور فکرمند ہے۔ تمام عالم اقتصادی ہیجان کی دبیز اور سیاہ چادر میں ملفوف ہے۔ جہاں بیکاری کی حیات ایک لفظِ بے معنی ہے۔ وہاں ستم یہ ہے کہ کچھ کام بھی نہیں ہے۔ محلِ انسانیت کی اینٹ سے اینٹ بج چکی ہے۔ جہاں انسانیت کے جہاز نے لنگر ڈال رکھا تھا وہاں اب طوفان خیز لہریں ڈگمگاتے ہوئے جہاز سے کھیل رہی ہیں۔ حیات دودھ کی مکھی بنی ہوئی ہے کہ دیکھتے ہی نکال کر پھینک دی جائے۔

اگر آج ہمارے عالم میں کوئی مذہب ہے تو وہ "بے اعتقادی" اور "بے اعتباری" کا مذہب ہے۔ حتیٰ کہ تعلیم بھی اب قدر و عظمت کی محرک نہیں رہ گئی۔ اس پر بھی مشکوک نگاہیں ڈالی جاتی ہیں۔ صاف نگاہوں میں بعض وقت وہم پرستیاں بھی محلول نظر آتی ہیں۔ روحِ عالم مریض ہے۔ اقتصادی طوفان کے تھپیڑے اپنا کام کر رہے ہیں۔ عالم کا رخ بدل گیا ہے۔ مادیت کا دورِ دورہ ہے۔

آپ عازمِ سفر ہیں تو دیکھیں گے کہ ہمیشہ والی "انسان با انسان" جنگ اور کبھی ختم نہ ہونے والی کشمکش اب اور بھی تیز ہو گئی ہے۔ مگر مریض کو ایک نئی سوئی دی گئی ہے، اور روح و دولت میں ہاتھا پائی شروع ہو گئی ہے۔

ذرا رکئے اور سوچئے

ہمارے سماج کے لئے دولت جزوِ حیات ہے۔ ہم اس کے لئے خون پانی ایک کر دیتے ہیں۔ جب تک دولت میں یہ خوبی ہے کہ منزلِ مقصود کے لئے رہبر بن سکے یا نصب العین تک پہنچا سکے اس وقت تک قدر و قیمت گھٹ نہیں سکتی۔ مگر منزل پر پہنچنے کے بعد اور کوچۂ مقصود میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی یہ دولت طوقِ لعنت ہو جاتی ہے۔

اور اگر احتیاط نہ ہو گی

تو

دولت دماغ پر قابو پا لے گی اور بندہ، مالک، نوکر آقا اور محکوم حاکم بن جائے گا۔

عابد الہ آبادی

غزل

مجھ ناتواں نے بارِ تمنا اٹھا لیا
ہمت تو دیکھئے غمِ دنیا اٹھا لیا

اک غیر ہے کہ لطف کا حامل نہ ہو سکا
اک میں کہ جس نے غمزۂ بیجا اٹھا لیا

دو چار نقشہائے جبیں چھوڑ ہی چلے
اور آستاں سے تیرے بھلا کیا اٹھا لیا

بزمِ جہاں میں رہ کے جو عبرت نگر رہی
کچھ اس نظر نے لطفِ تماشا اٹھا لیا

بجلی سی کوندتی ہے سرِ بزم بار بار
کس نے نقابِ صورتِ زیبا اٹھا لیا

حاجی سرحدی

میگھ دوت

(۱)

ملاقات کے پہلے دن بانسری نے کیا کہا تھا؟

اس نے کہا تھا" وہی آدمی میرے پاس آیا ہے جو دُور کا تھا"۔
اور کہا تھا" پکڑ لینے پر بھی جسے پکڑا نہیں جا سکتا اُسے پکڑ لیا ہے پا لینے پر بھی جو تمام فاصلوں سے پرے ہے اُسے پا لیا ہے"۔

اس کے بعد پھر روز بانسری بجتی کیوں نہیں؟ کیونکہ آدھی بات بھول جو گیا ہوں۔ صرف یہ یاد رہا کہ وہ پاس ہے لیکن وہ دور بھی ہے اس بات کا دھیان نہیں رہا۔ پریم کے جس آدھے حصے میں ملاقات ہے اسی کو دیکھتا ہوں جس آدھے حصہ میں جدائی ہے اُس پر نگاہ ہی نہیں جاتی جس سے ہمیشہ آنکھیں دیدار کی پیاسی رہتی ہیں پاس کے پردے سے اُس نے اب اوٹ کر لی ہے۔ دو ہستیوں کے بیچ جو لامحدود آسمان ہے۔ وہاں سب چُپ ہیں، وہاں باتیں نہیں ہوتیں۔ اُس گہری خاموشی کو بانسری کی تان سے بھر دیا جاتا ہے۔ لامحدود آسمان کا پتہ نہ ملتا تو بانسری بجتی ہی نہیں۔ ہمارا وہ بیچ کا آسمان آندھی سے چھا گیا ہے۔ روز کے کام کاج اور بات چیت سے روز کے خوف، فکر اور بخل سے بھر گیا ہے۔

(۲)

کسی کسی دن چاندنی رات میں ہوا چلتی ہے۔ تو اس وقت بستر پر جاگ کر بیٹھے رہنے میں دل دکھی ہو اُٹھتا ہے۔ اس وقت خیال آتا ہے کہ اس کو تو میں نے کھو ہی دیا۔

یہ جدائی ہے کس طرح! میری زندگی کے ساتھ اس کی جدائی ہے۔ دن کے آخر میں کام کاج سے چھٹی پا کر جس کے ساتھ باتیں کرتا ہوں وہ کون ہے! وہ تو سنسار کے ہزاروں آدمیوں میں ایک ہے۔ اُسے تو میں نے جان لیا ہے پہچان لیا ہے۔

وہ تو ختم ہو چکی لیکن اس کے اندر کہاں ہے میری وہ کبھی ختم نہ ہونے والی ایک میری وہ ——— اُسے پھر سے نئی طرح سے کہاں کس آرزو کے بحرِ بے کراں کے کنارے ڈھونڈ نکالوں! اس کے ساتھ پھر ایک بار کس وقت کی جاں نثاری کی بات کروں؟ کس بن کی خوشبو میں؟ کس بدقسمت رات کی تاریکی میں؟

(۳)

اتنے میں آر کی ہوا نئی بارش کو اڑاتی ہوئی پورب کی سمت میں آ پہنچی اجین کے کوی کی یاد اُٹھ آئی۔ سوچا پیاری کے پاس قاصد بھیجوں۔ میرے گیت! اڑ چل! اپنی اس ناقابلِ بود و باش پُر خار وادی کو پار کر جا۔ لیکن میرے گیت کو جانا پڑے گا۔ موت کے خلاف ——— بانسری کی اُسی محبت بھری پہلی ملاقات کے دن میں، جہاں دنیا کی جاودانی بارش اور جاودانی بسنت کی تمام خوشبو اور تمام لطف اکٹھا ہو کر رہ گیا ہے۔ کیتکی بن کے لمبے لمبے سانسوں میں اور رسال کے درختوں کے جھنڈ میں۔

سنسان ندی کے کنارے ناریل کے درختوں سے ٹکراتی ہوئی ہوا میں بارش کی بات کو ملا کر میری پیاری کے کانوں تک پہنچا دے جہاں وہ اپنے بکھرے بالوں کو سنوار کر ان میں گانٹھ دے کر کمر سے آنچل باندھے اپنے دنیاوی کاروبار میں مشغول ہے۔

(۴)

بہت دور کا لامحدود آسمان آج بن کے درختوں کی قطار سے نیلی زمین کے سرہانے کے نزدیک جھک پڑا اور کان میں بولا "میں تمہارا ہی ہوں"۔
زمین نے کہا " یہ کیسے ممکن ہے تم تو لامحدود ہو اور میں چھوٹی ہوں"۔
آکاش نے کہا " میں نے تو چاروں طرف اپنے بادلوں کی حد کھینچ دی ہے"۔

زمین بولی " تمہارے پاس تو تاروں کی بہت دولت ہے۔ میرے پاس نور روشنی کی دولت نہیں ہے"۔

آکاش نے کہا " میں اپنا چاند، سورج اور تارے سب کھو آیا ہوں۔ آج میری صرف تم ہی ہو"۔

زمین بولی " میرا آنسوؤں بھرا دل ہوا کے ہر جھونکے سے چنچل ہو کانپنے لگتا ہے۔ تم تو ساکن ہو"۔

آکاش کہنے لگا " میرے آنسو بھی آج چنچل ہو گئے ہیں۔ دیکھ نہیں رہی ہو میرا دل آج سانولا ہو گیا ہے۔ تمہارے اس سانولے دل

کی طرح۔ یہ کہہ کر اس نے آسمان اور زمین کے بیچ کی ہمیشہ کی جدائی کو آنسوؤں کے گیت سے بھر دیا۔

(۵)

اس آکاش زمین کے بواہ منتر کی گونج کو لے کر نئی بارش اتر آئے نا اور ہماری بیاری میں جتنے راگ ہیں اک دم جاگ اٹھیں۔ سارنگی کے تاروں کی طرح چونک پڑیں۔ وہ اپنے ماتھے کی مانگ کو دور بن کے اختتام کے آسمان کی طرح اپنے نیلے آنچل سے ڈھک لے۔ اس کی کالی آنکھوں کی چتون سے میگھ ملار کے سارے قطرے بے چین ہو اٹھیں اور اس کے دل کی بات کو ظاہر کرنے لگیں۔ اور اس کی چوٹی میں لپٹ لپٹ کر جب چھندوں کی جھنکار سے بن کا اندھیرا تھر تھر کانپ رہا ہو جب بارش کی ہوا سے دیئے کانپتے کانپتے بجھ چکے ہوں تب وہ اپنے بہت ہی پاس کے اس سنسار کو چھوڑ کر چلی آئے بھیگی گھاس کے خوشبو سے بھرے بن کے راستے سے میرے تنہا دل کی رات میں....

(ہندی)

اندر جیت شرما

غزل

عالمِ نزع میں ہے آہ جانِ نزار رات سے
عہدہ برآ نہ ہو سکی کشمکشِ حیات سے

کیسا فریب کھا گیا عقل کی بھول دیکھئے
یعنی توقعات تھیں مجھ کو تمھاری ذات سے

شورشِ ہاؤ ہو نہ ہو جس میں بہشت ہی تو کیا
جس سے قویٰ ہوں مضمحل فائدہ اس نجات سے

ہاں دلِ بے نوا سنا نغمۂ غم فزا کوئی
پہلو میں اٹھ رہا ہے کچھ درد سا پچھلی رات سے

دیر و حرم میں جا کے بھی دل کی لگی نہ بجھ سکی
پیدا کریں کوئی صنم دل ہی کے سومنات سے

ناظر اوجلوی

رباعی

ہوتی نہیں واں دیکھنے سے سیری اے شیخ
پیاسی ہے نگاہ میری اے شیخ
حیراں سے پیاساں جھیل
ہے کھنڈر کا رنگ محل اس سے اے شیخ
سرکار یہ ہے خانقاہ تیری اے شیخ

منظور حیدرآبادی

دیہاتی گیت

گرمیوں کی سہانی رات تھی، صاف شفاف آسمان پر چودھویں کا چاند چمک رہا تھا۔ کملا پور کے نکلتے ہوئے کنارے کو گنگا تین طرف سے گھیرے ہوئے دودھ کی ندی کی طرح بہہ رہی تھی میں اپنے دوست جیون سنگھ کے ساتھ بیٹھا ہوا اپنی زندگی سے معمور ہنسی میں مست، مناظر قدرت کی سیر میں محو تھا۔ تاروں کی روشنی سے افق چمک رہا تھا۔ کہکشاں کے پاس ہی ایک چھوٹا سا ستارہ روشن تھا۔ وہ جیسے چاند کو چھو لینا چاہتا تھا لیکن پہنچ نہیں سکتا تھا۔

میں نے جیون سے پوچھا "تم بتا سکتے ہو وہ کون سا تارا ہے؟"

"رد ہیڑین ہوگی" جیون کے اس جواب پر میں ہنسنا ہی چاہتا تھا کہ دور سے کانوں میں ایک سہانی آواز آئی۔

برجوری بسے ہو نینواں میں
نینواں میں ہو سپنواں میں

برجوری بسے ہو.....

اس نغمہ میں درد و غم بھرا ہوا تھا دل کو برباد دینے والی کسک تھی۔

میری ہنسی کافور ہوگئی۔ اس درد کو تلاش کرنے کے لئے میں افق کی جھالروں سے گنگا کے اُس پار گنجان درختوں کی قطار کو دیکھنے لگا لیکن کوئی نظر نہ آیا۔

میں چپ تھا کہ ایک پھر آواز آئی۔

اپنے بابا کی پیاری دلاری
کھیلت رہی انگنواں میں

برجوری بسے ہو.....

میں اس طرح محو ہو کر سننے لگا جیسے کوئی بھولی ہوئی دلکش کہانی ہو۔ دل میں شوق و آرزو تھی، اور ایک ٹیس بھرا استعجاب.... پھر آواز آئی—

ای کل بتیاں کیوں ناہیں جنلی
دیکھلی کیوں نا سپنواں میں

برجوری بسے ہو.....

میں بھولے پن سے اس گیت کا مطلب لگانے لگا۔ "آنگن میں کھیلتے ہوئے وہ کون سی بات تھی جسے جاننے کے لئے دل چنچل بالک کی طرح مچل گیا!

مجھے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے انھیں نامعلوم باتوں کے پُر اسرار جال میں دل مچھلی کی طرح چاندی کے سمندر میں تڑپ رہا ہے۔

میں نے بے قرار ہو کر کہا "جیون! اس کا گانا سنواؤ دو بولو بلواؤ گے؟"

"نہیں جی، وہ پگلی ہے"

"پگلی...... ہرگز نہیں ایسا اچھا گانے والی پگلی نہیں ہو سکتی۔ جیون! اسے بلاؤ۔ بہانہ نہ کرو۔"

"تم فضول ضد کر رہے ہو" ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے جیون نے کہا یہ دیکھ کر میرا استعجاب اور بھی بڑھ گیا۔ میں نے کہا "ضد نہیں۔ لڑائی بھی کرنی پڑے تو کر دوں گا۔ بتاؤ تم اسے کیوں نہیں بلانا چاہتے!"

"وہ اسی گاؤں کے بھاٹ کی لڑکی ہے۔ کچھ دنوں سے پاگل ہوگئی کبھی کبھی رات بھر گنگا کے کنارے گاتی ہوئی گھوما کرتی ہے"۔

"تو اس سے کیا! اسے بلاؤ بھی"

"نہیں میں اسے نہیں بلوا سکتا"

"اچھا تو یہی بتا دو کہ کیوں نہیں بلوا سکتے؟"

"یہ سن کر کیا کرو گے؟"

"جیون! میں سنوں گا۔ اور ضرور سنوں گا۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں اس وقت تمہاری زمینداری میں بیٹھا ہوں، اس لئے ڈر جاؤں گا" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

جیون نے کہا "اچھا سنو——"

تم جانتے ہو کہ دیہاتوں میں بھاٹوں کا خاص کام ہے اپنے کسی ٹھاکر کے گھر تقریبوں کے موقع پر ان کی تعریف و توصیف کے گیت سنانا۔ ان کے گھر کی عورتیں بھی گھروں میں گاتی بجاتی ہیں۔ اس طرح نندن بھی میرے خاندان کا پرانا بھاٹ ہے۔ اس کی لڑکی رد ہیڑین بیوہ ہوگئی۔

میں نے بیچ ہی میں ٹوک کر کہا "کیا نام بتایا؟"

جیون نے کہا "رد ہیڑین۔ اسی سال اس کا گون ہونے والا تھا۔ نندن کو بھی نہیں ہے۔ اسے اور بھاٹوں کی طرح مانگنے میں بھی

سنکوچ معلوم ہوتا ہے۔ یہاں سے تھوڑی دور گنگا کنارے اس کی کٹیا ہے۔ وہاں ہرے بھرے پیڑوں کا سہانا جھرمٹ ہے۔ ایک روز کھیت دیکھ کر میں گھوڑے پر آرہا تھا۔ دھوپ بہت تیز تھی میں نندن کے گھر کے پاس پیڑوں کے سائے میں ٹھہر گیا۔ نندن نے مجھے دیکھتے ہی کمبل بچھا کر اپنی جھونپڑی میں بٹھایا۔ میں لُو سے ڈر رہا تھا۔ اس لئے کچھ دیر تک وہیں رہنا مناسب معلوم ہوا۔

جیون کو مٹھائی دیتے دیکھ کر میں ہنس پڑا۔ لیکن جیون نے اس کی طرف کچھ توجہ نہ کی اور اپنی کہانی کو سنجیدگی سے جاری رکھا۔

"آ جاؤ نا۔ نندن نے پکارا ـــ روہیٹریں! ایک لوٹا جل لے آ یہی تو اپنے مالک ہیں۔ ان سے لاج کیسی؟ روہیٹریں آئی۔ اس وقت اس کے شباب کا آغاز تھا۔ محنت کرنے سے اس کی تمام رگیں جیسے گڑی ہوئی تھیں۔ میں نے دیکھا اس کی جھکی ہوئی پلکوں سے کالی زلفیں اٹکھیلیاں کر رہی تھیں اور ان زلفوں سے جیسے درد و غم کی خاموش سرسوتی ہزاروں دھارے لئے ہوئے بہہ رہی تھی۔ . . . . . . میں نہ جانے کیوں تڑپ اٹھا . . . . . اور زیادہ دیر تک وہاں نہ ٹھہر سکا۔ اپنے گھر چلا آیا۔

× × × × ×

دسہرے کا تیوہار تھا۔ گھر میں گانا بجانا ہو رہا تھا۔ میں اپنی شریمتی جی کے پاس جا بیٹھا۔ انھوں نے کہا "سنتے ہو؟"

میں نے کہا "دونوں کانوں سے۔"

انھوں نے کہا "روہیٹریں اب بہت اچھا گانے لگی ہے۔ اور ایک تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ گیت بناتی بھی جاتی ہے گاتی بھی جاتی ہے۔ تمہارے گاؤں کی لڑکیاں تو بڑی گنونتی ہیں۔"

میں "ہوں" کہہ کر اٹھ کر باہر آنے لگا۔ دیکھا تو روہیٹریں جوار لئے کھڑی ہے میں نے سر جھکا دیا۔ جو کی پتلی پتلی لمبی دھانی پتیاں میرے کانوں سے اٹکا دی گئیں۔ میں اسے کچھ دیئے بغیر باہر چلا آیا۔

پیچھے سے سنا کہ اس ڈھٹائی پر میری ماتا جی اس سے بہت بگڑیں اسی روز سے اس کا کوٹھی میں آنا بند ہو گیا۔

نندن بڑا دکھی ہوا۔ اس نے بھی آنا بند کر دیا۔ ایک دن میں نے سنا اس کی سہیلیاں اس سے میرے بارے میں مذاق کر رہی تھیں۔ وہ یکایک بہت مشتعل ہو گئی۔ اور بولی "تو تم لوگوں کا کیا؟ میں مرتی ہوں۔ انھیں پیار کرتی ہوں تو تمہاری بلا سے!

سہیلیوں نے کہا باپ رے! اس کی ڈھٹائی تو دیکھو! وہ اور بھی گرم ہوتی گئی۔ انھوں نے روہیٹریں کو یہاں تک چھیڑا کہ وہ بے سر و پا بکنے لگی۔ اسی روز سے اس کا بکنا بند نہ ہوا۔ اب وہ گاؤں میں پگلی سمجھی جاتی ہے۔ اسے اب بچا سنکوچ نہیں . . . . جب جی میں آتا ہے گاتی ہوئی گھوما کرتی ہے۔

جیون نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا: سن لیا تم نے! یہی اس کی کہانی ہے۔

اب تمہیں کہو میں اسے کیونکر بلاؤں؟

جیون سنگھ اپنی بات ختم کر کے چپ ہو رہے۔ اور میں اپنی قوت متخیلہ سے پھر وہی گیت سننے لگا۔

برجوری بسے ہو مینواں میں

اب یہ نغمہ آہستہ آہستہ قریب آنے لگا۔ اس مرتبہ کان میں آواز آئی

موری سکیا نی پڑھیو کھیونا
گاری دیو کینہ صوں مینواں میں

میں نے سنا اس دیہاتی زبان میں پگلی کے دل کی دردانگیز کہانی تھی یہ گیت دلی جذبات کی جیتی جاگتی تصویر تھا میں ہمہ تن محو ہو رہا تھا۔

جیون سنگھ نہ جانے کیوں تڑپ اٹھے، اور اٹھ کر ٹہلنے لگے۔ چھت کے نیچے سے گانے کی آواز آرہی تھی۔ درد و غم میں ڈوبی ہوئی رسیلی تان دل کو ہلانے لگی۔ میں نے کہا "جیون! اسے بلاؤ۔ میں اس پریم جوگن کے درشن تو کر لوں"۔

یکایک سیڑھیوں پر کسی کے آنے کی آہٹ معلوم ہوئی ہو ہی پگلی روہیٹریں جیون کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

پیچھے پیچھے سپاہی دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے ڈانٹ کر کہا "ہٹ پگلی!"

جیون اور ہم چپ تھے۔ اس نے ایک بار گھوم کر سپاہی کی طرف دیکھا۔ سپاہی سہم گیا۔ پگلی روہیٹریں پھر گانے لگی۔

ڈھیٹ بسارے بسرت ناہیں، کیسے بسوں جانے بنواں میں
برجوری بسے ہو . . . . .

سپاہی نے کڑی آواز میں پھر ڈانٹا وہ ڈر کر بھاگی یا پیچھے ہٹی مجھے اچھی طرح یاد نہیں لیکن چھت کے نیچے چاندنی کرنوں سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی سیس لہروں میں ایک چھپا کا ہوا . . . . !

جیون حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ میں بھی اس حسرت انگیز تماشے کو دیکھنے لگا۔ روہیٹریں جیسے چاند کا پیچھا کر رہی تھی۔ اور نیچے اس چھپاکے سے؟

آسی رام نگری

۱ اٹھتے ہوئے سیکڑوں بلبلوں میں منعکس روہیٹریں کی کرنیں نظروں سے غائب ہو رہی تھیں۔

رباعیات

۱

ملتا ہوں تو سر سے بلا جھٹکا لیتا ہوں
پھر فرش دل و چشم بچھا لیتا ہوں
سکھائی ہے اتفاق طبیعت اپنی
دشمن کو بھی میں دوست بنا لیتا ہوں

۲

دیوانہ وش و خاک سر ابتر رہتا ہے
آشفتہ دل و خستہ جگر رہتا ہے
خنجر کا اسے خوف نہ تلوار کا ڈر
شاعر بطرف تیر نظر رہتا ہے

۳

ہر چند کہ آلودہ شر رہتا ہوں
روشن دل و آزاد نظر رہتا ہوں
احباب تو احباب ہیں ان کا کیا ذکر
دشمن سے بھی میں شیر و شکر رہتا ہوں

۴

خنجر سے اگر گردن سے چھٹ جاتا ہے
گلے مل کے جو سب کٹ جاتا ہے
لیکن یہ کیا کسی نے
اس وقت کی بیتابی دل
بدروں سے سر عجز لپٹ جاتا ہے

نجیب ندوی

خلجی بغاوت

یوں تو ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت سے شروع ہوتی ہے یعنی اُس وقت سے جبکہ مسلمانوں کا ایک غارتگر گروہ تھانہ پر حملہ آور ہوا اور اپنے دلیر مگر بدقسمت نوجوان رئیسِ عساکر محمدؒ بن قاسم[1] کی قیادت میں سندھ کی سرزمین پر تسلط کر کے ایک اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالنے میں کامیاب ہوا، لیکن دہلی میں مسلمانوں کی تاریخ کا آغاز ۱۲۰۶ء سے ہوا جبکہ شہاب الدین محمد غوری کے نائب سلطنت قطب الدین ایبک نے سلطنتِ غلاماں کی بنیاد ڈالی۔ یہ سلطنت گیا تھی بوطوائف الملوکی، ہنگامہ آرائی، بغاوت، سازش اور قتل و غارت کا ایک دور تھا جس نے خلجیوں کے لئے جو اعضائے حکومت کے مفلوج ہو جانے سے اپنی قوت کو خاموشی کے ساتھ مستحکم کرتے رہے تھے علم بغاوت بلند کرنیکا اور پہلی اور آخری بار اپنی قسمت آزمائی کا موقع فراہم کر دیا۔

خلجیوں کی بغاوت اور حکمران غلام خاندان کے خاتمے کے بعد دہلی کے تخت پر تسلط کرنا ہند کی سلطنتِ اسلامیہ ترکیہ کی تاریخ میں "خلجی بغاوت" یا "خلجی انقلاب" کے نام سے موسوم ہے خلجی بغاوت کی جو تاریخی اہمیت ہے وہ چند لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتی۔ یہ بہت تفصیل طلب اور دلچسپیوں سے لبریز داستان ہے۔

خلجیوں کی اصل خلجی کون تھے اور ان کی حقیقت کیا تھی؟ راورٹی (Raverty) ان کو ترکوں میں شمار کرتا ہے لیکن اس کا معاصر مورخ ضیاء الدین برنی مصنفِ تاریخ فیروز شاہی جس کا باپ اور چچا دونوں شاہی ملازم تھے[2] لکھتا ہے کہ

"جلال الدین فیروز اُس نسل سے تھا جو ترکوں سے بالکل مختلف تھی[3]۔"

لیکن درحقیقت خلجی[4] قصبہ خلج کے جو افغانستان میں واقع ہے رہنے والے تھے اور اسی نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ ان کی نسل کے متعلق مورخین میں اختلاف[5] ہے۔ اگرچہ یہ ترک تھے لیکن افغانوں میں اس قدر مخلوط ہو گئے تھے کہ ان میں اور افغانوں میں کوئی فرق باقی نہ رہا تھا۔ ہندوستان میں پٹھان کہلاتے تھے۔ بہرکیف اس قبیلے کے افراد شمالی ہندوستان میں بنگال تک پھیلے ہوئے تھے اور سلطنتِ غلاماں کے عہد میں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز ہو گئے تھے۔ دہلی میں خلجی اچھی نظروں سے نہیں دیکھے جاتے تھے اور خود جلال الدین جو ایک با اقتدار فوجی افسر کی حیثیت رکھتا تھا ارکانِ سلطنت کا محسود تھا۔ وزیرِ وقت کے رفقا اس سے کھٹکتے تھے اور موقع پاکر اس کو قتل کر دینے کی فکر میں تھے۔ مگر کس کو معلوم تھا کہ یہ بڈھا جو قبر میں پیر لٹکائے ہوئے ہے اسلامی سلطنتِ دہلی کے تخت و تاج کا مالک ہو گا، اور ایک دن برسرِ اقتدار ہو کر ایک ایسے خاندان کا بانی ہو گا جو کم و بیش ربع صدی تک (۱۲۹۰ء سے ۱۳۲۰ء تک) ہندوستان کو اپنے زیرنگیں رکھ کر ملک کی تاریخ میں ایک جدید باب کا اضافہ کرے گا اور اس کا ایک حکمران علاء الدین خلجی (۱۲۹۶ء تا ۱۳۱۶ء) ہندوستان کے ان معدودے چند اولوالعزم مسلم سلاطین میں ہو گا جن کی مثالیں اسلام کی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ میں شاذ ہیں۔

---

[1] محمد بن قاسم کا انجام تاریخ ہند کا ایک جگر خراش اور دلدوز واقعہ ہے جس کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں مختصر یہ ہے کہ اس کو ہندوستان کی سرزمین پر علم اسلام نصب کرنے کا صلہ یہ ملا۔ وہ حجاج کے حکم سے نہایت سفاکی سے قتل کیا گیا۔ [2] باپ برن میں اور چچا کڑا اور اودھ میں رہتے تھے۔ اس وجہ سے اس کے ذرائعِ اطلاع معاصر مورخین سے زیادہ موثق ہیں [3] تاریخ فیروز شاہی۔
[4] خلجی ترکی سرفروشوں کے ایک گروہ یا ایک قبیلے کا نام تھا جو اپنے بخت کار سردار جلال الدین فیروز کی سرکردگی میں ابھرے اور پھر خاندانِ غلاماں کا استیصال کر کے برسرِ حکومت ہو گئے۔ [5] فرشتہ صاحب تاریخ سلجوقیاں سے نقل کرتا ہے کہ ترک بریافت کے گیارہ فرزند تھے ان میں سے ایک خلج کے نام سے موسوم تھا جس سے اس کی اولاد کا نام خلجی ہو گیا۔ مگر نظام الدین بخشی اس خیال سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "میں نے ایک معتبر تاریخ میں پڑھا ہے کہ خلجی قلیج خاں کی اولاد ہیں، جو چنگیز خاں کا داماد تھا اور اپنی بیوی سے آزردہ خاطر رہتا تھا۔ قلیج چنگیز کے خوف سے کوہستانِ غور کی طرف فرار ہو گیا اور وہاں ایک چھوٹی سی ریاست میں جا کر بیٹھ گیا۔ قلیج تحریف ہو کر قالج ہو گیا اور پھر رفتہ رفتہ کثرتِ استعمال سے خلج ہو گیا۔" بخشی کسی تاریخ کا نام نہیں لکھتا۔ قالج اور قلیج ترکی زبان میں شمشیر کو کہتے ہیں ۱۲

دہلی کی سیاسی فضا اور بغاوت کے اسباب

۱۲۸۷ء میں بلبن اپنی چالیس سالہ حکومت کے بعد تہہ خاک ہو چکا تھا۔ اب تک ہندوستان میں حکومت کے فلسفہ کو اس سے بہتر کسی نے نہ سمجھا تھا۔ اس نے بڑی شان و شوکت اور دبدبہ و استقلال سے حکومت کی تھی۔ خلوت میں بھی ملازمین بغیر وردی کے حاضر نہ ہو سکتے تھے۔ ادنیٰ سی بات یہ بھی کہ کسی نے کبھی اس کو قہقہہ مارتے نہیں سنا تھا۔ اس کی تعلیم بہترین اصول کے ماتحت ہوئی تھی۔ لہو و لعب سے اس کو فطری تنفر تھا۔ دربار میں آداب کا بہت لحاظ رکھا جاتا۔ مسخراپن یا غیر سنجیدہ کلام تعزیر کا مستوجب ہوتا تھا۔ عنفوان شباب میں اس نے شراب ضرور پی تھی، لیکن سر بر آرا ہونے کے بعد پھر کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کے سامنے شراب کا نام لیتا۔ چالیس سال کی حکومت میں جس میں بیس سال وزارت کے اور بیس سال سلطنت کے شامل ہیں کوئی موقع ایسا نہیں بتایا جا سکتا جہاں اس نے ادنیٰ طبقہ کے کسی فرد سے گفتگو بھی کی ہو۔ جذبات اور عہدوں کی تفویض میں وہ نجابتِ خاندان کا بڑا خیال رکھتا اور کمتر درجے کے لوگوں کو کبھی کوئی ذمہ دار خدمت نہ دیتا تھا۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ غلام نہیں تھا؛ لیکن ایسا غلام تھا جس کا خاندان ایک مدت سے حکمرانی کرتا چلا آتا تھا۔ بلبن غلام پھر سقہ، پھر محافظِ شکارگاہ، پھر سپہ سالار، پھر مدبر و وزیر، اور آخر میں خود سلطان غیاث الدین بلبن دہلی کے سلاطین میں ایک ایسی شخصیت ہے جس کی زندگی اور جس کا عہدِ حکومت تاریخِ ہند میں ایک مستقل باب ہے۔

۱۲۸۶ء میں جیسا کہ ہم سطورِ بالا میں اشارہ کر چکے ہیں عظیم القدر ہستی اٹھ گئی، لیکن بدقسمتی سے غیاث الدین کی حکومت کی پالیسی ملک اور خود خاندانِ غلاماں کے مستقبل کو تیرہ و تار بنانے والی تھی۔ التمش نے حکومت کی استعداد رکھنے والے متعدد غلام تیار کئے تھے لیکن بلبن نے ابھرنے والے لوگوں کو صفحۂ ہستی سے معدوم کر دیا تھا اور اپنی امیدیں اس فرزند کے دامن سے وابستہ کی تھیں جس کی عمر نے وفا نہ کی اور موت نے ضعیف باپ کی حیات ہی میں اس کو دبوچ لیا۔ رہا بغرا تو اس کی قسمت میں دہلی کا تخت نہ تھا۔ بلبن بسترِ مرگ پر نزع کے عالم میں تھا کہ بغرا کے دل میں نہ معلوم کیا سمائی کہ باپ کو اس حالت میں چھوڑ کر بنگال کی راہ لی مجبوراً بلبن نے متوفی فرزند کے نوعمر لڑکے کو ولی عہد نامزد کیا۔

لیکن اس بدنصیب کو تختِ دہلی پر متمکن ہونا نصیب نہ ہوا۔ بلبن کی آنکھ بند ہوتے ہی طوائف الملوکی، ہنگامہ آرائی، سازشیں اور بغاوتیں رونما ہونے لگیں جو قرونِ وسطےٰ ہند کی خصوصیات تھیں۔ امرا نے بغرا کے فرزند کو جس کی عمر بمشکل سترہ سال ہوگی متوفی سلطان کا جانشین بنا کر اس تخت پر بٹھا دیا جس پر التمش اور بلبن ایسے بیدار مغز سلاطین بھی چین سے نہ بیٹھ سکے تھے۔

کیقباد کی تعلیم بہترین عنوان سے ہوئی تھی۔ شباب کا آغاز تھا اور ہنوز اسے دنیا کا تجربہ حاصل نہ ہوا تھا البتہ رائج الوقت علوم و فنون سے آراستہ تھا لیکن اس کو اپنے علم کو عمل کی کسوٹی پر کسنے کا کبھی موقع نہ ملا تھا۔ لذاتِ زندگی سے ناآشنا نوجوان نے جب آنکھیں کھولیں اور ہر شخص کو اپنے سامنے دست بستہ کھڑے دیکھا۔ تو ایسا کھو گیا کہ سلطنت کرنا تو درکنار اس کو اپنی جان تک کا ہوش نہ رہا۔ تین سال کی مسلسل مے نوشی اور تعیش نے اس کو کہیں کا نہ رکھا۔ اعضائے حکومت میں اضمحلال پیدا ہو گیا۔ ادھر سلطان کے افعال کے مضر اثرات اس کی صحت کو برباد کرنے لگے یہاں تک کہ لکڑی کی طرح اس میں گھن لگ گیا۔

اس وقت نظام الدین وزیر تھا جو اس قدر با اختیار و با اقتدار تھا کہ حکومت کی تمام کنجیاں اس کے ہاتھ میں تھیں باپ نے بیٹے کو کچھ نصیحتیں بھی کی تھیں جن میں سے ایک نقش و نگارِ طاقِ نسیان ہونے سے رہ گئی تھی۔ اور وہ یہ تھی کہ "کبھی وزرا یا امرا کو سر پر نہ چڑھانا"۔ کیقباد تھا تو بے دست و پا، مگر جری اجداد کا خون اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ اس کو خوف ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ نظام الدین کا وار چل جائے اور وہ مجھے تخت سے اتار دے۔ بہتر ہے کہ اس کو دار السلطنت سے دور پھینک دوں خیال عاقبت اندیشانہ تھا لیکن اس کو جامۂ عمل پہنانے کے لئے حسنِ تدبیر کی ضرورت تھی جو سلطان کی قدرت سے باہر تھی۔ ایک دن بھرے دربار میں نظام الدین کو ملتان جانے کا حکم صادر کر دیا۔ لیکن زمانہ شناس وزیر فوراً تاڑ گیا، اور دل کڑا کر کے صاف انکار کر بیٹھا۔ امرا کو یہ بدتہذیبی اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کا بہانہ ہو گئی۔ نوعمر سلطان نے جب امرا کی کمک دیکھی تو انجام پر نظر کئے بغیر وزیر کا قلع قمع کرا دیا۔ اس واقعے کے کچھ دنوں بعد سلطان فالج میں مبتلا ہو گیا جس سے دار السلطنت میں ایک ہلچل مچ گئی۔ امرا نے تخت و تاج کے حصول کی حرص و آز میں تگ و دو شروع کر دی۔ جتھا

بندیاں شروع ہونے لگیں۔ تلواریں نیاموں میں موقع ومحل کے انتظار میں تھیں۔ ترکی امرائے اس موقع پر دوسری چال چلی۔ انھوں نے باہمی اختلافات کو دور کرکے بیرونی اقوام کے مقابلے میں متحدہ محاذ بنانا چاہا۔ ان بیرونی اقوام میں خلجی سب سے زیادہ سربرآوردہ تھے اور تمام قلمرو میں پھیلے ہوئے تھے اور ترکی امرا کے دل میں خار کی طرح کھٹک رہے تھے۔ خلجیوں کی ایک فہرست تیار کی گئی جس میں سب سے پہلا جلال الدین کا نام تھا۔ اور یہ کوشش ہوئی کہ رفتہ رفتہ ان سب کا استیصال کر دیا جاوے۔

جلال الدین کو بھی اس کی کسی نہ کسی طرح خبر ہوگئی، اور اس نے اپنی مختصر جماعت کو ہمراہ لے کر مدافعانہ تیاریاں شروع کر دیں۔ ملک اتبر کچھر باربک وہ شخص ہے جس نے جلال الدین کے قتل کا بیڑا اٹھایا تھا لیکن اس کو کیا خبر کہ قدرت جلال الدین کی نسل سے کیا کچھ ظہور پذیر کرنے والی تھی۔ کچھر باربک اس فکر میں تھا کہ جلال الدین کو دامِ تزویر میں لا کر کوشکِ شمسی میں اس کا کام تمام کرے۔ ادھر جلال الدین کے رفقا آخری دم تک اس کی حفاظت کرنے اور اپنے سردار کے قدموں پر سرنثار کرنے کے لئے کمربستہ بیٹھے ہوئے تھے کچھر باربک پہنچا لیکن ہنوز گھوڑے پر سے اترنے بھی نہ پایا تھا کہ کمینگاہ سے ایک جلال سردار نے بڑھ کر ایک ایسا جچا ہوا تلوار کا ہاتھ مارا کہ کچھر باربک کا سر تن سے جدا ہوگیا۔ اب بے سری فوج کیا لڑتی۔ چند سوار جو مقتول کے ساتھ تھے اسیر کر لئے گئے۔

یہ نازک وقت تھا کیونکہ اگر خلجی اس کامیابی سے مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے۔ اور آیندہ کی فکر نہ کرتے تو غالباً ان کا وجود ہندوستان کی تاریخ میں باقی نہ رہتا لیکن جیسا کہ شیکسپیئر نے اپنے ڈرامے جولیس سیزر میں کہا ہے کہ

> "انسانی زندگی ایک ایسے سمندر کی مثال ہے جس میں تموج ہوتا رہتا ہے۔ کبھی موج بڑھتی ہے اور کبھی پیچھے ہٹتی ہے۔ اگر موج کے بڑھتے وقت انسان تغافل برتے تو اس کا مستقبل تیرہ وتار ہوجاتا ہے، اور اس کی آیندہ زندگی ایسے پایاب دریا میں غرق ہو جاتی ہے جس سے پھر ابھرنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی"۔

یہ خلجیوں کی موت وزیست کا وقت تھا۔ آن واحد کا تغافل ان کو صفحۂ ہستی سے معدوم کرسکتا تھا۔ لیکن خانخاناں اور الغ خاں جلال الدین کے بڑے بیٹے نے بڑی جرأت سے کام لیا۔ اور صرف پچاس سرفروشوں کو ساتھ لے کر حرم سرائے سلطانی سے سہ سالہ سلطان کو جس کو شمس الدین کیومرث کے لقب سے ترکی امرائے تخت پر متمکن کر دیا تھا اٹھا لائے۔ اس وقت جلال الدین بہارپور کیمپ میں تھا جہاں ملک اتبر کچھر باربک کا قتل واقع ہوا تھا۔

کچھ دنوں تک تو جلال الدین کیومرث کے مدارالمہام سلطنت کی حیثیت سے سلطنت کرتا رہا لیکن بہت جلد قسمت نے سلاطینِ غلامان کے تاج کو اس کے قدموں پر رکھ دیا۔ معزالدین کیقباد ابھی زندہ تھا لیکن پیمانہ بھر چکا تھا چھلکنے کی دیر تھی۔ ایک ترکی ملک نے جس کا باپ سلطان کے حکم سے قتل کیا گیا تھا آخر کار جان بلب سلطان سے انتقام لے ہی لیا اور کوشک کیلوکھری میں موقع پاکر سلطنتِ غلاماں کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو گل کر دیا۔ جلال الدین سلطان کے قتل کی خبر پاتے ہی بہارپور سے دہلی میں آیا اور کوشک معزی میں سریر آرا ہوا۔ اس طرح خلجی قسمت آزماؤں کی بغاوت جو درحقیقت سرکشی نہیں بلکہ ایک مدافعانہ کوشش تھی آخر کار ایسی صورت میں آگئی کہ خلجی جو اپنی ہستی کی خیر منا رہے تھے دہلی کے تخت وتاج کے مالک بن گئے۔

تاریخی اہمیت بادی النظر میں خلجی بغاوت ہندوستان کے دورِ وسطیٰ کی ہزاروں بغاوتوں میں سے ایک بغاوت ہے اور اس قابل نہیں کہ اس کو کوئی تاریخی اہمیت دی جاسکے، لیکن درحقیقت یہ واقعہ سلطنتِ اسلامیہ ہند کی تاریخ میں پہلا باب ہے جس کا تسلسل صرف ترکی سلطنت کے خاتمے پر نہیں ٹوٹتا بلکہ ایک طویل زنجیر کی طرح ۱۸۵۷ء تک پھیلتا ہے جبکہ آخری نسلی تاجدار اپنی نام نہاد کامرانی سے دست کش ہونے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ یوں تو کہنے کو محمد غوری کے نازک حملوں کے بعد قطب الدین ایبک نے جو اپنے آقا کے ساتھ راہِ خدا میں خون بہانے والوں میں پیش پیش تھا سر پر تاج رکھ کر اور تختِ دہلی پر بیٹھ کر ہندوستان میں ایک اسلامی سلطنت کی بنیاد قایم کر دی تھی۔ اگرچہ اس وقت کے حالات میں یہ ایک بہتر تبدیلی تو تھی مگر اس انقلاب میں حکومت اسلامیہ کے قیام وقرار کی ضمانت نہ تھی۔ ترکوں کی سلطنت کی نوعیت فوجی تھی اور وہ صرف سپاہ کے بل بوتے پر حکومت کر رہے تھے۔ وہ عناصر جو سلطنت کے قرار واستقامت کے اجزائے لاینفک ہیں اس میں مفقود تھے۔ بات ایک

ہی تھی۔ خواہ محمود غزنوی اور محمد غوری بار بار ہندوستان کی زرخیز سر زمین کو اپنی زر و جواہر کی حرص و آز میں مبتلا سپاہ کا جولانگاہ بناتے اور منوں چاندی سونا لوٹ کر لے جاتے یا قطب الدین ایبک اور اس کے اسلاف گاہے ماہے دہلی میں بیٹھ کر قرب و جوار کی ریاستوں اور راجاؤں پر ہاتھ صاف کرتے اور چھاپے مارتے اور سلطانی خزائن کو پانی کی طرح بہانے کے لئے پُر کرتے۔ محمودی جذبہ مذہب کی آڑ میں ہندوستان کی آبادی یا دوسرے الفاظ میں حاکم و محکوم، مرکزی حکومت اور رعایا میں مغائرت پیدا کئے ہوئے تھا مسلمانوں کے قدم جمنے نہ دیتا تھا اور ایک ایسا مستقل خطرہ تھا جس سے اسلامی سلطنت دہلی ہر وقت اکثریت کے دباؤ اور عظیم قوت سے مغلوب ہو کر نابود ہو سکتی تھی۔ اس میں ذرا بھی کلام نہیں کہ مسلمانوں کی خوش قسمتی سے ہندوستان کے قریات کی زندگی کا بندھن کھل چکا تھا۔ ہندو قوت کے اجزا میں انتشار تھا اور وہ فاتحینِ اسلام بعدۂ ایبک کے بعد کے سلاطین کے مقابلہ میں اپنی شیرازہ بندی کر کے اجتماعی قوت سے نہیں آ سکتے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ ہندوستان کی آبادی کا زبردست عنصر تھے۔ اور مسلح بھی تھے ان کا مذہب جدا معاشرت مختلف، روایات مختلف تھیں۔ اس طرح سلطان اور رعایا کے درمیان ایک عمیق خلیج حائل تھی۔ جو کسی طرح پٹ نہ سکتی تھی۔ رواداری مذہب ہی ایک ایسا آلہ تھی جو آپس کے اختلافات کو دور کر سکتی تھی۔ علاؤالدین سلاطینِ خلجیہ نہیں بلکہ سلاطینِ اسلام میں پہلا سلطان ہے جس نے اس فلسفہ کو سمجھا اور رواداری مذہب کا وہ راستہ دکھایا جس پر جلال الدین محمد اکبر آخر کار چل ہی نکلا۔ قاضی بیانہ اور سلطان کی گفتگو ہمارے اس مبحث پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔ یہاں پر ہم صرف اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں اور طوالت کے خوف سے اس کو درج نہیں کرنا چاہتے۔

بہرکیف اس اعتبار سے ملک کی عنانِ حکومت کا خلجیوں کے ہاتھ میں جانا ہی سلطنتِ دہلی کے استقلال کی ضمانت تھا کیونکہ خلجی بغاوت کے بعد سے دہلی میں جلال الدین فیروز کے سریر آرا ہونے کے ساتھ ہی اسلامی سلطنتِ ترکیہ کے قیام و قرار کی داغ بیل پڑ گئی اور وہ بہت جلد اس کے جانشین علاؤالدین کے عہد میں رونما ہونے لگی تھی۔ عہدِ علائی کا دیباچہ خلجی بغاوت ہے اور عہدِ علائی تاریخِ اسلامی ہند کا پہلا باب۔ لہٰذا یہ کہنا کہ خلجی بغاوت ہی تاریخِ اسلامیۂ ہند کا پہلا باب ہے کسی طرح بیجا نہ ہوگا۔

شہنشاہ حسین رضوی

قصرِ خسرو

یہ گل بوٹے نہیں خسرو کے ایوانِ فلک سا کے
جو سچ پوچھو تو ہیں یہ کوہکن کے خون کے چھینٹے

بنا ہے بیکسوں کے آب و گِل سے جامِ پرویزی
بھرا ہے کوہکن کے خونِ دل سے جامِ پرویزی

اُدھر تعمیر ہوتی ہے کسی ظالم کے ایواں کی
اِدھر مسمار کی جاتی ہیں قبریں اہلِ ایماں کی

تماشا گاہِ عالم اک مقامِ یاس و عبرت ہے
کسی کا کاسۂ سر ہے، کسی کا پائے نخوت ہے

یہ قرباں گہ ہے جس میں ہیں ہزاروں خون کے فوّارے
جہاں کے گوشے گوشے میں ہیں حسرتناک نظّارے

عطاء اللہ کلیم

شاعر

وہ عندلیبِ خوش الحاں ہے اے ضیاؔ شاعر
فضائے دہر ترانوں سے جس کے ہے مسحور

دہن میں جس کے زبانِ کلیم ہے گویا
ہے جس کے سینے میں روشن چراغِ جلوۂ طور

نگاہ جس کی ہے آئینہ دارِ فطرتِ حق
جسے نصیب ہوئی ہے عجیب طبعِ غیور

رسائی جس کے تخیل کی آسماں سے بلند
ہے جس کی جنبشِ لب غیرتِ تبسّمِ حور

مثالِ بانگ درا رازدارِ منزل ہے
ہے ایک ذرّہ پامالِ منزل اُس کے حضور

ہر ایک چیز میں جو دیکھتا ہے حُسنِ ازل
ہوا ہے جس پہ عیاں رازِ ناظر و منظور

جو صبح و شام ہے اِس فکر میں کہ ہو جائے
قفس میں باعثِ تسکینِ بلبلِ مہجور

جو اتحاد کا پیغام دینے آیا ہے
جو خانہ جنگی سے رہتا ہے دور اور نفور

اُسی کے گیت کا طاری ہی مجھ پہ کیف و سُرور
اِسی سرور میں پنہاں ہے ہستیٔ جمہور

ضیاؔ فتح آبادی

رباعیات

تردید خیال

الفت کو حصولِ کامرانی سمجھے
یعنی ہم ہر بہارِ زندگانی سمجھے
بربادیٔ دل کی وجہ سوچی تو کھلا
وہ موت تھی ہم جسے جوانی سمجھے

زندگی اور موت

دنیا جو ازل سے روز ایک حادثہ بھی
وابستہ وہی کی جو سب کی شادی بھی
جب آ کے ہوئے سب کے ساتھ جینے کیلئے
اب مرنے کو ہے تعزیت میں دیکھا دی

مایوس تمنائیں

تو دل کو مٹا بھی اور ناشاد بھی کر
احساسِ غم و طرب سے آزاد بھی کر
میں نے تجھے اختیارِ ہستی بھی دیا
یعنی مری زندگی کو برباد بھی کر

تاثرات

بیتاب ہوئی امید حسرت جاگی
بیدار ہوئیں فضائیں فطرت جاگی
ہستی نے انگڑائی لی
یا دل کی سمجھیں کہ قسمت جاگی

محشر رامپوری

کٹا ہُوا ہاتھ

(۱)

جب گورکھپور کے سینٹ اینڈریوز کالج سے میں نے ایف اے پاس کر لیا تو الٰہ آباد کالج کی بی۔اے کلاس میں داخل ہوگیا۔ تمام یونیورسٹی میں مجھے صرف ایشور چندر ہی سے زیادہ موانست تھی، جو بی۔ایس سی کلاس میں پڑھتا تھا۔ گو وہ مجھ سے ایک جماعت آگے تھا تاہم ہماری بڑی گہری دوستی تھی اور ہوسٹل کے تمام طلبا ہم پر آوازے کستے تھے مگر ہم نے کبھی اس کی پروا نہیں کی۔

صرف سال ہی بھر میرا اس کا ساتھ رہا۔ کیونکہ دوسرے سال وہ آنرز کے ساتھ بی ایس سی پاس کرکے ڈاکٹری پڑھنے لکھنؤ میڈیکل کالج چلا گیا۔ ہم دونوں کی خط و کتابت اور ملاقات اکثر ہوتی رہتی تھی۔ لکھنؤ میڈیکل کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس نے ولایت کی آئی۔ ایم۔ ایس کی ڈگری حاصل کی۔ اور فی الفور اسے سرکاری ملازمت مل گئی۔ ملازمت بری ہوتی ہے اور وہ بھی سرکاری ملازمت، چنانچہ اس غریب کو ملازمت کے سلسلے میں سرحد جانا پڑا۔ جب تک اس نے ڈاکٹری پاس کی میں نے بھی تاریخ میں ایم۔اے پاس کرلیا اور مجھے اُسی سینٹ اینڈریوز کالج میں پروفیسری مل گئی۔ جہاں کسی وقت میں بھی ایک طالب علم کی حیثیت سے تھا۔

۲

بہت دن ہوئے ایشور چندر کی اور میری خط و کتابت بند ہو چکی تھی وہاں پہنچ کر اس نے دو تین خط لکھے تھے جن کا میں نے بھی جواب دے دیا تھا لیکن اس کے بعد ہم دونو ایک دوسرے کی خیر خبر کو ترس گئے۔

اتفاق سے ایک دن مجھے چند ضروری کاموں سے الٰہ آباد جانا پڑا۔ جس وقت میں جارج ٹاون سے تانگے پر گذر رہا تھا میری نگاہ ایک سائن بورڈ پر پڑی جس پر لکھا تھا۔

ایشور چند ورما ایم۔ بی بی۔ ایس
آئی۔ ایم۔ ایس۔ میڈیکل پریکٹشنر
جارج ٹاؤن۔ الہ آباد

مجھے بہت تعجب ہوا میں سوچنے لگا ــــ کیا یہ وہی ایشور چند ہے!

نہیں وہ نہیں ہوسکتا۔ وہ بھلا کابل کی نوکری چھوڑ کر یہاں کیوں آنے لگا لیکن پھر بھی میں اس معاملے کی تحقیقات سے محترز نہ رہ سکا۔ میں نے تانگے والے سے کہا ــــ تانگہ لوٹاؤ۔ اس ڈاکٹر کے مکان تک لے چلو۔

چلتے چلتے تانگے والے نے کہا ــــ "بابو جی یہ ڈاکٹر بڑے اچھے ہیں ہاتھ ہیٹے ہوئے کابل سے آئے ہیں، اور یہیں ڈاکٹری کر رہے ہیں۔ ان کی خوب چلتی ہے" اب مجھے بالکل شک نہیں رہا کہ یہ وہی ایشور چند ہے۔ میں نے انتہائی مسرت کے ساتھ پھاٹک کے اندر قدم رکھا۔ ایک کاغذ کے پرزے پر اپنا نام لکھ کر بھیج دیا، تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر صاحب نے مجھے اندر طلب کیا۔ اندر پہنچتے ہی ایشور مجھے بغور دیکھنے لگا اور میں ایشور کی جانب تکنے لگا۔ پھر ہم دونوں نے معانقہ کیا بغلگیر ہوئے اور خوشی کا اظہار کیا۔ میں نے دوران گفتگو میں ایشور سے معلوم کیا کہ وہ پانچ مہینے کی رخصت لے کر آیا تھا لیکن اب وہ نہ جائے گا اور اس نے استعفےٰ داخل کر دیا ہے اس نے یہ بھی کہا ــــ "اب یہیں بیٹھ کر پریکٹس کر رہا ہوں۔ جو کچھ کما لیتا ہوں غنیمت ہے۔ زندگی غلبہ ہوتی جاتی ہے میرے وہ دن اب نہیں رہے جتنی جلدی میں مر جاؤں اتنا ہی اچھا ہے" یہ کہتے کہتے اس کی صورت کچھ اداس سی ہوگئی۔

میں اس کی مرموز گفتگو نہ سمجھ سکا۔ اور جلدی مر جانے کی تمنا کیوں اسکے جی میں پیدا ہوئی اسے دریافت کیا ــــ

اس نے جواب دیا ــــ "میری افسوسناک سرگزشت سن کر تمہیں خوشی نہیں ہوگی۔ اسے سننے کی سعی کرنی بھی فضول ہے میں اپنی پُردرد کہانی سنا کر تمہیں بھی افسردہ نہیں بنانا چاہتا۔"

میں نے ہزار کوشش کی لیکن وہ اپنی سرگزشت سنانے پر رضامند نہ ہوا۔

بہت دیر تک ہم دونو چپ چاپ بیٹھے ایک دوسرے کی صورت تکتے رہے۔ اور ٹھنڈے سانس لیتے رہے۔ پھر اسی نے خاموشی کا قفل توڑا ــــ "ہاں تو تم الٰہ آباد کیا کسی کام سے آئے ہو؟"

میں نے جواب دیا ــــ "ہاں تمہیں معلوم ہوگا کہ میں سینٹ اینڈریوز

کالج میں پروفیسر ہوں وہاں کے کوآپریٹو اسٹور کے لئے کتابیں خریدنی ہیں دو دن تک مقیم رہوں گا۔

اس نے کہا "تب تو میں درخواست کرتا ہوں کہ تم میرے ہاں قیام کرو۔ بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ دو ایک دن پہلے کی طرح خوشی سے کٹ جائیں گے۔ پھر تمام عمر تو دکھ ہی دکھ قسمت میں لکھا ہے"۔

میں نے ہر چند غور کیا لیکن اس کی قنوطیت کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ بہر حال میں نے اس کے ہاں تین دن مقیم رہنا منظور کر لیا۔

۳

رات کو کھانے سے فارغ ہو کر ایشور چند کہیں چلا گیا۔ مجھے اس کی بیوی سے جسے میں ہمیشہ سے بھابھی کہا کرتا ہوں، بات چیت کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نے پوچھا "بھابھی ایشور آج کل اتنے اداس کیوں رہتے ہیں، ہمیشہ ان کی رنگت فق رہتی ہے، چہرے پر ہوائیاں اڑتی رہتی ہیں۔ دراصل بات کیا ہے؟

بھابھی کی صورت بھی اتر گئی۔ پہلے انھوں نے اس معاملے کو ٹالنا چاہا لیکن میرے بے حد اصرار پر وہ مجھ سے کہنے لگیں "تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے دوست سرکار کی طرف سے ڈاکٹر مقرر ہو کر سرحد بھیجے گئے تھے۔ ان کے کام میں کوئی نقص نکالنے والا نہیں تھا۔ اعلیٰ حکام بھی ان سے بہت خوش تھے لیکن حال میں سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں کی تحریک کے سلسلے میں جو بلوہ ہوا تھا اس میں مشین گن استعمال کی گئی تھی لیکن بدقسمتی سے ایک پولیس والے کے ہاتھ سے دوسرے پولیس والے کے بازو میں گولی لگ گئی اور وہ گر پڑا۔ تمہارے دوست فوراً طلب کئے گئے۔ انھوں نے معائنہ کرکے کہا کہ بغیر ہاتھ قلم کئے یہ بچ نہیں سکتا۔ پھر بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہاتھ کٹ جانے کے بعد اس کی زندگی برقرار رہ سکے گی یا نہیں۔ حکام بالا نے فوراً انہیں حکم دیا کہ ہاتھ کاٹ ڈالو۔ وہ فی الفور ہسپتال پہنچایا گیا جہاں تمہارے دوست نے اس کا اپریشن کیا۔ لیکن بدقسمتی سے شام تک اس کے جینے کی آس باقی نہ رہی وہ سرحدی مسلمان تھا۔ اس کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی تھی کہ وہ اب جیتا نہیں رہے گا چنانچہ اس نے ڈاکٹر کو وصیت کی کہ جب اس کی لاش قبر میں اتاری جائے تو اس کا وہ کٹا ہوا ہاتھ بھی دفن کر دیا جائے۔ رات کو وہ مر گیا۔ قبر کھود دی گئی وہ دفن کر دیا گیا لیکن کسی کو اس کا کٹا ہوا ہاتھ دفنانے کی یاد نہ رہی۔ چند روز کے بعد ہنگامہ ختم ہو گیا۔ تمہارے دوست چار مہینے کی رخصت لے کر یہاں آ گئے۔ تھوڑے دن بڑی امن چین سے گذرے لیکن ناگہاں ایک دن جب ہم لوگ گہری نیند سو رہے تھے۔ ایک پشاوری پٹھان [illegible] بند کمرے میں پُراسرار طریقے سے داخل ہو گیا۔ اور انھیں [illegible] لگا "داگتور! داگتور!"

وہ چونک کر اٹھ بیٹھے دیکھا کہ وہی پٹھان پولیس [illegible] کا انھوں نے اپریشن کیا تھا جو مر گیا تھا اور جس کی تجہیز و تکفین [illegible] سامنے ہوئی تھی۔ وہ بہت خائف ہوئے اور انھوں نے مجھے [illegible] جگا دیا۔ اسے دیکھ کر میرا بھی خون خشک ہو گیا۔ پھر اس سرحدی پٹھان نے سنجیدگی کے ساتھ دریافت کیا "کہاں داگتور! وہ میرا کٹا ہوا ہاتھ کہاں ہے! میں نے تو وصیت کی تھی کہ اسے میرے ہمراہ قبر میں دفن کیا جائے۔ تم نے بھی وعدہ کیا تھا کہ ضرور اس ہاتھ کو دفن کرا دوں گا۔ کیا وہ وعدہ بھول گئے؟ جہاں سے ہو سکے میرا وہ ہاتھ لا دو!"

اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔ ہم دونوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ مرا ہوا آدمی سرحد سے یہاں کیسے پہنچا؟ تمہارے دوست نے کہا مسلمانوں میں کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی قتل کیا جائے تو وہ شہید ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے وہ مرتا نہیں۔

دوسرے دن بھی بالکل ایسا سانحہ رونما ہوا۔ پھر تو روزانہ یہی معمول ہو گیا۔ گھبرا کر ہم لوگوں نے مکان چھوڑ دیا۔ دوسرے مکان میں اٹھ گئے۔ مگر وہاں بھی پیچھا نہ چھوٹا۔ اس طرح رخصت ختم ہو گئی۔ تمہارے دوست کی حالت دن بدن روبہ تنزل ہوتی گئی۔ غم و فکر کے سبب اُن کی آنکھیں اندر دھنس گئی ہیں۔ گال پچک گئے ہیں۔ تم خود ہی اندازہ لگا لو پہلے ان کی صحت کیسی تھی اور اب کیا حالت ہے۔ خیر اسی فکر کے باعث انھوں نے نوکری کو خیرباد کہہ دیا اور اپنا استعفےٰ داخل کر دیا۔ گزشتہ چار ماہ سے ایک دواخانہ کھول لیا ہے۔ اچھی چلتی ہے۔ مگر یہ فکر انھیں اندر ہی اندر گھلائے ڈال رہی ہے۔ کیونکہ جان سے زیادہ مال و دولت اور آمدنی نہیں ہوتی۔ اگر جان ہی نہ رہے تو روپیہ کون پیدا کرے گا۔ مجھے تمہارے دوست کے زیادہ دن جینے کی آس نہیں رہی"۔

میں نے پوچھا "کیا آپ لوگوں نے اس مکان کو بھی بدل کر دیکھا تھا"؟

بھابھی نے جواب دیا "جی ہاں۔ مگر وہاں بھی اس نے آنا بند

نہیں کیا۔ اس کا معمول ہے کہ جہاں کہیں ہم رہیں۔ دو بجے کے عمل میں آتا ہے پہلے دواؤں کی الماری کے قریب جاتا ہے۔ نہ جانے وہاں کیوں جاتا ہے اور کیا تلاش کرتا ہے۔ پھر آکر ان سے جرح کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر تم میرا ہاتھ نہ واپس کرو گے تو میں تمہیں مار ڈالوں گا۔"

میں نے اس سے کہا ——"بھابھی اب آپ بالکل نہ پریشان ہوں اطمینان سے سو جائیے۔ میں اس کا علاج کروں گا۔ میں دوا خانے میں سوتا ہوں۔"

انھوں نے ہر چند مجھے منع کیا کہ وہاں نہ سونا۔ کیونکہ وہ پہلے پہل وہیں آتا ہے۔ شاید تم پر بھی کوئی مصیبت نازل ہو جو گزرے ہم پر گزرے لیکن ہم لوگوں کے لئے تم پر کوئی مصیبت آئے یہ میں نہیں دیکھنا چاہتی"۔

میں نے کہا ——"بھابھی تم بے فکر رہو۔ میرا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔"

نہایت بے دلی کے ساتھ بھابھی نے مجھے دوا خانے میں سونے کی اجازت دی۔

میں دوا خانے میں جا کر سو گیا۔ تھوڑی دیر تک انھی فکروں کے سبب نیند نہ آئی لیکن پھر میں ایسا غافل سویا کہ دنیا جہان کی کوئی خبر نہ رہی رات بہت ہو چکی تھی کسی آواز نے مجھے جگا دیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں دیکھا کہ وہی پولیس والا سرحدی اپنی وردی پہنے ہوئے میرے سامنے کھڑا ہے میں سہم گیا۔ اور کانپنے لگا۔ اور آنکھیں بند کر لیں تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا وہ دواؤں کی الماری کے پاس گیا اور اندر کی ہر چیز شیشے کے پٹوں میں سے بغور دیکھنے لگا پھر غصے کے مارے ایک چیخ مار کر بالاخانے کی طرف دوڑا میں نے بھی آہستگی اس کا تعاقب کیا اور زینے پر کھڑا ہو کر سننے لگا وہ ایشور کو ڈانٹ رہا تھا اور دھمکیاں دے رہا تھا پھر جس طرح ہوا کی مانند وہ آیا تھا کچھ گنگناتے ہوئے اسی طرح واپس چلا گیا۔

صبح میں نے ایشور کو تشفی دیتے ہوئے کہا ——"دیکھو گھبرانے کی بات نہیں ہے میں اسے خدا نے چاہا تو تمہارے سر سے ٹال دوں گا"۔

اس نے کہا ——"تم کیا کر سکتے ہو بھائی۔ اس کا کوئی تدارک سمجھ میں نہیں آتا۔ جب تک میں نہ مروں تسکین نہیں مل سکتی۔ لیکن تمہیں یہ سب باتیں کیونکر معلوم ہوئیں؟"

میں نے کہا ——"سب معلوم ہے۔ تمہیں اس کی چھان بین کرنے سے کیا فائدہ۔ آئندہ تو اگر [illegible] پھر یہاں آؤں گا"۔

شام کی گاڑی سے میں گورکھپور واپس ہو گیا۔

۴

گورکھپور لوٹ کر بھی میں ایشور کی مصیبت نہ بھول سکا۔ میں اپنے دل میں بھی سوچتا رہا کہ اسے اس مصیبت سے کس طرح نجات دلاؤں۔ مجھے ایک تجویز سوجھی میرا چھوٹا بھائی دنیش لکھنؤ میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا۔ میں نے سوچا کہ لکھنؤ میڈیکل کالج میں ہمیشہ مردہ لاشوں کی چیر پھاڑ ہوتی ہے۔ اگر میں دنیش سے کہہ کر ایک کٹا ہوا ہاتھ لا سکوں تو کیا پوچھنا ہے چنانچہ میں نے دنیش کو ایک خط لکھا جب اس کا اطمینان بخش جواب ملا تو میں ایک ہفتے کی رخصت لے کر لکھنؤ روانہ ہوا۔ لکھنؤ میں بہت کم ٹھیرا وہ کٹا ہوا ہاتھ دنیش سے لے کر کاغذ میں لپیٹ لیا اور دوسری ٹرین سے الہ آباد روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے وہ کٹا ہوا ہاتھ ایشور چندر کو دے کر کہا کہ اسے الماری میں رکھ دو۔ وہ جب آئے گا اسے لے کر چلا جائیگا

ایشور نے کہا ——"بھائی یہ تدبیر مجھے معقول نہیں معلوم ہوتی۔ اگر اسے یہ چال معلوم ہو گئی تو نتیجہ بہت مہلک اور افسوسناک ہوگا!"

میں نے اصرار کے ساتھ کہا ——"تم رکھو تو سہی، وہ مطمئن ہو کر چلا جائے گا۔ آخر اس قدر گھبراہٹ کیوں ظاہر کرتے ہو؟"

اتنا کہہ کر اس کٹے ہوئے ہاتھ کو میں نے خود الماری میں رکھ دیا۔

رات کو کھانے سے فارغ ہو کر میں پھر دوا خانے میں جا کر سو رہا ان لوگوں نے ہر چند منع کیا کہ وہاں نہ سوؤں لیکن میں نے ان کی بات نہ مانی۔ میں سو گیا تھا۔ کسی کی آواز سن کر چونک اٹھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ تمام دروازے اور کھڑکیاں بند ہیں۔ غور کرتے کرتے مجھے پھر نیند آ گئی مگر پھر کانوں میں آواز آئی۔ اس بار جب میں نے الماری کی طرف نگاہ پھیری تو وہی سرحدی پٹھان ایک بڑا سا عمامہ باندھے ہوئے ہاتھ میں لمبی لاٹھی لئے ہوئے ہر ایک الماری کے پاس جاتا ہے اور بغور ہر اندر کی چیز کو دیکھتا ہے۔ ناگاہ میں نے دیکھا کہ وہ مارے خوشی کے رقص کرنے لگا۔ میں نے سمجھا کہ اسے ہاتھ نظر آ گیا ہے۔ تھوڑی دیر میں اس نے گھونسا مار کر الماری کا شیشہ چکنا چور کر دیا۔ اسی کٹے ہوئے ہاتھ کو نکال لیا اور ناچ ناچ کر اسے اپنے کٹے ہوئے بازو میں لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں سمجھا کہ اب وہ اسے لے کر چلا جائے گا۔ لیکن یہ کیا! اس کی صورت پر سنجیدگی کے آثار نمایاں ہو گئے تمام مارے غصے کے اس کی بھویں تن گئیں۔ اور تھوڑی دیر

میں اس نے وہ کٹا ہوا ہاتھ اتنی زور سے پھینکا کہ مجھے آ لگا۔ میں سہما ہوا پڑا رہا۔ جب وہ دوڑتا ہوا زینے کی طرف چلا تو میں بھی اس کے پیچھے روانہ ہوا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایشور کے سینے پر سوار ہے۔ اور اس کا گلا دبا رہا ہے! ایشور چلّا رہا ہے۔ بھابھی پتھر کا بت بنی ہوئی بیٹھی ہیں۔ میں نے دوڑ کر اسے جھٹکا دے کر الگ کر دیا۔ چنانچہ وہ بہت ناراض ہوا اور جاتے جاتے کہہ گیا ——— "ڈاگتور! میں تمہارا خون پیے بغیر نہ رہوں گا!"

اس کے جانے کے بعد ایشور نے بڑے اضطراب کے ساتھ کہا ——— بھائی میں تمہیں منع کرتا تھا کہ جیسا چل رہا ہے چلنے دو تم نہ مانے اور آج مجھے زیادہ دقتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ بھابھی بھی مجھ سے ناراض معلوم ہونے لگیں۔ مجھے بڑا تاسف ہوا اور بڑی ندامت ہونے لگی۔

میں نے سوچا "خداوندا! یہ کیا ہو گیا۔ میں تو نیکی کرنے گیا تھا لیکن بدی ہو گئی! میں سوچنے لگا کہ پہلے وہ خوش کیوں ہوا تھا۔ پھر کیا سبب ہے جو اس نے ہاتھ اٹھا کر پھینک دیا۔ میں نے ایشور سے پوچھا ——— تم نے اس کے کونسے ہاتھ کا اپریشن کیا تھا!

ایشور نے بتایا ——— داہنے ہاتھ کا۔

میں نے سوچا یہی میری غلطی ہے۔ میں بایاں ہاتھ لایا تھا۔ اس معاملے کا خاتمہ ہی کر دینا ٹھیک ہے۔ جوں توں رات بسر کی۔ دوسرے دن پہلی گاڑی سے میں لکھنؤ پہنچا۔ ونیش کے ذریعہ میں نے داہنا ہاتھ حاصل کیا۔ اور پھر الہ آباد لوٹ آیا۔ بہت رات ہو چکی تھی جب میں پہنچا میں نے آتے ہی اسی الماری میں اسی جگہ اسی طرح کے کاغذ میں لپیٹ کر وہ ہاتھ رکھ دیا اور دواخانے میں سو گیا۔

دو بجے کا عمل ہو گا۔ میری نیند کھل گئی۔ وہ افغانی الماری کے قریب ٹہل رہا تھا۔ آج پھر وہ خوشی کے مارے اچھل پڑا۔ وہ ناچتے ناچتے الماری کے پاس پہنچا، ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے ہاتھ ڈال کر کاغذ میں لپٹا ہوا ہاتھ نکال اسے اپنے بازو میں چسپاں کرنے لگا۔ آج اس نے دیکھا کہ ہاتھ بالکل درست جمتا ہے۔ چنانچہ وہ خوشی سے ناچنے لگا۔ اور چھلانگیں لگاتا ہوا باہر خانے کی طرف چلا۔

میں نے بھی اس کا تعاقب کیا۔ ایشور گہری نیند میں سو رہا تھا بھابھی اس کی بغل میں مصروفِ خواب تھیں۔ آج خلافِ معمول پٹھان کمرے میں داخل نہیں ہوا۔ وہ باہر ہی سے آواز دینے لگا۔ "باو! ڈگتور!" ایشور اس کی آواز پہچان کر مارے ڈر کے کانپنے لگا۔ اور اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ پھر اس کے بلانے پر باہر آیا۔

اس نے ڈاکٹر کو آتے دیکھ کر دو قدم پیچھے ہٹ کر جھک کر سلام کیا۔ اور بڑی لجاجت کے ساتھ کہنے لگا ——— "حضور میرا نام رحمت اللہ ہے۔ اپنے ہاتھ مل جانے سے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں آپ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ غلام کی گستاخی معاف کرنا۔"

اتنا کہہ کر وہ کودتا پھاندتا غائب ہو گیا۔

اس کے بعد میں دو تین دن وہاں اور رہا۔ لیکن پھر وہ افغانی سپاہی نہ آیا۔

جب میں جانے لگا تو ایشور اور بھابھی نے میرے ہاتھ پکڑ کر کہا ——— بھائی تمہارے سبب ہم لوگوں کی جان بچ گئی۔"

میں نے کہا ——— بھابھی! ایشور میرے دوست ہیں۔ اور تم ان کی اہلیہ ہونے کے سبب بھابھی ہو۔ اگر میں اتنا کام بھی تمہاری خاطر نہ کر سکتا تو میری دوستی کس کام کی تھی۔ میں نے درحقیقت جو کچھ کیا محض اپنے بھائی اور اپنی بھابھی کے واسطے کیا۔ خود تم بتاؤ! اگر میں کسی ایسی مصیبت میں گرفتار ہوتا تو تم میری مدد نہ کرتیں۔ بھابھی مجھے شرمندہ نہ کرو۔

بھابھی اور کچھ نہ کہہ سکیں البتہ ان کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے ——— اور جہاں تک مجھے خیال ہے وہ خوشی کے آنسو تھے۔

حسن عزیز جاوید

غزلیات

(۱)

وہ اُن کا نازسے چلنا وہ اُن کا فتنہ زا ہونا — قیامت سے ہے پہلے یہ قیامت کا بپا ہونا

وہ آغازِ محبت میں زباں کا بند ہو جانا — نگاہِ شوق سے پھر بعد ازاں دل ادا ہونا

رحیلِ کارواں کا کتنا دردانگیز منظر تھا — گلے مل مل کے رونا اور رو رو کر جدا ہونا

سنی دربان کی دھمکی سرزنشِ اغیار کی دیکھی — نہ راس آیا درِ جاناں پہ قسمت آزما ہونا

تماشا دور سے دیکھا کئے تم غرق ہونے کا — دراں حالیکہ ممکن تھا تمہارا ناخدا ہونا

تعالی اللہ وہ بعد از خشم ان کا مسکرا دینا — وہیں زہرِ ہلاہل کا مرا آبِ بقا ہونا

نگاہِ دوربیں نے اف ترا جلوہ کہاں دیکھا — دلیلِ نورِ ایماں تھی بتوں سے آشنا ہونا

جبینِ یار پر اعجاز زلفوں کا وہ لہرانا
پیامِ مرگ تھا ان ناگنوں کا ایک جا ہونا

سعید احمد اعجاز

(۲)

آئی بہار مے کشو، مژدۂ فیضِ عام ہے — آج ہے لطفِ میکشی ہاتھ میں سب کے جام ہے

بادۂ ارغواں میں بھی موج ہے ایک نور کی — شیخ کو ہو گیا ہے کیا، نور کہیں حرام ہے!

پھر نظارہ چیخ پر آج اک اژدحام ہے — لیلیٰ شب کی دوش پر زلفِ سیاہ تمام ہے

ہاتھوں سے دل کے تنگ ہوں، اس کو نکال پھینکیا — چاہ تمہاری اس میں ہے اس کا بس احترام ہے

ذاتِ بشر میں بھی بھرا جلوۂ حق ہے بیگماں — بات یہ اور ہے کہ وہ جلوۂ ناتمام ہے

کیا ہے بشر کی زندگی ہلکی حباب سے بھی کم! — دل ہے مگر بھرا ہوا شوقِ نمود و نام ہے

موت پہ کوئی بلائے کیا زیست پہ کچھ نہ کیا ہو — فکر ہے اس میں کام لے صبر کا دو مقام ہے

اہلِ جہاں ہیں خود غرض شمسؔ فریب ہے بچو
ان سے ہو تم کو فایدہ صرف خیالِ خام ہے

شمس الدین احمد شمسؔ جہان آبادی

(۳)

اُس وفا ناآشنا کو آشنا سمجھا تھا میں — کیا سمجھنا چاہئے تھا اور کیا سمجھا تھا میں

اُس کی بھولی بھالی صورت نے کیا دل کو تباہ — ہائے کس بیدرد کو دردآشنا سمجھا تھا میں

کیا خبر تھی جان کا ایذا بنیں گے آپ — دل کی بیتابی کو عرضِ مدعا سمجھا تھا میں

آہ وہ نالے کہ جن کی آسماں تک دھوم تھی — ہائے ناکامی کہ اُن کو نارسا سمجھا تھا میں

گو بھلایا لاکھ میں نے پھر بھی یاد آ ہی گیا
کس قدر آسان تجھ کو بھولنا سمجھا تھا میں

مظفر حسین شمیم

(۴)

دل وہ کیا دل جو مئے درد سے سرشار نہ ہو — سر وہ کیا سر ہے جو زیبِ رسن و دار نہ ہو

دل دیا جان بھی دی پھر بھی وہ راضی نہ ہوا — کوئی اس جنسِ محبت کا خریدار نہ ہو

نہ اٹھوں حشر میں دیکھوں کسی کی صورت — یوں بھی دنیا سے الٰہی کوئی بیزار نہ ہو

گلِ صحرا چمن آرا کا نہیں دستِ نگر — ننگِ انساں ہے وہ انسان جو خوددار نہ ہو

کہیں نادم نہ ہوئے دل مرا بھولا صیاد — تو گرفتار ہو کوئی جو گرفتار نہ ہو

بزمِ مستی میں کہیں کس سے حدیثِ مے و جام — یادِ ساقی میں کوئی آنکھ جو خونبار نہ ہو

دل جہاں ٹھہرے گا دم لینے کو منزل ہے وہی — اس سفر میں جو نہیں قافلہ سالار نہ ہو

خندۂ گل سے نشیمن پہ گری برقِ غضب — اس چمن میں کوئی مجھ سا بھی دل افگار نہ ہو

زندہ ہے شانِ رحمت تو ہمارے دم سے — کون پوچھے اسے کوئی جو گنہگار نہ ہو

درد بن کر کوئی آتا ہے خبر لینے کو — یا الٰہی کبھی اچھا دلِ بیمار نہ ہو

یہ خراباتِ محبت ہے سنبھل جا نشترؔ
اس جگہ ہے وہی ہشیار جو ہشیار نہ ہو

نشترؔ جالندھری

(۵)

ترکیبِ عیش اور ہے غم کا حساب اور — موتی ہے اور قطرۂ اشکِ کباب اور

پیری میں آب و تابِ جوانی فنا ہوئی — ڈوبا سحر کے وقت یہ تھا آفتاب اور

جلوہ بھرا بر دکے لئے دے رہے ہیں جان — اے ساقی کریم ذرا سی شراب اور

کیا فائدہ ہے قلزمِ ہستی کی سیر سے — کیوں مشقِ جبس تبسم کی بڑھائے حباب اور

شمس و قمر کی کہنے لگے لوگ پھبتیاں — اچھا نکلنے شام و سحر بے نقاب اور

دیتا ہے کیا نصیب کو الزام نامہ بر — تقدیر کا خط اور ہے خط کا جواب اور

گزری ہے مجھ پہ بزمِ عدو میں جو اے تپشؔ
کیا اس سے زیادہ قبر میں ہوگا عذاب اور

عبد اللطیف تپشؔ

جدید مدارس میں قدیم تعلیم و تہذیب

موجودہ زمانے میں صنعت و حرفت کو جو ترقی دی جا رہی ہے اس کا اثر تعلیم گاہوں میں بھی نمایاں نظر آ رہا ہے۔ روز بروز یہ خیال پھیلتا جاتا ہے کہ بچوں کو صرف ان چیزوں کی تعلیم دی جائے جو ان کے کسبِ معاش کے لئے معین ہوں۔ قدیم زبانوں کی تعلیم جو اب تک مدارس میں جاری تھی ان کی طرف سے بے تعلقی پیدا ہو رہی ہے اور صنعتی تعلیم کی طرف لوگ شوق سے بڑھ رہے ہیں۔ ملک میں ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے جو قدیم تہذیب و تمدن اور قدیم زبانوں دونوں کو بیکار خیال کرتا ہے۔ ان کے نزدیک تعلیم کا مقصد محض پیٹ پالنا اور روپیہ پیدا کرنا ہے۔ اس خیال کے لوگ صرف ہندوستان ہی میں نہیں پائے جاتے بلکہ یہ ہوا تمام دنیا میں یکساں پھیل رہی ہے۔ **انگلستان** میں خصوصاً یہ جماعت بڑھتی جاتی ہے۔ اور اس کا اثر **ہندوستان** پر بھی نمایاں ہے۔ حالانکہ خود **انگلستان** کے اہلِ فکر اپنے اس تعلیمی سطحِ نظر کی پستی پر ماتم کر رہے ہیں چنانچہ ماہِ جولائی ۱۹۳۶ء کے "ٹائمس" کے تعلیمی ضمیمہ میں ایک نامہ نگار نے ایک مستقل مضمون اس کے متعلق لکھا ہے جس کا اقتباس ہم ذیل میں درج کرتے ہیں،

"ملک میں مرکزی اور جدید مدارس کی تیز رفتاری، ہر قسم کے مدارس میں کار آمد تعلیم کا پیہم مطالبہ، خالص تعلیمی نصاب کے خلاف مستقل احتجاج، اور صنعتی تعلیم کی ترقی کی طرف روز افزوں توجہ، یہ سب ایک مفید تعلیمی تحریک کی حوصلہ افزا علامتیں ہیں۔ لیکن اس تحریک میں ایک اہم خطرہ بھی پوشیدہ ہے، جس سے اگر ہم وقت پر باخبر نہ ہوئے تو ممکن ہے بچ نہ سکیں۔ اور وہ یہ ہے کہ شاید ہم اس بات کو بھول جائیں کہ انگریزی ملکی تعلیم کا مسئلہ در اصل اقتصادی اور روحانی ہے نہ کہ ذہنی اور معاشیاتی۔ عملی نصاب اور صنعتی تعلیم میں آسانیاں پیدا کرنا اپنی جگہ پر نہایت درست ہے لیکن اگر اسے حد سے زیادہ وسعت دے دی جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اسکول اور کالج کی تعلیم کاروباری اصول پر ہونے لگے گی۔

یہ واضح ہے کہ ہمارے اسکولوں اور صنعتی کالجوں میں اکثریت ان طلبہ کی ہے جن کا تعلق طبقۂ عوام سے ہے۔ ان میں بے حد ذہین سے لے کر نہایت غبی تک ہر حیثیت کے دماغ والے ملیں گے۔ ملکی نظام تعلیم آبادی کی تقسیم دماغی فرقِ مراتب کے لحاظ سے کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

خطرہ یہ ہے کہ تقسیم کا یہ اصول حد سے زیادہ نہ بڑھ جائے۔ اگر اس تقسیم کا مطلب یہ ہے کہ صرف چند بچوں کو دنیا میں رہنے کے طریقے سکھائے جائیں، اور باقی جو ہیں ان کو محض کسبِ معاش کے وسائل بتا دیے جائیں تو لفظِ تعلیم کے معنی غلط ہو جائیں گے۔ ہر بچہ جو ایک ملکی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتا ہے، اس کی اصل ضرورت یہ ہے کہ اسے زندگی بسر کرنے کے طریقے سکھائے جائیں۔

نصابِ تعلیم میں عملی رنگ کو اور زیادہ نمایاں کر دینا ضرور مفید ہوگا لیکن شرط یہ ہے کہ کسی حالت میں تہذیب و تمدن اپنے اہم مقام سے علیحدہ نہ ہونے پائیں، ایسے اسکول کے لئے جو کاروباری اور محض کاروباری ہے، انگریزی نظامِ تعلیم میں کوئی جگہ نہیں۔ اکثر لوگ لاطینی اور یونانی زبانوں کی تعلیم کو جدید مدارس کے نصاب سے باہر خیال کرتے ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ مضامین آج کل کی ضروریات کے اعتبار سے بیکار ہیں، موجودہ زمانہ سے بالکل بے تعلق ہیں۔ اور کسبِ معاش کو ترقی دینے سے قاصر ہیں۔ لاطینی اور یونانی کا نام تو صرف مثال کے طور پر لیا گیا، اگر اسی دلیل کو بڑھائیے، اور صرف ان مضامین کو موجودہ نصاب میں داخل کیجئے، جو فوری ضروریات کے کفیل ہو سکتے ہیں تو معلوم نہیں اس دلیل کا دائرہ اثر کہاں تک پہنچے! ایسے محدود نصاب میں تاریخ کی جگہ کیا ہوگی؟ کیا فلسفہ، اخلاقیات اور مذہب کو بڑی بڑی تعلیم گاہوں سے محض اس بنا پر خارج کر دیا جائے کہ ان تعلیم گاہوں کو صنعتی کالج کے نام سے پکارتے ہیں"۔

تجربہ اور پابندیوں کی وجہ سے یہ اور زیادہ ضروری ہے کہ ایک بچہ جو اسکول میں تعلیم پاتا ہے اور وہاں سے ترقی کر کے کسی صنعتی کالج میں جاتا ہے اسے دنیا کو پورے طور سے دیکھنے کا موقع دیا جائے۔ اس کی اقتصادی حیثیت کے باعث اس کے گرد و پیش بےشمار دقتیں اور رکاوٹیں ہوتی ہیں۔ یہاں میرا مطلب صرف مادی دشواریاں نہیں اس لئے یہ درست نہیں کہ اس کی مشکلات میں ایک کامل زندگی سے بے خبری کا اضافہ بھی کر دیا جائے۔ عملی نصاب کا مطلب ایسا کاروباری نصاب نہ ہونا چاہئے جس سے تمام لطافتیں دور کر دی گئی ہوں، اور جس کا مقصد صرف یہ ہو کہ دستکاری اور تجارت کے لئے بہتر بندے پیدا کئے جائیں۔ اس لئے اپنے جدید مدارس میں قدیم تعلیم و تہذیب کی اب بھی ضرورت ہے اور یہ ضرورت ان بچوں کے لحاظ

م سے جن کے لئے یہ اسکول قائم ہیں آج اور بھی زیادہ ہے

حسن ابن ضیا علوی

دُنیائے ادب

اُردو

مرزا غالب اور اردو دیباچہ نگاری

مرزا صاحب کے زمانہ میں مقفّٰی و مسجع عبارت آرائی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی تاہم مرزا نے اپنے خطوط و رقعات میں زیادہ تر سادگی سے کام لیا جو نہایت مقبولِ عام ہوئی، مگر دیباچہ نگاری کے باب میں مرزا صاحب کا وہی رنگ پایا جاتا ہے جو اس وقت مروج و مرغوب تھا۔

اس وقت دو کتابیں ہمارے سامنے ہیں ایک تو رسالہ مساحت مطبوعہ دہلی ۱۸۴۷ء ہے دوسری کتاب جغرافیہ کی ہے جو ۱۸۵۶ء کی مطبوعہ ہے ان دونوں کے دیباچوں کی بخوف طوالت محض ابتدائی چند سطریں علیحدہ علیحدہ ذیل میں دی جاتی ہیں۔

(۱)

"مطلب اس کتاب سے یہ ہے کہ وہ اشخاص جنہوں نے علم ریاضی تحصیل نہیں کیا ہے اس کے چند فوائد سے مطلع ہو جائیں۔ اس کتاب میں اثباتِ دعویٰ چند اشکال کا درج نہیں کیا گیا ہے اور ان کو لطریق نفس الامر بات کے بیان کیا ہے۔ کیونکہ اگر اثباتِ دعوے ان کا درج کرتے تو یہ کتاب ان شخصوں کے لئے جو کہ اس علم سے نہ تو بالکل بہرہ رکھتے ہیں اور نہ استعداد و شوق اس کے تحصیل کا بہت مسطول ہو جاتے"۔

(ماخوذ از رسالہ مساحت)

(۲)

ہندوستان میں جو لوگ بستے ہیں۔ ان کو یہ بھی واقفیت نہیں کہ ہندوستان میں کون کون ملک کس کس سمت میں واقع ہیں۔ پھر انگلستان فرانس روس وغیرہ ملک جو اس ہندوستان سے باہر ہیں ان کو کیا جانیں بعض شخص یوں سمجھتے ہیں کہ انگلینڈ والوں کی ولایت شہر کلکتہ ہی ہے جب خاص اپنے ممالک کی سمتوں کے دریافت میں یہ حال ہے تب غیر ملک کے لوگوں کی بول چال اور راہ و رسم اور اس ملک میں جو جو اجناس پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہاں کے لوگ جو جو چیزیں اپنی دست کاری سے ایجاد کرتے ہیں اور وے جس قدر علمیت اور صنعت وغیرہ رکھتے ہیں ان سب حالوں سے واقفکار بعض شخص ہوتا ہے"۔

(ماخوذ از جغرافیہ)

ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ مرزا کے زمانہ میں سیدھی سادی نثر میں دیباچہ لکھنے کا خیال لوگوں میں ضرور ہو گیا تھا۔ اور کم از کم ادبی کتب کے سوا علوم و فنون کی دیگر کتب میں سیدھی سادی نثر والے دیباچے کا رواج ضرور ہو چلا تھا

خواجہ بدر الدین خاں عرف خواجہ امان صاحب نے بوستانِ خیال[1] کا ترجمہ اردو میں کیا تھا۔ اس کے متعلق مرزا غالب نے نواب میر غلام بابا جان بہادر (سورت) کو لکھا تھا۔

> خواجہ بدر الدین خاں میرے بھتیجے نے بوستانِ خیال کو اردو میں لکھا ہے۔ اس کا ایک اشتہار اور یہاں ایک اخبار نیا جاری ہونے والا ہے اس کے دو اشتہار خط کے ساتھ بھیجتا ہوں۔ آپ یا آپ کے احباب میں سے کوئی صاحب کتاب کے یا اخبار کے خریدار ہوں اشتہار کے مضمون کے مطابق عمل میں لائیں"۔

خواجہ بدر الدین خاں کے پردادا نواب رستم خاں صاحب حضرت غالب کے دادا نواب رستم خاں صاحب کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔ اس لئے

---

[1] مراد بوستانِ خیال جلد اول ۱۲۹۳ھ۔ مدائن اقتدار۔ "مضمون نگار"

مرزا نے صاحبِ بوستانِ خیال کو اپنا بھتیجا لکھا ہے اور اپنے بھتیجے کی کتاب کا جو دیباچہ لکھا ہے اس کی ابتدائی چند سطریں بطور نمونہ یہ ہیں:۔

"سبحان اللہ شاہدِ زیبائے سخن کا حسنِ بے مثال مشاہدہ
اس کا نور افزائے نگاہ، تصور اس کا تمکین افروزِ خیال آرزو ہے
لفظ اہلِ معنی کی نظر میں آئینہ عارضِ جمال من حیث المعنی لصورت
صنعت قطبِ کلام کا مطلوب یعنی بکمال اگر نفسِ ناطقہ کو حق نے
بصورت انسان پیدا کیا ہوتا تو اس صورت میں ہم کیونکر
کہیں کہ کیا ہوتا اس لعبت دلفریب کی نظارگی سے بے
بادہ مست ہو جاتے اور یہ پیکرِ ہوش ربا دیکھ کر اہلِ معنی یک قلم
صورت پرست ہو جاتے۔ نظم میں اور ہی روپ نثر میں
اور ہی ڈھنگ فارسی میں اور ہی زمزمہ اردو میں اور ہی
آہنگ۔ سیر و تواریخ میں وہ دیکھو جو تم سے سینکڑوں برس
پہلے واقع ہوا ہے۔"

(ارذوئے معلےٰ و عودِ ہندی)

یہ تو ہوا اس کتاب کے دیباچہ کا نمونہ جس کی اشاعت مرزا کو بدل و جان منظور تھی۔ اور جو ان کے بھتیجے صاحب کی لکھی ہوئی تھی۔ مگر انھوں نے اپنے ایک خاص انتخاب کا جو دیباچہ لکھا ہے۔ وہ کچھ کم قابلِ غور نہیں ہے چنانچہ وہ تمام و کمال ذیل میں دیا جاتا ہے جس سے خود ظاہر ہو جائے گا کہ مرزا نے اس انتخاب میں کیا لکھا ہے۔ کیوں لکھا ہے۔ اور کس کے لئے لکھا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"یہ کتاب دو باب کی ہے حقیقت یہ اس کتاب کی ہے کہ پہلے باب میں دو دیباچے اور کئی لطیفے اور کئی مکتوب ہیں۔ اگر میرے لکھے ہوئے نہ ہوتے تو میں کہتا کہ بہت خوب ہیں۔ دوسرا باب اشعار کا ہے کہ وہ بھی کلام اسی خاکسار کا ہے۔ اگر کوئی خط اردو زبان میں لکھا جائے ان اشعار میں سے شعر محل و مقام کے درج کیا جائے اور یہ محمود بندہ اس جنابِ رفعت مآب کے ہے جس سے عزت و توقیر فنانشل کمشنری پنجاب کی ہے مناقبِ عالی شان علم و اہلِ علم کے قدر دان یگانہ روزگار جن کا مطیع و محکوم ہونا اہلِ ہند کو سرمایۂ عز و افتخار والا پایہ عالی رتبہ معلی القاب حضرت فلک رفعت مکلوڈ صاحب بہادر فنانشل کمشنر بہادر قلمرو پنجاب پس یہ کتاب اگر ان کے حکم سے چھاپی جائے گی تو صاحبانِ تازہ وارد ولایت کے پڑھنے کے کام آئے گی اس کتاب کا نذر کرنے والا جو اپنی نذر کے قبول ہونے کا طالب ہے نصراللہ بیگ خاں بہادر رئیس سلسا کا بھتیجا موسوم بہ اسداللہ خاں متخلص بہ غالب ہے۔ میرے چچا کی سرداری اور ریاست کا حال گورنمنٹ اعلیٰ کے دفتر میں مرقوم ہے اور میرے قصیدے کا جنابِ مستطاب لارڈ الن برا بہادر کے ذریعہ سے وزیر اعظم کے پاس پہنچنا اور حضرت قدر قدرت شہنشاہ بحر و بر ملکہ معظمہ محتشمہ کے حضور پر نور میں گذرانا از روئے مشاہدہ خطوط آمد ولایت جو بہ سبیل ڈاک مجھ کو ولایت سے آئے ہیں۔ گورنمنٹ بہادر ہندوستان کو معلوم ہے البتہ میں اس کا مستحق ہوں کہ کوئین پوئٹ گنا جاؤں اور اس علاقہ سے ایک نیا نام اور نئی عزت پاؤں اگر رتبہ بڑھایا نہ جائے قدیم عزت میں تو فرق نہ آئے۔

نظم

اے جہاں آفریں خدائے کریم — صانعِ ہفت چرخ و ہفت اقلیم
نام مکلوڈ جن کا ہے مشہور — یہ ہمیشہ بصد نشاط و سرور
عمر و دولت سے شادمان رہے — اور غالب پہ مہربان رہے

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرزا دیباچہ نویسی کے باب میں کیوں رنگِ زمانہ پر کاربند رہے؟ ممکن ہے کہ مرزا کا مقصد یہ رہا ہو کہ وہ اپنے معاصرین و دیگر اربابِ علم کو بخوبی جتلا سکیں کہ وہ اپنے زمانہ کی پسندیدہ نگاری میں بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ القصہ اگر مرزا کے دیباچوں کو بہ غور دیکھا جائے تو ان میں بھی ان کی جدت پسندی نمایاں پہلو رکھتی ہے۔

"فطرت"

جوانی کی رات

شب کہ حریمِ ناز میں شور مدا اضطراب تھا
عشق بھی تھا برہنہ سر حُسن بھی بے نقاب تھا
آنکھوں میں روئے یار تھا آنکھیں تھیں روئے یار پر
ذرہ تھا آفتاب میں، ذرے میں آفتاب تھا

خشک تکلفات کی ٹوٹ چکی تھیں سب حدیں
چشمکِ بے دریغ تھی، خندۂ بے حجاب تھا
سر پہ صراحیاں لئے رقص کناں تھے مغبچے
نرگسِ نیم باز میں رنگِ شرابِ ناب تھا

معرکہ عظیم تھا، نازمیں اور نیاز میں
زلف میں تھی جو برہمی، دل کو بھی پیچ وتاب تھا

موج ہوا میں عطر تھا، چھٹکی ہوئی تھی چاندنی
پھول تھے صحن باغ میں، چرخ پہ ماہتاب تھا

عشق کی نبضِ شوق میں دوڑ رہی تھیں بجلیاں
حُسن کے دستِ ناز میں شعلہ فشاں رباب تھا

پرتوِ یار اس طرف، رامش و رنگ اُس طرف
چشم بھی فتحمند تھی، گوش بھی کامیاب تھا

درد سے قلب چُور تھے، کیف سے روح مست تھی
سوز بھی بے نظیر تھا، ساز بھی لاجواب تھا

ہونٹوں کو وقتِ گفتگو چومتی تھی شگفتگی
بات جو تھی سو پھول تھی، پھول جو تھا گلاب تھا

اور سحر کو ہمنشیں! آنکھ کھلی تو کیا کہوں
پھول پڑے تھے خاک پر، چرخ پہ آفتاب تھا

توبہ شکن صراحیاں فرش پہ چُور چُور تھیں
خلد فروش جامِ زر، شرم سے آب آب تھا

نغمہ و رقص کی صدا، ایک فسردہ گونج تھی،
شمع و شراب کا سماں ایک پریدہ خواب تھا

لرزشِ بادہ و خمِ زلفِ سیاہ کے عوض
تھا تو چراغِ کشتہ کے دود کا پیچ وتاب تھا

صبح کے سقف و بام میں گونج رہی تھی یہ صدا
رات نہ تھی وہ کیف کی جوشِ ترا شباب تھا

جوشؔ ملیح آبادی — "زمانہ"

انگریزی

مجھے تم سے محبّت ہے

مجھے تم سے محبت ہے، ہاں، مجھے تم سے محبت ہے۔
اس کے سوا میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔
دن اور رات محبت کے خواب دیکھتا ہوں۔
محبت ہی میرے دل کے گنبد کی صدا ہے۔

مجھے تم سے محبت ہے، ہاں، مجھے تم سے محبت ہے۔
ہر وقت میری زبان پر یہی لفظ رہتے ہیں
اور یہی میرے اُن اشعار کا لُبِّ لباب ہے جن پر مجھے سب سے زیادہ ناز ہے
یہی وہ ناطق فیصلہ ہے جو میری آنکھیں سنہلوں اور سرے جوانی کے ستونوں کو سناتی ہیں۔

مجھے تم سے محبت ہے
تم ہزاروں میں وہ ایک ہو جس سے مجھے محبت ہے۔

مجھے تم سے محبت ہے، ہاں مجھے تم سے محبت ہے۔
تمہاری چمکتی ہوئی سرمئی آنکھوں سے مجھے پیار ہے،
اور اس رسیلی بانسری سے جو تمہاری آواز کے اندر ہمیشہ سنائی دیتی ہے،
اور جس کی تانیں مجھ پر جادو سا کر دیتی ہیں۔
لیکن اے میرے دل کی ملکہ، میری محبت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ
تمہاری قسمت میں چاہے کیا ہو مجھے تم سے ویسی ہی محبت رہے گی۔

تم کیوں آنسو بہاتی ہو

"اے خاتون، تم اب دریا آنسو کیوں بہا رہی ہو؟
"تم کیوں دریا کے کنارے آنسو بہاتی ہو؟

"میں اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کے ساتھ تمہارا بیاہ کر دوں گا۔
"اور تم اس کی دلہن بنو گی۔

"اُس کی دُلہن
"جس کا حُسن آنکھوں کو لُبھانے والا ہے"۔

لیکن وہ اپنے دُور افتادہ عاشق کے لئے آنسو بہاتی رہی۔

"اس غم کو چھوڑ دو
" یہ گال جو زرد ہو رہے ہیں انہیں خشک کرو
" میرا بیٹا ایرنگمن کا نواب ہے۔
" اور بینگلے کی وادیوں کا مالک
" بزم میں اس کی شیریں بیانی سب سے مُمتاز ہے۔
" اور رزم میں اس کی تلوار سب سے زیادہ تیز ہے"

لیکن وہ اپنے دور افتادہ عاشق کے لئے آنسو بہاتی ہی رہی۔
شادی کی مجلس پھولوں سے آراستہ ہے۔
شمعیں جل رہی ہیں۔
دُولھا اور مہمان سب مُنتظر بیٹھے ہیں۔
ہر طرف اس کی تلاش ہے۔
لیکن وہ کہیں نہیں ملتی۔
سرحد کے پار وہ اپنے دور افتادہ عاشق کے پاس جا پہنچی ہے۔

ملک محمد اسلم خاں ایم اے (کیمبرج) بیرسٹر ایٹ لا لاہور

روسی

مطمئن نوجوان

ایک نوجوان شخص فرطِ مسرت سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا سڑک پر جا رہا ہے۔ اس کی ایک ایک حرکت سے خوشی اور مستعدی کا اظہار ہو رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک ہے، اس کے لبوں پر ایک تبسم ہے۔ اس کے مسرور چہرے پر ایک خوشگوار رنگ چھا رہا ہے۔ . . . . وہ سراپا اطمینان اور مسرت دکھائی دے رہا ہے۔

اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا اسے وراثت میں کوئی بہت بڑی جائداد ہاتھ آئی ہے؟ کیا اسے ترقی ملی ہے؟ کیا وہ اپنی محبوبہ سے ملنے جا رہا ہے؟

یا محض وہ کوئی پُر تکلف کھانا کھا کر آیا ہے۔ اور اس کے غرور اور صحت کے نشے نے اس کی رگ رگ میں خون کی حرکت کو تیز کر دیا ہے!

نہیں۔ اس نے اپنے ایک دوست پر افترا باندھا تھا۔ اس کی تشہیر میں اپنی تمام کوشش صرف کر دی تھی، اور اب اُسی افترا کو اس نے اپنے کسی دوسرے دوست کی زبانی سنا ہے۔ اور خود بھی اُس پر ایمان لے آیا ہے!

آہ کتنا مطمئن! کتنا مہربان بن گیا ہے اس وقت یہ شریف نوجوان!

تخیل کی دیوی

میں کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا. . . . . صبح ہو رہی تھی، آغازِ بہار کی ایک صبح۔

روشنی پوری طرح نمودار نہ ہوئی تھی، لیکن تاریک اور خوشگوار رات اس کی آمد سے کچھ زرد اور افسردہ ہو چلی تھی۔

فضا میں نہ دھند تھی نہ بادِ نسیم کے جھونکے، وہ صاف شفاف اور پُر سکون تھی. . . . لیکن بیداری کا قرب محسوس ہو رہا تھا، ہوا میں سے شبنم کی خوشبو آ رہی تھی۔

یکایک کھلی ہوئی کھڑکی میں سے ایک ہلکی سی پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ ایک بڑا سا پرندہ میرے کمرے آ داخل ہوا۔

میں چونک کر اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا. . . . . یہ پرندہ نہ تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی پر دار عورت تھی جس نے ایک لمبا چست لباس پہن رکھا تھا جو اس کے پاؤں تک پہنچتا تھا

سر سے پیر تک اس کا رنگ صدف کا سا تھا، صرف اس کے پروں کے اندرونی رُخ سے ایک کھلتے ہوئے گلاب کی ہلکی ہلکی سرخی جھلکتی تھی، اس چھوٹے سے گول سر کی بکھری ہوئی زلفوں کو وادی کی نرگس کے ایک ہار نے اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔ اور ایک تیتری کے رنگین پردوں کی طرح وہ پیاس کے

گول حسین ملتے پر اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔

دو دفعہ اس نے اڑ کر چھت کا طواف کیا، اس کا ننھا سا چہرہ ہنس رہا تھا، اس کی بڑی بڑی صاف اور سیاہ آنکھیں بھی ہنس رہی تھیں۔

پروانگی مسرت آمیز شوخی سے وہ ہیروں کی طرح چمک رہی تھیں۔

اس کے ہاتھ میں ایک صحرائی پھول کی لمبی سی شاخ تھی میرے سر پر تیزی سے پرواز کرتے ہوئے اس نے اس پھول سے میرے سر کو چھوا۔

میں اس کے پیچھے بھاگا... لیکن اتنے میں وہ کھڑکی سے باہر نکل چکی تھی، اور دُور اڑ رہی تھی۔

باغ میں، خوشنما پھولوں سے بھری ہوئی ایک جھاڑی کے پاس ایک صحرائی فاختہ نے اپنے ادلیں نغمۂ سحر گاہی سے اس کا استقبال کیا، اور جہاں وہ غائب ہو گئی وہاں دودھ جیسا سفید آسمان ہلکے گلابی رنگ سے تمتما اٹھا۔

میں تجھے جانتا ہوں، اے تخیل کی دیوی! تو یوں ہی اچانک میرے پاس آجایا کرتی ہے، تو جوان شاعروں کے پاس اکثر آتی ہے۔

شاعری! جوانی! اور عورت کے اچھوتے حسن! تو نے میری آنکھوں کو روشن کیا، مگر آغازِ بہار کی صبح کے ابتدائی لمحوں میں سے صرف ایک لمحے کے لئے!

آخری ملاقات

ایک زمانے میں ہم گہرے دوست تھے ..... لیکن ایک ایسی منحوس گھڑی آئی کہ ہم دشمنوں کی طرح ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

کئی برس گزر گئے ..... ایک دن جب میں اُس بستی میں آیا جہاں وہ رہتا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ بہت بیمار ہے۔ اور مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔

میں اس کے مکان پر پہنچا اور اس کے کمرے میں داخل ہوا ..... ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔

بمشکل میں نے اسے پہچانا۔ اللہ! بیماری نے اس کا کیسا برا حال کر دیا تھا۔

زرد اور جھریوں سے بھرا ہوا چہرہ، سر کے بال اُڑے ہوئے، چھدری چھدری داڑھی۔ صرف ایک قمیص پہنے وہ بیٹھا تھا۔ جس کا گلا ارادتاً اس نے کھول رکھا تھا ...... وہ ہلکے سے ہلکے کپڑے کا بوجھ بھی اس وقت سہار نہ سکتا تھا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے اپنا خوفناک طور پر نحیف ہاتھ جو اس طرح معلوم ہوتا تھا جیسے اسے گھن کھا گیا ہے۔ آگے بڑھایا، اور بڑی کوشش سے چند مبہم سے الفاظ کہے — نہ جانے میرے استقبال کے طور پر یا اظہارِ افسوس کے طور پر! اس کا نحیف سینہ ابھرا اور اس کی مشتعل آنکھوں کی سکڑی ہوئی پتلیوں میں سے دو دکھ بھرے آنسو ٹپک پڑے۔

میرا دل ڈوبنے لگا..... میں نے اپنی کرسی اس کے قریب کر لی، اور اس کے گھناؤنے پن اور ہیبت ناکی سے قطع نظر کرتے ہوئے میں نے بھی بے اختیار اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا۔

لیکن مجھے ایسا معلوم ہوا کہ یہ اس کا ہاتھ نہ تھا جس نے مجھ سے معانقہ کیا تھا۔

مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے ہم دونوں کے درمیان ایک بلند قامت خاموش، سفید رنگ عورت بیٹھی ہے۔ اس نے سر سے پاؤں تک ایک لمبی چادر لپیٹ رکھی ہے۔ اس کی زرد اگہری آنکھیں خلا میں دیکھ رہی ہیں، اور اس کے پیلے بے رحم ہونٹوں میں سے کوئی آواز نہیں نکلتی۔

اس عورت نے ہمارے ہاتھوں کو ملایا ہے ..... اس نے ہمیشہ کے لئے ہماری صلح کر دی ہے۔

ہاں ..... موت نے ہماری صلح کرا دی ہے ....

منصور احمد

ہندی

کرن

وہ بجلی کی تڑپتی لکیر کتنی تیز چلتی ہے، اور وہ تاروں کی دنیا کی رہنے والی میرے گھر آتی ہے۔ میں جہاں جاتا ہوں میرے ساتھ جاتی ہے اور جب ٹھہرتا ہوں وہ بھی کھڑی ہو جاتی ہے — اور وہ سمندر کی لہروں سے مل جل کر بہتی رہتی ہے۔

وہ بہت سویرے اُٹھ کر پانی میں ناؤ چلاتی ہے، اور اُن سوئے ہوئے کنولوں کو گدگدا کر ہنسا دیتی ہے. جو شام کے وقت گلے مل کر رات بھر کے لئے الگ ہو جاتے ہیں اور رات کی گود میں تھک کر سکھ سے سوتے ہیں.

وہ دن بھر نڈی میں کھیلتی ہے اور کچھ بن میں ڈھونڈا کرتی ہے جب کوئل بولتی ہے تو کوک بن کر ہوا کی موجوں سے اٹکھیلیاں کیا کرتی ہے.

جب سُنہری موسم آتا ہے تو وہ طرح طرح کے پھولوں میں سندر رنگ بن جاتی ہے. وہ سویرے ہی سویرے جاگ کر میرے سرھانے آجاتی ہے میں ابھی آنکھیں ہی مل رہا ہوتا ہوں کہ وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتی ہے.

اگر آکاش میں بادل اُسے کھانا چاہتا ہے تو وہ اوپر کو اُڑ جاتی ہے جب پھل پکتے ہیں تو بادلوں سے چھن چھن کر پھلوں میں رس بن کر رہ جاتی ہے.

دل کی آگ

جس وقت آسمان چپ چاپ زمین سے محبت کرتا ہے اور ہوا کی آنکھوں کو بند کئے ہوئے دل کی بیند سے لطف اٹھاتا ہے اور چاند کی کرنیں کنول کے کومل پھولوں کو چوم چوم کر کلولیں کرتی ہیں اس وقت بھی اے میرے انوکھے دل کی آگ! بھلا تو کیوں دھکا کرتی ہے؟

جب چاندنی کی چادر اوڑھ کر ساری دُنیا سو جاتی ہے. اور ہر طرف سناٹا چھا جاتا ہے تو فطرت کے رنگین خواب کی دیوی دُنیا کے سمن میں چکر لگانا شروع کر دیتی ہے. تب بھی اے میرے دنیا سے نفرت والے دل کی آگ تو کیوں دھکا کرتی ہے!

جب شفق سرخی کے استقبال میں خوشی کا نعرہ لگاتی ہے تو ٹھنڈی ہوا کے بہانے پریوں کو چھوتی ہوئی آتی ہے. اس کے بعد بھونروں کا گروہ پھولوں پر گُن گُن کا منتر پڑھتا ہوا آتا ہے. اُس وقت بھی اے میرے میٹھے درد بھرے دل کی آگ! تو کیوں دھکا کرتی ہے؟!

اندرجیت شرما

فارسی

ایک رات

رات زندگی کی صبح کی طرح حسین اور ایام جوانی کی طرح نشاط افزا تھی.

اُس کی آمد سے مُرغ و ماہی آرام کر رہے تھے،

اور حوادثِ زمانہ محوِ خواب تھے.

صرف ستاروں کی آنکھیں حسین دنیا کے نظارے میں محو تھیں

کتوں کا حلقۂ دم اُن کے لئے طوق بن گیا تھا

جس سے اُن کی عف عف دب گئی تھی،

رات نے پاسبان کے ہوش و حواس کھو دیئے تھے

اور گھنٹے کی زبان خاموش تھی.

نیند نے دُہل کوب کے ہاتھوں کو باندھ کر فرض کی ادائیگی سے روک دیا تھا.

تابش صدیقی

نقد و نظر

نجمۂ نوری

مصنفہ جناب نصار ناصری بی۔اے یہ ایک معاشرتی ڈراما ہے جو میاں بیوی کے تعلقات کے اہم موضوع پر لکھا گیا ہے۔ اس میں عورت کی نفسیات اور اس کے مطالبات کی طرف مرد کو توجہ دلائی ہے، اور ان سے ناواقفیت کے باعث خانگی زندگی میں جو بدمزگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان کو واضح اور موثر طور پر نمایاں کیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ عورت محض مرد کے دولت و اقبال سے مطمئن نہیں ہوتی اس کا سب سے بڑا مطالبہ شوہر کی محبت ہے۔ وہ اُسے دن رات کاروبار میں مصروف دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ بلکہ اس کے وقت پر اپنا بھی ایک حق سمجھتی ہے نجمۂ نوری ایک حزنیہ ڈراما ہے۔ جس میں شوہر کی بے اعتنائی سے ایک با عصمت خاتون کی پُرامن زندگی کی تباہی کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ ڈرامے کی زبان اور مکالمہ بہت اچھا ہے۔ حجم ۱۰۴ صفحات قیمت بارہ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ ساقی بک ڈپو دہلی۔

تعلیم زدہ بیوی

از جناب فضل حق صاحب قریشی دہلوی۔ یہ ایک مزاحیہ ڈراما ہے جس کا پلاٹ فرانس کے مشہور ڈرامانویس مولیر کے تین مختصر ڈراموں سے اخذ کیا گیا ہے اس میں اُس آزادہ روی کے بُرے نتائج کو لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے جس میں بعض عورتیں اپنی کم فہمی کے باعث مبتلا ہو جاتی ہیں ظرافت کا ایک کمال یہ ہے کہ وہ اکثر سنجیدگی سے کہی ہوئی بات سے زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ قریشی صاحب کا یہ ڈراما اس معیار پر پورا اترتا ہے۔ اس ڈرامے کا چوتھا منظر خصوصاً بہت دلچسپ ہے جہاں فلسفے اور حکمت کی انوکھی بحث ہے۔ حجم ۸۶ صفحات قیمت آٹھ آنے ملنے کا پتہ ساقی بک ڈپو دہلی۔

موتی

مولفہ جناب سید یوسف بخاری دہلوی۔ اس میں سو سے زائد موضوعات پر دنیا کے بڑے بڑے مفکرین کے پُرحکمت اور شاعرانہ اقوال جمع کئے گئے ہیں ابتدا میں مولف کا مقدمہ ہے جس میں اقوال کی تاریخ ان کا فلسفہ، ان کی ماہیت اور مختلف اقوام کے اقوال کی خصوصیت کا بیان ہے۔ کتاب نہایت دلچسپ اور کارآمد ہے۔ حجم ۱۴۴ صفحات قیمت بارہ آنے۔ سید محمد صاحب بخاری پبلشر گلی امام جامع مسجد دہلی سے طلب فرمایئے۔

پیراکی:۔

مصنفہ سید اکبر علی صاحب ایم۔اے ایل۔ٹی۔ اس کتاب میں فن شناوری کے تمام اصناف یعنی سخت پیرائیاں، جھبن پیرائیاں، ڈوبتے ہوؤں کو نکالنے کے طریقے، جل بانک، پانی میں پھاندنا اور پانی کی شناخت وغیرہ ۲۷ اشکال کے ذریعے سے عام فہم زبان میں سمجھائے گئے ہیں۔ شناوری کے شائقین کو اس کتاب سے ضرور استفادہ کرنا چاہیئے۔ قیمت چار آنے ملنے کا پتہ سید اکبر علی صاحب پاٹانالہ لکھنو

بچوں کی تفسیر

یہ قرآن مجید کے آخری پارے کی تفسیر ہے اور مجلس عالمگیر تحریک قرآن کی مساعی میں سے ایک کامیاب کوشش ہے۔ اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم کو معنی و مطلب کے ساتھ عام اور لازمی کیا جائے تاکہ اس حکیمانہ کتاب کے نزول کا منشا پورا ہو۔ اس تفسیر میں پہلے نہایت آسان زبان میں عربی الفاظ کے معنی بتائے ہیں پھر آیات کا تحت اللفظ ترجمہ کیا ہے۔ اور اس کے بعد ہر سورت کے اختتام پر مختصراً وہ تمام مباحث لکھی ہیں جن کا اُس سورت میں ذکر ہوا۔ ترجمے میں الفاظ کے معنی حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ رفیع الدین اور حضرت شاہ عبدالقادر کے ترجموں سے لئے گئے ہیں جو علمائے ہند کے نزدیک بالاتفاق مستند ہیں۔ اس تفسیر کی ایک خوبی یہ ہے کہ عربی قواعد جانے بغیر بچے قرآن کے معانی پر عبور حاصل کر سکتے ہیں لکھائی چھپائی اور کاغذ نہایت عمدہ قیمت مجلد مع محصول ایک روپیہ ملنے کا پتہ۔ مجلس عالمگیر تحریک قرآن۔ حیدرآباد۔ دکن۔

آخری پارہ

مجلس مذکور نے بچوں کی تفسیر کی طرز پر آخری پارے کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کیا ہے ابتدائی صفحات میں مجملاً اسلامی عقائد و اعمال کا بیان بھی دیا ہے یہ کتاب بھی بہت اچھی چھپی ہے قیمت مجلد مع محصول آٹھ آنے مجلس عالمگیر تحریک قرآن۔ حیدرآباد دکن سے طلب فرمایئے۔

ہم گورِ غریباں میں

نوشتہ مسٹر تہنیت شاہ حسین رضوی ایم۔اے ایل ایل بی۔ ایڈیٹر رسالہ خیابان لکھنو

اس کتاب میں میر اور سودا کے مزارات کی تحقیق پر ایک مختصر سلسلۂ مضامین ہے۔ یہ زندہ قوموں کا ایک امتیازی نشان ہے کہ وہ اپنے مشاہیر کی یادگاروں کی حفاظت کرتی ہیں لیکن ہماری بے حسی ملاحظہ ہو کہ ہمیں اپنے سب سے بڑے شاعر کی قبر کے متعلق اتنا بھی علم

نہیں کہ وہ کہاں ہر اربابِ ادب کو شہنشاہ حسین صاحب کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے ان کے لئے یہ محققانہ مضامین لکھے حجم ۴۲ صفحات مصنف سے طلب فرمائیے۔

باپ کا قاتل

یہ فرانس کے مشہور ترین شاعر و ادیب فرانسو کوپیہ کا ایک ناول ہے جسے مولوی عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی نے اردو زبان میں منتقل کیا ہے۔ اس افسانے کی اہمیت و مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ یورپ کی تقریباً تمام زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے اور صرف پڑھا ہی نہیں گیا بلکہ سٹیج پر بھی ہزاروں مرتبہ دکھایا گیا ہے۔ یہ ایک نہایت بلند و بدیع کتاب ہے جس میں سچے جذبات عام فطرت اور واقعات و حقائق کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا گیا ہے۔ مولوی عبدالرزاق صاحب اللہ کے مسلمہ ادیب ہیں اور ان کا نام ہی سمجھئے کی خوبی کا ضامن ہے حجم ۲۳۶ صفحات قیمت آٹھ آنے ملنے کا پتہ۔ ہند پریس نمبر ۲۸۔ اے جتن بخش ایونیو۔ کلکتہ۔

ترکانِ احرار

مولفہ محمد عبدالمجید صاحب عتیقی اس کتاب میں اُن ترک رہنماؤں کے حالات زندگی درج ہیں جنھوں نے جنگِ عظیم میں حصہ لیا اور اپنے ملک کو تباہی سے بچا کر از سر نو دنیا کی زبردست طاقتوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا کتاب کی مقبولیت کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ اب یہ ساتویں مرتبہ چھپی ہے اور اس پر ہندوستان کے اکابر اور اخبارات نے بہترین آرا کا اظہار کیا ہے ساتویں ایڈیشن پر مولانا ظفر علی خاں نے ایک بصیرت افروز اور مبسوط مقدمہ لکھا ہے جو بجائے خود ایک قابلِ دید چیز ہے کتاب تین درجن سے زائد تصاویر سے مزین ہے حجم ۲۱۶ صفحات قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ کامل بک ڈپو لاہور سے مل سکتی ہے

جڑی بوٹی کامل

مولفہ حکیم محمد عبدالمجید صاحب عتیقی۔ اس میں مشہور بوٹیوں کے متعلق دلچسپ معلومات اقسام، ماہیت و شناخت، کیفیاتِ مضرت و اصلاح، مزاج و درجہ، افعال و خواص، مفرد استعمالات، ویدک، یونانی اور ڈاکٹری مرکبات، اور ان کے ذریعے کشتہ کرنے کی ترکیب نہایت تفصیل کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔ بوٹیوں کی پہچان کے لئے ان کی عکسی تصویریں بھی کتاب میں شامل کی گئی ہیں، حجم ۱۵۰ صفحات قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ کامل بک ڈپو۔ لاہور

آگ کے کرشمے

مولفہ حکیم محمد عبدالمجید صاحب عتیقی۔ اس کتاب میں آگ یعنی اللہ کی قدیم و جدید تحقیق، پرانے توہمات اور عجیب و غریب روایات کا تذکرہ ہے۔ اس کے علاوہ آگ کے سحر کار اثرات اور اس کے ذریعے سے شدید امراض کے شافی علاج درج ہیں۔ حجم ۴۳ صفحات قیمت پانچ آنے کامل بک ڈپو لاہور سے منگائیے۔

قوتِ لایموت

مصنفہ حکیم منشی محمد عبدالصمد صاحب ناگپوری۔ اس رسالے میں بہت سی اقسام کی لذیذ اور مقوی غذائیں، ان کے مزاج اور تیاری کی ترکیب درج ہیں بالخصوص ان غذاؤں کا مفصل بیان ہے جو مریضوں کے لئے فائدہ مند ہیں۔ حجم ۳۲ صفحات قیمت چار آنے پتہ کامل بک ڈپو لاہور۔

اوقافِ صوبہ متحدہ

مرتبہ انیس احمد صاحب عباسی بی۔ اے اس میں حالتِ اوقاف کے متعلق ملک کے مشہور اور متعدد اخبارات اور اہلِ قلم کی رائیں پیش کر کے اصلاح اوقاف کی تحریک کی گئی ہے بالخصوص نظام امام باڑہ گورکھپور کے حالات درج کئے گئے ہیں قیمت چھ آنے ایڈیٹر روزنامہ حقیقت لکھنؤ سے طلب کیجیے۔

مساواتِ اسلامیہ

مولفہ مولوی شبیر محمد رضا صاحب قادری کاکوروی۔ اس کتاب میں مسلمانوں کے قومی تنزل کے اسباب و علل پر بحث کی گئی ہے اور اس کے بعد مسلمانوں کو مساوات و عمل کی طرف توجہ دلا کر اس پستی سے نکلنے کی راہ بتائی ہے حجم ۹۶ صفحات قیمت چھ آنے جناب مصنف سے نظیر آباد لکھنؤ کے پتے سے منگائیے

سفرنامۂ ہند

اس کتاب میں لالہ بالکشن صاحب بترہ آر بی اے ایل ایل بی وکیل ملتان نے ہندوستان کے مشہور مقامات کے چشم دید حالات دلچسپ پیرائے میں بیان کئے ہیں سیاحت کرنے والوں کے لئے یہ کتاب مفید ثابت ہوگی حجم ڈیڑھ سو صفحات قیمت ایک روپیہ مصنف موصوف سے طلب کیجئے۔

بارہ پھلجھڑیاں

اس میں سید ابو تمیم صاحب فریدآبادی کے بارہ مزاحیہ مضامین درج ہیں نو طبعزاد ہیں اور تین ترجمہ کئے گئے ہیں ابو تمیم صاحب کی زبان صاف اور لطیف ہے لیکن ترجموں میں غیر زبان کی جھلک ابھی باقی ہے حجم ۱۰۸ صفحات قیمت درج نہیں ملنے کا پتہ۔ سید ابو تمیم صاحب فریدآبادی۔ فریدآباد۔ قریب دہلی۔

اصغر گونڈوی کی شاعری

اس کتاب کے مصنف کوئی تیر کوٹ صاحب ہیں اس میں حضرت اصغر کی شاعری کے خلاف مضامین لکھے گئے ہیں، جن کا لہجہ معاندانہ ہے حجم ۱۲۵ صفحات قیمت آٹھ آنے پتہ:۔ مہدی علی خاں صاحب تاجر کتب دکان نمبر ۲۴ چوک۔ الہ آباد۔

پاک دامن دوشیزہ

نذیر حسین صاحب نسیم چغتائی کا ناول ہے۔ متعدد مقامات پر نظر ڈالنے سے دلچسپ اور سبق آموز معلوم ہوا معمولی کاغذ پر چھپا ہے حجم ۴۴ صفحات قیمت ۵۔ اردو بک سٹال لاہور سے منگائیے

تصویر

ماہوار مصور رسالہ ہے جس میں دنیائے فلم کے متعلق مضامین شائع ہوتے ہیں فقیر حسین صاحب فقیر نظامی اس کے ایڈیٹر ہیں اور وہ اسے صوری و معنوی حیثیت سے بہتر بنانے میں ہر وقت کوشاں رہتے ہیں مضامین کے لحاظ سے رسالہ خوب ہے، خوبصورت تصویریں بھی کثرت سے موجود ہیں لیکن ہم کارپردازانِ رسالہ کو کاغذ اور کتابت کی طرف توجہ دلائے بغیر نہیں رہ سکتے سالانہ چندہ تین روپے اور ایک پرچے کی قیمت تین آنے مقرر ہے۔ درخواستیں مینیجر رسالہ تصویر لاہور کے نام بھیجیے۔

فہرستِ مضامین "ادبی دنیا"

جلد ۱۰ — بابت ماہِ ستمبر ۱۹۳۴ء — نمبر ۶

تصویر:۔ ننھے تو پٹ جائے گا

سالانہ چندہ چار روپے سات آنے محصول اور وی پی نو آنے کل پانچ روپے ممالکِ غیر سے دس شلنگ

حمد

تری شانِ تجمل کا وقار عرش ہے مظہر
ضیا افگن ہے تیرا حسن تمنائے کی دنیا میں
کہیں موجود ہے رنگ و بہارِ گلستاں بن کر
ترے حسنِ تحیر زا کی کوئی انتہا بھی ہے
ترا سازِ محبت ہے ترنم عندلیبوں کا
ترے حسنِ جہاں افروز کے ہیں مختلف منظر
حدودِ ذات سے تیرے نہیں ہے کوئی شے باہر
تری شانِ ربوبیت ہے ہر معلول کی علت
ترے ہی نور سے روشن ہیں پتھرائی ہوئی آنکھیں
بیاباں، کوہ، باغ و دشت، صحرا، موج اور ساحل
سمجھتے ہیں خدا تجھ کو ثنا کرتے ہیں سب تیری
سمجھ سکتے نہیں ہرگز حقیقت تیرے جلووں کی
ہر اک ان میں سے تابع تیرے فاہر حکمِ محکم کا
غریبوں کی تڑپ میں اور یتیموں کی نگاہوں میں
تری قدرت سے ہوتے ہیں چٹانوں سے رواں دھارے
تری قدرت کی طاقت کا یہ اک ادنیٰ کرشمہ ہے
ترے حسنِ جلالت خیز کی گرمی اگر چاہے
جو تو چاہے مرے مولا تو وہ نتھے خون ٹپکائیں

ترا نقشِ جلالت ثبت ہے کعبہ کی عظمت پر
ترے انوار کی تابش ہے فانوسِ کلیسا میں
کہیں ظاہر ہے تو آتشکدے کی گرمیاں بن کر
کہ تو شامل ہے سب میں اور پھر سب سے جدا بھی ہے
خنک غنچوں کی کیا ہے! اک تری تقدیس کا نغمہ
شگوفے، پھول، ذرے، کہکشاں، قوسِ قزح، اختر
نشاط و کیف، نوع و جنس، رنگ و بو، عرض، جوہر
زمانہ، ظرف، مقدار و تجدد، گردش و حرکت
رواں ہوتی ہیں تیرے نام سے چھوٹی ہوئی نبضیں
تری تجرید کے تفرید کے توحید کے قائل
برہمن، شیخ، اسقف، مغ، پری، جن، حور اور قدسی
بصیرت، فہم، ادراک و تخیل، ہوشِ انسانی
ارادہ، آرزو، خواہش، تمنا، ولولہ، جذبا
تری رحمت کے جھونکے بند ہیں بیوہ کی آہوں میں
تری رحمت سے مولا پھول بن جاتے ہیں انگارے
زمیں کے سخت پردے نرم دانہ چیر دیتا ہے
ابھی سارا زمانہ برف کی صورت پگھل جائے
رگیں پھولوں کی پتھر سے زیادہ سخت ہو جائیں

ترے جلوے طلسمِ رنج و کلفت توڑ دیتے ہیں
ترے لطف و کرم ٹوٹے دلوں کو جوڑ دیتے ہیں

منظور حسین ماہر القادری

بزمِ ادب

غیر ذمہ دار محققین اور نقاد

آج کل تنقید اور تحقیق کا شوق عام ہو رہا ہے۔ ہر روز بیسیوں نئے نقاد اور محقق پیدا ہو رہے ہیں۔ اردو زبان کے لئے یہ ایک نیک فال ہے لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ان نونہالوں میں سے عموماً غیر ذمہ دار واقع ہوئے ہیں۔ انھوں نے تنقید کے معنی تنقیص اور تحقیق کے معنی ادب کی غلط سلط فہرستیں تیار کرنا سمجھ رکھا ہے۔ تنقیص کا بیڑا شاید انہوں نے اس لئے اٹھایا ہے کہ سادہ لوح لوگوں کو اپنی مجتہدانہ شان دکھا کر مرعوب کیا جائے اور بے وقوف بنایا جائے۔ لیکن انہیں یہ خبر نہیں کہ نقاد بننے کا یہ گُر کچھ ایسا کارگر نہیں ہے اور سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ دنیائے ادب میں ان کی تحریروں کو کوئی وقعت حاصل نہیں۔

انہیں غیر ذمہ دار حضرات میں سے ایک کوئی پروفیسر احمد علی صاحب ایم۔ اے ہیں جنھوں نے ساقی کے اگست نمبر میں "ادبی چوری" کے عنوان سے ایک مقالہ شائع کرایا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:۔

> میرے دوست اختر حسین رائے پوری نے چند ماہ گزرے مجھ کو یہ واقعہ سنایا کہ کچھ عرصہ ہوا انھوں نے مشہور روسی افسانہ نگار گارشن کی ایک کہانی چاردن کا ترجمہ کر کے ہمایوں میں اشاعت کے لئے بھیجا۔ افسانہ نہ چھپا جب انھوں نے یاددہانی کی تو جواب ملا کہ کاتب کے پاس سے افسانہ کھو گیا۔ خیر گئی گزری بات ہوئی۔ چند ماہ گزرے کہ گارشن کا وہی افسانہ "چاردن" "ادبی دنیا" میں ایک صاحب نے اپنے نام سے شائع کیا۔

زیر بحث افسانہ جیسا کہ ہمارے دوست نے لکھا روسی مصنف گارشن کا ہے۔ ہر شخص اس کا ترجمہ کرنے کا مجاز ہے لیکن اختر حسین صاحب خدا جانے کیوں یہ حق صرف اپنے لئے مخصوص سمجھتے ہیں اور اگر کوئی دوسرا اسے ہاتھ لگائے تو اس کو چوری کا الزام دینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں روزانہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی مضمون کے دو دو تین تین ترجمے موصول ہوتے اور واپس کئے جاتے۔ اور افسانوں کا تو کچھ عجیب حال ہے۔ منتخب افسانوں کے مجموعے سب کی دسترس میں ہیں لیکن یہ سب کو معلوم نہیں کہ ان میں سے کون کون سے افسانے اردو میں شائع ہو چکے اور کون کون سے شائع نہیں ہوئے۔ یہاں تک کہ بقول حضرت شاہد ایڈیٹر لوگ بھی اس علم سے عاجز ہیں۔ پھر کبھی کوئی افسانہ چھپنے پر اس قدر ڈھلا جانا کیا جائز ہے کہ اپنے ایک ہم مشرب کو چور کہا جائے۔ ادبی دنیا میں "چار دن" کے عنوان سے جو افسانہ چھپا اسے جناب ناظم میر علی نے حیدر آباد دکن سے بھیجا تھا۔ ناظم صاحب سے ایک زمانہ واقف ہے۔ وہ ملک کے ایک مشہور ادیب ہیں اور ان کے افسانے ہندوستان کے موقر ترین رسائل میں چھپتے رہتے ہیں۔ پروفیسر صاحب کو لازم تھا کہ سرقے کا الزام سمجھ سوچ کر عاید کرتے۔ کیونکہ ایسی چیزیں کبھی کسی معروف و مستند آدمی سے منسوب نہیں کی جاتیں۔

اس کے علاوہ اختر حسین صاحب کو شاید یہ معلوم نہیں کہ "ہمایوں" سے "ادبی دنیا" کے تعلقات اتنے گہرے ہیں کہ ایسی غلط فہمی پیدا کرنے کا امکان ہی ان کے لئے باقی نہیں رہ جاتا۔ میں نے حامد علی خاں صاحب مدیر ہمایوں سے اختر حسین صاحب کے مضمون کا ذکر کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ یہ قطعاً غلط ہے کہ میں نے کوئی ایسا خط اختر حسین صاحب کو لکھا اور اس میں مسودہ کی گمشدگی کا ذکر کیا ہو۔ وہ مضمون تو اب بھی سوہانِ روح ہو کر میرے ناقابلِ اشاعت مضامین کے خلطے میں پڑا ہے۔ اس کی بدنما تشا اس کی غلط املا، اس کی نامطبوع زبان نے مجھے مہینوں اسے شائع کرنے سے باز رکھا اور جب ناظم صاحب کا افسانہ "ادبی دنیا" میں شائع ہوا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب اس کے بارِ اشاعت سے نجات حاصل ہوئی۔ اختر حسین صاحب

کو میرا یہ دوستانہ مشورہ ہے کہ وہ محققین کو دلچسپ شمار و اعداد
ہم پہنچانے کے لئے آیندہ کبھی ایسی غلط بیانی سے کام نہ لیں۔ اور
پروفیسر صاحب کو بھی میں یہ مشورہ دوں گا کہ وہ محض مضمون کی
تکمیل کے لئے ایسے بے سروپا بیانات پر اعتبار نہ کر لیا کریں۔
کیونکہ اس سے ان کے کارناموں کو کوئی فروغ حاصل نہ ہوگا۔

حرم

کارپردازانِ "ادبی دنیا" "حرم" کے نام سے عنقریب ایک
نسوانی رسالہ جاری کر رہے ہیں۔ "ادبی دنیا" کی ظاہری آب و تاب
اور معنوی محاسن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ رسالہ کس پایہ کا
ہوگا۔ اس رسالے کے اجرا کی تحریک ہمیں اس خیال سے ہوئی کہ اس
وقت نسوانی رسائل عموماً ان مقاصد کو پورا نہیں کرتے جن کی نسوانی
دنیا کو اس وقت ضرورت ہے۔ وہ آج سے بیس تیس سال پہلے
جس روش پر جاری ہوئے تھے آج بھی اسی روش پر جاری ہیں
"حرم" نسوانی رسائل میں ایک نئے دور کا آغاز کرے گا۔ اس کے
مضامین ماہر اور مستند اہلِ قلم لکھیں گے۔ اس میں نئی نسوانی تحریکات،
جدید علمی تحقیقات، ادبی مضامین اور افسانے اور موجودہ نسوانی
ضروریات پر مقالات شائع ہوں گے۔ گویا یہ علم و ادب کا ایک ایسا
پُر از معلومات ذخیرہ ہوگا جو شریف اور ذوقِ ادب رکھنے والی
خواتین کے لئے ایک بہترین اتالیق کا قائم مقام ہوگا۔ ادبی دنیا کے
معاونین سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اپنے گھروں میں اس
رسالے کو رائج کریں اور جاری ہونے سے پہلے اس کے لئے
فرمایشیں بھجوائیں۔ پانچ سو فرمایشیں جمع ہونے پر رسالہ جاری کر دیا
جائے گا۔

ٹیگور اور تصاویر

ہندوستانی تصویروں کے معنی کبھی ہماری سمجھ میں نہ آئے
تھے۔ غیر متناسب الاعضا جسم، بدصورتی کے ممکن الحصول نیکن بھدے
تاریک رنگ، منظر کی بے ربط بانٹ یہ وہ خصوصیتیں ہیں جو ہندوستانی
مصوری کی معراجِ کمال ہیں لیکن چند روز ہوئے ڈاکٹر رابندر ناتھ
ٹیگور نے یہ مسئلہ حل کر دیا اب ہم مطمئن ہیں وہ فرماتے ہیں:-

"آپ کہیں گے کہ ان تصاویر کے کیا معنی ہیں میں آپ
کو بتانا چاہتا ہوں کہ تصاویر کے کچھ معنی نہیں ہوتے۔
معنی تو ادب کی بڈھی پری ہی کو زیبا ہیں۔ آرٹ میں
صرف اظہار ہوتا ہے جس کے ادا کرنے کی طاقت الفاظ
میں نہیں۔ تصویروں کے کچھ معنی نہیں ہوتے۔"

ٹیگور نے یہ بصیرت افروز کلمات جافنا کی آرٹ گیلری
میں فرمائے۔ ٹیگور اب خود مصور ہو گئے ہیں۔ جن لوگوں نے اُن
کی تصویریں دیکھی ہیں وہ ضرور اُن کے اس قول کے "قائل" ہو
جائیں گے کہ تصاویر کے کچھ معنی نہیں ہوتے۔ باقی رہا "اظہار"۔ تو
سو ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

مدیرانہ "ہم"

خطیبوں اور مصنفوں کے لئے "ہم" کا لفظ استعمال کرنے
سے اولین مقصد یہ ہے کہ خود پرستی کا اظہار نہ ہو۔ اس کے علاوہ
تقریروں اور تحریروں میں یہ لفظ ایک ایسی شانِ تحکم پیدا کر دیتا ہے
جو صیغۂ واحد متکلم استعمال کرنے سے پیدا نہیں ہوتی۔ "ہم" کا مدیرانہ
استعمال اس سے ذرا مختلف ہے، کیونکہ ایڈیٹر کے بیان کے
ساتھ ناشرین اور اخبار کے سارے عملے کی تائید بھی شامل سمجھی جاتی
ہے۔

اُردو ہندوستان کی لنگوا فرینکا ہے

۱۹۲۸ء میں لارڈ بنٹنگ دوسری دفعہ یہاں گورنر جنرل ہو کر آئے۔ یہی زمانہ
گلگرسٹ سوسائٹی کی جوانی کا تھا۔ ان کے تشریف لانے کے ساتھ، بورڈ آف
ڈائرکٹرز میں زبان کا مسئلہ چھڑا۔ اس کے ایک ایماندار ممبر مسٹر ام۔ گریو نے
اس وقت اردو زبان کے متعلق یہ رائے ظاہر کی۔

"اردو کی اس وقت یہاں حالت بجنسہ فرینچ کی سی ہے۔ کہ تمام یورپ میں
بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس ایک اردو کے جان لینے سے ایک حصہ ملک سے دوسرے
حصہ ملک تک بے تکلف آؤ جاؤ کسی مددگار کی ضرورت نہ ہوگی۔" (ماخوذ از داستانِ اردو)

منصور احمد

آئینۂ عالم

آزادی اور قومی حقوق

آکسفورڈ میں انگلستان کے مشہور حکیم ہربرٹ سپنسر کی یادگار میں لیکچر ہوتے رہتے ہیں، اسی سلسلے میں کچھ دن ہوئے ڈین انگ نے آزادی اور قومی حقوق پر ایک تقریر کی جس میں کیڑوں کی زندگی سے سیاسی نکات اخذ کئے گئے تھے۔

ڈین انگ نے کہا کہ شہد کی مکھیوں اور چیونٹیوں میں ایک ایسا سیاسی اور اقتصادی نظام پایا جاتا ہے جو ایک بہترین اشتراکی مملکت کا درجہ رکھتا ہے اس کرمی دنیا میں

فرد کو مملکت پر کلیتہً قربان کر دیا گیا ہے۔ اور اس لئے فرد کو فرد کہنا بھی وہاں بجا معلوم نہیں ہوتا۔

یہ بالکل ممکن معلوم ہوتا ہے کہ انسانی ترقی کا انجام بھی یہی ہو لیکن ڈین موصوف ایسا خیال نہیں کرتے وہ کہتے ہیں۔

ہمیں معلوم نہیں کہ اشتراکی کیڑے کبھی ترقی کرنے والے تمدن کے ایسے دور میں سے بھی گذرے ہیں یا نہیں جس کے دوران میں انہوں نے اپنی ذہانت اور جزوی طور پر اپنے نہایت ہی کامیاب سیاسی تجربات کی آبیاری کی۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ ایک ایسا دور ضرور گزر چکا ہے۔ کیڑوں نے اپنے تمدن میں "مشینیت" کو داخل کر لیا ہے۔ اور ہم اس کے نتائج دیکھ رہے ہیں۔

شہد کی مکھیوں کا چھتا چیونٹیوں کا ٹیلا اور بستی ہر جگہ بالشویت پھیل رہی ہے۔ شہد کی مادہ مکھیاں اپنی جنسیت تک کھو دیتی ہیں۔ صرف ان کی ملکہ میں دوسری نسل کی ماں بننے کی استعداد باقی رہتی ہے۔ عمر بھر میں صرف ایک مرتبہ وہ چھتے سے اڑ کر فضا میں نکلتی ہے تمام نر اس کے پیچھے اڑتے ہیں جن میں سے صرف ایک کو وہ ہم آغوش ہونے کی اجازت دیتی ہے۔

نر کی ازدواجی مسرتیں اپنی ذات کے لئے مہلک ثابت ہوتی ہیں۔ ملکہ چھتے میں واپس آجاتی ہے ناکام خواستگار بھی اس کی تقلید کرتے ہیں۔

چیونٹیوں میں کام کرنے والیاں نہ صرف یہ کہ جنسیت سے معرا ہوتی ہیں بلکہ بے پر بھی ہوتی ہیں بستی میں اُنکی آنکھیں تک بیکار ہو جاتی ہیں۔

یہی انجام انسانی ترقی کا بھی ہو سکتا تھا آخر یہ ہے کیا؟ ایک نظام حکومت کی ایک انتہائی شکل، ایک پائدار مساوات جس سے کبھی چھٹکارا نہیں ہو سکتا۔ چونکہ یہ کیڑے اب ایک مشین کی طرح خود بخود کام کرتے چلے جاتے ہیں اور اپنی سوچنے کی طاقت اور تغیر کی خواہش کھو بیٹھے ہیں۔ اس لئے وہ گویا اعراف میں میں ہیں لیکن انہیں اس کا علم نہیں ہے۔

اپنی نوع کے لئے مجھے اس انجام کی امید نہیں میں سمجھتا ہوں کہ ہماری نوع کی فطرت میں سے یافت کی بہ نسبت صرف زیادہ کرنے کی خواہش جس نے ہمیں وہ بنایا جو کچھ ہم اب ہیں زائل کرنے کے لئے بالشویت کی بہت سی صدیاں درکار ہیں۔ شہد کی ننھی مصروف مکھی اور چیونٹی کی سیرت جو کسی سست آدمی کے لئے عمل کا نمونہ ہو سکتی ہے ہم میں موجود نہیں۔

ڈین کہتے ہیں کہ یکے بعد دیگرے تمام یورپی اقوام میں آزادی کی قریب قریب کلی تباہی کو دیکھ کر میں کانپ جاتا ہوں۔ سنئے ڈکٹیٹروں کو

جو دہشت زدگی کے ممبر داروں کی ایک جماعت سے اتنی طاقت حاصل ہوگئی ہے کہ وہ ہمارے قیاس میں بھی نہیں آسکتی۔ وہ قلم کی ایک جنبش سے ایسی ایسی باتیں کرسکتے ہیں جو کسی سلطان یا کسی زار کے خواب وخیال میں بھی نہیں گزریں۔

روس میں لاکھوں انسانوں کو قانوناً موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔ اور مہذب جرمنی میں بھی ایسی نسل منافرت پھیلی ہوئی ہے کہ اسے دیکھ کر دہشت اور بربریت کے زمانے کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ دانشمند جنہوں نے انگلستان کی معاشرتی فلاح اور خوشحالی سے متاثر ہوکر اکثر کہا ہے کہ "دوستو، اپنی آزادی کی حفاظت کرو۔ تمہیں معلوم نہیں کہ آزادی کو کھو دینا کتنا آسان ہے"۔

کیا حقیقت میں اس ملک کو سپنسر کے بقول غلامی کا کوئی خطرہ لاحق ہے؟ جب لبرل ازم پرانی آزادیوں کو منسوخ کر رہا تھا اور آزادی کا پھریرا اڑا رہا تھا اس وقت سماج کی اقتصادی ترقی انسانوں کو زیادہ سے زیادہ غیر انفرادی طاقتوں کا غلام بنا رہی تھی۔ سیاسی آزادی اقتصادی تنظیم کا توازن برقرار رکھنے کی قابلیت نہ رکھتی تھی۔

روس کی حکومت میکانکی اصول سے نتائج حاصل کرنے کی ایک حقیقی کوشش تھی۔ خاندان، مذہب، وطنیت سب کو بہرصورت اور ارادۃً انھوں نے تباہ کر دیا۔

روس میں اس کا فوری ردعمل اس طرح ظاہر ہوا کہ نوجوان نسل نے ایک شادی پر اکتفا کی اور اخلاقی حیثیت سے تقریباً صوفی بن گئے۔ انسانی فطرت کو بدلنا آسان نہ تھا۔

قدرتی مسلک کی یہ ناپسندیدگی اشتراکیت کی دوسری شکلوں میں بھی ظاہر ہوئی۔ فاسسٹ میں یہ کیفیت رونما نہیں ہوئی کیونکہ اس کی تعمیر حقیقی تنظیمی بنیادوں پر ہوئی تھی۔ نظریہ جنگجویانہ قومیت کا تقاضا جو تمدن کی حقیقی شرائط سے ہم آہنگ نہ رہی تھی۔

یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ اب جب کہ میکانکی خیال کی بنیادیں متزلزل ہوچکی ہیں انسانوں میں مشینیت پیدا کرنے کا رجحان زیادہ ترقی نہ کرے گا۔ ڈین انگ کو بھی یہی توقع ہے لیکن وہ اس بات کو نظر انداز نہیں کرسکتے کہ اگر شدید قومی تنازعات کو جاری رہنے کا موقع دیا گیا تو اس کا نتیجہ ایسا تشدد ہوگا جو قوم کی تمام قابلِ حصول طاقتوں کو استعمال میں لائے گا۔

کاروبار کا مسئلہ

مشہور امریکن خواتین کا نوجوانوں سے خطاب

امریکا میں کام کے انتخاب کے لئے جو کانفرنس منعقد ہوئی تھی وہ ختم ہوگئی۔ اختتامی تقریریں اُن خواتین نے کیں جن کی قابلیت اپنے اپنے شعبے کے لئے کارہی مسلّمہ ہے۔ بعض خواتین کی تقریریں دوسرے ممالک سے آلاتِ لاسلکی کے ذریعے بھی سنی گئیں۔

جنرل ہیو جانسن کی مستعد اور باہمت متدس راہبن نے واشنگٹن سے لاسلکی کے ذریعے حاضرین کو خطاب کیا کہ عورتیں حکومت کے کاروبار میں اب عملی طور پر پہلے سے زیادہ حصہ لیں گی۔

> انسانی حقوق کا توازن حقیقی طور پر آج پہلی دفعہ قائم ہوا ہے۔ یہ نیا دن مقدی کا کام کرنے والی خواتین کے لئے ایک زریں توقع ہے۔ عورتوں نے اپنی انتظامی قابلیت کا اعتراف کرالیا ہے۔ ان کے دلوں میں ذمہ داری اٹھانے کی خواہش اور جذبہ موجزن ہے۔ وہ عمل چاہتی ہیں، اور چونکہ ان کی مساوات کی حس تیز ہے اس لئے وہ ہمیشہ انصاف کرنے میں سچائی اور عدل کو ملحوظ رکھتی ہیں۔
>
> دروازہ کھلا ہے۔ اب اس میں داخل ہونا عورتوں کا کام ہے لیکن یہ نہ سمجھنا کہ ملازمت کا پروانہ تمہیں ایک چاندی کی تھالی میں رکھ کر پیش کیا جائے گا۔ تم میں سے بعض کو محنت بھی کرنی پڑے گی جس کی تم کچھ پروا نہیں کرتیں۔ لیکن آخر میں تمہیں اپنی لیاقت کے مطابق کام مل جائے گا۔"

مس فینی ہرسٹ، افسانہ نگار نے کہا۔

اگر کوئی کام دنیا میں ایسا ہے جس نے درخواست کرنے والے کو سر کے بل چلنے پر مجبور کر دیا ہو تو یہ ادبی کام ہے۔ وہ شخص جو روپیہ پیدا کرنے کے لئے ادبیات کا پیچھا کرتا ہے ایک خیالِ خام میں مبتلا ہے وہ صنف جو دولت کی محبت میں قلم کاری اختیار

کرتا ہے اپنی محبت میں مایوس تو ملٹن میں نے
بہت سے ایسے نوجوان دیکھے ہیں جو مضمون نویسی
کا پیشہ اختیار کرنے کی دھن میں دیوانے ہو رہے
ہیں لیکن جنہیں تصنیف و تالیف کی پُر از مصائب
زندگی کا کچھ اندازہ نہیں۔

مشہور ہوا باز خاتون مس امیلیا ارہارٹ نے طلبہ کو خود مختارانہ سوچنے عادت ڈالنے کی ترغیب دی۔ انہوں نے کہا۔

اُن باتوں پر بہت زیادہ یقین نہ کرو جو مجھ
جیسے پرانے وقتوں کے لوگ تم سے کہتے ہیں۔ اگر
وہ بہتر دنیا جو تمہارے پیش نظر ہے ہمارے نصیب
میں نہ تھی تو تم اس کو حاصل کرو۔ کامیابی کے جتنے
طریق ہیں ان میں تھوڑی سی خوش بختی کی ضرورت
بھی ہے۔

جتنے کام ہیں ان سے زیادہ اس وقت ان کے
لئے درخواستیں کرنے والے ہیں۔ ایسی حالت نہیں
رہنی چاہیئے۔ ہر مرد اور ہر عورت کو جسم و روح کا اتحاد
برقرار رکھنے کے لئے کمانے کا حق حاصل ہے۔

اس کے بعد مس ہیلبرن ڈائرکٹر تھیٹر گلڈ نے بتایا کہ متحرک تصاویر اچھے ایکٹر پیدا نہیں کرتیں۔ انہوں نے کہا۔

میرا خیال ہے کہ ہالی وڈ میں اچھے ایکٹر پیدا نہیں ہو
سکتے۔ میں سمجھتی ہوں کہ سینما میں ایکٹنگ ایک
ترکیبی آرٹ ہے۔ ایکٹر براڈوے میں پیدا ہوتے
ہیں اور پھر ہالی وڈ اُن کو چرا لیتا ہے۔

اس کے بعد معاشرتی اور انتظامی خدمات کے متعلق چند اور تقریریں ہوئیں جن کے اختتام پر کانفرنس کے ڈائرکٹر مسٹر جارج بجور نے کہا کہ میں نے بعض طلبہ کو تیرہ ڈالر فی ہفتہ پر بیمہ کمپنی کے ہاں کام دلوانا چاہا تھا لیکن انھوں نے اس کو قبول نہیں کیا۔ حالانکہ جب میں نے کالج چھوڑا تھا تو دس ڈالر ہفتہ وار پر کام شروع کر دیا تھا۔

مسولینی

ماڈرن سٹوڈنٹ کے ایک نامہ نگار نے اٹلی کے عظیم الشان ڈکٹیٹر مسولینی کی ایک نہایت دلچسپ قلمی تصویر کھینچی ہے۔ جن لوگوں نے مسولینی کو تقریر کرتے دیکھا ہے، اور وہ بھی کھلی فضا میں، انہوں نے اس کی آواز کے اتار چڑھاؤ میں ایک حیرت انگیز کیفیت محسوس کی ہے۔

وہ آہستہ لہجے میں شروع ہوتی ہے۔ ایک حسین
نغمے کی طرح، اور اس میں اس کے وطن کی مخصوص موسیقی
ملی ہوتی ہے۔ کچھ دیر تک وہ اسی طرح آہستہ آہستہ بولتا
رہتا ہے حتیٰ کہ اسے اپنے موضوع سے حقیقی دلچسپی پیدا
ہو جاتی ہے، اور اس کے الفاظ ایک نہ تھمنے والے
طوفان کی طرح بہتے چلے آتے ہیں۔

قدرتی طور پر زیادہ موقع اسے اطالوی زبان
میں بولنے کا ملتا ہے لیکن اجنبیوں کو وہ جرمن،
فرانسیسی یا انگریزی زبان میں بھی مخاطب کر سکتا ہے
ان سب زبانوں سے وہ بہت اچھی طرح واقف ہے
اسے شمار و اعداد پیش کرنے میں کبھی دقت نہیں ہوتی
اور اپنے بیانات کے ثبوت میں حوالے تلاش کرنے کے
لئے اسے شاذ و نادر ہی کتابوں سے مدد لینی پڑی۔
اس کا حافظہ ایک مخزن العلوم ہے۔ اور وہ ہر موضوع
پر بے تکلف گفتگو کر سکتا ہے۔

جن لوگوں کا روزانہ اس سے سابقہ پڑتا ہے وہ کہتے ہیں کہ وہ کبھی آج کا کام کل پر نہیں ڈالتا، اور خواہ کتنی دیر ہو جائے کام ختم کر کے دم لیتا ہے۔ الفاظ میں اس کی تصویر یوں کھینچی جا سکتی ہے۔

جب مسولینی چپ چاپ اپنی میز پر بیٹھا ہوتا ہے
اور اپنے تصورات میں غرق ہوتا ہے تو وہ ایک محض
خیالی آدمی معلوم ہوتا ہے لیکن جب اسے اپنے
افکار سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے جوش
میں حرکت رونما ہونے لگتی ہے تو اس کی عملی شخصیت
بیدار ہو جاتی ہے — وہ شخصیت جو سریع العمل ہے جب

عزم اور اکثر جنگ دلانہ فیصلے کرنے والی ہے اور جسے یورپ اور دوسری دنیا اچھی طرح جانتی ہے اپنی گفتگو میں وہ کبھی مبالغے سے کام نہیں لیتا اور اس کی گفتگو ہمیشہ بے عیب ہوتی ہے۔ اختلاف رکھنے والوں سے گفتگو کرتے وقت بھی اس کے الفاظ میں ایک خلوص ہوتا ہے جس میں یقین کی آمیزش ہوتی ہے سننے والا محسوس کرتا ہے کہ اگر اس کی رائے قطعاً غلط بھی ہے تاہم وہ نیک نیتی سے قائم کی گئی ہے اور طویل و عمیق غور کا نتیجہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض موقعوں پر اس نے محض جوش سے متاثر ہو کر بعض کام کئے، لیکن وہ خیالات جن کی وجہ سے یہ افعال اس سے سرزد ہوئے اچھی طرح سوچے سمجھے ہوئے تھے۔

اس کی خانگی زندگی میں بھی ایک حد تک تنہائی کا عنصر موجود ہے۔ ایسے ذاتی دوست جو اس کے حقیقی بے تکلفی کے دعویدار ہو سکیں تقریباً مفقود ہیں اس کے آشناؤں کا حلقہ بہت وسیع ہے لیکن اس کا حقیقی دوست شاید کوئی بھی نہیں۔ اس کی زندگی اس کا کام ہے اور اس کا کام اس کی زندگی ہے۔ اس کی تمام قوتیں اور اس کا سارا وقت اٹلی کے لئے وقف ہے۔ اس کی گفتگو کے ہر موضوع کا رخ پھر پھرا کر اٹلی اور اس کے مستقبل کی طرف ہو جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ مسولینی کسی قسم کی تفریح نہیں کرتا اسے فرصت ہی بمشکل ملتی ہے۔

زمین کی گردشِ مرکزی کے کرشمے

اگر زمین کے مرکز میں سر بسر ایک سوراخ کر دیا جائے اور اس میں ایک طرف سے کوئی چیز دوسری جانب پھینکی جائے تو اس کا کیا حشر ہوگا؟ اس بات کی تشریح "جان او لنڈن" کے ایک نامہ نگار نے بالفاظ ذیل کی ہے:۔

یہ سادہ اور یکساں حرکت کی ایک مثال ہے۔ چونکہ مخالف حرکت موجود ہی نہیں اور صرف قوتِ جاذبہ اس چیز پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ اس لئے اس کی رفتار درمیان میں پہنچ کر انتہا درجے کی تیز ہو جائے گی۔ پھر اس کی رفتار کم ہونی شروع ہوگی یہاں تک کہ دوسرے سرے پر پہنچ کر ایک لمحے کے لئے یہ ساکن ہو جائے گی۔ اس کے بعد یہ واپس روانہ ہوگی اور ہمیشہ کے لئے آگے اور پیچھے سفر کرتی رہے گی۔ ایک مرتبہ کے سفر میں اسے کتنا وقت لگے گا یہ بات حساب کرنے سے بآسانی معلوم ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک سفر پر بیالیس منٹ صرف ہوتے ہیں خواہ کسی وزن، کسی نوعیت کی کوئی چیز زمین کے کسی سوراخ میں سے پھینکی جائے وقت کا اندازہ یہی ہوگا۔

ترکی اور سینما

ترکی میں صحت کے موضوعات پر فلمیں بہت مقبول ہو رہی ہیں۔ ایک فلم جس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ دانتوں کی حفاظت کس طرح کرنی چاہیئے ترکی کے تمام صوبجات میں ۱۳۹۵ روز تک دکھائی گئی اور ملیریا کے متعلق ایک فلم ۱۴۱۷ روز تک ایک اور فلم جس میں بچوں کے معالجات درج تھے ۴۵۵ روز تک۔ لیکن ایک فلم جس کا نام تھا Why Willy Wont Wash زیادہ دلچسپی سے نہ دیکھی گئی اور صرف ۴۵ دن تک چل سکی۔

زندہ قوموں کی ضروریات

جرمنی میں گھروں کے اندر جن آلاتِ لاسلکی کا استعمال ہوتا ہے حکومت نے انہیں گرو رکھنا خلاف قانون قرار دے دیا ہے۔ آلاتِ لاسلکی آیندہ گھر کی ضروریات میں داخل سمجھے جائیں گے۔ اس ضابطہ کی نظیر جرمن قانون میں پہلے بھی ملتی ہے، جہاں لکھا ہے کہ آلاتِ لاسلکی قوم کی ایک ناگزیر ضرورت ہیں اور ہر گھرانے میں قومی خبریں معلوم کرنے کے لئے ایک آلہ موجود ہونا چاہیے

منصور احمد

ترقی

امریکہ کے ایک جدید ادبی جریدہ میں دُنیا کے مشہور مفکر و فلسفی ول ڈیورنٹ (Will Durant.) کے تازہ افکار دنیا کے اہم مسئلۂ ترقی وارتقائے تمدنِ انسانی پر شائع ہوئے ہیں جنہیں یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

۱۷۹۴ء میں ایک فرانسیسی مدبر مین میری انطونی کونڈرسیٹ نے پیرس کے ایک تنگ و تاریک مکان میں بیٹھ کر حیات و ترقی انسانی کے مسئلہ پر ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام ہے

"انسانی ترقی کی تصویر یا خاکہ"

میری یہ رائے ہے کہ انسانی ہاتھ نے اس سے بڑھ کر شاید کوئی کتاب انسانی ترقی کے مسئلہ پر نہیں لکھی ہوگی۔

کونڈرسیٹ نے اٹھارویں صدی کی فضا میں یہ کتاب لکھنی شروع کی تھی اور اس پر اس عہد کے تاثرات اور توجہات کا زیادہ اثر پایا جاتا ہے۔ اٹھارویں صدی یورپ میں علمی بیداری کا ایک زریں دور ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب سائنس نے نئی کروٹ لی۔ ارسطو کے وقت سے اس وقت تک سائنس اور علم انسانی جن توہمات اور پابندیوں سے گھرے ہوئے تھے ان کا تاروپود بکھر گیا اور سائنس نے جملہ قیود و توہمات سے آزاد ہو کر وہ پرواز شروع کی جو انسانی ترقی کی تاریخ میں حیرت انگیز ہے اور جس کے نتائج سے ہم ہر وقت متمتع ہوتے رہتے ہیں اور جس کی رفتار برابر بڑھ رہی ہے۔

اس کتاب کے مصنف کا زاویۂ خیال بہت وسیع ہے۔ اس کی رائے میں دنیا کی تمام مشکلات کا حل علم کی ترقی اور جدید ایجادات کی طرف بڑھنے میں ہے وہ غریب کو امیر کے چنگل سے نجات دلوانے اور اقوام و ملل کو استبدادیت سے آزاد کرانے کے لئے بھی سائنس اور جدید علوم و حرفت کی ضرورت سمجھتا ہے اور اقتصادی بدحالی اور مذہبی مہملات و خیالات کے ازالہ کے لئے بھی وہ جدید علوم اور جدید ترقیوں کا مددگار و حامی ہے۔ عورتوں کی آزادی اور مردوں کی ترقی کے لئے بھی وہ علم کی ترقی پر زور دیتا ہے۔

اٹھارویں صدی میں یورپ ایک جدید کروٹ بدل رہا تھا جمود کی بجائے حرکت پیدا ہو رہی تھی۔ نشاط کی جگہ ضروریاتِ زندگی کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ غریب کی طاقت اور آواز برسرِ اقتدار آ رہی تھی۔ اس وقت کنڈرسیٹ کی آواز کو یورپ نے لبیک کہہ کر ایک بہت بڑا کام کیا۔ ایک بہت مفید عمل کیا اور اس کے بعد سے یورپ نے ترقی وارتقائے حیات کے جملہ پہلوؤں کو اسی اصول و ضابطہ کے ماتحت شروع کر دیا جس کے بدیہی نتائج سے ہم یا تو روزمرہ بہرہ ور ہو رہے ہیں یا آیندہ ہوں گے۔

جنگِ عظیم شروع ہوئی۔ جو یورپ کے لئے عربوں کی علمی حکومت اور جدید تمدن کی بنیادی تبدیلیوں سے بھی زیادہ مؤثر ثابت ہوئی اور اس نے یورپ کی عملی فضا اور علمی دنیا کو یکسر بدل دیا۔ انسانی عقل و ذہن میں کبھی اس قدر تبدیلی نہیں ہوئی تھی جس قدر جنگِ عظیم نے پیدا کی۔

جنگِ عظیم کا سب سے اہم نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ دنیا کے مستقبل کو تاریک دیکھنے والوں کی آنکھیں کھل گئیں اور جدید تبدیلیوں اور ترقیوں کی رفتار دیکھ کر انہیں ایک زبردست علمی جہاد کی صورت نظر آنے لگی اور ہر شخص 'ترقی' 'ترقی' 'ترقی' کا راگ الاپنے لگا۔

موجودہ نسل ترقی کے لئے از حد بیتاب ہے یورپ کی ترقی پسندی انسانی دائرۂ عمل کی وسعت اور بیداریٔ حیات و عمل کی یہ ذاوانی یورپ سے نکل کر ایشیا کی طرف راغب و مائل ہوئی اور اس سلسلہ میں تمام ایشیا منسلک ہو گیا۔ ایشیا نے جنگِ عظیم کے باعث بہت سے سبق حاصل کئے اور ترقی کے عملی پہلوؤں پر غور کیا۔ اس وقت ایشیا کی ہر قوم بیداری و حیاتِ عمل کی طرف راجع ہے یا گامزن ہو چکی ہے۔

جو لوگ تاریک بین ہیں اب بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ ترقی حقیقی ترقی نہیں ہے بلکہ معکوس ہے۔ میری رائے میں ترقی کا مفہوم غلط سمجھا گیا ہے۔ ترقی معکوس ہو ہی نہیں سکتی۔ ترقی انسان کی بہتری کا ذریعہ

ہے۔ اگر وہ انسانی گروہ کی فلاح کے لئے کوئی عملی مددگار ثابت نہیں ہوتی تو اُسے ترقی کا نام دینا اس لغت کو غلط مفہوم دینا ہے۔ دراصل اس سلسلہ میں ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ترقی اور تحصیل میں بہت فرق ہے۔ انسان بہت سی چیزوں کے حصول اور سینکڑوں تصورات اور وہمی خوابوں کی عملی تعبیر کے لئے بے چین رہتا ہے۔ اگر یہ خواب واقعی حقیقی ثابت ہو جائیں تو ان کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ترقی کا باعث ہوں۔ تحصیل کی ذیل میں آ سکتے ہیں۔ "انسانی ترقی" کو اس سے کوئی علاقہ نہیں۔

اگر انسانی ترقی کی گذشتہ تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ترقی کا مفہوم تحصیل کے مطالب سے ہمیشہ علیحدہ رہا ہے۔ اور انسان نے وحشیوں اور درندوں کے درجہ سے ارتقا کر کے جو موجودہ حیثیت اختیار کی ہے اس میں بھی ترقی کو بڑا دخل رہا ہے۔ جہاں صرف تحصیل مطلب رہا ہے وہاں ترقی رک گئی ہے یا ترقی کو نقصان پہنچا ہے۔ میرا مدعا یہ ہے کہ ترقی سے مراد انسانی فلاح کے لئے عملی تدبیروں کو سوچنا اور اسے بروئے کار لانا ہے۔ محض تحصیلِ علم و تحصیلِ فنون و تحصیلِ آلات ہماری ترقی کو کفایت و کفالت نہیں کر سکتی۔

انسانی ترقی کی رفتار ان درجوں اور منزلوں میں سے ہو کر گذری ہے:

اوّل۔ گفتگو

سب سے پہلے انسان نے اپنے خیالات اور مافی الضمیر کو ظاہر کرنے کے لئے زبان اور چیزوں کی مدد لی یا ہاتھ کے اشاروں سے (خاموش گفتگو) کا وسیلہ تلاش کیا اور ترقی کی بنیاد پڑی۔ مرد مرد بنے اور عورتیں عورتیں بنیں۔ انسان حیوان سے ممیز بنا اور اس نے تبادلۂ خیال و عمل کر انسانی ارتقا میں مدد دی۔

دوم و سوم۔ آگ اور روشنی

انسان کی ترقی میں دوسری منزل آگ اور روشنی کی آتی ہے۔ آگ اور روشنی نے انسان کو موسمی اثرات سے آزاد کرایا اور وہ موسموں کے خطرے اور دن رات کی سنسنا ہٹ سے بے خبر و مطمئن ہو کر اپنی ترقی اور قیام و حفاظت کی فکر کرنے لگا۔ آگ اور روشنی نے موسم اور وقت پر فتح و ساعت حاصل کرنے میں انسان کو مدد دی اور تسخیرِ فطرت کی بنیاد پڑی جو اس وقت سائنس اور انسان کا مطمحِ نظر بنی ہوئی ہے۔

چہارم۔ تسخیر حیوانات

جانوروں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنا کر انسان نے رہائش کا انتظام زراعت کی بنیاد اور آرام و حفاظت کی تدابیر سوچیں، جن سے انسان نے ایک جگہ رہنے کی عادت اختیار کی۔ جانوروں کی مدد سے زراعت شروع کی۔ اہلی زندگی اور مکمل مدنیت شروع ہوئی۔ زراعت، تجارت اور تعلیم کے شعبہ جات کی بنیادیں "تسخیرِ حیوانات" کے عمل کے بعد ہی شروع ہوئیں اور اسے انسانی ترقی کی رفتار میں ایک اہم منزل سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

پنجم۔ معاشرتی تنظیم

جتھے بندی کا خیال۔ انتشار کی جگہ اجتماع کی ضرورت اور بے قاعدگی کی بجائے قانون و ضابطہ کی ضرورت محسوس کی جس سے ذاتی میل جول، معاشرتی نظم، خلاقِ عامہ اور قانون و انصاف کی بنیادیں پڑیں۔

ششم۔ احساسِ اخلاق

ذاتی میل جول کی ترقی کے باعث پھر انسان میں ایک دوسرے کی مدد کرنے، ایک دوسرے کے حق کی حفاظت کرنے اور سارے گروہ یا جتھے کی ترقی و تنزل وغیرہ کی بابت سوچنے اور اس کے متعلق عمل کرنے کا احساس و خیال پیدا ہوا جسے ہم احساسِ اخلاق اور احساسِ اخلاق کہہ سکتے ہیں۔ مہربانی، ہمدردی، امداد، ضمیر اور ایمان وغیرہ کی بنیادیں اسی منزل میں آ کر رکھی گئیں اور اس کے بعد انسان نے ترقی کی جانب ایک اور قدم بڑھایا۔

ہفتم۔ جمالیاتی ذوق

اچھے خوبصورت، دلکش مناظرِ قدرت اور مظاہرِ عالم و مشاہداتِ زندگی و تجرباتِ عامہ کی مدد سے انسان میں "جمالیاتی ذوق" پیدا ہوا۔ خوبصورت چیزوں کو پسند کرنے اور خوبصورت آوازوں کو پسند کرنے کا مادہ پیدا ہوا۔ رنگ اور سپیدی کے جمالیاتی اثر سے متاثر ہونا شروع ہوا۔ بے ضابطہ چیزوں کی جگہ ضابطہ اور نظم سے اسے خوشی و مسرت حاصل ہونے لگی۔ جنسی رغبت بھی اسی زمانہ میں آ کر جمالیاتی ذوق سے وابستہ و آشنا ہوئی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو شاعری، مصوری، رنگ کاری، بت تراشی، موسیقی اور رومان کی بنیادیں اسی جذبہ و احساس کی ترقی و پرورش سے استوار ہوئیں اور یہ اسی دور کی پیداوار سمجھے جا سکتے ہیں۔

ہشتم۔ سائنس

سائنس ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ سائنس دراصل

بڑے تجربہ اور نئے حالات کو باہم ملا کر آئندہ کے لئے ضابطۂ عمل بنانے کا دوسرا نام ہے جب انسان نے بے ضابطگی سے نقصانات اٹھائے تو تعلیم حیات کی بنیاد ڈالی۔ علوم و فنون کو بکھرے ہوئے تجربات کی نوعیت سے بدلا تجربہ، تعلیم، صحت و درستی خیال و عمل پیدا ہوئی اور اس نے ترقی کر کے اب ایسی شکل اختیار کر لی ہے کہ اسے انسانی ترقی کی رفتار میں سب سے بڑا اور اہم ترین درجہ دیا جاتا ہے۔

بعض کا یہ خیال ہے کہ سائنس اس قدر ترقی کر جائے گا کہ آج کل جس طرح جہاز یا کوئی بیاٹو یا کوئی اور آلہ ایجاد کر تے یا بناتے ہیں اسی طرح انسانی قلب و دماغ و اعضا تک سائنس کی لیبارٹریوں اور فیکٹریوں میں بن سکیں گے یا ان کی مرمت کی جا سکے گی اور انسان فطرت کی پابندیوں سے بالکل آزاد ہو جائے گا؟!!

نہم۔ چھاپہ

موجودہ تمدن کی بنیادیں چھاپے پر رکھی گئی ہیں۔ اگر تحریر و مطبع کا کام بند ہو جائے تو ترقی فوراً رک جائے۔ اخبارات۔ رسائل۔ کتابیں، سینما وغیرہ تشہیر و تفہیم و تعلیم کے ایسے ذرائع بن چکے ہیں کہ اب ان سے مفر نہیں۔ چھاپے کی ایجاد اور اس کے متعلقات نے دنیا کو اپنا پابند بنا لیا ہے اور اس نے سائنس اور انسان کی جملہ ارتقائی منازل کو جس درجہ بلند کیا ہے اور دنیا کے اس سرے کو اس سرے سے جس طرح وابستہ کیا ہے اس کا صحیح اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو تشہیر اور مطبع کے کاموں سے واقف ہیں۔

دہم۔ تعلیم

تعلیم ترقی کی ماں ہے اگر ترقی کو پیدا کرنے، اس کی پرورش کرنے اور اُسے عملی طور پر کامیاب بنانے میں تعلیم بر سر کار نہ آئے تو ترقی فوراً رک جائے۔ دنیا ہر روز نئے نئے تجربے حاصل کرتی ہے۔ ان تجربوں کو دوسروں تک پہنچانا، ایک دوسرے کے حالات سے باخبر رہنا، ترقی میں مدد دینا، اپنا ورثۂ علم و عمل دوسری نسلوں کے لئے چھوڑنا، انسانی ہمدردی اور انسانی تبدیلیوں اور ترقیوں کو ضابطے میں لانا اور ان سے مفید خلائق کام لینا یہ سب کام تعلیم کے ذریعہ ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

غرض دنیا ان منازل میں سے گذر چکی ہے اور اس کی ارتقائی زندگی و ترقی عمل برابر جاری ہے۔ گیلیلیو نے بالکل صحیح کہا تھا کہ دنیا ہر وقت حرکت میں رہتی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ انسانی دماغ کو قدامت کے جراثیم سے پاک کریں۔ اور اس کے جسم کو پرواز عمل کے لئے لطیف و جدید بنا دیں تاکہ ترقی ہمیشہ ایک عمودی شکل میں آسمان تک بڑھتی رہے اور انسان، انسان برتر بنتا چلا جائے۔

ظفر قریشی

اقوال زرّیں

پُر آشوب اوقات ہی ہمیشہ صاحب دماغ لوگوں کی تخلیق کرتے ہیں۔ خالص لوہا ہمیشہ دہکتی ہوئی بھٹی میں سے نکلتا ہے اور خیرہ کن روشنی گھٹا ٹوپ بادلوں میں سے نمودار ہوتی ہے۔ (کارلائل)

ہمیں اُس موج کو، جو دنیا کی سطح کو تہ و بالا کر دیتی ہے اور اُس بے چینی کو جو نہ بیٹھنے دیتی ہے نہ کھڑا ہونے دیتی ہے بلکہ ہمیں اضطراب میں رکھتی ہے، خوش آمدید کہنا چاہئے۔

(رابرٹ براؤننگ)

رکاوٹیں آدمی کے لئے ترقی کی منازل میں بہترین مددگار ہیں۔

(میکالٹ)

"ناممکن" میرے سامنے کبھی ایسے حوصلہ شکن لفظ کا نام نہ لو۔

(میرابیو)

فرانسیسی لغت میں "ناممکن" کوئی لفظ نہیں۔ (نپولین)

کسی کام کو مصائب میں سے گذر کر پایۂ تکمیل تک پہنچانا اور ناممکن کو ممکن کر دکھانا ہی قابلیت ہے۔

(نپولین)

ارشادِ پیرِ مغاں

ازل سے پیرِ مغاں کا ہے جوش! یہ ارشاد ۔۔۔ کہ تا بہ حشر چلے دورِ "ہر چہ باد اباد"

اٹھا بھی ساز کہ ہے آج پھر بحمد اللہ ۔۔۔ زمین زیرِ نگیں، آسمان حسبِ مراد

چھلک گیا ہے جو ساغر وفورِ مستی میں ۔۔۔ ہر ایک ذرۂ ناچیز ہے بہشت سواد

کسی کے کارِ فروبستہ کی گرہ کھل جائے ۔۔۔ ادھر بھی ایک نظر صاحبانِ بست و گشاد

ترا جمال چمن کے لئے نسیمِ شمال ۔۔۔ تری نگاہ سفینے کے حق میں بادِ مراد

مجھے کہ ہر بنِ مو تھا مرا اسیر ہوا ۔۔۔ تری نظر نے دو عالم سے کر دیا آزاد

ہزار خرقۂ زہاد و جامۂ پاکاں ۔۔۔ فدائے پیرہنِ چاکِ بادہ نوشاں باد

ہر ایک نعرۂ مستانہ ہے نشاط اساس ۔۔۔ ہر ایک گوشۂ مے خانہ ہے طرب بنیاد

چھڑی ہوئی ہے سرِ بزم گاہِ ناز و نیاز ۔۔۔ حکایتِ لبِ شیریں و بازوئے فرہاد

ہزار شکر کہ حاصل ہوئی ہے غم سے مجھے ۔۔۔ متاعِ خاطرِ مجموع و دولتِ دلِ شاد

سبو میں بادہ ہے پہلو میں اک نگارِ لطیف ۔۔۔ کہو، جھکے مرے قدموں پہ عالمِ ایجاد

ترانہ ریز ہوائے حوریانِ دیر نشیں ۔۔۔ شریکِ رقص ہوائے مہ وشانِ خلد نژاد

یہ آب و رنگِ سخنہائے جوش ہے واللہ
کہ آج ہمسرِ شیراز ہے ملیح آباد

جوش ملیح آبادی

جراثیم کی چوری

"اور یہ ہیں ہیضے کے جراثیم"۔ بکٹیریا کے ماہر ڈاکٹر نے خوردبین کے نیچے شیشے کی ایک نلکی رکھتے ہوئے کہا

زردرُو مہمان نے خوردبین میں سے دیکھا۔ اُسے پہلے کبھی اس قسم کی چیز دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر وہ بولا "مجھے بہت کم دکھائی دے رہا ہے"۔

ڈاکٹر نے کہا "ذرا غور سے دیکھو۔ شاید خوردبین پر تمہاری نظر قایم نہیں ہے ورنہ یہاں ذرا سی آنکھ کے ہل جانے سے جراثیم بہ مشکل دکھائی دیتے ہیں"۔

مہمان نے کہا "آخاہ اب مجھے دکھائی دینے لگا، اگرچہ زیادہ نہیں۔ ہاں ہاں چھوٹی چھوٹی لکیریں سی۔ اور اگر یہی بے حقیقت اجسام تعداد میں بڑھتے چلے جائیں تو ایک شہر بھر کی آبادی کو تباہ کر دیں ——— بہت خوب!" یہ کہہ کر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا اور اس نے شیشے کی نلکی کو خوردبین سے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ کھڑکی کی طرف منہ کر کے اس نے ملا کر کہا۔

"کس قدر چھوٹے ہیں یہ!" وہ ہچکچایا اور دوبارہ متعجب آمیز لہجے میں بولا "یہ زندہ ہیں کیا؟ ——— اور خطرناک؟"

ڈاکٹر نے کہا "نہیں ان کو ضائع کر دیا گیا ہے۔ کاش تمام دنیا کے جراثیم اس طرح ضائع کر دیئے جائیں"۔

زردرُو انسان نے نہایت ہلکے سے تبسم کے ساتھ کہا۔

"غالباً ایسی چیزوں کو تم بہت ہی کم زندہ یعنی پُرخطر حالت میں رکھتے ہوگے"۔

ڈاکٹر نے کہا "ہاں ——— ہم مجبور ہیں"۔ مثال کے طور پر یہ دیکھو ——— یہ کہہ کر وہ کمرے کے دوسرے کونے سے چند سر بمہر نلکیاں اٹھا لایا

"ہاں یہ ہیں بیماری پیدا کرنے والے بکٹیریا یا دوسرے الفاظ میں بند کیا ہوا ہیضہ"

اُس نحیف و کمزور شخص کے زرد چہرے پر چند سیکنڈ کے لئے ایک قسم کی تسلی کے آثار نمایاں ہوئے "غضب ہے کہ تم ایسی چیزیں اپنے قبضہ میں رکھتے ہو"۔ یہ کہہ کر اُس نے نلکی کو نہایت غور سے دیکھا۔

ڈاکٹر اپنے مہمان کے چہرے کا غور سے مشاہدہ کر رہا تھا۔ یہ شخص ڈاکٹر کے کسی پرانے دوست سے تعارفی رقعہ حاصل کر کے اُس کے دارالتجاریب کی سیر کرنے آیا تھا۔ اُس کے سیاہ بال گڑی ہوئی آنکھیں، طرزِ کلام اور گھبراہٹ ایک اُس سائنسدان سے بالکل مختلف تھی جس سے کہ ڈاکٹر کو اکثر واسطہ پڑتا تھا۔

ماہر بکٹیریا نے نلکی کو ہاتھ میں ہلاتے ہوئے کہا "یہ ہے قید کی ہوئی وبا ——— اگر اس کو پانی کے منبع میں توڑ کر ڈال دیا جائے تو کسی کو پانی کے پینے یا سونگھنے سے ہرگز پتہ نہ چل سکے گا کہ اس میں کوئی آلائش ہے۔ بغیر خوردبین کے ان جراثیم کا تو نظر آنا بھی محال ہے:۔

"ہاں۔ ہاں تو اگر ان کو پانی کے منبع میں ڈال دیا جائے تو پھر موت، پُراسرار، ناقابلِ سُراغ، خطرناک اور دردناک موت شہر بھر پر اپنا قبضہ جمالے گی۔ اور شکار کی تلاش میں شہر کو ایک کونے سے دوسرے کونے تک بالکل خالی کر دے گی۔ خاوند کو بیوی سے، بچے کو ماں سے ایک سیاست دان کو اس کے فرایض کی توجہ سے اور ایک مصیبت زدہ کو اُس کی مصیبت سے یہ جراثیم ہمیشہ کے لئے چھڑا دیں گے۔ یہ پانی میں تیرتے پھریں گے اور جس گھر میں ایسے بغیر پانی استعمال ہوگا اس کے افراد کو چند گھنٹوں میں ابدی نیند سلا دیں گے۔ کنوئیں ان سے بھر جائیں گے۔ جمی ہوئی برف بھی ان کے اثر سے خالی نہ ہوگی۔ گھوڑے پانی پئیں گے تو یہ ان کے جسم میں سرایت کر جائیں گے۔ اور جب نادان بچے یا جاہل دہقان شفاف چشموں سے اپنی پیاس بجھائیں گے تو یہ اُن کی رگ رگ میں پہنچ جائیں گے کیونکہ یہ زمین تلے بھی جا سکتے ہیں اور پھر چشموں اور کنوؤں میں بکثرت نمایاں ہو سکتے ہیں۔ انہیں ایک دفعہ پانی میں چھوڑ دو اور پھر پیشتر اس کے کہ تم ان کا کچھ تدارک کر سکو یہ تمام شہر کو غارت کر چکے ہوں گے"۔

وہ یکایک چُپ ہوگیا کیونکہ زیادہ بولنے سے اس کا حلق خشک ہونے لگا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے سلسلۂ گفتگو جاری کرتے ہوئے کہا۔

"مگر یہاں وہ محفوظ ہیں ـــــ بالکل محفوظ۔"

زرد چہرے والے آدمی نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔

ڈاکٹر کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوگئی۔ اور حلق کو صاف کرتے ہوئے اس نے کہا "یہ انارکسٹ بدمعاش تو ہیں مگر بیوقوف بھی ہیں بے وقوف کیونکہ وہ تباہی برپا کرنے کے لئے بم استعمال کرتے ہیں میرے خیال میں ـــــ"

دروازہ کھٹکھٹانے کی ہلکی سی آواز آئی۔ ڈاکٹر نے دروازہ کھولا تو اس کی بیوی نے کہا "ذرا باہر آیئے۔"

جب وہ کمرے میں واپس آیا تو اُس کے زرد رُو مہمان نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا

"خلافِ توقع میں نے آپ کا قیمتی وقت ضرورت سے زیادہ ضائع کر دیا ہے ـــــ چار بجنے میں بارہ منٹ۔ مجھے ساڑھے تین بجے چلے جانا چاہئے تھا لیکن آپ کے موضوع کی دلچسپی نے مجھے جانے سے روک لیا۔ اب میں ایک سیکنڈ بھی اور نہ ٹھہروں گا۔ مجھے چار بجے ایک شخص سے ملنا ہے۔"

اس کے بعد وہ اپنے میزبان کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے رخصت ہوگیا۔ ڈاکٹر بھی دروازے تک اُسے رخصت کرنے کے لئے گیا۔ واپسی پر وہ نہایت آہستگی سے قدم اٹھاتا ہوا دار التجارب کی طرف آیا۔ وہ اب تک اپنے مہمان کی ذہنیت پر غور کر رہا تھا۔ وہ ایک معمولی انسان معلوم نہ ہوتا تھا ـــ اس نے دل میں کہا ـــ "مگر وہ کس قدر نحیف تھا۔ اُس نے جراثیم کے متعلق میری گفتگو کو نہایت غور سے سنا۔"

یکایک اُسے کسی خیال نے پریشان کر دیا۔ وہ کمرے میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔ اِدھر اُدھر تلاش کے بعد اس نے میز پر اپنی نظر دوڑائی جلدی ہی میں اُس نے اپنی جیبوں کو ٹٹولا اور پھر بڑے دروازے کی طرف دوڑا۔ "میں نے اسے بڑے کمرے کی میز پر رکھ دیا ہے شاید"

"مِنّی" ـــ اس نے زور سے آواز دی۔

"ہاں" دور سے ایک آواز سنائی دی۔

میرے ہاتھ میں کچھ تھا تو نہیں جب میں تمہارے ساتھ گفتگو کر رہا تھا؟"

"نہیں مجھے یاد ہے کہ ـــ "۔

ڈاکٹر کے مُنہ سے بے اختیار نکلا "وبا ـــ" اور وہ بے تحاشا سامنے دروازے کی سیڑھیوں سے اُتر بازار کی طرف بھاگا۔

دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز سن کر مِنّی دوڑ کر کھڑکی کی طرف آئی۔ نیچے سڑک پر ایک پستہ قد آدمی ایک گاڑی میں سوار ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر ننگے سر سلیپر پہنے اُس کی طرف بھاگا چلا جا رہا تھا۔ اس کا ایک سلیپر پاؤں سے نکل گیا۔ مگر اُس نے ذرا پروا نہ کی۔ مِنّی نے خیال کیا کہ "شاید وہ پاگل ہوگیا ہے"۔

وہ پستہ قد آدمی بھی بوکھلایا ہوا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اُس نے ڈاکٹر کی طرف اشارہ کر کے گاڑی بان سے کچھ کہا۔ گاڑیبان نے زور سے گھوڑے کے چابک لگائی، اور وہ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ ڈاکٹر نے بھی ان کا تعاقب جاری رکھا۔

چند ہی لمحوں میں وہ سب مِنّی کی نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

مِنّی ایک منٹ تک انگشت بدنداں کھڑی باہر کا نظارہ کرتی رہی پھر فوراً ہی واپس دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے اپنے دل میں خیال کیا۔ "یقیناً اس کا دماغ چل گیا ہے لیکن ـــــ لیکن لنڈن کے بازاروں میں اس موسم میں ننگے سر دوڑنا ـــــ"

یکایک اُسے ایک اور خیال آیا۔ وہ اٹھی اور ایک دوسرا لباس پہنکر جلدی سے مکان کے باہر سڑک پر پہنچ گئی۔ جلد ہی وہ ایک گاڑی میں بیٹھ گئی اور گاڑیبان سے کہا کہ مجھے سیدھے اس سڑک پر ہیولوک کریسنٹ کی طرف لے چلو اور اگر راستے میں کسی ننگے سر اور گرم کوٹ والے آدمی پر نگاہ پڑے تو مجھے اشارے سے بتا دینا۔"

"گ۔ گرم ک۔ کوٹ م۔ ما۔ مادام ـــ بہت اچھا" یہ کہہ کر اُس نے گھوڑے کو اس قدر تیز دوڑایا جیسے ہیولوک کریسنٹ کا اُسے پورے طور پر علم ہے!

گاڑیاں سڑک پر معمول رفتار سے گذر رہی تھیں۔ اس گاڑی کو اس طرح بے تحاشا دوڑتے ہوئے دیکھ کر دوسرے گاڑیبان اور بازاری غنڈے بہت متعجب ہوئے

ان میں سے ایک شخص ٹوملز نامی نے کہا۔ "وہ دیکھو ایرک ـــ اُسے کیا ہوگیا ہے؟"

ایک کم سن لڑکا پاس ہی کھڑا تھا بولا۔

"وہ اپنی چابک کو بہت آزادانہ استعمال کر رہا ہے!"

ٹام نے کہا "ہلو۔ وہ دیکھو ایک اور سرپھرا گاڑیبان آرہا ہے!"

"یہی ہے نا بوڑھا جارج" ٹوٹلز نے کہا "یہ فی الواقع پاگل ہو چکا ہے۔ کہیں یہ اپرک کے تعاقب میں تو نہیں جا رہا؟"

تمام گاڑی بانوں اور دوسرے غنڈوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔

جارج ——— جارج بہت خوب! خوب تیز چلاؤ ——— اوہو یہ تو گھوڑ دوڑ ہے۔ ہاں ہاں جارج تم اسے پکڑ لوگے ذرا اور تیز ہو جاؤ ——— تیز ہو جاؤ۔"

ٹوٹلز نے کہا "میں بھی ان کے پیچھے ہی جاؤں گا ——— ہاں ضرور جاؤں گا!"

"ہلو۔ وہ ایک اور گاڑی دوڑی آرہی ہے ہیمسٹیڈ کے تمام گاڑیبان آج پاگل تو نہیں ہو گئے کیا!"

"گاڑی میں کوئی دہقان عورت بیٹھی معلوم ہوتی ہے۔"

"دیکھو تو اس کے ہاتھ میں کیا ہے؟"

"مجھے تو ہیٹ سا معلوم ہوتا ہے"۔

اوہو لڑکی تو بہت حسین معلوم ہوتی ہے ——— میں شرط لگاتا ہوں جارج سب سے آگے نکل جائے گا ——— بتاؤ تم کیا کہتے ہو؟"

شور مچاتے ہوئے گروہ کے پاس سے گذرتے وقت مینی کچھ شرمندگی سی محسوس کر رہی تھی۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی اُسے معلوم تھا کہ وہ ایک فرض کے ادا کرنے میں مشغول ہے۔ اُس کی آنکھیں اگلی گاڑی پر گڑی ہوئی تھیں جس میں اُس کا شوہر بیٹھا تھا اور جسے جارج اس قدر تیزی سے ہیولوک کریسنٹ کی طرف لئے جا رہا تھا۔

سب سے اگلی گاڑی میں وہی زرد رُو آدمی ایک کونے میں سمٹا بیٹھا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں وہی بربادی کا سامان یعنی جراثیم سے بھری ہوئی نلکی تھی۔ وہ حد سے زیادہ خوفزدہ اور پریشان تھا کیونکہ اُسے خوف تھا کہ کہیں اپنا کام کرنے سے پہلے ہی وہ گرفتار نہ ہو جائے اُس کی پریشانی اُسے اور بھی خوف زدہ کر رہی تھی۔ اس سے پہلے کسی انارکسٹ کو ایسا خیال نہ آیا تھا۔ دنیا کے بڑے بڑے انارکسٹ اس وقت اس کی نظروں میں کچھ حقیقت نہ رکھتے تھے۔ اُس کی کامیابی کا راز صرف اُس نلکی کو پانی کے منبع پر جا کر اس میں ڈال دینے میں مضمر تھا اس نے کس قدر چالاکی سے کام لیا تھا۔ ایک جعلی تعارفی خط سے کام نکالنا اور دارالتجارب سے نلکی کو اس طرح اڑانا اسی کا کام تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دنیا اُسے ہمیشہ تک یاد کرے گی۔ تمام وہ لوگ جو اس کا نام حقارت سے لیتے اور اُسے پاس تک نہیں بٹھلاتے اس کے بعد اس کا نام عزت سے لیں گے ———

موت! موت!! بس اسی کا خیال اس کے دماغ میں سمایا ہوا تھا۔ دنیا نے اُسے ایک معمولی انسان سمجھا مگر اب وہ اپنی لیاقت کے جوہر دکھانے والا تھا۔ اینڈریو سٹریٹ میں پہنچ کر اس نے سر کو گاڑی سے باہر نکال کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر بمشکل پچاس گز اس سے پیچھے تھا۔ اس نے نصف کراؤن اپنی جیب سے نکال کر گاڑی بان کے منہ پر پھینکا۔ "تجھے اور بہت کچھ دوں گا۔ تجھے جلد بھگا لے چل" اس نے ماتھے پر شکن ڈال کر کہا

گاڑی بان نے نصف کراؤن سنبھالا اور گھوڑے کے اس زور سے چابک لگایا کہ وہ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ ہچکولوں سے بچنے کی خاطر انارکسٹ نے نلکی والے ہاتھ سے گاڑی کی کھڑکی کو پکڑا۔ اُسے نلکی کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی نلکی کا اگلا حصہ فوراً گاڑی میں نیچے گر گیا۔ وہ دھم سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور اپنے کپڑوں پر نلکی سے گرے ہوئے چند قطرات کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔

وہ خوف سے کانپ رہا تھا۔

"بہت خوب! ان جراثیم کا پہلا شکار میں خود ہو گیا۔ مگر ہاں لوگ مجھے شہید کہیں گے لیکن ——— لیکن یہ بڑی ذلت آمیز موت ہے"

اچانک اُسے ایک خیال آیا۔ وہ اچھل پڑا اور پھر اُس نے نلکی کے باقی ماندہ قطرات کو منہ میں ڈال لیا۔ اُسے یقین ہو چکا تھا کہ اب ہیضہ چارسُو پھیل جائے گا۔ اُس نے دل میں خیال کیا کہ اب ڈاکٹر سے بھاگنا بالکل فضول ہے۔ ولنگٹن سٹریٹ میں گاڑی کو ٹھہرا کر نیچے اترا۔ اس کا سر چکر کھا رہا تھا۔ یہ بات اُس کے ذہن نشین ہو چکی تھی کہ وہ اب ایک ہیضے کا مریض ہے۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو چھاتی پر باندھ کر وہ ڈاکٹر کا انتظار کرنے لگا۔ اُس کا چہرہ اس وقت عجیب و غریب تبدیلیوں کا آئینہ دار تھا۔ وہ اپنی اس قسم کی موت پر فخر کر رہا تھا۔

ایک قہقہہ لگا کر وہ ڈاکٹر سے یوں مخاطب ہوا "زندہ باد انارکی! میرے دوست اب وقت گزر چکا میں نے اُسے منہ میں ڈال لیا ہے ——— اب تمام لندن ہیضہ کا شکار ہو جائے گا!"

ڈاکٹر نے نہایت غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم نے اُسے منہ میں ڈال لیا! آہ، تم انارکسٹ ہو میں اب سمجھا!"

وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر خاموش رہ گیا۔ ایک مسکراہٹ کے ساتھ وہ گاڑی سے پیچھے آئیا مگر انارکسٹ اسی وقت اپنے جسم کو ایک خاص انداز میں ہلاتا ہوا واٹرلُو کے پل کی طرف چل دیا۔ وہ راستے میں اپنے جسم کو دوسروں سے رگڑتا جاتا تھا تاکہ اُن پر بھی ہیضے کا اثر ہو جائے۔ ڈاکٹر انارکسٹ کی حرکات کا بنایت تعجب آمیز نگاہوں سے مشاہدہ کر رہا تھا، اور جب اُس کی بیوی مِنی وہاں اس کا ہیٹ اور اوورکوٹ وغیرہ وغیرہ لے کر پہنچی تو اُس نے صرف یہی کہا۔

"خوب! تم نے اچھا کیا جو میری یہ چیزیں لے آئیں" پھر دوبارہ وہ انارکسٹ کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔

اس نے مِنی کو بے پروائی سے کہا "چلو تم گاڑی میں بیٹھو"

مِنی کو اب یقین ہو چکا تھا کہ وہ دیوانہ ہو گیا ہے۔ اس نے گاڑی بان کو گھر کی طرف جانے کے لئے اشارہ کیا۔ پھر اپنے شوہر سے کہنے لگی

"جوتے تو پہن لیجئے"

"بہت اچھا پیاری"

گاڑی ایک طرف کو مڑی۔ اب وہ زرد رُو آدمی اس کی نظروں سے بالکل اوجھل ہو چکا تھا۔ وہ بیٹھا بیٹھا قہقہہ لگا کر ہنسا۔ پھر بولا "یہ بڑا عجیب معاملہ ہے ——— عجیب واقعی۔ یہ آدمی جو میرے ہاں ملاقات کے لئے آیا تھا ایک انارکسٹ ہے۔ او ہو گھبراؤ نہیں پیاری ورنہ میں باقی واقعہ ہرگز نہ بتاؤں گا۔ ہاں بغیر اس بات کے علم کے کہ وہ ایک انارکسٹ ہے میں نے اُسے اپنے تجربات سے حیرانگی میں ڈالنا چاہا۔ میں نے بکٹیریا کے وہ جراثیم جن سے بندروں کے جسم پر نیلے نشان پڑ جاتے ہیں دکھا کر کہا کہ یہ ہیضے کے زندہ جراثیم ہیں۔ مجھ سے رخصت ہوتے وقت وہ اس نلکی کو بھی ساتھ ہی لیتا گیا تاکہ لندن کے پانی کو جراثیم سے آلودہ کر دے۔ اگر وہ ایسی حرکت کر دیتا تو واقعی اس مہذب شہر کے افراد کے جسم پر پانی کے استعمال سے نیلے نیلے نشان پڑ جاتے۔ مگر شک ہے کہ اس نے انھیں اپنے ہی منہ میں ڈال لیا۔ تمہیں یاد ہے ناکہ انہیں جراثیم کے اثر سے وہ خرگوش اور کتے کے بچے بالکل نیلے ہو گئے تھے۔ اب بات صرف اتنی ہے کہ مجھے نئے جراثیم تیار کرنے کے لئے اخراجات اور زحمت گوارا کرنی پڑے گی۔"

"اچھا یہ اپنا اوورکوٹ تو پہن لو"

"کیوں پیاری؟"

"شاید راستہ میں مسز جوبر سے اچانک ملاقات ہو جائے"

"مسز جوبر سے ملاقات! ——— پھر کیا ہوا میں اُس کی وجہ سے ایسی گرمی میں اوورکوٹ کیوں پہنوں؟"

"اچھا ——— اچھا تمہاری مرضی"

(ایچ۔ جی۔ ویلز)

حسن عباس

لوری

چُپ رہ میرے بچے، تیرا باپ ایک بڑا جرنیل تھا، تیری ماں ایک خوبصورت اور عقلمند خاتون تھی جنگل اور وادیاں جو میناروں پر سے ہم دیکھ رہے ہیں۔ اے میرے پیارے بچے! یہ سب تیری ہی ہیں۔

بگل کی آواز سے مت ڈر! اسے تیز تیز بجنے دے۔ یہ تیرے محافظوں کو بلا رہا ہے، جو سوتے میں تیری حفاظت کریں گے ان کی کمانیں جھک جائیں گی اور ان کی تلواریں سُرخ ہو جائیں گی اس سے پہلے کہ کسی دشمن کا قدم تیرے بستر کے قریب پہنچے۔

میرے بچے! چپ رہ۔ وہ وقت آیا ہی چاہتا ہے جب تو باجے اور ڈھول کی آواز سے بیدار ہوگا۔

ہاں ہاں چپ رہ میرے پیارے! جب تک تیرا جی چاہے آرام کر کیونکہ بڑے ہوتے ہی دنیا کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے اور دن نکلتے ہی روشنی ظاہر ہو جاتی ہے۔

(سکاٹ)

طاہر قریشی

رباعیات

حضرتِ سلطان ابوالخیر ابوسعید علیہ الرحمۃ

در کعبہ اگر دل سوئے غیر است ترا
سبحہ زنّار و کعبہ دیر است ترا
ور دل بحق است و ساکن مے کدۂ
خوش باش کہ عاقبت بخیر است ترا

ترجمہ

کعبے میں اگر دل ہے ترا مائلِ غیر
سبحہ ترا زنار ہے، کعبہ ترا دیر
اور ہے جو خرابات میں بھی حق سے لگاؤ
کچھ خوف نہ کر کہ عاقبت ہے بالخیر

عمر خیام

گر دست دہد ز مغز گندم نانے
وز مے کدوے ز گوسفندے رانے
با ماہ رُخے نشستہ در ویرانے
عیشے بود آں نہ حدِّ ہر سلطانے

ترجمہ

دو دن میں بھی گر میسر آئے اک نان
اک مے کا سبو اور اک بکرے کی ران
اک گوشۂ خلوت اور اک محبوبہ
پھر تو کوئی شاہ ہے نہ مجھ سا سلطان

حضرتِ سلطان ابوالخیر ابوسعید علیہ الرحمۃ

نے باغ نہ بستاں نہ چمن می خواہم
نے سرو نہ گُل نہ یاسمن می خواہم
خواہم ز خدائے خویش کُنجے کہ دراں
من باشم و آں کسے کہ من می خواہم

ترجمہ

ہم مائلِ دیر اور نہ صنم طالب ہیں
ہم سائلِ حور اور نہ ارم طالب ہیں
ہم ہیں اور صرف یہ تمنائے دلی
ہم ہوں اور وہ کہ جس کے ہم طالب ہیں

حکیم آزاد انصاری

افلاطون کی فلسفیانہ لغزشیں

شاعری کی حمایت میں ایک اہم ترین مقالہ

افلاطون کا دنیا کے اُن خوش نصیب افراد میں شمار ہے، جن کی شہرت کو قدرت نے خلود، اور جن کے نام کو بقائے دوام کی غیر فانی نعمتوں سے نوازا ہے۔ "عدل اور ریاست" کا جس قدر مکمل اور صحیح نظریہ افلاطون نے پیش کیا، اس کا عشرِ عشیر بھی کوئی دوسرا یونانی فلسفی پیش نہ کر سکا۔ بسطِ امن، فصلِ قضایا، رفعِ نزاع اور شیوعِ علم کے متعلق جو افلاطون نے اپنے گرانقدر اور بیش بہا خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ اپنی جگہ پر ایک حقیقتِ مستقل اور صداقتِ مکمل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ افلاطون کے تمام خیالات کا محور "حقیقتِ مطلق" ہے۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس مقدس دائرہ سے باہر آنا نہیں چاہتا۔ اُس کے فلسفہ کی اساس "خیرِ مطلق" کا وہ مقدس ترین نظریہ ہے، جس کے بغیر دنیا میں سکون و اطمینان کا رونما ہونا محال ہے۔ عقل کی بلند ترین ذکاوت، اور احساس کی انتہائی لطافت کے ساتھ ساتھ، غور و فکر اور تعمق و تدبر کا جوہر بھی قدرت نے اس کو ودیعت کیا تھا، یہی سبب ہے کہ افلاطون کا زورِ استدلال، آدمی تو آدمی بے جان پتھر تک سے بھی "ہاں" کرا کے چھوڑتا ہے۔ اُس کی ایک ایک بات تیز نشتر کی طرح دل میں اُتر جاتی ہے، اور اُس کی ہر دلیل کا جادو، ضمیر کو متاثر کر کے دم لیتا ہے، لیکن ان تمام فلسفیانہ کمالات اور تعقل و تدبر کی بے پناہ خوبیوں کے باوجود، افلاطون سے چند ایسی افسوسناک لغزشیں ہوئی ہیں، جو اُس کے رُتبہ سے فروتر ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس فرصت میں اپنے بوڑھے فلسفی کی فلسفیانہ لغزشوں پر آزادی کے ساتھ تبصرہ کریں، اور اس کی تحریر کے اہم ترین اقتباسات پر دیانت اور سچائی کے ساتھ بحث کر کے اُس "حقیقتِ کبرے" سے ناظرین کی نگاہوں کو روشناس کرا دیں، جس کے سمجھنے میں افلاطون جیسے عظیم الشان فلسفی کو ٹھوکر لگی، حالانکہ اُس کی ساری عمر "عرفانِ حقیقت" کی تلاش و تبلیغ میں صرف ہوئی۔ فلسفہ کی تاریخ کا یہ واقعہ، یقیناً حیرتناک ہے، لیکن اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ انسانی طائرِ خیال کے شہپر کو، اسرارِ قدرت اور رموزِ کائنات کے تیر اسی طرح مجروح کرتے رہتے ہیں۔

افلاطون نے بہترین ریاست کا ایک خیالی خاکہ پیش کیا ہے، جس کے گھیرے سے دنیا کا کوئی اہلِ فن باہر نہیں ہے، حتیٰ کہ موسیقی اور ورزش کو بھی اس نے تنظیمِ ریاست اور اُس کے محافظین اور نگران کاروں کے لئے ضروری قرار دیا ہے؛ اس سلسلہ میں افلاطون نے اپنے فلسفیانہ انداز میں اس درجہ سیر حاصل بحث کی ہے، جس کے صرف تصور سے روح ایک خاص قسم کی مسرت حاصل کرتی ہے۔ اسی ضمن میں اُس نے "شاعری" پر بھی نظر کیا ہے۔ افسوس ہے کہ فلسفہ کے خیالی طوفان اور عقلی سیلاب میں اُس کے حواس مختل ہو گئے، اور منطق کا ناخدا، اس گرداب سے اُسے نہ نکال سکا، شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے "وہ" لکھتا ہے:-

"سارے شعرا ہومر سے لے کر آج تک محض نقال ہیں، یہ نیکی اور دوسری چیزوں کے عکس کی نقل کرتے ہیں، لیکن حقیقت تک کبھی نہیں پہنچے، شاعر کی مثال اُس مصور کی سی ہے، جو موچی کی تصویر بنا ڈالتا ہے، حالانکہ اُس کے فن کو ذرا نہیں سمجھتا، اس کی تصویر بس اُن کے لئے ٹھیک ہے، جو خود اُس سے زیادہ نہیں جانتے، اور صرف رنگ اور صورت کو دیکھ کر فیصلہ کر لیتے ہیں۔ اسی طرح شاعر اپنے الفاظ اور ترکیبوں سے مختلف فنون کا رنگ جماتا ہے، اور اُن کی ماہیت سے بس اسی حد تک واقفیت رکھتا ہے، جتنی کہ نقالی کے لئے کافی ہو، دوسرے لوگ جو خود اسی کی طرح جاہل ہیں، اور صرف اس کے الفاظ پر فیصلہ کر لیتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ جب یہ شاعر، وزن اور بحر و ایقاع کے ساتھ موچی کے کام کا، فوجی نقل و حرکت کا، یا کسی اور بات کا ذکر کرتا ہے تو نہایت اچھی طرح انھیں بیان کرتا ہے، ہاں! کیوں نہ ہو، نغمہ و ایقاع میں قدرتاً یہ شیریں اثر ہے، میں سمجھتا ہوں، اور آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ اگر ان شاعروں کے قصوں کو اُس رنگ سے۔۔۔

سے معطّل کر دیجئے، جو موسیقی سے اُن پر چڑھایا جاتا ہے، اور معمولی سیدھی سادی نثر میں انہیں بیان کیجئے تو اُن کی کیسی حقیر شکل نکل آتی ہے، ان کی مثال، اُن چہروں کی سی ہے، جو کبھی حسین نہ تھے، اُن میں صرف اوپری چمک دمک تھی، اور اب شباب کی یہ آب و تاب اُن پر سے اُتر گئی ہے۔"

افلاطون کا غلط اندازہ

افلاطون نے شاعر کی ذہنیت اور اُس کی کارفرمائیوں کا اس قدر غلط اندازہ لگایا ہے، جس کا تصور بڑا ہی دردناک ہے، بات یہ ہے کہ "عقل" اور "جذبات" دو مختلف قوتیں ہیں، اور اُن کے محرکات و موثرات بھی ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں، دنیا کے اکثر ہنگامے اور کائنات کی بہت سی شورشیں عقل اور جذبات کی کشمکش کا نتیجہ ہیں، فلسفہ کی ساری کائنات عقل اور صرف عقل ہے، فلسفی کائنات کے ذرہ ذرہ کی حقیقت کو عقل کی روشنی میں سمجھنا چاہتا ہے، اُس کے محسوسات و مدرکات کی بنیاد بھی عقل ہی ہے، اُس کی تخئیل کا عقاب بھی عقل ہی کے بازوؤں کے سہارے فضائے بسیط کی سیر کرتا ہے، اُس کے خیال میں نگاہ دھوکا کھا سکتی ہے، سامعہ فریب میں مبتلا ہو سکتا ہے، لامسہ پر خدع و مکر کا جادو چل سکتا ہے اور شامہ کو دھوکا دیا جا سکتا ہے، مگر "عقل" غلطی نہیں کر سکتی، اُس کی اصابت مسلمہ اور صحت محقق ہے، ریاضی کا یہ بدیہی اور ناقابل ابطال نظریہ کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں، فلسفی کے نزدیک باطل ٹھہر سکتا ہے، اگر عقل کو اس کے ماننے میں تامل ہو، کائنات کے بہت سے اسرار، جن کی عقل نقاب کشائی نہیں کر سکتی، فلسفی کے نزدیک "واہمہ" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، دل کی دھڑکن ہو یا بادل کی گرج، نبض کی جنبش ہو یا بجلی کی کڑک، سانس کی آواز ہو یا ہوا کا تموج، ان تمام مختلف النوع اور متباین الاثر حرکات کا وہ عقل کی روشنی میں مشاہدہ کرنا چاہتا ہے، اُس کے ہاتھ میں صرف ایک نشتر ہے، جس سے ذی روح ہستیوں کی رگوں کا بھی جائزہ لیتا ہے، اور ساتھ ہی پتھر کی سخت چٹانوں اور گلاب کی نازک پتیوں کا بھی اُسی سے تجزیہ کرتا ہے، اُس کے پاس صرف ایک ترازو ہے، جس میں ٹھیکریوں اور لعل و گوہر کو بیک وقت تولتا ہے، اس کے یہاں صرف ایک ہی قانون ہے، جس کو وہ ہر حکومت میں ہر موقع پر نافذ کرتا ہے، غرض وہ اُن تمام کیفیات پر جو انسانی دل و دماغ پر مرئی اور غیر مرئی محرکات کے ذریعہ طاری ہوتی رہتی ہیں، عقل کے ذریعہ حکم لگاتا ہے، "معقولات" کے گورکھ دھندے میں پھنس کر فلسفی اپنے جذبات کی لطافت کو کھو بیٹھتا ہے، یا اگر یہ لطافت زائل نہیں ہوتی تو عقلی مسائل کی پیہم ممارست، لطافتِ احساس سے اُسے لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں دیتی، حظ و کرب، مسرت و الم، وصل و ہجر کے اکثر افسانے اُس کو بے سر و پا اور لغو معلوم ہوتے ہیں، نالہ و فریاد، شیون و بکا، حسرت و یاس کی بیشتر حکایتوں کو وہ مبالغہ آمیز اور حقیقت سے بعید سمجھتا ہے، اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ایک انسان، کسی دوسرے انسان کی یاد میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے سکتا ہے، اُس کی عقل اس حقیقت کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتی کہ ایک اچٹتی ہوئی کافر نظر، دلوں کو مجروح بنا سکتی ہے، اور کسی مدہوش ناز کی ایک انگڑائی، رگوں میں ہیجان پیدا کر سکتی ہے! بات یہ ہے کہ فلسفی مشاہدات و مرئیات کا خوگر ہوتا ہے، غیر محسوس محرکات و موثرات کی تہ میں، اس کی نگاہ نہیں اتر سکتی، اسی باعث اس قسم کی کیفیات کی ترجمانی و تشریح کو وہ ایک قسم کی تفریح سمجھتا ہے، جس سے تھوڑی دیر کے لئے دل تو بہلایا جا سکتا ہے، مگر کسی حقیقت کا انکشاف نہیں ہو سکتا۔ یہی سبب ہے کہ افلاطون نے "شاعری" کو نقالی سے تعبیر کیا ہے، اور اس کے نزدیک شعرا حقیقت تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔

حقیقتِ مطلق کی تلاش

اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل فلسفہ عقل کے ذریعے "حقیقتِ مطلق" کا پتہ لگانا چاہتے ہیں، اور شاعر کا مطمح نظر بھی وہی چیز ہے، جس کی تلاش میں فلسفی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے، مقصد دونوں کا ایک ہے، لیکن راہیں جدا جدا ہیں، فلسفی کے پاس ایک محدود دائرہ عمل ہے، جس میں وہ تمام حقایق کو سمیٹ لانا چاہتا ہے، اُس کی نظر اپنی محدود و مفروضہ دنیا سے بلند نہیں ہوئی، اور اگر کبھی وہ ہُو کے عالم میں نکل بھی جاتا ہے، تو اس کی رہنما "عقل" اُسے وہاں سے کھینچ لاتی ہے، برخلاف اس کے شاعر محض عقل کا پابند نہیں ہے، لفظ "محض" نے میرے مفہوم کو غالباً کافی طور پر ادا کر دیا ہے، لیکن مسئلہ کی وضاحت کے لئے مجھے کہنا پڑتا ہے کہ شاعر خدانخواستہ عقل و شعور سے بے نیاز نہیں ہوتا، مگر حقیقتِ مطلق کی جستجو میں اس کو ایسی دشوار گذار وادیوں سے گزرنا ہوتا ہے، جہاں عقل کا ٹٹو نہیں چل سکتا، شاعر کے خیال میں حقایق لامحدود ہیں، لہٰذا محض عقل کے ذریعے ہی اُن کا ادراک نہیں ہو سکتا، کیونکہ ایک لامحدود شے، کا محدود شے احاطہ نہیں کر سکتی، بلکہ وجدان و ضمیر کی الہی قوتیں اور قلب و دماغ کی روحانی

کیفیات سے بھی اس ضمن میں امداد طلب کرنا ضروری ہے یہی وہ حدِ فاصل ہے جہاں سے فلسفہ اور شاعری کا دائرۂ عمل جدا ہوجاتا ہے، پس اگر شاعر عقل کی محدود دنیا سے گذر کر "حقیقتِ مطلق" کے متعلق ایسے نشانات دیتا ہے، جو الہامی اور ربانی ہوتے ہیں، تو کیا ان کو نقالی کہا جا سکتا ہے۔ اول تو کسی حقیقت کی صحیح کیفیت کی ترجمانی کو نقل نہیں کہا جا سکتا اگر بالفرض اس کو "نقل" تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ چیز بالکل واضح ہے کہ اصل کے مشاہدہ کے بغیر "نقل" مرتب نہیں ہوسکتی۔ لہذا فلسفیوں کے مقابلہ میں شاعروں کے لئے وجہِ ترجیح یہی ہے کہ وہ کسی نہ کسی نوع سے "حقیقت" کی نقل تو کر دیتے ہیں اور ان کا یہ فعل اصل حقیقت کے مشاہدہ پر دلالت کرتا ہے، کاش فلسفی کوئی ایسی نقل ہی پیش کر سکتے جس سے "حقیقت" کا تصور ہو سکتا!

شاعری کا نقطۂ آغاز

فلسفہ کا یہ ایک مسلمہ مسئلہ ہے کہ ہر وہ چیز جو مفید ہوتی ہے، وہ نیک اور حسین ہوتی ہے۔ لہذا وہ تمام چیزیں جو حواسِ خمسہ کے لئے افادی حیثیت رکھتی ہیں، فی نفسہٖ "نیک" ہیں۔ پس قوسِ قزح، پھول، ذرے، کہکشاں، ستارے، نرم و نازک اشیا، خوش آہنگ نغمے، اور حسین چہرے، نیکی یا مسرت کے حامل ہیں۔ شاعر ان نیکیوں کی ہی اپنی زبان میں ترجمانی کرتا ہے۔ مگر اس منزل میں بھی وہ فلسفی کو بہت پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔

باغ میں گلاب کا پھول کھلتا ہے۔ ایک فلسفی متبسم گلاب کو دیکھ کر پودے کی خارجی ماہیتوں پر غور و خوض کرنا شروع کرے گا، اُس کے پیشِ نظر سب سے پہلی کیفیت زمین کی ماہیئت اور شادابی کے اسباب ہوں گے اس کا ذہن پودے کی تدریجی نشو و نما پر اپنا سارا زور صرف کرے گا؛ لیکن شاعر منطقی فلسفی کی طرح مقدمات کو ترتیب دے کر اُن سے نتائج مستنبط و مستخرج کرنے کا خوگر نہیں ہے، وہ اس بات پر کبھی غور نہیں کرے گا کہ گلاب کے پودے کے لئے جو کیاری تجویز کی گئی ہے، وہ اس کے لئے کس حد تک موزوں ہے، پودے کی شاخوں کو ترتیب کے ساتھ تراشا گیا ہے یا نہیں، پتیوں پر پچکاریوں سے پانی ڈالا جاتا ہے یا جڑوں کو تر و تازہ کیا جاتا ہے، یا ترتیب میں جو مولسری کا درخت ہے، اس کی شاخیں پودے پر جھکی ہوئی ہیں، اگر ان کو تراش دیا جائے، تو پودا، آزادی کے ساتھ نشو و نما پا سکے گا، اور اب کی بہار میں یہ درخت جو پھول دے گا وہ زیادہ بڑے اور شاداب ہوں گے۔ شاعر اس ہنگامۂ نشو و نما پر مطلق توجہ نہ کرے گا، بلکہ اس کی زبان بے اختیار اس حقیقت آمیز مصرعہ کو ادا کرے گی کہ:

اے گُل بتو خورسندم تو بوئے کسے داری

شاعر کی اسی "حقیقت نگاری" پر فلسفی خشم آلود ہوجاتا ہے، اور وہ اُس کو محض ایک "نقال" سمجھتا ہے، بات یہ ہے کہ فلسفی کی نظریں اور دماغ پودے کے نشو و نما کے خارجی حقایق پر غور کر رہی ہیں، اور اسی اُلجھن میں اُس کے دماغ کی رگ رگ سے خون ٹپکا پڑتا ہے، لیکن شاعر ان تمام سطحی باتوں سے گذر کر "حقیقتِ مطلق" کی طرف بے ساختہ لطیف اشارہ کر جاتا ہے، اور فلسفی اپنی شاندار پسپائی سے نادم ہو کر غریب شاعر پر برس پڑتا ہے۔ فلسفی کے خیال میں پہلے "پودے" کے اسبابِ نشو و نما کا پتہ لگانا ضروری تھا، لیکن شاعر ان ذہنی کاوشوں میں گرفتار ہونا نہیں چاہتا، اُس کی لطافتِ خیال "حقیقت" کی تلاش کے لئے خارجی اسباب کا سہارا نہیں ڈھونڈھتی، غرض فلسفی کی کاوشوں اور عرق ریزیوں کا جو نقطۂ آخر ہے، وہاں سے شاعر کی تخیل کی ابتدا ہوتی ہے — پس ثابت ہوا کہ حقیقی شاعر ایک فلسفی سے کہیں زیادہ حقیقت آشنا ہوتا ہے، اور جب کبھی وہ خارجی اشیا کی جزئیات بیان کرتا ہے، تو بھی اس کا مقصد اسبابِ وجود کا تجزیہ نہیں، بلکہ "حقیقتِ مطلق" کی ترجمانی ہوتی ہے۔

ماہیّت کا وقوف

افلاطون کا یہ اعتراض اگر اس کو اعتراض کہہ سکتے ہیں، بالکل درست اور بجا ہے کہ شاعر جن فنون سے بحث کرتا ہے ان کی ماہیت سے زیادہ واقف نہیں ہوتا۔ شاعر کو فی الحقیقت اشیا کے خواص اور ان کی ماہیتوں کے علم کی چنداں ضرورت نہیں ہے، اور اس کا "جہل یا عدمِ واقفیت" اس کے کمال پر کسی طرح حرف نہیں لا سکتا، کیونکہ اس جہل کا شکار تو دنیا کا ایک بڑا حصہ ہے، اور سچ پوچھیے تو چند فلسفیوں کو چھوڑ کر سارا عالم اسی جہل و نادانی میں مبتلا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کو لیجیے جو نیشکر کی کاشت، اُس کی نشو و نما، اور پھر ان تمام مدارج سے بے خبر ہے، جن سے "نیشکر" کو شکر کی صورت میں تبدیل ہونے تک گذرنا پڑتا ہے، مگر "شکر" کو چکھ کر، وہ بے اختیار ہو کر اس کی تعریف

بیان کرنے لگتا ہے، تو اگر کوئی فلسفی عزیب آدمی پر اعتراض کرے کہ "جب تجھے نیشکر کی ماہیت کا علم نہیں ہے تو شکر کی تعریف کرنے کا کیا حق ہے" بتائیے کیا یہ اعتراض کسی طرح بھی واجب اور درست ہو سکتا ہے۔ اور کیا اُس کی تعریف کو "نغالی" کہا جائے گا۔ اور کیا یہ شخص، اُس آدمی کے مقابلہ میں زیادہ حقیقت شناس نہیں ہے، جو نیشکر کی ماہیت سے تو واقف ہو چکا ہے، لیکن شکر کو ابھی نہیں چکھ سکا! پس اگر شاعر فنون کی ماہیتوں سے عدم واقفیت کے باوجود اُن کے حقائق کی طرف اشارہ کر جاتا ہے تو یہ اُس کا نقص نہیں کمال ہے۔

ایک شاعر ہے جو کما حقہٗ نہیں جانتا کہ صفیں کس طرح درست کی جاتی ہیں۔ تیروں کو کس طرح تانا جاتا ہے۔ گھوڑوں کو کب ایڑ لگا، چلیئے۔ میمنہ اور میسرہ کو کب اور کس طرح دشمن کی فوج کی جانب بڑھانا ضروری ہے، اور زخمیوں کی مرہم پٹی کس طریقہ پر مناسب ہے، لیکن وہ جنگ کی کیفیت بڑے شاندار طریقہ پر بیان کرتا ہے، پس فنِ جنگ سے عدم واقفیت کی بنا پر اُس کی یہ رزمیہ شاعری کیا مردود قرار دینے کے قابل ہے؟ آؤ اس مسئلہ کو ذرا تفصیل کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں تاکہ کوئی ابہام باقی نہ رہے۔

جنگ کا عمومی مقصد دشمن پر غلبہ پانا ہے، اور غلبہ پانے کے لئے سپاہیوں میں عزم اور مردانگی کا ہونا ضروری ہے، اور وہی سپاہی میدان جنگ میں زیادہ مستحکم عزم اور استواری پامردی کے ساتھ لڑ سکتے ہیں جو فطری مردانگی کے علاوہ، قواعدِ رزم آرائی سے بھی واقف ہوں، اور فتح کا نام بہادری اور شکست کا نام "بزدلی" ہے۔ پس معلوم ہوا کہ بہادری ہی فتح کی حقیقت ہے، اور یہ پہلے ثابت کیا جا چکا ہے کہ جنگ کا مقصدِ عمومی فتح ہوتا ہے۔ لہٰذا شاعر لڑائی کے پینتروں سے عدم واقفیت کے باوجود تلواروں کی کاٹ، برچھیوں کی صید افگنی، تیروں کے توڑ، ڈھالوں کی روک، گھوڑوں کی پھرتی، اور سواروں کی چابک دستی کی تعریف کرتا ہے تو اس کا مقصد "بہادری" کی مدح سرائی اور بزدلی کی ہجو و تنقیص ہوتی ہے، اس کے اندازِ بیان سے جذباتِ مردانگی برانگیختہ ہوتے ہیں، اور دلوں میں گرمی پیدا ہوتی ہے، پس مبادیاتِ جنگ سے ناواقفیت کے باوجود شاعر کا "حقیقتِ جنگ" کی طرف اشارہ کرنا، اُس کے کمال کا بین ثبوت ہے۔ لہٰذا شاعر جن فنون کی بھی تعریف کرتا ہے عام اس کا مقصد حقائق کی ترجمانی ہوتی ہے، پس جس شخص کو مغز مل چکا ہو اُس کو آپ چھلکے کی حفاظت و جستجو پر کیوں مجبور کرتے ہیں۔ وہ شخص جو درخت کی سب سے اونچی ڈالی پر پہنچ چکا ہو اس سے آپ کا یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ اُسے درخت کی تمام شاخوں اور تنے کے ٹکڑوں کی ماہیت سے واقف ہونا چاہئے۔ حالانکہ وہ ان ابتدائی مراحل سے گذر چکا ہے۔ تو ہم کس قدر افسوسناک بات ہے کہ ہمارے فلسفی دوست، شاعروں کو تخیل کی حقائق بکنار بلندیوں سے کھینچ کر عقل کی مجازی اور خارجی سطح پر لانا چاہتے ہیں، اگر افلاطون کی اس نصیحت پر قوم اور اس کے قبیل کے افراد (شعراء) عمل پیرا ہو جائیں تو دنیائے حقیقت کے لئے اس سے زیادہ دردناک واقعہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

شاعری اور موسیقی

"افلاطون نے سب سے بڑا حملہ شاعری پر یہ کیا ہے۔ اگر شاعری سے موسیقی کو نکال دیا جائے اور ان رنگین قصوں کو سیدھی سادی نثر میں لکھئے۔ تو ان کی کیسی حقیر شکل نکل آتی ہے"

ہمیں افلاطون کے اس اعتراض پر ذرا وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالنا ہے، ہم یہ دعوے کے ساتھ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شعر "حقیقت" کا ترجمان ہے تو اس کی نثر کرکے "حقیقت" کو تباہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اشکال و صور کی تبدیلی سے "حقیقت" پر کوئی اثر نہیں پڑتا، پانی کو آپ آبخورے میں بھریں یا صراحی میں وہ بہرحال پانی رہے گا، ظرف کی تبدیلی سے کوئی اور چیز نہیں ہو جائے گا، ہاں یہ بات ضرور ہے کہ کسی معمولی اور سادہ گلاس کے بجائے کسی رنگین گلاس میں اگر آپ نے پانی بھر دیا، تو اس کی حسین رنگت کے باعث پانی بھی زیادہ خوشنما معلوم ہوگا اور دل کو اس کی طرف رغبت ہوگی، لیکن یہ خیال رہے کہ سادہ اور رنگین گلاسوں کی تبدیلی کے باعث پانی کی "حقیقتِ مطلق" میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہیں ہوئی، اسی طرح شعر اور نثر کو بھی دو گلاس سمجھئے، ایک رنگین ہے، اور دوسرا سادہ۔ رنگین گلاس میں "زلالِ حقیقت" نظروں کو بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اب کسی نے اُس کو سادہ گلاس میں انڈیل دیا، تو اس فعل سے "حقیقتِ زلال" پر مطلق اثر نہیں پڑے گا، ہاں نگاہیں خوشنمائی میں ذرا کمی محسوس کریں گی، مگر ایک پیاسے کے لئے تو رنگین اور سادہ گلاس کا ظاہری امتیاز کوئی وقعت نہیں رکھتا، وہ تو بے تابانہ طور پر سادہ گلاس کو خالی کر کے دم لے گا۔ لہٰذا شاعر، حقیقت کو زیادہ اچھے اور خوشنما انداز میں پیش کرتے ہیں تاکہ عام طور پر لوگوں کو حقیقت کی جانب رغبت ہو۔ اور وہ

اشخاص جو اس شرابِ حقیقت کے متوالے نہیں ہیں، وہ بھی ساغر کی رنگینی اور اُس کے خطوط کی بوقلمونی دیکھ کر ایک آدھ گھونٹ تو حلق سے اتار ہی لیں۔ پس موسیقی کو اس ساغر کی رنگینی سمجھئے۔ اگر آپ اس رنگینی کو چھین بھی لیں تو بھی "حقیقت" فنا نہیں ہو سکتی۔

فلسفی کی گھنٹوں کی بحث کے بعد بھی دل مطمئن نہیں ہوتا، لیکن شاعر کے ایک شعر پر، انسان سر دھننے لگتا ہے۔ بات یہ ہے کہ فلسفی خشک دلائل، پیچدار براہین کے ذریعہ حقایق کا تصور کرانا چاہتا ہے۔ لیکن شاعر حقایق کو بلا کسی واسطے کے نگاہوں کے روبرو بے نقاب کر دیتا ہے، ظاہر ہے کہ حصولِ مدعا کی مسرت، انسان کو وارفتہ بنا دیتی ہے۔ یہی سبب تو ہے کہ اشعار کو سن کر لوگ رقص کرنے لگتے ہیں۔

شاعر کی منظم ریاست میں حیثیت

آگے چل کر افلاطون کہتا ہے :۔

"یہ تفریحی اور المناک شعر کہنے والے چاہے رجز کہتے ہوں یا حمیس بدرجہ اولیٰ نقال ہیں، لہٰذا ہم بالکل حق بجانب ہوں اگر اُسے یعنی شاعر کو ایک منظم ریاست میں داخل ہونے سے انکار کر دیں، کیونکہ یہ جذبات کو تو بیدار کرتا اور انہیں قوت بخشتا ہے، لیکن عقل کو مضرت پہنچاتا ہے جیسے کبھی کسی شہر میں بدکرداروں کو سارا اختیار مل جائے۔ اور نیک لوگ مار کر الگ کر دیئے جائیں تو کیا حال ہو، اسی طرح روحِ انسانی میں یہ نقال "شاعر" ایک دستورِ باطل لا کر نصب کرتا ہے، اس لئے کہ یہ روح کے اس غیر عاقل عنصر کی تائید کرتا ہے، جسے بڑے چھوٹے کی تمیز نہیں۔ جو اسی چیز کو کبھی بڑا اور کبھی چھوٹا خیال کرتا ہے، یہ شاعر صورت گر ہے، اور حقیقت سے کوسوں دور"

ہم اوپر بتا چکے ہیں، کہ شاعر نقال نہیں ہے، بلکہ عکاسِ حقیقت اور ترجمانِ صداقت ہے، حیرت ہے کہ افلاطون "موسیقی" کو تو منظم ریاست کا جزو لاینفک سمجھتا ہے، لیکن شاعری کو خارج کرنا چاہتا ہے، حالانکہ شاعری اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اگر موسیقی ریاست میں شامل ہو سکتی ہے تو شاعری کو بدرجہ اولیٰ دخول و شرکت کا حق حاصل ہے، جذبات کی بیداری اور حسیات کا ایقاظ کسی طرح بھی عقل کو مضرت نہیں پہنچا سکتے، شاعر، جذبات کو بیدار کرتا ہے، تو کیا اُس کا یہ جرم اس قدر سنگین ہے کہ غریب کو منظم ریاست میں حقِ شرکت سے محروم کر دیا جائے، جذبات کی خوابیدگی اور حسیات کا جمود تو ایک قوم کے لئے ازحد مضرت رساں اور نقصان دہ چیزیں ہیں، اس قوم کو فی الحقیقت مُردہ تصور کرنا چاہیئے، جس کے افراد کے جذبات خوابیدہ ہو گئے ہوں، پھر اگر شاعر سوتے ہوئے جذبات کو جگاتا ہے، اور خوابیدہ حسیات میں بیداری کی لہر پیدا کرتا ہے، تو اُس کا یہ فعل قوم کے حق میں ازحد مفید اور مستحسن ہے، دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ شاعر قوم کی مُردنی کو حیات سے، اور جمود کو حرکت سے بدلتا ہے، پس شعرا کو منظم ریاست میں ضرور بالضرور شریک کرنا چاہئے کہ یہ طبقہ قوم و افراد کی بیداریٔ جذبات کا ضامن ہے — کیا بیداریٔ جذبات کے مؤثرات کو "دستورِ باطل" کہہ سکتے ہیں؟ اگر جذبات کی بیداری کو باطل دستور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، تو پھر "خیرِ مطلق" اور "حقیقتِ مطلق" کے محرکات کو بھی ایسے ہی غیر مستحسن مجازی لقب دینے چاہئیں۔

ان تمام باتوں کے علاوہ یہ خیال بھی غلط ہے کہ شاعر قوم و ملک کے سامنے کوئی "دستور" پیش کر سکتا ہے، شاعر کے متعلق اس قسم کا خیال قایم کرنا، دراصل شعر کی توہین اور ساتھ ہی شعر سے ناواقفیت کا ثبوت ہے، شاعر کوئی واضعِ قانون مرتبِ دستور اور مسجلِ ضوابط نہیں ہے جو اُس سے ایسی توقع کی جاتی ہے، شاعر کی نظر انسانی قوانین پر نہیں بلکہ الٰہی قوانین، ربانی دستور اور فطری ضوابط پر ہوتی ہے، وہ دُنیوی قوانین کی عام طور پر خلاف ورزی نہیں کرتا، لیکن قوانین کے واضعین اور متبعین کو ربانی قانون کے اتباع کا درس دیتا ہے کہ اس کی پیروی تکمیلِ انسانیت کی ضامن ہے۔ عام انسان دنیوی قوانین کو توڑتے ہوئے سزا کے خوف سے ڈرتے ہیں، اگر احتساب کا ڈر اور دار و گیر کا دھڑکا نہ ہو، تو وہ بھی کھول کر گناہ کریں، اور ساری دنیا کو معصیت سے بھر دیں، شاعر، گناہ کی حقیقت، اور ثواب کی کنہ کو عام نگاہوں سے روشناس کراتا ہے، تاکہ حقیقت پر مطلع ہو جانے کے بعد کسی باطل اور غیر مستحسن اقدام کی جرأت نہ ہو۔ خواہ دنیوی قوانین کا نفاذ ہو یا نہ ہو محکمہ احتساب قایم ہو یا نہ ہو، عدالتوں کے دروازے اور قیدخانوں کے پھاٹک کھلے ہوئے ہوں یا بند ہوں، انسانوں کو بالطبع گناہ سے نفرت ہونی چاہئے، اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے، جبکہ گناہ و ثواب کی حقیقت اور تکمیلِ انسانیت کی لِم کا وقوف حاصل ہو گیا ہو۔

ایک منظم ریاست نے قوم و ملک کے سامنے بہترین دستور پیش کیا جس کے نفاذ نے ہر طبقہ کو مطمئن بنا دیا، اُس کے اتباع و لزوم سے ملک میں اطمینان و خوشحالی پیدا ہو گئی، لیکن اطمینان و مسرت کے آغوش میں

پرورش پاکر، جذبات پر ایک قسم کی خوابیدگی طاری ہوگئی، تو ایسی صورت میں دستور کیا کرے گا؟ کیا اُس کے ذریعہ خاموش جذبات کو ابھارا جا سکتا ہے، اور کیا جذبات کے اس افسوسناک جمود کے ہوتے ہوئے منظم ریاست کا دستور کامیاب ہو سکتا ہے؟ پس ایسے نازک موقع پر شعرا اٹھتے ہیں، اور خوابیدگی و جمود کے طلسم کو آنِ واحد میں توڑ مروڑ کر پھینک دیتے ہیں،

غور فرمائیے کہ وہ منزل جہاں پہنچ کر دستور کا عمل ختم ہو جاتا ہے، وہاں سے شعر کی کارفرمائی کا آغاز ہوتا ہے، تو کیا شعر جیسی مفید شے کو منظم ریاست اور اُس کے دستور سے کسی طرح بھی علیحدہ کیا جا سکتا ہے؟ حکومتوں کا دستور، شہروں، مکانوں، سوسائٹیوں اور افراد کی حفاظت کرتا ہے، اور شعر جذبات کا محافظ اور روحِ انسانی کا سنوارنے والا ہے۔

جذبات کی پرورش

اس ضمن میں افلاطون کہتا ہے کہ:۔

"شہوت و غضب کے جذبات کے چشمہ کو خشک کرنے کے بجائے شاعری اُن کی پرورش و آبیاری کرتی ہے، اور انسانی مسرت و خوبی کے لئے جن چیزوں کو قابو میں رکھنا ضروری ہے یہ اُن کے ہاتھ میں عنانِ حکومت دے دیتی ہے"۔

معلوم ہوتا ہے کہ افلاطون کی نظر میں جذباتِ انسانی کی کوئی وقعت نہیں ہے، وہ ان کو تباہ و برباد کر دینا چاہتا ہے، لیکن اگر کوئی دستور انسانی جذبات کی تخریب و غارتگری کے بعد بھی کامیاب ہو سکتا ہے تو ایسا دستور میرے خیال میں انسانیت کے لئے سب سے بڑی لعنت ہے۔ شہوت و غضب کی قوتیں بلا سبب قدرت نے ودیعت نہیں کیں، اُن کا استعمال اپنے موقع اور محل پر ضرور ہونا چاہیئے جو شخص ان قوا کو تباہ و برباد کر کے کسی نیکی اور صداقت کی تمنا رکھتا ہے، وہ فی نفسہ قدرت کے منشا کی توہین، اور فطرت سے جنگ کرتا ہے، دنیا کی تاریخ کسی ایسے شخص کو پیش نہیں کر سکتی جس نے قدرت سے جنگ کی ہو اور وہ کامیاب ہو گیا ہو، پس جو شخص بھی جذبات و قوائے انسانی کے خلاف جہاد کرتا ہے، وہ کتنا ہی بڑا فلسفی اور مدبر کیوں نہ ہو اس کو کسی صورت میں بھی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی، ممکن ہے کہ وہ جہلا کو منطق اور زورِ استدلال کے سبب اپنے اصول کی کامیابی کا یقین دلا سکے، اور لوگ اُسے مان بھی جائیں، لیکن اس مفروضہ کامیابی سے قدرت کا قانون تو نہیں بدل سکتا۔

شاعر اگر اعتدال کے ساتھ جذبات کو ابھارتا ہے، تو کیا وہ کوئی گناہ کرتا ہے؟ قدرت نے انسانی جذبات کے ابھارنے اور انسان کی قوتوں کو مشتعل کرنے کے لئے خود اسباب پیدا کئے ہیں، حُسن، نغمہ، رنگ، بُو، یہ سب چیزیں جذبات و حسیات میں حرکت پیدا کرنے کے سوا اور کیا کام کرتی ہیں پس اگر جذبات کے ابھارنے پر شاعر کو مجرم قرار دیا جاتا ہے تو قدرت کے ہاتھوں میں بھی ہتھکڑیاں ڈالنا ہوں گی، اور شاعر کو مجرم کہنے سے پہلے قدرت پر فردِ جرم لگانا ہوگی ــــ وہ شاعر واقعی لایقِ تعزیر اور مستوجبِ زجر و توبیخ ہے جو اخلاق کی تخریب کرتا ہو، اور رذائل و ذمایم کی طرف دل کو رغبت دلاتا ہو، لیکن ایسا شخص فی نفسہ شاعری کے اُس مقدس حلقہ سے خارج سمجھا جائے گا، جہاں "حقیقتِ مطلق" کے سوا اور کسی شئے کا گذر نہیں ہو سکتا۔

حقیقی شاعر کا مطمحِ نظر "حُسنِ مطلق" ہوتا ہے، وہ کائنات کے ذرہ ذرہ میں اسی روشنی کو دیکھتا ہے، عام انسانوں کے لئے چونکہ اس کا تصور مشکل ہے لہٰذا اس کی مجازی باتیں، اسی حدیث کی ترجمان ہوتی ہیں ؎

مدارِ صحبتِ ما بر حدیثِ زیبی ہست
کہ اہلِ شوق عوام اند و گفتگو عربی ست

اُس کا مقصد کسی طرح بھی جذبات کا غیر معتدل اشتعال اور حسیات کا ناروا ہیجان نہیں ہوتا، لیکن اگر کوئی حساس انسان، اُس کے الہامی نغموں پر بے خود ہو جائے تو اس کی ذمہ داری شاعر پر نہیں ہے، بلکہ صاحبِ ظرف پر ہے۔ بادل، کھیتوں کو سیراب کرنے کے لئے برستے ہیں لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض کہنہ اور بے مرمت مکان، پانی کے بہاؤ کے سبب گر پڑتے ہیں، تو کیا شکستہ مکانوں کی تخریب کے ذمہ دار مینہ کے وہ چھالے ہیں جن کی سر بوند، پودوں کے لئے "امرت" سے زیادہ گراں قدر ہوتی ہے۔ اسی طرح شاعری کی رو میں اگر کوئی انسانی خیال بہہ جاتا ہے تو یہ اس کا ذاتی قصور ہے اہلِ فلسفہ کا دعوے ہے کہ فلسفہ انسانوں کی بہترین رہنمائی کرتا ہے، لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض کج فہم فلسفہ کی بدولت گمراہ بھی ہو جاتے ہیں، تو اس گمراہی کا ذمہ دار فلسفہ ہے یا گمراہ ہونے والے کی فطری کمزوری، اسی طرح شعر کا مقصد جذباتِ حیات کی بیداری ہے، جرائم و معاصی کی ترویج و اشاعت نہیں ہے، بلکہ جو

کی شکست اور سکون کا خاتمہ ہے۔ کہ حرکت ہی کا نام زندگی، اور بیداری ہی کا نام حیات ہے۔

فلسفہ کا سب سے بڑا اعتراض شعر پر یہ ہے کہ اُس کا بیشتر تعلق جذبات سے ہے۔ اسی روشنی میں افلاطون نے بھی شاعری اور شعراکو جی کھول کر برا بھلا کہا ہے۔ اور شعرا کو ظلم ریاست سے کال باہر کیا ہے۔ حالانکہ شعراکو تنظیم ریاست میں کسی دوسرے صاحبِ فن سے کم اہمیت حاصل نہیں ہے کیونکہ اور لوگ اجسام کی غور و پرداخت کرتے ہیں شاعر روح کو سنوارتا ہے۔ ظاہر ہے کہ روح کے بغیر کوئی حسین سے حسین جسم بھی کام نہیں کرسکتا۔ فلسفیوں کو شعرا پر زیادہ غصہ اس لئے ہے کہ وہ بہت جلد قبولِ عام حاصل کر لیتے ہیں۔ فلسفہ کے بلند ترین مقالات کو کوئی نہیں پوچھتا لیکن معمولی معمولی شعروں کا گھر گھر چرچا ہوجاتا ہے۔ شعرا کی اس قبولیت کو اہلِ فلسفہ اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔ اور عام طبائع کو اُن کی طرف سے بدظن کرانے کے لئے شعرا کو نقال، بدکردار، جذباتی اور تنگ ظرف کے خطابات دے دیتے ہیں۔

کاش ہومر پر اعتراض کرنے سے قبل افلاطون شعر کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیتا۔

منظور حسین ماہر القادری

شعر

یادِ پیرو استاداں

چارۂ اغلاطِ غزل ہی نہ رہا

پھر رفعِ نقائص کا محل ہی نہ رہا

پھر بیکسیٔ اصلاح سبب ہی نہ رہا

پھر حسرتِ اصلاح کا بدل ہی نہ رہا

غزل

چٹکیاں شوق سے لے لے کے دل میں سلنے والے

خوب تڑپا مجھے ہنس ہنس کے رُلانے والے

مل گئے خاک میں بھی جان سے جلنے والے

کل سے آتے ہی رہے آج تک آنے والے

دسترس دامنِ محبوب تک آسان نہیں

او بگولے کی طرح خاک اڑانے والے

کر کے بیدار مجھے خواب سے روپوش نہ ہو

میری سوئی ہوئی قسمت کو جگانے والے

جاں بلب صدق بھی ہے دعویٔ عیسیٰ نفسی

دل میں انصاف تو کر رحم نہ کھانے والے

صدق جائسی

خوف

مجھے دیوانوں سے انتہائی دلچسپی ہے ـــــ یہ لوگ اس طلسمی دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں جہاں تخیلی فضا ہر لمحہ ان کے سامنے تمام گزشتہ واقعات کو پردۂ فلم کی طرح پیش کرتی رہتی ہے۔ ان کے لئے ناممکن کا لفظ بے معنی ہے کیونکہ وہ ہر امر کا تصور اپنے دماغ میں خواہ وہ کتنا ہی غیر ممکن ہو، قایم کر لیتے ہیں ـــــ اور اسی تصور پر ان کی زندگی کا مدار ہے۔ کس قدر مسرت انگیز اور دلچسپ زندگی ہے!

میں پاگل خانے میں عموماً جایا کرتا تھا۔ ایک دن ڈاکٹر نے کہا۔

"آؤ! میں تمہیں ایک عجیب مریضہ دکھاؤں"۔

یہ کہہ کر اس نے ایک کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ اندر ایک چالیس سالہ عورت جو ابھی تک حسین تھی، ایک بڑی کرسی پر بیٹھی تھی۔ ایک دستی آئینے پر اس کی نگاہیں جمی ہوئی تھیں۔

ہمیں دیکھ کر وہ معاً کھڑی ہوگئی، اور دوڑی ہوئی کمرے کے ایک کونے سے اپنا نقاب لینے کے لئے گئی۔ اس نے اپنے چہرے کو نہایت احتیاط سے ڈھانپ لیا۔

ڈاکٹر نے پوچھا "اب تمہارا کیا حال ہے؟"

اُس عورت نے ایک آہِ سرد کھینچی۔

"اف! ڈاکٹر! کیا بتاؤں! حالت نہایت خطرناک ہے۔ داغوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے"۔ اس کی آواز میں تیقن اور سنجیدگی تھی

"بالکل نہیں! میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں دھوکا ہو رہا ہے"

وہ ذرا نزدیک کھسک آئی۔

"لیکن جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہ بالکل درست ہے آج صبح میں نے دس اور داغ گنے ہیں تین دائیں اور چار بائیں رخسار پر اور تین پیشانی پر۔ اف! یہ کس قدر ہولناک بات ہے! میں کسی کو اپنا منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی ـــــ میں کسی شخص کو اپنا منہ نہیں دکھاؤں گی خواہ وہ میرا بیٹا ہی کیوں نہ ہو ـــــ میرا چہرہ بگڑ گیا ـــــ عمر بھر کے لئے میرا حسن برباد ہو گیا!"

یہ کہہ کر وہ کرسی پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ڈاکٹر دوسری کرسی پر اس کے نزدیک بیٹھ گیا اور نہایت ہمدردانہ لہجے میں بولا۔

"لاؤ تو میں دیکھوں! تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا کہ تم دھوکا کھا رہی ہو۔ اور اگر کچھ ہے تو میں آنِ واحد میں اسے دور کر سکتا ہوں"۔

اس نے خاموشی سے اپنا سر ہلایا اور دیوانہ وار اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا جس پر پہلے ہی نقاب پڑا ہوا تھا۔

"دیکھو! ایسی ضد سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ پہلے تمہارا چہرہ چیچک کے داغوں سے بھرا ہوا تھا۔ جب تم سو رہی تھیں تو میں نے تمہارا علاج کیا تھا۔ اب بہت تھوڑے داغ باقی رہ گئے ہوں گے۔ اور جب تک تم مجھے اپنا چہرہ نہ دکھاؤ گی میں کیسے علاج کر سکوں گا!"

"بہت اچھا! میں دکھانے کو تیار ہوں لیکن تمہارے ساتھ یہ کون شخص ہے"۔

"کچھ فکر نہ کرو میرے دوست نہایت قابل ڈاکٹر ہیں"۔

اس نے اپنے چہرے کو بے نقاب کیا تو شرم اور خجالت سے اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اس کی گردن بھی سرخ ہو گئی تھی۔ وہ ہماری نظروں سے چھپ رہی تھی نیچی نگاہوں سے وہ کبھی دائیں کبھی بائیں اپنی گردن ہلا رہی تھی۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم مجھے اس حالت میں دیکھ رہے ہو لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ میرے دل پر چھریاں چل رہی ہیں۔ میں انتہائی رنج والم اور یاس کی حالت میں ہوں۔ کس قدر درد انگیز منظر ہوگا جو تم دیکھ رہے ہو!"

میری حیرت میں اضافہ ہو چکا تھا کیونکہ اس کے چہرے پر کوئی نشان نہ تھا۔ نیچی نگاہیں کئے ہوئے اس نے میری طرف رُخ کیا

"میں اپنے بچے کی تیمار داری کر رہی تھی کہ یہ عارضہ مجھے لاحق ہو میں نے اپنے بیٹے کی جان بچالی لیکن میرا چہرہ عمر بھر کے لئے بگڑ گیا میں نے اپنا فرض ادا کر دیا اور اس سے میرا دل مطمئن ہے میں کس قدر دکھ میں مبتلا ہوں؟ یہ صرف خدا ہی جانتا ہے"!

ڈاکٹر نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی اور برش نکالا۔

"میں دوائی لگا کر ابھی ان کو دور کر دوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے برش تر کر کے جہاں جہاں اس عورت کو داغوں کا وہم تھا۔ دوا لگا دی۔ جب دوا خشک ہو گئی تو ڈاکٹر نے بلند آواز سے کہا،

"اب دیکھو! داغ بالکل رفع ہو چکے ہیں۔"

اس عورت نے آئینہ ہاتھ میں لیا اور کافی دیر تک غور سے دیکھتی رہی۔ گویا وہ کسی گمشدہ چیز کی تلاش میں تھی۔ اس نے ایک آہ بھری۔

"ایک وقفہ کے لئے نظروں سے اوجھل تو ہو گئے ہیں۔ بہرحال میں آپ کی انتہائی شکرگزار ہوں۔"

جب ہم باہر نکلے تو ڈاکٹر نے کہا۔

اس عورت کا بھی عجیب دردانگیز قصہ ہے۔ اس کا نام مادام شرٹ ہے۔ جوانی کے دنوں میں وہ حسین ترین عورت تصور کی جاتی تھی۔ اس کی کوئی بات ادا سے خالی نہ تھی۔ مسرت اور شادمانی ہر وقت اس پر پھول برسانی تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جن کی زندگی کا واحد مقصد اپنے حسن کو برقرار رکھنا اور اس میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔ اس کی تمام توجہ اپنے حسن کی تازگی، ہاتھ پاؤں، دانت اور جسم کے سڈول پن کی آرائش کی طرف لگی رہتی تھی۔

جب وہ بیوہ ہوئی تو اس کا ایک بچہ تھا۔ اس نے بچے کی پرورش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا ——— وہ اس سے محبت بھی کرتی تھی لڑکا بڑا ہوتا گیا اور وہ معمر ہوتی گئی۔ ہمیں معلوم نہیں لیکن قیاس یہی ہے کہ وہ بہروں اپنے مرجھائے ہوئے حسن کی طرف غور سے دیکھتی ہوگی اور پہلی تر و تازگی کو کافور ہوتا دیکھ کر گھنٹوں آنسو بہاتی ہوگی اور آئینہ ہاتھ میں لے کر دروازہ بند کر کے اپنی روح کو آنکھوں سے نکلتا دیکھتی ہوگی۔

ایک دن جبکہ وہ چھتیس سال کی تھی اور اس کا بیٹا پندرہ سال کا تھا وہ اچانک بیمار ہو گیا۔ اس کی ماں جس کو اپنی آرائش سے بہت کم فرصت ملتی تھی۔ صرف دو وقت اپنے بیٹے کے پاس آتی اور دور سے آواز دیتی۔

"بیٹا! اب کیا حال ہے"؟

"امی! پہلے سے کچھ بہتر ہوں"۔

وہ چند لمحوں کے لئے چارپائی کے پاس کھڑی ہوتی اور پھر دوا کی بوتلوں کی طرف نہایت نفرت سے دیکھ کر کہتی۔

"اوہ! مجھے تو ایک نہایت ضروری کام کرنا تھا" یہ کہہ کر وہ وہاں سے بھاگ جاتی اور غسلخانہ میں جا کر دم لیتی اور وہاں صابن اور خوشبوؤں سے ہاتھ منہ مل مل کر دھوتی۔ مریض کے پاس اس کا اتالیق دن رات موجود رہتا۔

ایک شام وہ کمرے میں داخل ہوئی۔

"کیوں! ڈاکٹر نے کیا تشخیص کیا ہے"؟

"مادام! آپ کے بیٹے کو چیچک نکل آئی ہے"۔

یہ سنتے ہی ماں نے ایک چیخ ماری اور دیوانہ وار باہر بھاگ نکلی

صبح کو جب خادمہ اس کے کمرے میں گئی تو وہاں سے دافع جراثیم دواؤں کی بو آ رہی تھی۔ وہ چھت کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ تمام رات بیدار رہی ہے۔ چہرے کا رنگ بالکل زرد ہو چکا تھا۔ وہ اپنے بستر میں کانپ رہی تھی۔

"کیوں جارج کا کیا حال ہے؟

"آج حالت زیادہ تشویشناک ہے"۔

وہ دن چڑھے تک لیٹی رہی اور وہیں اس نے چائے پی۔ پھر وہ وہاں سے اٹھ کر ایک ڈاکٹر کے پاس گئی اور چیچک سے بچنے کے لئے متعدد ادویات اپنے ہمراہ لائی اور آتے ہی اپنے آپ کو کمرہ میں بند کر کے ان کا استعمال شروع کر دیا۔

اتالیق کھانے کے کمرے میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس نے ایک خوفناک چیخ ماری۔

"کیوں ——— ؟"

"حالت اچھی نہیں ڈاکٹر بھی کچھ مایوس ہو رہا ہے"۔

اس نے دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا اور اس دن وہ کچھ نہ کھا سکی۔

دوسرے دن علی الصباح اس نے اپنے بیٹے کی خیریت کی دریافت کی لیکن اس دن بھی حالت ویسی ہی خطرناک تھی۔ اس کا تمام دن اپنے کمرے ہی میں گزرا اور وہ دافع جراثیم ادویات استعمال کرتی رہی۔ خادمہ نے اس کی خوف آمیز چیخوں کو بھی سُنا۔

اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس عورت کا معمول تھا کہ صرف دو گھنٹے کے لئے باہر تفریح کے لئے جایا کرتی تھی ورنہ تمام دن اپنے کمرہ میں بند رہتی تھی۔

وہ بار بار اپنے بیٹے کی صحت کے متعلق پوچھتی لیکن ہر مرتبہ

خطرناک حالت کی خبر سنتی تو وہ بچوں کی طرح روتی۔

گیارھویں دن صبح کو اتالیق اس کے پاس آیا اور کہا۔

"مادام! آپ کا بیٹا سخت بیمار ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے"

یہ سن کر وہ اپنے گھٹنوں پر گر پڑی اور روتے ہوئے کہنے لگی

"اے خدا! مجھ میں یہ حوصلہ نہیں مجھ پر رحم کر، میری مدد کر! اے خدا!"

"مادام! ڈاکٹر نے بالکل مایوسی ظاہر کی ہے، تمہارا بیٹا تمہاری راہ دیکھ رہا ہے"

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

"دو گھنٹے کے بعد جبکہ لڑکا موت کے قریب پہنچ چکا تھا اس نے اپنی ماں کو یاد کیا۔ آج گیارہ روز ہوئے اس نے ماں کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں میں تیر رہی تھیں۔

"اماں! آخری دفعہ تو مجھ سے مل جاؤ!" یہ سن کر اتالیق پھر دوڑا ہوا گیا۔ وہ ابھی تک اسی حالت میں پڑی ہوئی رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی

"میں وہاں نہیں جاؤں گی ..... نہیں جاؤں گی ...... مجھے انتہائی خوف محسوس ہو رہا ہے ---- میرے خدا ----"

"اتالیق نے اسے بہت سمجھایا لیکن وہ کسی طرح ڈھب پر نہ آئی روتے روتے بے حال ہوتی جا رہی تھی۔ شام کے وقت ڈاکٹر آیا۔ اس کو بھی اس عورت کی بزدلی کی نسبت بتایا گیا۔ اس نے کہا کہ میں زبردستی اٹھا کر اس کو مرنے والے بچے کے پاس لے جاؤں گا۔

ڈاکٹر نے اس کو بہت اطمینان دلایا لیکن وہ اپنے لڑکے کے پاس جانے کو رضامند نہ ہوئی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنی گود میں اٹھا لیا لیکن اس نے اپنی چیخوں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ وہ فرش پر لیٹ گئی اور دروازے کو نہایت زور سے پکڑ لیا۔

"ڈاکٹر! میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ میرے بیٹے سے کہو کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں ---- میں اس کی پرستش کرتی ہوں ---- لیکن ----"

وہ بری طرح رو رہی تھی اور ڈاکٹر اسے وہاں لے جانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

لڑکا اب چند لمحوں کا مہمان تھا۔ اس نے اتالیق سے کہا "اب دنیا میں میرے چند لمحے باقی ہیں، امی سے کہو کہ مجھے الوداع کہہ جائے اگر وہ میرے پاس آنے سے ڈرتی ہے تو اس سے کہو کہ سامنے کھڑکی میں کھڑے ہو کر مجھے اپنا خوبصورت چہرہ دکھا دے تاکہ میں نگاہوں ہی سے اسے الوداع کہہ سکوں۔ گو میں ماں کے آخری بوسہ سے محروم رہوں گا!"

ڈاکٹر اور اتالیق پھر دوڑتے ہوئے اس کے پاس آئے اور انہوں نے کہا۔ "تمہیں کوئی خطرہ نہ ہوگا تم کھڑکی کے شیشے میں سے دیکھ لو۔ تمہارا بیٹا تمہیں ایک نظر دیکھنا چاہتا ہے!"

وہ رضامند ہو گئی۔ اس نے اپنے سر کو اچھی طرح لپیٹ لیا اور اپنے ساتھ اپنی حفاظت کے لئے ادویات بھی لے لیں۔ دس قدم گئی ہوگی کہ پھر چیخ چیخ کر رونے لگی۔

"میں اس کی طرف نہیں دیکھ سکوں گی ---- ...... مجھے انتہائی خوف محسوس ہو رہا ہے ...... میں اپنے بیٹے سے شرمندہ ہوں ...... میں نہیں جاؤں گی!"

ڈاکٹر اور اتالیق دونوں اسے کھینچ کر لے جانے لگے لیکن اس نے اس زور سے چیخیں ماریں کہ سڑک پر چلنے والے ٹھٹھک گئے ---- وہ زار و قطار رو رہی تھی اور اس نے ایک کھڑکی کی سلاخوں کو اپنی گرفت میں لے لیا اور وہ اسے وہاں نہ لے جا سکے۔

لڑکا آخری سانس لے رہا تھا اس نے کروٹ بدل دی تھی اور اس کی آنکھیں کھڑکی پر لگی ہوئی تھیں ---- اسے امید تھی کہ اس کی ماں وہاں آئے گی اور اسی انتظار میں اس نے موت کو ایک ساعت کے لئے ملتوی کر رکھا تھا ---- اسی انتظار میں رات کا اندھیرا چاروں طرف چھا گیا ---- اس کی آنکھیں پتھرا گئیں دو موٹے موٹے آنسو اس کے رخساروں پر بہہ نکلے۔

اب وہ ناامید ہو چکا تھا، اس نے اپنا منہ دیوار کی طرف کر لیا اور ہمیشہ کے لئے سو گیا۔

صبح ہوئی تو یہ عورت دیوانی ہو چکی تھی۔

(موپاساں)

خلیل بی اے

تجلّیات

غرورِ حُسن یہ طرفہ ادا کیا
محبّت سے فریبِ اعتنا کیا

جہاں میں اور ہے تیرے سوا کیا
میں تجھ کو دیکھ کر پھر دیکھتا کیا

جہاں کو بے حقیقت کردیا ہے
مجھے بخشا دلِ بے مدعا کیا

میں تاثیرِ وفا کو رو رہا ہوں
تری تمکینِ بے حد کا گلہ کیا

پسندِ شوق ہے ہر نازِ جاناں
محبّت میں وفا کیا اور جفا کیا

وہ جو چاہیں کریں بے خوف ہو کر
کسی کو طاقتِ چون و چرا کیا

وہ شرماتے ہیں عرضِ مُدعا سے
کروں اب اُن سے عرضِ مدعا کیا

ہماری جاں نثاری ہی صلہ ہے
ہماری جاں نثاری کا صِلہ کیا

ہمیشہ بے قرار و مضطرب ہے
الٰہی میرے دل کو ہو گیا کیا

مجھے کر دے گا مایوسِ تمنّا
ترا ہر بات پر کہنا یہ کیا کیا

پلٹنا ہی پڑے گا سوئے کعبہ
نہیں ہوگا درِ مے خانہ وا کیا!

یہی دیواں کے اوراق پریشاں
میں شاعر ہوں مرا برگ و نوا کیا

اسے ہر وقت غمگیں دیکھتے ہیں
جلال الدین اکبرؔ کو ہوا کیا

جلال الدین اکبر

مصور شاعری

۲ ۶
۲ ۲
۲ ۶

گذشتہ جولائی کے رسالہ "ادبی دنیا" میں میرے فاضل دوست مولانا احمد حسین صاحب امجد حیدرآبادی نے ناظرین ادبی دنیا کے سامنے ایک مصور ہندی دوہا پیش کیا تھا۔ جو حسب ذیل ہے۔

رانن کے رس بین مال باتن پڑ گئی کھیس
ترسٹھ کے چھیاسٹھ بھئے چھیاسٹھ کے چھتیس[1]

یہ دوہا میں نے پہلے بھی کئی مرتبہ سنا اور دیکھا ہے۔ اور اکثر بہت لطف بھی اٹھایا ہے۔ لیکن اس سے پہلے اس کو کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا تھا کہ اس کا اردو میں بھی ترجمہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ لیکن اس مرتبہ جو میں نے اس کو "ادبی دنیا" میں دیکھا اور غور کیا تو معلوم ہوا کہ ہمارے ہاں اعداد میں بھی دو عدد یعنی (۲ و ۶) ایسے عدد ہیں جن کی مدد سے اس دوہے کے مضمون کو اردو جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے کوشش کی اور اتفاق سے جلد ہی اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہو گیا۔ جسے نذر ناظرین "ادبی دنیا" کرتا ہوں۔

کل رات وہ رنجش بڑھی، جاگے مقدر سو گئے
چھبیس کے بائیس ہو گئے، بائیس کے باسٹھ ہو گئے

یعنی کل رات عاشق و معشوق لیٹے ہوئے تھے، پیار اور محبت کی باتیں ہو رہی تھیں اور دونوں کے رخ یوں آمنے سامنے تھے ۲۶

لیکن باتوں باتوں میں رنجش بڑھ گئی اور معشوق نے خفا ہو کر کروٹ بدل لی۔ جس سے یہ شکل پیدا ہو گئی ۲۲

عاشق منانے لگا۔ مگر جب مناتے مناتے تھک گیا اور معشوق نہ منا تو اس نے بھی بگڑ کے کروٹ لے لی جس سے یہ تصویر وجود میں آ گئی ۶۲

یہاں تک کوشش ترجمہ تھی جس کا برا بھلا حق میں نے ادا کر دیا۔ اب اس کا عکس ملاحظہ ہو جس کا ترجمے سے تعلق نہیں، بلکہ میری کاوش دماغ کا نتیجہ ہے۔ مگر انصاف یہ ہے کہ اس عکس کی طرف بھی میری رہبری مندرجہ بالا ہندی دوہے کی مدد ہی سے ہوئی ہے۔

شکر خدا۔ روٹھے ہوئے معشوق و عاشق من گئے
باسٹھ کے بائیس بن گئے۔ بائیس کے چھبیس بن گئے

یعنی جب عاشق و معشوق میں باتوں باتوں میں جھگڑا ہو گیا تھا تو دونوں نے بگڑ کے کروٹیں بدل لی تھیں۔ جن کی صورت یہ تھی ۶۲

لیکن کچھ دیر بعد عاشق نے رخ بدل کر معشوق کو منانا شروع کیا تو یہ شکل وجود پذیر ہو گئی ۲۲

پھر جب بعد کوشش عاشق معشوق کو منانے میں کامیاب ہو گیا تو معشوق نے بھی عاشق کی طرف رخ کر لیا اور پھر دونوں میں اس طرح محبت و اخلاص کی باتیں ہونے لگیں جس کی تصویر یہ ہے ۲۶

مندرجہ بالا ہندی دوہا اور اس سے اخذ کردہ میرے دونوں شعر درحقیقت ایک قسم کے ادبی لطیفے ہیں۔ امید ہے کہ قارئین "ادبی دنیا" ان اشعار کو پڑھ کے اور دیکھ کے حظ اٹھائیں گے۔

حکیم آزاد انصاری

---

[1] اس شعر میں اور نیز دوسرے شعر میں جو اس کا عکس ہے اور جو آگے چند سطور کے بعد درج ہے میں نے الفاظ باسٹھ و چھبیس کو جن کا صحیح تلفظ بر وزن مفعول ہے بضرورت شعری بتخفیف یا بروزن فعلن دانستہ استعمال کیا ہے کیونکہ میں بوقت ضرورت اس قسم کے تصرف کو شعر میں جائز سمجھتا ہوں۔ آزاد انصاری

غلط فہمی

ڈرامے کے افراد

جمیعت رائے ـــــ ایک وکیل
کوشلیا ـــــ اس کی بیوی
لشیا ـــــ نوکر
مکان کا منشی ـــــ

(جمیعت رائے کا کمرہ۔ دو میزیں۔ دو تین کرسیاں ترتیب وار رکھی ہیں دو دروازے ایک باہر کی طرف اور دوسرا اندر کی طرف کھلتا ہے۔ دونوں پر پردے کھنچے ہیں۔ پردہ اٹھتا ہے تو جمیعت رائے ایک کرسی پر بیٹھا کتاب کے مطالعے میں مصروف دکھائی دیتا ہے عمر ۴۸ کے لگ بھگ۔ کوشلیا اندر والے دروازے سے داخل ہوتی ہے)

کوشلیا۔ اونہہ۔ صبح سے ہزار بار کہہ چکی ہوں کہ آٹا دال چاول سب ختم ہیں کیلدار بجنے کو آئے کچھ منگوا دو۔ مگر تم ہو کہ دودھ پیتے بچے کی طرح خاموش۔ کتاب کلیجے سے نہیں چھوٹتی آخر وکالت کی کتابوں کو پڑھ کر کیا بنا لیا۔ دھکے کھا رہے ہو کسی کو ملنے کے رہے نہ گھر سے نکلنے کے

(ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

جمیعت۔ (کتاب کو ایک طرف رکھتے ہوئے) دیکھو میں خود پریشان ہوں۔ دل بہلانے کے لئے کبھی کبھی کتاب پڑھ لیتا ہوں، اور تم ہو کہ وہی پرانی باتیں یاد دلاتی ہو آخر وکالت ہی تھی جس نے میری شہرت کو چار چاند لگا دیے تھے۔ ہر شخص کی زبان پر میری تعریف تھی۔ اب جب مصیبت میں پھنس گیا ہوں تو تم بھی میری دشمن بن گئی ہو۔ صبر، صبر بڑی چیز ہے۔

کوشلیا۔ اچھا دشمن! اور وہ دن بھول گئے جب پی کر آیا کرتے تھے تو کس طرح صبر کیا کرتی تھی؟

جمیعت۔ مدد دینا تو درکنار، تسلی اور دلاسے کا لفظ بھی تمہارے منہ سے کبھی نہیں نکلا۔

کوشلیا۔ مدد! میں نے کونسا خزانہ چھپا رکھا ہے جو تمہاری مدد کر دوں؟

جمیعت (نزدیک آکر) سنو مجھے پر اتنا پورا بھروسا ہے (کچھ دیر ٹھہر کر) میں روپیہ حاصل کرنے کی سبیل سوچ رہا ہوں۔ ایک تجویز سوجھی تھی مشورہ کرنے کے لئے تمہیں بلانے ہی لگا تھا۔

کوشلیا۔ میں خوب سمجھتی ہوں۔ اپنی تجویزیں اپنے ذہن میں رکھئے۔ چار سال خالی بیٹھے ہو گئے تو کچھ کام نہ کیا۔ اب تجویزیں سوچنے لگے

جمیعت۔ اس وقت کی حالت تو تم کو خوب معلوم ہے کھانے پینے کو بھی کچھ نہیں۔

(کھانستا ہے)

کوشلیا۔ ہاں کچھ نہیں اور نہ امید ہے کہ کبھی ہوگا۔

جمیعت (سر کو ہاتھوں میں پکڑ کر) تم۔ تم ذرا خاموش رہو گی۔ تمہاری آواز میرے دماغ میں نہ معلوم ایک طوفان پیدا کر دیتی ہے۔

کوشلیا۔ (اٹھتے ہوئے) آخاہ اب دماغ کو بھی کچھ ہو گیا۔ لیجئے جناب ہم یہاں نہیں بیٹھتے۔ آج فاقہ کیجیے گا۔

(جانے لگتی ہے جمیعت راستہ روک لیتا ہے)

جمیعت۔ ان نازک حالات میں تمہیں میرا شریک غم ہونا چاہیئے۔ میری اب وہ ساکھ نہیں جو پہلے تھی۔ (کوشلیا کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر) مجھ پر ہزاروں مصیبتیں ٹوٹ رہی ہیں، مگر میں نے ہمت نہیں ہاری۔ کبھی شکایت کا ایک حرف بھی لب پر نہیں لایا۔

کوشلیا۔ (ادھر ادھر دیکھتی ہے) مگر۔ مگر یہ شکایت کس کے خلاف میرے یا (ٹھہر کر) یا اس کتاب کے مصنف کے خلاف

جمیعت۔ (ٹہلتے ہوئے) اچھی رہنے بھی دو ہمیشہ مذاق کرتی ہو۔

کوشلیا۔ (ہنس کر) یہ غلط ہے۔ تم سمجھتے نہیں۔ میں دراصل تمہارا دل بہلا رہی ہوں۔

جمعیت۔ (دیوار پر لگے ہوئے ایک کیلنڈر کی طرف بغور دیکھتے ہوئے) آج کیا تاریخ ہے؟

کوشلیا۔ دس۔

جمعیت۔ توبہ۔ اب وہ آتا ہی ہوگا (گھڑی دیکھ کر) گیارہ بج کر آٹھ منٹ۔

کوشلیا۔ کون؟

جمعیت۔ (کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) کوشی تم ہر بات سے آگاہ ہو، پھر کیوں پوچھتی ہو؟

(توقف)

کوشلیا۔ کون؟ میں سمجھی نہیں۔

جمعیت۔ (میز پر مکا مارتے ہوئے) واہ۔ تم سمجھی نہیں؟ مجھے آج کل کون ملنے آتے ہیں؟

کوشلیا۔ اوہ۔ قرضخواہ۔ مگر تم ان سے ملنے کے عادی ہو چکے ہو۔

جمعیت۔ (کوشلیا کی ساڑھی کا ایک سرا کھینچتے ہوئے) تمہاری قسم میں اس عادت سے بیزار ہو چکا ہوں۔

کوشلیا۔ (بات کا رُخ بدلتے ہوئے) دیکھو۔ آج ولایتی ڈاک جائے گی امریکہ خط لکھو۔ مجھے یقین ہے تمہارا بھائی ضرور مدد کرے گا۔

جمعیت۔ (کتاب کو اُٹھاتے ہوئے) کوشی کوشی۔ میں نے کل بھی بتایا تھا کہ میں خط وط کچھ نہ لکھوں گا۔ میرا بھائی امیر ہے اس میں شک نہیں۔ پچھلے سال بھی کئی خط لکھے تھے مگر کوئی خاطر خواہ جواب نہیں آیا تھا۔

کوشلیا۔ وہ ساٹھ سال کا ہو چکا ہے۔ اس کی بیوی نہیں، بچہ نہیں دس سال سے وہ امریکہ میں ہے کیا اس کی موت کے بعد اس کی دولت کے تم مالک نہ بنو گے؟

جمعیت۔ اب۔ اب دیکھو میں نہیں چاہتا کہ یہ بحث طول پکڑے۔ میرا بھائی میرا بھائی ہے یہ اس کے اختیار میں ہے (ٹھہر کر) اگر میری تجویز پر عمل کرو گی تو کوئی نہ کوئی خاطر خواہ نتیجہ ضرور برآمد ہوگا۔

(میز سے کاغذ اٹھاتا ہے اور جیب سے پنسل نکالتا ہے)

کوشلیا۔ ذرا میں بھی تو سنوں تمہاری تجویز۔

جمعیت۔ اور سنو میں نہیں چاہتا کہ تم مجھ پر ہر بات میں نکتہ چینی کرو۔

کوشلیا۔ ہوں۔

جمعیت۔ یہ بھی یاد رہے کہ جس طرح میں کہوں اسی طرح تمہیں کرنا ہوگا۔

کوشلیا۔ (تنگ آکر اور مُنہ بنا کر) اور وہ تجویز کیا ہے؟

جمعیت۔ اس تجویز کے متعلق تم کو کسی سے ایک لفظ بھی نہیں کہنا ہوگا۔

کوشلیا۔ (اٹھتے ہوئے) آخر تمہاری تجویز ....

جمعیت۔ (کاغذ پنسل کوشلیا کو دیتا ہے) میری تجویز پر مجھے خود فخر ہے

کوشلیا۔ (کاغذ پنسل پھینک دیتی ہے) بس بس میں اور کچھ نہیں سننا چاہتی

جمعیت۔ (کاغذ پنسل اٹھاتا ہے) صبر میری پیاری بیوی صبر۔

کوشلیا۔ (غصے سے) پھر وہی! (خاموش ہو جاتی ہے)

جمعیت۔ (کھانسنے کی کوشش کرتے ہوئے) مصیبت میں اپنے بھی پرائے ہو جاتے ہیں۔

کوشلیا۔ ہوں (کرسی کا رُخ بدلتی ہے)

جمعیت۔ وہ تجویز

کوشلیا۔ کافی ہو چکی ہے۔ میں نہیں سننا چاہتی۔

(دروازہ پر کھٹکھٹاہٹ)

جمعیت (چونک کر) لو وہ کمبخت آپہنچا۔

کوشلیا اور وہ تجویز!

جمعیت (کاغذ پنسل سے اٹھاتا ہے) لو لکھتی جاؤ ہمارے گھر میں جتنی فالتو......

(کھٹکھٹاہٹ)

جا کوشی جلدی کر۔ کہہ دے میں نہیں مل سکتا۔

کوشلیا۔ میں کیوں جاؤں مجھے ایسی عادت نہیں۔

جمعیت (کرسی سے اٹھتا ہے) تم تم ہمیشہ گستاخی کرتی ہو۔

(کھٹکھٹاہٹ)

کمبخت ٹھہر تو جا (توقف) لٹیا!

کوشلیا۔ (زور سے آواز دے کر) لٹیا!

جمعیت۔ بدمعاش پھر باہر چلا گیا ہوگا۔

(لٹیا میلے کچیلے کپڑے پہنے ہاتھوں میں راکھ لگائے داخل ہوتا ہے)

لٹیا۔ جی!

جمعیت۔ بدمعاش سنتا نہیں باہر کون ہے (لٹیا جانے لگتا ہے) اور سن۔

(کھٹکھٹاہٹ)

اگر مکان والا ہے تو کہہ دے اس وقت فرصت نہیں اور مکھن والا ہے تو نیند رہ تاریخ۔ کمبخت مہاوہ کی دس کو آپہنچتا ہے۔ اور وہ کیا نام

ہے اس کا سوچتا ہے۔ ہاں درزی اس کا تیس روپے کا بل ہے کہہ دیجیو کہ بی بی جی سے ایک خاص تجویز پر غور کر رہے ہیں۔

(للیتا جاتا ہے)

کوشلیا۔ اونہہ تمہاری تجویز۔ نہ مونی بچوں کا کھیل ہو گیا۔

جمعیت۔ (بیٹھے ہوئے) ہاں میرا ایک واقف ہے لالہ گھنشام داس نیلام گھر کا منیجر ہے۔

کوشلیا۔ (حیرانگی سے) نیلام گھر! (کرسی سے اُٹھ بیٹھتی ہے)

جمعیت۔ بہت شریف انسان ہے۔

کوشلیا۔ مجھے اس کی شرافت سے ۔۔۔۔

جمعیت۔ سنو تو سہی۔ جب بھی ملتا ہے نہایت تپاک سے ملتا ہے۔

کوشلیا۔ (پھر بیٹھ جاتی ہے)

(للیتا آتا ہے)

کوشلیا۔ کون تھا!

للیتا۔ مکھن والا۔

جمعیت۔ (لمبا سانس لے کر) تو نے کیا کہا!

للیتا۔ یہی کہ پندرہ تاریخ حساب ملے گا۔

جمعیت۔ ہاں جا اور کان کھول کر کام کر (للیتا جاتا ہے) اب پھر آیا تو کہوں گا پچیس تاریخ۔ اس کے بعد پھر وہی دس پھر پندرہ۔۔۔

کوشلیا۔ اور وہ تجویز؟

جمعیت۔ ہاں تو لالہ گھنشام داس۔

کوشلیا۔ جہنم میں جائے تمہارا گھنشام داس۔ کام کی بات کرو گے یا میں جاؤں؟

جمعیت۔ کاغذ پنسل لو۔ جو ہمارے گھر کی فالتو چیزیں ہیں اُن کی فہرست بناؤ۔

کوشلیا۔ اور فہرست بنا کر چولھے میں ڈال دوں۔

جمعیت۔ نہیں ان کو نیلام گھر بھیجوں گا۔

کوشلیا۔ نہ نہ۔ میں ہرگز نہ بیچنے دوں گی۔ پرانی چیزیں یادگار ہوتی ہیں۔

جمعیت۔ صبح سے یہ وقت ہوا ابھی تک منہ میں ایک دانہ بھی نہیں گیا۔ میری دانائی، سنو ذرا، میری دانائی، سمجھیں؟ میری دانائی، میری سوجھ بوجھ دنیا سے نرالی ہے۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھتیں

کوشلیا۔ میں خوب سمجھتی ہوں۔

جمعیت۔ مثلاً میری وکالت کی کتابوں کی کافی قیمت ملے گی۔ ہمارے پاس چار دریاں ہیں۔ کس قدر فضول خرچی ہے۔ دس کرسیاں ہیں تین چار میزیں بھی ہوں گی اور وہ ہاں، باورچی خانہ کا سامان

(دروازہ پر کھٹکھٹاہٹ)

جمعیت۔ (چونک کر) اب یہ کون! توبہ!

(کھٹکھٹاہٹ)

جمعیت۔ للیتا!

(للیتا آتا ہے)

جمعیت۔ دیکھ کون ہے (للیتا جانے لگتا ہے) سن۔ درزی ہو تو بیس تاریخ

(للیتا جاتا ہے)

جانتا ہوں کہ جھوٹ بول رہا ہوں۔ مگر مجبور ہوں۔ سمجھتا ہوں کہ یہ گناہ ہے مگر مجبور ہوں۔ آخر کیا کروں۔

(للیتا آتا ہے)

جمعیت۔ (جلدی سے) کون؟

للیتا۔ درزی تھا۔

(للیتا جاتا ہے)

جمعیت۔ شکر! میں سمجھا مکان والا تھا۔ ہاں تو پہلے اسی کمرے کی فالتو چیزوں کی فہرست بناؤ۔ لو لکھو (دری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ دری تو خیر یہاں بھی رہے گی۔ تمہارا کیا خیال ہے۔

کوشلیا۔ ٹھیک ہے۔

جمعیت۔ (کرسیوں کی طرف دیکھتے ہوئے) یہ تین کرسیاں اس کمرے کے لئے بہت ہیں (کوشلیا لکھنے لگتی ہے) مگر ٹھہرو۔ اگر دوست وغیرہ ملنے آجائیں تو کیا فرش پر بٹھاؤں گا۔ نہیں۔

کوشلیا۔ تو کرسیاں رہنے دو۔ مگر یہ دو میزیں بہت بری معلوم ہوتی ہیں۔

جمعیت۔ ہاں لکھو ایک میز فالتو۔

کوشلیا۔ (لکھتے ہوئے) ایک میز فالتو

جمعیت (کچھ سوچتے ہوئے) یہ بھی نہیں۔ دو میزیں اس کمرے میں بہت لازمی ہیں۔ بسا اوقات دعوت ہی کے وقت ضرورت پڑ جاتی ہے۔

کوشلیا۔ تو کاٹ دوں۔

جمعیت۔ ہاں (کوشلیا کاٹ دیتی ہے)

جمعیت۔ (کمرے کے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے) دراصل اس کمرے میں

بہت مختصر سا سامان پڑا ہے دیکھ سوچ کر) واہ لکھو۔ ایک پائپ

رتوقف) اچھے وقت یاد آئی۔

کوشلیا۔ رلکھتے ہوئے) ایک پائپ

جمعیت۔ اور لکھو

کوشلیا۔ کیا؟

جمعیت۔ رجیب سے ایک بٹوا باہر نکالتا ہے) یہ بٹوا۔

کوشلیا۔ رلکھتی ہے) ایک بٹوا۔

جمعیت۔ مگر

کوشلیا۔ ہاں۔

رکھٹکھٹاہٹ)

جمعیت۔ تو یہ اب کون! لٹیا!

ردروازے سے کان لگا کر سننا چاہتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ کوشلیا کے قریب آکر) مکان والا!

کوشلیا۔ رکرسی سے اٹھتی ہے) مکان والا!

لٹیا ہاتھ میں ایک لفافہ لئے آتا ہے)

جمعیت۔ رلفافہ چھینتے ہوئے) اسے چٹھی؟

کوشلیا۔ شکر کہ مکان والا نہیں تھا مگر یہ چٹھی۔۔۔۔

رلفافہ کھولتا ہے پڑھ کر لفافہ اور کاغذ زمین پر پھینک دیتا ہے خود کرسی پر جا بیٹھتا ہے)

کوشلیا (لفافہ اور کاغذ اٹھاتی ہے) کیوں کیا ہے؟

جمعیت۔ رآہ بھر کر) کل سے بجلی بند۔

کوشلیا۔ رحیرانی سے) بجلی بند۔ کیوں کمپنی فیل ہو گئی یا انجن خراب ہو گیا۔

جمعیت۔ کچھ بھی نہیں۔ ان کا تین ماہ کا بل نہیں ادا کیا گیا۔

کوشلیا۔ ہاں تو فہرست۔

رکاغذ پنسل میز سے اٹھاتی ہے)

جمعیت۔ ہاں تو کیا کیا لکھا؟

کوشلیا۔ رکاغذ سے پڑھ کر) ایک پائپ

جمعیت۔ درست

کوشلیا۔ ایک بٹوا۔

جمعیت۔ ذرا ٹھہرو۔

کوشلیا۔ کیوں؟

جمعیت۔ اس میں شک نہیں کہ بٹوا اس وقت میری جیب میں ایک فضول بوجھ ہے مگر۔

کوشلیا۔ مگر؟

جمعیت۔ بٹوا کاٹ دو۔

کوشلیا۔ رحیران ہوکر) کاٹ دوں؟ کیوں!

جمعیت۔ بس کہہ دیا کاٹ دو۔

کوشلیا۔ تو کاٹ دوں؟

جمعیت۔ ہاں

رکوشلیا کاٹ دیتی ہے)

کوشلیا۔ اور؟

جمعیت۔ ہاں باورچی خانہ کی چیزیں۔

کوشلیا۔ لٹیا کو آواز دوں؟

(لٹیا کو بلاتی ہے۔ لٹیا فوراً ہی آجاتا ہے)

لٹیا۔ جی اب کیا کہوں؟

جمعیت۔ باورچی خانہ میں کتنی بالٹیاں لوٹے تھالیاں تھے گلاس وغیرہ ہیں

کوشلیا۔ ذرا گن کر آ۔

رلٹیا جاتا ہے)

جمعیت۔ ایک کرسی چھت پر پڑی ہے۔

کوشلیا۔ رلکھتی ہے) ایک کرسی چھت والی۔ بغیر بازو کے۔

جمعیت۔ کیا!

کوشلیا۔ اس کا ایک بازو نہیں۔

جمعیت۔ خیر اور وہ میز جو باورچی خانہ کے باہر پڑی ہے۔

کوشلیا۔ ایک میز باورچی خانہ کے باہر ٹوٹی ہوئی ٹانگ والی۔

جمعیت۔ ررر۔ بازو ٹانگ خوب!

رلٹیا آتا ہے)

لٹیا۔ تین بالٹیاں۔ چار لوٹے۔ چھ بڑے دس چھوٹے ۔۔۔۔

رکھٹکھٹاہٹ)

جمعیت۔ رچونک کر) کون؟

کوشلیا۔ مکان والا۔

لٹیا۔ جی مجھے یاد ہے کیا کہنا ہے رجاتا ہے)

جمعیت۔ کہ کہاں ہیں پتیس کٹ جائیں اور پھر پہلی سی حالت ہو جائے۔

(لٹیا تار لے آتا ہے)

جمعیت۔ (حیرانی سے) تار۔

کوشلیا۔ تار [illegible] سے۔

(لٹیا ایک کاغذ دیتا ہے جمعیت اس پر دستخط کرتا ہے۔ لٹیا جاتا ہے جمعیت تار کھول کر پڑھتا ہے۔ اور پڑھ کر کرسی پر جا گرتا ہے۔ پیر اٹھتا ہے۔ کوشلیا اسکے بازو وہاں کو پکڑتی ہے)

جمعیت۔ (خوشی سے) مرے کوشی مرے سب خیالات کا فیصلہ ہو گیا۔

کوشلیا۔ یعنی!

جمعیت۔ یعنی کہ ہم پھر امیر ہو گئے۔

کوشلیا۔ کس طرح؟

جمعیت۔ امریکہ سے کسی کا تار آیا ہے کہ میرے بھائی [illegible] مر گئے اور ساری جائداد ہمارے نام چھوڑ گئے

کوشلیا۔ سچ!

جمعیت۔ سچ اور دن رات کی طرح سچ۔

(لٹیا آتا ہے)

لٹیا۔ جی میں بتا رہا تھا کہ چھ بڑے اور دس چھوٹے....

جمعیت۔ ابے بس۔ کبھی گھر کے برتن بھی گنا کرتے ہیں۔

لٹیا۔ جی۔ جی آپ..

جمعیت۔ چل کام کر۔ جس برتن کی کمی ہو۔ اس کا نام بتلا دے تاکہ منگوا دیا جائے۔

کوشلیا۔ اور ٹوٹی ہوئی کرسیوں اور میزوں کو جلا دے۔ وہ [illegible] گی

(لٹیا حیران ہو جاتا ہے)

جمعیت۔ اب میں بھی اپنے دوستوں سے ایسی بے رخی سے پیش آؤں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے۔ اور جن دوستوں نے ان مصائب کے وقت منہ پھیرا۔ ان کو ایسا سیدھا کروں گا کہ عمر بھر [illegible] کرینگے

کوشلیا۔ اور غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرو گے؟

جمعیت۔ واہ ہرگز نہیں ان سے کوئی قرض نہیں لایا۔

کوشلیا۔ تو دولت کے ساتھ پرانی عادتیں بھی یاد آ گئیں۔

جمعیت۔ پرانی عادتیں (ہنستا ہے اور سلجھ [illegible] ہنستا ہے) دولت پسینہ [illegible] بہا کر کھٹی کی جاتی ہے [illegible] پر گیا حق ہے

(جمعیت لٹیا کو آواز دیتا ہے۔ کوشلیا کاغذ پنسل میز سے اٹھا کر دیکھتی ہے۔ پھر رکھتی ہے۔ لٹیا آتا ہے)

(کھٹکھٹاہٹ)

جمعیت۔ یہ کون (کوشلیا سے) تم ذرا دوسرے کمرے میں چلی جاؤ میں خود ملنا چاہتا ہوں (لٹیا دروازہ کھول)

(کوشلیا [illegible] جاتی ہے۔ لٹیا دروازہ کھولتا ہے مکان کا منشی داخل ہوتا ہے)

جمعیت۔ آیئے آیئے۔ تشریف رکھئے (کرسی پیش کرتا ہے)

منشی۔ شکریہ۔ دو سو باسٹھ روپے آپ کی طرف ہیں۔

جمعیت۔ سب ادا ہو جائیں گے۔

منشی۔ (جیب سے رسیدیں نکالتے ہوئے) یہ ....

جمعیت۔ آپ تکلیف نہ کریں سب ادا ہو جائے گا

منشی۔ مگر کب؟

جمعیت۔ (تار دکھاتے ہوئے) یہ دیکھئے تا میں بے شمار دولت کا مالک بن گیا ہوں۔ آپ کی ایک ایک پائی ادا کر دی جائے گی۔

منشی۔ (اٹھتے ہوئے) تو میں کب آؤں؟

جمعیت۔ بس اگلے ماہ کی دس کو۔

(منشی ترچھی نظروں سے دیکھتا ہوا جاتا ہے لٹیا دروازہ بند کر لیتا ہے)

جمعیت۔ لٹیا!

لٹیا۔ جی!

جمعیت۔ بکرم چند شراب والا [illegible] یہ دو تین مکان چھوڑ کر ان کی دکان ہے۔ کل حالات یعنی میرے بھائی کی وفات اور ان کی کل جائداد میرے نام....

لٹیا۔ سمجھ گیا جی۔

جمعیت۔ کمبخت کیا سمجھا۔ ایک بوتل وسکی...

(کوشلیا آتی ہے۔ لٹیا جاتا ہے)

کوشلیا۔ (حیران ہو کر) وسکی!

جمعیت۔ (ہنستے ہوئے) دیکھو میں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ میری باتوں میں دخل نہ دیا کرو۔

کوشلیا۔ قسمت!

جمعیت۔ قسمت قسمت [illegible] پڑھتے [illegible] دار فانی سے

ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گئے۔

کوشلیا۔ اور تمھارے لئے دلکی کا ایک ذریعہ بن گئے۔

جمعیت۔ میں چار سال سے متواتر مصائب والم کے بادلوں میں گھر رہا ہوں پے در پے آفتیں ٹوٹیں مصیبتوں میں پھنسا رہا۔ مگر آہ۔ اس لیکچر کا تم پر کچھ اثر نہ ہوگا۔ خاموشی بہتر ہے۔ در اصل (کوشلیا کی طرف مسکرا کر دیکھتا ہے) عورتوں کا دماغ بہ نسبت مردوں کے کسی قدر کم ہوتا ہے۔ اور یوں تو خیر سے تم....

کوشلیا۔ اچھا ذرا خاموش رہیئے بہت کچھ سن لیا۔

(للتیا دسکی کی بوتل میز پر رکھ دیتا ہے۔ جمعیت بوتل اٹھا کے بغور دیکھتا ہے۔ کھٹکھٹاہٹ)

جمعیت۔ اب کون۔ کہہ دے مجھے فرصت نہیں

(للتیا جاتا ہے)

کوشلیا۔ اب تم کو فرصت ہی کیوں ہوگی۔

(للتیا تار لا کر دیتا ہے)

جمعیت۔ (سراسیمگی سے) ایک اور تار!

کوشلیا۔ اب کون مرا؟

(جمعیت کاغذ پر دستخط کرتا ہے تار کھولتا ہے۔ چہرے پر عجیب آثار نمایاں ہیں تار کو پڑھتا ہے پھر بوتل اٹھا کر دیکھتا ہے بوتل ہاتھ سے گر کر ٹوٹ جاتی ہے۔ تار کو فرش پر پھینک خود کرسی پر جا گرتا ہے)

کوشلیا۔ (قریب آکر) اب کس کی جائیداد کے مالک بنے؟

(للتیا واپس آتا ہے۔ حیران ہے۔ ٹوٹی ہوئی بوتل کے ٹکڑے اٹھاتا ہے)

جمعیت۔ کوشی۔ میری کوشی سب امیدوں پر پانی پھر گیا۔

کوشلیا۔ آئیں کیا ہوا۔

جمعیت۔ (اٹھتا ہے) غلط فہمی!

کوشلیا۔ غلط فہمی!

جمعیت۔ وہ پہلا تار میرے نام نہ تھا بلکہ میرے ایک ہم نام کے نام تھا بھائی اس کا مرا ہے میرا نہیں مرا۔

کوشلیا۔ تو وہ جائیداد؟

جمعیت۔ سب اسی کی جس کا بھائی مرا پھر وہی غربت۔ وہی پندرہ پچیس تاریخ۔

کوشلیا۔ للتیا وہ ٹوٹی میز کرسی جلا تو نہیں دی؟

للتیا۔ جی نہیں۔

کوشلیا۔ خیر یہ بھی اچھا کیا (دونوں میاں بیوی ہنسنا شروع کر دیتے ہیں وہ ایک طرف تو وہ دوسری طرف)

جمعیت۔ (ٹھہر کر) کوشی!

کوشلیا۔ (قریب آکر) وہ تجویز؟

جمعیت۔ ہاں تو وہ ذرا اس فہرست کو مکمل کر لیں۔

(دونوں اپنی جگہ جا بیٹھتے ہیں۔ کوشیا کاغذ پنسل اٹھا لیتی ہے)

پردہ

اندر لال داس قمر

تحفہ

لائی ہوں پوجا کو پیارے
تن ڈلیا میں جیون ہار
من کی پوری سادھ کروں گی
اس کو تب چرنوں میں ڈار

اے میرے سانسوں کے سانس
اور دھرا کیا میرے پاس
پوری کرنا من کی آس
ٹھکرا نا مت پران ادھار
میرا چھوٹا سا اپہار

از تپش اکبرآبادی

جُدائی!

دمِ رخصت مجھے رو رو کے رُلاتے جانا
آگ جو تم نے لگائی ہے بجھاتے جانا

دیکھنا بھول نہ جائے کوئی اندازِ ستم
جاتے جاتے بھی مرے دل کو دُکھاتے جانا

جلوۂ حُسنِ دل افروز دکھا کر مجھ کو
اور بھی حسرتِ دیدار بڑھاتے جانا

ہو نہ جائے کہیں خلوت کدۂ دل ویراں!
مری دنیائے تصوّر کو بسا تے جانا

درد بن کر مرے پہلو سے نہ اٹھنا ہرگز
روح میں نشترِ غم بن کے سماتے جانا

یہ تمنا ہے کہ تم اپنی تمنا کے سوا
دل سے ہر نقشِ تمنا کو مٹاتے جانا

~~~

مجھ پہ افشائے محبت کا نہ الزام آئے (ق)
ضبطِ غم کی کوئی تدبیر بتاتے جانا

اس کو اربابِ نظر شرطِ وفا کہتے ہیں
عشق کے راز کو دنیا سے چھپاتے جانا

ہو کے مجبور جو رونا بھی تو چھپ کر رونا!
خاک میں گوہرِ نایاب ملاتے جانا

صورتِ آتشِ خاموش سدا چُپ رہنا
یاد کرنا ہمیں اور اشک بہاتے جانا

~~~

گو تغافل پہ بھی خوش ہوں مگر اے جانِ حفیظؔ
تم مری یاد کو سینے سے لگاتے جانا

یاد کرنا مجھے، تم بھول نہ جانا ہرگز
ہاں مگر میری خطاؤں کو بھلاتے جانا

حفیظؔ ہوشیار پوری

مغربی فسانہ نگاری کی تاریخ

قدرتاً انسان کے لئے دنیا میں سب سے زیادہ دلچسپی کے اسباب خود اس کے ہم جنسوں کے افعال ہیں جن کا آغاز ابتدائے آفرینش سے ہی ہوتا ہے اور حقیقتاً یہی اسباب فن تاریخ کی بنیاد ہیں لیکن فسانہ نگاری کی ابتدا کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کرنا اگر محال نہیں ہے تو مشکل ضرور ہے۔

مغربی فسانہ نگاری کے متعلق محققین کا خیال ہے کہ اس کی ابتدا انجیل مقدس کے دفتر اول سے ہوئی جس میں تخلیق عالم اور انسانی عروج و زوال کے متعلق بعض نہایت اہم و سبق آموز قصص درج ہیں۔

اگرچہ انگریزی فسانہ نگاری کی ابتدا گیارھویں صدی عیسوی میں ہوئی تھی لیکن سولھویں صدی تک اس نے کوئی خاص ترقی نہیں کی۔ کیونکہ اس وقت تک اس میں کوئی (Originality) صلاحیت یا خاص خوبی نہیں پائی جاتی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ولیم آف نارمنڈی نے انگلستان پر قبضہ جما کر ۱۰۶۶ء ایک نئے خاندان، نئے رسم و رواج کی بنیاد ڈال دی تھی۔ اہل نارمنڈی باعتبار اپنی زبان اور طرز معاشرت کے بالکل فرانسیسی تھے لیکن (Anglo-Saxon) اینگلو سیکسن باوجود بے انتہا نفرت اور قومی مغایرت کے قوانین قدرت کے موافق فاتح قوم کے اثرات سے متاثر ہو چکے تھے۔ چنانچہ میلوری (Malory) کی تصنیفات میں جس کا نام فسانہ نگاری کی تاریخ میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے اگرچہ ایک حد تک اصلیت موجود ہے تاہم اس کا طرز عبارت و تراکیب فرانسیسی انشا پردازی کی نقل ہیں۔

ملکہ الزبتھ کا عہد زریں انگلستان کی علمی و ادبی تاریخ میں ایک قابل یادگار احیاء ادب کا زمانہ ہے۔ پاپائے روم کے جبر و تشدد نے یورپ کے دماغوں کو عرصہ مدید سے معطل و بیکار کر رکھا تھا لیکن پندرھویں صدی کے آخر میں یورپ نے پھر کروٹ لی۔ قسطنطنیہ کے جلاوطن و مفرور یونانی اپنی زبان و علوم و فنون کا درس اٹلی، فرانس اور دیگر ممالک یورپ کو دینے لگے مسلمانان اندلس و بغداد کی بدولت ارسطاطالیس اور دیگر حکمائے یونان کے فلسفوں کے عربی تراجم یورپ تک پہنچ گئے۔ پوپ کی مخالفانہ کارروائیوں کے باوجود لوگوں نے ان سے استفادہ کرنا شروع کیا۔ اس طرح پوپ کے مذہبی اقتدار کی آہنی دیواریں دن بدن منہدم ہوتی گئیں اور یورپ میں اس مشہور عہد بیداری کا آغاز ہوا جس نے جرمنی میں اصلاح کنیسا کی شکل اختیار کر کے تمام ملک میں ایک زبردست مذہبی تلاطم برپا کر دیا۔ اور یورپ میں تہذیب جدید کے دور کی بنیاد ڈالی۔ انگلستان بھی ان مذہبی مناقشات اور کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کی خانہ جنگیوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ہنری ہشتم کے قضیہ طلاق سے شروع ہو کر ملکہ میری کے خون آشام دور تک فرقہ آرائیوں کا بازار گرم رہا۔ یہاں تک کہ ملکہ الزبتھ کی بیدار مغزی، معاملہ فہمی اور اعتدال پسند پالیسی نے ان مذہبی مناقشات کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ اس عرصہ میں علمی و ادبی تحقیقات کا وہ پودا جو ارسمیس و سرطامس مور کے مقدس ہاتھوں سے لگایا گیا تھا برابر پروان چڑھتا رہا لیکن الزبتھ کے پُرسکون دور میں اس کی جو نشوونما ہوئی وہ حقیقت میں تعجب خیز ہے۔

چونکہ اس وقت انگلستان میں مذہبی مناقشات ایک عرصہ کے لئے دب گئے اس لئے لوگوں کو مختلف شعبہ ہائے علوم و فنون کی طرف متوجہ ہونے کا موقع ملا۔

اب فسانہ نگاری نے بھی ایک قدم اور آگے بڑھایا لیکن یہ فن اس قدر ترقی نہ کر سکا جتنی کہ اس عہد کے فن شعرگوئی و ڈرامانویسی نے کی۔ لیکن کچھ تو اس وجہ سے کہ انگریزی نثر نگاری ہنوز پایہ تکمیل تک نہیں پہنچی تھی اور کچھ دیگر وجوہ تھے۔ اس لئے اس زمانہ کے فسانے کچھ وقتی شہرت و عارضی ہر دلعزیزی حاصل کرنے کے بعد کس مپرسی و گمنامی کی حالت میں پڑ گئے۔ اس وقت کا مشہور فسانہ نگار گرین ہے جس کی تصنیفات تعلق الفاظ، پیچیدہ محاورات و لایعنی عبارات سے پُر ہیں۔ ان میں قصہ کے تسلسل کو توڑ کر پند و نصیحت کا باب شروع ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں تاریخی فسانوں میں نہ تو واقعات کی صحت کا خیال رکھا گیا ہے اور نہ افراد افسانہ کی حیثیت و ماحول کے اقوال و

افعال میں باہمی مناسبت ہے۔

اس صدی کا دوسرا کامیاب فسانہ نگار [illegible] ہے جو [illegible] میں پیدا ہوا اور [illegible] میں فوت ہوا اس نے اپنی عمر کے آخری چند سالوں میں کئی نہایت دلچسپ افسانے لکھے۔ اس کا انداز بیان طریق ادا نے مطالب نہایت شگفتہ و مربوط ہے۔ اور جا بجا ظرافت کی حلاوت بھی موجود ہے۔ ہر واقعہ کو سادگی سے بیان کرنے پر قناعت کرتا ہے۔ اپنے ذاتی تجربہ اور عینی مشاہدہ سے کام لیتا ہے اور کیرکٹرز کی جن خصوصیات کے متعلق اس کو کافی معلومات میں ان سے بحث کرتا ہے۔ یہی اس کی کامیابی کے بڑے وجوہ ہیں۔ اگرچہ اپنی تصنیف تصنع بے ربطی سے مبرا نہیں ہے تاہم اپنی قابلیت کے بے جا اظہار اور واقعات کے توڑ مروڑ سے بالکل آزاد ہے۔

ڈیفو کے فسانوں نے اس فن کو کامیابی کی حد تک پہنچا دیا۔ لیکن پھر اس کے بعد کئی صدیوں تک اس طرف توجہ نہیں کی گئی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ عوام کا رجحان ڈراموں کی طرف زیادہ تھا۔ جو قصوں کو بجائے پڑھنے کے اسٹیج پر دیکھنا پسند کرتے تھے۔

لیکن فسانہ نگاری کو بالآخر ترقی کرنا تھا۔ سترھویں صدی کے وسط میں مسیحی مذہبیوں Puritans کے سیاسی اقتدار اور اثر سے ڈراموں کا زور کم ہوا۔ چارلس اول کے قتل پر اس پر جوش مذہبی فرقے کو کامل سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا۔ کرامویل کی قوت و تدبر اور ملٹن کے دماغ و قلم نے اس تصوف کی عظمت و رعب کا سکہ تمام یورپ پر بٹھا دیا۔ ان لوگوں کی مذہبی زندگی نہایت سادہ اور طرز معاشرت درویشانہ تھی۔ یہ فرقہ مذہباً اور اعتقاداً تمام تفریحات رقص و سرود کو خلافِ مذہب سمجھتا تھا۔ اور اس کو ڈرامے اور تھیٹر سے دلی نفرت تھی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ تمام تھیٹریکل کمپنیاں بند کر دی گئیں۔ لیکن ڈرامے کی بے قدری اور انحطاط نے فن فسانہ نگاری کو کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہنچایا۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں البتہ ہم فن فسانہ نگاری کو ترقی پذیر حالت میں دیکھ سکتے ہیں۔ اگرچہ شروع صدی کے افسانے کچھ زیادہ امتیاز نہیں رکھتے ہیں سوفٹ (Swift ۱۶۶۷ - ۱۷۴۵) نے قدرتاً وہ تمام خصوصیات پائے تھے۔ جو ایک تجربہ کار فسانہ نگار کے لئے ضروری ہیں۔ لیکن اس نے اپنے قصوں کو مطائبہ نویسی کا آلہ بنایا تھا اس فن کا دوسرا زبردست استاد ڈیفو (۱۶۶۰ - ۱۷۳۱ Danial Defoe) ہے یہ واقعہ نگاروں میں سب سے پہلا ہوشیار فن کار ہے جو سلجھے ہوئے واقعات کو اس قدر دلچسپ انداز میں تحریر کرتا تھا کہ تمام اسرار سربستہ متحرک تصاویر کی طرح ناظرین کی آنکھوں کے سامنے آجاتے تھے۔ اس کا مشہور افسانہ رابن سن کروسو اس کی استادی کا بین ثبوت ہے۔ اڈیسن، اسٹیل، سوفٹ اور ڈیفو اٹھارویں صدی کے ممتاز و ماہر فسانہ نگار سمجھے جاتے ہیں۔ ملک میں مختلف رسائل کے بکثرت جاری ہونے سے اس فن کو زیادہ تقویت ملی، کیونکہ مختصر افسانے کو ناول وغیرہ کی طرح کتابی شکل میں شائع کرنے کا دستور نہ تھا۔ ان رسالوں میں عمدہ عمدہ افسانے نکلے اور ان کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان میں سے ایک افسانہ [illegible] ہے جو جدتِ مضامین، رنگینیٔ خیالات، واقعات و مناظر کی دلفریبیوں کے اعتبار سے اس فن کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ لیکن علانیہ اخلاقی وعظ اور ناصحانہ اصلاح کی تلخی اس میں اس قدر موجود ہے کہ تخیل کی چاشنی اور محاکات کی شیرینی بھی اس کو دور نہیں کر سکتی۔

انیسویں صدی میں اس فن کی حیرت انگیز ترقی ہوئی۔ اس وقت انگریزی نثر مکمل اور تمام خصوصیاتِ انشا پردازی سے مالا مال ہو گئی تھی۔ اخبارات و رسائل کی کثرت نے اس کی ترقی میں بہت مدد دی اس لئے ادبی حیثیت سے انیسویں صدی فسانہ کی صدی کہلاتی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر انیسویں صدی کے فسانہ کی خصوصیات اور اس کی ارتقائی حالت پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔ اس صدی کے قصے بھی اخلاقی فسانے کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان میں اور ان کے پیش روؤں میں بڑا فرق ہے۔ اٹھارویں صدی کا ایک مشہور فسانہ نویس ہانکسورتھ (Hanks-worth) ہے۔ اس کے فسانوں کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس کے دماغ میں اخلاقی تعلیم کا خیال پیدا ہوا اس نے اس کے اظہار کا طریقہ دریافت کرنے کی کوشش کی اور اسی مناسبت سے پلاٹ اور کیرکٹر وغیرہ تلاش کیے لیکن اس کے قصے وعظ و نصیحت کے غیر ضروری بوجھ سے لدے ہوئے ہیں، جس کو پڑھنے والے کا دماغ محسوس کرتا ہے۔ انیسویں صدی کا ایک شہرۂ آفاق فسانہ نگار ناتھانیل ہاتھارن (HAWTHORN) ہے جو فسانہ اور [illegible] مذاق میں پورا توازن قائم رکھتا ہے۔ اگر ہم اس کے اخلاقی درس کی نوعیت دریافت کرنا چاہیں تو پہلے ہم کو قصہ کا خول جدا کرنا پڑیگا [illegible] مذکور کی مقبولیت اور شہرت کا یہ ایک بہت بڑا سبب ہے۔

دوسری خصوصیت اس صدی کے ماہرینِ فن کی یہ ہے کہ وہ قصہ کی ترتیب و ادائے مطالب میں باعتبارِ عبارت و وضاحت اپنے متقدمین سے بہت بڑھے چڑھے ہیں۔ اٹھارویں صدی میں یہ فن خارجی اسباب کے ماتحت ترقی کرتا رہا لیکن انیسویں صدی میں اس کی ارتقائی حالت کا اندازہ کر کے یہ رائے قایم کی گئی کہ اس کی ترقی اندرونی لوازمات کے زیرِ اثر ہونا چاہیئے۔

سب سے زیادہ ضروری چیز فسانہ نگار کے لئے یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے ذہن میں قصے کے اصلی مقصد کو قایم کرلے اور اس پلٹ کا پورا اندازہ کرلے کہ وہ ناظرین کے دل پر کیا اثر پیدا کرنا چاہتا ہے پھر اسی کے مطابق پلاٹ، سین، کیرکٹر اور الفاظ و محاورات کا استعمال کرے قصے کے مقصد پر ایسی گرفت ہونی چاہیئے کہ کسی وقت بھی ہاتھ سے نہ چھوٹ سکے۔ غیر ضروری و بے ربط چیزوں کو قصے میں ہرگز داخل نہ کرنا چاہیئے۔ ناول میں بے شک خامیاں نظر انداز کی جاسکتی ہیں ممکن ہے ان کی وجہ سے اس کی خوبی میں کوئی فرق نہ آتا ہو لیکن قصے کی تمام خوبی ایسے اسقام کے نہ ہونے ہی پر منحصر ہے۔ ہر قصہ انسان کے کسی خیال، جذبہ، تصور، برتاؤ یا عمل کی ترجمانی کرتا ہے اس لئے فسانہ نگار کو اپنے قصے کے لئے ایک ایسا کردار منتخب کرنا چاہیئے جس کی خصوصیتوں کو وہ اچھی طرح سمجھ سکتا ہو ورنہ اس کی تخلیق بے اثر رہے گی۔ اور پڑھنے والے اس کو مصنوعی سمجھیں گے۔ اس صدی کے شہرۂ آفاق ناول نگار تھیکرے (Thachray) اور ڈکنس (Dickens) باوجود خامیوں کے نہایت دلچسپ اور مشہور ناولوں کے لکھنے میں کامیاب ہوئے۔

تھیکرے کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنے قصے کے تسلسل کو توڑ کر پند و نصیحت کا دفتر کھول دیتا ہے اور ڈکنس نے بہت سے ایسے اشخاص اپنے ناولوں میں داخل کر دیے ہیں جن کو اصل واقعے سے کچھ بھی تعلق نہیں لیکن انہی اسباب سے جو رنگینی اور بوقلمونی پیدا ہو گئی ہے وہ بے ربط اور غیر ضروری طوالت کا کافی معاوضہ ہے۔

اگر کہانی میں فضول اور بے ربط باتیں داخل کر دی جائیں تو اس کی اصلی خوبصورتی یقیناً مٹ جاتی ہے لیکن ان اصولوں کی پابندی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ قصہ اور اس کا مفہوم خود ہی نہایت سادہ نہ ہو۔ سامقارن نے نہایت سلیس قصوں میں نہایت مشکل مسائل اور دقیق نکات سے بحث کی ہے۔ لیکن بلند تر مضامین اور اعلیٰ مقصد میں اس نے پیچیدگی اور اطناب کو داخل نہیں کیا۔ پیچیدگی خواہ عبارت میں ہو یا مفہوم میں اس کے لئے طوالت لابدی ہے۔ اور طوالت کے ہوتے ہوئے ضروری اور غیر ضروری امور میں امتیاز قایم رکھنا مشکل ہے۔ فسانہ کا طرزِ تحریر اور اس کا پلاٹ ایسا ہونا چاہیئے کہ پڑھنے والے کا دماغ شروع سے آخر تک ایک خاص اثر سے متاثر ہوتا رہے اور اس کی توجہ مرکزِ اصلی سے ہٹنے نہ پائے۔ فسانہ کی یہ خصوصیت اس کو ڈراما سے الگ کرتی ہے کیونکہ موخر الذکر انسان کے دماغ پر مختلف اثرات کے عکس ڈالتا ہے جبکہ اول الذکر کے اثر میں یکرنگی ہوتی ہے۔ انیسویں صدی کے افسانوں میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے اور ساتھ ہی انسانی جذبات کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جو چھوڑ دیا گیا ہو۔ محض تفننِ طبع کے لئے پڑھنے والا آدمی بھی ان سے اس طرح استفادہ کر سکتا ہے جس طرح کہ فطرتِ انسانی کا غائر مطالعہ کرنے والا۔

بیسویں صدی کی فسانہ نگاری کے متعلق صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اس درخشاں صدی میں ادب کی یہ اہم صنف معراجِ کمال پر پہنچ چکی ہے۔ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو چھوڑ دیا گیا ہو۔ مذہبی، اخلاقی، معاشرتی، سیاسی غرض ہر نقطہ نظر سے عصرِ حاضر کے مغربی فسانوں میں بحث کی جاتی ہے حتے کہ بعض مشہور ترین قصے صرف معمولی اور پامال واقعات یا کسی بے دھڑک فقرے یا کسی کتاب یا اخبار کے کسی جملے پر مبنی ہیں۔

مغربی فسانہ نگاری کی تاریخ اور تدریجی ترقی کے اس مختصر تبصرہ کے بعد صرف اس قدر کہنا باقی ہے کہ ہماری زبان میں ادب کی اس اہم اور مفید صنف کی طرف ابھی ابھی توجہ شروع کی گئی ہے۔ اور اگرچہ دو چار اچھے فسانہ نگار پیدا ہو گئے ہیں لیکن عام طور پر اردو رسالوں میں جس قسم کے فسانے شائع ہوتے رہتے ہیں ان کا مطالعہ ایک ایسے شخص کو ضرور مایوس کر دے گا جو روسی، فرانسیسی یا انگریزی فسانوں کا ترجمہ کر چکا ہو۔ ضرورت ہے کہ ہمارے نئے نئے انشاپرداز کالجوں کے طالب علم اپنی پوری ادبی قوتوں کے ساتھ اس کی طرف بڑھیں۔

آخر میں میں نئے فسانہ نگار دوستوں سے استدعا کرتا ہوں کہ مختصر فسانوں [illegible] حاصل کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے

کہ ہم ترقی یافتہ زبانوں (خصوصاً فرانسیسی، جرمنی، روسی اور انگریزی کے بہترین فسانوں کا گہرا اور نتیجہ خیز مطالعہ کریں خاص کر حسبِ ذیل انگریزی اور فرانسیسی انشاپردازوں کے کارنامے اس ضمن میں قابلِ ذکر ہیں۔

انگریزی (۱) ڈگراس پو (۲) آر۔ ایل۔ اسٹی ونسن (۳) ایچ۔ جی ویلس (۴) لیونرڈ میرک (۵) رڈیارڈ کپلنگ

فرانسیسی (۱) والٹیر (۲) اناطول فرانس (۳) موپاساں (۴) بالزاک۔

اس میں شک نہیں کہ قدردانانِ اردو کی توجہ اور کوششیں سے اردو لٹریچر میں بعض مفید اور دلچسپ قصوں کا اضافہ ہوا ہے لیکن اس فن کو ایک مستقل بکمل حالت پر پہنچا دینے کے لئے چند لوازمات کی بھی اشد ضرورت ہے اور ان کی صراحت مضمونِ ہذا میں کر دی گئی ہے۔

بیگانہ

نوٹ

اس مضمون میں حسبِ ذیل انگریزی کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

1. History of English Literature.
By J. Scherr
2. A History of English Literature.
3. Encyclopaedia Britanica.



طلوعِ سحر

مشرق میں ابرو رنگ کا منظر ہے دیدنی
کیف آفریں گھٹاؤں میں ہے سحرِ سامری
اک کیف انبساط کا عالم ہے چار سُو
محسوس ہو رہی ہے سحر کی شگفتگی!
پرواز کر رہے ہیں پرندے فضاؤں میں
یا کھل رہا ہے ذہن پہ مفہومِ زندگی
موسم کا حُسن، پھولوں کی نکہت، فضا کا رنگ
ٹھنڈی ہوا، لطیف سماں، روحِ تازگی
کوثر کے پڑ رہے ہیں جو چھینٹے حواس پر
ہر سانس میں سُرور کی ہے ایک لہر سی
صبحِ شگفتہ کار کا اعجاز دیکھنا!
کھلنے لگی ہے ایک خزاں آشنا کلی!
یعنی عدم کے قلبِ فسردہ میں بھی ندیم!
بیدار ہو رہا ہے پھر احساسِ زندگی!

عدم

غزل

نگہِ ناز سے پہلو میں اترنا سیکھو
یا مرادِ غِ جگر بن کے اُبھرنا سیکھو

تم سرِ عرش پہنچ جاتے ہو میرے نالو!
کیا ہو گر رحمتِ حق بن کے اترنا سیکھو؟

مرتے دم رات یہ پروانۂ مضطر نے کہا
کہنے والوں کو یہ سمجھا دو کہ کرنا سیکھو!

عشق کی راہ میں اک مرحلۂ یاس بھی ہے
پہلے اس جادۂ مشکل سے گزرنا سیکھو

شمع کی طرح دلیرانہ کٹا دو گردن
آرزو جینے کی ہے تم کو تو مرنا سیکھو

ربطِ باہم نہ کرو ترک جدا ہو کر بھی
یعنی جمعیتِ انجم سے بکھرنا سیکھو

تم کسی سے نہ ڈرو، اور ہر اک تم سے ڈرے
یہ اگر چاہو تو اللہ سے ڈرنا سیکھو

دوست دیتا ہے اگر داغ قبول اس کو کرو
سادہ دل چاند کی مانند سنورنا سیکھو

جان لو جب یہ سب اسرار تو پھر مثلِ کلیمؔ
التجا دید کی دلدار سے کرنا سیکھو

عطاء اللہ کلیمؔ

حقیقت

کلکتہ میں چند ہی ایسے خوش قسمت لوگ ہیں جن کے مکانات اس قابل ہیں کہ وہ آرام کے ساتھ ان میں اپنی زندگی بسر کر سکیں۔ اس امر کی صداقت پر وہی لوگ ایمان لا سکتے ہیں جنھوں نے سلطنتِ انگلیسیہ کے اس دوسرے دارالخلافت میں اپنی آنکھوں سے غریبوں کے گھروں کو دیکھا ہے۔ اس لئے اس کی تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

متوسط طبقہ، موجودہ تمدن کی بہت سی برکتوں سے فیضیاب ہوتا ہے، لیکن پھر بھی جس کو عشرت کہتے ہیں وہ اس کو بھی نصیب نہیں۔ ان امور کے باوجود وہ اپنی عادت سے مجبور ہو کر شہر ہی میں رہنے پر مرتے ہیں اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ دیہاتوں میں ان کا کام بھی نہیں چل سکتا۔

منور نجن اسی متوسط طبقہ کا ایک فرد تھا، خاندان ذرا بڑا تھا، اور اس کی تنخواہ جملہ مصارف کے لئے کافی نہ ہوتی تھی اس کے گھر میں اس کی ماں، بیوی اور پانچ لڑکے تھے، سال بھر میں کوئی مہینہ ایسا خالی نہ جاتا تھا کہ اس کے ہم وطن احباب، عزیز اور رشتہ دار ہندوستان کے ہر گوشہ سے اس سے ملنے نہ آتے ہوں، اس لئے منور نجن کا گھر تقریباً ہمیشہ مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا رہتا تھا۔

گھر، سڑک سے ہٹ کر، کسی قدر گلی میں پڑتا تھا، اور اس میں دو منزلیں تھیں، منور نجن نے اپنے خاندانی حکیم کے مشورہ کے مطابق نیچے کا حصہ لے رکھا تھا اس کی بیوی کا دل بہت کمزور تھا، اور اس لئے وہ بار بار سیڑھیوں پر نہیں چڑھ سکتی تھی۔ اس لئے وہ نیچے ہی رہا کرتا تھا، حالانکہ بعض وجوہات سے یہ مکان ان کے لئے بہت تکلیف دہ تھا، اوپر کے حصہ میں ایک عیسائی خاندان رہا کرتا تھا۔

ہر حصہ میں چار کمرے تھے، دو کافی بڑے تھے اور دو کسی قدر چھوٹے تھے۔ منور نجن نہ تو آزاد خیال آدمی تھا نہ بہت زیادہ قدامت پسند۔ اس کی لڑکیاں کالج میں پڑھنے جاتی تھیں ایک بی اے میں تھی اور دوسری انٹرمیڈیٹ میں اور ان میں سے اب تک کسی کی شادی نہ ہوئی تھی، وہ تعلیمِ نسواں کا حامی ضرور تھا، لیکن لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم کے متعلق اس کے دل میں طرح طرح کے شبہات جاگزیں ہو گئے تھے، لیکن وہ اپنی فطرت کے لحاظ سے کسی معاملہ میں دخل دینا پسند نہ کرتا تھا، اور وہی طریقہ اختیار کرتا تھا جس میں مخالفت کی ذرا بھی گنجائش نہ ہو چند نوجوان لڑکے اکثر اس کے مکان پر آیا کرتے تھے، وہ یا تو اس کے دور کے رشتہ دار تھے یا اس کے بیٹے کے دوست تھے، اس کی لڑکیاں اور بیوی ان سے بات چیت کرتی تھیں، جب لڑکیاں بہت کمسن تھیں تو گھر کا سرکمرہ مہمان کے استقبال کے لئے وقف تھا، لیکن ان کے جوان ہونے کے بعد ایک کمرہ مہمانوں کی ملاقات کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ اور باقی کمروں کے دروازوں پر بھی پردے ڈال دیئے گئے تھے تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ کمرے خانگی ہیں صرف دن کے وقت یہ کمرہ ملاقات کا کمرہ رہتا تھا۔ اور رات کو اس کا فرنیچر اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا جاتا تھا اور سب سے بڑا لڑکا نخو اس کے فرش پر سویا کرتا تھا اگر کوئی مہمان مرد ہوتا تو وہ بھی رات کو اس کمرہ میں سوتا تھا۔ بڑے کمروں میں سے ایک میں منور نجن اور اس کی بیوی رہتی تھی اور ان کے ساتھ چھوٹے بچے سوتے تھے۔ دوسرا کمرہ لڑکیوں کی خوابگاہ کے کام آتا تھا۔

موسمِ گرما میں، ایک روز بہت سخت گرمی تھی اور حبس کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، اور سارا شہر گرمی سے پریشان نظر آ رہا تھا، بعض لوگوں کے پاس برقی پنکھے تھے لیکن ان میں سے بھی ہوا کی بجائے چنگاریاں نکلتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ غریب آدمی کھجور کے پنکھے جھل کر اور سیمنٹ کے فرش پر لیٹ کر کسی قدر ٹھنڈک محسوس کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

منور نجن کے گھر میں بجلی کے پنکھے موجود نہ تھے اس پر طرہ یہ کہ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا اس کا ایک دوست راسک، صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ سے اپنی بیوی اور بیٹے کو لے کر آیا تھا وہ لوگ بنگال کے کسی گاؤں کی طرف جا رہے تھے، جو ان کا وطن تھا۔ اور یہاں دورانِ سفر میں ایک یا دو روز کے لئے ٹھہر گئے تھے۔

شام کو دھیمی دھیمی ہوا چلنے لگی تھی۔ گھر کے سب لوگ اندرونی دالان میں جمع ہو گئے تھے جو ہنا دل خانہ ڈائننگ روم کا کام دیتا تھا، سب سے بڑی لڑکی سُلاتا نے، جو ہر طرف علیحدہ علیحدہ بیٹھ کر کھانے اور ہر طرف برتن پھینک دینے کے طریقہ کو پسند کرتی تھی، اس دالان کو ڈائننگ روم کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا، اور اپنے باپ کو مجبور کر کے کھانے کا ایک میز منگوا لیا تھا۔

اس وقت وہ لوگ چاء نوشی میں مشغول تھے۔ سُجاتا چائے انڈیل انڈیل کر دے رہی تھی، اور سُلاتا مہمانوں کے سامنے، توس، مکھن اور مٹھائیاں پیش کر رہی تھی۔ مٹھائی خاص طور پر مہمانوں کے لئے منگوائی گئی تھی۔

"کانپور میں بھلا اس قسم کے کھانے کا مزہ کہاں؟" راسک بابو کی بیوی نے کہنا شروع کیا۔ "ہم لوگ تقریباً اپنے بنگالی کھانوں کو چھوڑ کر بالکل صوبہ متحدہ کے باشندے بن گئے ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ وہاں ہم اپنے پیر خوب پھیلا کر سو سکتے ہیں، مجھے اس لحاظ سے اس شہر کی خوبی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ وہاں مکان بہت بڑا ہے۔ اور ہم کو معلوم نہیں کہ اتنے زیادہ کمروں کو کس کام میں لائیں۔ تقریباً سب کو نوکروں نے گھیر رکھا ہے۔"

"ہم لوگ اسی چھوٹے سے جھونپڑے پر قناعت کرتے ہیں" منورنجن نے کہا۔ "ہم لوگ کثرت سے مچھلی ملنے کی خوشی میں ان ذرا ذرا سی تکلیفوں کو بھول گئے ہیں، تم کو مہینہ میں کتنی مرتبہ مچھلی ملتی ہے؟"

راسک بابو کی بیوی کے جواب دینے سے قبل ان کی بیٹی اپرنا بول اٹھی "آپ پوچھتے ہیں مہینہ میں کتنی مرتبہ۔ آپ کو پوچھنا چاہئے کہ سال میں کتنی مرتبہ۔ اس کے باوجود اس کے مزے کا لحاظ کرتے ہوئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ مچھلی ہے یا سوکھے چھلکے۔"

منورنجن نے اپرنا کی طرف تحسین آفریں انداز سے دیکھا، اور کہا۔ "لیکن اس کی وجہ سے تمہاری صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑا۔ تم میری دونوں لڑکیوں کو ایک ساتھ ایک ایک ہاتھ سے پکڑ کر اٹھا سکتی ہو۔"

سب لڑکیاں کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ "ہم تو جگہ کی تنگی کی وجہ سے آزادانہ چل پھر بھی نہیں سکتے" سلاتا کہنے لگی "پھر آپ کیونکر یہ توقع کر سکتے ہیں کہ ہم مضبوط، قوی، توانا اور موٹے تازے ہوں گے۔ تاہم سجاتا نے مدرسہ کے بعض کھیلوں میں انعامات حاصل کئے ہیں لیکن میں نے ان میں کبھی شرکت نہیں کی۔"

"اس مرتبہ جب ہم گھر واپس ہوں گے تو تم دونوں کو اپنے ساتھ لیتے جائیں گے" راسک بابو کی بیوی نے دونوں لڑکیوں سے کہا۔ "وہاں چل کر دیکھنا کہ تمہاری صحت کیسی اچھی ہو جائے گی۔"

"مگر وہاں ہر سال طاعون تو نہیں پھیلتا؟" سلاتا کی ماں نے کسی قدر ہراساں ہو کر پوچھا۔

"ممکن ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہاں لوگ رہتے ہیں" مہمان نے جواب دیا۔ "ہم کو وہاں رہتے ہوئے دس سال گزر گئے لیکن ہم تو زندہ ہیں۔"

اپرنا اس موضوع کو کچھ پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھ رہی تھی، اس لئے وہ بیچ میں بول اٹھی "میں تو یہ کہوں گی کہ کلکتہ کسی حالت میں بھی کانپور سے زیادہ ٹھنڈا نہیں ہے اگر وہاں ہم لوگ گرمی سے سوکھ جاتے ہیں تو یہاں معلوم ہوتا ہے کہ اُبالے جا رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ بدترین مقام ہے۔ ذرا مہربانی کر کے چاء جلد ختم کیجئے۔ میں ذرا تازہ ہوا کی خاطر کہیں باہر جانا چاہتی ہوں۔ اب گھر کے اندر بیٹھا رہنا میرے لئے ناممکن ہو گیا ہے۔"

سب نے عجلت سے چاء ختم کی۔ اور کسی نے مٹھائی اور مکھن کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ اس کے بعد لڑکیاں لباس تبدیل کرنے اپنے کمرے میں چلی گئیں ہر شخص نے جلد جلد لباس پہن لیا اور سب لوگ تفریح کے لئے باہر نکل گئے صرف سجاتا کی ماں گھر میں رہ گئی کیونکہ اس کو مہمانوں کے لئے کھانے کی نگرانی کرنی تھی۔ تھوڑی دور تک یہ پارٹی پیدل چلی، پھر ایک ٹرام میں بیٹھ گئی۔ ٹرام سے اترنے کے بعد پھر کچھ دور تک پیدل چلی۔ اور جب گھر واپس ہوئی تو رات زیادہ ہو چکی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" منورنجن کی بیوی نے استفسار کیا۔ "تم لوگوں کو وقت کا بھی خیال نہیں کہ کیا بج چکا ہے؟" "اوہو۔ کچھ خیال نہ کرو" شوہر نے جواب دیا۔ "گرمی اس قدر ہے کہ دس بجے سے پہلے کوئی شخص گھر میں نہیں آ سکتا۔"

"تو اب دس بج رہے ہیں" بیوی نے کہا۔ "فوراً کھانے کے لئے بیٹھ جانا چاہئے۔"

سب لوگ ہاتھ دھو کر دسترخوان پر بیٹھ گئے چہل قدمی کی وجہ سے سب کو بھوک لگ آئی تھی اس وجہ سے سب نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔

کھانے کے بعد جب دسترخوان اٹھایا جا رہا تھا راسک بابو نے کہا "میں کل شام کی طرح آج بھی اس میز پر رات بسر کروں گا۔ میں باہر سونے کا اس قدر عادی ہو گیا ہوں کہ چھت کے نیچے سونے سے مجھے وحشت ہوتی ہے"

"لیکن یہاں اور سڑک پر سونا دونوں برابر ہیں یہاں ذرا بھی کوئی بچاؤ نہیں ہے اس ذرا سی دیوار سے کوئی فایدہ نہیں" میزبان نے کہا۔

راسک بابو قہقہہ مار کر ہنس پڑے "میں نہ تو حسن کا مجسمہ ہوں، اور نہ سونے کا پتلا" وہ بولا "اس لئے چور کو مجھے لے جانے سے کیا فایدہ ہوگا۔

چنانچہ اس کی رائے کے مطابق میز صاف کر دیا گیا، اور اس پر راسک بابو کا بستر بچھا دیا گیا۔ منورنجن اپنے بیٹے کے کمرے میں سونے چلا گیا۔ اور راسک بابو کی بیوی منورنجن کی بیوی کے کمرے میں شب بسر کرنے گئی۔

ایرنا کو اس چھوٹے سے گرم کمرے سے سخت تنفر ہو رہا تھا جس میں اس کو سونا تھا، لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کی شکایتوں اور فریادوں کو یہاں کوئی نہ سنے گا۔ کلکتہ کے لوگوں میں شمالی ہند کے لوگوں کی سی تہذیب موجود نہیں اور اس لئے وہ اس کی جیسی عمر والی لڑکی کو باہر سونے کی اجازت نہ دیں گے۔

لڑکیوں نے فرش پر ایک بستر بچھا لیا کیونکہ ایک پلنگ پر تین آدمی نہ سو سکتے تھے۔ سلاتا کو بہت گرمی محسوس ہو رہی تھی اور اس لئے وہ زمین کے ٹھنڈے بستر پر لیٹ گئی۔ لیکن سحانا آرام پسند تھی اور اس کو پلنگ پر سونا اچھا معلوم ہوتا تھا اس لئے وہ پلنگ پر سو گئی۔

لیکن ایرنا کو زمین پر بچھا ہوا بستر بھی اچھا نہ معلوم ہوتا تھا، اس نے کہا "مہربانی کر کے مجھے ایک چٹائی دے دو گی۔ اس قدر ہے کہ میں کسی قسم کے بستر پر نہیں سو سکتی۔ سلاتا جا کر ایک جاپانی چٹائی اٹھا لائی" اور کیا چاہئے؟" اس نے پوچھا۔

"اور کچھ نہیں" ایرنا نے جواب دیا "مجھے تازہ اور ٹھنڈی ہوا کی بہت ضرورت ہے لیکن تم میرے لئے وہ مہیا نہیں کر سکتیں۔ اگر ہم دروازے اور کھڑکیاں کھول دیں تو کسی قدر گرمی کم ہو جائے گی"۔

سلاتا نے جواب دیا "اگر نقصو ملاقات کے کمرے میں نہ سو رہا ہوتا تو ہم کھڑکیاں کھول دیتے"۔

"خیر کوئی ہرج نہیں" ایرنا بولی "جس کا علاج نہیں اس کو برداشت ہی کرنا پڑتا ہے لیکن مجھے ایک گلاس پانی کی ضرورت ہے یہ میری ایک بہت خراب عادت ہے کہ جب رات کو میری آنکھ کھلتی ہے تو میں ٹھنڈا پانی ایک گلاس پی لیا کرتی ہوں۔ مگر اب تم مت اٹھو، میں خود لے آؤں گی"۔

ایرنا اٹھ کر باہر چلی گئی۔ ذرا دیر کے بعد ایک بڑے لوٹے میں پانی لے کر واپس ہوئی۔ اور اس کو اپنے تکیہ کے پاس رکھ لیا۔

گیارہ بجے تھے۔ تقریباً سب لوگ جا کر سو گئے تھے پہلے ذرا دیر تک سرگوشیاں سنائی دیتی رہیں پھر پنکھوں کی سائیں سائیں ——— اس کے بعد بالکل سناٹا ———

کچھ رات گذرنے پر حسب معمول ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے آنے لگے تھے لیکن کمروں کے اندر ان کا گذر مشکل سے ہوتا تھا۔ اتنے بڑے خاندان میں صرف راسک بابو گہری نیند کے مزے لے رہے تھے۔ دوسرے کمروں میں ہوا کے جھونکے پردوں سے ٹکرا کر داخل ہوتے تھے۔ اس وجہ سے جب ہوا کے جھونکے نہ آتے تو گرمی ناقابل برداشت حد تک پہنچ جاتی تھی۔

گرمی کی شدت کی وجہ سے ایرنا صرف غنودگی کی حالت میں لیٹی ہوئی تھی، اسے نیند نہ آ رہی تھی باہر آندھی زور زور سے چل رہی تھی، دروازے اور کھڑکیوں کے کھلنے اور بند ہونے کی کرخت آوازیں آ رہی تھیں اور یہاں سب لوگ گہری نیند سو رہے تھے، دونوں لڑکیاں نیند میں بالکل مدہوش نظر آ رہی تھیں ایرنا اپنے والد کی طرح چھت سے بہت وحشت زدہ ہو گئی تھی اور وہ بھی کھلی فضا میں سونا پسند کرتی تھی۔

اس کی آنکھ پھر جھپک گئی۔ یکایک اس کے کانوں میں دروازہ کھولنے کی آواز پڑی۔ اس نے سوچا کہ ہوا کے جھونکوں سے دروازہ کھل گیا ہوگا اور یہ سوچ کر وہ سو گئی۔ کھجور کا پنکھا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گرا۔

دونوں کمروں کے بیچ کا دروازہ آہستہ سے کھلا، کوئی اجنبی آدمی سلاتا کی ماں کے کمرے سے لڑکیوں کے کمرے میں آ رہا تھا لیکن یہ آنے والا کوئی مرد معلوم ہوتا تھا۔ کمرے میں نیچے اوپر ہر طرف چھوٹے بڑے سائے نظر آ رہے تھے سڑک کی لالٹین کی ایک ہلکی سی کرن، کھڑکی میں سے داخل ہو کر کمرے کے ایک گوشہ کو منور اور روشن کر رہی تھی آنے والا شخص اس کرن کی روشنی میں بخوبی دیکھ سکتا تھا کہ ایک لڑکی پلنگ پر سو رہی ہے اور دو زمین پر۔

پہلے وہ پنجوں کے بل سحانا کے بستر کے پاس گیا وہ بہت گہری نیند لے رہی تھی، وہ جھک کر دیکھنے لگا کہ وہ لڑکی کوئی زیور تو پہنے ہوئے نہیں ہے۔ لیکن اس کے جسم میں کوئی زیور نہ تھا، وہ ایک روشن خیال سنتو سال

کی ناکتخدا لڑکی تھی، اکثر اس عمر میں جوان لڑکیاں یکایک دنیا اور اس کی دولت سے ایک قسم کی نفرت کرنے لگتی ہیں اور وہ تارک الدنیا بن جانے کے خواب دیکھنے لگتی ہیں۔ وہ بالکل سادہ لباس پہنتی ہیں۔ اور زیور اتار کر پھینک دیتی ہیں سجاتا زندگی کی اسی منزل سے گذر رہی تھی۔

وہ شخص وہاں سے ہٹ کر اپرنا کے پاس پہنچا اس کے جسم پر البتہ کئی زیور تھے، کیونکہ وہ اپنے متمول والدین کی تنہا بیٹی تھی، اس کی کمر میں ایک قیمتی طلائی کمربند ہاتھوں میں سونے کے کڑے اور چوڑیاں تھیں۔

اس شخص نے ٹارچ لائٹ نکالکر زیوروں کو اچھی طرح دیکھا، اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ قیمتی ہیں اور آسانی سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس نے ٹارچ جیب میں رکھ لی اور احتیاط سے کڑے اتارنے لگا۔ کڑے اپرنا کی گول اور خوبصورت کلائیوں میں بہت تنگی سے چڑھے ہوئے تھے۔ اس شخص نے جلدی میں کڑے کو ذرا تیزی سے اتارنے کی کوشش کی، اس ذراسی عجلت سے اپرنا جاگ پڑی، کیونکہ وہ بہت اچاٹ سی نیند سو رہی تھی، اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اور اٹھ کر چٹائی پر بیٹھ گئی۔

اگر ایک معمولی بنگالی لڑکی آدھی رات کو ایک اجنبی کو اپنی خوابگاہ میں دیکھ لیتی تو شاید بے ہوش ہو جاتی لیکن اپرنا اس سے بالکل مختلف تھی، ایک بات تو یہ کہ وہ صوبہ متحدہ میں رہ کر دلیر بن گئی تھی دوسرے یہ کہ وہ اکثر ڈاکوؤں اور چوروں کو دیکھ چکی تھی، چنانچہ جب اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی تو اس آدمی نے زور سے اس کا منہ بند کر دیا تاکہ وہ چلّا نہ سکے۔

لیکن اپرنا اس قدر آسانی سے چپ رہنے والی نہ تھی۔ اُس نے سُجاتا کو ایک لات ماری تاکہ وہ بیدار ہو جائے اور اس اثنا میں وہ اس اجنبی کی گرفت سے چھوٹ جانے کی سعی کرنے لگی، سجاتا نے بھی آنکھ کھول دی اور اس منظر کو دیکھ کر خوف سے بے ساختہ چلا اٹھی۔ اس آدمی نے اپرنا کو چھوڑ دیا اور دوسرے کمرے کے دروازہ کی طرف لپکا۔ اپرنا نے پانی کا لوٹا اٹھا کر پوری طاقت سے اس شخص پر پھینکا۔ لوٹا ٹھیک اس کے سر پر جا کر گرا۔ وہ آدمی چیخ مار کر گر پڑا۔ لیکن فوراً ہی اٹھ کر بھاگا۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے کوئی شدید ضرب نہیں آئی۔

اب گھر کے سارے آدمی بھی ہوشیار ہو چکے تھے۔ دونوں لڑکیاں زور زور سے چیخ رہی تھیں منورنجن بابو اٹھ کر لڑکیوں کے کمرے کی طرف دوڑے اور نتھو نے چور کا تعاقب کیا۔

راسک بابو بھی جاگ پڑے۔ اور جب وہ میز سے نیچے اترنے لگے تو ان کی نظر ایک آدمی پر پڑی جو چار دیواری پر سے پھاندنے کی کوشش کر رہا تھا وہ اٹھ کر اس کی طرف دوڑے اور اس کو پکڑ لیا۔ لیکن وہ آدمی دیوار سے کود کر بھاگ گیا مگر راسک بابو کے ہاتھ میں اس کی قمیص کا ایک ٹکڑا باقی رہ گیا تھا۔ اور دیوار پر خون کے چند دھبے۔ بالائی منزل پر رہنے والے بھی بیدار ہو گئے۔ انھوں نے چراغ روشن کر دیے تھے۔ اور اس پریشانی کا سبب دریافت کر رہے تھے سارے گھر کو پھر ایک بار اچھی طرح دیکھا گیا کہ کہیں کوئی دوسرا چور تو چھپا ہوا نہیں ہے۔ لیکن کوئی نہ ملا۔

اس کے بعد ہر شخص اپنے اپنے بستر پر واپس آ گیا۔ لڑکیوں کی خوابگاہ میں خون کے قطرے پانی میں ملے ہوئے نظر آئے جن کو دھو دیا گیا۔ نتھو نے پہلے تو اس خون کو دھونے سے اختلاف کیا کہ پولیس کے دیکھنے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ لیکن گھر کے اور لوگوں نے اس کی رائے سے اتفاق نہ کیا اور یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ کہ جب چور کچھ لے ہی نہیں گیا تو پھر اس قدر شور و غل مچانے اور پولیس کو اطلاع دینے سے کیا فائدہ!

"تم تو ایک حقیقی طوفان ہو" سجاتا بولی۔ "چور کبھی تم کو فراموش نہ کرے گا"

اپرنا اب بھی جوش اور خوف سے ہانپ رہی تھی "کاش میرے پاس اور کوئی لوٹے سے بہتر چیز ہوتی تو وہ مزہ چکھاتی کہ وہ مجھے کبھی فراموش نہ کرتا" وہ بولی۔

"چور کوئی منچلا بھی تھا" سجاتا بولی "تم نے دیکھا نہیں کہ وہ اپنی ریشمی قمیص کا ایک ٹکڑا نمونے کے طور پر چھوڑ گیا ہے"

"یقیناً یہ بات تو تعجب خیز ہے" اس کی بہن نے کہا "میں نے تو آج تک ایسا چور نہیں دیکھا جو ریشمی قمیص پہنتا ہو۔ معلوم ہوتا ہے اُسے اپرنا سے محبت تھی"

"مجھ سے؟" اپرنا بولی "جیسا کہ تم نے ابھی کہا تھا کہ میں طوفان ہوں اور ایسی نہیں کہ جس سے لوگ محبت کرتے ہیں۔ اگر اُسے محبت تھی تو یقیناً تم حسین لڑکیوں میں سے کسی ایک سے رہی ہوگی"

باقی رات بھی باتوں میں کاٹ دی گئی کسی کو نیند نہ آئی ہر شخص اس امر پر حیرت کر رہا تھا کہ چور کس طرح کمرے میں داخل ہوا۔ آخر کار غسلخانہ کا ایک دروازہ جو گلی میں تھا کھلا ہوا پایا گیا۔ لیکن وہ کس طرح کھولا گیا اس کا جواب کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

جسے کہ دوستوں اور رشتہ داروں کا جمگھٹا لگ گیا کئی روز تک سب کی گفتگو کا صرف ایک ہی موضوع یعنی "چور" تھا۔ رفتہ رفتہ ہر شخص اس کو بھول گیا۔

دو ہفتے گذرے جب رسالہ "بلاسی" کے ایڈیٹر چترنجن بابو، اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے پروف کی تصحیح کر رہے تھے، ان کا مددگار کھاجن مضمون کے پلندوں کو دو حصوں میں تقسیم کر رہا تھا۔ ایک طرف وہ قابلِ اشاعت مضامین رکھ رہا تھا اور دوسری طرف ناقابلِ اشاعت۔ ناقابلِ اشاعت مضامین کی تعداد زیادہ تھی، اور کھاجن اس میں اضافہ کرتا جا رہا تھا۔ ادھر اُدھر چند آدمی منتظر بیٹھے ہوئے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے ایک شخص اٹھ کر کھاجن کے پاس آیا اور ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ "کیا آپ نے میرا مضمون دیکھ لیا ہے۔؟" اس نے منکسرانہ دھیمے لہجہ میں دریافت کیا۔ "ہاں" کھاجن نے مختصر سا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ وہ مضمون اشاعت کے قابل نہیں ہے"۔

یہ سن کر اس شخص کے چہرہ پر انتہائی یاس اور ناامیدی کی کیفیت طاری ہوگئی۔

"آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں"! اس نے کہا "میں نے اس کو بہت محنت اور غور و فکر کے بعد لکھا ہے۔ آپ براہِ کرم اس کو ایڈیٹر صاحب سے ایک نظر دکھالیں تو اچھا ہے"۔

یہ سن کر کھاجن کسی قدر برہم ہوگیا اور سخت لہجہ میں جواب دیا۔ "ہمارا وجود آخر کاہے کے لئے ہے؟ ہم یہاں اسی لئے بیٹھے ہیں کہ ایڈیٹر کو اس قسم کے ناکارہ اور فضول مضامین کو دیکھنے کی زحمت سے بچائیں۔ لیکن اگر وہ خود دیکھنا چاہے تو ہم کو کوئی اعتراض نہ ہوگا" اس نے کاغذ کے بنڈل میں سے ایک نوٹ بک نکال کر مضطرب اور افسردہ مصنف کی طرف بڑھا دی۔

مصنف کے چہرہ پر ایک بار پھر مایوسی کی عمیق لہر دوڑ گئی۔ "خیر کوئی ہرج نہیں ہے۔ اگر آپ کہتے ہیں تو پھر دکھلانے سے کیا فایدہ۔ میں بلاوجہ ایڈیٹر کو تکلیف دینا نہیں چاہتا لیکن براہِ مہربانی اتنا فرمائیے کہ آخر آپ نے اس کو کیوں ناقابلِ اشاعت قرار دیا ہے۔ اس کا پلاٹ بہت دلچسپ ہے۔ اور زبان اور طرزِ نگارش پر میں نے خاص زور دیا ہے"

"میرے محترم دوست" کھاجن نے کہا۔ "آج کل لوگوں کو "حقیقت" اور "اصلیت" کی ضرورت ہے ان کو محض خیالی تخلیق یا رومان سے کوئی لگاؤ نہیں رہا۔ اب لوگ بنگالی ادب سے "رومان" نکال دینے کی سعی کر رہے ہیں۔ میں اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا لیکن ہم تو عوام الناس کے سامنے وہ چیز پیش کرنا چاہتے ہیں جس کی وہ خواہش کرتے ہیں"۔

"تو کیا اس میں حقیقت کی ذرا سی بھی جھلک نہیں پائی جاتی"! غریب مصنف نے پوچھا۔

"ہاں مجھے کہنے دیجئے کہ "حقیقت" سے معرا ہے مثال کے طور پر اس حصہ کو لے لیجئے جہاں ہیرو رات کے وقت، چھپ کر ہیروئن کی خوابگاہ میں داخل ہوتا ہے کیا یہ امر قطعی طور پر غیر حقیقی نہیں ہے۔ کیا تم کو کسی ایسی بنگالی لڑکی کا علم ہے جو ایک چور سے محبت کرنے پر آمادہ ہو جائے گی، وہ تو اپنی چیخوں سے سارا آسمان سر پر اٹھالے گی"۔

"لیکن کیا کوئی استثنائی صورت نہیں ہوتی"! مصنف رمیش نے کہا۔ "ممکن ہے کہ کوئی لڑکی عام اصول کی پابندی سے انحراف کرے"۔

"ہاں یہ بالکل ممکن ہے"۔ کھاجن نے جواب دیا "بعض ایسے لوگ بھی دنیا میں دیکھے گئے ہیں جن کی چار ٹانگیں ہوتی ہیں لیکن ایسا آدمی دنیائے ادب میں ایک ہیرو کی حیثیت سے تو پیش نہیں کیا جاسکتا"۔

رمیش اپنی تصنیف لے کر کھڑا ہوگیا۔ "اچھا تو اب رخصت چاہتا ہوں تسلیم عرض ہے"! اس نے کہا "میں آپ کے ارشاد کے مطابق اس میں کچھ رد و بدل کرنے کی کوشش کروں گا"! اور یہ کہہ کر وہ جانے کے لئے آگے بڑھا۔ اس وقت کھاجن کو اس غریب مصنف پر کچھ ترس آگیا اور وہ بولا "اس کے بعد میرے پاس لائیے۔ طرزِ بیان اور پلاٹ بہت خوب ہے لیکن اس میں ذرا حقیقت کا رنگ بھر دیا جائے تو پھر اس کا معاوضہ بھی قابلِ لحاظ دیا جاسکتا ہے"۔

رمیش باہر چلا گیا۔ دوسرا آدمی بھی جو کسی قدر فاصلہ پر بیٹھا تھا، اٹھ کر باہر آگیا اور جب وہ دفتر کی عمارت کی حدود سے گذر گئے تو اس آدمی نے رمیش کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تم اس قدر رنجیدہ کیوں ہوگئے تم کو شاید معلوم نہیں کہ یہ لوگ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ وہ تمام اچھے مضامین شائع نہیں کر سکتے۔ اگر ایسا کریں تو حجم میں تگنا اضافہ کرنا پڑے گا۔ ان کے کہنے کی پروا نہ کرو۔ اس نے کہا کہ عوام الناس کو "حقیقت" کی ضرورت ہے یہ بالکل غلط اور مہمل بات ہے۔ آخر میں بھی تو عوام الناس میں شامل

ہوں لیکن یقین کرو کہ میں تو اس "حقیقت" اور "اصلیت" سے سخت بیزار ہوں روزمرہ زندگی میں ہم کو اس قدر "حقیقت" سے سابقہ پڑتا ہے کہ ہم کو "افسانہ نگاری" میں اس کو بیان کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے"۔ "تم میرے دوست ہو اور اس لئے مجھے دلاسا دینے کی کوشش کر رہے ہو۔" رمیش نے جواب دیا "انھیں اچھے مضامین شائع کرنے میں کیا امر مانع ہے حقیقی، عمدہ تحریر اس کثرت سے دستیاب نہیں ہو سکتی جیسا کہ تمہارا خیال ہے"۔

"لیکن" ہیتوش کہنے لگا "میں تم سے کہتا ہوں کہ یہ سب فضول باتیں ہیں۔ ہم حقیقی چیزوں کے متعلق افسانے نہیں لکھ سکتے۔ بنگال میں صرف تین چیزیں حقیقی ہیں مثلاً ملیریا، لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ اور تھوڑی تنخواہ کے کلرک۔ ایک شخص کہاں تک ان کے متعلق لکھے گا۔ متعدد لوگوں نے نہایت تفصیل کے ساتھ ان موضوعات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس لئے اب درحقیقت ہم کو "تمثیل نگاری" اور "رومان" ہی کی طرف توجہ کرنی چاہیے"۔

"میں محض تفریح اور شہرت کی خاطر نہیں لکھتا" غریب رمیش بولا "ورنہ مجھے ان مضامین کے رد کئے جانے کا ذرا بھی افسوس نہ ہوتا۔ لیکن میں ایک غریب کلرک ہوں۔ میرے چار بچے ہیں اور میری تنخواہ صرف ساٹھ ہے اگر وہ لوگ یہ افسانہ لے کر مجھے پندرہ روپے دے دیتے تو میں دودھ والے کے دام ادا کر دیتا"۔ "ایسی باتوں کا کون خیال کرتا ہے"! ہیتوش نے جواب دیا "مگر خیر اب اس میں ترمیم و تبدل کر کے دیکھو وہ کیا جواب دیتے ہیں"!

رمیش نے فوراً کوئی جواب نہ دیا بلکہ آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ جب وہ گھر کے پاس پہنچ گیا تو بولا "مگر اس میں ترمیم و تبدل کرنے سے میرا کیا فائدہ ہوگا۔ جو بات میرے لئے حقیقت رکھتی ہے ممکن ہے کہ وہ ایڈیٹروں کی نظروں میں حقیقت سے معرا ہو۔ ہمارا حقیقی زندگی کا تجربہ بالکل کس حد تک محدود ہے۔ جیسا کہ تم نے ابھی کہا ہے۔ ہماری زندگی میں صرف تین باتیں حقیقی ہیں یعنی ملیریا۔ لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ اور ایک غریب آدمی کا کثیر العیال ہونا۔ البتہ ہالی ووڈ کی فلموں کی بدولت ہم کو کچھ حقیقی اور عمدہ پلاٹ مل جاتے ہیں لیکن ایڈیٹر ان کو "بہت زیادہ مغربیت میں ڈوبے ہوئے" کہہ کر نظرانداز کر دیتے ہیں۔ خواہ تم اپنی تمام کوششیں ایک امریکی حسن کو ساڑی میں ملبوس کرنے میں صرف کر دو۔ لیکن وہ فوراً تاڑ لیتے ہیں"

ہیتوش رمیش کے دروازے تک آگیا لیکن اندر داخل نہ ہوا اس کی بجائے آہستہ آہستہ اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ اُسے چائے کی خواہش تھی لیکن وہ غریب رمیش کو تکلیف نہ دینا چاہتا تھا۔ اُسے خیال تھا کہ شاید وہ بیچارہ اس وقت چائے کا انتظام نہ کر سکے۔ ہیتوش اور رمیش لڑکپن میں ایک دوسرے کے ہم جماعت رہ چکے تھے اور جب سے ابتک ان کی دوستی چلی آ رہی تھی۔ رمیش نے بہت جلد شادی کر لی تھی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دن بدن غریب اور غریب تر ہوتا جا رہا تھا لیکن ہیتوش خوش قسمتی سے ابتک کنوارا تھا اور اس لئے وہ زندگی کی دلچسپیوں سے کسی قدر لطف اندوز ہو سکتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ ایک طرح اس کی زندگی بے کیف اور بے معنی عمر تھی تاہم وہ کشمکش حیات اور پریشانیوں سے آزاد تھا۔

شام تک وہ رمیش کو تقریباً بھول گیا تھا۔ لیکن اسی وقت وہ بدقسمت اس سے دو روپے قرض مانگنے آیا۔ چونکہ مہینہ ختم ہو رہا تھا اس لئے ہیتوش اس کی استدعا کو پورا نہ کر سکتا تھا، وہ اس سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے سوچا کہ اس کو کسی نہ کسی طرح اس غریب کی ہمدردی کر کے اس کو پریشانی سے چھڑانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ یہ سوچ کر اس نے اس پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیا۔

منورنجن بابو کے گھر میں چوری ہو کر دو روز گذر چکے تھے رمیش اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو گود میں لئے ہوئے گلی میں سے گذر رہا تھا، اس کی بیوی باورچیخانہ میں مشغول تھی۔ ہیتوش آہستہ آہستہ آیا اور رمیش کے برآمدہ کی مسند پر بیٹھ گیا۔

"یہ تم نے اپنے ماتھے پر پلاسٹر کا پھاہا کیوں لگایا ہے" رمیش نے مضطربانہ انداز سے پوچھا "یہ چوٹ کیسے آگئی"!

ہیتوش زبردستی مسکرانے لگا "حقیقت کی جستجو میں" وہ بولا "لیکن میں اعتراف کرتا ہوں کہ اسسٹنٹ ایڈیٹر نے جو کچھ تم سے کہا صحیح تھا اور تم غلطی پر تھے، تمہیں اپنی کہانی میں ضرور رد و بدل کرنا چاہیئے"۔

رمیش اس کو حیرت سے گھورنے لگا۔ "ایک شرابی کی طرح مجھے نہ گھورو" ہیتوش نے کہا "اپنی بیوی سے کہو کہ میرے لئے ایک پیالی چائے لائے"۔

رمیش آکر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اور آہستہ سے پوچھا "کیا درحقیقت تم چوری کرنے گئے تھے"؟

ہیتوش یہ سن کر برہم ہو گیا اور کھڑا ہو کر بولا "مجھے چوری کرنے کی کیا ضرورت ہے لیکن اس بات کا اعتراف ضرور ہے کہ میں نے ایک گھر میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ تھا جن کا کہنا صحیح تھا بنگالی لڑکیاں رات کو گھر میں گھسنے والے سے محبت نہیں کرتیں"۔

یہ سن کر رمیش کچھ سٹ پٹا سا گیا "لیکن اس حالت میں باہر نہ نکلو۔ شاید تم گرفتار کر لئے جاؤ"۔

"تم بیوقوف ہو" ہیتوش نے جواب دیا "ایک شریف آدمی پر کون تہمت لگا سکتا ہے؟ میں بالکل محفوظ ہوں"۔

(سیتا دیوی)

محشر عابدی بی۔ اے

اے دِل! اے دِل!!

نہ کھا غم ہائے دوراں اے دل! نہ ہو یاوسِ حرماں اے دل اے دل
خدا تیرا نگہباں اے دل اے دل

بہاریں زندگانی کی ہیں فانی! اُٹھا کم بخت لطف زندگانی
زمیں ہے گل بداماں اے اے دل

گلِ مہتاب کی روشن جبیں پر، چنبیلی کی ردائے مرمریں پر
ہوا ہے گوہر افشاں اے دل اے دل

وہ دورِ آرزو کی چیرہ دستی، وہ رسوائی، وہ بے باکی، وہ مستی
وہ لطفِ عہد و پیماں اے دل اے دل

جوانی ہائے دیوانی جوانی، وہ کیفِ مے وہ ذوقِ شعر خوانی
وہ عشقِ فتنہ ساماں اے دل اے دل

بلا سے ہو خفا وہ خوگرِ ناز، بہت رنگیں ادائیں بر سرِ ناز،
ہوئی یہ جنس ارزاں اے دل اے دل

یہ ساغر زہر کا پینا پڑا ہے، کہ مرنے کے لئے جینا پڑا ہے
نہ آئی موت آساں اے دل اے دل

عابد لاہوری

مذہب

شیطان خمار آلود آنکھیں ملتا ہوا اٹھا وسیع کائنات پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی ہر جگہ تقریباً اسی کی بادشاہت پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے کارندے اپنی اپنی جگہ مصروفِ کار تھے۔ دنیا گناہ کے خوبصورت شکلوں میں کھیل رہی تھی۔ شیطان نے مکارانہ مسکراہٹ سے چاروں طرف دیکھا۔ یکایک اس کی نظر دو ننھے بچوں پر پڑی۔ معصومیت کا پاک نور ان کا احاطہ کئے ہوئے تھا۔ ان کی مسرت آمیز مسکراہٹ مقدس فرشتوں کی عبادت سے زیادہ حسین تھی۔ بے فکری اور سادہ لوحی انسان کی گم شدہ بہشت کا تصور دلا رہی تھی۔ محبت سے سرشار دل تمام فضا میں مسرت پھیلا رہے تھے۔

شیطان نے غضب آلود نظروں سے اپنے اردگرد مودب کھڑی ہوئی فوج پر نگاہ ڈالی۔ اس کے لئے ایک انسان کا مسرور و شاد کام ہونا بھی ناقابلِ برداشت تھا۔ اپنے آقا کو غضب ناک دیکھ کر تمام کارکن گھبرا گئے۔ شیطان نے گرج کر کہا "میں ابھی تک اس کمینے انسان کی دنیا میں مسرت کے قہقہے سن رہا ہوں۔ ابھی تک ان میں امن و سکون کے منظر دکھائی دے رہے ہیں۔ ابھی تک محبت اور اخوت کے پھول لہلہاتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ کیا اتنی طاقتوں اور قوتوں کے باوجود تم انسانی مسرت کو تباہ نہیں کر سکے۔ لعنت ہو تم پر۔" تمام محفل خاموش تھی۔ آقا کی خاموشی پر ایک نوجوان شیطان نے جرات کر کے عرض کی۔

"آقا!! آپ یہ مسرت اور شادمانی صرف معدودے چند ہستیوں میں پائیں گے۔ نصف سے زیادہ دنیا ہم نے اپنی راہ پر کر لی ہے ہماری چالوں اور فریبوں کے جال ساری دنیا میں پھیل چکے ہیں۔ بچے کھچے لوگ بھی خود بخود دام میں آ جائیں گے۔" اور وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ شیطان نے بات کاٹ کر کہا "بس خاموش! اپنا جام جہاں نما سامنے رکھتے ہوئے "کیا تم دیکھتے نہیں کہ یہ دونوں بچے کتنے بشاش ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری کوئی طاقت ان کے دل و دماغ کو آلودہ نہیں کر سکتی۔ انسان مٹی کے بنے ہوئے کم ظرف انسان! ہمارے دشمن کمینے انسان کے کم عقل بچے ہوں اور یوں آزادانہ اور مسرت سے معمور دنیا میں پھر رہے ہوں خاکی پتلا ابھی تک بہشتی زندگی کا لطف اٹھا رہا ہے جب کہ ہم ہمیشہ کے لئے راندے جا چکے ہیں جاؤ۔ تم دربار میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتے جب تک ان کو ایک دوسرے سے جدا نہ کر دو۔"

پندرہ برس بعد وہی کارندہ شیطان خوشی خوشی دربار میں داخل ہوا ہے۔ شیطان ڈائری اٹھا کر پڑھتا ہے۔ "مجھے آقا نے انسانی مسرت اور محبت کے خلاف جہاد کرنے کے لئے روانہ فرمایا تھا۔ میرا شکار دو ایسے بچے تھے جن کے دل ابھی دنیا کی ہر آلایش سے پاک تھے۔ جن میں بغض و فساد حسد و رقابت کینے اور غصے کی بو تک نہ تھی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ ان میں جدائی ڈالنی بہت آسان ہے۔ مگر تجربہ پر معلوم ہوا کہ درحقیقت یہ ایک وقت طلب معاملہ تھا۔ بڑی کوششوں کے بعد میں نے ایک بچے کے والد کے دل میں یہ خیال جاگزیں کرایا کہ وہ یہاں سے کسی دوسرے شہر میں چلا جائے۔ مال و دولت کا لالچ، عزت و شہرت کی حرص کے ذریعہ میں نے اس کو پھسلا لیا اور ان میں عارضی جدائی ڈال دی میں یہ کارنامہ لے کر آقا کی خدمت میں پیش ہوا مگر دربار میں مجھے اپنی ناتجربہ کاری پر لعنت ملامت کی گئی اور مجھے دوبارہ حکم ہوا کہ ان کو جا کر دیکھوں۔ دونوں بچے بہت بچپن سے یک جا وقت گزارتے تھے کھیل اور کام میں ایک دوسرے کے شریک اور دکھ اور بیماری میں ہم نوالہ و ہم پیالہ سکول میں ہم جماعت کے ساتھی۔ جدا ہوتے ہی دونوں بیمار پڑ گئے۔ اصل وجہ معلوم ہونے پر دونوں کے والدین نے فیصلہ کیا کہ دونوں کو ایک ہی سکول کے بورڈنگ میں داخل کرا دیا جائے۔ جب میں دربار سے معزول ہو کر نکلا تو میں نے جا کر دیکھا کہ دونوں ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ دونوں کے والدین کا خیال تھا کہ ان کو اعلیٰ تعلیم دلوائیں گے۔ میرا داؤ چلنا ذرا مشکل تھا۔ آخر مجھے ایک بوڑھے استاد کی تجویز سوجھی میں نے ان کے والدین کے دل میں خیال پیدا کیا کہ دونوں کو مذہبی تعلیم دلائی جائے دونوں گھرانے مذہبی حیثیت سے مختلف خیال تھے۔ ابتدائی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ایک لکھنؤ داخل کرا دیا گیا اور دوسرا دیوبند کو روانہ کیا گیا۔ ہر ایک نے اپنے اپنے کالج کی انتہائی ڈگریاں حاصل کر لیں۔ احادیث اور فقہ، تواریخ اور تفاسیر

کا تمام دفتر زیر و زبر کر دیا۔ تحریر و تقریر میں دونوں کی شعلہ زبانیاں یادگار اثر رکھتی تھیں۔ جب مولانا فرزند علی شاہ لکھنؤ سے واپس آئے تو یہاں امن و سکون تھا۔ لوگ اپنے اپنے کاروبار میں مصروف تھے۔ جلدی ہی مولانا نے امام باڑے میں جلسہ کا انتظام کیا اور سنی و ربانی مسلمانوں کے خلاف ایک زہر آمیز تقریر فرمائی۔ خدا و رسول کے قول کے ذریعہ ثابت کر دیا کہ ان لوگوں سے تعلق رکھنا کفر ہے۔ ان سے بات کرنا گناہِ کبیرہ ہے۔

انہیں دنوں مولانا غلام ربانی دیوبند سے واپس لوٹے۔ گھر پہنچ کر اپنے دیرینہ دوستوں سے ملنے کی امید میں مولانا کے مکان پر جا کر دستک دی۔ مگر نوکر کے ذریعہ جواب موصول ہوا کہ میں نے رافضیوں سے ملنے کی قسم کھائی ہے۔ مولوی غلام ربانی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اتنی بڑی دوستی کی امید کے بدلے یہ ہتک آمیز کلمے! اور وہ بھی ایک مولوی کی شان میں بہت ناقابل برداشت تھے۔ اسی دن جامع مسجد میں جلسہ میں وہ تقریر فرمائی کہ شیعوں کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ ان کا سر اعتقاد و عمل منافقانہ اور دائرہ اسلام سے خارج ثابت کرنے میں اپنا تمام زورِ بیان صرف کر دیا۔ وہی دونوں دوست نہ صرف ایک دوسرے کے دشمن ہو چکے تھے بلکہ بنی نوعِ انسان کے دو فرقوں میں ایسی آگ لگا رہے تھے۔ جو ہزاروں بے گناہوں کی جان لینے والی تھی۔ لغت میں جتنی گالیاں ان کو یاد تھیں ایک دوسرے کو سنا رہے تھے۔ ایک ماہ کے اندر اندر شہر بے عقل کے پتلوں میں سیکڑوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے پھر رہے تھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ میرا کام پورا ہو چکا ہے کیونکہ میں نے اپنے استاد کے ایک قول پر عمل کیا "کہ جب کسی عاقل و ذہین انسان کو گمراہ کرنا مقصود ہو تو اسے مذہب کی طرف لے جاؤ" اور میں نے دو انسانوں کی سرشت کے ساتھ پورے دو فرقوں کی محبت اخوت و الفت کو تباہ کر دیا۔ آپ بچشم خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

شیطان نے ڈائری رکھ دی۔ اور ایک ایسی مسکراہٹ جس میں ہزاروں مکاریاں چھپی ہوئی تھیں اپنے خادم جبل نامی کی طرف دیکھا۔ شہر میں کشت و خون کا بازار گرم تھا۔ انسان انسان کے خون کے پیاسے پھر رہے تھے۔ شیطان نے ایک بلند قہقہہ لگایا اور اپنے کارندے کو ایک بلند مرتبہ پر فائز کرتے ہوئے فرمایا "انسان اکمل عقل، انسان جس چیز پر اسے بڑا ناز ہے وہی چیز تو اسی کی گمراہی کا باعث ہے"۔

ظفر خالد قریشی

ایک دائمی جدائی پر

میرا پیارا چھوٹ رہا ہے — رشتۂ الفت ٹوٹ رہا ہے

دل کی حالت پوچھ نہ ہمدم! — کوئی سینہ کوٹ رہا ہے

جوش پہ ہے اب شوقِ ماتم — دل ہے سوزاں آنکھ ہے پُرنم

اے گلِ خوبی باغِ جہاں میں — تو نے بسر کی مثلِ شبنم

جی میں ہے طوفان اٹھاؤں — رو رو کر عالم کو رلاؤں

میرے سدا کے روٹھنے والے! — آج تجھے کس طرح مناؤں

پریت کا بندھن توڑا تو نے — موسے ناتا جوڑا تو نے

من کی نگری سونی کر کے — میرے لئے دکھ چھوڑا تو نے

بیتا کس کو سناؤں پیارے — غم سہتا تھا تیرے سہارے

میں نے کبھی آرام نہ پایا — اب تک دن رو رو کے گزارے

تیرے سوا بیکار ہے جینا — روز پڑیں گے آنسو پینا

ساحلِ بحرِ غم پہ کھڑا ہوں

ڈوب گیا الفت کا سفینہ

سکندر علی وجد

قسمت کی شاہراہ

نوجوان ڈیوڈ ایک غریب گڈریے گاؤں کا رہنے والا تھا مگر قدرت نے اس کی طبیعت میں شاعری بھی ڈال دی تھی۔ ایک رات افلاس و بیکسی کی تنہائی میں اس نے عزم کر لیا کہ اس گاؤں کو جہاں اس کا کوئی ہم مشرب و ہم خیال نہیں چھوڑ دے گا۔ اور جب تک اس کے اشعار ہر کس و ناکس کی زبان پر جاری نہ ہوں گے واپسی کا نام تک نہ لے گا۔

یہ ٹھان وہ رات کے سناٹے و تاریکی میں اپنے باپ کے جھونپڑے میں گیا۔ سب لوگ سو رہے تھے۔ چپکے سے اس نے اپنے کپڑوں کا ایک بقچہ بنایا اور اسے ہاتھ میں لے کر اپنے مولد سے رخصت ہوا۔ تھوڑی دور جا کر وہ اپنے باپ کی بھیڑوں کے پاس سے گذرا جو اس وقت باڑے میں بند تھیں۔ وہ ہر روز انہیں چرایا کرتا تھا مگر اکثر جب وہ اپنے اشعار کو کاغذ کے ٹکڑوں پر لکھنے میں مصروف ہوتا تو ان سے غافل ہو جاتا۔ اور وہ منتشر ہو کر ادھر ادھر آوارہ پھرتیں۔ باڑے کا منظر دیکھ کر وہ کچھ جھجکا۔ مگر نہیں۔ اس کا ارادہ راسخ ہو چکا تھا۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کی مستقبل در مقدر کی کامیابی اس سفر میں مضمر ہے۔ اس کے گاؤں سے ایک رستہ نکلتا تھا جو تقریباً چھ کوس کے فاصلے پر سیدھا ایک بڑی سڑک میں جا ملتا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ یہ سڑک پیرس کو جاتی ہے۔ ساری عمر میں وہ پہلے کبھی اپنے گاؤں سے اتنی دور نہیں آیا تھا۔ سڑک کو دیکھ کر وہ لفظ پیرس کو بار بار اپنے دل میں دہرانے لگا۔ مقام اتصال پر پہنچ کر ڈیوڈ رک گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کدھر کو مڑے۔ دائیں جانب یا بائیں [illegible] کسی ناقابل فہم [illegible] نی تحریک سے [illegible] بائیں ہاتھ کی سڑک پر ہو لیا۔ اس سڑک پر کسی گاڑی کے پہیوں کے تازہ نشان نمودار تھے۔

جب وہ تھوڑی دور چلا تو اسے ایک گاڑی نظر آئی جو [illegible] کوہ میں ایک [illegible] کے کیچڑ میں پھنس رہی تھی۔ کوچوان اور حمال نے ایک شور مچا رکھا تھا اور دو [illegible] کی باگوں کو [illegible] چیخ رہے تھے۔ [illegible] کی ایک طرف شاہراہ پر ایک بڑا جسیم شخص سیاہ لباس پہنے اور ایک نازک بدن خاتون ایک مہین ملکی قبا زیب تن کئے کھڑی تھی۔

ڈیوڈ نوکروں کی بے سلیقگی کو فوراً بھانپ گیا۔ منہ سے کچھ کہے بغیر اس نے ساری مہم کا اہتمام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور نوکروں کو ہدایت کی کہ بجائے گلا پھاڑنے کے وہ اپنا سارا زور گھوڑوں کو حرکت میں لانے پر صرف کریں۔ چنانچہ کوچوان اپنی مانوس آواز سے جانوروں کو اکسانا رہا اور باقی سب نے مل کر ایک ہی بار پہیوں کو اٹھایا۔ ایک ہی متحدہ کوشش سے گاڑی کیچڑ میں سے نکل کر خشک اور ٹھوس زمین پر آ رہی اور حمال اور مسافر اپنی اپنی جگہ جا بیٹھے۔

صرف ڈیوڈ باقی رہ گیا جو عام تذبذب میں پائدان پر ایک پاؤں رکھے کھڑا تھا۔ اتنے میں اس جسیم شخص نے ہاتھ کا اشارہ کر کے کہا "تم گاڑی میں بیٹھنے کی اجازت ہے" آواز کا متکلمانہ لہجہ کچھ ایسا تھا کہ اسے اطاعت کے سوا اور کچھ نہ سوجھا۔ وہ گاڑی کے اندر گھس گیا۔ جاتے ہی اس نے پچھلی نشست پر ایک خاتون کی شکل کو تاریکی میں دیکھا۔ وہ اس کے بالمقابل بیٹھنے ہی کو تھا کہ وہی متکلمانہ آواز پھر آئی "خاتون کے ساتھ اس کے ایک پہلو پر بیٹھ جاؤ" یہ شخص خود اگلی نشست پر جما ہوا تھا۔

گاڑی نے پہاڑی پر چڑھنا شروع کیا۔ خاتون چپ چاپ ایک گوشے میں دبکی بیٹھی تھی۔ ڈیوڈ یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ بوڑھی ہے یا جوان مگر اس ہلکی ہلکی نفیس خوشبو نے جو اس کی پوشاک میں سے آ رہی تھی نوجوان شاعر کے تخیل کو یہ بتا دیا کہ اس پردے میں حسن ضرور پوشیدہ ہے۔ اس صورت حالات سے وہ خوش تھا مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کیونکہ اس کے ہم سفروں نے سکوت مطلق اختیار کر رکھا تھا۔

کوئی ایک گھنٹے کے سفر کے بعد گاڑی ایک آبادی میں پہنچی اور ڈیوڈ کو یوں معلوم ہوا کہ ایک عام سرائے کے سامنے جو اس وقت بالکل تاریک اور بند تھی ٹھہر گئی۔ فوراً ایک حمال نیچے اترا اور نہایت بے صبری سے اس کے دروازے کو کھٹکھٹانے لگا۔ جواب میں اوپر بالاخانے کی ایک

کھڑکی کھلی اور کسی نے سر باہر نکال کر کہا کہ "کون ہو جو ایسے بے وقت پُر امن شہریوں کو دق کرتے ہو۔ جاؤ یہ آرامگاہ اس وقت بند ہے۔"

یہ سُن کر ححال بلند آواز میں بولا "کھولو، نواب صاحب کے لیے فوراً دروازہ کھولو۔" ان الفاظ نے طلسم کا اثر کیا اور وہی آواز اوپر سے چلائی "نواب صاحب ہزار ہا معذرتیں بے شمار معذرتیں قبول فرمایئے ہمیں معلوم نہ تھا کہ آپ تشریف لائے ہیں۔ دیر ہو چکی ہے مگر دروازہ کھلا جا سکتا ہے اور آن کی آن میں آپ اس تمام مہمان خانہ پر بطیب خاطر مسلط ہو سکتے ہیں۔" چنانچہ پھاٹک کھلا اور سرائے کا مالک لرزاں و ترساں، نیم عریاں، چراغ بدست دہلیز پر کھڑا نظر آیا۔ سرائے کا نام "دنیائے سیمیں" تھا۔

ڈیوڈ نواب کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ اس کو حکم ہوا کہ خاتون کو گاڑی سے اتارے چنانچہ اس نے خاتون کا ہاتھ پکڑ اس کو اترنے میں مدد دی۔ دوسرا حکم یہ تھا کہ سارے پیچھے پیچھے مکان کے اندر داخل ہوں۔ ہم ایک لمبے چوڑے ایوان میں داخل ہوئے جس کے وسط میں بلوط کی ایک بڑی بھاری میز لمبائی کے رخ بچھی ہوئی تھی یہ کھانے کا کمرہ تھا۔ وہ بیٹھتے ہی نواب میز کے ایک سرے پر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور خاتون ایک دوسری پر۔ دیوار کے ساتھ ڈیوڈ کھڑا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کس طرح ان سے رخصت کی اجازت لے اور اپنے سفر پر روانہ ہو۔

اتنے میں سرائے کے مالک نے آداب بجا لا کر عرض کیا "نواب صاحب اگر حضور کی آمد کی پہلے سے اطلاع ہوتی تو خورد و نوش کا مناسب انتظام کر دیا جاتا۔ سر دست تو کچھ شراب اور شکار کے ٹھنڈے کباب ہی موجود ہیں۔ اگر حکم ہو تو . . . . . . !"

امیر بولا۔ "بتیاں، بتیاں چاہئیں۔" جس پر سرائے والے نے کوئی نصف درجن بتیاں جلا کر میز پر رکھ دیں پھر کہنے لگا "اگر پسند فرمائیں تو کچھ برگنڈی . . . . . . !"

امیر پھر بولا "نہیں۔ بتیاں، بتیاں، بتیاں چاہئیں۔" اس پر ایک درجن کے قریب اور شمعیں میز پر جگمگانے لگیں۔

تنومند نواب کا موٹاپا اس کرسی میں سما نہیں سکتا تھا۔ اس کا تمام لباس سیاہ تھا حتیٰ کہ تلوار کی نیام اور قبضہ بھی سیاہ تھے۔ اس کے چہرے سے رعونت، تکبر اور استہزا ٹپک رہے تھے۔ اس کی ٹیڑھی مونچھوں کے سرے آنکھوں تک پہنچے ہوئے تھے۔ وہ خاتون بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈیوڈ نے دیکھا کہ وہ نہ صرف نوجوان تھی بلکہ حسین بھی تھی۔

اس نے اس سراسیمہ دلکش حسن کے منظر سے ابھی محظوظ ہونا شروع ہی کیا تھا کہ یہ بھی گونجتی ہوئی آواز اس کے کان میں پڑی "تمہارا نام اور کام کیا ہے؟" اس نے جواب دیا "مجھے ڈیوڈ کہتے ہیں میں ایک شاعر ہوں۔" امیر کی ٹیڑھی مونچھوں کے سروں کو خندۂ تضحیک آنکھوں کے اور بھی قریب لے گیا۔ اور اس نے پھر پوچھا "تمہارا ذریعہ معاش کیا ہے؟" اس نے کہا "میں شاعر ہوں اور گلہ بان بھی ہوں میں اپنے باپ کے ریوڑ چرایا کرتا تھا۔" نواب نے کہا "خوب! تو حضرت گلہ بان اور شاعر! سنئے آپ شاید مقدر کی غلطی سے آج رات خوش نصیبی سے دوچار ہو گئے ہیں۔ یہ خاتون میری بھتیجی ہے۔ یہ ایک بلند پایہ شریف خاندان سے ہے اور تنہا دس ہزار فرانک سالانہ آمدنی کی مالک و حقدار ہے بہ لحاظ حسن کے تم خود اس کا درجہ سمجھ سکتے ہو اور اگر ان اوصاف کی یہ مختصر فہرست آپ کے گلہ بانی مذاق کو کسی طرح پسندیدہ معلوم ہو تو وہ ایک حرف زدن میں آپ کی بیوی بن سکتی ہے۔ آج رات ہی ایک عالی نسب امیرزادے سے جو حسب و نسب اور جاہ و ثروت میں اس کا ہم پلہ تھا اس کی شادی ہونے والی تھی، مہمان موجود تھے، پادری نکاح خوانی کے لئے حاضر تھا مگر عین اُس وقت یہ نیک اختر جو دیکھنے کو ایسی معصوم اور مطیع معلوم ہوتی ہے بھوکی شیرنی کی طرح جھلا گئی۔ اس نے مجھ پر بے رحمی اور آور حرام کی تہمتیں لگائیں۔ اور اس حیرت زدہ مجمع کے روبرو اس نے اُس رشتے کو جو میں نے انتخاب کیا تھا ایک دم قطع کر دیا۔ میں نے ان ہزاروں شیاطین کی جو جہنم آباد کی رونق ہیں اُسی وقت قسم کھائی کہ اس کی شادی اُس آدمی سے کر دوں گا جو واپسی میں سب سے پہلے ہمیں ملے گا خواہ وہ جنگلی ہو چمار ہو یا ڈاکو ہو کوئی بھی ہو۔ اس ثریا جاہ خاتون کی شادی آج ہی رات ایک امر ناگزیر ہے۔ بھیڑیں چرانے والے! تو وہ پہلا شخص ہے۔ اور اگر بفرض محال تو رضامند نہ ہوا تو کوئی اور سہی۔ میں تجھے فیصلے کے لئے دس منٹ دیتا ہوں۔ اس بارے میں مزید گفتگو یا استفسارات میری رنجیدگی کا موجب ہوں گے۔ گڈریئے! صرف دس منٹ اور دیکھو وہ کس قدر جلدی گزر رہے ہیں!"

نواب کے ان الفاظ نے ڈیوڈ کو مبہوت سا کر دیا اور وہ خاتون کی طرف پھرا۔ ایک مکلف رسمی سلام کے بعد اس نے کہا "بیگم صاحبہ آپ نے سُن لیا ہے کہ میں ایک گڈریا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں شاعر بھی ہوں۔ کیا میں کسی طرح آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں؟"

خاتون نے خشک سوگوار آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا مگر گڈریے کے چہرے کی تابناک صداقت جس کو وقت کی اہمیت نے

متانت کا انداز دے دیا تھا۔ اس کا قدسی اور محبت سے لبریز اور رقیق آنکھیں اور شاید مدد اور مہربانی کی فوری ضرورت کا احساس جن سے عمر بھر وہ محروم رہا تھا۔ ان سب نے مل کر اس خاتون پر رقت کا عالم طاری کر دیا اور اس کی آنکھیں یک لخت پُرنم ہو گئیں اس نے دھیمی آواز میں کہا "صاحب! آپ ایک راست باز اور رحم دل انسان دکھائی دیتے ہیں یہ بزرگ میرے چچا ہیں اور میرے اقارب میں صرف یہی زندہ ہیں۔ میں ان کی صورت سے مراساں ہوں۔ اس سے پہلے کبھی میری جرأت نہیں ہوئی کہ ان کی نافرمانی کروں۔ مگر آج رات وہ مجھ کو ایک ایسے شخص کے ساتھ جو مجھ سے عمر میں تین گنا بڑا تھا بیاہنے لگے۔ مجھے معاف کرنا کہ میں تمہاری تشویش و تردد کا موجب ہوئی ہوں بلاشبہ تم ایک ایسے مجنونانہ فعل کے ارتکاب سے جس کے لئے تمہیں مجبور کیا جا رہا ہے انکار کرو گے۔ تمہارے ہمدردانہ الفاظ کا ہزار شکریہ۔ عرصہ ہوا کہ میں نے ایسے الفاظ نہیں سنے!"

یہ سُن کر کوئی ایسا جذبہ جو محض فیاضی اور رحمدلی سے بہت مختلف تھا شاعر کی آنکھوں میں نمودار ہو گیا۔ حُسن کی تازگی اور لطافت نے اُسے مسحور کر لیا۔ اُس پُر اسرار خوشبو نے جو خاتون کے لباس سے آ رہی تھی نئے نئے جذبات اس کے دل میں پیدا کر دئیے۔ گرم جوشانہ نظروں سے اس نے اس کی طرف دیکھا۔ اور خاتون جو ہمدردی اور رحمدلی کی پیاسی تھی جواب میں اس کی طرف جھکی۔ ڈیوڈ بولا "خاتون صاحبہ! مجھے صرف دس منٹ کی مہلت ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ مجھے آپ کی حالت پر ترس آتا ہے نہیں، مجھے آپ سے محبت ہے۔ بہ تقاضائے حالاتِ موجودہ مجھے کوئی حق نہیں کہ میں آپ کی طرف سے بھی کسی محبت کی امید رکھوں مگر پہلے مجھے آپ کو اس ظالم کے پنجے سے چھڑانا ہے اور اس کے بعد محبت خود بخود پیدا ہو جائے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ دنیا میں میرا ایک مستقبل ہے میں ہمیشہ گڈریا نہیں رہوں گا۔ فی الحال میں تندہی سے آپ کی خدمت کروں گا اور کوشش کروں گا کہ آپ کی زندگی کو خوش و خورم بناؤں۔ کیا آپ اپنے مقدر کو میرے حوالے کر سکتی ہیں؟" لڑکی نے جواب دیا۔ "آہ، تو کیا آپ صرف خدا ترسی کی وجہ سے یہ مہربانی کریں گے؟"

"نہیں، محبت کی وجہ سے! دس منٹ کا وقفہ قریباً گذر چکا ہے۔"

"مجھے ڈر ہے کہ آپ اپنے فیصلے پر پشیمان ہوں گے اور مجھے حقیر سمجھیں گے۔

"میری زندگی آپ کی خوشی کے لئے وقف ہو گی۔ اور میں ہمیشہ کوشش کروں گا کہ اپنے آپ کو آپ کے قابل بناؤں" خاتون نے اپنا نرم و نازک ہاتھ چغے کے اندر سے اس کے ہاتھ میں دے دیا اور کہا "میں اپنی زندگی تک کو تمہارے سپرد کرتی ہوں اور محبت شاید اتنی دور نہ ہو جتنی کہ تم نے خیال کیا۔ جاؤ۔ ان سے ہاں کہہ دو۔ ان کی نظروں سے دور شاید میں سب کچھ بھول جاؤں۔"

ڈیوڈ گیا اور نواب کے سامنے کھڑا ہو گیا اس کی تمسخر آمیز آنکھیں اٹھیں اور کلاک کو دیکھنے لگیں "ابھی دو منٹ باقی ہیں تعجب ہے کہ ایک گڈریے کو ایک حسین اور دولتمند بیوی قبول کرنے کے لئے آٹھ منٹ تک سوچنے کی ضرورت پڑی۔ بول او چرواہے کیا تو رضامند ہے؟"

ڈیوڈ نے خودداری کے لہجہ میں جواب دیا "ہاں صاحبزادی نے میری درخواست کو شرفِ قبولیت بخش کر مجھے سرفراز کیا ہے۔"

"واہ بے چرواہے! تو تو کسی بادشاہ کا درباری بننے کے قابل ہے۔ تو خیر اب اس قضیہ کو جہاں تک جلد ممکن ہو ختم ہو جانا چاہئے!"

اس نے اپنی تلوار کے قبضے کو زور سے میز پر مارا۔ سرائے والا آن کی آن میں کانپتا اور سلامیں کرتا ہوا آن موجود ہوا "ایک پادری کو لاؤ۔ سمجھتے ہو نا۔ دس منٹ کے اندر پادری یہاں موجود ہونا چاہئے!" پادری آیا۔ اس نے ڈیوڈ اور اس خاتون کو خاوند اور بیوی بنا دیا۔ نواب نے ایک طلائی اشرفی اس کی طرف پھینکی اور وہ لے کر جدھر سے آیا تھا ادھر چلا گیا۔

پھر اس نے شراب منگائی اور اس سے دو گلاس بھر لئے۔ ایک ڈیوڈ کے لئے دوسرا اپنے لئے اور میز کے سرے پر غیظ و غضب کی حالت میں کھڑا ہو کر اس سے یوں مخاطب ہوا "جناب ڈیوڈ! جب میں اپنی تقریر ختم کر چکوں تب یہ گلاس نوش فرما لینا۔ سنو تم نے ایک ایسی عورت کو بیوی بنا لیا ہے جو تمہاری ساری زندگی کو تباہ اور المناک بنا دے گی اس کی طبیعت میں سیاہی، دروغ بافی اور تباہی پوشیدہ ہیں وہ تمہارے لئے موجبِ شرم و پشیمانی ہو گی میرے ان الفاظ کو اپنی زندگی کی آیندہ خوشیوں کی ایک فال سمجھو اور اب تمہیں اجازت ہے کہ اپنا گلاس پیو آخر کار میں نے تم سے نجات پائی!"

نواب نے اپنا گلاس پی لیا۔ ایک ہلکی مگر دردناک چیخ خاتون کے منہ سے نکلی۔ ڈیوڈ گلاس کو ہاتھ میں لئے تین قدم آگے بڑھا اور

نواب کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اُس وقت اپنے رویہ سے وہ گڈریا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ "آپ نے آج ابھی اپنی لڑکی سے میری شادی کر کے مجھے اپنے برابر کا رتبہ دے دیا ہے۔ کیا مہربانی سے آپ اس معاملے میں جو میں پیش کرنے والا ہوں مجھے اپنا ہم رتبہ و ہم پلہ سمجھیں گے؟"

"بہت اچھا گڈریئے!"

ڈیوڈ نے اپنا شراب کا گلاس نواب کے منہ پر کھینچ مارا اور کہا کہ "آؤ اگر مرد میدان ہو تو میرے ساتھ لڑ کر شجاعت کی داد دو۔ یہی ہماری قسمت کا فیصلہ کرے گی۔"

نواب کے غصے کی کوئی حد نہ رہی۔ اس نے تیزی سے اپنی تلوار کو نیام سے نکالا اور شیر کی سی گرجتی ہوئی آواز میں مہمان خانے کے مالک سے کہا "اس سفلے ناپاک کے لئے ایک تلوار لاؤ۔" غصے کے اس طوفان میں اپنی بھتیجی کی طرف ایک ایسے لہجے میں مخاطب ہو کر جس سے سننے والے کا زہرہ آب ہو جائے وہ چلایا "محترمہ! آپ نے عجیب خدمات میرے سپرد کر رکھی ہیں۔ ایک تو مجھے تمہارے لئے خاوند تلاش کرنا چاہیے اور دوسرے تلاش کے بعد تمہیں فوراً ہی بیوہ بنانا بھی میرے لئے لازمی ہے۔"

ڈیوڈ نے کہا "شمشیر زنی سے تو میں نابلد ہوں" اور مارے شرم کے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"تو میں تم سے گنواروں کی طرح ڈنڈوں سے لڑوں؟ لونڈے میرے پستول کی جوڑی!" جب وہ لائی گئی تو ان میں سے ایک نواب نے ڈیوڈ کی طرف میز پر پھینک دیا۔ اور کہا "جاؤ میز کے دوسرے سرے پر۔ اور خوش ہو کہ تم جیسے سفلوں کو مجھ جیسے کے ہاتھوں مرنے کا شرف حاصل ہونے والا ہے۔"

نواب اور گڈریا دونوں ایک دوسرے کے سامنے میز کے مقابل سروں پر کھڑے ہو گئے

نواب نے سرائے کے مالک سے کہا "تم ایک طرف کھڑے ہو جاؤ۔ اور ہم دونوں کو پستول چلانے کا اذن دو۔"

خاتون نے کہا کہ میں اذن دوں گی۔ پھر وہ ڈیوڈ کی طرف بڑھی اور اس کی پیشانی کو چوما۔ اس کے بعد وہ دیوار کے پاس کھڑی ہو گئی۔

اور دونوں نے اپنے پستول ایک دوسرے پر سیدھے کر کے نشانہ لیا۔

"ایک - دو - تین"

دونوں آوازیں یک بارگی بلند ہوئیں۔ نواب مسکراتا ہوا ایک ہاتھ میز پر رکھے کھڑا تھا۔ ڈیوڈ تھوڑا عرصہ سیدھا کھڑا رہا۔ پھر اس نے اپنا سر آہستگی سے پھیرا اور چکرائی ہوئی آنکھوں سے اپنی بیوی کی تلاش کرنے لگا۔ پھر جس طرح ایک کپڑا کھونٹی پر سے زمین پر آ پڑے اس کا جسم فرش پر گر پڑا۔ خوف اور مایوسی کی ایک ہلکی سی چیخ خاتون کے منہ سے نکلی اور وہ لپک کر اس کے اوپر جھک گئی۔ اور ایک ضعیف ماتمی آواز میں بولی "آہ عین دل کے مقام پر! غضب! اس بے چارے کا دل!" نواب نے جھلا کر قہر آلود آواز میں کہا "بس چلو گاڑی میں۔ سورج نکلنے سے پہلے مجھ کو تمہارا قضیہ ختم کرنا ہے۔ آج رات تمہاری شادی ہو جانا ضروری ہے اب ایک دوسرا آدمی ہمیں تلاش کرنا ہے خواہ وہ چمار ہو یا کہار اور اگر کوئی دوسرا آدمی نہ ملا تو پھر اس نوکر کو جو میزبان ہے تمہارا شوہر بنا دوں گا۔ چلو اٹھو گاڑی میں۔" ذلیل صورت نواب، خاتون اپنی قبا میں راز کی طرح چھپی اور کوچوان اور حمال سب کے سب گاڑی کی طرف جو دروازے پر کھڑی تھی چلے گئے۔ اس کے بھاری پہیوں کا شور اس سوئے ہوئے گاؤں کی گلیوں میں گونجا۔ اور [illegible] میں سرائے کا مالک مردہ جسم کے پاس اپنے ہاتھوں کو مروڑتا کھڑا رہ گیا۔

(ترجمہ) پروفیسر عبد الرحمٰن

تم مجھ سے دور ہو لیکن میری نگاہیں تعینات کے سارے پردے اٹھا کر تمہیں دیکھ رہی ہیں۔ کبھی میں دیکھتا ہوں کہ تم خوش خوش ادھر ادھر پھر رہی ہو۔ اور کبھی دیکھتا ہوں تم خاموش اور اداس ہو کر بیٹھ گئی ہو۔ تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں کہ ان کے سامنے ماحول کا منظر نہیں ہے۔ بلکہ تمہارا خیال انہیں اپنے ساتھ خبر نہیں کہاں لے گیا ہے۔ کبھی مجھے بتاؤ کیا تم بھی مجھے دیکھ رہی ہو؟ میری ہی طرح کیا تم بھی ہزاروں میل کی اس دوری کو ایک ہی نگاہ میں طے کر گئی ہو؟ میری ہی طرح شاید تمہارے دل میں بھی ایک خلا ہے جو کسی طرح پُر نہیں ہوتا۔ اور میری ہی طرح تم بھی مغموم ہو کر جو بیٹھی ہوئی ہو —— [illegible] تک پہنچ کر مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ میں نہیں ہوں بلکہ تم ہی تم ہو۔ مگر جب اپنے اوپر نگاہ ڈالتا ہوں تو تم سے کتنی دور پہنچ جاتا ہوں۔

ساحر رام پوری

رباعیات

(۱)

قائل ہم بھی ہیں دوزخ و جنت کے
معنی کے ہیں مقصد نہیں صورت کے
دوزخ ہے تاریکیاں تری دوری کی
جنت انوار ہیں تری قربت کے

(۲)

اللہ رے وسعت جہان انجم
گم ہوتی ہے عقل درمیان انجم
کیا سامنے ان کے ہے زمیں کی ہستی
شاید ہے یہ گرد کاروان انجم

(۳)

دنیا کے حقوق سے آگاہی کا مذہب ایک
تعلیم خدارسی کا مکتب ہے ایک
تفصیلیں ہیں یہ سب بہانے ورنہ
اللہ کہو کہ رام مطلب ہے ایک

(۴)

جب فصل بہار گل فشاں ہوتی ہے
یا جب برسات ابر باراں ہوتی ہے
فطرت کس درجہ دلستاں ہوتی ہے
اس سال میں دو بار جواں ہوتی ہے

تلوک چند محروم

کوکین کی کہانی

کوکین طبی طریقے بے ہوش کرنے والی دواؤں میں اور اعضا کو سُن کرکے نشتر دینے کے واسطے سب سے تیز دوا ہے۔ اب کلوروفارم کے بجائے اکثر ڈاکٹر کوکین کی پچکاری سے کام لیتے ہیں۔ جب جگہ سُن ہو گئی تو نشتر چلیں۔ یا بجائے مریض کو خبر تک نہیں ہوتی۔ کوکین کے نام سے کام سے کُن سے کون واقف نہیں، سب جانتے ہیں، سب پہچانتے ہیں۔ مگر اس کی اصل اور اس کی حقیقت کے جاننے والے بہت کم ہیں۔ ہارڈی صاحب کی زبانی سنئے کہتے ہیں۔ کوکا بیل سے جس کو طبی زبان میں اری تھراکسی زیلن کہا جاتا ہے ایک قسم کا ست برآمد ہوتا ہے یہ لفظ کوکا رپروزن جوگا، یا کوکا ربروزن ہوگا، امریا ہندوستانی لفظ کھوکا کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔

جب دنیا کی تہذیب زمانے کے گہوارے میں بچپن کے پینگ لے رہی تھی، اس وقت سے پیرو کے بسنے والے اس بیل کے خواص سے واقف تھے اور جب اسپین نے پیرو میں فتح کا جھنڈا گاڑا، اس وقت بھی وہاں اس کا رواج عام تھا۔ اب یہ بیل منڈھے چڑھی اور پیرو سے چلی تو بید مجنوں کی طرح بولیویا، برازیل اور ارجنٹائن تک پہنچ گئی۔ ہر جگہ اس کی کاشت ہونے لگی، اس کے کھیت سمندر کی سطح سے بہت اونچے ہوتے ہیں ہزار سے آٹھ ہزار تک کی بلندی راس آتی ہے۔ اس کی پچاس قسمیں اب تک دریافت ہو چکی ہیں جن میں سے جنوبی امریکا، ہندوستان اور لنکا، ایک آسٹریلیا، اور بقیہ شمالی امریکا میں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ کوکا کے پودے دو فٹ سے دو گز تک کے ہوتے ہیں اور شاخیں ایسی گھنی کہ سیاہ سینگوں کا دھوکا ہوتا ہے۔

اس کے بونے میں کوئی خاص زحمت نہیں ہوتی، جو پودے سائے میں بڑھتے ہیں ان کی پتیاں بہت چھی ہوتی ہیں اسی لئے کوکین رکوکین کے پودے، بڑے تنے والے چھتنار درخت کے پہلو میں لگائے جاتے ہیں جب تین مہینے تک بارش نہیں ہوتی اس وقت وہی بزرگ درخت اپنی آغوش محبت اور اپنے سایۂ عاطفت میں نازک اندام بچوں کو دھوپ کی تپش اور گرمی کی تھکن سے پناہ میں رکھتے ہیں لطف یہ کہ سائے کی وجہ سے پتیاں لانبی چکنی، اور حسین ہوتی ہیں، اور ست کی عمدگی کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ مگر دھوپ میں بڑھنے والی پتیوں میں نشہ زیادہ ہوتا ہے۔

پیرو اور بولیویا میں اس کی دو فصلیں ہوتی ہیں، ایک مارچ میں دوسری مئی میں۔ لاوگ لگانے کے بعد ڈیڑھ برس گزر جاتا ہے۔ تب ست نکالنے کے واسطے پتیاں چنی جاتی ہیں پہلے پانچ برس تک ست کی مقدار بڑھتی جاتی ہے۔ اور دس برس میں نقطۂ کمال تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کے بعد بھی دس برس تک پودوں میں پیداوار کی پوری قابلیت باقی رہتی ہے

عورتیں اور بچے بالغ پتیوں کو چنتے ہیں، ان کی نچلی سطح ماشی رنگ کی اور اوپر والی تہہ زعفرانی رنگ کی ہوتی ہے۔ ایک ایک پتی الگ الگ چنی جاتی ہے اور پھنگیاں چھوڑ دی جاتی ہیں۔ پتوں کی دوسری منزل (BAY) میں ہوتی ہے۔ جہاں پک کھلے ہوئے صاف چبوترے پر ان کے بستر ڈال دئے جاتے ہیں۔ سورج ان کی آگ آرام کرتی ہے، چبوترہ خوب گرم رہتا ہے پتیوں کو گرمی میں بدلی جاتی ہیں پتیاں اور سالیں ہوتی ہیں۔ اس کے بعد چار گھنٹے تک تہہ پڑی ہوئی کھولتی تپکتی رہتی ہیں اب تیسری منزل گودام میں ہوتی ہے جہاں گلے مل مل کر اپنی کہتی سنتی ہیں اور مرجھا جاتی ہیں پھر وہ جست کے ہوا بند ڈبوں میں بھری جاتی ہیں جن کے حاشیے ٹین سے منڈھے ہوئے ہوتے ہیں۔

ہندوستان والے ان پتیوں کو کیتلی میں یا کوئلے والے چولھوں میں سکھاتے ہیں مگر جو طریقہ بھی ہو اصل غرض صرف یہی ہے کہ کم سے کم حدت میں پتیاں اچھی طرح سکھا لی جائیں۔

بولیویا پیرو، ایکاڈر، کولمبیا، نیو گرینڈا کے باشندے کوکا پتی کو چوس کر کوکین حاصل کرتے ہیں۔ پیرو میں پتیوں کے چوسنے کو چاپ چار یا اکولیر کہتے ہیں۔ ہر پیروین ریڈ انڈین رہنے والا پتیوں کے ساتھ یا تو ری چونا لئے رہتا ہے یا ربر کے بٹوے میں کونین کی راکھ رکھے رہتا ہے۔

جن ممالک میں چوسنے کا طریقہ رائج ہے وہاں روزانہ دو تین مرتبہ کام

بند کر دیا جاتا ہے پتیاں ڈنٹھل سے نوچ لیتے ہیں اور یہاں تک چوستے ہیں کہ منہ میں گولی بن جاتی ہے تب تھوڑا سا چونا کھاتے ہیں تا کہ کیا پیدا ہو جائے لطافت!

امریکائی ہندوستانی اس پودے کے عجیب و غریب صفات بیان کرتے ہیں۔ وہ محض اسی کوکین کی بدولت تھکن سے بچتے ہیں اور بغیر کھائے پئے گھنٹوں تازہ دم رہتے ہیں اور نیند بھی اڑی رہتی ہے مگر تکلیف نہیں ہوتی انہیں پتوں کو دم پخت کر کے ایک قسم کی چا بنتی ہے جس کو پی لیجئے تو پورا بوجھ لے کر پہاڑی راستوں پر بلا تکلف چڑھتے چلے جائیے۔ زیادہ استعمال کیجئے تو ویسا ہی نشہ ہوتا ہے جیسا شراب یا بھنگ سے اور عادی ہو جائیے تو جو خرابیاں افیون سے پیدا ہوتی ہیں وہی اس سے بھی ہوتی ہیں۔

کوکین کے پرستار ہاضمہ سے ہاتھ دھو لیتے ہیں، بھوک مر جاتی ہے اور جب نشہ اتر جاتا ہے تو زندگی دوبھر اور جام حیات کڑوا ہو جاتا ہے۔

کوکین کا شیدائی فوراً پہچان لیا جاتا ہے۔ پاؤں میں لڑکھڑاہٹ ہوتی ہے، چہرہ کا رنگ زعفرانی ہو جاتا ہے۔ آنکھیں دھندلی، حلقے سیاہ، ارغوانی دھبے حاشیۂ چشم پر نظر افروز، ہونٹ فرانس کی رقاصہ، ہاتھ مخزن رعشہ اور ایک خاص قسم کی پھٹکار چہرے مہرے پر برستی رہتی ہے۔ مگر دنیا بھی بڑے مزے کی جگہ ہے۔ سمیات کے ایک ماہر جناب وال شودی صاحب فرماتے ہیں کہ تھوڑی سی کوکین صحت بخش ہے

طبی طور پر کوکو پتی کا دھواں دمہ کے واسطے، اس کی دھونی درد گردہ کے لئے مفید ہے اور کوکو مرہم سے پھوڑے پھنسیاں بھی پناہ مانگتی ہیں مگر کوکین دیجئے یا کوئی نشیلا ست عنایت فرمائیے تو مریض شفا پانے سے پہلے ہی ایک نئی بلا میں پھنس جاتا ہے۔ اور نشہ کا عادی ہو جاتا ہے بیہوش کرنے اور سن کرنے کے لئے کوکین بہت عمدہ چیز ہے نیمن نے ۱۸۶۰ء میں سب سے پہلے اس کو ڈھونڈ نکالا تھا اتفاق سے آپ نے کوکین چکھی تو زبان سُن ہو گئی، بس اب کیا تھا، خزانہ ہاتھ آ گیا، کھال سُن کرنے کے لئے اور خاص طور پر پپوٹے بے حس کر دینے کے واسطے کوکین تیر بہدف ہے بعض وقت ڈاکٹر کان کی بیماری میں یا کمی قوت میں بھی کوکین کا استعمال کراتے ہیں۔

پیرو والے اب بھی کوکین کی بڑی قدر کرتے ہیں، مذہبی رسموں اور سورج دیوتا کی پوجا میں کوکا پتیاں چڑھائی جاتی ہیں وہ تو اس حد تک معتقد ہیں کہ اگر پریذیڈنٹ پوجا کے وقت کوکا پتیانہ چبائیں تو دیوتا ناخوش ہو جائیں گے۔ کوکین دلربا ہے، دلکش ہے اس واسطے کہ فوراً ہی تھکن دور ہو جاتی ہے۔ کھانے والے کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، ترنگ میں آ جاتا ہے اور چودہ طبق کی سیر ہونے لگتی ہے بدقسمتی سے جب تک نیا شکار کوکین کے پنجے میں اچھی طرح نہیں آ جاتا اس کے اثرات کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہوتا۔

اور ـــ اور ـــ اور ـــ کی بے تاب تمنا بہت جلد تڑپانے لگتی ہے۔ کوکین افیون سے کئی جوتے آگے ہے۔ اس سے بدحواسیاں بے تابیاں بے تمیزیاں اور بدہضمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بہرا پن، بے اصل خوف، طلسمات کی سیر، واہمہ اور مردہ دلی پیدا کر دینا کوکین کے بائیں ہاتھ کا کرشمہ ہے۔

کوکین کھانے والے کا منہ ہونٹ اور دانت کیسے ہوتے ہیں، جیسے کالا توا، ہاتھ بھی کالا منہ بھی کالا، چونا، رال اور کیمیاوی اثر یہی تینوں اس سیاہی کے ذمہ دار ہیں۔

جب الھڑ نو سیکھیا پہلے پہل کوکین کھاتا ہے تو زبان سُن اور جبلی موٹی ہو جاتی ہے گردن کی رگیں پھڑکتی ہیں، دل دھڑکنے لگتا ہے نبض تیز ہو جاتی ہے۔ اسی کو بھولا شکار ترنگ سمجھتا ہے۔ جی یہی چاہتا ہے کہ اپنی چھوٹی سی دنیا الگ بس جائے کھانے والا، آنکھیں بند کر کے خاموش بیٹھ جاتا ہے اور ہونٹ سی لیتا ہے۔ کان لال ہوں اور گال زرد ہو جاتے ہیں ناک کی پھنگی سرخ ہو جاتی ہے ماتھے اور گلے پر ٹھنڈے پسینے کے موتی رُلنے لگتے ہیں۔

نشہ کی پیمائش مطلوب ہو تو پوروں کی سردی اور پتلیوں کے پھیلاؤ سے ناپ لیجئے۔ یہ حالت چالیس پچاس منٹ تک رہتی ہے جس کے بعد ہی اور اور کی رام رٹن لگ جاتی ہے اور جب تک ورنہ ملے صید ہوس مردہ سا رہتا ہے

گانجے اور بھانگ کے برعکس کوکین کے لئے خاص لوازم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جی چاہے تو سفوف کی چٹکی پھانکئے یا کسی ماکول و مشروب میں شامل کر لیجئے اکثر لوگ پان میں ڈال کر یا چونے میں ملا کر کھاتے ہیں۔ کوکین کے کھانے سے ساری اخلاقی خوبیاں کافور ہو جاتی ہیں اور کوکینی بُرے سے بُرا کام کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں لوٹ لینا، جھوٹ بولنا، ٹھگ لینا اور یہاں تک کہ مار ڈالنا بھی کچھ مشکل نہیں ان کو رقم سے غرض ہے تا کہ روح فرسا پیاس بجھا سکیں۔

دول یورپ و امریکا کی اساسی مساعی کے باوجود بھی کوکین کی ناجائز تجارت میں کوئی کمی نہیں ہے حقیقت تو یوں ہے کہ ممالک متحدہ امریکا میں آئے دن کوکین کے پرستار ہزاروں کی تعداد میں بڑھتے جاتے ہیں ہاں جہاں کہیں برطانوی سایہ ہے وہاں تھوڑی سی کمی ضرور نظر آتی ہے۔

عابد الہ آبادی

غزلیات

(۱)

شبِ فرقت جب اُن کی یاد کا ہنگام آتا تھا
میں جب جی بھر کے رو لیتا تھا تب آرام آتا تھا

دمِ آخر وہ مایوسی غضب موت کی الجھن
یہ سب کچھ تھا مگر لب پر تمہارا نام آتا تھا

ہمیں بھی رشک آتا تھا یہ دل بھی کچھ تڑپتا تھا
لبِ نازک تک اُن کے جب چھلکتا جام آتا تھا

کشاکش میں تھی قسمت جانِ ناتواں اپنی
نہ ہنسنا کام آتا تھا نہ رونا کام آتا تھا

مجھے انکار ہی کرنا پڑا اُن کی محبت سے
سرِ محشر مرے سر مفت کا الزام آتا تھا

مرے وحشت زدہ دل کو نہ یوں برباد کرنا تھا
وہ گو میرا ابھی لیکن تمہارے کام آتا تھا

عزیز اچھا ہوا دل کھو گیا راہِ محبت میں
کسی دن بھی نہ یہ کمبخت اپنے کام آتا تھا

(۲)

گدگداتے ہیں نئے انداز سے
چھیڑ کے دیتے ہیں وہ تیغِ ناز سے

غمزہ کہتا ہے بتِ طناز سے
اور کوئی وار تیغِ ناز سے

میرے قاصد اُن کے دل پر ہو اثر
حالِ دل کہنا کچھ اس انداز سے

کم نہیں میری نگاہِ شوق ہی
لڑ گئی اُن کی نگاہِ ناز سے

اے دلِ ناداں غضب ہم نے کیا
کر دیا آگاہ تجھ کو راز سے

اُن کے نغمے میرے نالے ایک ہیں
ملتی ہے آواز کچھ آواز سے

سیکھ لے تو سیکھ لے اے دل ذرا
ساز کرنا چشمِ افسوں ساز سے

پوچھتے ہیں وہ مرے مرنے کا حال
میرے ہمدم سے مرے دم ساز سے

شیخ کو چونکا دے غافل ہے بہت
قلقلِ مینا ذرا آواز سے

کیا اُٹھیں دبتے ہیں کچھ اٹھتے ہوئے
فتنۂ محشر خرامِ ناز سے

حضرتِ عارف سنائیں کچھ کلام
کچھ تو فرمائیں لبِ اعجاز سے

(۳)

کچھ اس طرح خموش ہیں بزمِ سخن میں ہم
گویا زباں ہی نہیں رکھتے دہن میں ہم

دنیا سے [illegible] ایک پل کو
چھوٹے جہاں قفس سے کہ پہنچے چمن میں ہم

آخر اٹھا کے شورِ قیامت کو کیا بلا
سونے نہ پائے چین سے گور و کفن میں ہم

کیا جذبِ عشق ہے کہ گہِ گرمِ عتاب میں
محسوس کر رہے ہیں حرارت بدن میں ہم

غفلت ترا برا ہو کہ پھر آ گئی بہار
اب تک رفو بھی کر نہ سکے پیرہن میں ہم

رازِ وقار ترکِ وطن میں نہاں ہے کچھ
بے آبرو مثالِ گہر ہیں وطن میں ہم

(۴)

رہا جو اے مرے شوریدہ بخت تو باقی
رہے گی زخمِ جگر کی نہ آرزو باقی

بوقتِ قتل لبِ جانفزا سے ڈرتا ہوں
کہ رہ نہ جائے شہادت کی آرزو باقی

دہن کا وصف ہمیں اس تری خموشی نے
بتا دیا کہ نہیں جائے گفتگو باقی

جو دیکھ لے گا اس سرو کی تو پھر قمری
بھلائے دل سے بجز لفظِ [illegible] باقی

جنوں کے جوش نے کیا ہم کو بے نیاز کیا
نہ جیب ہی رہی نے حاجتِ رفو باقی

سنائی دے گی کسے نفخِ صور کی آواز
جو حشر میں بھی رہی اپنی ہاؤ ہو باقی

دکھا دے بارِ خدایا وہ رنگِ بیرنگی
خیال میں رہے نے دل میں وہم تو باقی

ہزار طرح سے ڈھونڈا ترا پتہ نہ ملا
نہ جستجو کریں اب ہے یہ جستجو باقی

اگرچہ اس کو بھی کہتے ہیں آرزو لیکن
رہے نہ کوئی مرے دل میں آرزو باقی

گلے سے ملتے ہی فرہاد کے ہوا ثابت
کہ تیغِ یار میں الفت کی کچھ ہے خو باقی

(۵)

ہاں کوئی تیر مگر موت کا ساماں ہو جائے
یوں چھپے دل میں کہ پیوستِ رگِ جاں ہو جائے

ہوشیار اے دلِ خاموش سحر ہوتی ہے
اب ذرا دیر کو ہر چیز پریشاں ہو جائے

یہ تو سمجھو مجھے دیوانہ سمجھنے والو
اُس پہ ہنستے ہو محبت میں جو نالاں ہو جائے

یا رب اتنی بھی نہ بڑھ جائے مری مایوسی
ہنس کے دیکھے وہ مجھے اور پشیماں ہو جائے

ہاں ترے ضابطۂ حسن میں فرق آئے گا
ہاں بگڑے کیا کوئی کمبخت پریشاں ہو جائے

جا پڑی تھی یوں دامن پہ نگاہِ وحشت
میں نے یہ تو نہ کہا چاک گریباں ہو جائے

پھر ذرا کوئی اسی طرح سے ہنس دے قمر
پھر مداراتِ دلِ سوختہ ساماں ہو جائے

انگوٹھی

ایک چھوٹی سی کہانی

میری اور زہرہ کی نسبت بچپن سے ٹھہری ہوئی تھی۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ ہم دونوں ایک دعوت میں گئے زہرہ کی بے چینی اور اضطراب، شرمیلی اور نیچی نگاہوں نے جو بار بار یوسف کا تعاقب کن آنکھوں سے کر رہی تھیں کبھی کا یہ راز افشا کر دیا تھا کہ اُسے صاحب خانہ کے لڑکے سے محبت ہے

رات کو کوئی گیارہ بجے ہم واپس ہوئے۔ رات بہت ٹھنڈی تھی۔

میں نے اُس سے کہا "آج کا موسم کتنا خوشگوار ہے"؟

وہ اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔

میں نے تھوڑی دیر بعد پھر کہا۔ "آج کی دعوت خوب رہی"۔

وہ چونکی۔ اتفاقاً اس کی نظریں میری انگوٹھی پر پڑیں جو ہماری منگنی کی یادگار تھی۔

اُس نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اس کی نظریں خود بخود جھک گئیں۔

میں نے کہا "یہ انگوٹھی میرے تنگ ہو گئی ہے۔ مجھے اس کے پہننے میں تکلیف ہوتی ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہو سکتی ہے"؟

"ہاں۔ کیوں نہیں"؟ اس نے بے دلی سے جواب دیا۔ ..... "مجھے دے دو"۔

میں نے انگوٹھی اُسے دے دی۔

ایک مہینے کے بعد ہم پھر ملے۔ مجھے خیال آیا کہ زہرہ سے انگوٹھی کی نسبت دریافت کروں لیکن ایک مہینہ تو بہت کم مدت ہے۔ اسے اور وقت ملنا چاہئے۔

کمرے میں کانس پر یوسف کی تصویر رکھی تھی۔ اس نے اس کی طرف دیکھا۔ پھر خود ہی کہنے لگی۔

"ہاں۔ وہ انگوٹھی وہ کم بخت بڑی منحوس ہے بس اُس کو کہیں کسی کونے میں رکھ کر بھول گئی۔ .... وہ کھو گئی"۔

وہ میرے جواب کا انتظار کرنے لگی۔

"کیا تم خفا ہو"؟

"نہیں" میں نے کہا۔

پورا ایک سال گذر گیا۔

میں اور زہرہ ایک دن پھر پرانی اور رومانوس جگہوں میں ٹہل رہے تھے کہ اُس نے کہا۔

"تمھاری وہ انگوٹھی مجھے پھر مل گئی۔ اُف میں نے اسے کتنا ڈھونڈا اور کتنی تکلیف اٹھائی ...... اور ہاں نا۔ اب میں بہت خوش ہوں ....؟ ذرا سے وقفے کے بعد وہ پھر بولی،

"میں نے اسے ٹھیک بھی کرا دیا ہے۔ اب یہ کبھی تمہاری انگلی میں تنگ نہیں ہوگی ...... لو"۔

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی اور پھر انگوٹھی کو دیکھا میں نے کہا۔

"افسوس! یہ انگلی ہے ہی کمبخت۔ اب یہ بہت بڑی ہو گئی ہے"۔

صوفی

دنیائے ادب

اردو

خدا روح اور گوئٹے

ایک زمانہ تھا کہ "خدا" اور "روح" کے معنی تھے جو انسان بخوبی سمجھ سکتا تھا۔ خدا کو آنکھوں سے دیکھ سکتا تھا۔ اس کی آواز کانوں سے سن سکتا تھا۔ اس کے اشاروں پر کٹ پتلی کی طرح عمل کر سکتا تھا۔ خدا اور روح کے معنی مقرر و معین تھے۔ دونوں دیکھی بھالی چیزیں تھیں۔ سب کو معلوم تھا خدا کیا ہے۔ روح کیا ہے۔

اب وہ زمانہ نہیں رہا۔

انسان نے ایک نئی راہ اختیار کی ہے۔ علم بڑھ گیا ہے معرفت گھٹ گئی ہے۔ یوں تو آج بھی خدا اور روح کے الفاظ بجنسہٖ موجود ہیں مگر ان کے معانی مٹتے مٹتے ناپید ہو گئے ہیں۔

پہلے خدا کیا تھا؟

درخت، پتھر، آگ، پانی، چاند، سورج، زمین، آسمان، سانپ، بچھو، بندر، ہنومان، بن مانس، گوریلا، انس الا بلا سب خدا تھا۔

روح کیا تھی؟

سانس تھی، ہوا تھی، خون تھی، موج تھی، کبوتر تھی، مقناطیس تھی، بجلی تھی، ذرہ تھی، غبار تھی،

اب فلسفہ نے خدا اور روح کے معنوں کو کوٹ کر پیس کر راکھ بنا دیا ہے۔ اڑتی ہوئی راکھ، مع اس ہوا کے جس میں یہ مل گئی ہے ہمارا خدا اور ہماری روح ہے۔

پہلے خدا مجسم تھا۔
اب مطلق ہے۔

پہلے روح مجسم تھی۔
اب بسیط ہے۔

مطلق اور بسیط، گویا مجسم خدا اور روح کے معنوں کی چھنی ہوئی راکھ ہے جو عالمِ خیال کی فضا میں اڑ رہی ہے۔ چاند کے معنی چاند اور سورج کے معنی سورج ہیں۔ پہلے بھی ان کے یہی معنی تھے اور اب بھی یہی معنی ہیں مگر لفظِ خدا کے معنی پھیلتے پھیلتے بدلتے بدلتے، مٹتے مٹتے، ہاں سے نہیں اور ہست سے نیست ہو گئے ہیں۔

خدا کا انکار معزلی ملحدوں کا کارنامہ نہیں اس کا سہرا گوتم بدھ اور جارو ک کے سر ہے۔

زید کہتا ہے کہ خدا سب کچھ ہے مگر مٹی نہیں، پتھر نہیں، زمین نہیں، آسمان نہیں، یہ نہیں، وہ نہیں یعنی سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں۔
زید کہتا ہے خدا وہ نہیں جو ہمیں معلوم ہے اور جو ہمیں معلوم ہے وہ خدا نہیں۔

یا مظہر العجائب۔

خدا خیال ہے
اور خیال کیا ہے؟
خیال کسی شے کا ہوتا ہے مگر خدا کوئی شے نہیں۔
خدا خیالِ مطلق ہے
اور خیالِ مطلق کوئی شے نہیں۔
خدا ایک مغالطہ ہے۔
اور مغالطہ کوئی شے نہیں
خدا سمیع و بصیر و کلیم ہے مگر اس کے کان نہیں آنکھیں نہیں، زبان نہیں۔

ہمارے خیال میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس کا تعلق کسی دیکھی بھالی چیز سے نہ ہو کوئی خیال ہمارے دماغ میں آ نہیں سکتا جو دیکھی بھالی سوچی سمجھی چیز سے متعلق نہ ہو۔ خدا کے معنی خواہ مادی ہوں یا غیر مادی مجسم

ہوں یا مطلق، روحانی ہوں یا خیالی، سب دنیا کی قوتوں سے جڑے ہونگے اگر ہم خدا کو سمجھ لیں تو وہ آگ پانی یا مٹی یا بجلی کی سی کوئی چیز ہوگی یا محض خواب و خیال ہوگا صاف لفظوں میں یوں کہئے جہاں تک ہماری سمجھ کا تعلق ہے خدا ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ المانی شاعر گوئٹے کہتا ہے:۔

"جس نے خدا کو سمجھ لیا اس نے دھوکا کھایا"

خدا کی تعریف میں مشرقی شعرا نے بہت کچھ لکھا ہے بے محل نہ ہوگا اگر اس معنوی مضمون میں گوئٹے کا بھی شاعرانہ و ملحدانہ نظریہ پیش کر دیا جائے بقول شخصے تعرف الاشیاء باضدادہا۔

گیٹے کی شہرۂ آفاق تصنیف "فوسٹ" کی نسبت علمائے ادب کا خیال ہے کہ اس میں شیکسپیر کی بلند نظری اور حافظ کی شیرینی جمع ہے یہ وہ شاعر ہے جس نے خدا سے بغاوت کی اور دنیائے شعر و تخیل میں ایک ہیجان پیدا کر دیا ایک جگہ لکھتا ہے۔

"اے خدا! اے غیر فانی ہستی! اے وسیع آسمان کے بسنے والے ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دے کہ ہم نڈر ہو کر زمین پر زندہ رہ سکیں اور تو براہِ نوازش اپنی وسیع آسمانی قلمرو پر قانع رہ"۔

دوسری جگہ لکھتا ہے۔

اے خدا اگر تو چاہے تو اپنے آسمانوں کو گھٹاؤں سے، کہر سے اور دھند لکے سے بھر دے، اور جس طرح بچے پھولوں اور پتوں سے کھیلا کرتے ہیں اسی طرح تو بھی پہاڑوں کی چوٹیوں سے کھیلا کر لیکن میری زمین کو اس کی حالت پر چھوڑ دے۔ میری جھونپڑی تو نے نہیں بنائی۔ میرا چولھا تو نے نہیں بنایا۔ نہیں نہ گرا۔ آہ میرے چولھے کے انگاروں کی چمک تیرے دل میں کیوں رشک کی آگ بھڑکاتی ہے۔

ایک اور جگہ لکھتا ہے۔

"میں تیری عزت کرتا ہوں۔ یہ کیوں؟ کیا تو نے کبھی بوجھ اٹھانے والوں کا بوجھ ہلکا کیا؟ کیا تو نے کبھی غمزدوں کا غم دور کیا؟"

ایک اور جگہ لکھتا ہے:۔

"میں یہاں بیٹھا ہوا اپنی قسم کے انسان پیدا کر رہا ہوں میری طرح کے انسان تکلیفیں اٹھانے کے لئے، صدمے سہنے کے لئے، رونے کے لئے، ہنسنے کے لئے اور تجھ سے اعراض کرنے کے لئے ہیں"۔

ایک اور جگہ لکھتا ہے۔

"اے خدا! اس سورج تلے تجھ سے بڑھ کر کون بھوکا بھکاری ہوگا تو نے اپنی عظیم الشان ہستی کو قربانیوں کے خون اور منتوں کے گوشت پر قایم رکھا ہے۔ بلاشبہ تو خود بھوک سے مر جاتا اگر انسان جاہل اور احمق نہ ہوتا"۔

"ماہِ تمام"

ساون کے مہینے

فردوس بناتے مرے ساون کے مہینے
اک گلرخ و نسریں بدن و سرو سہی نے

ملتے پر ادھر کاکلِ شب رنگ کی لہریں
گلشن پر ادھر ابرِ خراماں کے سفینے

شاخوں پہ لٹیں اپنے جھٹکتے ہوئے شہپر
لہروں پہ لپٹیں اپنے ابھارے ہوئے سینے

گیتی سے ابلتے تھے تمنا کے سلیقے
گردوں سے برستے تھے لگاوٹ کے قرینے

شیشوں پہ کھنکتی ہوئی بوندوں کی صدائیں
پُروائی کے دھارے پہ ملاردں کے سفینے

اللہ رے طوفانِ خرامِ لبِ ساحل
رنگین تھے تالاب کے ترشے ہوئے زینے

مینہ جتنا برستا تھا سرِ دامنِ کہسار
اتنے ہی زمیں اپنے اگلتی تھی دفینے

بدلی تھی فلک پر کہ سیہ مست جوانی
بوندیں تھیں زمیں پر کہ انگوٹھی کے نگینے

کیا نغمہ چھلکتی ہوئی کلیوں میں بھرا تھا
اک محشرِ گفتار کی شیریں سخنی نے

کیا رقص پہ کونین کو مجبور کیا تھا
سبزے پہ چھلکتی ہوئی ساون کی جھڑی نے

بھر دی تھی ہر اک خار میں روحِ گل و نسریں
اک غنچۂ نورس کی مسیحا نفسی نے

تھا، یا تو یار شاد، کہ اس مست ہوا میں
ہم منہ سے نہ بولیں گے اگر پی نہ کسی نے

یا سکرِ تبسم تھا، نزاکت کے لبوں پر
طوفان اٹھائے تھے، مری بادہ کشی نے

اللہ رے وہ لب جس لبِ گلرنگ کے آگے
ڈالی تھی سپر رنگِ عقیقِ یمنی نے

بارش تھی لگاتار تو یوں گرد تھی مفقود
جس طرح سے ناب سے دُھل جاتے ہیں کینے

وہ زینتِ آغوش تھا، جس کے لئے برسوں
مانگی تھیں دعائیں مرے آغوشِ تہی نے

دم بھر کو بھی تھمتی تھیں اگر مست ہوائیں
آتے تھے جوانی کو پسینے پہ پسینے

اس فصل میں اس درجہ رہا بیخود و سرشار
میخانے سے باہر مجھے دیکھا نہ کسی نے

کیا لمحۂ فانی تھا، کہ مڑ کر بھی نہ دیکھا
دی کتنی ہی آواز، حیاتِ ابدی نے

اے جوشؔ! ہر اک سانس تھی اک عمرِ گرامی
جنت میں بھی یاد آئیں گے یہ چند مہینے

"زمانہ"

روسی

خیرات

ایک بڑے قصبے کے قریب فراخ سڑک پر ایک بڈھا بیمار آدمی جا رہا تھا چلنے میں اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے! اس کی کمزور ٹانگیں رُکتی، ہچکچاتی، ڈگمگاتی اس مصیبت او ناتوانی کے ساتھ حرکت کر رہی تھیں جیسے اسے ان پر کچھ اختیار نہ ہو، اس کے کپڑے چیتھڑے بن کر اس کے بدن پر لٹک رہے تھے، اس کا ننگا سر جھک کر اس کی چھاتی سے آلگا تھا۔ وہ بالکل تباہ ہو چکا تھا۔

سڑک کے کنارے وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا، آگے کو جھکا، اپنی کہنیاں اپنے گھٹنوں پر جھکا دیں، اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اور اس کی گُنٹھل انگلیوں میں سے چھن چھن کر اس کے آنسو خشک زمین پر گرنے لگے اُسے یاد آرہا تھا . . . .

یاد آرہا تھا وہ زمانہ جب وہ بھی طاقتور اور امیر تھا، اور اس نے اپنی صحت کو برباد کر لیا اور اپنی دولت کو دوسروں پر، دوستوں اور دشمنوں پر صرف کر ڈالا . . . اور آج وہ روٹی کے ایک ٹکڑے تک کو محتاج تھا! اور دوست دشمن سب نے اسے چھوڑ دیا تھا . . . . کیا اسے بھیک مانگنا چاہیے! اس کا دل تلخی اور ندامت سے بھر گیا۔

اس کے آنسو اب تک فرشِ خاک پر گر گر کر اسے داغدار کر رہے تھے یکایک اس نے کسی کو اپنا نام لے کر بلاتے ہوئے سنا، اس نے اپنا تھکا ہوا سر اٹھایا۔ اور اپنے سامنے ایک اجنبی کو کھڑا ہوا دیکھا۔

ایک پُر سکون اور سنجیدہ چہرہ لیکن اس میں سختی نہ تھی، آنکھیں روشن نہ تھیں لیکن صاف سینے میں اتر جانے والی نگاہ، لیکن بے مہر نہیں۔

ایک مطمئن لہجے میں اُس نے کہا "تو نے اپنی تمام دولت خرچ کر ڈالی، لیکن اپنی نیکی پر یقیناً تجھے افسوس نہ ہوگا؟"

ایک آہ بھر کر بڈھے نے کہا "مجھے افسوس نہیں، لیکن دیکھو تو اب میں کس برے حال میں ہوں!"

اجنبی نے کہا "لیکن اگر مانگنے والے نہ ہوتے جو تیرے سامنے اپنے ہاتھ پھیلاتے تو تجھے اپنی نیکی کے اظہار کا موقع نہ ملتا! تو نیکی نہ کر سکتا۔"

بڈھے نے کچھ جواب نہ دیا اور سوچنے لگا۔

اجنبی پھر بولا "سو اب تو مغرور نہ ہو اے غریب آدمی۔ جا تو بھی اپنے ہاتھ پھیلا؟ اور نیک لوگوں کو تو بھی موقع دے کہ وہ اپنی نیکی کا ثبوت دیں۔"

بڈھا یہ سن کر چونک اٹھا اس نے اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں . . . لیکن اجنبی وہاں موجود نہ تھا۔ دور سڑک پر اُسے ایک آدمی آتا ہوا دکھائی دیا۔

بڈھا اُس کے پاس گیا اور اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا۔ یہ شخص تیوری چڑھا کر گذر گیا اور اس نے اسے کچھ بھی نہ دیا۔

لیکن اس کے بعد ایک اور آدمی ادھر سے گذرا، اور اس نے بڈھے کو ایک پیسہ دیا۔ بڈھے نے اس پیسے کی ایک روٹی خریدی، اور مانگ کر حاصل کیا ہوا لقمہ اسے شیریں معلوم ہوا۔ اب اُسے شرم محسوس نہ ہوتی تھی بلکہ اس کے برعکس مسرت اور اطمینان نے اس کے دل میں گھر کر لیا۔

منصور احمد

انگریزی

جستجو

(۱) لوگوں نے کہا وہ تو چل بسی، شاید!!
میں نے موت کے سیاہ پردہ دل کو، موٹے پردہ دل کو اپنی
نازک انگلیوں سے پھاڑ ڈالا۔
مگر تُو وہاں نہیں تھی

(۲) بارش ہو رہی تھی بھیانک رات میں! تاریکی نے پر کھول
رکھے تھے، موت کی طرح!!

میں دیوانہ وار قبرستان میں گیا مگر وہ دروازہ مقفل تھا میری خاموشی کی مگر

(۳) ہوشیار رہ میں تیرے پاس آرہا ہوں — آسمانوں پر !!
شراب و محبت کی اس حسین واری میں !!
شباب و عشق کی اس بستی میں !!!
جہاں تو مجھ سے روٹھ کر، خلوت کدہ روپوش ہے
میری اگر تو غم کدہ بن وہاں بھی نہ ملی تو؟ —— (واحد قریشی)

بوڑھا فلسفی

دولت کی میری نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں۔
میں جذباتِ محبت کو بھی ٹھکراتا ہوں۔
شہرت میرے نزدیک ایک خواب کی سی موہوم چیز ہے جو
طلوعِ آفتاب کے ساتھ ہی غائب ہو جاتی ہے۔

اگر میں کوئی دعا مانگتا ہوں
جو رہ رہ کر میرے ہونٹوں پر مچلتی ہے
تو وہ یہ ہے۔

اے خدا! میرے دل کو آزادی کی نعمت سے بہرہ یاب کر

زندگی کے تیز رفتار دن گذرتے جا رہے ہیں۔
اور میں صرف یہی چاہتا ہوں
کہ خدا مجھے زندگی اور موت میں ایک ایسا آزاد دل عطا
کرے جو آزادی کی خاطر ہر مصیبت برداشت کر سکے۔

تابش صدیقی

چینی

رخصت

اُس کے ریشمی لباس کی سرسراہٹ خاموش ہو چکی
اور صحن کا مرمریں فرش گرد و غبار سے بھر گیا
اب قدموں کی ہلکی ہلکی شیریں صدا کبھی نہیں سنائی دی
دروازے کے سامنے
خشک پتوں نے گر گر کر ڈھیر لگا دیے یہاں تک کہ دروازے
کا راستہ بھی رک گیا......

کیونکہ وہ میری پیاری، میری محبت کی جان
ہمیشہ کے لئے چلی گئی تھی
اب میں ایک دردناک اور غمگین فضا میں تنہا رہ
گیا ہوں۔

مہدی علی خاں

مدراسی

محبت کا گیت

عورت کے جذبات

بین کی آواز پرست ناگن کی طرح
میرا دل تیری طرف لپکتا ہے ـــ اے میرے مرکزِ الفت بادہ
نشب ایک بادۂ عشق سے سرشار عاشق کی طرح
تیرے باغ کے گلوں اور غنچوں سے چھیڑ کرتی ہے اور تیرے
رنگا رنگ کے پکے ہوئے پھلوں کی سرسبز شاخوں پر خوشنما طوطے بیٹھے
آپس میں چہ میگوئیاں کرتے ہیں۔

مرد کے جذبات

تیرا دل میرے پہلو میں اس طرح نہاں ہے۔
جیسے ایک پھول میں خوشبو ـــ اے میرے رازِ الفت وہ
ایک چمکیلے موتیوں کے ہار یا جگمگ کرتے ہوئے ہیرے کی طرح ہے۔
یا ایک معصوم فاختہ کی طرح
جو دور ایک درخت پر اپنا نشیمن بناتی ہے۔
آرام سے نیند کر اے میرے چاند!
حتیٰ کہ صبح اپنے سنہری خیمے سفید میدانوں میں گاڑ دے۔

حسن عباس

نقد و نظر

مصحفی کے تذکرے

انجمنِ ترقی اردو، اورنگ آباد دکن نے اردو کے مشہور استاد اور شاعر مصحفی کے تین نایاب تذکرے شائع کئے ہیں مصحفی نے بڑی لمبی عمر پائی اس لئے یہ تذکرے ایک پورے دور کی شاعری کی تاریخ کی حیثیت رکھتے ہیں، اور دور بھی وہ دور جس میں اردو زبان نے بڑی ترقی اور فروغ حاصل کیا۔ اس نے یہ تذکرے صاف اور سیدھی زبان میں لکھے ہیں، تصنع اور عبارت آرائی سے بالکل کام نہیں لیا۔ اسی لئے بڑی حد تک یہ تذکرے معتبر اور مستند ہیں۔ شعرا کے حالات کے ضمن میں اُس زمانے کی شاعری اور ادبی تحریکات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اگرچہ پرانے تذکروں کی طرح شعر پر تنقید ان تذکروں میں بھی کم ہے۔ لیکن بعض نامور شعرا کی نسبت مصحفی کی رائے خاص وقعت رکھتی ہے پہلا تذکرہ فارسی گو شعرا کا ہے۔ اس کا نام عقدِ ثریا ہے اس میں تقریباً ڈیڑھ سو شعرا کے مختصر حالات ہیں۔ دوسرا تذکرہ اردو کہنے والے شاعروں کا ہے اس کا نام تذکرۂ ہندی ہے اور اس میں تقریباً دو سو اڑھائی سو شعرا کے حالات ہیں۔ حالات کے بعد کلام کے نمونے بھی دیئے ہیں۔ انتخاب کلام میں حسنِ ذوق سے کام لیا ہے۔ یہ تذکرہ مصحفی نے جوانی کے زمانے میں لکھا تھا۔ تیسرا تذکرہ ریاض الفصحا عالمِ پیری کی یادگار ہے۔ اس میں اُن فارسی اور اردو کہنے والے تقریباً سوا تین سو شعرا کا ذکر ہے جن کے نام پہلے تذکروں میں لکھنے سے رہ گئے۔ اردو زبان اور ادب سے ذوق رکھنے والوں کے لئے ان تینوں کتابوں کا مطالعہ نہایت ضروری ہے اور ہمیں انجمن ترقی اردو کا ممنون ہونا چاہئے کہ وہ اردو کے خزانے کو ایسی اہم کتابوں سے بھر رہے ہیں۔ شروع میں مولوی عبدالحق صاحب بی اے نے ایک محققانہ مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے جس سے مصحفی کی زندگی اور اس کے تذکروں کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ عقدِ ثریا کی قیمت فی جلد مجلد ۱۲/ غیر مجلد ۱۲/ تذکرۂ ہندی کی قیمت فی جلد مجلد عہ/ غیر مجلد ۱۲/۔ ریاض الفصحا کی قیمت فی جلد مجلد تے غیر مجلد ۱۲/

نغمۂ الہام

یہ ہندوستان کی مشہور الہامی کتاب بھگوت گیتا کا منظوم اردو ترجمہ ہے بھگوت گیتا علم و حکمت کی وہ روشنی ہے جو پانچ ہزار برس سے اہلِ ہند کے دلوں کو روشن کر رہی ہے۔ انگریزی زبان میں گیتا کے متعدد ترجمے اور تفسیریں لکھی جا چکی ہیں فارسی میں اس کا منظوم ترجمہ غالباً فیضی نے کیا تھا۔ اردو نثر میں بھی ایک دو ترجمے موجود ہیں لیکن سنسکرت اور ہندی الفاظ کی بھرمار اور زبان کی خامیوں کے باعث یہ ترجمے مقبول نہیں ہو سکے۔ زیرِ نظر ترجمہ پنڈت یوگی راج صاحب نظر سوہانوی نے کیا ہے۔ پنڈت صاحب ایک کامل ادیب ہیں جنہیں اردو فارسی اور عربی الفاظ کے استعمال پر پوری قدرت ہے ترجمہ انھوں نے اس عمدگی سے کیا ہے کہ الہیات کے ادق مسائل کا مفہوم سمجھنے میں بالکل دقت نہیں ہوتی۔ ان کی نظم و نثر دونوں آسان، دلکش اور بلیغ ہیں۔ اس کتاب کا دیباچہ انہوں نے نہایت حسین اور پُرشوکت الفاظ میں لکھا ہے۔ مثال کے طور پر یہ چند فقرات دیکھئے:۔

”ارجن نے بیدلی سے کرشن کی طرف دیکھا۔ حیران رہ گیا۔ خوف سے کانپنے لگا رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کیا دیکھا؟ ایک ایسا قالب جس کا چہرہ ہزار آفتابوں کی روشنی سے زیادہ روشن تھا جس کے ہزاروں ہاتھ اور ہزاروں پیر تھے۔ جس کے خوفناک غاروں کی طرح کشادہ منہ میں تمام جہاں موجود تھا اور دونوں طرف کی خون کے جنگجو ہیبت آفریں دانتوں کے تلے دبے ہوئے تھے“

نظم کا نمونہ یہ ہے:۔

میں بغیر از جسم مخفی طور پر — اس جہاں میں ہر جگہ ہوں جلوہ گر
بیحس و بے حس یہاں جو کچھ بھی ہے — یہ مکاں یہ لامکاں جو کچھ بھی ہے
مجھ میں ہے یہ سب نہاں و آشکار — میں نہیں ہوں ان کے اندر آشکار
ہے خلا میں ہر جگہ جیسے ہوا — یوں ہی مجھ میں ہے قیام اس دہر کا
مجھ پہ مایا کا فسوں چلتا نہیں — دور ہوں بندِ عمل سے بالیقیں
اس لئے کرتا نہیں، کرتا ہوا — کچھ اثر مجھ پر نہیں افعال کا
میری یہ قدرت صدارت میں مری — کرتی ہے پیدا جہانِ زندگی
چونکہ اس قدرت میں حرکت اور قرار — جو ہرِ ذاتی سے ہے اے نامدار
اس لئے فانی جہاں گردش میں ہے — یہ زمیں یہ آسماں گردش میں ہے

کتابت طباعت اور صحت کے لحاظ سے کتاب نہایت اچھی ہے حجم دو سو صفحات سے زائد قیمت دو روپے ملنے کا پتہ۔ پنڈت نظر سوہانوی مقام سوہانہ ضلع انبالہ۔

منصور احمد

TO YOU

While writing to Advertisers please do not fail to refer "ADABI-DUNYA" as it facilitates immediate compliance.

F. M. SAQI,

Manager, "Adabi-Dunya" Lahore



[P]rinted & Published by Salah ud-din Ahmad at the Muslim Printing Press, Ry. Road, Lahore.
The Title & picture printed at the Victoria Press, Railway Road, Lahore.
Issued from office of the Adabi Dunya, Commercial Building, The Mall, Lahore.